إِنَّ هٰذَا الْقُرْآنَ يَهْدِي لِلَّتِي هِيَ أَقْوَمُ

بلاشبہ یہ قرآن نہایت سیدھی راہ دکھاتا ہے

تفسیر

هِدَايَتُ الْقُرْآن

ان شاء اللہ یہ تفسیر آپ کو قرآنِ کریم سے بہت قریب کردے گی

جلد پنجم

تالیف

حضرت مولانا مفتی سعید احمد صاحب پالن پوری

شیخ الحدیث وصدر المدرسین دارالعلوم دیوبند

ناشر

مکتبہ حجاز دیوبند

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

آغازِ تکمیل

۳ ربیع الاول ۱۴۱۶ ہجری کو پارہ پندرہ (سورۂ کہف) کی تفسیر مکمل ہوئی تھی، جو اسی وقت طبع ہوگئی تھی۔ پھر گیارہ سال کا طویل عرصہ بیت گیا کہ آگے کام نہ ہوا۔ کچھ ایسے اسباب پیدا ہوگئے کہ میں حجۃ اللہ البالغہ کی اردو شرح رحمۃ اللہ الواسعہ میں لگ گیا۔ اس کی ضخیم پانچ جلدیں لکھیں جو طبع ہوگئی ہیں۔ پھر متن پر عربی حاشیہ میں لگ گیا۔ جو دو جلدوں میں طبع ہوگیا ہے۔ اس درمیان اور بھی چھوٹے موٹے کام کئے۔ جیسے شرح علل الترمذی (عربی) مبادئ الاصول (عربی) اور معین الاصول شرح مبادئ الاصول (اردو) لکھی گئیں۔ مگر دوستوں اور قارئین کے پیہم اصرار کے باوجود تفسیر کا کام آگے نہ بڑھ سکا۔ یہاں تک کہ لوگ اس سے مایوس ہوگئے۔ مگر میرے ذہن سے تفسیر کی تکمیل کا خیال کبھی نہیں ہٹا، مگر ہوتا وہی ہے جو اللہ تعالیٰ چاہتے ہیں۔ اس عرصہ میں لندن کے میرے ایک کرم فرما ولی بھائی کھنکھارا اللہ کو پیارے ہوگئے، اللہ تعالیٰ ان کی بال بال مغفرت فرمائیں، وہ اور ان کے خاندان کے دوسرے حضرات تفسیر ہدایت القرآن کی تکمیل سے خصوصی دلچسپی رکھتے تھے۔ امریکہ اور افریقہ کے دوسرے حضرات بھی متوجہ تھے خاص طور پر جناب مولانا اسماعیل صاحب سیدات (سابق امام مسجد مسجد قبا اسٹامفورہیل، لندن) کی خصوصی توجہ تھی، مگر کلُّ أمر مرهون بوقته: ہر کام وقت پر ہوتا ہے۔ یہاں تک کہ امسال ایک دوست مولانا طارق انور قاسمی سلمہ کا بڑا ہی حوصلہ افزا اور تکمیل کے اصرار کا خط ملا۔ اس خط نے دل پر بہت اثر ڈالا۔ چنانچہ میں ضروری کتاب (آسان صرف حصۂ سوم) کو صیغۂ التواء میں ڈال کر تفسیر میں مشغول ہوگیا۔ محرم ۱۴۲۷ ہجری میں کام شروع کیا اور ربیع الاول میں یہ پانچویں جلد تکمیل پذیر ہوئی جو آپ کے ہاتھوں میں ہے۔ اب زندگی کے دن کچھ زیادہ نظر نہیں آرہے اس لئے ارادہ ہے کہ اب مسلسل اس کام میں لگا رہوں اور اس کو پایۂ تکمیل تک پہنچاؤں۔ اللہ تعالیٰ توفیق عطا فرمائیں اور کام آسان فرمائیں (آمین)

تفسیر پہلے لیتھو پر چھپی تھی اور الگ الگ پارے تھے۔ کئی سال پہلے ان کو کمپیوٹر سے طبع کیا گیا اور جلدیں بنائی گئیں تو شروع کے چودہ پارے چار جلدوں میں آئے۔ پارہ پندہ اگلی جلد کے لئے باقی رکھا تھا۔ جو اب پانچویں جلد میں شامل کیا گیا ہے۔ اس میں نے نظر ثانی کی ہے اور بہت کچھ حک وفک کیا ہے، بلکہ بعض مضامین از سر نو لکھے ہیں۔ پس جن کے پاس یہ پارہ پہلے سے ہے ان کے لئے بھی یہ پارہ نیا ہے۔ بس قارئین سے اس دعا کی التماس ہے کہ اللہ تعالیٰ بلا وقفہ تفسیر کی تکمیل کی توفیق عطا فرمائیں (آمین)

کتبہٗ

سعید احمد عفا اللہ عنہ پالن پوری

خادم دار العلوم دیوبند ۵ ربیع الثانی ۱۴۲۷ھ

فہرست مضامین

سورۂ بنی اسرائیل

سورۂ کہف

سورۂ مریم

سورۂ طٰہٰ

سورۃ الانبیاء

سورۃ الحج

سورۃ المؤمنون

﴿سورۃ المؤمنون پوری ہوئی﴾

❁ ❁ ❁

سورۂ بنی اسرائیل

نمبر شمار ۱۷ نوعیتِ نزول مکی نمبر نزول ۵۰

آیات: ۱۱۱ رکوع: ۱۲ کلمات: ۱۵۸۲ حروف: ۶۷۱۰

یہ سورت مکہ میں نازل ہوئی ہے۔نزول کے اعتبار سے یہ پچاسویں سورت ہے۔مُصحف میں اس کا نمبر سترہواں ہے۔زمانۂ نزول مکی دور کا وسط ہے۔مکی سورتیں کل چھیاسی ہیں۔پس اس صورت کے بعد مکہ میں ۳۶ سورتیں اور نازل ہوئی ہیں۔زمانۂ نزول کے قرائن یہ ہیں:

پہلا قرینہ ـــــ حضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں: هُنَّ من العِتَاقِ الأُوَل، وَهُنَّ من تِلادی: یہ سورت اور کہف و مریم: پرانی سورتیں ہیں، اور وہ میرا پرانا سرمایہ ہیں۔یا یہ سورتیں نہایت عمدہ (فصیح و بلیغ) ہیں، اور مجھے بہت قدیم زمانہ سے یاد ہیں (بخاری حدیث ۴۷۰۸)

دوسرا قرینہ ـــــ معراج کی تاریخ میں اختلاف ہے۔سُہیلی نے الروض الاُنُف میں لکھا ہے کہ اسراء کا واقعہ ۵ ہجری میں پیش آیا ہے۔اگر یہ قول صحیح ہے تو اس سے بھی اس سورت کی قدامت کا پتہ چلتا ہے۔

تیسرا قرینہ ـــــ سورت کے مضامین سے اندازہ ہوتا ہے کہ یہ سورت پُر آشوب دور میں نازل ہوئی ہے۔جب مشرکین نے مکہ میں مسلمانوں کے لئے عرصۂ حیات تنگ کر رکھا تھا۔اور وہ مکہ چھوڑ کر ہجرتِ حبشہ پر مجبور ہو گئے تھے۔پہلی ہجرتِ حبشہ ۵ نبوی میں ہوئی (طبقات ابن سعد ۱:۲۰۴)

سورت کا نام ـــــ اس سورت کے مشہور نام دو ہیں: بنی اسرائیل اور اسراء۔چونکہ اس سورت کے پہلے رکوع میں بنی اسرائیل کا تذکرہ آیا ہے، اور سب سے پہلی آیت میں واقعۂ اسراء کا ذکر ہے، اس لئے اس سورت کے یہ دو نام ہیں۔اور اس کو سورہ سبحان بھی کہتے ہیں۔یہ سورت کا پہلا کلمہ ہے۔

سورت کا پس منظر ـــــ جس زمانہ میں یہ سورت نازل ہوئی ہے: وہ زمانہ آنحضرت ﷺ اور مسلمانوں کے لئے

سخت آزمائش کا زمانہ تھا۔ مشرکین کی ایذا رسانیاں اپنی انتہاء کو پہنچی ہوئی تھیں۔ صورتِ حال یہ ہو کر رہ گئی تھی کہ مسلمان نہ تو علانیہ وطن سے نکل سکتے تھے، نہ اپنے گھروں میں اطمینان کا سانس لے سکتے تھے۔ چھپ چھپ کر حبشہ کی طرف ہجرت کر رہے تھے، مگر سب کے لئے ہجرت بھی آسان نہیں تھی۔ جو مکہ میں رہ گئے تھے ظلم و ستم کی چکّی میں پس رہے تھے۔ اور مشرکین دندناتے پھر رہے تھے۔ ان کو ناز تھا کہ ہم کعبہ کے پاسبان ہیں۔ اللہ کے گھر کے ہم ذمہ دار ہیں، یہ ہمارے برحق ہونے کی دلیل ہے۔ چنانچہ ان کو سورت کے شروع میں بنی اسرائیل کے احوال سنائے گئے ہیں کہ وہ بھی بیت المقدس کے پاسبان تھے۔ مگر جب ان کی شرارتوں کا پارہ چڑھ گیا تو ان کا حشر کیا ہوا؟! اور اس سورت میں ایمان لانے والوں کو بار بار تسلی دی گئی ہے کہ ہمت رکھو، صبر کرو، گھبراؤ نہیں، دن پھرنے والے ہیں، حق کا بول بالا ہونے والا ہے، اور باطل سرنگوں ہونے والا ہے۔ باطل کو تو سرنگوں ہونا ہی ہے! (آیت ۸۱)

سورت کے عمودی مضامین — تمام مکی سورتوں کی طرح اس سورت کے بھی بنیادی مضامین تین ہیں: توحید، رسالت اور معاد۔ بار بار وحدانیت ثابت کی گئی ہے اور شرک کی برائی بیان کی گئی ہے۔ توحید کو تعلیماتِ انبیاء میں بنیادی اہمیت حاصل ہے (الانبیاء آیت ۲۵) اور رسالت: بندوں اور اللہ کے درمیان وساطت کا نام ہے۔ رسول ہی لوگوں کو اللہ کا پیغام پہنچاتے ہیں۔ اور آخرت کی زندگی ہی اصل زندگی ہے۔ دنیا کی زندگی اس کی تمہید ہے۔ یہاں کمانا ہے، وہاں کھانا ہے۔ یہاں بونا ہے، وہاں کاٹنا ہے۔ یہ زندگی چندروزہ ہے، وہ دائمی۔ اس زندگی میں جو بھلا برا عمل کیا ہے، اُس زندگی میں اس کا بدلہ ملنے والا ہے۔ انہی عقائد ثلاثہ پر کامیابی کا مدار ہے۔ اس لئے یہ مضامین بار بار بیان کئے گئے ہیں تاکہ انسان ہوش میں آئے، اور کامیابی سے ہمکنار ہو۔

سورت کے تفصیلی مضامین — اس سورت میں اس قدر گونا گوں مضامین ہیں: جن کا احاطہ دشوار ہے۔ فہرستِ مضامین سے اس کا کچھ اندازہ کیا جاسکتا ہے۔ البتہ تین مضامین خصوصی اہمیت کے حامل ہیں: ایک: اسراء و معراج کا واقعہ جو سورت کی پہلی آیت میں مذکور ہے۔ دوم: وہ بارہ احکام جو آیات ۲۲-۳۹ میں دیئے گئے ہیں۔ سوم: وہ پانچ اہم باتیں جو آیات ۷۸-۸۲ میں بیان کی گئی ہیں۔ یہ باتیں امید اور صبر و ہمت پیدا کرنی والی ہیں۔ اور ایسے نازک دور میں نازل کی گئی ہیں جب مکہ کی سرزمین اہلِ حق کے لئے تنگ ہوگئی تھی۔ مخالفتیں اور سازشیں دن بدن بڑھتی جا رہی تھیں۔ ایسے جانگداز حالات میں یہ احکام دیئے گئے ہیں، تاکہ مسلمان صبر و ہمت سے کام لیں، اور اللہ کی فتح کا انتظار کریں۔

بِسۡمِ اللّٰهِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِيۡمِ

سُبۡحٰنَ الَّذِىۡۤ اَسۡرٰى بِعَبۡدِهٖ لَيۡلًا مِّنَ الۡمَسۡجِدِ الۡحَـرَامِ اِلَى الۡمَسۡجِدِ الۡاَقۡصَا الَّذِىۡ بٰرَكۡنَا حَوۡلَهٗ لِنُرِيَهٗ مِنۡ اٰيٰتِنَا ؕ اِنَّهٗ هُوَ السَّمِيۡعُ الۡبَصِيۡرُ ۞

بِسۡمِ	نام سے	بِعَبۡدِهٖ	اپنے بندے کو	بٰرَكۡنَا	برکتیں کر رکھی ہیں ہم نے
اللّٰهِ	اللہ کے	لَيۡلًا (۳)	رات میں	حَوۡلَهٗ	اس کے گرداگرد
الرَّحۡمٰنِ	(جو) بے حد مہربان	مِّنَ الۡمَسۡجِدِ	مسجد حرام سے	لِنُرِيَهٗ	تا کہ دکھلائیں ہم اس کو
الرَّحِيۡمِ	نہایت رحم والے (ہیں)	الۡحَرَامِ (۴)		مِنۡ اٰيٰتِنَا	اپنی کچھ نشانیاں
سُبۡحٰنَ (۱)	پاک ہے	اِلَى الۡمَسۡجِدِ	مسجد اقصیٰ تک	اِنَّهٗ هُوَ	بے شک وہی
الَّذِىۡۤ	وہ ذات جو	الۡاَقۡصَا (۵)		السَّمِيۡعُ	بہت سننے والا
اَسۡرٰى (۲)	لے گئی	الَّذِىۡ	وہ (مسجد اقصیٰ) جو کہ	الۡبَصِيۡرُ	بہت دیکھنے والا (ہے)

(۱)سُبْحَانَ (مصدر) بمعنی تسبیح (پاکی بیان کرنا) اس کے لئے نصب اور مفرد کی طرف اضافت لازم ہے۔مفرد خواہ اسم ظاہر ہو جیسے: سبحان اللہ یا ضمیر ہو جیسے سبحانہ ـــــ ترکیب میں سبحان مفعول مطلق ہے اور اس کا فعل وجوباً محذوف رہتا ہے تقدیر عبارت: اُسَبِّحُ اللہ سُبْحَانَہٗ ہے۔سُبْحَانَ کا استعمال غایتِ تنزیہ کے لئے بھی ہوتا ہے اور امور عظام سامنے آنے کی صورت میں بھی ـــــ اَسْرٰی جملہ فعلیہ صلہ ہے لَیْلاً اس کا مفعول فیہ ہے۔الذی بارکنا إلخ مسجد اقصی کی صفت مادحہ ہے اور لِیُرِیَہٗ، اَسْرٰی سے متعلق ہے (۲)اَسْرٰی از باب افعال بمعنی مجرد ہے ہمزہ تعدیہ کے لئے نہیں ہے سَرَی(ض)سُریً وَسَرْیَۃً ومَسْریً وَاَسْرٰی کے معنی ہیں رات میں چلنا اور سَرٰی بہ اور اَسْرٰی بہ کے معنی ہیں رات میں لے چلنا، سفر کرانا (۳) لَیْلاً تاکید کے لئے ہے جیسے: لَاتَتَّخِذُوْا اِلٰھَیْنِ اثْنَیْنِ (دو معبود نہ بناؤ) اس میں اِثْنَیْنِ تاکید کے لئے ہے اور لَیْلاً کی تنکیر کا مقصد یہ بتانا ہے کہ یہ لے جانا صرف ایک رات میں ہوا تھا۔متعدد راتیں اس میں صرف نہیں ہوئی تھیں۔کیونکہ تنکیر سے جو تبعیض حاصل ہوتی ہے وہ افراد کی تبعیض ہوتی ہے برخلاف من جارہ کے، اس سے اجزاء کی تبعیض حاصل ہوتی ہے (روح) (۴) اَلْحَرَامُ (مصدر) حلال کی ضد ہے اور جمع حُرُمٌ ہے کعبہ شریف اور اس کے اردگرد کو مسجد حرام کہتے ہیں کیونکہ وہ جگہ محترم ہے۔وہاں گناہوں کی اور نامناسب کاموں کی سخت ممانعت ہے (۵) اقصیٰ (اسم تفضیل) بہت دور جمع اَقَاصٍ مؤنث قُصْوٰی بیت المقدس کو مسجد اقصی اس لئے کہتے ہیں کہ وہ خانۂ کعبہ سے بہت فاصلہ پر ہے اور اس سے پرے اور کوئی مسجد نہیں تھی (تفسیر حقانی) اور المقدس مشدد و مخفف دونوں طرح ←

اللہ کے نام سے شروع کرتا ہوں، جو بے حد مہربان بڑے رحم والے ہیں

اس سورت کا آغاز اسراء کے واقعہ سے کیا گیا ہے۔ جس کے بعد معراج یعنی آسمانوں پر چڑھنا ہوا ہے۔ پھر بنی اسرائیل کی بدکرداری کا تذکرہ ہے۔ اس میں دو باتوں کی طرف اشارہ ہے:

ایک: اس طرف اشارہ ہے کہ اس دین کو عروج حاصل ہونے والا ہے، مخالفوں کی سازشوں کے ختم ہونے کا وقت قریب آگیا ہے۔ مسلمان صبر وہمت سے کام لیں۔ یہی بات گذشتہ سورت کے آخر میں تلقین کی گئی تھی۔ فرمایا تھا: ''آپ صبر کریں، اللہ ہی صبر کی توفیق دینے والے ہیں۔ اور مخالفین کی ریشہ دوانیوں کا غم نہ کریں، نہ تنگ دل ہوں، اللہ تعالیٰ کی نصرت و مدد ان لوگوں کے شامل حال رہتی ہے جو نیکوکار ہیں''

دوم: اس طرف اشارہ ہے کہ اب انبیاء علیہم السلام کے دونوں قبلے خاتم النّبیین ﷺ کے ماتحت کئے جا رہے ہیں۔ اور بنی اسرائیل کو دینی قیادت سے ہٹایا جا رہا ہے، اور ان کی جگہ امتِ محمدیہ کو کھڑا کیا جا رہا ہے۔

ارشاد پاک ہے: —— اس اللہ کے لئے پاکی ہے جو اپنے خاص بندے (محمد ﷺ) کو ایک ہی رات میں مسجد حرام سے مسجد اقصیٰ تک لے گئے، جس کے ارد گرد ہم نے برکتیں رکھی ہیں، تاکہ ہم اس بندے کو اپنی کچھ نشانیاں دکھائیں۔ بیشک وہ بندہ خوب سننے والا خوب دیکھنے والا ہے —— یعنی کامل فہم وبصیرت والا ہے۔

تفسیر: ہجرت سے کچھ پہلے اسراء ومعراج کا واقعہ پیش آیا۔ مسجد حرام سے مسجد اقصیٰ تک کا سفر اسراء کہلاتا ہے۔ اور مسجد اقصیٰ سے آسمانوں کے اوپر تک کی سیر معراج کہلاتی ہے۔ اسراء کے معنی ہیں: رات میں چلنا، اور اَسری بہ کے معنی ہیں: رات میں لے چلنا۔ چونکہ یہ سفر رات میں کرایا گیا تھا، اس لئے وہ اسراء کہلاتا ہے۔ اور معراج کے معنی ہیں: سیڑھی۔ چونکہ آسمانوں پر چڑھنے کے لئے سیڑھی لگائی گئی تھی، اس لئے اس سفر کو معراج کہتے ہیں۔ مگر عرف عام میں دونوں کے مجموعہ کو معراج کہتے ہیں۔

اسراء ومعراج میں بہت سی حکمتیں تھیں۔ دو کی طرف قرآن کریم نے اشارہ کیا ہے:

ضمنی حکمت: یہ تھی کہ یہ واقعہ لوگوں کے لئے ابتلا اور آزمائش بنے۔ ارشاد پاک ہے: ﴿وَمَا جَعَلْنَا الرُّءْ يَا الَّتِیْ

→ صحیح ہے۔ اَلْمَقْدِسْ: مکان مقدس، پاک جگہ اور اَلْمُقَدَّسْ (اسم مفعول) پاک کیا ہوا اور جب اس پر لفظ بیت داخل ہو تو پہلی صورت میں مضاف ہوگا اور بَیْتُ الْمَقْدِسِ کہا جائے گا اور دوسری صورت میں موصوف ہوگا اور البیت الْمُقَدَّسْ کہا جائے گا مگر اردو میں اس کا خیال نہیں رکھا جاتا بیت الْمقدّس بھی کہہ دیتے ہیں البتہ الْمُقَدِّسْ (دال کے زیر کے ساتھ یعنی اسم فاعل) غلط ہے اور اَلاَرْضُ الْمُقَدَّسَة: فلسطین (یروشلم) کے کہتے ہیں۔

أَرَيْنٰكَ إِلَّا فِتْنَةً لِّلنَّاسِ﴾ ترجمہ: اور ہم نے آپؐ کو (شب معراج میں) جو مشاہدہ کرایا تھا: اس کو ہم نے لوگوں کے لئے آزمائش ہی بنایا تھا (بنی اسرائیل آیت ۶۰) یہ واقعہ اس زمانہ میں پیش آیا تھا جبکہ دعوت وتبلیغ کے کام میں کامیابی کے آثار نمودار ہوچکے تھے۔ اس واقعہ سے کچے پیچھے چلے گئے، اور پکے مضبوط ہوگئے۔ اسی واقعہ کی تصدیق کی وجہ سے حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کو صدیق کا خطاب ملا ہے۔

اور اصل حکمت: کی طرف: ﴿لِنُرِيَهُ مِنْ آيَاتِنَا﴾ کہہ کر اشارہ کیا ہے یعنی ہم (اللہ تعالیٰ) آپ ﷺ کو اپنی کچھ نشانیاں دکھلانا چاہتے ہیں۔ یہ نشانیاں بہت ہیں۔ اسراء سے یعنی بیت المقدس لے جانے سے مقصود تو آپؐ کا امام الانبیاء ہونا واضح کرنا تھا۔ چنانچہ ایک ہی آیت میں اسراء کا تذکرہ کرکے کلام کا رخ بنی اسرائیل کی سیاہ کاریوں کی طرف پھیر دیا ہے۔ اور آخر میں انہیں آگاہ کیا ہے کہ یہ قرآن وہ راہ دکھلاتا ہے جو بالکل سیدھی اور صحیح ہے۔ اس انداز کلام میں اشارہ ہے کہ اب بنی اسرائیل کو نوعِ انسانی کی قیادت سے معزول کیا جارہا ہے۔ اور اب یہ منصب آپ ﷺ کو اور آپؐ کی امت کو سونپا جارہا ہے۔ چنانچہ اس سفر کے آخر میں آپؐ نے جو تمام انبیاء ورسل کی امامت فرمائی ہے، اس سے اسی حقیقت کا اظہار مقصود تھا۔

پھر آپ ﷺ کو عالم بالا کی سیر کرائی گئی، آسمانوں کے احوال سے واقف کیا گیا، جنت وجہنم کا مشاہدہ کرایا گیا، اوران گنت عجائباتِ قدرت دکھلائے گئے، تاکہ آپؐ اپنی امت کو دوسری دنیا کا آنکھوں دیکھا حال بتلائیں، اور آپؐ کا بیان صرف شنیدہ نہ ہو، بلکہ دیدہ ہو۔ اور اس مقصد کے لئے آپؐ کا انتخاب اس لئے کیا گیا کہ آپؐ ہی خوب سننے والے، خوب دیکھنے والے یعنی کامل فہم وبصیرت رکھنے والے ہیں[1]

اس کی تفصیل یہ ہے کہ آخرت کے احوال اور جنت وجہنم کے کوائف تمام انبیاء علیہم السلام نے اپنی امتوں کے سامنے بیان کئے ہیں، مگر وہ سب شنیدہ تھے یعنی وحی کے ذریعہ جن احوال کی ان کو اطلاع دی گئی تھی، وہی احوال انھوں نے اپنی امتوں سے بیان کئے تھے۔ اور ہمارے نبی ﷺ کو دوسری دنیا کے احوال صرف وحی سے نہیں بتلائے گئے، بلکہ معراج میں موقع پر لے جاکر تفصیلی مشاہدہ کرایا۔ چنانچہ آپؐ نے جنت وجہنم وغیرہ کے احوال اتنی تفصیل سے امت کو

۱؎ اس جگہ سمیع وبصیر اللہ تعالیٰ کی صفتیں نہیں ہیں۔ رسول اللہ ﷺ کی ہیں۔ انسانوں کے لئے یہ دونوں صفتیں سورۃ الدہر آیت ۲ میں ثابت کی گئی ہیں۔ اور آیت کے آخری حصہ میں تعلیل ہے کہ عجائباتِ قدرت اور دوسری دنیا کے احوال دکھانے کے لئے تمام انبیاء علیہم السلام میں سے آپ ﷺ کا انتخاب اس لئے کیا گیا ہے کہ آپؐ ہی کامل فہم وبصیرت والے ہیں۔ اور ایسے ہی بندے کو نشانیاں دکھانا مفید ہے ۱۲

سنائے ہیں کہ گذشتہ کسی نبی نے اتنی تفصیل بیان نہیں کی۔ اس کی مثال یہ ہے کہ جب کوئی شخص حج کر کے لوٹتا ہے تو ہفتوں مہینوں حرمین کے احوال لوگوں کو سناتا ہے، اور چھوٹی چھوٹی باتیں بھی بیان کرتا ہے، اور مزے لے لے کر بیان کرتا ہے، تھکتا نہیں۔ آپ معراج کی احادیث پڑھیں۔ اتنی تفصیل سے نبی ﷺ نے عجائبات قدرت بیان کئے ہیں کہ عقل دنگ رہ جاتی ہے، اور صاف محسوس ہوتا ہے کہ یہ سب باتیں آپؐ کی چشم دید ہیں۔

تسبیح سے آغاز ـــــ واقعۂ اسراء کا آغاز اللہ تعالیٰ کی پاکی سے کیا گیا ہے۔ اللہ تعالیٰ کی ہر عیب، ہر کمی، ہر عاجزی اور ہر کمزوری سے پاکی بیان کی گئی ہے۔ اس میں اللہ کی قدرتِ کاملہ کی طرف اشارہ ہے۔ جو ہستی ہر طرح کی کمزوری، عجز ودر ماندگی سے مبرّا ہو، وہ بااقتدار ہوتی ہے۔ اور اللہ کی قدرتِ کاملہ سے واقعہ کی ابتداء اس لئے کی گئی ہے کہ معراج کے سلسلہ میں ممکن اور ناممکن کا سوال نہ پیدا ہو۔ یہ سوال اس صورت میں پیدا ہوتا ہے جب معاملہ بندے کے کام کرنے کا ہو، کیونکہ بندوں کی طاقت وقدرت محدود ہے۔ لیکن جب معاملہ قدرتِ خداوندی کا ہو، تو امکان اور عدم امکان کی بحث وہی چھیڑ سکتا ہے جو اللہ کے قادر مطلق ہونے کا یقین نہ رکھتا ہو۔ پھر یہ کوئی انوکھا واقعہ نہیں، اس سے پہلے دو واقعے جسد عنصری کے ساتھ آسمانوں پر اٹھائے جانے کے پیش آچکے ہیں۔ ایک حضرت آدم علیہ السلام کا واقعہ ہے۔ آپ کی تخلیق اسی زمین پر ہوئی تھی۔ پھر آپ کو اور دادی حواء رضی اللہ عنہا کو آسمانوں میں لے جا کر جنت میں بسایا گیا۔ پھر وہاں سے زمین پر اتارا گیا۔ دوسرا واقعہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کا پیش آچکا ہے۔ آپ کو بھی جسد عنصری کے ساتھ آسمانوں میں اٹھایا گیا ہے۔ اور قیامت سے پہلے اسی جسم کے ساتھ اتارا جائے گا۔ یہ واقعات اللہ تعالیٰ نے رونما کئے ہیں، جو قادر مطلق ہیں، اور ہر ضعف وکمزوری سے پاک ہیں۔ معراج کا محیر العقول واقعہ بھی ان کی قدرت کاملہ کا ادنی کرشمہ ہے۔ اسی طرح اُس زمانہ میں مسجد حرام سے مسجد اقصی تک کا سفر مہینہ سوا مہینہ میں طے ہوتا تھا، مگر قادر مطلق نے ایک ہی رات میں طے کرادیا۔ سفر رات کے ابتدائی حصہ میں شروع ہوا، اور صبح سویرے غَلَس میں آپؐ مکہ لوٹ آئے۔ غَلَس: صبح صادق کے بعد کی تاریکی جو صبح کی روشنی کے ساتھ ملی ہوتی ہے)

بندگی طرۂ امتیاز ـــــ عبده میں اضافت تشریف کے لئے ہے۔ مراد اللہ کے خاص بندے حضرت محبوبِ خدا، محمد مصطفیٰ ﷺ ہیں۔ اور نام نامی یا صفتِ حبیب اللہ کے بجائے وصف عبدیت دو وجہ سے اختیار کیا گیا ہے: ایک: بندوں کے لئے اشرف وصف عبدیت (بندہ ہونا) ہے۔ دوم: کچے عقیدہ والے اور جاہل مسلمان آپؐ کی شان میں غلو نہ کریں۔ جیسے عیسائیوں میں عیسیٰ علیہ السلام کے رفع (آسمان پر اٹھائے جانے) سے الوہیتِ مسیح اور ابنیتِ مسیح کا عقیدہ پیدا ہوا، معراج کا واقعہ بھی چونکہ رفع شان کا غیر معمولی واقعہ تھا، اس لئے اندیشہ تھا کہ کہیں یہ بات امت کی

گمراہی کا سبب نہ بن جائے۔ اس لئے وصفِ عبدیت کے ذریعہ اشارہ کیا کہ آپ ﷺ بایں عظمت ورفعت رہے اللہ کے بندے ہی! کچھ خدائی شان ان میں پیدا نہیں ہوگئی۔ بندگی ہی آپؐ کے لئے طرّۂ امتیاز ہے۔

مسجد حرام سے مراد: وہ مسجد ہے جس کے بیچ میں کعبہ شریف قائم ہے۔ نزولِ قرآن کے وقت وہاں کوئی باقاعدہ مسجد نہیں تھی (جامع الاصول حدیث ۶۸۹۴) کعبہ شریف کھڑا تھا، اوراس کے گرد مطاف کی جگہ کھلی پڑی تھی، پھر مکانات شروع ہوجاتے تھے۔ اس زمانہ میں لوگ کعبہ کے اندر جا کر بھی نماز پڑھتے تھے، پھر قریش نے دروازہ اونچا کر کے روک لگادی۔ آیت پاک میں مسجد حرام سے کعبہ شریف مراد ہے۔ ﴿فَوَلِّ وَجْهَكَ شَطْرَ الْمَسْجِدِ الْحَرَامِ﴾ میں بھی یہی مراد ہے۔ یعنی آپ اپنا چہرہ (نماز میں) کعبہ کی طرف کیا کریں (البقرۃ آیت ۱۴۴)

مسجد اقصی کا دوسرا نام بیت المقدس ہے۔ اللہ کا یہ گھر بھی عرصہ تک انبیاء بنی اسرائیل کا قبلہ رہا ہے، اور ہجرت کے بعد امت مسلمہ نے بھی سولہ سترہ مہینے تک اس گھر کی طرف نماز پڑھی ہے۔

بیت المقدس کے اردگرد برکتیں ـــــ ظاہری برکتیں یہ ہیں کہ وہاں کی آب وہوا عمدہ، زمین زرخیز، باغات اور نہریں عجیب شان رکھتی ہیں۔ اور روحانی برکتیں: یہ ہیں کہ یہ گھر بھی انبیاء اور ملائکہ کی توجہات کا مرکز رہا ہے۔ اور عنایاتِ ربانی کی جلوہ گاہ ہے۔ اس لئے وہ ملکوت کی طرف ایک دروازہ ہے۔

معراج کی روایات ـــــ متعدد مفسرین کرام نے فرمایا ہے کہ اسراء ومعراج کی روایتیں متواتر ہیں۔ علامہ ابن کثیر رحمہ اللہ نے ۲۵ صحابۂ کرام کے نام لکھے ہیں، جن سے معراج کی حدیثیں مروی ہیں۔ اور آخر میں لکھا ہے: ''معراج کی حدیثوں پر تمام مسلمانوں کا اتفاق ہے، اور ملحدوں اور زندیقوں نے ان سے اعراض کیا ہے'' سیوطی رحمہ اللہ نے درمنثور میں، اور ابن کثیر نے تفسیر میں ان سب روایات کو ذکر کیا ہے۔ ہم ذیل میں ایک حدیث ذکر کرتے ہیں جو متفق علیہ ہے:

حضرت انس رضی اللہ عنہ بیان فرماتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ ''میرے پاس براق لایا گیا''۔ بُراق: بَرْق سے ہے جس کے معنی ہیں بجلی۔ اور اس سواری کو بُراق اس کی برق رفتاری کی وجہ سے کہا گیا ہے۔ یہ سواری جنت سے لائی گئی تھی ـــــ ''وہ سفید لانبے قد کا ایک چوپایہ تھا۔ گدھے سے کچھ بڑا اور خچر سے کچھ چھوٹا'' ـــــ اور یہ جو مشہور ہے کہ اس کا چہرہ عورت جیسا اور جسم گھوڑے جیسا تھا وہ محض بے اصل بات ہے ـــــ اس سواری کی تیز رفتاری کا حال یہ تھا کہ وہ اپنا پیر منتہائے نظر پر رکھتی تھی آپؐ اس پر سوار ہوکر بیت المقدس پہنچے اور اس کُنڈے سے اس کو باندھ دیا جس سے انبیا اپنی سواریاں باندھا کرتے تھے۔ پھر آپ مسجد میں تشریف لے گئے ـــــ

اُس وقت مسجد اقصیٰ منہدم کردی گئی تھی مگر پوری ختم نہیں ہوئی تھی محراب باقی تھی، صخرہ اپنی جگہ پر تھا، اور باقی مسجد کو کوڑی بنادیا گیا تھا۔ تاریخ طبری وقائع سن ۱۵ ہجری میں اس کی صراحت ہے ـــــ پھر آپؐ نے فرمایا: میں نے وہاں (محراب میں تحیۃ المسجد کی) دو رکعتیں پڑھیں پھر باہر نکلا تو جبرئیل علیہ السلام نے میرے سامنے شراب کا جام اور دودھ کا پیالہ پیش کیا۔ میں نے دودھ کا پیالہ پسند کیا۔ حضرت جبرئیل علیہ السلام نے فرمایا: ''آپ نے فطرت کو اختیار کیا'' پھر حضرت جبرئیل ہم کو لے کر آسمان کی طرف چڑھے اور دروازہ کھلوایا اندر سے پوچھا گیا: کون ہے؟ جبرئیل نے جواب دیا: میں جبرئیل ہوں پوچھا گیا: آپ کے ساتھ کون ہے؟ جواب دیا حضرت محمد ﷺ ہیں۔ دریافت کیا گیا: کیا ان کو بلایا گیا ہے؟ حضرت جبرئیل علیہ السلام نے جواب دیا: ہاں، ان کو بلایا گیا ہے۔ اس کے بعد ہمارے لئے دروازہ کھول دیا گیا تو اچانک میں آدم علیہ السلام کے پاس تھا۔ انہوں نے مجھے خوش آمدید کہا اور دعائیں دیں'' ـــــ اسی طرح آپ دوسرے پھر تیسرے یہاں تک کہ ساتویں آسمان پر پہنچے اور ہر آسمان میں اسی طرح سوال وجواب کے بعد دروازہ کھولا گیا۔ آپؐ نے دوسرے آسمان میں دو خالہ زاد بھائیوں یعنی حضرت یحییٰ اور حضرت عیسیٰ علیہما السلام سے ملاقات کی ـــ حضرت یحییٰ کی والدہ اور حضرت عیسیٰؑ کی نانی حقیقی بہنیں تھیں، اس لئے حضرت یحییٰ اور حضرت مریم رضی اللہ عنہا خالہ زاد بھائی بہن ہیں اور حضرت مریمؑ کے صاحب زادے حضرت عیسیٰ بھی حضرت یحییٰؑ کے خالہ زاد بھائی ہیں، یہی شرعی اصول ہے ہمارے عرف کے اعتبار سے حضرت یحییٰ وعیسیٰ علیہما السلام ماموں بھانجے ہوتے ہیں یہ ہندوانہ ریت ہے۔ غیر مسلم اسی طرح رشتہ داریاں قائم کرتے ہیں۔ اصول شرع کی رو سے باپ کی بہن پھوپی ہے تو دادا کی بہن بھی پھوپی ہے اسی طرح پردادا کی بہن بھی۔ بلکہ آدم علیہ السلام تک ہر دادا کی بہن پھوپی ہے اور اس کی اولاد پھوپی زاد ہے۔ اور ہر پھوپی سے نکاح حرام ہے اور پھوپی زاد سے جائز ہے۔ اسی طرح چچا، ماموں، خالہ وغیرہ رشتوں کو سمجھنا چاہئے ـــ اور تیسرے آسمان میں آپ کی ملاقات یوسف علیہ السلام سے ہوئی آپ نے فرمایا: میں نے اچانک دیکھا کہ وہ آدھی خوبصورتی دیئے گئے ہیں ـــــ چوتھے آسمان میں حضرت ادریس علیہ السلام سے ملاقات ہوئی۔ ادریس علیہ السلام کے بارے میں باری تعالیٰ کا ارشاد ہے ﴿وَرَفَعْنَاهُ مَكَانًا عَلِيًّا﴾ یعنی ہم نے ان کو بلند مرتبہ تک پہنچایا ـــ اور یہ جو مشہور ہے کہ ادریس علیہ السلام کی ایک فرشتہ سے دوستی تھی۔ وہ اپنے پروں میں چھپا کر آپؑ کو عالم بالا میں لے گیا، پھر وہ وہیں رہ پڑے۔ یہ اسرائیلی روایت ہے آیت میں اس کی طرف کوئی اشارہ نہیں ـــــ اور پانچویں آسمان میں حضرت ہارون علیہ السلام سے اور چھٹے آسمان میں حضرت موسیٰ علیہ السلام سے اور ساتویں آسمان میں حضرت ابراہیم علیہ السلام سے ملاقات ہوئی۔ تمام انبیا نے آپؐ کو خوش آمدید کہا

اور دعائیں دیں۔حضرت ابراہیم علیہ السلام بیت معمور سے ٹیک لگائے بیٹھے تھے اللہ کے اس گھر میں روزانہ ستر ہزار فرشتے عبادت کے لئے داخل ہوتے ہیں پھر دوبارہ ان کا نمبر نہیں آتا — پھر حضرت جبرئیلؑ مجھے سدرۃ المنتہی (باڈر کی بیری) تک لے گئے۔وہاں اچانک میں نے دیکھا کہ اس بیری کے پتے ہاتھی کے کان کے برابر ہیں اور اس کے پھل مٹکوں جیسے ہیں۔پھر جب اس بیری کے درخت پر بحکم خداوندی وہ انوار چھاگئے جو چھاگئے تو اس کا حسن اس قدر دوبالا ہوگیا کہ اللہ کی مخلوق میں سے کوئی اس کی خوبصورتی بیان کرہی نہیں سکتا۔

آنحضرت ﷺ نے فرمایا: ''پھر اللہ تعالیٰ نے اس موقعہ پر جو وحی فرمانی منظور تھی میری طرف وحی فرمائی۔پھر مجھ پر شب وروز میں پچاس نمازیں فرض کیں۔پھر جب میں موسیٰ علیہ السلام کی طرف اترا تو انھوں نے پوچھا کہ پروردگار نے آپ کی امت پر کیا فرض کیا؟ میں نے کہا: پچاس نمازیں! انھوں نے کہا کہ آپ بارگاہ خداوندی میں واپس جائیں اور تخفیف کی درخواست کریں۔آپ کی امت پچاس نمازیں نہیں پڑھ سکے گی۔میں بنی اسرائیل کو آزما چکا ہوں اور ان کا خوب تجربہ کر چکا ہوں۔چنانچہ میں بارگاہِ خداوندی میں واپس گیا اور تخفیف کی درخواست کی۔اللہ تعالیٰ نے پانچ نمازیں کم کردیں جب واپس لوٹا موسیٰ علیہ السلام نے کہا کہ آپ کی امت پینتالیس نمازیں بھی نہیں پڑھ سکے گی۔پھر جائیے اور تخفیف کی درخواست کیجئے۔

رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا: ''میں برابر بارگاہ خداوندی میں اور موسیٰ علیہ السلام کے پاس آتا جاتا رہا یہاں تک کہ آخر میں جب پانچ نمازیں رہ گئیں تو اللہ پاک نے ارشاد فرمایا: ''اے محمد! یہ شب وروز میں پانچ نمازیں ہیں اور ہر نماز کا دس گنا بدلہ ہے لہٰذا مجموعہ پچاس ہوگیا، اور جو شخص کسی نیکی کا ارادہ کرے پھر اس کو نہ کرسکے تو اس کے لئے ایک نیکی لکھ دی جاتی ہے اور اگر کرلے تو دس نیکیاں لکھی جاتی ہیں اور جو شخص کسی برائی کا ارادہ کرے پھر اس کو نہ کرے تو اس لئے کوئی گناہ نہیں لکھا جاتا اور اگر کرلے تو صرف ایک گناہ لکھا جاتا ہے''

آنحضرت ﷺ نے ارشاد فرمایا: ''پھر میں اتر آیا یہاں تک کہ موسیٰ علیہ السلام کے پاس پہنچا اور ان کو پوری صورت حال بتلائی۔انھوں نے اب بھی یہی مشورہ دیا کہ میں بارگاہِ خداوندی میں واپس جاؤں اور مزید تخفیف کی درخواست کروں۔میں نے جواب دیا کہ: ''میں اتنی بار آیا گیا کہ اب شرم محسوس ہوتی ہے'' (مسلم شریف مصری ۲: ۲۰۹ کتاب الایمان)

روایاتِ معراج کا خلاصہ: اب آپ معراج کے سلسلہ کی تمام روایات کا وہ خلاصہ پڑھیں جو علامہ ابن کثیر رحمہ اللہ نے نکالا ہے وہ تفسیر میں تمام روایات درج کرنے کے بعد لکھتے ہیں:

''حق بات یہ ہے کہ آپ کو یہ سفر بیداری میں پیش آیا تھا، خواب میں نہیں۔مکہ مکرمہ سے بیت المقدس تک یہ سفر

بُراق پر ہوا تھا۔ جب آپؐ بیت المقدس کے دروازے پر پہنچے تو براق کو دروازے کے قریب باندھ دیا اور آپؐ اندر تشریف لے گئے اور اس کی محراب میں تحیۃ المسجد کی دو رکعتیں ادا فرمائیں، پھر ایک زینہ لایا گیا۔ جس میں درجے بنے ہوئے تھے۔ اس کے ذریعہ آپؐ پہلے آسمان پر تشریف لے گئے۔ اس کے بعد باقی آسمانوں پر چڑھے۔ ہر آسمان پر وہاں کے فرشتوں نے آپؐ کا استقبال کیا اور آپؐ ان انبیاء کی خدمت میں تشریف لے گئے جو حسب درجات و مراتب آسمانوں میں قیام پذیر تھے۔ یہاں تک کہ چھٹے آسمان میں حضرت موسیٰ علیہ السلام سے اور ساتویں آسمان میں حضرت ابراہیم خلیل اللہ سے ملاقات ہوئی۔ پھر آپؐ ان تمام انبیائے کرام کے مقامات سے بھی آگے تشریف لے گئے اور ایسے مقام میں پہنچے جہاں کِلکِ کروبیاں کی آواز سنائی دے رہی تھی۔ اور آپؐ نے سدرۃ المنتہی کو دیکھا جس پر اللہ تعالیٰ کے حکم سے سونے کے پتنگے اور مختلف رنگوں کے پروانے گر رہے تھے، اور جس کو اللہ کے فرشتوں نے گھیر رکھا تھا۔ وہاں آپؐ نے حضرت جبرئیل علیہ السلام کو ان کی اصلی شکل میں دیکھا۔ ان کے چھ سو بازو تھے اور وہیں پر آپ نے ایک سبز رنگ کا رَفرَف دیکھا جس نے افق کو گھیر رکھا تھا ـــــ رفرف کے معنی ہیں سبز مسند یعنی ہرے رنگ کی پالکی ـــــ اور آپ نے بیت معمور کو دیکھا جس کے پاس زمینی کعبہ کے بانی حضرت ابراہیم علیہ السلام دیوار سے کمر لگائے بیٹھے تھے، کیونکہ وہ آسمانی کعبہ ہے۔ اس میں روزانہ ستر ہزار فرشتے عبادت کے لئے داخل ہوتے ہیں جن کی دوبارہ قیامت تک باری نہیں آتی۔ اور آپؐ نے جنت و دوزخ کا معائنہ کیا اور وہیں آپؐ کی امت پر اولاً پچاس نمازیں فرض کی گئیں۔ پھر تخفیف کر کے پانچ کر دی گئیں۔ یہ اللہ تعالیٰ کی مہربانی اور بندوں پر ان کی نرمی تھی۔ اس سے تمام عبادات میں نماز کی خاص اہمیت اور فضیلت ثابت ہوتی ہے۔

پھر آپ بیت المقدس کی طرف واپس تشریف لائے اور انبیائے کرام بھی آپ کے ساتھ اترے اور جب نماز کا وقت ہوا تو آپؐ نے امام بن کر سب کو نماز پڑھائی، اور یہ بھی احتمال ہے کہ یہ نماز اس دن کی صبح کی نماز ہو اور بعض کا خیال یہ ہے کہ یہ امامت آسمانوں میں فرمائی ہے۔ حالانکہ بہت سی روایات میں صراحت ہے کہ بیت المقدس میں امامت فرمائی ہے۔ ہاں بعض روایات میں یہ ہے کہ امامت انبیاء کا واقعہ آسمانوں پر چڑھنے سے پہلے پیش آیا تھا۔ مگر ظاہر یہ ہے کہ یہ امامت واپسی پر فرمائی ہے کیونکہ آسمانوں پر انبیائے کرام سے ملاقات کے وقت سب انبیاء سے حضرت جبرئیل علیہ السلام نے آپؐ کا تعارف کرایا ہے اگر واقعۂ امامت پہلے پیش آچکا ہوتا تو تعارف کی کیا ضرورت تھی؟ ـــــ اور واقعات کی فطری ترتیب بھی یہی مناسب معلوم ہوتی ہے کیونکہ اس سفر کا اصل مقصد بارگاہ خداوندی میں حاضری تھی۔ تاکہ آپؐ پر اور آپؐ کی امت پر جو احکام فرض کئے جانے ہیں وہ فرض کئے جائیں۔ پھر جب آپ

اصل کام سے فارغ ہوگئے تو انبیائے کرام مُشایعت کے لئے بیت المقدس تک آئے اور آپؐ کو جبرئیل امین کے اشارے سے سب کا امام بنا کر آپ کی سیادت وفضیلت کا عملی ثبوت دیا گیا ـــــ پھر آپؐ بیت المقدس سے رخصت ہوئے اور براق پر سوار ہوکر غلس میں مکہ معظّمہ پہنچ گئے، واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم (۲۲:۳)

اب ذیل میں چند فوائد ذکر کئے جاتے ہیں:

پہلا فائدہ: بعض حضرات کا خیال ہے کہ اسرا اور معراج کے دونوں واقعے ایک ساتھ پیش نہیں آئے ہیں اور ان کی دلیل یہ ہے کہ اس آیت میں صرف اسراء کا بیان ہے اگر دونوں واقعے ایک ساتھ پیش آئے ہوتے تو قرآن ایک کے ذکر پر اکتفا نہ کرتا ـــ مگر یہ خیال احادیث شریفہ کی روشنی میں غلط ہے۔ احادیث سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ دونوں واقعے ایک ساتھ پیش آئے ہیں اور یہاں صرف اسرا کو ذکر کرنے کی وجہ وہ ہے جو پہلے ذکر کی جاچکی ہے کہ یہاں مقصود آپؐ کی سیادت کا بیان ہے اور اس کا تعلق واقعہ کے صرف اسی قدر حصہ سے ہے ـــــ رہا یہ سوال کہ اس آیت میں تو امامت انبیاء کا تذکرہ نہیں، نہ اس کی طرف کوئی اشارہ ہے؟ اس کا جواب یہ ہے کہ "آیات اللہ" میں یہ بات بھی داخل ہے اور احادیث میں اس کی تفصیل موجود ہے۔

دوسرا فائدہ: اسرا اور معراج بیداری میں پیش آئے ہیں یا خواب میں؟ حضرت عائشہ صدیقہ، حضرت معاویہ رضی اللہ عنہما اور حضرت حسن بصری رحمہ اللہ کی طرف یہ بات منسوب کی گئی ہے کہ آپؐ نے یہ واقعات بحالت خواب دیکھے ہیں ان حضرات کا استدلال اسی سورت کی آیت ۶۰ سے ہے جس میں معراج کے واقعہ کو رؤیا (خواب) کہا گیا ہے۔

اور جمہور امت کی رائے یہ ہے کہ دونوں واقعے بیداری کی حالت میں پیش آئے ہیں۔ اور روح اور جسم کے ساتھ معراج ہوئی ہے۔ ان حضرات کے دلائل درج ذیل ہیں:

۱ ـــ اس آیت میں واقعہ کی ابتدا تسبیح سے کی گئی ہے اس میں اس طرف اشارہ ہے کہ یہ کوئی بہت بڑا خارق عادت واقعہ تھا جو اللہ تعالیٰ کی غیر محدود قدرت سے رونما ہوا ہے۔ اور خواب میں اس قسم کے احوال کا دیکھنا ایک عام بات ہے اس کو بیان کرنے کے لئے اتنی زوردار تمہید کی ضرورت نہیں تھی۔

۲ ـــ یہ الفاظ کہ "ایک رات میں اپنے خاص بندے کو لے گئے" جسمانی سفر پر صراحۃً دلالت کرتے ہیں۔ عالم خواب کے سفر کے لئے یہ الفاظ کسی طرح موزوں نہیں۔

۳ ـــ لفظ عبد کے اشارے سے بھی یہی بات سمجھ میں آتی ہے۔ کیونکہ صرف روح کا نام عبد نہیں بلکہ جسم وروح کے مجموعہ کا نام عبد ہے۔

۴ــــ جب آپؐ نے معراج کا واقعہ اپنی چچازاد بہن حضرت ام ہانی رضی اللہ عنہا کو سنایا تو انھوں نے مشورہ دیا کہ آپؐ اس کا تذکرہ کسی سے نہ کریں ورنہ لوگ اور زیادہ تکذیب کریں گے۔ اگر معاملہ خواب کا ہوتا تو اس میں تکذیب کی کیا بات تھی؟ اس قسم کے خواب تو دیکھے جاتے ہیں۔

۵ــــ جب آپؐ نے لوگوں کے سامنے واقعہ کا اظہار کیا تو کفار نے تکذیب کی اور خوب مذاق اڑایا۔ اگر معاملہ صرف خواب کا ہوتا تو تکذیب بے معنی تھی!

۶ــــ علاوہ ازیں مشرکین نے آپؐ سے بیت المقدس کا نقشہ معلوم کیا۔ آپؐ سے قافلوں کے احوال دریافت کئے، جو سب آنحضرت ﷺ نے بتلادیئے اور ان لوگوں نے تصدیق بھی کی کہ آپ نے بیت المقدس کا نقشہ تو بالکل صحیح بتایا ہے پس اگر یہ معاملہ محض خواب کا ہوتا تو وہ کوئی انوکھی بات نہیں تھی، پھر یہ سب امتحان کرنے کی کیا ضرورت تھی؟

اور آیت ۶۰ میں جو اس واقعہ کو رؤیا کہا گیا ہے تو ترجمان القرآن حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ نے اس کی تفسیر یہ کی ہے کہ وہ ''رؤیا'' آنکھ کا دیکھنا تھا جو شب معراج میں آپ کو دکھایا گیا تھا۔ تفصیل کے لئے اسی آیت کی تفسیر دیکھیں۔

تیسرا فائدہ معراج کا واقعہ کب پیش آیا؟ اس سلسلہ میں سن، ماہ، تاریخ اور دن سب میں اختلاف ہے۔ سن میں چار قول ہیں ۵ نبوی، ۶ نبوی، ۱۱ نبوی اور ۱۲ نبوی اور مہینہ کے بارے میں پانچ قول ہیں ماہ ربیع الاول، ربیع الآخر، رجب، رمضان اور شوال۔ اور تاریخ کے بارے میں دو قول ہیں ۱۷ اور ۲۷۔ اور دن کے بارے میں تین قول ہیں بار کی رات، جمعہ کی رات اور پیر کی رات اور لوگوں میں مشہور یہ ہے کہ معراج کا واقعہ ہجرت سے ایک سال پہلے ۲۷ رجب کی شب میں پیش آیا ہے واللہ اعلم۔

چوتھا فائدہ: اللہ تعالیٰ اپنی ذات میں تو اطلاقی شان رکھتے ہیں مگر مخلوق کے ساتھ معاملہ کرنے میں ــــ اپنی کسی کمزوری کی بنا پر نہیں بلکہ مخلوق کی کمزوریوں کی بنا پر ــــ محدود وسائط اختیار فرماتے ہیں مثلاً جب کسی مخلوق سے کلام فرماتے ہیں ــــ جیسے کوہ طور پر موسیٰ علیہ السلام سے کلام فرمایا ــــ تو کلام کا ایک محدود طریقہ اختیار فرماتے ہیں تا کہ انسان اللہ کا کلام سن سکے اور سمجھ سکے۔ اسی طرح جب وہ اپنے کسی بندے کو عجائبات قدرت دکھانا چاہتے ہیں تو اسے لے جاتے ہیں اور جہاں جو چیز دکھانی ہوتی ہے اسی جگہ دکھاتے ہیں۔ یہی معاملہ اللہ تعالیٰ کی بارگاہ میں باریابی کا بھی ہے کہ اللہ تعالیٰ بذاتِ خود کسی مکان میں محدود نہیں، مگر بندہ ان کی ملاقات کے لئے بہرحال کسی جگہ کا محتاج ہے جہاں اس کے لئے تجلیات کو مرکوز کیا جاتا ہے ورنہ اللہ تعالیٰ کی اطلاقی شان کے ساتھ بندہ کے لئے ملاقات ممکن نہیں۔

پانچواں فائدہ: اور یہ جو بعض روایات میں آیا ہے کہ معراج سے واپسی پر ہنوز بستر گرم تھا یا دروازے کا کنڈا ہل رہا تھا، یا راستہ میں درخت کی ایک ٹہنی سے آپؐ کا عمامہ چھوگیا تھا جس کی وجہ سے وہ ہلنے لگی تھی جب واپسی ہوئی تو دیکھا کہ وہ ہنوز ہل رہی ہے —— یہ سب روایات اللہ جانیں کیسی ہیں، مجھے ان کی سندوں کا حال معلوم نہیں بلکہ کسی معتبر کتاب میں ان کا ہونا بھی معلوم نہیں۔ اور ابن کثیر رحمہ اللہ نے احادیث کا جو خلاصہ لکھا ہے اس کی روشنی میں تو یہ سب روایات بے اصل معلوم ہوتی ہیں۔

شب معراج میں عبادت کرنا مشروع نہیں (روح المعانی) پس دوسری رسومات کیسے جائز ہوسکتی ہیں؟! معراج کی سب سے بڑی یادگار پانچ نمازیں ہیں

وَاٰتَيْنَا مُوْسَى الْكِتٰبَ وَجَعَلْنٰهُ هُدًى لِّبَنِيْٓ اِسْرَاۗءِيْلَ اَلَّا تَتَّخِذُوْا مِنْ دُوْنِيْ وَكِيْلًا ۝۲ ذُرِّيَّةَ مَنْ حَمَلْنَا مَعَ نُوْحٍ ۭ اِنَّهٗ كَانَ عَبْدًا شَكُوْرًا ۝۳

وَاٰتَيْنَا	اور دی ہم نے	اَلَّا [۲]	کہ نہ	حَمَلْنَا	سوار کیا ہم نے
مُوْسَى	موسیٰ کو	تَتَّخِذُوْا	بناؤ تم	مَعَ نُوْحٍ	نوح کے ساتھ
الْكِتٰبَ	کتاب (تورات)	مِنْ دُوْنِيْ	میرے سوا	اِنَّهٗ	بلاشبہ
وَجَعَلْنٰهُ	اور بنایا ہم نے اس کو	وَكِيْلًا [۳]	کوئی کارساز	كَانَ	تھے وہ
هُدًى [۱]	راہ نما	ذُرِّيَّةَ [۴]	اے نسل	عَبْدًا	بندے
لِّبَنِيْٓ اِسْرَاۗءِيْلَ	بنی اسرائیل کے لئے	مَنْ	ان لوگوں کی جن کو	شَكُوْرًا	شکرگزار

گذشتہ آیت میں اسراء کا تذکرہ تھا۔ اب بنی اسرائیل کی بدکرداریوں کا بیان شروع ہورہا ہے۔ ان کو پہلے ان کا ماضی یاد دلایا جاتا ہے کہ ہم نے تم کو تین نعمتوں سے سرفراز کیا تھا۔ ارشاد ہے —— ہم نے موسیٰ کو کتاب دی، اور اس کو بنی اسرائیل کے لئے راہ نما بنایا (اور حکم دیا) کہ میرے سوا کسی کو کارساز نہ بناؤ، اے نسل ان لوگوں کی جن کو ہم

(۱) هُدًى مفعول ثانی ہے جعل کا، اور لبنی اسرائیل متعلق ہے هُدًى (مصدر) سے (۲) اَلَّا دو حرف ہیں اَنْ تفسیر یہ اور لَا نامیہ، اور نون کا لام میں ادغام کیا گیا ہے اور یہ تورات کے ہدایت ہونے کے مختلف پہلوؤں میں سے ایک پہلو کا بیان ہے (۳) وَكِيْلًا (صفت مشبہ) مفعول بہ ہے۔ لَاتَتَّخِذُوْا کا، اور من دونی ظرف مستقر ہوکر وكيلاً کی صفت ہے۔ رعایت فاصلہ کی وجہ سے مقدم کی گئی ہے۔ أی و كيلاً كائنًا من دونی. (۴) ذرية منصوب علی النداء ہے اور منصوب علی الاختصاص بھی ہوسکتا ہے۔

نے نوحؑ کے ساتھ کشتی میں سوار کیا تھا! نوح بلاشبہ شکر گزار بندے تھے ـــــ ان آیات میں اللہ تعالیٰ کی تین عظیم نعمتوں کا بیان ہے۔اور بنی اسرائیل کو نصیحت بھی کی گئی ہے کہ خدائے واحد کے علاوہ کسی کو کارساز نہ بنائیں۔

وکیل: اس شخص کو کہتے ہیں جس کو اپنے معاملات سپرد کئے جائیں۔اوراس پر مکمل اعتماد کیا جائے۔تمام انبیا کی شریعتوں میں بنیادی حکم یہ رہا ہے کہ اللہ جل شانہ کے علاوہ کسی کو وکیل مطلق نہ بنایا جائے۔کیونکہ کارساز اللہ تعالیٰ ہی ہیں۔وہی بندوں کے سب کام بناتے ہیں دوسرا کوئی ایسا نہیں ہے جو کسی کا کام بنا سکے۔پس اللہ تعالیٰ کی حق شناسی اور شکر گزاری کا مقام یہ ہے کہ انہی کے در سے وابستہ رہا جائے۔حضرت نوح علیہ السلام کو دیکھو وہ اللہ کے بڑے شکر گذار بندے تھے، پس ان کی اولاد میں ان کی خوبو ہونی چاہئے۔

تین نعمتیں: ان آیتوں میں بنی اسرائیل کو جو تین نعمتیں یاد دلائی گئیں ہیں، وہ یہ ہیں:

پہلی نعمت ـــــ تورات شریف ـــــ اللہ تعالیٰ نے حضرت موسیٰ علیہ السلام کو طور پر بلا کر پہلے ہم کلامی کا شرف بخشا، پھر اپنی عظیم کتاب تورات عنایت فرمائی۔جو عیسیٰ علیہ السلام کے زمانہ تک بلکہ حضرت خاتم النّبیین ﷺ کے دور تک بنی اسرائیل کے لئے سامانِ ہدایت بنی رہی، کیونکہ تورات کے بعد نازل ہونے والی تمام کتابیں زبور وانجیل وغیرہ مستقل کتابیں نہیں تھیں۔بلکہ وہ تورات کے ضمائم تھے۔

دوسری نعمت ـــــ شکر گذار جد امجد ـــــ انسانوں کے دوسرے دادا حضرت نوح علیہ السلام ہیں۔آج روئے زمین پر جس قدر انسان موجود ہیں سب آپ ہی کی نسل سے ہیں۔سورۃ الصافات میں ہے: ﴿وَجَعَلْنَا ذُرِّيَّتَهُ هُمُ الْبٰقِيْنَ﴾ ترجمہ: ہم نے انہی کی نسل کو باقی رہنے والا بنایا۔طوفان نوح کے بعد کسی اور کی نسل نہیں چلی، آہستہ آہستہ سب کی نسلیں منقطع ہوگئیں، صرف آپؑ کے صاحب زادوں کی اولاد باقی رہی۔نوح علیہ السلام کو سب سے پہلا رسول ہونے کا شرف حاصل ہے، آپ سے پہلے صرف انبیاء مبعوث ہوتے تھے۔آپؑ ہی پہلے رسول ہیں جو مؤمنین وکفار سب کی طرف مبعوث کئے گئے ہیں۔آپ بڑے شکر گذار بندے تھے۔ساڑھے نوسو سال دشمنوں کے نرغے میں پھنسے رہے، مگر کبھی حرف شکایت زبان پر نہ لائے۔صبر وشکر ان کا شیوہ تھا، لہٰذا ان کی اولاد کو بھی ان کے نقش قدم پر چلنا چاہئے۔

تیسری نعمت ـــــ عام ہلاکت سے نجات ـــــ نوح علیہ السلام کے زمانہ میں پانی کا جو طوفان آیا تھا اور جس میں تمام انسان ہلاک ہوگئے تھے، وہ اس معنی کر کے عام طوفان تھا کہ جہاں تک انسانی آبادی پھیلی ہوئی تھی، اس سب جگہ کو طوفان نے گھیر لیا تھا۔وہ سیلاب روئے زمین پر ہر جگہ نہیں پھیلا تھا، اللہ تعالیٰ نے اس طوفان سے نوح علیہ السلام کو اور مؤمنین کو کشتی کے ذریعہ بچالیا۔اس آیت میں خاص طور پر بنی اسرائیل کو اور عام طور پر تمام انسانوں کو سمجھایا جارہا ہے کہ

تم انہی لوگوں کی اولاد ہو جن کو ہم نے عام ہلاکت سے بچالیا تھا، تم اللہ کی اس نعمت کو یاد کرو اور اس کا حق بجالاؤ۔ اپنے اسلاف کے نیک طریقہ پر چلو، تاکہ تم بھی عذاب سے بچ جاؤ اور خدا تعالیٰ کی نعمتوں سے سرفراز کیے جاؤ۔

صبر وشکر کامیابی کی کلید ہیں

وَقَضَيْنَآ اِلٰى بَنِىٓ اِسْرَآءِيْلَ فِى الْكِتٰبِ لَتُفْسِدُنَّ فِى الْاَرْضِ مَرَّتَيْنِ وَلَتَعْلُنَّ عُلُوًّا كَبِيْرًا ۝ فَاِذَا جَآءَ وَعْدُ اُوْلٰىهُمَا بَعَثْنَا عَلَيْكُمْ عِبَادًا لَّنَآ اُولِىْ بَاْسٍ شَدِيْدٍ فَجَاسُوْا خِلٰلَ الدِّيَارِ ۭ وَكَانَ وَعْدًا مَّفْعُوْلًا ۝ ثُمَّ رَدَدْنَا لَكُمُ الْكَرَّةَ عَلَيْهِمْ وَاَمْدَدْنٰكُمْ بِاَمْوَالٍ وَّبَنِيْنَ وَجَعَلْنٰكُمْ اَكْثَرَ نَفِيْرًا ۝ اِنْ اَحْسَنْتُمْ اَحْسَنْتُمْ لِاَنْفُسِكُمْ ۣ وَاِنْ اَسَاْتُمْ فَلَهَا ۭ فَاِذَا جَآءَ وَعْدُ الْاٰخِرَةِ لِيَسُوْۗءٗا وُجُوْهَكُمْ وَلِيَدْخُلُوا الْمَسْجِدَ كَمَا دَخَلُوْهُ اَوَّلَ مَرَّةٍ وَّلِيُتَبِّرُوْا مَا عَلَوْا تَتْبِيْرًا ۝ عَسٰى رَبُّكُمْ اَنْ يَّرْحَمَكُمْ ۚ وَاِنْ عُدْتُّمْ عُدْنَا ۘ وَجَعَلْنَا جَهَنَّمَ لِلْكٰفِرِيْنَ حَصِيْرًا ۝

وَقَضَيْنَآ (۱)	اور ہم نے بتادیا	مَرَّتَيْنِ	دومرتبہ	بَعَثْنَا	(تو) ہم بھیجیں گے
اِلٰى بَنِىٓ	اولاد کو	وَلَتَعْلُنَّ (۳)	اور تم ضرور سرکشی کرو گے	عَلَيْكُمْ	تم پر
اِسْرَآءِيْلَ	اسرائیل (یعقوب) کی	عُلُوًّا كَبِيْرًا	بڑی سرکشی	عِبَادًا لَّنَآ	اپنے بندے
فِى الْكِتٰبِ	کتاب (تورات) میں	فَاِذَا جَآءَ	پھر جب آئے گا	اُولِىْ بَاْسٍ (۴)	جنگ جو
لَتُفْسِدُنَّ (۲)	کہ تم ضرور خرابی پھیلاؤ گے	وَعْدُ	وعدہ	شَدِيْدٍ	سخت
فِى الْاَرْضِ	زمین میں	اُوْلٰىهُمَا	دو میں کا پہلا	فَجَاسُوْا (۵)	پس وہ گھس جائیں گے

(۱) قَضٰی (ض) قَضَاءَ الشیءَ: مضبوطی سے بنانا، پورا کرنا اور جب اِلٰی کے ذریعہ متعدی ہو تو معنی ہوتے ہیں طے کر کے پہنچانا، بتادینا اس صورت میں قَضٰی: اِیْحَاء کے معنی کو متضمن ہوتا ہے (۲) لَتُفْسِدُنَّ از باب افعال، فعل مضارع لام تاکید بانون تاکید ثقیلہ صیغہ جمع مذکر حاضر: قَضَیْنَا کا جواب ہے۔ کیونکہ قَضٰی قسم کے قائم مقام بھی ہے۔ کہا جاتا ہے قَضَاءُ اللّٰہِ لَاَفْعَلَنَّ کَذَا (۳) لَتَعْلُنَّ (فعل مضارع لام تاکید بانون تاکید ثقیلہ، صیغہ جمع مذکر حاضر) از عَلَا (ن) عُلُوًّا الشَّیْءُ: بلند ہونا۔ یہ لتفسدن پر معطوف ہے اور عُلُوًّا کَبِیْرًا مرکب توصیفی مفعول مطلق برائے تاکید ہے اور عُلُوٌّ کے مجازی معنی ہیں سرکشی کرنا (۴) بَاسٌ: ←

خِلٰلَ الدِّیَارِ (۱)	گھروں کے بیچ میں	نَفِیۡرًا (۵)	جماعت	الۡمَسۡجِدَ	مسجد میں
وَکَانَ (۲)	اور ہے وہ	اِنۡ اَحۡسَنۡتُمۡ	اگر اچھے کام کروگے	کَمَا	جس طرح
وَعۡدًا	وعدہ	اَحۡسَنۡتُمۡ	اچھے کام کروگے	دَخَلُوۡہُ	گھس گئے وہ اس میں
مَّفۡعُوۡلًا	پورا ہو کر رہنے والا	لِاَنۡفُسِکُمۡ	اپنے لئے	اَوَّلَ مَرَّۃٍ	پہلی بار
ثُمَّ رَدَدۡنَا	پھر لوٹائیں گے ہم	وَاِنۡ اَسَاۡتُمۡ	اور اگر برے کام کروگے	وَّلِیُتَبِّرُوۡا (۸)	اور تا کہ وہ برباد کرڈالیں
لَکُمُ	تمہارے لئے	فَلَہَا (۶)	تو (بھی) اپنے لئے ہے	مَا	اس چیز کو
الۡکَرَّۃَ (۳)	باری	فَاِذَا جَآءَ	پھر جب آئے گا	عَلَوۡا	(جس پر) وہ بلند ہوں
عَلَیۡہِمۡ	ان پر	وَعۡدُ الۡاٰخِرَۃِ	پچھلا وعدہ تو	تَتۡبِیۡرًا	برباد کرڈالنا
وَاَمۡدَدۡنٰکُمۡ (۴)	اور ہم مدد پہنچائیں گے تمکو		(ہم مسلط کریں گے تم	عَسٰی	ہوسکتا ہے
بِاَمۡوَالٍ	اموال سے		پر سخت جنگ جو بندے)	رَبُّکُمۡ	تمہارا رب
وَّبَنِیۡنَ	اور بیٹوں (سے)	لِیَسُوۡٓءٗا (۷)	تا کہ وہ بگاڑ دیں	اَنۡ یَّرۡحَمَکُمۡ	تم پر مہربانی فرمائے
وَجَعَلۡنٰکُمۡ	اور بنائیں گے ہم تم کو	وُجُوۡہَکُمۡ	تمہارے چہروں کو	وَاِنۡ عُدۡتُّمۡ	اور اگر تم لوٹے
اَکۡثَرَ	بڑی	وَلِیَدۡخُلُوا	اور تا کہ وہ گھس جائیں	عُدۡنَا	(تو) ہم لوٹیں گے

← لڑائی سختی، جنگ کی شدت۔ شَدِیۡدٌ صفت کاشفہ ہے (۵) جَاسَ (ن) جَوۡسًا الشيءَ: بہت انہاک سے تلاش کرنا۔ جَاسَ القومُ بين البيوت و الدُّوۡرِ: گھروں کے درمیان فساد مچادینا اوران کے اندر مال ومتاع کوڈھونڈھنا۔

---

(۱) خِلَالٌ جمع خَلَلٌ کی جیسے جِبَالٌ جمع جَبَلٌ کی جس کے معنی ہیں درمیان، بیچ، دو چیزوں کے درمیان کشادگی اور دیار، دار کی جمع ہے بمعنی گھر (۲) کَان کا اسم ضمیر مستتر ہے جو وَعۡدُ أولھما کی طرف راجع ہے (۳) كَرَّةٌ (اسم) لڑائی میں حملہ، باری ت وحدت کی ہے یعنی ایک بار لوٹنا (۴) اَمَدَّ الۡجیش: فوج کی مدد کرنا، کمک پہنچانا (۵) نَفِیۡر (صفت مشبہ) خاندان، کنبہ، جہادی دستہ۔ نفیر بمعنی نافر ہے یعنی وہ لوگ جو بوقت ضرورت ساتھ نکل کر جائیں نَفِیۡرًا تمیز ہے (۶) فَلَھَا میں ف جزائیہ ہے اور لَھَا کا مبتدا محذوف ہے أی فَاِسَاءَ تُکُمۡ لَھَا، ھَا کا مرجع نفس ہے اور علی کے بجائے لام مشاکلۃً لایا گیا ہے (۷) اِذَا جَاءَ وَعۡدُ الآخِرَۃ کی جزا محذوف ہے اور وہ ہے بَعَثۡنَا عَلَیۡکُمۡ عِبَادًا لَنَا اُوۡلِیۡ بَاۡسٍ شَدِیۡدٍ — اور لِیَسُوۡؤُا، بَعَثۡنَا محذوف سے متعلق ہے اور لِیَدۡخُلُوۡا اور لِیُتَبِّرُوۡا معطوف ہیں لِیَسُوۡؤُا پر — لِیَسُوۡؤُا وغیرہ میں لام بمعنی کَیۡ ہے یَسُوۡءُ (مضارع منصوب) سَاءَ (ن) سَوۡءًا فلانًا: ناپسندیدہ سلوک کرنا غمگین کرنا (۸) تَبَّرَہٗ (تفعیل) ہلاک کرنا۔ مجرد: تَبَرَ (س) تَبۡرًا: ہلاک ہونا — مآ موصولہ جملہ علوا صلہ، عائد محذوف أی عَلَوۡا علیه پھر موصول صلہ مل کر لیتبروا کا مفعول بہ — تَتۡبِیۡرًا مفعول مطلق برائے تاکید۔

وَجَعَلْنَا	اور بنایا ہم نے	جَهَنَّمَ لِلْكٰفِرِيْنَ	دوزخ کو کافروں کیلئے	حَصِيْرًا(۱)	قید خانہ

بنی اسرائیل کو ان کا ماضی یاد دلانے کے بعد، اب ان کو ان کی بدکرداریاں یاد دلائی جاتی ہیں۔ بنی اسرائیل وہ قوم ہے جس کو کسی وقت اللہ تعالیٰ نے سارے جہاں پر فضیلت بخشی تھی، مگر جب وہ قوم ایمان وتقوی سے ہٹی، شرک وکفر اور فسق وفجور کے دلدل میں پھنسی، تو عذابِ الٰہی نے ان کو آ گھیرا، کیونکہ اللہ تعالیٰ کا کسی قوم سے کوئی رشتہ ناتا نہیں کہ وہ جو کچھ بھی کرتی رہے: مقبول بارگاہ بنی رہے۔

بنی اسرائیل نے ماضی میں دو مرتبہ سرکشی کی ہے، اور دونوں ہی مرتبہ سزا پائی ہے۔ اب ان کے لئے سنبھلنے کا ایک تیسرا موقعہ آیا ہے، مگر وہ نابکار قوم یہ سنہری موقعہ بھی کھودے گی:

بنی اسرائیل کی بدکرداری اور سزایابی کا پہلا واقعہ —— اور ہم نے بنی اسرائیل کو کتاب (توارت) میں یہ بات جتادی تھی کہ تم ضرور زمین میں دو بار فساد پھیلاؤ گے، اور یہ وعدہ پورا ہوکر رہنے والا ہے —— چنانچہ ۶۸۶ قبل مسیح میں جب بنی اسرائیل کی سرکشی کا پارہ چڑھ گیا، تو بابل ونینوی کے تاجدار بخت نصّر نے ان پر حملہ کیا، خون کی ندیاں بہادیں، اور سب کو تاخت وتاراج کردیا۔

پہلے واقعہ کے بعد کے احوال —— پھر ہم ان پر تمہیں غلبہ دیں گے —— چنانچہ دارائے اول (سارس یا مورس) شاہِ ایران نے جو بنی اسرائیل کا ہمدرد اور بہی خواہ تھا، بابل پر حملہ کیا، کلدانیوں کو شکست دی، اور ان کے ملک پر قبضہ کرلیا۔ اور ۵۵۹ قبل مسیح میں جب یہودیوں کو جلاوطنی سے نجات دی، اور وطن لوٹ کر بیت المقدس دوبارہ آباد کرنے کی اجازت دی، تب بنی اسرائیل کے دن پھرے —— اور ہم تمہاری دولت اور بیٹوں کے ذریعہ مدد کریں گے اور تمہاری تعداد بڑھا دیں گے —— یعنی تمہاری جو دولتیں اور جائدادیں چھین لی گئی تھیں، وہ تمہیں واپس مل جائیں گی اور مزید دولتیں بھی برسیں گی اور تمہیں خوب اولاد دی جائے گی تاکہ تمہاری نفری بڑھے، مگر قاعدہ سن لو —— اگر تم اچھے کام کروگے تو اپنے ہی نفع کے لئے کروگے، اور اگر برے کام کروگے تو خود ہی بھگتوگے —— یہ قانون قدرت ہے اور سب کے لئے عام ہے۔

دوسرا واقعہ —— پھر جب آخری موقعہ آئے گا (تو ہم دوبارہ اپنے سخت جنگ جو بندے بھیجیں گے) تاکہ وہ تمہارے چہرے بگاڑ دیں، اور مسجد (بیت المقدس) میں اسی طرح گھس جائیں، جس طرح پہلی بار گھس گئے تھے، اور

(۱) حَصِيْر: تنگ جگہ، جیل خانہ۔ حَصَرَ (ن) حَصْرًا تنگی میں ڈالنا، گھیرنا، حَصِيْر بمعنی اسم مفعول ہے اور یہ جعلنا کا مفعول ثانی ہے ۱۲

جس چیز پر ان کا ہاتھ پڑے اس کو تباہ و برباد کر دیں ـــــ یہ واقعہ ۷۰عیسوی میں پیش آیا جب بنی اسرائیل برائیوں میں بے قابو ہو گئے تو اللہ تعالیٰ نے رومی شہنشاہ ٹیطس (Titus) کو بنی اسرائیل پر مسلط کیا، جس نے یہودیوں کا مار مار کر بُھرکس نکال دیا۔ اور مسجد بیت المقدس کے بڑے حصہ کو اجاڑ دیا۔

تیسرا موقعہ ـــــ ہوسکتا ہے کہ تمہارا پروردگار تم پر مہربانی کرے اور اگر تم نے اپنی سابقہ روش کا اعادہ کیا تو ہم بھی اپنی سنت قدیمہ کا اعادہ کریں گے، اور ہم نے منکرین کے لئے جہنم کا جیل خانہ تیار کر رکھا ہے ـــــ افسوس! اس آخری موقعہ سے بھی انھوں نے فائدہ نہ اٹھایا، وہ ناہنجار قوم آخری پیغمبر محمد ﷺ پر بھی ایمان نہ لائی، الٹی برسرِ پیکار ہو گئی تو غزوۂ بنو قریظہ، غزوۂ بنو نضیر، غزوۂ خیبر اور فتح بیت المقدس کے مواقع پر رسوائیوں سے دوچار ہوئی اور یہ آخری موقعہ کھو دینے کے بعد ہمیشہ کے لئے ان پر ذلت و مسکنت کا ٹھپّہ لگ گیا۔

آیات پاک کی مذکورہ تفسیر ایک حدیث شریف کی روشنی میں کی گئی ہے جو حضرت حذیفہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے یہاں اس لمبی حدیث کا وہ حصہ پیش کیا جاتا ہے جو ان آیات کی تفسیر سے متعلق ہے:

حضرت حذیفہ رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ میں نے رسول اللہ ﷺ سے عرض کیا کہ بیت المقدس اللہ تعالیٰ کے نزدیک معظم و محترم، بلند مرتبہ اور عظیم القدر مسجد ہے۔ آپ ﷺ نے فرمایا: جی ہاں! دنیا کے سب گھروں میں وہ ایک ممتاز عظمت والا گھر ہے جس کو اللہ تعالیٰ نے سلیمان علیہ السلام کے لئے سونے چاندی، جواہرات و یاقوت اور زمرد سے بنایا تھا اور اس کی صورت یہ ہوئی تھی کہ جب سلیمان علیہ السلام نے اس کی تعمیر شروع کی تو اللہ تعالیٰ نے جنّات کو آپؑ کے تابع کر دیا۔ جنات کھانوں سے سونا چاندی لائے۔ اور وہ جواہرات، یاقوت اور زمرد بھی لائے، اللہ تعالیٰ نے سلیمان علیہ السلام کے لئے جنات کو مسخر کر دیا تھا۔ چنانچہ انھوں نے اس جمع کئے ہوئے مواد سے مسجد بنائی۔

حضرت حذیفہ رضی اللہ عنہ نے دریافت کیا کہ یا رسول اللہ! پھر بیت المقدس سے یہ چیزیں کیسے چھین لی گئیں؟ آنحضور ﷺ نے فرمایا کہ: ''جب بنی اسرائیل نے اللہ تعالیٰ کی نافرمانی شروع کی اور انبیاء کو قتل کیا تو اللہ تعالیٰ نے ان پر بخت نصر بادشاہ کو مسلط کر دیا، جو مجوسی تھا اس کے خاندان نے سات سو سال تک حکومت کی تھی۔ ارشاد باری: ''پھر جب ان دو میں سے پہلا موقعہ آئے گا تو ہم اپنے سخت جنگ جو بندے بھیجیں گے جو گھروں میں گھس پڑیں گے اور یہ پہلا وعدہ پورا ہو کر رہنے والا ہے'' اس میں اس طرف اشارہ ہے۔ چنانچہ اس نے حملہ کیا اور اس کا لشکر بیت المقدس میں گھس گیا اور مردوں کو تہ تیغ کیا اور عورتوں اور بچوں کو قید کیا اور بیت المقدس کے تمام اموال اور سونے چاندی اور جواہرات کو لوٹ کر لے گیا۔ اور سو سال تک بنی اسرائیل سے بیگار لیتا رہا ان کو اپنا غلام بنا کر طرح طرح

سے رسوا کرتا رہا اور سزا دیتا رہا۔

پھر اللہ تعالیٰ نے ان پر رحم کھایا اور فارس کے بادشاہوں میں سے ایک بادشاہ کو اشارہ کیا کہ مجوسیوں کے دارالسلطنت بابل پر حملہ کرے اور جو بنی اسرائیل مجوسیوں کے ہاتھ میں قید ہیں ان کو چھڑائے، چنانچہ اس بادشاہ نے حملہ کر کے بابل کو فتح کر لیا اور باقی ماندہ بنی اسرائیل کو مجوسیوں کی قید سے آزاد کیا۔ اور جو زیورات وہ بیت المقدس سے لائے تھے ان کو بھی چھڑایا یوں اللہ تعالیٰ نے سب سامان حسب سابق بیت المقدس کو پھیر دیا اور اللہ تعالیٰ نے بنی اسرائیل سے فرمایا کہ اگر تم نافرمانی اور گناہ کرو گے تو ہم پھر تم کو قتل وقید کی سزا دیں گے۔

پھر جب بنی اسرائیل بیت المقدس لوٹ آئے تو پھر معاصی اور بداعمالیوں میں مبتلا ہو گئے۔ اس بار اللہ تعالیٰ نے ان پر روم کے بادشاہ قیصر [1] کو مسلط کیا اس نے بنی اسرائیل پر برّی اور بحری دونوں راستوں سے حملہ کیا اور ان کو قید کیا، قتل کیا اور اموال اور عورتوں کو لوٹا اور بیت المقدس کے تمام سامان وسامان کو لے گیا۔ (تفسیر قرطبی ۱۰:۲۲۲ التذکرہ ۲۶:۲ درمنثور)

الحاصل: اللہ تعالیٰ نے آسمانی کتابوں میں بنی اسرائیل کے متعلق یہ فیصلہ فرما دیا تھا کہ وہ جب تک اللہ تعالیٰ کی اطاعت کریں گے دارین میں کامیاب رہیں گے اور جب کبھی دین سے انحراف کریں گے، ذلیل وخوار ہوں گے اور دشمنوں کے ہاتھوں ان پر مار پڑے گی اور صرف وہی برباد نہیں ہوں گے بلکہ ان کا قبلہ بیت المقدس بھی دشمن کی زد میں آجائے۔ دشمن اس میں گھس کر اس کی بے حرمتی کریں گے اور توڑ پھوڑ اور لوٹ کھسوٹ مچائیں گے۔ اور یہ بنی اسرائیل کی سزا کا ایک باب ہوگا ـــــ پہلا واقعہ شریعت موسویہ کی خلاف ورزی کرنے کی وجہ سے پیش آیا تھا اور اس کی اطلاع تورات میں دیدی گئی تھی آج بھی احبار باب ۲۶ اور استثنا باب ۲۸ میں یہ تنبیہ موجود ہے اور دوسرا واقعہ شریعت عیسوی کو قبول نہ کرنے کی وجہ سے پیش آیا تھا اور اس کی اطلاع انجیل میں دیدی گئی تھی، اور آج بھی متی باب ۲۳ اور لوقا باب ۲۳ میں اشارے موجود ہیں۔ اور دیگر بہت سے صُحُفِ انبیائے بنی اسرائیل میں تفصیلات ہیں۔ اب تیسرا دور شریعت محمدیہ کا ہے جو قیامت تک چلے گا اس کی مخالفت کرنے کا بھی وہی انجام ہوگا۔ چنانچہ ایسا ہی ہوا کہ جن لوگوں نے شریعت محمدیہ اور اسلام کی مخالفت کی وہ مسلمانوں کے ہاتھوں جلاوطن اور ذلیل وخوار ہوئے اور ان کے قبلہ بیت المقدس پر بھی مسلمانوں کا قبضہ ہو گیا۔ فرق یہ رہا کہ پچھلے کافر بادشاہوں نے یہود کو بھی ذلیل وخوار کیا تھا اور ان کے قبلہ بیت المقدس

(۱) کہتے ہیں کہ روم کا یہ بادشاہ نہ عیسائی تھا اور نہ مجوسی، روم کے بادشاہوں میں عیسائیت سب سے پہلے قسطنطین اول نے قبول کی ہے۔ ''قیصر'' روم کے تمام بادشاہوں کا لقب تھا ۱۲

کی بھی بے حرمتی کی تھی، اور مسلمانوں نے جب بیت المقدس فتح کیا تو مسجد بیت المقدس جو صدیوں سے منہدم اور غیر آباد پڑی تھی اس کو از سر نو تعمیر کیا اور اس قبلہ انبیاء کے احترام کو بحال کیا۔

ایک عجیب فرق: اللہ تعالیٰ نے روئے زمین پر عبادت کرنے والوں کے لئے دو مسجدوں کو قبلہ بنایا ہے مگر قانون قدرت دونوں کے لئے الگ ہے، مسجد حرام کی حفاظت خود اللہ تعالیٰ نے اپنے ذمے لی ہے۔ جب ہاتھی والوں نے کعبہ شریف کو ڈھانا چاہا تو اللہ تعالیٰ نے ابابیل کو بھیج کر سارے لشکر کا بھوسا بنادیا۔ لیکن بیت المقدس کے متعلق یہ قانون نہیں۔ جب مسلمان گمراہی اور معاصی میں مبتلا ہوں گے: ان کی سزا کے طور پر ان سے یہ قبلہ چھین لیا جائے گا اور کفار اس پر غالب آجائیں گے (ماخوذ از معارف القرآن)

عِبَادَنَا اور عِبَادًا لَّنَا کا فرق ـــــ عِبَادَنَا کا ترجمہ ہے: ہمارے بندے۔ اس میں عباد کی ضمیر جمع متکلم کی طرف اضافت ہے اور یہ اضافت تشریف (مرتبہ بڑھانے) کے لئے ہے یعنی ہمارے مخصوص، محبوب اور پیارے بندے ـــــ اور عِبَادًا لَّنَا میں اضافت نہیں ہے بلکہ لام تملیک لایا گیا ہے یعنی ہمارے مملوک بندے، جن کے لئے محبوب ہونا تو درکنار، مسلمان ہونا بھی ضروری نہیں کیونکہ تکوینی طور پر سارے ہی انسان اللہ کے بندے ہیں خواہ وہ مسلمان ہوں یا کافر اب یہ بات آسانی سے سمجھ میں آئے گی کہ اللہ تعالیٰ نے بنی اسرائیل پر جن دشمنوں کو مسلط کیا تھا ان کے لئے عبادًا لّنا کیوں فرمایا عِبَادَنَا کیوں نہیں فرمایا؟ اس کی وجہ یہ ہے کہ وہ لوگ مسلمان نہیں تھے کافر تھے، اس لئے اللہ تعالیٰ نے ان کے لئے عِبَادَنَا کے بجائے عبادًا لّنا کی تعبیر اختیار فرمائی۔

بیت المقدس کے موجودہ حادثۂ جافعہ میں مسلمانوں کے لئے عبرت ـــــ بنی اسرائیل کے یہ واقعات قرآن کریم میں بیان کرنے کا ایک مقصد یہ بھی ہے کہ مسلمان سمجھیں کہ وہ بھی اس قانون خداوندی سے مستثنیٰ نہیں۔ دنیا میں ان کی عزت وشوکت اطاعت خداوندی کے ساتھ وابستہ ہے جب وہ اللہ ورسول کی اطاعت سے انحراف کریں گے تو ان کے دشمنوں کو ان پر مسلط کردیا جائے گا جن کے ہاتھوں ان کی مساجد کی بے حرمتی ہوگی۔

آج جو حادثۂ جافعہ بیت المقدس پر یہودیوں کے قبضہ کا اور اس کو آگ لگانے کا سارے عالم میں اسلام کو پریشان کئے ہوئے ہے حقیقت یہ ہے کہ یہ خدا اور رسول کو بھلا دینے اور ان کے احکام سے غافل ہونے کا نتیجہ ہے جب مسلمان قرآن وسنت سے بیگانہ ہوگئے اور دنیا کی شان وشوکت اور عیش وعشرت میں لگ گئے تو وہی قانون قدرت جو ان آیات میں بیان کیا گیا ہے سامنے آیا اور کروڑوں عربوں پر چند لاکھ یہودی غالب آگئے، انھوں نے ان کی جان ومال کو بھی نقصان پہنچایا اور ان کا قبلۂ اول بھی چھین لیا اور ایک ایسی قوم غالب آگئی جو دنیا میں سب سے زیادہ ذلیل وخوار سمجھی جاتی

ہے اس پر مزید یہ کہ وہ قوم نہ تعداد میں مسلمانوں کے مقابلہ میں کوئی حیثیت رکھتی ہے اور نہ مسلمانوں کے مجموعی سامان حرب کے مقابلہ میں اس کی کوئی حیثیت ہے اس سے یہ بھی معلوم ہوگیا کہ یہ واقعہ یہود کو کوئی عزت کا مقام نہیں دیتا، البتہ اس سے مسلمانوں کی سزا سوا ہوگئی! اور اس کا علاج بجز اس کے کچھ نہیں کہ مسلمان اپنی بداعمالیوں پر نادم ہوں اور سچی توبہ کریں، احکام خداوندی کی اطاعت میں لگ جائیں، سچے مسلمان بنیں غیروں کی نقالی چھوڑیں اور پرایوں پر اعتماد کے گناہ عظیم سے باز آئیں۔ اور جان لیں کہ وہ اسلحہ اور ساز وسامان جس سے بیت المقدس اور فلسطین پھر مسلمانوں کو واپس مل سکتے ہیں وہ انابت الی اللہ، آخرت پر یقین، اللہ تعالیٰ پر بھروسہ، نکوکاری اور خالص اسلامی جہاد ہے، اللہ تعالیٰ ہمارے حکمرانوں کو اور تمام مسلمانوں کو اس بات کے سمجھنے کی توفیق عطا فرماویں (آمین) (ماخوذ از معارف القرآن)

رذیلوں کا غلبہ ان کی رذالت کو زائل نہیں کرتا، البتہ اس سے شریفوں کی شرافت کا جنازہ نکل جاتا ہے!

إِنَّ هَٰذَا الْقُرْآنَ يَهْدِي لِلَّتِي هِيَ أَقْوَمُ وَيُبَشِّرُ الْمُؤْمِنِينَ الَّذِينَ يَعْمَلُونَ الصَّالِحَاتِ أَنَّ لَهُمْ أَجْرًا كَبِيرًا ﴿٩﴾ وَأَنَّ الَّذِينَ لَا يُؤْمِنُونَ بِالْآخِرَةِ أَعْتَدْنَا لَهُمْ عَذَابًا أَلِيمًا ﴿١٠﴾

ع

إِنَّ (۱)	بلاشبہ	لِلَّتِي	وہ (راستہ) جو	وَيُبَشِّرُ	اور خوشخبری دیتا ہے وہ
هَٰذَا الْقُرْآنَ	یہ قرآن	هِيَ	(کہ) وہ	الْمُؤْمِنِينَ	(اُن) مؤمنین کو
يَهْدِي	بتلاتا ہے (لوگوں کو)	أَقْوَمُ (۲)	بالکل سیدھا (ہے)	الَّذِينَ (۳)	جو

(۱) اِنَّ حرف مشبہ بالفعل، هذا القرآن اسم اشارہ مُشَارٌ اليہ مل کر اِنَّ کا اسم، يَهْدِي جملہ فعلیہ خبر ہے — لِلَّتِي میں لام حرف جر التي اسم موصول، هِيَ مبتدا، اقوم خبر۔ پھر جملہ اسمیہ خبریہ صلہ، پھر موصول صلہ مل کر الطريقة (راستہ) موصوف محذوف کی صفت۔ پھر موصوف صفت مل کر مجرور اور جار مجرور يهدي سے متعلق — اور يهدي کا مفعول بہ محذوف ہے أي يهدي الناس (۲) اَقْوَمُ اسم تفضیل ہے مگر اسم فاعل کے معنی میں ہے (کبیر) یعنی دوسری چیز کی بہ نسبت مصدری معنی کی زیادتی بیان نہیں کرتا بلکہ فی نفسہ مصدری معنی کے ساتھ اتصاف بیان کرتا ہے پس قرآن کریم کے بتائے ہوئے راستہ کی اقومیت (نہایت سیدھا ہونے) کو کسی دوسری کتاب کے بتائے ہوئے راستہ کی اقومیت سے موازنہ نہیں کیا جائے گا (۳) الذين موصول صلہ مل کر المؤمنين کی صفت ہے۔

يَعْمَلُوْنَ	کرتے ہیں	كَبِيْرًا	بڑا	بِالْاٰخِرَةِ	آخرت پر
الصّٰلِحٰتِ	نیک کام	وَّاَنَّ (۲)	اور یہ کہ	اَعْتَدْنَا (۳)	تیار کر رکھی ہے ہم نے
اَنَّ لَهُمْ (۱)	کہ ان کے لئے	الَّذِيْنَ	جو	لَهُمْ	ان کے لئے
اَجْرًا	ثواب (ہے)	لَا يُؤْمِنُوْنَ	نہیں ایمان رکھتے	عَذَابًا اَلِيْمًا	دردناک سزا

بنی اسرائیل کو دومرتبہ کے بعد جو آخری مرتبہ موقع دیا جائے گا: وہ اس کو بھی گنوادیں گے۔ ارشاد پاک: ﴿وَاِنْ عُدْتُّمْ عُدْنَا﴾ میں اس طرف اشارہ ہے کہ اگر تم پھر شرارت پر اتروگے تو ہم بھی اپنی سنتِ قدیمہ کے مطابق معاملہ کریں گے، اور اس کے بعد ان کے لئے کوئی موقع نہیں ہوگا۔ اس کے بعد ان کی جگہ دوسری امت کو کھڑا کیا جائے گا، اور دینی قیادت ان کو منتقل کردی جائے گی۔ یہ نئی امت حاملِ قرآن بن کر دنیا کے اسٹیج پر جلوہ گر ہوگی، اور قرآن کی ہدایت کے مطابق دنیا کی راہ نمائی کا فریضہ انجام دے گی۔ یہ قرآن کیسی کتاب ہے؟ —— بیشک یہ قرآن وہ راستہ بتاتا ہے جو نہایت سیدھا ہے —— یعنی منزل مقصود تک پہنچنے میں قریب بھی ہے آسان بھی ہے اور خطرات سے پاک بھی ہے —— البتہ بعض انسان اپنی کوتاہ فہمی سے قرآن کریم کے بتلائے ہوئے راستہ کو دشوار سمجھتے ہیں، انھیں اس راستہ پر چلنے میں موت نظر آتی ہے۔ مگر انسان کا نفع اسی راستہ پر چلنے میں ہے جو قرآن کریم بتاتا ہے —— اور قرآن کریم ان مؤمنین کو جو نیک کام کرتے ہیں خوش خبری سناتا ہے کہ ان کو بڑا ثواب ملنے والا ہے —— لہٰذا جو لوگ کامیابی اور نجات کے خواہش مند ہیں وہ اس سیدھی راہ پر چلیں جو قرآن کریم دکھاتا ہے، اگر وہ لوگ ایمان وعمل صالح اختیار کریں گے اور قرآن کریم کے بتائے ہوئے صاف اور کشادہ راستہ پر چلیں گے تو ان کو دنیا میں حیات طیبہ نصیب ہوگی اور آخرت میں جنت کی ابدی نعمتیں میسر آئیں گی —— اور ان لوگوں پر جو آخرت پر ایمان نہیں رکھتے خوش خبری سناتا ہے کہ ان کے لئے اللہ تعالیٰ نے دردناک سزا تیار رکھی ہے —— یعنی جو لوگ انجام سے بے خبر ہوکر، دنیا کی لذتوں اور شہوتوں میں غرق رہیں گے، اور آخرت کی فکر نہیں کریں گے، ان کو دنیا میں مکدّر زندگی نصیب ہوگی، اور آخرت میں وہ دردناک عذاب سے دوچار ہوں گے۔

(۱) اَنَّ حرف مشبہ بالفعل۔ لهم خبر مقدم اور أجرًا كبيرًا مرکب توصیفی اسم مؤخر۔ پھر جملہ يُبَشِّرُ کا مفعول ثانی (۲) جملہ اَنَّ معطوف ہے سابق جملہ اَنَّ پر اور عذاب کے لئے فعل بشارت یا تو مشاکلۃً استعمال کیا گیا ہے یا تهكُّمًا (ٹھٹھا کرنے کے طور پر) مُشاکلہ کے معنی ہیں مشابہت، یکسانیت اور فن بدیع میں مشاکلت یہ ہے کہ کسی معنی کو ایسے لفظ کے ذریعہ ادا کیا جائے جو اس کے لئے وضع نہیں کیا گیا ہے، لیکن اس سے ملا ہوا ہے جیسے: ﴿وَمَكَرُوْا وَمَكَرَ اللّٰهُ﴾ اس میں مَکَرِ ثانی بمعنی مکر نہیں، بلکہ بمعنی تدبیر ہے، کیونکہ مکر کی نسبت اللہ کی طرف نہیں ہوسکتی۔ (۳) جملہ اعتدنا خبر ہے اَنَّ کی ۱۲

فضائل قرآن

① ـــ مفسر قرآن حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما فرماتے ہیں: ''جو شخص قرآن پاک سیکھے، پھر قرآنی ہدایات کی پیروی کرے تو اللہ پاک اس کو دنیا میں گمراہی سے بچاتے ہیں اور قیامت کے دن سخت دار و گیر سے اس کی حفاظت فرمائیں گے (مشکوٰۃ حدیث ۱۹۰ باب الاعتصام الخ)

② ـــ حضرت عبد اللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے ایک مثال بیان فرمائی: ایک سیدھا راستہ ہے، جن پر دورویہ دیواریں ہیں، دیواروں میں کھلے ہوئے دروازے ہیں، جن پر منقش پردے پڑے ہوئے ہیں اور راستہ کے آخری کنارہ پر ایک پکارنے والا پکار رہا ہے کہ سیدھا چلا آ، دائیں بائیں مت مڑ، اور اس پکارنے والے سے اوپر ایک پکارنے والا ہے، جب بھی کوئی شخص ان پردوں میں سے کوئی پردہ کھولنا چاہتا ہے تو وہ پکارنے والا کہتا ہے: ''تیرا ناس ہو! اس کو مت کھول، اگر تو اس کو کھولے گا تو اس میں گھس جائے گا'' (ان پردوں کے پیچھے ایسی خوبصورت دنیا ہے کہ آدمی اس سے صرفِ نظر کر ہی نہیں سکتا)

پھر آنحضرت ﷺ نے مثال کی وضاحت فرمائی: ''وہ راستہ دین اسلام کا راستہ ہے اور کھلے ہوئے دروازے حرام کام ہیں اور ان پر لٹکائے ہوئے پردے اللہ تعالیٰ کی مقرر کردہ حدیں ہیں (اور ان کے پیچھے خواہشات ہیں) اور راستہ کے منتہی پر پکارنے والا قرآن کریم ہے اور اس سے اوپر پکارنے والا مؤمن کا ضمیر ہے (مشکوٰۃ حدیث ۱۹۱ و ۱۹۲)

③ ـــ حضرت علی رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں: میں نے رسول اللہ ﷺ کو یہ ارشاد فرماتے ہوئے سنا کہ ''ایک بڑا فتنہ آنے والا ہے'' میں نے عرض کیا: یا رسول اللہ! اس سے بچنے کی کیا سبیل ہے؟ آپؐ نے فرمایا: ''اللہ کی کتاب (اس فتنہ سے بچا سکتی ہے) اس میں گذشتہ امتوں کے (سبق آموز) واقعات ہیں۔ اور آئندہ کی اطلاعات ہیں۔ اور حال کے لئے فیصلے ہیں۔ قرآن کریم کے ارشادات فیصلہ کن ہیں، وہ دل لگی کی باتیں نہیں ہیں۔ جو بھی سرکش اس کو چھوڑے گا اللہ تعالیٰ اس کو توڑ دے گا اور جو قرآن سے ہٹ کر ہدایت تلاش کرے گا، اللہ اس کو گمراہ کر دے گا۔ قرآن کریم اللہ کی مضبوط رسّی ہے وہ پُر حکمت و نصیحت نامہ اور سیدھا راستہ ہے۔ قرآن کریم ہی ایک ایسی کتاب ہے جس سے خیالات میں کجی نہیں آتی زبانیں اس میں گڑبڑ نہیں کرتیں (یعنی تحریف نہیں کر سکتیں) اہل علم کبھی اس سے سیر نہیں ہوتے، وہ کثرت مزاولت سے پُرانا نہیں ہوتا (یعنی طبیعت اس سے کبھی نہیں اکتاتی) اس کے حیرت انگیز مضامین کبھی ختم نہیں ہوتے۔ قرآن کریم کی شان یہ ہے کہ جب اس کو جنات نے سنا تو بے اختیار پکار اٹھے: ''ہم نے ایک عجیب قرآن سنا،

جو بھلائی کی طرف راہ نمائی کرتا ہے، سو ہم اس پر ایمان لے آئے'' (سورۃ الجن آیت ۱و۲) جس نے قرآن کریم کے موافق بات کہی اس نے سچی بات کہی، اور جس نے قرآن کریم پر عمل کیا تو وہ اجر وثواب کا حقدار بنا، اور جس نے قرآن کے موافق فیصلہ کیا اس نے عدل وانصاف والا فیصلہ کیا اور جس نے قرآن کی طرف دعوت دی اس نے سیدھا راستہ پایا (مشکوٰۃ حدیث ۲۱۳۸ فضائل القرآن)

قرآن پاک کی بے انتہا عظمت کا راز یہ ہے کہ وہ اللہ کا کلام ہے

وَيَدْعُ الْإِنْسَانُ بِالشَّرِّ دُعَاءَهُ بِالْخَيْرِ ۖ وَكَانَ الْإِنْسَانُ عَجُولًا ﴿١١﴾ وَجَعَلْنَا اللَّيْلَ وَالنَّهَارَ آيَتَيْنِ ۖ فَمَحَوْنَا آيَةَ اللَّيْلِ وَجَعَلْنَا آيَةَ النَّهَارِ مُبْصِرَةً لِتَبْتَغُوا فَضْلًا مِنْ رَبِّكُمْ وَلِتَعْلَمُوا عَدَدَ السِّنِينَ وَالْحِسَابَ ۚ وَكُلَّ شَيْءٍ فَصَّلْنَاهُ تَفْصِيلًا ﴿١٢﴾

وَيَدْعُ (١)	اور مانگتا ہے	عَجُولًا (٣)	بڑا جلد باز	وَجَعَلْنَا	اور بنایا ہم نے
الْإِنْسَانُ	انسان	وَجَعَلْنَا	اور بنایا ہم نے	آيَةَ النَّهَارِ	دن کی نشانی کو
بِالشَّرِّ	برائی	اللَّيْلَ	رات کو	مُبْصِرَةً (٧)	روشن
دُعَاءَهُ (٢)	جیسے مانگتا ہے	وَالنَّهَارَ	اور دن کو	لِتَبْتَغُوا	تاکہ تم تلاش کرو
بِالْخَيْرِ	بھلائی	آيَتَيْنِ (٤)	دو نشانیاں	فَضْلًا	روزی
وَكَانَ	اور ہے	فَمَحَوْنَا (٥)	پس دُھندلا کیا ہم نے	مِنْ رَبِّكُمْ	اپنے پروردگار سے
الْإِنْسَانُ	انسان	آيَةَ اللَّيْلِ (٦)	رات کی نشانی کو	وَلِتَعْلَمُوا (٨)	اور تاکہ تم جان لو

(۱) دَعَا (ن) دُعَاءً: پکارنا، بلانا دَعَابِهٖ: مانگنا، درخواست کرنا۔ یَدْعُ کی اصل یَدْعُوْ ہے اور فعل مضارع مرفوع ناقص ہے، لام کلمہ حرف علت ہے اور آگے لام ساکن آرہا ہے اس لئے جب عین کو لام سے ملایا جائے گا تو واو نہیں پڑھا جائے گا اس لئے رسم الخط سے بھی اس کو حذف کردیا، قرآن میں اس کی متعدد مثالیں ہیں جیسے: سَنَدْعُ الزَّبَانِيَةَ اور يُنَادِ الْمُنَادِ وغیرہ (۲) دُعَاءَهٗ منصوب بنزع خافض ہے کاف حرف تشبیہ محذوف ہے اور دُعَاءَهٗ میں مصدر کی اضافت فاعل کی طرف ہے (۳) عجول مبالغہ کا وزن ہے، عَجَلٌ سے (۴) آیتین جعل کا مفعول ثانی ہے اور جَعَلَ بمعنی صَيَّرَ ہے (۵) فَمَحَوْنَا میں ف تفسیریہ ہے۔ مَحَا (ن) مَحْوًا: مٹانا، اثر زائل کرنا (۶) آیۃ اللیل اور آیۃ النہار میں اضافت بیانیہ ہے یعنی شب وروز خود نشانیاں ہیں (۷) مبصرۃ: دکھانے والا، دن حقیقت میں دکھانے والا نہیں بلکہ دن میں اللہ تعالیٰ دکھاتے ہیں پس آیت میں مجاز عقلی ہے (۸) لتعلموا کا لتبتغوا پر عطف ہے اور دونوں جعلنا سے متعلق ہیں۔

عَدَدَ	گنتی	وَالْحِسَابَ(۱)	اور حساب	فَصَّلْنٰهُ	ہم نے کھول کر بیان کیا
السِّنِيْنَ	برسوں (کی)	وَكُلَّ شَيْءٍ(۲)	اور ہر چیز کو	تَفْصِيْلًا	تفصیل سے

قرآن کریم ان لوگوں کو جو آخرت پر یقین نہیں رکھتے: دردناک عذاب کی خوش خبری سناتا ہے، جیسا کہ گذشتہ آیت میں سنائی ہے۔ مگر منکرِ آخرت جب عذاب، آخرت اور قیامت کا تذکرہ سنتے ہیں تو کہتے ہیں: اگر دردناک عذاب کی یہ خبر صحیح ہے تو اللہ تعالیٰ ہم پر آسمان سے پتھر کیوں نہیں برساتے، یا کوئی اور دردناک عذاب کیوں نہیں بھیجتے! (الانفال آیت ۳۲) اور قیامت ہی میں یہ سزا ملنی ہے تو قیامت آ کیوں نہیں جاتی؟ اس کے آنے میں دیر کیوں لگ رہی ہے؟ (العنکبوت آیت ۵۴)

اللہ تعالیٰ ارشاد فرماتے ہیں —— اور انسان برائی بھی اُسی طرح مانگتا ہے، جس طرح وہ بھلائی مانگتا ہے، اور انسان بڑا جلد باز ہے —— یعنی انسان کا حال عجیب ہے، وہ برائی بھی اسی اشتیاق سے مانگتا ہے، جس اشتیاق سے بھلائی مانگتا ہے۔

بات دراصل یہ ہے کہ اسے موت کے بعد کی زندگی کا یقین ہی نہیں۔ حالانکہ وہ زندگی ضروری ہے۔ اللہ تعالیٰ نے دنیا و آخرت کا جوڑ بنایا ہے جس طرح اللہ تعالیٰ نے رات دن کا جوڑ بنایا ہے۔ دونوں سے مل کر انسان کی ضرورتیں پوری ہوتی ہیں اسی طرح دنیا و آخرت بھی جوڑا ہے اور ایک کے مقصد کی تکمیل دوسرے کے ذریعہ ہوتی ہے ارشاد ہے —— اور ہم نے رات اور دن کو دو نشانیاں بنایا۔ سو ہم نے رات کی نشانی کو تو دھندلا بنایا اور دن کی نشانی کو روشن بنایا تاکہ تم اپنے پروردگار کی روزی تلاش کرو اور تاکہ تم سالوں کی گنتی اور حساب جانو اور ہم نے ہر چیز کو خوب کھول کر بیان کیا ہے —— اللہ تعالیٰ نے رات دن کا جو جوڑا بنایا ہے اس میں انسان کی بے شمار مصلحتیں ہیں، انسانی ضروریات کی تکمیل دونوں سے مل کر ہوتی ہے۔ اگر صرف رات ہوتی دن نہ ہوتا تو زندگی گذارنے میں طرح طرح کی مشکلات پیش آتیں۔ لوگ ہمہ وقت اندھیروں میں ٹامک ٹوئیاں مارتے رہتے اور اگر صرف دن ہوتا، رات نہ ہوتی تو سکون نام کو بھی نصیب نہ ہوتا۔ انسان کماتے کماتے براحال ہو جاتا —— اسی طرح اللہ تعالیٰ نے دنیا اور آخرت کا جوڑا بنایا ہے۔ ایک کے مقاصد کی تکمیل دوسرے کے ذریعہ ہوتی ہے اگر صرف دنیا ہوتی، آخرت نہ ہوتی تو نیکی اور بدی کا فرق کبھی ظاہر نہ ہوتا، نیکوکار اور بدکار یکساں ہو کر رہ جاتے اور اگر صرف آخرت ہوتی دنیا نہ ہوتی تو جزاء وسزا کی بنیاد کیا ہوتی؟ جنت وجہنم کی زندگی کن اعمال کا بدلہ ہوتی؟ غرض جس طرح صرف دن سے یا صرف رات سے انسان کی مصلحتیں پوری نہیں ہوتیں اسی طرح صرف دنیا سے یا صرف آخرت سے مقصدِ حیات کی تکمیل نہیں ہوتی۔ بامقصد زندگی کے لئے دنیا کے ساتھ آخرت کا جوڑا ضروری ہے۔

(۱) الحساب کا عَدَدَ پر عطف ہے (۲) كُلَّ شَيْءٍ منصوب بر بنائے اشتغال ہے۔ فعل محذوف کی تفسیر بعد والا فعل کرتا ہے ۱۲

آیت کریمہ میں غور کرنے کا ایک پہلو یہ بھی ہے کہ لوگ کیلنڈر بنا کر جو وقت شماری کرتے ہیں وہ آخر کس چیز کا انتظار کرتے ہیں؟ اور کس منزل کی طرف بڑھ رہے ہیں؟ مثلاً ایک ملازم دن گنتا ہے تو اس کا مطلب یہ ہے کہ وہ تنخواہ کا انتظار کر رہا ہے۔ ایک راہ رو راستہ کی منزلیں اور کلومیٹر گنتا ہے تو اس کا مطلب یہ ہے کہ وہ کسی جگہ پہنچنا چاہتا ہے۔ انسان اپنی زندگی کے ماہ وسال گنتا ہے تو اس کا صاف مطلب یہ ہے کہ وہ موت کی طرف بڑھ رہا ہے پس لوگ جو کیلنڈر بنا کر دنیا کی عمر گنتے ہیں کیا وہ دنیا کی موت کا انتظار نہیں کر رہے؟ اگر دنیا کی زندگی دائمی ہوتی تو نہ کیلنڈر بنانے کی ضرورت تھی نہ سالوں کی گنتی کرنے کی، آخرت میں یہ سب چیزیں نہیں ہونگی کیونکہ وہ ابدی زندگی ہے۔

فائدہ: سورۂ یونس آیت ۵ میں نظام قمری کا بیان آیا ہے اور اس آیت میں نظام شمسی کا بیان ہے اور دونوں ہی سے کیلنڈر بنتے ہیں۔ بیشتر احکام شرعیہ میں مثلاً ماہ وسال کی تعیین، حج اور رمضان کے اوقات کی تعیین میں قمری کیلنڈر کا اعتبار ہے کیونکہ یہ حساب بہت آسان ہے اس کا مدار چاند کی رویت پر ہے جسے ہر شخص بسہولت ضبط کرسکتا ہے اور ہر موسم میں حج اور رمضان آسکتے ہیں اور بعض معمولی حسابات مثلاً روزں کی ابتدا اور انتہا (صبح صادق اور غرب آفتاب) اور نمازوں کے اوقات سورج کی روشنی سے متعلق ہیں۔ کیونکہ سورج کے طلوع وغروب اور رفتار کا اندازہ ہر شخص آسانی سے کرسکتا ہے۔ مگر شمسی کیلنڈر کا احکام شرعیہ میں اعتبار نہیں۔ کیونکہ وہ دقیق حساب پر مبنی ہے۔

قمری حساب یاد رکھنا اور اس کی حفاظت کرنا فرض کفایہ ہے کیونکہ بیشتر احکام شرعیہ کا اسی سے تعلق ہے

وَكُلَّ اِنْسَانٍ اَلْزَمْنٰهُ طٰٓئِرَهٗ فِيْ عُنُقِهٖ ۭ وَنُخْرِجُ لَهٗ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ كِتٰبًا يَّلْقٰىهُ مَنْشُوْرًا ﴿۱۳﴾ اِقْرَاْ كِتٰبَكَ ۭ كَفٰى بِنَفْسِكَ الْيَوْمَ عَلَيْكَ حَسِيْبًا ﴿۱۴﴾ۭ مَنِ اهْتَدٰى فَاِنَّمَا يَهْتَدِيْ لِنَفْسِهٖ ۚ وَمَنْ ضَلَّ فَاِنَّمَا يَضِلُّ عَلَيْهَا ۭ وَلَا تَزِرُ وَازِرَةٌ وِّزْرَ اُخْرٰى ۭ وَمَا كُنَّا مُعَذِّبِيْنَ حَتّٰى نَبْعَثَ رَسُوْلًا ﴿۱۵﴾

وَكُلَّ اِنْسَانٍ (۱)	اور ہر انسان پر	اَلْزَمْنٰهُ	چپکایا ہم نے اس پر	طٰٓئِرَهٗ (۲)	اس کا پرندہ (نامۂ اعمال)

(۱) كُلَّ انسانٍ منصوب علی الاشتغال ہے أی ألزمنا كلَّ انسانٍ ـــــ ألزم إلزامًا: لازم کرنا لگا دینا۔ لَزِمَ (س) لُزُوْمًا الشیءُ: لازم ہونا۔ (۲) الطائر (اسم فاعل) پرندہ، اڑنے والا۔ جمع طَيْرٌ اور طُيُوْرٌ آیت پاک میں نامۂ اعمال مراد ہے کیونکہ وہ قیامت کے دن اڑ کر ہاتھ میں آئیں گے۔

فِيْ عُنُقِهٖ	اس کی گردن میں	الْيَوْمَ	آج	فَاِنَّمَا	تو بس
وَنُخْرِجُ	اور نکالیں گے ہم	عَلَيْكَ	اپنے خلاف	يَضِلُّ	بے راہی اختیار کریگا
لَهٗ	اس کے لئے	حَسِيْبًا	حساب لینے کے لئے	عَلَيْهَا	اپنے نقصان کے لئے
يَوْمَ الْقِيٰمَةِ	قیامت کے دن	مَنِ	جو شخص	وَلَا تَزِرُ	اور نہیں بوجھ اٹھاتا
كِتٰبًا (۱)	نوشتہ	اهْتَدٰى	سیدھے راستے پر چلے گا	وَازِرَةٌ (۵)	کوئی بوجھ اٹھانے والا
يَّلْقٰهُ	جس سے وہ ملاقات کریگا	فَاِنَّمَا (۴)	تو بس	وِّزْرَ اُخْرٰى	دوسرے کا بوجھ
مَنْشُوْرًا (۲)	کھلا	يَهْتَدِيْ	سیدھے راستے پر چلے گا	وَمَا كُنَّا	اور ہم نہیں ہیں
اِقْرَاْ	پڑھ تو			مُعَذِّبِيْنَ	سزا دینے والے
كِتٰبَكَ	اپنا نامۂ اعمال	لِنَفْسِهٖ	اپنے نفع کے لئے	حَتّٰى	یہاں تک کہ
كَفٰى (۳)	کافی ہے	وَمَنْ	اور جو	نَبْعَثَ	بھیجیں ہم
بِنَفْسِكَ	تو بذاتِ خود	ضَلَّ	بے راہی اختیار کریگا	رَسُوْلًا	رسول

انسانوں کے لئے موت کے بعد بھی زندگی ہے، اور ابدی زندگی ہے۔ اس کی دوسری دلیل یہ ہے کہ انسان اور دیگر مخلوقات میں ایک فرق ہے۔ انسان جب اپنے اختیار سے کوئی کام کرتا ہے تو وہ عمل وجود میں آ کر ختم نہیں ہوجاتا بلکہ اس کے نفس کے ساتھ وابستہ ہوجاتا ہے۔ دل میں اس کا اثر باقی رہتا ہے اور دیگر مخلوقات کے اعمال وجود پذیر ہوکر ختم ہوجاتے ہیں۔ ان کے دلوں میں اس کا کوئی اثر باقی نہیں رہتا نہ ان کے نفوس ان اعمال سے متأثر ہوتے ہیں۔ مثلاً ایک جانور بھاگتا ہے اور اپنی جولان گاہ میں کسی کو زخمی کرتا ہے یا جان سے مار ڈالتا ہے تو اس کے دل کو کوئی احساس نہیں ہوتا کہ اس نے کوئی برا کام کیا۔ وہ بار بار نقصان پہنچاتا ہے اور اس کے نفس کا حال یکساں رہتا ہے۔ مگر انسان کی صورت حال جانوروں سے مختلف ہے جب اس سے کوئی زیادتی ہوجاتی ہے تو اول وہلہ میں وہ اپنے عمل سے متأثر ہوتا

(۱) کتابا مفعول بہ۔ نخرج کا اور وہ موصوف ہے اور صفت جملہ يَلْقَاهُ ہے (۲) مَنْشُوْرًا حال ہے مفعول کی ضمیر سے (۳) کفی فعل ماضی، بنفسك اس کا فاعل اور باء زائد۔ الیوم مفعول فیہ۔ حسيبًا تمیز اور علیك متعلق حسيبًا سے، رعایت فاصلہ کی وجہ سے مقدم کیا ہے۔ حسیبٌ فعیل کا وزن بمعنی فاعل ہے یعنی حساب لینے والا چونکہ یہ عَدَّ کے معنی کو متضمن ہے اس لئے اس کا صلہ علیٰ آیا ہے (۴) اِنَّمَا کلمۂ حصر ہے (۵) وَازِرَةٌ صفت ہے نَفْسٌ کی اور اُخری بھی ہے نفس کی اور یہ دونوں صفتیں موصوف کے قائم مقام ہیں۔ وَزَرَ يَزِرُ وُزْرًا الشَّئَ: اٹھانا۔ وَزَرَ الرَّجُلُ: بوجھل چیزوں کو پیٹھ پر اٹھانا۔ الوِزْرُ: گناہ، بھاری بوجھ، گٹھڑی۔ الوزیر: امور سلطنت میں بادشاہ کا معین ومددگار، حکومت کا بوجھ اٹھانے والا ۱۲

ہے۔ وہ نادم ہوتا ہے اپنے آپ کو ملامت کرتا ہے اور کوشش کرتا ہے کہ پھر وہ یہ غلطی نہ دُوہرائے یہ اس بات کی علامت ہے کہ اس کا کیا ہوا کام اس کے نفس کے ساتھ چپک گیا ہے ـــــ اعمال صالحہ کا معاملہ بھی ایسا ہی ہے جانور اگر کوئی اچھا کام کرتا ہے تو اسے کوئی خوشی نہیں ہوتی۔ اور انسان کا دل خوشی سے لبریز ہو جاتا ہے وہ پھولا نہیں سماتا اس کے تن بدن میں شادمانی کی لہر دوڑ جاتی ہے اور وہ تمنا کرتا ہے کہ آئندہ بھی وہ ایسے اچھے کام کرتا رہے ـــــ انسان اور غیر انسان کے اعمال میں یہ فرق اس بات کی واضح دلیل ہے کہ انسان کے لئے اس زندگی کے بعد دوسری زندگی آنے والی ہے اگر دوسری زندگی نہ ہوتی اور جزاؤ سزا کا معاملہ پیش آنا نہ ہوتا تو انسان کا حال دیگر مخلوقات سے مختلف نہ ہوتا۔ اس کے اعمال اس کے گلے کا ہار بنا کر نہ رکھے جاتے ان آیات میں یہی دلیل بیان کی جارہی ہے ـــــ اور ہم نے ہر انسان کا عمل اس کے گلے کا ہار بنا رکھا ہے ـــــ یعنی ہر شخص کا عمل وجود پذیر ہو کر ختم نہیں ہو جاتا بلکہ نفس کے دامن کے ساتھ وابستہ ہو جاتا ہے ـــــ اور قیامت کے دن ہم اس کا نامہ اعمال اس کے سامنے کردیں گے جسے وہ کھلی کتاب کی طرح پائے گا ـــــ یعنی انسان کے اعمال اس کے نفس کے ساتھ وابستہ ہی نہیں، بلکہ وہ باقاعدہ ریکارڈ بھی کر لیے گئے ہیں اور یہ سارا ریکارڈ کل قیامت کے دن اس کے سامنے آجائے گا اور وہ ایک کھلی کتاب ہوگی اور اس سے کہا جائے گا ـــــ اپنا نامۂ اعمال پڑھ آج تو خود اپنا حساب جانچنے کے لئے کافی ہے ـــــ تو خود فیصلہ کرلے، تیرے ساتھ کیا معاملہ کیا جانا چاہئے۔

اور جب یہ بات واضح ہوگئی کہ قیامت کا آنا اور آخرت میں پہنچنا ضروری ہے، تو اب یہ قاعدہ سن لیں ـــــ جو شخص راہ راست اختیار کرتا ہے وہ اپنے ہی نفع کے لئے راست روی اختیار کرتا ہے اور جو بے راہی اختیار کرتا ہے اس کی گمراہی کا وبال بھی اسی پر پڑنے والا ہے اور کوئی بوجھ اٹھانے والا دوسرے کا بوجھ نہیں اٹھائے گا ـــــ نہ کسی کے گناہوں کی گٹھڑی کسی پر لادی جائے گی نہ کوئی رضا کارانہ کسی کا بوجھ اٹھانے کے لئے تیار ہوگا۔ رشتہ دار بھی بھاگیں گے۔ ماں بیٹا ملیں گے، ماں کہے گی: میرے لاڈلے! کیا میری گود تیری خوابگاہ نہیں تھی؟ کیا میری چھاتی تیری غذا نہیں تھی؟ کیا میرا پیٹ تیرا برتن نہیں تھا؟ بیٹا کہے گا: کیوں نہیں! اے میری پیاری امی! اب ماں التجا کرے گی کہ میرے لخت جگر! میں آج گناہوں کے بوجھ میں دبی ہوئی ہوں۔ مہربانی کر، اور میرا ایک گناہ لے لے۔ بیٹا جواب دے گا: اماں پرے ہٹ! میں خود ہی آج اپنے گناہوں میں پھنسا ہوا ہوں۔ اپنا بوجھ ہی مجھ سے نہیں اٹھتا، تیرا بوجھ کیسے اٹھاؤں!

اس کے بعد منکرین کو سزا دہی کا قانون بتایا ہے ـــــ اور ہم سزا نہیں دیتے جب تک کوئی رسول نہیں بھیج دیتے ـــــ یعنی جب تک اتمام حجت نہیں کیا جاتا حق و باطل کی آویزش کا عملی فیصلہ نہیں کیا جاتا ـــــ اور یہ کام کیا جاچکا،

ہمارا رسول پہنچ چکا، اس نے دلسوزی سے سمجھادیا، اور حجت تام کردی، اب بھی اگر باز نہیں آؤ گے تو سنتِ الٰہی پوری ہوکر رہے گی۔

وَاِذَآ اَرَدْنَآ اَنْ نُّهْلِكَ قَرْيَةً اَمَرْنَا مُتْرَفِيْهَا فَفَسَقُوْا فِيْهَا فَحَقَّ عَلَيْهَا الْقَوْلُ فَدَمَّرْنٰهَا تَدْمِيْرًا ﴿۱۶﴾ وَكَمْ اَهْلَكْنَا مِنَ الْقُرُوْنِ مِنْۢ بَعْدِ نُوْحٍ ؕ وَكَفٰى بِرَبِّكَ بِذُنُوْبِ عِبَادِهٖ خَبِيْرًاۢ بَصِيْرًا ﴿۱۷﴾

وَاِذَآ	اور جب	فِيْهَا	اس (بستی) میں	مِنَ	امتیں
اَرَدْنَآ	ہم چاہتے ہیں	فَحَقَّ (۴)	پس ثابت ہوجاتی ہے	الْقُرُوْنِ	
اَنْ نُّهْلِكَ	کہ ہلاک کریں	عَلَيْهَا	اس (بستی) پر	مِنْۢ بَعْدِ نُوْحٍ	نوحؑ کے بعد
قَرْيَةً	کسی بستی کو	الْقَوْلُ	(اللہ کی) بات	وَكَفٰى	اور کافی ہے
اَمَرْنَا (۱)	(تو) ہم حکم دیتے ہیں	فَدَمَّرْنٰهَا (۵)	پس غارت کردیتے	بِرَبِّكَ	آپ کا رب
	(ایمان واطاعت کا)		ہیں ہم اس بستی کو	بِذُنُوْبِ	اپنے بندوں کے
مُتْرَفِيْهَا (۲)	اسکے خوش عیش لوگوں کو	تَدْمِيْرًا	پوری طرح غارت کرنا	عِبَادِهٖ (۷)	گناہوں کو
فَفَسَقُوْا (۳)	پس وہ حد سے تجاوز	وَكَمْ (۶)	اور بہت سی	خَبِيْرًا	جاننے
	کرتے ہیں	اَهْلَكْنَا	ہلاک کیں ہم نے	بَصِيْرًا	دیکھنے کے اعتبار سے

(۱) أَمَرْنَا جملہ جزائیہ ہے۔ اَمَرْنَا فعل بافاعل۔ مُتْرَفِيْهَا (مرکب اضافی) مفعول بہ بطاعة الله ظروف محذوف کما قاله ابن عباسؓ وسعید بن جبیر (الدرالمنثور) (۲) مُتْرَفِيْ اصل میں مُتْرَفِيْنَ (اسم مفعول جمع مذکر) ہے اضافت کی وجہ سے نون جمع گرگیا ہے اِتْرَاف (افعال) عیش دینا، خوش حالی دینا۔ مُتْرَف: خوش حال، فارغ البال اور عیش پرست آدمی (۳) فَسَقَ (ن،ض) فِسْقًا: حق وصلاح کے راستہ سے ہٹ جانا، بدکار ہونا اس مادہ میں خروج کے معنی ہیں کہا جاتا ہے فَسَقَ الرُّطَبُ عَنْ قِشْرِهٖ: کھجور اس کے چھلکے سے نکل آئی۔ پس شریعت کے مقررہ دائرہ سے باہر نکل جانا فسق ہے (۴) حَقَّ (ن،ض) حَقًّا وَحَقَّةً الأمرُ: ثابت وواجب ہونا (۵) دَمَّرَ تدمیرًا: خراب کرنا، ہلاک کرنا، اکھیڑ مارنا۔ دَمَرَ (ن) دُمُوْرًا: ہلاک ہونا اور مفعول مطلق تاکید ومبالغہ کے لئے ہے (۶) كَمْ خبریہ ہے مِنْ الْقُرُوْنِ اس کی تمیز ہے اور من تبیین کے لئے ہے اور من بعد میں مِنْ ابتدائے غایت کے لئے ہے (۷) بِذُنُوْبِ عِبَادِهٖ متعلق ہے خَبِيْرًا اور بَصِيْرًا سے علی سبيل التنازع اور ظرف کو رعایت فاصلہ کی وجہ سے مقدم کیا گیا ہے اور بربك فاعل ہے کفی کا اور باء زائد ہے اور خَبِيْرًا بَصِيْرًا نسبت سے تمیز ہے ۱۲

سنتِ الٰہی یہ ہے کہ دنیوی عذاب بعثتِ انبیاء سے پہلے تو نازل نہیں کیا جاتا، مگر انبیائے کرام کو بھیج کر حجت تام کردی جاتی ہے، تو عذاب آنے میں دیر بھی نہیں لگتی۔ ارشاد ہے: ـــــ اور جب ہم کسی بستی کو ہلاک کرنا چاہتے ہیں ـــــ یعنی اللہ کے علم میں جب کسی قوم کی، شامت اعمال کی وجہ سے، ہلاکت کا وقت قریب آجاتا ہے ـــــ تو ہم (پہلے) اس بستی کے خوش حال لوگوں کو (رسولوں کے ذریعہ ایمان واطاعت) کا حکم دیتے ہیں ـــــ یعنی اللہ تعالیٰ دفعۃً کسی بستی والوں کو نہیں پکڑتے، پہلے اتمام حجت کرتے ہیں، پھر سزا دیتے ہیں اور اتمام حجت کے لئے رسولوں کے ذریعہ ایمان واطاعت کا حکم دیا جاتا تھا ـــــ پھر وہ اس میں نافرمانیاں کرنے لگتے ہیں ـــــ پیغام خداوندی ٹھکرادیتے ہیں اور کھلے بندوں حکم عدولیاں کرتے ہیں ـــــ اور اس بستی پر اللہ کی بات چسپاں ہوجاتی ہے ـــــ یعنی بستی والے علانیہ جرم کرکے عذاب کے مستحق ہوجاتے ہیں ـــــ تو ہم اس بستی کو غارت کردیتے ہیں ـــــ یعنی اس کو صفحۂ ہستی سے مٹادیتے ہیں۔

مثالیں ـــــ اور ہم نے نوح کے بعد کتنی ہی نسلیں تباہ وبرباد کردیں ـــــ قوم نوح کی تباہی سے تو تم واقف ہی ہو اس کے بعد بھی ہم نے بہت سی قوموں کو تباہ کرڈالا، جیسے عاد وثمود، جن کا کرّوفر مثالی تھا۔ جب ان کا شر وفساد حد سے تجاوز کرگیا تو ان کو شجر ممنوعہ کی طرف جڑ مول سے اکھاڑ پھینکا ـــــ اور آپ کے رب اپنے بندوں کے گناہوں سے پوری طرح باخبر ہیں اور سب کچھ دیکھ رہے ہیں۔

آیت پاک میں خوش عیش مالداروں کا خصوصیت سے ذکر اس لئے کیا گیا ہے کہ عام لوگ حاکموں اور مالداروں کے اخلاق واعمال سے متأثر ہوتے ہیں اور جب بڑے لوگ بدعمل ہوجاتے ہیں تو پوری قوم بدعمل ہوجاتی ہے اور بڑے لوگ سنور جاتے ہیں تو چھوٹے خواہی نخواہی سنورنے پر مجبور ہوتے ہیں۔ مشہور کہاوت ہے **اَلنَّاسُ عَلَی دِیْنِ مُلُوْکِهِمْ** (لوگ اپنے بادشاہوں کے طور طریق اپناتے ہیں) چنانچہ جب سے برے لوگ برسر اقتدار آئے ہیں ساری دنیا بگاڑ سے بھر گئی ہے اور جب سے ناک والوں نے ریت رواج کی پابندی شروع کی ہے سارا معاشرہ رسوم میں پھنس گیا ہے۔ لہٰذا جن لوگوں کو اللہ تعالیٰ نے مال ودولت دی ہے ان کو اپنے اعمال واخلاق کی اصلاح کی سب سے پہلے اور سب سے زیادہ فکر کرنی چاہئے۔ اصلاح معاشرہ کی محنت بھی اسی وقت کامیاب ہوسکتی ہے جب پہلے بڑے سنور جائیں۔ حدیث شریف میں ہے کہ جو شخص اچھی راہ نکالتا ہے اس کو اس راہ پر چلنے کا ثواب بھی ملتا ہے اور جس قدر لوگ اس اچھی راہ پر چلیں گے ان کے اجر میں سے بھی اس اچھی راہ نکالنے والے کو حصہ ملے گا۔ یہی حال بری راہ چلانے والوں کا ہے۔ پس اگر آج بھی خوش عیش مسلمان عیش پرستی میں پڑ کر دین سے غافل ہوجائیں گے تو پوری قوم ان کی

راہ پر چل پڑے گی اور ساری قوم کے اعمال بد کا وبال ان بڑوں کو بھگتنا پڑے گا۔

مَنْ كَانَ يُرِيْدُ الْعَاجِلَةَ عَجَّلْنَا لَهٗ فِيْهَا مَا نَشَآءُ لِمَنْ نُّرِيْدُ ثُمَّ جَعَلْنَا لَهٗ جَهَنَّمَ ۚ يَصْلٰىهَا مَذْمُوْمًا مَّدْحُوْرًا ﴿١٨﴾ وَمَنْ اَرَادَ الْاٰخِرَةَ وَ سَعٰى لَهَا سَعْيَهَا وَهُوَ مُؤْمِنٌ فَاُولٰٓئِكَ كَانَ سَعْيُهُمْ مَّشْكُوْرًا ﴿١٩﴾ كُلًّا نُّمِدُّ هٰٓؤُلَآءِ وَهٰٓؤُلَآءِ مِنْ عَطَآءِ رَبِّكَ ؕ وَمَا كَانَ عَطَآءُ رَبِّكَ مَحْظُوْرًا ﴿٢٠﴾ اُنْظُرْ كَيْفَ فَضَّلْنَا بَعْضَهُمْ عَلٰى بَعْضٍ ؕ وَلَلْاٰخِرَةُ اَكْبَرُ دَرَجٰتٍ وَّ اَكْبَرُ تَفْضِيْلًا ﴿٢١﴾

مَنْ	جو شخص	جَعَلْنَا	تجویز کی ہے ہم نے	لَهَا	اس کے لئے
كَانَ يُرِيْدُ	چاہتا ہے	لَهٗ	اس کے لئے	سَعْيَهَا (۵)	آخرت والی کوشش
الْعَاجِلَةَ (۱)	دنیا	جَهَنَّمَ	دوزخ	وَهُوَ	درانحالیکہ وہ
عَجَّلْنَا	جلدی دیتے ہیں ہم	يَصْلٰىهَا (۲)	جلے گا وہ اس میں	مُؤْمِنٌ	مؤمن ہے
لَهٗ	اس کو	مَذْمُوْمًا (۳)	ملامت خوردہ	فَاُولٰٓئِكَ	تو یہ لوگ
فِيْهَا	دنیا میں	مَّدْحُوْرًا (۴)	دُھتکارا ہوا	كَانَ	ہے
مَا نَشَآءُ	جتنا چاہتے ہیں ہم	وَمَنْ	اور جو شخص	سَعْيُهُمْ	ان کی کوشش
لِمَنْ	جس کے لئے	اَرَادَ	چاہتا ہے	مَّشْكُوْرًا (۶)	مقبول
نُّرِيْدُ	چاہتے ہیں ہم	الْاٰخِرَةَ	آخرت کو	كُلًّا (۷)	ہر ایک کو
ثُمَّ	پھر	وَسَعٰى	اور کوشش کی ہے اس نے	نُّمِدُّ	کمک پہنچاتے ہیں ہم

(۱)عَاجِلَةٌ (اسم فاعل) جلدی آنے والی۔ مراد دنیا ہے اس کا موصوف محذوف ہے أى الدار العاجلة (جلدی والا گھر) پھر موصوف کو حذف کر کے صفت کو اس کے قائم مقام کر دیا ہے یہی تقدیر عبارت الدنیا اور الآخرۃ کی ہے (۲)يَصْلَاهَا جملہ مستانفہ ہے یا لَهٗ کی ضمیر سے حال ہے صَلِيَ(س) صَلًى وصِلْيًا: آگ کی گرمی برداشت کرنا۔ آگ میں جلنا (۳)مَذْمُوْم (اسم مفعول) ذَمَّهٗ(ن) ذَمًّا وَمَذَمَّةً: برائی بیان کرنا (۴)مدحور (اسم مفعول) دَحَرَهٗ(ف) دَحْرًا وَدُحُوْرًا: دھتکارنا، دور کرنا، دفع کرنا مَذْمُوْمًا اور مَدْحُوْرًا یصلی کی ضمیر فاعل سے حال ہیں (۵)سَعْيَهَا مفعول بہ اور مفعول مطلق دونوں ہو سکتے ہیں (۶)مشکور (اسم مفعول) شکریہ ادا کیا ہوا۔ بہتر سلوک پر تعریف کیا ہوا مجازی معنی ہیں بدلہ دیا ہوا۔ کہا جاتا ہے: شَكَرَ اللّٰهُ سَعْيَكَ یعنی ←

هٰٓؤُلَآءِ	اِن کو	عَطَآءُ رَبِّكَ	تیرے رب کی بخشش	عَلٰى بَعْضٍ	بعض پر
وَهٰٓؤُلَآءِ	اوراُن کو	مَحْظُوْرًا (۱)	بند(روکی ہوئی)	وَلَلْاٰخِرَةُ (۲)	اوریقیناً آخرت
مِنْ عَطَآءِ	تیرے رب کی	اُنْظُرْ	دیکھ	اَكْبَرُ	بہت بڑی ہے
رَبِّكَ	بخشش سے	كَيْفَ	کس طرح	دَرَجٰتٍ	درجات کے اعتبار سے
وَمَا	اورنہیں	فَضَّلْنَا	برتری بخشی ہم نے	وَّاَكْبَرُ	اور بہت بڑی ہے
كَانَ	ہے	بَعْضَهُمْ	ان میں بعض کو	تَفْضِيْلًا	فضیلت کے اعتبار سے

اب آخرت پرایمان لانے والوں کا اورایمان نہ لانے والوں کا دنیوی اوراخروی انجام بیان کیا جاتا ہے۔

منکر آخرت ـــــ جو شخص دنیا کا خواہش مند ہے ہم اس کو دنیا میں جتنا چاہتے ہیں، اور جس کے لئے چاہتے ہیں: جلدی دیدیتے ہیں ـــــ چونکہ دنیا کی حیثیت اللہ کے نزدیک مچھر کے پَر کے برابر بھی نہیں، اس لئے جس کو جس قدر دینا مصلحت ہوتا ہے عیش وآرام اور مال ومنال دیتے ہیں ـــــ پھر ہم نے اس کے لئے (آخرت میں) جہنم تجویز کررکھی ہے، جس میں وہ ملامت خوردہ پھٹکارا ہوا بھنے گا ـــــ یعنی اُخروی سعادت اس کے لئے مقدر نہیں۔ جب دنیا کی چندروزہ عیش نمٹ جائے گی تو وہ جہنم کے ابدی جیل خانہ میں دھکیل دیا جائے گا، اور وہاں بریاں سوزاں پڑا رہے گا۔

مومن کا حال ـــــ اور جو شخص آخرت کا خواہش مند ہے، اوراس کے لئے جیسی کوشش کرنی چاہئے، ایمان کی حالت میں اس نے ویسی کوشش کی ہوگی، تو ایسے لوگوں کی سعی مشکور ہوگی ـــــ ان کی محنت رائگاں نہیں جائے گی۔ ان کے اعمال حسن قبول سے نوازے جائیں گے۔ اوران کو ابدی نعمتوں سے ہمکنار کیا جائے گا۔

دنیا میں دونوں کے ساتھ معاملہ ـــــ ہم دونوں ہی کی، اِن کی بھی اور اُن کی بھی، تیرے رب کی بخشائشوں میں مدد کرتے ہیں۔ اور آپ کے رب کی بخشش سیل بند نہیں ـــــ اللہ تعالیٰ اپنی حکمت ومصلحت کے موافق

→ اللہ تمہاری کوشش کی جزادیں اور جزاوثواب مقبول عمل پر ملتا ہے اس لئے مقبول ترجمہ کیا گیا ہے (۷) كُلًّا کی تنوین مضاف الیہ کے عوض میں ہے أی کل الفريقين اور یہ نُمِدُّ کا مفعول بہ ہے جو مقدم کیا گیا ہے اور هٰؤلاء وهؤلاء بدل کل ہیں كُلًّا سے ۱۲

(۱) مَحْظُوْر (اسم مفعول) روکا ہوا، منع کیا ہوا حَظَرَهٗ (ض) حَظْرًا: روکنا منع کرنا (۲) لَلْآخِرَةُ کا پہلا لام، لام ابتدا ہے جو مضمون جملہ کی تاکید کے لئے ہے اور الآخرةُ مبتدا ہے اور أکبر إلخ خبر ہے اور درجاتٍ اور تَفْضِيْلًا، أَكْبَرُ کی تمیزیں ہیں اور مفضل علیہ عام محذوف ہے أی أکبر من کل شیئ۔

مسلمانوں کو بھی جو آخرت پر یقین رکھتے ہیں، اور اس کے لئے واجبی تیاری کرتے ہیں، اور کافروں کو بھی جو آخرت پر یقین نہیں رکھتے، اور دنیا کے پیچھے اپنی محنتیں ضائع کررہے ہیں: دنیا کا مال ومتاع، عیش وآرام اور خوش حالی عطا فرماتے ہیں۔ دنیوی نعمتوں کے دروازے کسی پر بند نہیں۔ مگر یہ بات بھی ہے کہ دنیا سب کو یکساں نہیں ملتی۔ ارشاد ہے: —— غور کرو! ہم نے کس طرح بعض کو بعض پر ترجیح دی ہے؟ —— اللہ نے اس دنیا میں نہ سب کافروں کو یکساں رکھا ہے، نہ سب مؤمنوں کو۔ مال ومنال، عز وجاہ، آل اولاد، اور راحت وآرام میں بعض کو بعض پر فوقیت دی ہے۔ جہاں منکرین آخرت صاحبِ اقتدار اور دولت وثروت والے ہیں، وہیں خاک نشیں، ذلیل وخوار، بے آل واولاد اور نانِ شبینہ کے محتاج بھی ہیں۔ اور یہی حال مسلمانوں کا بھی ہے۔ اور اس میں حکمت یہ ہے کہ لوگ دنیا کی خوشحالی اور فراغبالی کو مذہب کی حقانیت کی دلیل نہ سمجھ لیں۔ البتہ آخرت کا حال دنیا سے مختلف ہوگا۔ ارشاد ہے —— اور آخرت بالیقین درجات اور فضیلت کے اعتبار سے بہت بڑی ہے —— جو صرف مؤمنین کے لئے ہے، کافروں کا اس میں کوئی حصہ نہیں!

فائدہ: آخرت میں عمل کی قبولیت کے لئے تین شرطیں ہیں: ۱۔ عمل صحیح عقیدہ سے ہو ﴿وَهُوَ مُؤْمِنٌ﴾ کا یہی مطلب ہے ۲۔ صحیح نیت سے ہو، یعنی اللہ کی خوشنودی کے لئے کیا گیا ہو، کوئی دنیوی غرض اس میں شامل نہ ہو ۳۔ عمل: شریعت کی تعلیم کے مطابق ہو، اس میں خودرائی شامل نہ ہو، نہ من گھڑت طریقوں پر انجام دیا گیا ہو۔ پس بدعات ورسوم آخرت میں کچھ بھی مفید نہیں، بلکہ بہت سخت ضرر رساں ثابت ہونگی۔

لَا تَجْعَلْ مَعَ اللّٰهِ اِلٰهًا اٰخَرَ فَتَقْعُدَ مَذْمُوْمًا مَّخْذُوْلًا ﴿۲۲﴾ وَقَضٰى رَبُّكَ اَلَّا تَعْبُدُوْٓا اِلَّآ اِيَّاهُ وَبِالْوَالِدَيْنِ اِحْسَانًا ۭ اِمَّا يَبْلُغَنَّ عِنْدَكَ الْكِبَرَ اَحَدُهُمَآ اَوْ كِلٰـهُمَا فَلَا تَقُلْ لَّهُمَآ اُفٍّ وَّلَا تَنْهَرْهُمَا وَقُلْ لَّهُمَا قَوْلًا كَرِيْمًا ﴿۲۳﴾ وَاخْفِضْ لَهُمَا جَنَاحَ الذُّلِّ مِنَ الرَّحْمَةِ وَقُلْ رَّبِّ ارْحَمْهُمَا كَمَا رَبَّيٰنِيْ صَغِيْرًا ﴿۲۴﴾ رَبُّكُمْ اَعْلَمُ بِمَا فِيْ نُفُوْسِكُمْ ۭ اِنْ تَكُوْنُوْا صٰلِحِيْنَ فَاِنَّهٗ كَانَ لِلْاَوَّابِيْنَ غَفُوْرًا ﴿۲۵﴾

ع ۲

لَا تَجْعَلْ	مت تجویز کر	مَعَ اللّٰهِ	اللہ تعالیٰ کے ساتھ	اِلٰهًا اٰخَرَ	کوئی اور معبود

فَتَقْعُدَ(۱)	پس بیٹھ رہے گا تو	يَبْلُغَنَّ	پہنچے	قَوْلًا	بات
مَذْمُوْمًا	ملامت خوردہ	عِنْدَكَ	تیرے پاس	كَرِيْمًا(۱۰)	باادب
مَّخْذُوْلًا(۲)	بے یارومددگار	الْكِبَرَ(۷)	بڑھاپے کو	وَاخْفِضْ(۱۱)	اور جھکا
وَقَضٰى(۳)	اور حکم دیا	اَحَدُهُمَآ	ان میں سے ایک	لَهُمَا	دونوں کے لئے
رَبُّكَ	تیرے رب نے	اَوْ كِلٰهُمَا	یا دونوں	جَنَاحَ	بازو
اَلَّا(۴)	کہ نہ	فَلَا تَقُلْ	پس مت کہہ تو	الذُّلِّ(۱۲)	انکساری کا
تَعْبُدُوْٓا	عبادت کرو تم	لَّهُمَآ	ان دونوں سے	مِنَ الرَّحْمَةِ(۱۳)	مہربانی سے
اِلَّآ اِيَّاهُ	مگر اس کی	اُفٍّ(۸)	اُف	وَقُلْ	اور کہہ تو
وَبِالْوَالِدَيْنِ(۵)	اور والدین کے ساتھ	وَّلَا تَنْهَرْهُمَا(۹)	اور نہ جھڑک تو ان کو	رَّبِّ	اے پروردگار
اِحْسَانًا	حسن سلوک کرو	وَقُلْ	اور کہہ تو	ارْحَمْهُمَا	مہربانی فرما دونوں پر
اِمَّا(۶)	اگر	لَّهُمَا	ان سے	كَمَا(۱۴)	جس طرح

(۱)تَقْعُدَ (فعل مضارع منصوب) فَا جواب نہی میں آئی ہے اس لئے اس کے بعد اَنْ ناصبہ مقدر ہے قَعَدَ(ن) قُعُوْدًا کے اصل معنی ہیں بیٹھنا اور بہ معنی تَصِيْرُ بھی ہوسکتا ہے اس وقت فعل ناقص ہوگا اور پہلی صورت میں مَذْمُوْمًا اور مَخْذُوْلًا احوال مترادفہ ہیں اور دوسری صورت میں خبریں ہیں (۲)مَخْذُوْل (اسم مفعول) خَذَلَهٗ(ن) خَذْلًا: بے مدد چھوڑ دینا (۳) یہاں قَضٰى يَقْضِىْ قَضَاءً کے معنی ہیں فیصلہ کرنا، طے کرنا یا حکم دینا (۴) اَلَّا میں اَنْ مصدریہ ہے اور لا نافیہ ہے اور جملہ بہ تاویل مصدر ہوکر قضٰی کا مفعول ہے (۵) بالوالدین کا متعلق محذوف ہے أی تُحْسِنُوْا اور اِحْسَانًا فعل محذوف کا مفعول مطلق ہے اور فعل محذوف جملہ ہوکر لَا تَعْبُدوا پر معطوف ہے ۱۲ (۶) اِمَّا میں اِنْ شرطیہ ہے اور ما زائد برائے تاکید ہے اسی وجہ سے فعل مضارع پر نون مشدد برائے تاکید آیا ہے (۷) اَلْكِبَرَ (اسم مصدر) پیرانہ سالی، بڑھاپا، یہ يَبْلُغَنَّ کا مفعول بہ ہے اور اَحَدُهُمَا اور كِلَاهُمَا فاعل ہیں۔ اور عِنْدَكَ ظرف ہے (۸) اُف یا تو اسم فعل ہے یا اسم صوت جو تنگ دلی اور گرانی کو ظاہر کرنے کے لئے ہے (۹) نَهَرَ (ف) نَهْرًا السائل: سائل کو ڈانٹنا (۱۰) کریم کے بہت سے معانی ہیں مگر جب وہ کسی چیز کی صفت ہوتو اس سے مراد اس چیز کا اچھی صفات کے ساتھ متصف ہونا ہوتا ہے جیسے زَوْج کریم (عمدہ قسم) مقام کریم (عمدہ جگہ) قول کریم (اچھی بات) (۱۱) اِخْفِضْ (فعل امر) خَفَضَهٗ(ض) خَفْضًا: پست کرنا (۱۲) الذل (مصدر) تابعداری، ذلت، انکساری، تواضع، نرمی (۱۳) من الرحمة میں من یا تعلیلہ ہے یعنی شفقت ومہربانی کی وجہ سے، لوگوں کے عار دلانے کی وجہ سے نہیں یا ابتدائیہ ہے یعنی قلبی مہربانی کی وجہ سے یہ عمل ہونا چاہئے (۱۴) کما میں کاف حرف تشبیہ ہے اور جار مجرور مصدر مقدر کی صفت ہیں أی رب ارْحَمْهُمَا رَحْمَةً مِثْلَ رَحْمَتِهِمَا لِیْ۔

رَبَّيٰنِيْ (۱)	پرورش کی انھوں نے میری	بِمَا	اس چیز کو جو	فَاِنَّهٗ	تو بے شک اللہ تعالیٰ
صَغِيْرًا	بچپن میں	فِيْ نُفُوْسِكُمْ	تمہارے دلوں میں ہے	كَانَ	ہیں
رَبُّكُمْ	تمہارے پروردگار	اِنْ تَكُوْنُوْا	اگر ہوئے تم	لِلْاَوَّابِيْنَ (۲)	توبہ کرنے والوں کیلئے
اَعْلَمُ	خوب جانتے ہیں	صٰلِحِيْنَ	نیک	غَفُوْرًا	بڑے بخشش فرمانے والے

آخرت میں کامیابی کے لئے ضروری ہے کہ صحیح عقیدہ کے ساتھ اور صحیح نیت کے ساتھ شریعت کے مطابق عمل کیا جائے۔آخرت کی نعمتیں انہی لوگوں کے لئے ہیں جو آخرت کے لئے واجبی کوشش کرتے ہیں۔اب یہاں سے دور تک وہ احکام ذکر کئے گئے ہیں جن پر عمل کرنے سے آخرت کے بلند درجات حاصل ہوتے ہیں اور نہ صرف آخرت خوشگوار ہوتی ہے بلکہ دنیا بھی سنورتی ہے:

پہلا حکم ــــ توحید ــــ توحید کے لغوی معنی ہیں ایک بنانا اور شریعت کی اصطلاح میں توحید کے معنی ہیں ایک خدا پر ایمان لانا۔پھر توحید کی تین قسمیں ہیں۔

① ــ توحید الوہیت: صرف ایک ذات کو معبود ماننا،کسی دوسری ہستی کو اس جیسا نہ ماننا،توحید الوہیت کو توحید ذات بھی کہتے ہیں۔

② ــ توحید ربوبیت: صرف ایک ذات کو پروردگار اور پالنہار ماننا،کسی دوسری ذات کو ربوبیت میں شریک نہ گرداننا۔توحید ربوبیت کو توحید صفات بھی کہتے ہیں۔

③ ــ توحید عبادت: صرف اللہ کی پرستش کرنا،کسی دوسرے کی پوجا نہ کرنا۔

توحید یہ تینوں قسمیں مامور بہ ہیں جو شخص اللہ تعالیٰ کے علاوہ کسی دوسرے کو بھی معبود مانتا ہے وہ مشرک ہے اسی طرح جو غیر اللہ کو خالق و مالک مانتا ہے یا غیر اللہ کی پوجا کرتا ہے وہ بھی مشرک ہے۔ارشاد ہے ــــ اللہ کے ساتھ دوسرا معبود تجویز مت کر، ورنہ بدحال بے یارومددگار ہو کر بیٹھ رہے گا! ــــ یعنی اگر تیرا دامن شرک سے آلودہ ہو گیا تو آخرت میں تیرا کوئی پرسان حال نہ ہوگا۔تجھ پر اللہ کی اس کے فرشتوں کی اور تمام لوگوں کی پھٹکار برسے گی ــــ اور آپ کے رب نے حکم دیا ہے کہ تم اس کے سوا کسی اور کی عبادت مت کرو ــــ یعنی ایک خدا کو ماننا کافی

---

(۱۰) رَبَّيَانِيْ تَرْبِيَةٌ سے فعل ماضی،صیغہ تثنیہ مذکر غائب،تثنیہ کا نون الف کے بعد محذوف ہے ن وقایہ کا اور ی ضمیر واحد متکلم ہے

(۱۱) اَوَّابِيْنَ جمع ہے اَوَّابٌ کی جو مبالغہ کا صیغہ ہے اور اس کے معنی ہیں بہت رجوع ہونے والا۔بہت توبہ کرنے والا۔حدیث میں ہے کہ اَوَّابٌ وہ شخص ہے جو تنہائی میں اپنے گناہوں کو یاد کر کے اللہ تعالیٰ سے مغفرت کا خواستگار ہو (رواہ الدیلمی عن ابن عمرؓ)

نہیں، توحید الوہیت کے ساتھ توحید عبادت بھی ضروری ہے۔ ایک خدا کا عقیدہ تو تمام مشرک اقوام میں موجود ہے مگر وہ صنم پرستی کے ساتھ کچھ مفید نہیں۔ توحید ذات اسی وقت معتبر ہے جب بندہ اسی کی عبادت کرے، کسی دوسرے کی چوکھٹ پر جبّہ سائی نہ کرے۔

دوسرا حکم ـــــ والدین کے ساتھ نیک سلوک ـــــ انسان کو وجود حقیقۃً اللہ تعالیٰ نے عطا فرمایا ہے مگر والدین سبب ظاہری ہیں۔ اس لئے متعدد آیات میں والدین کے حقوق کو اللہ تعالیٰ کے حقوق کے ساتھ ملا کر بیان کیا گیا ہے۔

ارشاد ہے ـــــ اور والدین کے ساتھ نیک سلوک کرو ـــــ یعنی:

۱ــ ان کی زندگی میں جان و مال سے ان کی خدمت کرو اور ہمیشہ ان کو خوش رکھو۔

۲ــ دل سے والدین کی تعظیم کرو اور ان سے محبت رکھو۔

۳ــ والدین کی وفات کے بعد ان کے لئے دعائے مغفرت کرتے رہو۔

۴ــ والدین کے کئے ہوئے عہد و پیمان جہاں تک ممکن ہو پورے کرو۔

۵ــ والدین کے دوستوں کے ساتھ حسن سلوک کرو، اور ان کے رشتہ داروں کے ساتھ صلہ رحمی کرو۔

روایات ـــــ صحیحین میں مروی ہے کہ ایک شخص نے آنحضرت ﷺ سے دریافت کیا: ''اللہ کے نزدیک سب سے محبوب عمل کونسا ہے؟'' آپ ﷺ نے فرمایا: ''وقت پر نماز پڑھنا'' سائل نے پوچھا ''پھر؟'' آپؐ نے فرمایا: ''والدین کے ساتھ اچھا سلوک کرنا'' (مشکوٰۃ حدیث ۵۶۸)

ایک دوسری روایت میں ہے: ''باپ جنت کا درمیانی (بہترین) دروازہ ہے، اب اولاد کو اختیار ہے اس کی حفاظت کرے یا اس کو ضائع کرے'' (مشکوٰۃ حدیث ۴۹۲۸)

آپؐ کا یہ بھی ارشاد ہے کہ: ''اللہ تعالیٰ کی خوشنودی باپ کی خوشنودی میں ہے اور اللہ تعالیٰ کی ناراضگی باپ کی ناراضگی میں ہے'' (مشکوٰۃ حدیث ۴۹۲۷)

حدیث ـــــ حضرت ابوامامہ رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ ایک شخص نے آنحضور ﷺ سے دریافت کیا: اولاد پر ماں باپ کا کیا حق ہے؟ آپؐ نے فرمایا: ''وہ دونوں تیری جنت ہیں یا دوزخ'' یعنی والدین کی اطاعت و خدمت کر کے آدمی جنت حاصل کر سکتا ہے اور ان کی بے ادبی، ایذا رسانی اور ناراضگی مول لے کر جہنم رسید بھی ہو سکتا ہے۔

حدیث ـــــ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے مروی ہے کہ آنحضرت ﷺ نے فرمایا: میں خواب میں جنت میں گیا۔ وہاں میں نے قراءت کی آواز سنی، میں نے پوچھا: یہ کون پڑھ رہا ہے؟ فرشتوں نے بتایا: حارث بن نعمان

آنحضور ﷺ نے فرمایا: ''یہ حسن سلوک کا نتیجہ ہے، یہ حسن سلوک کا نتیجہ ہے وہ اپنی والدہ کے ساتھ بہت زیادہ حسن سلوک کیا کرتے تھے (مشکوٰۃ حدیث ۴۹۲۶) ــــ اس حدیث سے معلوم ہوا کہ ماں کے ساتھ حسن سلوک خاص طور پر موجب جنت ہے۔

اب ذیل میں چند ضروری مسائل ذکر کئے جاتے ہیں:

مسئلہ (۱) ماں حسن سلوک کی باپ سے زیادہ حقدار ہے۔ایک شخص نے آنحضور ﷺ سے دریافت کیا کہ میری بہترین رفاقت (حسن سلوک) کا سب سے زیادہ حقدار کون ہے؟ آپؐ نے جواب دیا: ''تیری ماں'' سائل نے پوچھا پھر؟ آپؐ نے فرمایا: ''تیری ماں'' سائل نے پوچھا: پھر؟ آپؐ نے فرمایا: ''تیری ماں'' سائل نے چوتھی بار دریافت کیا: پھر؟ آپؐ نے جواب دیا تیرا باپ (متفق علیہ، مشکوٰۃ حدیث ۴۹۱۱) ــــ اس حدیث سے معلوم ہوا کہ حسن سلوک میں ماں کا حق باپ سے زیادہ ہے۔

ایک دوسری حدیث میں ہے کہ ایک صحابی نے دریافت کیا: میں کس کے ساتھ حسن سلوک کروں؟ آپؐ نے فرمایا: ''اپنی ماں کے ساتھ'' انھوں نے پوچھا: پھر کس کے ساتھ؟ آپؐ نے فرمایا: ''اپنی ماں کے ساتھ'' انھوں نے سہ بارہ پوچھا: پھر کس کے ساتھ؟ آپؐ نے فرمایا ''اپنی ماں کے ساتھ'' انھوں نے چوتھی بار دریافت کیا: پھر کس کے ساتھ؟ آپؐ نے فرمایا: ''اپنے باپ کے ساتھ پھر درجہ بدرجہ دوسرے رشتہ داروں کے ساتھ (مشکوٰۃ حدیث ۴۹۲۹)

مسئلہ (۲) ماں باپ کافر ہوں تب بھی ان کے ساتھ حسن سلوک کرنا چاہئے۔حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کی صاحب زادی حضرت اسماء رضی اللہ عنہا بیان کرتی ہیں کہ صلح حدیبیہ کے بعد مصالحت کے زمانہ میں میری ماں میرے یہاں آئیں اور وہ غیر مسلم تھیں۔ میں نے آنحضور ﷺ سے دریافت کیا کہ میری ماں میرے یہاں آئی ہے اور وہ امید لے کر آئی ہے تو کیا میں ان کے ساتھ صلہ رحمی کروں؟ آپؐ نے فرمایا: ''ہاں! تم ان کے ساتھ صلہ رحمی کرو'' (متفق علیہ، مشکوٰۃ حدیث ۴۹۱۳)

اور سورۂ لقمان آیت ۱۵ میں ہے: ''شرک وکفر میں تو والدین کی بات ماننا جائز نہیں مگر دنیا میں ان کے ساتھ خوبی سے بسر کرنا چاہئے'' اس لئے اگر والدین غیر مسلم بھی ہوں مگر غربت کی وجہ سے مالی تعاون کے محتاج ہوں یا بڑھاپے کی وجہ سے خدمت کے محتاج ہوں تو مسلمان اولاد پر لازم ہے کہ ان کے ساتھ حسن سلوک کرے، اور ان کے ساتھ خوبی سے بسر کرے۔

مسئلہ (۳) ماں باپ کے مرنے کے بعد ان کے دوستوں اور متعلقین کے ساتھ حسن سلوک کرنا بھی والدین کے

ساتھ سلوک کرنا ہے۔حدیث شریف میں ہے کہ: ''سب سے بڑا حسن سلوک یہ ہے کہ آدمی باپ کے مرنے کے بعد اس کے دوستوں کا خیال رکھے'' (مشکوٰۃ حدیث ۴۹۱۷)

حدیث ـــــ حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما ایک مرتبہ مکہ شریف جارہے تھے۔راستہ میں ایک آدمی ملا، ابن عمرؓ نے اس کو سلام کیا اور اس کو اپنے ساتھ گدھے پر بٹھالیا، اور اپنے سر سے پگڑی اتار کر اس کو عنایت فرمائی۔ان کے شاگرد ابن دینار نے عرض کیا کہ یہ لوگ تو دیہاتی ہیں، کوئی معمولی چیز دی جائے تو بھی خوش ہوجاتے ہیں یعنی آپ نے اس کا اتنا اکرام کیوں کیا؟ حضرت ابن عمرؓ نے فرمایا کہ اس کا باپ مرے والد حضرت عمرؓ کا دوست تھا اور میں نے آنحضور ﷺ سے یہ ارشاد سنا ہے کہ: ''اولاد کا سب سے بڑا حسن سلوک باپ کے دوستوں کے ساتھ حسن سلوک ہے'' (رواہ مسلم، روح المعانی ۱۵:۵۸)

حدیث ـــــ حضرت ابوموسیٰ اشعری رضی اللہ عنہ کے صاحب زادے ابوبُردہ رحمہ اللہ ایک بار مدینہ منورہ آئے۔ حضرت ابن عمرؓ ان سے ملنے گئے۔دوران ملاقات پوچھا کہ جانتے ہو میں آپ سے ملنے کیوں آیا ہوں؟ انھوں نے عرض کیا: نہیں! ابن عمرؓ نے فرمایا کہ میں نے آنحضور ﷺ سے سنا ہے کہ ''جو شخص مرنے کے بعد اپنے والد کے ساتھ صلہ رحمی کرنا چاہتا ہے اس کو چاہئے کہ وہ والد کے دوستوں سے صلہ رحمی کرے'' اور میرے ابا اور آپ کے ابا کے درمیان محبت اور بھائی چارہ تھا اس لئے میں اس تعلق کی خاطر آپ سے ملنے آیا ہوں (روح المعانی ۱۵:۵۹)

مسئلہ (۴) والدین کے ساتھ حسن سلوک ان کی حیات کے ساتھ خاص نہیں، بلکہ مرنے کے بعد بھی ان کے ساتھ حسن سلوک کرنا ضروری ہے۔حدیث شریف میں ہے کہ ایک شخص دربار نبوی میں حاضر ہوا اور اس نے دریافت کیا: یارسول اللہ! والدین کے ساتھ حسن سلوک میں سے کیا کوئی ایسی چیز بھی باقی رہ جاتی ہے جو ان کے مرنے کے بعد کی جائے؟ آنحضور ﷺ نے جواب دیا: ''جی ہاں! (۱) ان کے لئے دعائیں کرنا (۲) ان کے لئے استغفار کرنا (۳) ان کے جو عہد و پیمان باقی رہ گئے ہوں ان کو پورا کرنا (۴) اس ناتے کو جوڑنا جس کا تعلق ان دونوں ہی کے ساتھ ہو (۵) اور ان کے دوستوں کا اکرام کرنا'' (مشکوٰۃ حدیث ۴۹۳۶) یعنی یہ پانچ کام بھی والدین کے ساتھ حسن سلوک میں شامل ہیں اور یہ کام والدین کی حیات میں نہیں بلکہ ان کی وفات کے بعد کئے جاتے ہیں۔

مسئلہ (۵) ماں باپ کے ساتھ بدسلوکی کرنا کبیرہ گناہوں میں سے بھی بڑا گناہ ہے۔حضرت عبداللہ بن عمرو بن العاص رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ''بڑے گناہ یہ ہیں (۱) اللہ تعالیٰ کے ساتھ شریک ٹھہرانا (۲) والدین کے ساتھ بدسلوکی کرنا (۳) کسی کو ناحق قتل کرنا (۴) جھوٹی قسم کھانا'' (مشکوٰۃ حدیث ۵۰)

اور حضرت مغیرہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ آنحضور ﷺ نے ارشاد فرمایا: ''اللہ تعالیٰ نے تم پر ماں کے ساتھ بدسلوکی کرنا، لڑکیوں کو زندہ درگور کرنا، اور دینا نہیں اور مانگنا (یعنی اپنے مال میں بخیلی کرنا، اور لوگوں سے مانگنا) حرام کیا ہے اور ردّ وکدّ، سوالات کی بہتات اور مال برباد کرنے کو ناپسند کیا ہے'' (مشکوٰۃ حدیث ۴۹۱۵)

اور حدیث شریف میں ہے کہ والدین کے ساتھ بدسلوکی کرنے کی سزا دنیا ہی میں ملتی ہے۔ حضرت ابوبکرہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ آنحضرت ﷺ نے ارشاد فرمایا: ''گناہوں میں سے اللہ تعالیٰ جس کو چاہتے ہیں بخش دیتے ہیں مگر والدین کے ساتھ بدسلوکی مستثنیٰ ہے اس گناہ کی سزا مرنے سے پہلے ہی دنیا میں دی جاتی ہے (مشکوٰۃ حدیث ۴۹۴۵)

مسئلہ (۶) اگر کوئی شخص زندگی میں والدین کے ساتھ بدسلوکی کرتا رہا تو اب اس کا کفارہ یہ ہے کہ والدین کے لئے دعائیں کرے، ایصال ثواب کرے، ان کی قبروں پر جائے، اور ان کے لئے استغفار کرے۔ حدیث شریف میں ہے کہ: ''جس شخص کے ماں باپ کا: دونوں کا یا ان میں سے کسی ایک کا انتقال ہوجائے اور وہ زندگی میں ان کے ساتھ بدسلوکی کرتا رہا ہو مگر وفات کے بعد برابر ان کے لئے دعائیں کرتا رہے اور استغفار کرتا رہے تو اللہ تعالیٰ اس کو حسن سلوک کرنے والا قرار دیتے ہیں'' (مشکوٰۃ حدیث ۴۹۴۲) — ایک دوسری حدیث میں ہے کہ جو شخص ہر جمعہ کو والدین کی یا ان میں سے کسی ایک کی قبر پر جائے تو اس کی بخشش کردی جاتی ہے اور وہ حسن سلوک کرنے والا قرار دیا جاتا ہے۔ (روح المعانی ۱۵:۵۸)

عجیب بات — والدین کے ساتھ زندگی بھر حسن سلوک کرنے والا ان کے مرنے کے بعد بدسلوکی کرنے والا قرار دیا جاتا ہے اور زندگی بھر بدسلوکی کرنے والا ان کے مرنے کے بعد حسن سلوک کرنے والا بن جاتا ہے۔ امام اوزاعی رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ مجھے یہ روایت پہنچی ہے کہ جس شخص نے زندگی میں والدین کے ساتھ بدسلوکی کی ہو پھر وفات کے بعد ان کا قرضہ ادا کرے ان کے لئے استغفار کرے اور ان کو گالیاں نہ دلوائے تو وہ حسن سلوک کرنے والا قرار دیا جاتا ہے۔ اور جو زندگی میں تو حسن سلوک کرتا رہا مگر ان کی وفات کے بعد ان کا قرضہ ادا نہ کیا، نہ ان کے لئے استغفار کیا اور دوسروں سے ان کو گالیاں دلوائیں تو وہ بدسلوکی کرنے والا لکھ دیا جاتا ہے (روح المعانی ۱۵:۵۸) —— اس میں خوش خبری ہے بدسلوکی کرنے والوں کے لئے اور ڈرنے کا مقام ہے حسن سلوک کرنے والوں کے لئے۔

مسئلہ (۷) ماں باپ کو گالی دینا یا برا کہنا یا دوسروں سے گالی دلوانا یا برا کہلوانا بھی کبیرہ گناہ ہے۔ حدیث شریف میں ہے کہ: ''کبیرہ گناہوں میں سے یہ بات بھی ہے کہ کوئی شخص اپنے والدین کو گالی دے'' صحابہ نے پوچھا: یارسول اللہ! اپنے ماں باپ کو بھی کوئی شخص گالی دے سکتا ہے؟! آپؐ نے فرمایا: ہاں! (مثلاً) ایک شخص دوسرے کے باپ کو

گالی دیتا ہے، جواباً وہ اس کے باپ کو گالی دیتا ہے یا ایک شخص دوسرے کی ماں کو گالی دیتا ہے، جواباً وہ اس کی ماں کو گالی دیتا ہے'' (تو یہ خود اپنے ماں باپ کو گالی دینا اور دلوانا ہے) (اخرجہ البیہی، روح المعانی ۱۵:۵۸)

مسئلہ(۸) والدین کی فرمانبرداری بعض صورتوں میں واجب ہے بعض صورتوں میں مستحب اور بعض صورتوں میں ناجائز — ناجائز اور گناہ کے کاموں میں والدین کی بلکہ کسی کی بھی اطاعت جائز نہیں۔ حدیث شریف میں ہے کہ: ''خالق کی نافرمانی میں کسی مخلوق کی اطاعت جائز نہیں'' (مشکوٰۃ حدیث ۴۹۱۶) — صرف جائز کاموں میں والدین کی اطاعت واجب یا مستحب ہے حدیث شریف میں ہے کہ:

اَطِعْ رَبَّكَ وَوَالِدَيْكَ وَاِنْ اَمَرَاكَ اَنْ تَخْرُجَ مِنْ كُلِّ شَيْءٍ (بیہقی عن ام ایمن درمنثور ۴:۱۷۳)

اپنے پروردگار کی اور اپنے والدین کی اطاعت کرو، اگرچہ وہ تجھے ہر چیز سے بے دخل ہوجانے کا حکم دیں۔

حدیث — حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما فرماتے ہیں کہ میری ایک بیوی تھی، مجھے اس سے محبت تھی اور میرے ابا حضرت عمر رضی اللہ عنہ اس کو ناپسند کرتے تھے۔ انھوں نے مجھ سے کہا: ''اس بیوی کو طلاق دیدو'' میں نے انکار کیا حضرت عمرؓ نے آنحضرت ﷺ سے اس کا تذکرہ کیا۔ حضور اکرم ﷺ نے مجھ سے فرمایا کہ ''اس کو طلاق دیدو'' (مشکوٰۃ حدیث ۴۹۴۰)

حدیث — حضرت ابوالدرداء رضی اللہ عنہ کے پاس ایک شخص آیا اور اس نے کہا کہ میرے ابا نے اصرار کر کے میرا ایک عورت سے نکاح کرایا اور اب وہ مجھے حکم دیتے ہیں کہ میں اس کو جدا کردوں؟ حضرت ابوالدرداءؓ نے جواب دیا کہ میں نہ تو تجھے والد کی نافرمانی کا حکم دیتا ہوں، نہ بیوی کو طلاق دینے کا۔ البتہ ایک حدیث سناتا ہوں جو میں نے خود آنحضرت ﷺ سے سنی ہے۔ فرمایا: ''باپ جنت کا درمیانی (بہترین) دروازہ ہے اب تیری مرضی ہے کہ خواہ اس کی حفاظت کر یا اس سے ہاتھ دھو بیٹھ!'' (ابن حبان، روح المعانی ۱۵:۶۰)

ان احادیث سے معلوم ہوا کہ والدین کا ہر حکم واجب الطاعہ نہیں۔ بعض واجب ہیں، بعض مستحب، تفصیل آگے آرہی ہے۔

مسئلہ(۹) والدین کے ساتھ بدسلوکی کیا ہے؟ روح المعانی میں بعض محققین کا قول لکھا ہے کہ: ''عقوق والدین کے ساتھ یا ان میں سے کسی ایک کے ساتھ ایسے برتاؤ کا نام ہے جس سے ان کو لوگوں کے عرف کے اعتبار سے غیر معمولی اذیت پہنچے۔ لیکن اگر باپ انتہائی احمق اور کم عقل ہو اور وہ کوئی ایسا حکم دے کہ یا کسی ایسی بات سے روکے جس کی مخالفت لوگوں کے عرف میں نافرمانی نہ سمجھی جاتی ہو تو ایسے امر ونہی کی مخالفت کرنے والا لڑکا فاسق نہ ہوگا۔ بناء علیہ اگر

کسی کو بیوی سے محبت ہے اور باپ بیوی کو طلاق دینے کا حکم دے ــــ اگرچہ وہ حکم عورت کی بدچلنی کی وجہ سے ہو ــــ اور لڑکا اس حکم کی تعمیل نہ کرے تو اس پر کوئی گناہ نہیں۔ البتہ افضل یہ ہے کہ باپ کی فرمانبرداری کرتے ہوئے اس عورت کو طلاق دیدے"

مختلف احوال:

(۱) علم دین کے دو درجے ہیں۔ فرض عین اور فرض کفایہ ــ فرض عین وہ علم ہے جس کا حاصل کرنا ہر مسلمان پر فرض ہے اور یہ دین کا وہ ضروری حصہ ہے جو اسلامی زندگی گذارنے کے لئے ضروری ہے اور دین کا مکمل علم حاصل کرنا فرض کفایہ ہے۔ یعنی سب مسلمانوں پر فرض نہیں، بلکہ بقدر کفایہ (بقدر ضرورت) لوگوں پر فرض ہے۔ یعنی اتنے لوگوں پر اس کی تحصیل فرض ہے جس کے ذریعہ مسلمانوں کی دینی ضرورت پوری ہو سکے اور اسلام کی حفاظت ہو سکے ــــ یہی حال تبلیغ وجہاد کا بھی ہے کہ وہ عام حالات میں فرض کفایہ ہیں مگر خاص حالات میں فرض عین ہو جاتے ہیں۔ پس دونوں درجوں کے احکام مختلف ہوں گے۔

(۲) صحت، طاقت اور قوت کے اعتبار سے بھی والدین کی دو حالتیں ہیں: ایک وہ زمانہ ہے جس میں والدین جسمانی خدمت کے محتاج نہیں ہوتے اور دوسری بڑھاپے اور بیماری کی حالت ہے جس میں وہ اولاد کی خدمت کے محتاج ہو جاتے ہیں اس لئے دونوں حالتوں کے احکام مختلف ہیں۔

(۳) معاشی لحاظ سے بھی والدین کی دو حالتیں ہیں: ایک خود کفیل ہونے کی حالت دوسری محتاجگی کی حالت۔ یعنی کبھی والدین کے پاس گذارے کے لئے اندوختہ ہوتا ہے یا وہ کما سکتے ہیں اور کبھی تہی دست ہوتے ہیں اور کمانے کی قابلیت نہیں رکھتے پس دونوں حالتوں کے احکام جدا جدا ہیں۔

(۴) سفر کی اجازت نہ دینا بھی مختلف وجوہ سے ہوتا ہے ایک محبت کی وجہ سے والدین نہیں چاہتے کہ اولاد ان کی نظروں سے دور ہو، دوسرے اولاد کی دینی مصلحت کی وجہ سے مثلاً لڑکا امرد خوبصورت ہے اس کو دوسری جگہ بھیجنا مناسب نہیں، یا وہ لڑکی ہو جس کا تحصیل علم کے لئے سفر کرنا مصلحت نہیں۔ تیسرے دنیا طلبی کی وجہ سے۔ ماں باپ چاہتے ہیں کہ لڑکا گھر رہے اور کاروبار میں ان کا ہاتھ بٹائے یا کاروبار سنبھالے۔ چوتھے بے دینی کی وجہ سے۔ پانچویں علم دین کی قدر نہ جاننے کی وجہ سے ــــ غرض سفر سے روکنے کی بھی مختلف وجوہ ہیں اس لئے ان کے احکام بھی مختلف ہیں۔

احکام:

(۱) اگر والدین غریب اور خدمت کے محتاج ہوں اور کوئی دوسرا خدمت گار نہ ہو یا وہ اولاد کی دینی مصلحت کی وجہ

سے سفر کرنے سے منع کریں تو ان کی اطاعت واجب ہے۔ ان کی اجازت کے بغیر نہ فرض عین علم دین حاصل کرنے کے لئے سفر کرنا جائز ہے نہ فرض کفایہ۔ اس کو چاہئے کہ علم دین کا جو درجہ فرض عین ہے وہ مقامی لوگوں سے حاصل کرے۔ اور تبلیغ کے لئے نکلنا بھی فرض کفایہ ہے، فرض عین نہیں۔ البتہ جہاد کے لئے جب کہ وہ فرض عین ہو جائے یعنی نفیر عام کی صورت میں والدین کی اجازت ضروری نہیں۔

حدیث شریف: میں ہے ایک صاحب آنحضرت ﷺ کی خدمت میں آئے اور انھوں نے جہاد میں شرکت کی اجازت چاہی آپؐ نے دریافت فرمایا: کیا تمہارے والدین زندہ ہیں؟ انھوں نے جواب دیا: جی ہاں! آنحضرت ﷺ نے فرمایا: ''ان دونوں میں جہاد کر'' مطلب یہ ہے کہ اُن کی خدمت کر اسی سے جہاد کا ثواب مل جائے گا۔

حدیث ــــ ایک شخص دربار نبوی میں حاضر ہوئے اور کہنے لگے: میں آپ سے ہجرت (اور جہاد) کی بیعت کرنے آیا ہوں اور اپنے والدین کو روتا ہوا چھوڑ کر آیا ہوں۔ آنحضرت ﷺ نے فرمایا کہ: ''واپس جاؤ اور ان کو ہنساؤ جیسا کہ ان کو رُلایا ہے'' ــــ اس حدیث کی شرح میں بذل المجہود میں ہے: ''یہ ارشاد اس صورت میں ہے جب جہاد فرض عین نہ ہو اور جب جہاد فرض عین ہو جائے تو پھر کسی کی اجازت کی ضرورت نہیں''

اور پہلی حدیث کی شرح میں علامہ بغوی کی شرح السنۃ سے نقل کیا ہے کہ: ''یہ ارشاد نفل جہاد کے لئے ہے اس کے لئے مسلمان ماں باپ کی اجازت کے بغیر نہ نکلے، اور اگر جہاد فرض عین ہو جائے تو پھر والدین کی اجازت ضروری نہیں اور اگر والدین منع کریں تو ان کی نافرمانی کرے اور جہاد کے لئے نکل پڑے...... اور یہی حکم ہر نفل عبادت کا ہے۔ جیسے نفل حج، عمرہ اور زیارت (قبر اطہر) اور نفل روزہ، اگر مسلمان والدین یا ان میں سے ایک اجازت نہ دے تو نہ رکھے۔ علامہ ابن الہمام نے اس کی وجہ یہ بیان فرمائی ہے کہ والدین کی اطاعت فرض ہے اور جہاد فرض عین نہیں (بذل ۱۲: ۱۸ مصری)

(۲) اگر والدین خدمت کے محتاج ہیں مگر خود کفیل ہیں یعنی ان کے پاس گذارہ کا سامان ہے تو فرض عین علم دین حاصل کرنے کے لئے ــــ اگر وہ مقامی طور پر حاصل نہ ہو سکتا ہو ــــ بلا اجازت سفر کرنا جائز ہے اور والدین کو چاہئے کہ وہ کسی کو اجرت پر رکھ کر خدمت لیں، البتہ فرض کفایہ علم دین حاصل کرنے کے لئے اور تبلیغ کے لئے بغیر اجازت سفر کرنا جائز نہیں۔

(۳) اور اگر والدین طاقت وقوت رکھتے ہوں، خدمت کے محتاج نہ ہوں تو خواہ وہ خود کفیل ہوں یا غریب، فرض عین اور فرض کفایہ دونوں درجوں کا علم دین حاصل کرنے کے لئے اجازت کی ضرورت نہیں۔ بلا اجازت بھی سفر کرنا اور علم دین حاصل کرنا جائز ہے۔ کیونکہ اس صورت میں والدین کا نفقہ (خرچ) اولاد کے ذمہ واجب نہیں۔ والدین کا

نفقہ حیثیت رکھنے والی اولاد پر اس وقت واجب ہوتا ہے جب والدین غریب ہوں اور بڑھاپے کی وجہ سے یا بیماری کی وجہ سے کمانے کے قابل نہ ہوں۔ نیز باپ اگر مالدار ہے یا کما سکتا ہے تو ماں کا خرچ اولاد پر واجب نہیں، باپ پر واجب ہے۔ کیونکہ بیوی کا نفقہ شوہر پر واجب ہوتا ہے۔

(۴) اور اگر والدین علم دین حاصل کرنے کے لئے سفر کرنے سے، یا تبلیغ کے لئے نکلنے سے، یا جہاد کے لئے نکلنے سے بر بنائے محبت منع کریں یا دنیا طلبی کی وجہ سے یا بے دینی کی وجہ سے یا اعمال دینیہ کی قدر نہ جاننے کی وجہ سے۔ تو اس صورتوں میں ان کی اجازت ضروری نہیں۔ دونوں درجوں کا علم دین حاصل کرنے کے لئے اور دوسرے اعمال دینیہ کے لئے بلا اجازت سفر کرنا جائز ہے۔

نوٹ: یہ تو مسائل احکام ہیں مگر سب صورتوں میں افضل یہ ہے کہ والدین کو کسی بھی طرح راضی کر کے ان کی اجازت لے کر علم دین حاصل کرنے کے لئے یا تبلیغ کے لئے نکلے۔ ان کی دعائیں شامل حال ہونگی تو علم میں اور کام میں برکت ہوگی۔

روح المعانی میں علامہ عمر بن رَسْلان بُلقینی مصری شافعی رحمہ اللہ (ولادت ۷۲۴ھ وفات ۸۰۵ھ) کے فتاوی سے نقل کیا ہے کہ: ''فرض عین علم دین حاصل کرنے کے لئے یا فرض کفایہ کے لئے سفر کرنا ممنوع نہیں اگر چہ مقامی طور پر اس کی تحصیل ممکن ہو ــــ کچھ لوگ اس میں اختلاف کرتے ہیں ان کے نزدیک اجازت ضروری ہے ــــ کیونکہ باہر نکل کر علم حاصل کرنے میں فراغ بالی ہوتی ہے اور استاذ کے نصائح سے بھی متمتع ہوتا ہے اور اس قسم کے دیگر فوائد حاصل ہوتے ہیں اور اگر اس قسم کے فوائد کی امید نہ ہو وپھر اجازت کی ضرورت ہوگی۔

اور جن صورتوں میں باپ کا خرچ اولاد پر واجب ہے اور علم دین حاصل کرنے کے لئے سفر کرنے میں یہ واجب فوت ہوتا ہو یعنی وہ والدین کا خرچ نہ دے سکتا ہو تو باپ کو منع کرنے کا حق ہے اور اگر سفر کرنے میں بچے کی آبرو پر حرف آ سکتا ہو مثلاً وہ امرد ہے اور باہر جانے میں تہمت کا اندیشہ ہے تو باپ سفر کرنے سے منع کر سکتا ہے اور لڑکی کو بدرجۂ اولی روک سکتا ہے۔

رہا ایسی صورت میں باپ کے امر و نہی کی مخالفت کرنا جب کہ سفر میں بچہ کا قطعاً کچھ ضرر نہ ہو باپ محض ارشاد و راہ نمائی کرتا ہو تو یہ سفر باپ کی نافرمانی نہیں۔ اور باپ کے حکم کی مخالفت نہ کرنا بہر حال بہتر ہے'' (روح المعانی ۱۵: ۶۰)

بُڑھاپے میں والدین کے ساتھ حسن سلوک: بڑھاپے کا زمانہ بچپن کی طرح ناتواں اور کمزوری کا زمانہ ہے جس طرح بچہ والدین کی ہر قسم کی خدمات کا محتاج ہوتا ہے، ماں باپ بھی پیری میں اولاد کی خدمت کے محتاج ہو جاتے ہیں،

اور جس طرح بچے کے مزاج میں ضد اور لا اُبالی پن ہوتا ہے بڑھاپے میں بھی مزاج نازک ہو جاتا ہے اور یہ نظام قدرت ہے۔ارشاد باری تعالیٰ ہے:﴿وَمَنْ نُعَمِّرْهُ نُنَكِّسْهُ فِي الْخَلْقِ﴾ ترجمہ: اور ہم جس کی عمر زیادہ کرتے ہیں اس کو طبعی حالت میں اُلٹا کر دیتے ہیں (یٰس آیت ۶۸) یعنی بچپن میں جیسا کمزور و ناتواں اور دوسروں کے سہارے کا محتاج ہوتا ہے بڑھاپے میں پھر اسی حالت کی طرف پلٹا دیا جاتا ہے۔اس لئے اگر چہ والدین کی خدمت واطاعت کسی زمانہ اور کسی عمر کے ساتھ مقید نہیں، ہر حال میں اور ہر عمر میں والدین کے ساتھ اچھا سلوک کرنا واجب ہے۔مگر مخصوص حالات کے لئے کچھ تاکیدی احکام ہیں، والدین کے ساتھ بڑھاپے میں کیسا برتاؤ کیا جائے؟ اس سلسلہ میں ارشاد ہے —— اگر ان میں سے ایک یا دونوں تیرے پاس بڑھاپے کو پہنچ جائیں تو ان کو اُف مت کہہ اور نہ ان کو جھڑک۔اور ان سے باادب گفتگو کر، اور ان کے سامنے مہربانی سے انکساری کا بازو جھکا دے اور دعا کر: ''پروردگار! ان پر مہربانی فرما جس طرح انھوں نے مجھے بچپن میں پالا ہے —— جب ماں یا باپ دونوں بوڑھے ہو جاتے ہیں اور وہ اولاد کی خدمت کے محتاج ہو جاتے ہیں اور ان کی زندگی اولاد کے رحم وکرم پر رہ جاتی ہے اس وقت اگر اولاد کی طرف سے ذرا سی بھی بے رخی محسوس ہو تو وہ ان کے دل کا زخم بن جاتی ہے۔نیز بڑھاپے میں انسان طبعی طور پر چڑچڑا ہو جاتا ہے۔عقل وفہم بھی جواب دینے لگتے ہیں اور خواہشات ومطالبات بھی کچھ ایسے ہو جاتے ہیں کہ ان کا پورا کرنا مشکل ہو جاتا ہے اس لئے اللہ پاک نے ان حالات میں والدین کی دل جوئی اور راحت رسانی کے احکام دینے کے ساتھ انسان کو اس کا بچپن یاد دلایا کہ کسی وقت تم بھی والدین کے اس سے زیادہ محتاج تھے جس قدر آج وہ تمہارے محتاج ہیں۔پس جس طرح انھوں نے اپنی راحت وخواہشات کو تم پر قربان کیا تھا اور تمہاری بے عقلی کی باتوں کو پیار کے ساتھ برداشت کیا تھا اب جبکہ ان پر محتاجی کا وقت آیا ہے: عقل وشرافت کا تقاضا یہ ہے کہ اُن کے سابق احسان کا بدلہ ادا کرو۔اور درج ذیل احکام کی پابندی کرو۔

پہلا حکم —— ان کو اُف تک مت کہو۔یعنی ان کی بات رد نہ کرو، نہ ٹال مٹول کرو، نہ ناگواری ظاہر کرو، عربی کے لفظ اُف سے مراد ہر ایسا کلمہ ہے جس سے آدمی اپنی ناگواری کا اظہار کرتا ہے اردو میں اس مفہوم کے لئے لفظ ''تُف'' اور ''ہوں'' وغیرہ مستعمل ہیں اسی طرح ان کی بات سن کر لمبا سانس لینا جس سے ناگواری ٹپکتی ہو وہ بھی اُف میں داخل ہے۔حضرت علی رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ آنحضرت ﷺ نے فرمایا: ''اگر ایذا رسانی کے لئے ''ہوں'' سے بھی کوئی کم درجہ ہوتا تو اللہ تعالیٰ یقیناً اس کو ذکر فرماتے۔پس حسن سلوک کرنے والا بولنے میں محتاط رہے تاکہ وہ جہنم میں نہ پہنچ جائے اور بدسلوکی کرنے والا جو چاہے کرے کیونکہ وہ جنت میں ہرگز نہیں جائے گا'' (قرطبی ۱۰:۲۴۳)

دوسرا حکم —— ماں باپ کو ڈانٹنا، جھڑکنا، گھرکنا اور بُرا بھلا کہنا ممنوع ہے کیونکہ یہ سخت ایذا رسانی ہے۔

تیسرا حکم ـــــ والدین کے ساتھ باادب گفتگو کی جائے،ان سے محبت وشفقت کے نرم لہجہ میں مخاطب ہوا جائے جس طرح کوئی غلام اپنے سخت مزاج آقا سے بات کرتا ہے وہی انداز اپنایا جائے۔اوران سے احترام کے ساتھ بات چیت کی جائے۔

چوتھا حکم ـــــ ماں باپ کے سامنے نیاز مندی،تحمل مزاجی،فروتنی اور انکساری سے کام لیا جائے خودسری سخت مزاجی،کھرّا پن،بدمزاجی اور بڑائی کا مظاہرہ نہ کیا جائے۔لفظ جناح کے معنی ہیں بازو اور الذل کے معنی ہیں تواضع اور انکساری کا بازو جھکانے کا مطلب یہ ہے کہ والدین کے سامنے اپنے آپ کو عاجز وذلیل آدمی کی صورت میں پیش کرے جیسے غلام آقا کے سامنے اپنے آپ کو پیش کرتا ہے ـــ اور من الرحمۃ(مہربانی سے) کا مطلب یہ ہے کہ والدین کے ساتھ یہ معاملہ محض دکھاوے کا نہ ہو بلکہ قلبی رحمت ومہربانی کی وجہ سے ہو۔

پانچواں حکم ـــــ والدین کی پوری راحت رسانی انسان کے بس کی بات نہیں۔پس مقدور بھر راحت رسانی کی فکر کرے اوران کے لئے اللہ تعالیٰ سے دعا کرتا رہے کہ:"الٰہی اپنی رحمت سے ان کی سب مشکلات کو آسان فرما!اورتمام تکلیفوں کو دور فرما کیونکہ جب میں بالکل کمزور اور ناتواں تھا،انھوں نے میری تربیت میں خون پسینہ ایک کیا تھا۔میرے لئے ہر راحت وخوبی کی فکر کی تھی آفات وحوادث سے بچانے کے لئے کوشش کی تھی۔بارہا میری خاطر اپنی جان جوکھوں میں ڈالی تھی آج ان کی ضعیفی کا وقت ہے جو کچھ میری قدرت میں ہے ان کی خدمت وتعظیم کرتا ہوں،لیکن پورا حق ادا نہیں کرسکتا۔اس لئے بارالٰہا!آپ سے درخواست کرتا ہوں کہ اس بڑھاپے میں بھی اوروفات کے بعد بھی ان پر نظر کرم فرما۔

فائدہ(۱):والدین میں سے کوئی ایک یا دونوں کا مطلب یہ ہے کہ بعض مرتبہ والدین دونوں ہی بڑھاپے کی حد تک پہنچنے سے پہلے اللہ کو پیارے ہوجاتے ہیں اوراولاد بڑھاپے کے زمانہ میں خدمت سے محروم رہ جاتی ہے اور کبھی کوئی ایک فوت ہوجاتا ہے اورایک بڑھاپے کے زمانہ تک زندہ رہتا ہے یا ایک جوان یا طاقت وقوت رکھنے والا ہوتا ہے اور ایک بیمار،ناتواں اورضعیف ہوتا ہے تو اس صورت میں اولاد کو بوڑھے بیمار اور کمزور کی چاکری کی طرف زیادہ توجہ دینی چاہئے اور کبھی ایسا ہوتا ہے کہ والدین دونوں ہی زندہ رہتے ہیں اور بڑھاپے کی حدود کو چھو لیتے ہیں تو اولاد کو ان کی خدمت کے لئے کمر ہمت کس لینی چاہئے،کیونکہ بوڑھے ماں باپ کی خدمت دخول جنت کا ذریعہ ہے۔حدیث شریف میں ہے کہ آنحضرت ﷺ نے ارشاد فرمایا:"اس کی ناک خاک آلود ہو!اس کی ناک خاک آلود ہو!!اس کی ناک خاک آلود ہو!!!صحابہ نے پوچھا:کس کی یارسول اللہ؟آپؐ نے فرمایا:"اس کی جس نے اپنے والدین کے بڑھاپے کا زمانہ پایا،ان میں سے ایک کا یا دونوں کا،پھر اس نے(ان کی خدمت کرکے)جنت حاصل نہ کرلی"(مشکوٰۃ حدیث ۴۹۱۲)

فائدہ(۲): بڑھاپے میں والدین کی خدمت کرنے سے آفتیں اور بلائیں بھی ٹلتی ہیں ایک لمبی حدیث میں قصہ ہے کہ تین شخص بارش سے بچنے کے لئے ایک غار میں پناہ گزیں ہوگئے۔ایک چٹان لُڑھکی اور غار کے منہ پر آپڑی اور دہانہ بند ہوگیا۔ان لوگوں نے آپس میں طے کیا کہ اب اعمال صالحہ کو وسیلہ بنا کر دعا کرنے کے علاوہ کوئی چارہ نہیں۔ آؤ ہر شخص اپنا کوئی نیک عمل یاد کرے اور اس کا واسطہ دے کر دعا کرے تا کہ اللہ تعالیٰ اس مصیبت سے رستگاری عطا فرماویں۔ چنانچہ ان میں سے ایک نے دعا شروع کی: خدایا! میرے بوڑھے ماں باپ تھے،اور میرے ننھے ننھے بچے بھی تھے میں جب شام کو بکریاں چرا کر گھر لوٹتا اور بکریوں کو دوھتا تو پہلے والدین کو دودھ پلاتا پھر بچوں کو۔ایک دن ایسا ہوا کہ میں بکریوں کو چراتا ہوا دور نکل گیا اور شام لوٹنے میں دیر ہوگئی جب میں لوٹا تو دیکھا کہ والدین سو چکے ہیں۔ میں نے حسب معمول بکریوں کو دوھا اور دودھ لیکر آیا اور ان کے سر کے پاس کھڑا ہوگیا۔ میں نے ان کو بیدار کرنا مناسب نہ سمجھا اور پہلے بچوں کو دودھ پلانا بھی مجھے گوارہ نہ ہوا بچے بھوک سے میرے قدموں میں بلکتے رہے اور میں اسی طرح کھڑا رہا۔ یہاں تک کہ صبح ہوگئی،الٰہی! اگر میرا یہ عمل آپ کی خوشنودی کے لئے تھا تو چٹان ہٹا تا کہ ہم آسمان دیکھ سکیں، چنانچہ چٹان اتنی ہٹ گئی کہ ان لوگوں کو آسمان نظر آنے لگا۔ پھر دوسرے دو شخصوں نے اپنے اپنے اعمال صالحہ کا واسطہ دیکر دعا کی تو چٹان اتنی ہٹ گئی کہ وہ نکل کر چل دیئے (متفق علیہ،مشکوٰۃ حدیث ۴۹۳۸)

اس حدیث سے معلوم ہوا کہ بڑھاپے میں والدین کے ساتھ حسن سلوک کرنا اور اخلاص سے خدمت کرنا آفتوں اور بلاؤں کو ٹالتا ہے۔

اس کے بعد ایک خلجان دور کیا جاتا ہے اور وہ یہ ہے کہ بعض مرتبہ بوڑھے ماں باپ کے ساتھ عرصۂ دراز گذارنا پڑتا ہے اور شب و روز ہمیشہ یکساں نہیں ہوتے آدمی کی طبیعت بھی ہمیشہ قابو میں نہیں رہتی اس لئے ایسا ہوسکتا ہے کہ بوڑھے والدین کے ساتھ برتاؤ میں احکام خداوندی کی خلاف ورزی یا کوتاہی ہوجائے۔اس نازک صورت حال کے بارے میں ارشاد ہے ـــــ تمہارے پروردگار تمہارے دلوں کی باتوں کو خوب جانتے ہیں اگر تم نیک (سعادت مند) ہوئے تو اللہ تعالیٰ یقیناً توبہ کرنے والوں کے حق میں بڑی بخشش فرمانے والے ہیں ـــــ یعنی اگر واقعۃً تم نیک دل اور سعادت مند ہوئے اور اخلاص وحق شناسی کے ساتھ والدین کی خدمت کی وہ تمہاری کوتاہیوں اور خطاؤں کو معاف فرمادیں گے۔

والدین کے ساتھ حسن سلوک کرنے سے آخرت کے درجات میں ترقی کے علاوہ عمر میں برکت ہوتی ہے (حدیث شریف)

وَاٰتِ ذَاالْقُرْبٰی حَقَّهٗ وَالْمِسْكِيْنَ وَابْنَ السَّبِيْلِ وَلَا تُبَذِّرْ تَبْذِيْرًا ﴿٢٦﴾ اِنَّ الْمُبَذِّرِيْنَ كَانُوْٓا اِخْوَانَ الشَّيٰطِيْنِ ؕ وَكَانَ الشَّيْطٰنُ لِرَبِّهٖ كَفُوْرًا ﴿٢٧﴾ وَاِمَّا تُعْرِضَنَّ عَنْهُمُ ابْتِغَآءَ رَحْمَةٍ مِّنْ رَّبِّكَ تَرْجُوْهَا فَقُلْ لَّهُمْ قَوْلًا مَّيْسُوْرًا ﴿٢٨﴾ وَلَا تَجْعَلْ يَدَكَ مَغْلُوْلَةً اِلٰى عُنُقِكَ وَلَا تَبْسُطْهَا كُلَّ الْبَسْطِ فَتَقْعُدَ مَلُوْمًا مَّحْسُوْرًا ﴿٢٩﴾ اِنَّ رَبَّكَ يَبْسُطُ الرِّزْقَ لِمَنْ يَّشَآءُ وَيَقْدِرُ ؕ اِنَّهٗ كَانَ بِعِبَادِهٖ خَبِيْرًۢا بَصِيْرًا ﴿٣٠﴾

وَاٰتِ (1)	اور دے تو	وَكَانَ	اور ہے	لَهُمْ	ان سے
ذَاالْقُرْبٰی	رشتہ دار کو	الشَّيْطٰنُ	شیطان	قَوْلًا	بات
حَقَّهٗ	اس کا حق	لِرَبِّهٖ	اپنے رب کا	مَّيْسُوْرًا	نرم (آسان)
وَالْمِسْكِيْنَ	اور محتاج کو	كَفُوْرًا (3)	بڑا ناشکرا	وَلَا تَجْعَلْ	اور نہ کر تو
وَابْنَ السَّبِيْلِ	اور مسافر کو	وَاِمَّا	اور اگر	يَدَكَ	اپنا ہاتھ
وَلَا تُبَذِّرْ (2)	اور بے موقع نہ اڑا تو	تُعْرِضَنَّ (4)	پہلوتہی کرے تو	مَغْلُوْلَةً (5)	بندھا ہوا
تَبْذِيْرًا	جی کھول کر	عَنْهُمُ	ان سے	اِلٰى عُنُقِكَ	اپنی گردن سے
اِنَّ	بیشک	ابْتِغَآءَ	چاہتے ہوئے	وَلَا تَبْسُطْهَا	اور نہ کھول دے اس کو
الْمُبَذِّرِيْنَ	فضول خرچی کرنے والے	رَحْمَةٍ	مہربانی (روزی)	كُلَّ الْبَسْطِ	پوری طرح کھول دینا
كَانُوْٓا	ہیں وہ	مِّنْ رَّبِّكَ	اپنے رب کی	فَتَقْعُدَ	پس بیٹھ رہے تو
اِخْوَانَ	بھائی بند	تَرْجُوْهَا	جس کی امید رکھتا ہے تو	مَلُوْمًا	الزام خوردہ (ملامت
الشَّيٰطِيْنِ	شیطانوں کے	فَقُلْ	تو کہہ		کیا ہوا)

(۱) آتِ (فعل امر) ضمیر مستتر فاعل ذا القربی مفعول اول حقَّهٗ، مفعول ثانی اور المسکین معطوف مفعول اول پر (۲) تَبْذِیر کے معنی ہیں تفریق اور پراگندہ کرنا۔ تبذیر اصل میں زمین میں بَذْر (بیج) ڈالنے اور پھینکنے کا نام ہے اور بیج ڈالنا اس شخص کی نظر میں جو مآل کار سے واقف نہ ہو غلہ ضائع کرنا ہے اس لئے بطور استعارہ انجام سوچے بغیر مال فضول ضائع کرنے کے لئے تبذیر کا لفظ مستعمل ہونے لگا (۳) کفور (صفت مشبہ) ناشکرا (۴) تعرضن از اعراض: منہ پھیر لینا، تغافل برتنا (۵) مَغْلُوْلَةً (اسم مفعول) بالکل بندھا ہوا غلَّ (ن) غلاً: ہاتھ میں ہتھکڑیاں یا گلے میں طوق ڈالنا

مَّحْسُوْرًا (۱)	تہی دست (درماندہ)	الرِّزْقَ	روزی	اِنَّهٗ كَانَ	بیشک وہ ہیں
اِنَّ	بیشک	لِمَنْ	جس کے لئے	بِعِبَادِهٖ (۲)	اپنے بندوں کو
رَبَّكَ	آپ کے رب	يَّشَآءُ	چاہتے ہیں	خَبِيْرًا	خوب جاننے والے
يَبْسُطُ	کشادہ کرتے ہیں	وَيَقْدِرُ	اور تنگ کرتے ہیں	بَصِيْرًا	خوب دیکھنے والے

تیسرا حکم —— رشتہ داروں کو ان کا حق دینا —— والدین کے حقوق بیان کرنے کے بعد، اب دوسرے رشتہ داروں کے حقوق بیان فرمارہے ہیں —— اور رشتہ دار کو اس کا حق دے —— رشتہ دار خواہ نزدیک کا ہو یا دور کا اس کا یہ حق تو ہے ہی کہ اس کے ساتھ اچھا معاملہ کیا جائے۔ اور اگر وہ محتاج بھی ہو تو مقدور بھر اس کا مالی تعاون بھی ضروری ہے —— اور حق کہہ کر اس طرف اشارہ کیا ہے کہ یہ دینا کوئی احسان نہیں، وہ اس کا حق ہے، اور دینے والا اپنا فرض ادا کر رہا ہے۔

چوتھا حکم —— اور محتاج و مسافر کو بھی —— ان کا حق دے یعنی ان کے ساتھ بھی حسن سلوک کر، خواہ وہ رشتہ دار ہوں یا نہ ہوں یعنی پردیسیوں اور مسافروں کا بھی خیال رکھ۔

رشتہ دار اور محتاج و مسافر پر خرچ کرنے میں تفاوت: جب اللہ تعالیٰ نے رشتہ داروں پر خرچ کرنے کا حکم دیا تو آتِ کا مفعول ثانی حَقَّه کو ظاہر فرمایا، اور جب محتاجوں اور مسافروں پر خرچ کرنے کا حکم دیا تو اس کو حذف کر دیا۔ اس انداز تعبیر میں دونوں حقوق میں تفاوت کی طرف اشارہ ہے وہ تفاوت درج ذیل ہے:

غریبوں محتاجوں اور مسافروں پر خرچ کرنا شرعاً واجب نہیں، محض کار خیر ہے اور ذی رحم محرم اگر عورت یا بچہ ہو، اور ان کے پاس گذارے کا سامان نہ ہو، نہ کمانے پر وہ قادر ہوں، یا اپاہج یا اندھے ہوں یا کسی اور طرح سے معذور ہوں اور ان کی ملک میں اتنا مال بھی نہ ہو، جس سے ان کا گذارا چل سکے، تو ایسے لوگوں کا نفقہ (خرچ) رشتہ داروں میں سے اس شخص پر واجب ہے جو مالی وسعت رکھتا ہو یعنی وہ اُس نصاب کا مالک ہو جس کی وجہ سے صدقۂ فطر اور قربانی وغیرہ واجب ہوتے ہیں اور اگر ایک ہی درجہ کے کئی رشتہ دار ایسی مالی وسعت رکھتے ہوں تو سب پر حصہ رسد نفقہ واجب ہوگا۔

مسئلہ: ایسے رشتہ داروں کو زکوٰۃ دینا بھی جائز ہے بلکہ اس میں دُوہرا اجر ہے ایک صدقے کا دوسرا صلہ رحمی کا۔ زکوٰۃ صرف میاں بیوی ایک دوسرے کو نہیں دے سکتے اسی طرح اصول و فروع کو بھی زکوٰۃ دینا جائز نہیں۔ اصول وہ

(۱) محسور (اسم مفعول) تھکا ہوا حَسَرَ (ن) البعیر اونٹ کو تھکا دینا (۲) بِعِبَادِہ: خَبِيْرًا اور بَصِيْرًا سے علی سبیل التنازع متعلق ہے ۱۲

ہیں جن سے آدمی پیدا ہوتا ہے یعنی ماں باپ، دادا دادی اور نانا نانی اوپر تک۔ اور فروع وہ ہیں جو آدمی سے پیدا ہوتے ہیں یعنی بیٹا بیٹی، پوتا پوتی، نواسا نواسی نیچے تک ان کو زکوٰۃ دینا جائز نہیں، باقی رشتہ داروں کو جیسے بھائی، بہن، چچا، پھوپی، خالہ، ماموں وغیرہ کو اگر وہ غریب ہوں تو زکوٰۃ دینا درست ہے۔

مسئلہ: جو زکوٰۃ کا حکم ہے وہی تمام صدقات واجبہ کا ہے، یعنی صدقۂ فطر، منت کی چیزیں اور تمام کفارے بحکم زکوٰۃ ہیں۔

مسئلہ: صدقۂ نافلہ ہر غریب کو دیا جا سکتا ہے اگر چہ وہ ایسا قریبی رشتہ دار ہو جس کو زکوٰۃ دینا درست نہیں۔ صحیحین میں روایت ہے کہ ایک بار آنحضرت ﷺ نے عورتوں کو صدقہ کرنے کی ترغیب دی۔ حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ کی اہلیہ حضرت زینب رضی اللہ عنہا وعظ سن کر گھر لوٹیں۔ انھوں نے اپنے شوہر سے کہا: ''آپ نادار ہیں اور آنحضرت ﷺ نے ہمیں خیرات کرنے کا حکم دیا ہے۔ لہٰذا آپ جا کر حضور سے مسئلہ دریافت کریں اگر بیوی شوہر کو خیرات دے سکتی ہے تو میں آپ کو دوں ورنہ غریبوں پر خرچ کروں۔

حضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہ نے بیوی سے کہا: آپ ہی دریافت کرآئیں یعنی مجھے شرم آتی ہے کہ اپنے بارے میں ایسا مسئلہ دریافت کروں، حضرت زینب نے جا کر مسئلہ دریافت کیا تو آپؐ نے فرمایا: ''جائز ہے بلکہ شوہر کو خیرات دینے میں دُوہرا اجر ملے گا: ایک رشتہ داری کا، دوسرا خیرات کا'' (مشکوٰۃ حدیث ۱۹۳۴)

فضول خرچی کی ممانعت —— خرچ کرنے کے مواقع بتلانے کے ساتھ یہ بھی حکم دیا —— اور خوب ہاتھ کھول کر فضول خرچی مت کرو —— یعنی خدا کا دیا ہوا مال موقع محل میں خرچ کرو، فضول ضائع مت کرو، مال اللہ کی بڑی نعمت ہے، اس کی قدر کرو۔ مال کا حال یہ ہے کہ جب وہ کسی کے پاس وافر مقدار میں جمع ہو جاتا ہے تو مالدار آپے سے باہر ہو جاتا ہے، رسم ورواج میں، انیٹ گارے میں، عیش وعشرت میں اور رنگ رلیوں میں بے تحاشا خرچ کرنے لگتا ہے یہ شرعاً ممنوع ہے اور خوب ہاتھ کھول کر خرچ کرنے کا مطلب یہ ہے کہ معمولی اسراف سے بچنا تو مشکل ہے، بلکہ بعض مرتبہ احساس تک نہیں ہوتا کہ فضول خرچ ہو گیا۔ ایسی صورت میں ان شاء اللہ کچھ دارو گیر نہ ہوگی، لیکن اندھا دھنداڑانا اور بے تحاشہ خرچ کرنا، جس کو ہر کوئی کہے کہ یہ فضول خرچی ہے یہ قابل عفو نہیں اس لئے اس سے بچنے کی پوری کوشش کرنی چاہئے۔

تبذیر کے معنی — فضول خرچی کرنا ہیں یعنی مال کو بے موقع اور بے ضرورت خرچ کرنا اور اس کی دو قسمیں ہیں:

ا — معصیت بالذات میں خرچ کرنا، جیسے زنا، شراب، جوا وغیرہ میں خرچ کرنا۔ چونکہ یہ کام حرام ہیں اس لئے

ان کاموں میں کچھ بھی صرف کرنا حرام ہے۔

۲۔ معصیت بالغیر میں خرچ کرنا۔یعنی ایسے کاموں میں خرچ کرنا جو بجائے خود جائز ہیں مگران میں خرچ کرنے سے مقصود شہرت، تفاخر، ناموری اور ریت رواج کی پابندی ہو، تو یہ خرچ کرنا بھی شرعاً ممنوع ہے اور فضول خرچی کے دائرہ میں آتا ہے۔

اسراف کا حکم — اور مباح کاموں میں ضرورت سے زیادہ خرچ کرنا اسراف کہلاتا ہے اور وہ بھی ممنوع ہے۔ سورۃ الاعراف آیت ۳۱ میں ہے: ﴿كُلُوْا وَاشْرَبُوْا، وَلَاتُسْرِفُوْا اِنَّهٗ لَايُحِبُّ الْمُسْرِفِيْنَ﴾ ترجمہ: کھاؤ، پیو اور حد سے مت نکلو، بیشک اللہ تعالیٰ حد سے تجاوز کرنے والوں کو پسند نہیں فرماتے۔

فضول خرچی کس درجہ بری چیز ہے اور فضول خرچی کون لوگ کرتے ہیں، اس بارے میں ارشاد ہے کہ — فضول خرچی کرنے والے یقیناً شیطانوں کے بھائی ہیں — غور کیجئے! انسان کی اس سے زیادہ کیا مذہب ہو سکتی ہے کہ اس کو شیطان کی برادری کا ایک فرد قرار دیا جائے وہ شیاطین جو تمام برائیوں کا سرچشمہ ہیں ارشاد ہے — اور شیطان اپنے پروردگار کا ناشکرا بندہ ہے — پس جو اس کی پارٹی میں شامل ہوگا وہ بھی اللہ تعالیٰ کا ناشکرا بندہ ہو کر رہ جائے گا۔

آگے مزید تین باتیں بیان کی ہیں:

پہلی بات: اگر کسی کے پاس رشتہ داروں کو اور حاجت مندوں کو دینے کا انتظام نہ ہو یعنی وہ نادار ہو تو کیا کرے؟ ارشاد ہے — اور اگر تو ان لوگوں سے پہلو تہی کرے — یعنی حاجت مندوں، غریبوں اور رشتہ داروں کو مانگنے پر فوراً نہ دے سکے — اللہ کے اُس رزق کے انتظار میں جس کی تجھے امید ہے — یعنی بخیلی کی وجہ سے نہیں بلکہ ناداری کی وجہ سے نہ دے سکے — تو ان سے نرم بات کہہ — کوئی کڑوا اور دل شکن جواب مت دے، بلکہ یہ کہہ کہ ابھی انتظام نہیں جب اللہ تعالیٰ ہم کو دیں گے ہم تمہاری ضرور خدمت کریں گے۔

اور نرم بات کہنے کا حکم اس لئے ہے کہ حاجت مندوں اور مجبور انسانوں کا دل ویسے ہی ٹوٹا ہوا ہوتا ہے اگر ان سے دل خراش بات کہی جائے تو زخم پر نمک پاشی ہوگی اور میٹھے لہجے میں معذرت کی جائے تو وہ دل پر زیادہ بوجھ محسوس نہیں کریں گے۔

دوسری بات — صحیح مواقع میں اور برمحل خرچ کرنے کے لئے بھی ایک ضابطہ ہے جس کو ہمیشہ ملحوظ رکھنا ضروری ہے ارشاد ہے — اور تو اپنا ہاتھ گردن سے باندھ نہ لے — یعنی انتہائی کنجوس مت بن جا — اور

نہ اس کو بالکل ہی کھول دے ـــــ یعنی ایسا بھی مت کر کہ جو آیا سو دے ڈالا ـــــ ورنہ (پہلی حالت میں) ملامت کیا ہوا (اور دوسری حالت میں) تہی دست ہو کر رہ جائے گا ـــــ پہلی صورت میں سب لوگ کوسیں گے کہ کمبخت کنجوس مکھی چوس ہے اور دوسری صورت میں تہی دستی وبال جان بن جائے گی اور تو ہار کر رہ جائے گا۔

الغرض موقع اور محل میں بھی اعتدال سے خرچ کرنا چاہئے بالکل ہاتھ روک لینا مؤمن کے شان نہیں اور جو آیا سب کچھ لٹا دینا بھی مصلحت کے خلاف ہے۔ عام مسلمانوں کے لئے ضابطہ یہ ہے کہ میانہ روی اور اعتدال سے خرچ کیا جائے۔ حدیث شریف میں ہے کہ: خَيْرُ الصَّدَقَةِ مَا كَانَ عَنْ ظَهْرِ غِنًى بہترین خیرات وہ ہے جو مالداری کی پیٹھ سے ہو یعنی صدقہ کرنے کے بعد بھی آدمی کے پاس بقدر ضرورت باقی رہے (متفق علیہ مشکوٰۃ حدیث ۱۹۲۹)

تیسری بات ـــــ اہل حقوق پر خرچ کرنے کے لئے ذہن سازی کی گئی تاکہ انسان دل کی رغبت سے خرچ کرے ارشاد ہے ـــــ بیشک اللہ تعالیٰ جس کے لئے چاہتے ہیں روزی کشادہ کرتے ہیں اور (جس کے لئے چاہتے ہیں) تنگ کرتے ہیں یقیناً وہ اپنے بندوں کے احوال سے پوری طرح باخبر ہیں اور انہیں دیکھ رہے ہیں ـــــ یعنی اللہ تعالیٰ نے دولت کی تقسیم حکمت و مصلحت سے کی ہے جس کسی کے مناسب وسعتِ رزق تھی اس کے ذرائع رزق وسیع کر دیئے اور جس کے لئے اس کے برعکس مصلحت تھی اس کے لئے ذرائع رزق تنگ کئے۔ پس جو کچھ ہو رہا ہے اندھا دھند بغیر کسی حکمت و مصلحت کے نہیں ہو رہا ہے، بلکہ آئین حکمت کے مطابق ہو رہا ہے۔

اس آیت میں خرچ کرنے کا ذہن بنایا گیا ہے لوگوں سے کہا گیا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اپنی حکمت بالغہ سے تمہیں رزق دیا ہے، تمہارے پاس چار پیسے جمع ہیں اور تم کھاتے پیتے ہو اور تمہارے اعزا، اور دیگر اہل حاجات تمہارے دست نگر ہیں سوچو! یہ نقشہ الٹا بھی ہو سکتا تھا تم نادار ہوتے اور وہ مالدار ہوتے پھر تم کیسی للچائی نظروں سے ان کی خوشحالی دیکھتے اور یہ بات بھی نہ بھولو کہ آئندہ بھی احوال بدل سکتے ہیں وہ مالدار اور تم فلاکت زدہ ہو سکتے ہو پس آج اللہ تعالیٰ نے تم پر جو نعمت کی ہے اس کی قدر کرو اور اس میں سے حقداروں کے حقوق ادا کرو۔ اس سے پہلے کہ پانسا پلٹ جائے، تم پر روزی تنگ ہو جائے اور ان پر کشادہ ہو جائے۔

دولت ڈھلتی چھاؤں ہے، آج اِدھر تو کل اُدھر ہے۔ خوش نصیب وہ ہے جو اس نعمت سے بروقت فائدہ اٹھالے

وَلَا تَقْتُلُوٓا اَوْلَادَكُمْ خَشْيَةَ اِمْلَاقٍ ۭ نَحْنُ نَرْزُقُهُمْ وَاِيَّاكُمْ ۭ اِنَّ قَتْلَهُمْ كَانَ خِطْاً كَبِيْرًا ﴿۳۱﴾

وَلَا تَقْتُلُوْٓا	اور تم قتل مت کرو	نَحْنُ	ہم	قَتْلَهُمْ	ان کا قتل
اَوْلَادَكُمْ	اپنی اولاد کو	نَرْزُقُهُمْ	روزی دیں گے ان کو	كَانَ	ہے
خَشْيَةَ[1]	اندیشہ سے	وَاِيَّاكُمْ	اور تم کو	خِطْاً[3]	گناہ
اِمْلَاقٍ[2]	ناداری (افلاس) کے	اِنَّ	بے شک	كَبِيْرًا	بڑا (بھاری)

گذشتہ آیات میں وہ چار احکام دیئے ہیں جو مأمورات کے قبیل سے ہیں۔ اب وہ احکام دیئے جارہے ہیں جو منہیات کے قبیل سے ہیں۔ مأمورات وہ کام ہیں جن کا کرنا ضروری ہے اور منہیات وہ کام ہیں جن سے بچنا ضروری ہے اور منہیات کی اہمیت مامورات سے زیادہ ہے جیسا کہ بارہ احکام کے آخیر میں یہ بات آئے گی۔

پانچواں حکم ــــ محتاجگی کے ڈر سے اولاد کو قتل کرنے کی ممانعت ــــ اور افلاس کے ڈر سے اپنی اولاد کو قتل مت کرو، ان کو بھی ہم روزی دیں گے اور تم کو بھی، یقیناً ان کا قتل بڑا بھاری گناہ ہے ــــ اولاد کا قتل کبھی تو مفلسی کی وجہ سے کیا جاتا ہے اور کبھی مفلسی کے ڈر سے یعنی قتل اولاد کی ایک صورت تو یہ ہے کہ سر دست غربت ہے اس لئے سوچتا ہے کہ خود ہی کھانے کو نہیں، اولاد ہوگی تو کہاں سے کھلاؤں گا۔ دوسری صورت یہ ہے کہ فی الحال تو فلاکت زدہ نہیں، مگر اندیشہ ہے کہ اگر اولاد شروع ہوئی تو موجودہ آمدنی کافی نہیں ہوگی۔ اس لئے اولاد کو قتل کرتا ہے یا ان کے ہونے کو روکتا ہے ــــ قتل اولاد کی دونوں صورتیں حرام ہیں۔ پہلی صورت کا حکم سورۃ الانعام کی آیت ۱۵۱ میں گذر چکا ہے اور دوسری صورت کا حکم اس آیت میں ہے۔ وہاں مِنْ اِمْلَاقٍ (مفلسی کی وجہ سے) فرمایا تھا اور یہاں خَشْيَةَ اِمْلَاقٍ (مفلسی کے ڈر سے) فرمایا ہے اور وہاں نَرْزُقُكُمْ مقدم تھا اور یہاں اِيَّاكُمْ مؤخر ہے، کیونکہ پہلی صورت میں اپنا فکر سر دست ہے اور اولاد کا بعد میں۔ اور یہاں اپنا کوئی اندیشہ نہیں، بلکہ اولاد ہی کے رزق کا فکر ہے۔

انسان خود کو اولاد کی روزی کا ذمہ دار تصور کرتا ہے، حالانکہ رزق انسان کے ہاتھ میں نہیں۔ اس اللہ کے ہاتھ میں ہے جس نے انسان کو وجود بخشا ہے۔ وہ جس طرح ماں باپ کو روزی پہنچا رہے ہیں، آنے والی اولاد کی بھی کفالت کریں گے، تجربہ یہ ہے کہ جوں جوں اولاد بڑھتی ہے تنگی دور ہوتی ہے۔ معاشی ذرائع دن بدن وسیع ہوتے ہیں اس لئے نظام باری میں دخل اندازی حماقت کے سوا کچھ نہیں!

مگر افسوس کہ قدیم زمانہ سے برابر ضبط ولادت، فیملی پلاننگ اور منع حمل کی تحریکات اٹھتی رہتی ہیں جس طرح دور

(۱) خَشْيَةَ اِمْلَاقٍ (مرکب اضافی) مفعول لہ ہے لَاتَقْتُلُوْا کا (۲) اِمْلَاق (مصدر) مفلسی تنگ دستی، أَمْلَقَ الرجلُ: محتاج ہونا۔ أَمْلَقَ الدَّهْرُ مَالَهُ: ضائع کر دینا (۳) خِطْأً مصدر خَطِئَ يَخْطِئُ: گناہ کرنا ۱۲

قدیم میں افلاس کا خوف قتل اولاد کا یا اسقاط حمل کا محرک ہوا کرتا تھا آج کا پڑھا لکھا انسان بھی محتاجگی کے ڈر سے اولاد کا گلا گھونٹ رہا ہے جو لوگ اللہ پر ایمان نہیں رکھتے وہ جو چاہیں کریں مگر اس مسلمان کو جو اللہ کی رزّاقیت پر ایمان رکھتا ہے یہ بات کسی طرح زیب نہیں دیتی کہ افلاس کے موہوم ڈر سے نسل کُشی کرے۔

روزی کے طالبو! اولاد بھی روزی ہے اور ایک روزی سے دوسری روزی کا دروازہ کھلتا ہے!

وَلَا تَقْرَبُوا الزِّنَىٰٓ إِنَّهُۥ كَانَ فَاحِشَةً وَسَآءَ سَبِيلًا ﴿٣٢﴾ وَلَا تَقْتُلُوا النَّفْسَ الَّتِى حَرَّمَ اللَّهُ إِلَّا بِالْحَقِّ ۗ وَمَن قُتِلَ مَظْلُومًا فَقَدْ جَعَلْنَا لِوَلِيِّهِۦ سُلْطَٰنًا فَلَا يُسْرِف فِّى الْقَتْلِ ۖ إِنَّهُۥ كَانَ مَنصُورًا ﴿٣٣﴾

وَلَا تَقْرَبُوا	اور نزدیک مت جاؤ	النَّفْسَ	اس شخص کو	فَقَدْ جَعَلْنَا	پس تحقیق رکھا ہم نے
الزِّنَىٰٓ	زنا کے	الَّتِى	جس کو	لِوَلِيِّهِۦ	اس کے وارث کے لئے
إِنَّهُۥ كَانَ	بے شک وہ ہے	حَرَّمَ اللَّهُ	حرام کیا ہے اللہ نے	سُلْطَٰنًا	اختیار
فَاحِشَةً	بے حیائی	إِلَّا بِالْحَقِّ	مگر حق کی وجہ سے	فَلَا يُسْرِف	پس حد سے تجاوز نہ کرے وہ
وَسَآءَ	اور بُری	وَمَن	اور جو شخص	فِّى الْقَتْلِ	قتل کرنے میں
سَبِيلًا	راہ	قُتِلَ	قتل کیا گیا	إِنَّهُۥ كَانَ	بیشک وہ (مظلوم) ہے
وَلَا تَقْتُلُوا	اور قتل مت کرو	مَظْلُومًا	ناحق	مَنصُورًا	مدد کیا ہوا

چھٹا حکم ــــ زنا کی ممانعت ــــ اور زنا کے قریب مت جاؤ، وہ یقیناً بے حیائی اور بری راہ ہے ــــ یعنی زنا بھی حرام ہے اور زنا کی طرف دعوت دینے والی چیزیں بھی حرام ہیں مثلاً غیر محرم کو بری نظر سے دیکھنا، چھونا، بات چیت کرنا، اور دلچسپی سے غیر محرم کی باتیں سننا ــــ اور زنا کی حرمت کی بڑی وجہ اس کا بے حیائی ہونا ہے۔ بے حیائی کا عام مفہوم یہ ہے کہ انسان انسانیت کی چادر اتار دے، چاہے کھلے بندوں اتار دے، چاہے چھپ کر اتار دے۔ اور جب حیا گئی تو انسان میں اور جانور میں کیا فرق رہ گیا؟!

حدیث میں ہے: ''جب تیری حیا جاتی رہے تو جو چاہے کر'' (مشکوٰۃ حدیث ۵۰۷۲) حیا ہی گناہوں سے انسان کی حفاظت کرتی ہے۔ جب تک حیا کا ساتھ ہے شیطان ناکام رہتا ہے۔ جب حیا اٹھ جاتی ہے شیطان کامیاب ہو جاتا

ہے۔اسی وجہ سے حیا کو ایمان کی اہم ٹہنی قرار دیا گیا ہے (مشکوٰۃ حدیث ۵)

اور بے حیائی نگاہ سے لے کر قدم تک ہر چیز سے سرزد ہوسکتی ہے۔احساسات بھی بے حیا ہوسکتے ہیں اور دست وبازو بھی۔اور بے حیائی بالآخر انسان کو وہاں لے جا کر پھینکتی ہے جہاں سے اٹھا نصیب نہیں ہوتا۔حدیث میں ہے: ’’انسان کے نصیب میں زنا کا جو حصہ لکھ دیا گیا ہے، وہ اُسے پہنچ کر رہتا ہے: آنکھوں کا زنا دیکھنا ہے، کانوں کا زنا سننا ہے، زبان کا زنا بات چیت کرنا ہے، ہاتھ کا زنا پکڑنا ہے، پاؤں کا زنا چلنا ہے اور دل خواہش کرتا ہے اور شرمگاہ اس کی تکمیل کرتی ہے یا باز رہتی ہے‘‘ (رواہ ابوداؤد)

زنا کی حرمت کی دوسری وجہ —— یہ ہے کہ وہ بدراہی ہے۔اس کی وجہ سے معاشرتی خرابیاں پیدا ہوتی ہیں اور فساد برپا ہوتا ہے اور اتنا پھیلتا ہے کہ اس کی کوئی حد نہیں رہتی۔آج دنیا فساد اور بگاڑ سے بھری ہوئی ہے اگر حالات کی چھان بین کی جائے تو آدھے سے زیادہ واقعات کا سبب زنا نکلے گا۔اسی وجہ سے اس جرم کو تمام جرائم سے سخت قرار دیا گیا ہے اور اس کی سزا بھی دیگر جرائم سے سخت رکھی گئی ہے۔کیونکہ یہ ایک جرم ہی سینکڑوں جرائم پیدا کرتا ہے۔ احادیث میں زنا پر سخت وعیدیں آئی ہیں۔

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ قیامت کے دن اللہ تعالیٰ تین شخصوں سے بات نہیں کریں گے، نہ ان کو گناہوں سے پاک کریں گے، نہ ان کی طرف نظر رحمت فرمائیں گے بلکہ ان کو دردناک سزا دیں گے۔ایک بوڑھا زناکار۔دوسرا جھوٹا حاکم۔تیسرا نادار گھمنڈی (مشکوٰۃ حدیث ۵۱۰۹)

دوسری حدیث میں حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ زنا کرنے والا زنا کرتے وقت مؤمن نہیں رہتا، چوری کرنے والا چوری کرتے وقت مؤمن نہیں رہتا۔شراب پینے والا شراب پیتے وقت مؤمن نہیں رہتا، اور لوٹ مچانے والا جب کوئی ایسی لوٹ مچاتا ہے کہ لوگ حیرت سے آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر اس کو دیکھتے ہیں تو وہ مؤمن نہیں رہتا اور قومی مال میں خیانت کرنے والا جب خیانت کرتا ہے تو وہ مؤمن نہیں رہتا۔پس ان گناہوں سے بچو ان گناہوں سے بچو! (مشکوٰۃ حدیث ۵۳)

اس حدیث کی شرح ایک دوسری حدیث میں آئی ہے کہ ان جرائم کے مرتکب جب مبتلائے جرم ہوتے ہیں تو ایمان ان کے قلب سے نکل کر باہر آجاتا ہے۔پھر جب وہ اس جرم سے فارغ ہوتے ہیں تو ایمان واپس لوٹ جاتا ہے۔

مسند احمد میں یہ واقعہ ہے کہ ایک شخص نے رسول اللہ ﷺ سے زنا کی اجازت چاہی۔حاضرین نے اُسے ڈانٹ پلائی خبردار! چپ رہو۔حضور نے اس سے فرمایا: ’’میرے قریب آؤ‘‘ وہ قریب آکر بیٹھ گیا آپؐ نے ارشاد فرمایا: کیا تو یہ

حرکت اپنی ماں، بیٹی، بہن، پھوپی، خالہ کے ساتھ پسند کرتا ہے؟ اس نے عرض کیا: یارسول اللہ! خدا مجھ کو آپ پر قربان کرے، ہرگز نہیں! آپؐ نے فرمایا: پس سوچ، دوسرے لوگ بھی اپنی ماؤں، بیٹیوں، بہنوں، پھوپیوں اور خالاؤں کے ساتھ یہ فعل گوارا نہیں کرتے۔ پھر آپ نے دعا فرمائی کہ اے اللہ! اس کے گناہ کو معاف فرما اور اس کے دل کو پاک کر اور شرمگاہ کو محفوظ فرما۔ حضرت ابوامامہ رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ اس دعا کے بعد اس شخص کی یہ حالت ہوگئی کہ کسی عورت وغیرہ کی طرف نگاہ اٹھا کر نہیں دیکھتا تھا۔

شراب، ناچ گانا، ٹی وی، وی سی آر، تصاویر اور بے پردگی زنا کے چور دروازے ہیں ان سے کلی اجتناب کرو

ساتواں حکم ـــــ قتل ناحق کی ممانعت ـــــ اور جس جان کو اللہ تعالیٰ نے حرام کیا ہے اس کو قتل مت کرو مگر حق کی وجہ سے ـــــ یعنی شرعاً جن صورتوں میں قتل کرنا جائز یا واجب ہے وہ مستثنٰی ہیں۔ اور وہ پانچ قتل ہیں (۱) کسی قاتل کو قصاص میں قتل کرنا (۲) باغیوں کو یعنی اسلامی نظام حکومت کو الٹنے کی سعی کرنے والوں کو قتل کرنا (۳) مُحْصِنْ (شادی شدہ مرد) اور مُحْصَنَہْ (شادی شدہ عورت) کو ارتکاب زنا کی سزا میں سنگسار کرنا (۴) ارتداد کی سزا میں قتل کرنا (۵) دین سے مزاحمت کرنے والوں کو جہاد میں قتل کرنا۔

یہی پانچ صورتیں ہیں جن میں انسانی جان کی حرمت مرتفع ہوجاتی ہے اور اسے قتل کرنا جائز ہوجاتا ہے اس کے علاوہ کسی صورت میں قتل کرنا جائز نہیں۔ وہ قتل ناحق ہے مگر آج انسان بہت بڑے پیمانہ پر قتل ناحق کررہا ہے۔ نتیجہ ہمارے سامنے ہے کہ عداوت اور جنگ اس دنیا کی تقدیر بن گئی ہے۔

اور قتل نفس سے صرف دوسرے انسان کا قتل ہی مراد نہیں بلکہ اپنے آپ کو قتل کرنا بھی اس میں داخل ہے۔ اپنا نفس بھی ایک محترم نفس ہے پس جتنا جرم اور گناہ دوسرے انسان کو قتل کرنے کا ہے اتنا ہی بڑا جرم اور گناہ خودکشی کا بھی ہے، اور یہ سمجھنا بڑی غلط فہمی ہے کہ ہم اپنی جان کے مالک ہیں اور اس کو تلف کرنے کے مجاز ہیں۔ ہماری جان ہماری ملک نہیں اللہ تعالیٰ کی ملک ہے ہم نہ اس کے اتلاف کے مالک ہیں نہ بے جا استعمال کرنے کے۔ جو لوگ دنیا کی معمولی تکلیفوں سے گھبرا کر خودکشی کرلیتے ہیں وہ بہت بڑی تکلیف میں مبتلا کردیئے جاتے ہیں۔ حدیث میں ہے کہ جس شخص نے پہاڑ (بلندی) سے گر کر خودکشی کی وہ دوزخ میں پہاڑ سے گرنے کی سزا دیا جائے گا اور وہ اس میں ہمیشہ رہے گا اور جس نے زہر پی کر خودکشی کی اس کا زہر اس کے ہاتھ میں ہوگا وہ دوزخ میں اسی کو پیتا رہے گا، اور وہ اس میں تاابد مبتلا

رہے گا۔اور جس نے کسی دھاردار ہتھیار سے خودکشی کی اس کا ہتھیار اس کے ہاتھ میں ہوگا، اور وہ جہنم میں اس کو اپنے پیٹ میں گھونٹتا رہے گا اور وہ اس میں ہمیشہ رہے گا (متفق علیہ، مشکوٰۃ حدیث ۳۴۵۳)

اور یہ بھی یاد رکھنا چاہئے کہ قتل یہاں عرفی معنی میں نہیں ہے یعنی کسی کو دھاردار ہتھیار سے ختم کرنا ہی قتل نہیں ہے بلکہ یہ لفظ عام استعمال کیا گیا ہے یعنی کسی بھی طرح سے کسی کو ہلاک کرنا، زہر دینا، غلط دوا دینا جھوٹے مقدمے میں پھانس کر پھانسی دلوانا، کسی کو پیسے دیکر قتل کرانا، جادو کر کے یا کرا کے کسی کو ہلاک کرنا: سب صورتیں قتل ناحق میں داخل ہیں اور سورۃ النساء کی آیت ۹۳ میں اس پر سخت وعید آئی ہے۔

اور ''جس کو اللہ نے حرام کیا ہے'' کہہ کر قتل ناحق کی شناعت بڑھائی گئی ہے یعنی اس نفس کو محترم کسی ایسے ویسے نے نہیں بنایا، بلکہ اللہ تعالیٰ نے اس کو حرام کیا ہے پس اس کی حرمت کا پاس ولحاظ کرو اور خواہ مخواہ کسی کی جان کے پیچھے مت پڑو۔اللہ نے سب کو جینے کا حق دیا ہے اس کا یہ حق تسلیم کرو۔

آگے قتلِ ناحق پر ایک اور طرح سے روک لگائی گئی ہے، ارشاد ہے —— اور جو شخص ناحق قتل کیا گیا اس کے وارث کو ہم نے (قصاص لینے کا) اختیار دیا ہے پس وہ (وارث) قتل کرنے میں حد سے نہ بڑھے، یقیناً وہ مدد کیا ہوا ہے —— یعنی جو شخص کسی کو ناحق قتل کرنا چاہتا ہے وہ پہلے اپنا انجام سوچ لے، قتل کرنے کے بعد وہ بھی قصاص میں قتل کیا جائے گا۔ کیونکہ اللہ تعالیٰ نے مقتول کے وارث کو قصاص لینے کا حق دیا ہے پس اگر تم نے کسی کو ناحق قتل کیا تو تم بھی چند ہی روز زندہ رہ سکو گے۔ دیر سویر قصاصاً قتل کئے جاؤ گے ——اور مقتول کے وارث کو اللہ تعالیٰ نے جو اختیار دیا ہے وہ مطلق اختیار نہیں بلکہ محدود ہے وہ صرف قاتل ہی کو قصاصاً قتل کرسکتا ہے کسی دوسرے کو قتل نہیں کرسکتا۔ نیز قصاص لینے کا جو شرعی طریقہ ہے اسی طرح قتل کرسکتا ہے۔جس طرح چاہے قتل نہیں کرسکتا۔ پس وارث کو بھی چاہئے کہ وہ مقررہ حدود سے تجاوز نہ کرے، ورنہ بجائے مظلوم کے وہ ظالم ٹھہرے گا۔

اور آیت کے آخری حصہ میں ناحق قتل کرنے والوں کی ایک خاص ذہنیت کا علاج کیا گیا ہے۔ قاتل سوچتا ہے کہ مقتول کا وارث اور اس کا خاندان میرا کیا بگاڑ لے گا؟ میں زبردست ہوں، جتھے قبیلے والا ہوں مال دولت کی میرے پاس کمی نہیں، میرے تعلقات چاروں طرف ہیں۔ میں قتل کروں گا تو مجھ سے کون قصاص لینے کی ہمت کرے گا؟ اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا تو یہ نہ سمجھ کہ مقتول کا وارث تنہا اور بے سہارا ہے وہ مدد کیا ہوا ہے پوری نیک سوسائٹی اس کی مددگار ہے اور سب سے بڑی مددگار اسلامی حکومت ہے۔ وہ جب تک کمزور کے لئے زبردست ہے بدلہ نہیں لے گی چین سے نہیں بیٹھے گی۔ پس قتل کرنے کے بعد تیرا صفایا ضرور ہو کر رہے گا۔

آج کل جو دھڑ ادھڑ ناحق قتل ہو رہے ہیں وہ انہی دو سہاروں کے نہ رہنے کی وجہ سے ہو رہے ہیں آج کے بگڑے ہوئے ماحول میں لوگ مظلوم کی مدد کرنے کے لئے تیار نہیں ہوتے، اور وہ معذور بھی ہیں مظلوم کی مدد کرنے جاتے ہیں تو خود پھنس جاتے ہیں۔ چنانچہ قتل کے چشم دید گواہ بھی کورٹ میں گواہی دینے کی ہمت نہیں کرتے اس ڈر سے کہ کہیں انہیں بھی جان سے ہاتھ نہ دھو لینے پڑیں۔ اور جب گواہ پیش نہیں ہوتے تو مجرم بری ہو جاتا ہے۔

اور حکومت کا حال یہ ہے کہ آج سارے جرائم پولیس کے تغافل سے بلکہ تعاون سے ہوتے ہیں۔ جرم پیشہ آدمی پولیس سے ملی بھگت کر کے چشم زدن میں جس کو چاہتا ہے اڑا دیتا ہے اور کوئی اس کا بال بیکا نہیں کر سکتا، واقعہ یہ ہے کہ آج بھی پولیس مظلوم کا بے لاگ تعاون کرے تو کوئی کسی کی طرف آنکھ اٹھا کر نہیں دیکھ سکتا۔

وَلَا تَقْرَبُوْا مَالَ الْيَتِيْمِ اِلَّا بِالَّتِيْ هِيَ اَحْسَنُ حَتّٰى يَبْلُغَ اَشُدَّهٗ ۪ وَاَوْفُوْا بِالْعَهْدِ ۚ اِنَّ الْعَهْدَ كَانَ مَسْـُٔوْلًا ﴿۳۴﴾ وَاَوْفُوا الْكَيْلَ اِذَا كِلْتُمْ وَزِنُوْا بِالْقِسْطَاسِ الْمُسْتَقِيْمِ ۭ ذٰلِكَ خَيْرٌ وَّاَحْسَنُ تَاْوِيْلًا ﴿۳۵﴾

وَلَا تَقْرَبُوْا	اور نزدیک نہ جاؤ	اَشُدَّهٗ	اپنے سن بلوغ کو	اِذَا	جب
مَالَ الْيَتِيْمِ	یتیم کے مال کے	وَاَوْفُوْا	اور پورا کرو	كِلْتُمْ	ناپو
اِلَّا	مگر	بِالْعَهْدِ	عہد و پیمان کو	وَزِنُوْا	اور تولو
بِالَّتِيْ	اس (طریقہ) سے جو	اِنَّ الْعَهْدَ	بے شک عہد	بِالْقِسْطَاسِ	ترازو سے
هِيَ	(کہ) وہ	كَانَ	ہے وہ	الْمُسْتَقِيْمِ	سیدھی
اَحْسَنُ	اچھا ہے	مَسْـُٔوْلًا	باز پرس کیا ہوا	ذٰلِكَ خَيْرٌ	یہ بہتر
حَتّٰى	یہاں تک کہ	وَاَوْفُوا	اور پورا کرو	وَّاَحْسَنُ	اور اچھا (ہے)
يَبْلُغَ	پہنچ جائے وہ	الْكَيْلَ	ناپ کو	تَاْوِيْلًا	انجام کے اعتبار سے

آٹھواں حکم ـــــ یتیموں کے مال کو خرد برد کرنے کی ممانعت ـــــ اور یتیم کے مال کے پاس بھی مت جاؤ، مگر ایسے طریقہ سے جو کہ وہ اچھا ہے تا آنکہ وہ اپنے شباب کو پہنچ جائے ـــــ اور اپنے نفع نقصان کو سمجھنے لگے۔ اس وقت اس کا مال اس کے حوالہ کر دو۔

یتیم بچہ انسانیت کے باغ کا وہ نرم و نازک اور بے زبان پودا ہے جس کے سر پر شفقت کا ہاتھ پھیرنا، بڑی سے

بڑی سنگدلی کا کامیاب علاج ہے۔ اس کے ساتھ، اس کے مال کے ساتھ وہ برتاؤ کرنا چاہئے جو ہم اپنے بچوں کے بارے میں چاہتے ہیں۔ یتیم کی کفالت بڑا اجر وثواب کا کام ہے۔ احادیث میں اس کی بہت فضیلتیں آئی ہیں مگر اس میں خطرہ بھی ہے کیونکہ یتیم بے شعور ہوتا ہے اور اس کی طرف سے ولی سے باز پرس کرنے والا کوئی نہیں ہوتا اس لئے عام طور پر لوگ یتیموں کے اموال میں بے احتیاطی برتتے ہیں۔ چنانچہ سورۃ النساء آیت ۱۰ میں یتامی کے اموال کھانے پر سخت وعید آئی ہے، ارشاد ہے: ''جو لوگ بلا استحقاق یتیموں کا مال کھاتے ہیں وہ اپنے پیٹ میں آگ ہی بھر رہے ہیں اور عنقریب وہ جلتی ہوئی آگ میں داخل ہوں گے''

اور عام طور پر ایسا ہوتا ہے کہ جب کسی کا انتقال ہونے لگتا ہے تو وہ اپنے بچوں کی ذمہ داری خاندان کے کسی فرد کو یا کسی دوست کو سونپتا ہے اور اس سے عہد لیتا ہے کہ وہ اس کے بچوں کی پوری خبر گیری کرے گا۔ ایسے موقعہ پر لوگ وقتی طور پر وعدہ کر لیتے ہیں مگر بعد میں جب مرنے والے کی یاد دُھندلی پڑ جاتی ہے تو وعدہ کا ایفا نہیں کرتے۔ اس لئے آگے نواں حکم دیا:

نواں حکم —— قول وقرار کا پاس کرنا —— اور عہد و پیمان پورا کرو، عہد کے بارے میں یقیناً باز پرس ہونے والی ہے —— یعنی قیامت کے دن جیسے اور فرائض وواجبات اور احکامِ الٰہیہ کے بارے میں سوال ہوگا کہ ان کو پورا کیا یا نہیں؟ اسی طرح باہمی عہد و پیمان کے متعلق بھی سوال ہوگا۔ روزِ محشر آپ کا رشتہ دار یا دوست حبیب ہوگا اور پوچھا جائے گا کہ آپ نے آخری دم میں جو عہد و پیمان کیا تھا کہ آپ اس کے بچوں کی پوری نگہداشت کریں گے اور ان کو اپنے بچوں کی طرح پالیں گے۔ یہ عہد و پیمان آپ نے کہاں تک پورا کیا؟ اگر کما حقہ پورا کیا ہوگا تو وہ دن اپنے عزیز قریب اور دوست حبیب کے سامنے سرخروئی کا دن ہو، گا ورنہ کچھ ایسی پشیمانی ہوگی کہ بات بنائے نہ بنے گی۔

ملحوظہ: قول وقرار اور معاہدوں کے بارے میں تفصیلی کلام سورۃ الحجر آیت ۹۱ کی تفسیر میں گذر چکا ہے وہاں ملاحظہ فرمائیں۔

دسواں حکم —— ناپ تول میں کمی کرنے کی ممانعت —— اور جب پیمانے سے ناپو تو پورا ناپو —— جھوک مت مارو —— اور (جب ترازو سے تولو تو) صحیح ترازو سے تولو، یہ اچھی بات ہے، اور اس کا انجام بھی اچھا ہے —— اس سے اعتماد قائم ہوتا ہے اور تجارت کو فروغ ملتا ہے۔ دغا بازی چند دن چلتی ہے پھر جب لوگ باخبر ہو جاتے ہیں تو اس تاجر سے معاملہ چھوڑ دیتے ہیں اور صحیح معاملہ کرنے والا سب کو بھلا لگتا ہے اس لئے اس کی تجارت خوب چمکتی ہے اور آخرت میں اس کا مقام اتنا بلند ہے کہ تصور نہیں کیا جا سکتا۔ حدیث شریف میں ہے کہ: ''سچا امانت دار تاجر

انبیاء، صدیقین اور شہدا کے ساتھ ہوگا (رواہ الترمذی)

حلال وحرام یکساں نہیں، اگر چہ حرام کی کثرت لوگوں کو بھلی معلوم ہوتی ہے

وَلَا تَقْفُ مَا لَيْسَ لَكَ بِهٖ عِلْمٌ ؕ اِنَّ السَّمْعَ وَالْبَصَرَ وَالْفُؤَادَ كُلُّ اُولٰٓئِكَ كَانَ عَنْهُ مَسْئُوْلًا ﴿۳۶﴾ وَلَا تَمْشِ فِی الْاَرْضِ مَرَحًا ۚ اِنَّكَ لَنْ تَخْرِقَ الْاَرْضَ وَلَنْ تَبْلُغَ الْجِبَالَ طُوْلًا ﴿۳۷﴾ كُلُّ ذٰلِكَ كَانَ سَيِّئُهٗ عِنْدَ رَبِّكَ مَكْرُوْهًا ﴿۳۸﴾ ذٰلِكَ مِمَّآ اَوْحٰٓى اِلَيْكَ رَبُّكَ مِنَ الْحِكْمَةِ ؕ وَلَا تَجْعَلْ مَعَ اللّٰهِ اِلٰهًا اٰخَرَ فَتُلْقٰى فِیْ جَهَنَّمَ مَلُوْمًا مَّدْحُوْرًا ﴿۳۹﴾

وَلَا تَقْفُ (۱)	اور پیروی مت کر	عَنْهُ	اُن کے بارے میں	كُلُّ ذٰلِكَ	ہر ایک اُن (کاموں) سے
مَا لَيْسَ لَكَ	اس کی کہ نہیں ہے تجھے	مَسْئُوْلًا	باز پرس کیا ہوا	كَانَ	ہے
بِهٖ	اس کے بارے میں	وَلَا تَمْشِ	اور مت چل	سَيِّئُهٗ (۵)	اس کا بُرا
عِلْمٌ	کچھ علم	فِی الْاَرْضِ	زمین میں	عِنْدَ رَبِّكَ	تیرے رب کے نزدیک
اِنَّ	بے شک	مَرَحًا (۳)	اترا کر	مَكْرُوْهًا	ناپسندیدہ
السَّمْعَ	کان	اِنَّكَ	بے شک تو	ذٰلِكَ	یہ (احکام)
وَالْبَصَرَ	اور آنکھ	لَنْ تَخْرِقَ	ہرگز نہیں پھاڑ سکتا	مِمَّآ	اس میں سے ہیں جو
وَالْفُؤَادَ	اور دل	الْاَرْضَ	زمین کو	اَوْحٰٓى	وحی کی ہے تیری طرف
كُلُّ (۲)	سب	وَلَنْ تَبْلُغَ	اور ہرگز نہیں پہنچ سکتا	رَبُّكَ	تیرے رب نے
اُولٰٓئِكَ	ان (اعضاء) کا	الْجِبَالَ	پہاڑوں کو	مِنَ الْحِكْمَةِ (۶)	حکمت کی باتوں سے
كَانَ	ہے وہ (شخص)	طُوْلًا (۴)	لمبا ہوکر	وَلَا تَجْعَلْ	اور مت تجویز کر

(۱) لَا تَقْفُ (فعل نہی، صیغہ واحد مذکر حاضر) قَفَا (ن) قُفُوًّا: کسی کے پیچھے چلنا، پیروی کرنا (۲) كُلُّ اولئك (مرکب اضافی) مبتدا ہے اور جملہ فعلیہ كَانَ عَنْهُ خبر ہے اور عَنْهُ کے بارے میں زمخشری نے فرمایا ہے کہ یہ مسئولاً کا نائب فاعل ہے جو مقدم آیا ہے (۳) مَرَحًا (اسم فعل) اترانا، غرور آمیز اکڑنا (۴) طُوْلًا تمیز محوّل عن المفعول ہے (۵) سَيِّءٌ (صفت مشبہ) بد، برا از سُوْءٌ خیال رہے کہ سَيِّءٌ صفت مشبہ ہے اس کا ترجمہ بدی اور برائی نہیں بلکہ اس کا ترجمہ بد اور برا ہے (۶) مِنَ الْحِكْمَةِ میں مِنْ بیانیہ ہے اور یہ مِمَّا میں جو مَا موصولہ ہے اس کا بیان ہے ۱۲

مَعَ اللّٰهِ	اللہ تعالیٰ کے ساتھ	فَتُلْقٰى	پس ڈالا جائے تو	مَلُوْمًا	اور ملامت کیا ہوا
اِلٰهًا اٰخَرَ	کوئی اور معبود	فِيْ جَهَنَّمَ	دوزخ میں	مَّدْحُوْرًا	دُھتکارا ہوا

گیارہواں حکم ـــــ تحقیق کے بغیر کسی بات پر عمل کرو نہ بدگمانی کرو ـــــ معاملات میں بہت جلد آدمی بدگمان ہوجاتا ہے، بے تحقیق دل میں خیال جمالیتا ہے کہ فلاں دکاندار بے ایمان ہے، جھوک مارتا ہے۔ دغابازی کرتا ہے، نفع زیادہ لیتا ہے یا سامان خراب دیتا ہے۔ اسی طرح قول وقرار کے معاملہ میں معمولی معمولی باتوں سے بدگمانی ہوجاتی ہے اور آدمی عہد و پیمان سے پھر جاتا ہے اس لئے حکم دیا ـــــ اور ایسی چیز کے پیچھے مت پڑو جس کے بارے میں تمہیں خبر نہیں ـــــ یعنی بے تحقیق زبان سے بات مت نکالو۔ اندھادھند کسی چیز کی پیروی نہ کرو، سنی سنائی باتوں پر بے سوچے سمجھے حکم لگادینا یا اس پر عمل درآمد شروع کردینا پشیمانی کا باعث ہوتا ہے۔ آگے مذکورہ حکم کی وجہ بیان کی ہے ـــــ یقیناً کان، آنکھ اور دل، ان میں سے ہر ایک کے بارے میں باز پرس ہونی ہے ـــــ یعنی قیامت کے دن سوال ہوگا کہ کان سے کیا سنا تھا؟ آنکھ سے کیا دیکھا تھا؟ دل کے بارے میں دریافت کیا جائے گا کہ کیسے کیسے خیالات دل میں پکائے تھے؟ اور کن کن باتوں پر یقین کیا تھا؟

اس میں جھوٹی گواہی دینا، غلط تہمتیں لگانا، بے تحقیق باتیں سن کر کسی کے درپئے آزار ہونا یا بغض وعداوت قائم کرلینا، باپ دادا کی تقلید یا رسم ورواج کی پابندی میں خلافِ شرع اور ناحق باتوں کی حمایت کرنا، اَن دیکھی یا اَن سنی چیزوں کو دیکھی یا سنی ہوئی بتلانا، نامعلوم چیزوں کی نسبت دعوی کرنا کہ میں جانتا ہوں، فال نکال کر چور کا نام بتلانا، قیافہ سے مستقبل کے حالات بتلانا، یہ سب صورتیں اس آیت میں داخل ہیں۔

احساس کرنے والی قوتیں کان اور آنکھ کے علاوہ اور بھی ہیں۔ ناک سے سونگھ کر احساس کیا جاتا ہے۔ زبان سے چکھ کر علم حاصل کیا جاتا ہے اور کسی چیز کو چھوکر اور ٹٹول کر بھی جانا جاتا ہے۔ قیامت کے دن تمام قُویٰ کی نسبت سوال ہوگا کہ ان کو کہاں استعمال کیا تھا؟ مگر چونکہ انسان زیادہ تر کان اور آنکھ سے علم حاصل کرتا ہے اس لئے انہی دو کا ذکر کیا ہے پھر ان میں بھی زیادہ تر معلومات کان سے حاصل ہوتی ہیں اس لئے اس کو مقدم کیا ہے۔

بارہواں حکم ـــــ فخر وغرور کی ممانعت ـــــ تکبر: عزت کو خاک میں ملادیتا ہے جس کو یہ روگ لگ جاتا ہے وہ ذلیل وخوار ہوتا ہے۔ اور یہ حکم سب سے آخر میں اس لئے دیا ہے کہ تکبر: حق کے راستہ کی سب سے بڑی رکاوٹ ہے۔ شیطان کی مثال ہمارے سامنے ہے۔ گھمنڈ ہی نے اس کو حق کی پیروی سے روکا تھا۔

متکبر آدمی اللہ کا صحیح بندہ بننے کے لئے تیار نہیں ہوتا۔ ماں باپ کی خدمت میں اسے عار محسوس ہوتی ہے، رشتہ

داروں اور محتاجوں کے حقوق ادا کرتے ہوئے اس کی جان نکلتی ہے۔قتل اولاد، بدکاری اور ناحق قتل سے وہ چوکتا نہیں۔یتیموں کے اموال کو اپنی دولت سمجھتا ہے اور کسی بات پر یقین کرنے کے لئے اس کو کسی تحقیق کی ضرورت نہیں۔ غرض ساری ہی خرابیاں فخر وغرور سے پیدا ہوتی ہیں۔کیونکہ جو شخص حق بات قبول کرنے ہی کے لئے تیار نہ ہو وہ حق بات پر عمل کیا کرے گا؟ اس لئے آخر میں بارھواں حکم دیا جاتا ہے —— اور زمین میں اکڑ کر مت چلو —— یعنی ایسی چال مت چلو جس سے تکبر اور فخر وغرور ٹپکتا ہو —— تو نہ تو زمین پھاڑ سکتا ہے اور نہ ہی پہاڑوں کی بلندی کو پہنچ سکتا ہے —— یعنی زور سے پاؤں مار کر زمین کو پھاڑ نہیں سکتا۔گردن ابھار کر اور سینہ تان کر پہاڑوں کے برابر نہیں ہوسکتا۔پس کس برتے پر اپنے کو اس قدر لمبا کھینچتا ہے! —— تکبر بہت بڑا گناہ ہے۔چال ڈھال میں جو چیزیں تکبر پر دلالت کرتی ہیں وہ بھی ناجائز ہیں۔حدیث شریف میں ہے کہ وہ آدمی جنت میں داخل نہ ہوگا جس کے دل میں ذرہ بھر تکبر ہوگا (مشکوٰۃ حدیث ۵۱۰۷) ایک دوسری حدیث میں ہے کہ گھمنڈی لوگ قیامت کے دن مقدار میں چھوٹی چیونٹیوں جیسے، اور صورت میں انسانوں جیسے اٹھائے جائیں گے۔جن پر ہر طرف سے ذلت وخواری برستی ہوگی ان کو جہنم کے ایک جیل خانہ کی طرف ہانکا جائے گا جس کا نام بولس ہے جس پر سب سے زیادہ تیز آگ چڑھی ہوئی ہے اور پینے کے لئے ان کو جہنمیوں کے بدن سے نکلا ہوا پیپ دیا جائے گا (مشکوٰۃ حدیث ۵۱۱۲)

ایک اور حدیث میں آنحضرت ﷺ نے ارشاد فرمایا: ''اللہ تعالیٰ نے میرے پاس وحی بھیجی ہے کہ تواضع اختیار کرو: کوئی کسی پر نہ تو فخر کرے اور نہ ظلم کرے'' (مشکوٰۃ حدیث ۴۸۹۸)

اور حضرت فاروق اعظم رضی اللہ عنہ نے خطبہ دیتے ہوئے فرمایا ہے کہ میں نے رسول اللہ ﷺ سے یہ ارشاد سنا ہے کہ: ''جو شخص تواضع اختیار کرتا ہے، اللہ تعالیٰ اس کو سر بلند کرتے ہیں وہ اپنی نظر میں چھوٹا ہوتا ہے مگر دوسروں کی نظر میں بڑا ہوتا ہے اور جو تکبر کرتا ہے اللہ تعالیٰ اس کو ذلیل کرتے ہیں وہ اپنی نظر میں بڑا ہوتا ہے مگر دوسروں کی نظر میں کتے اور خنزیر سے بھی بدتر ہوتا ہے'' (مشکوٰۃ حدیث ۵۱۱۹)

تکبر: حق کو قبول نہ کرنا اور دوسروں کو حقیر جاننا ہے (حدیث)

اب مذکورہ منہیات (حکم ۵ تا ۱۲) کی تاکید، اور ان سے اجتناب کا ذہن بنانے کے لئے دو باتیں بیان کی جاتی ہیں:

پہلی بات —— یہ سارے کام: ان میں سے جو برے ہیں: تیرے رب کے نزدیک ناپسندیدہ ہیں —— لہٰذا اللہ کے مخلص بندوں کو ان کاموں سے کوسوں دور رہنا چاہئے —— ماموراتکی خوبی انسان بخوبی سمجھ سکتا ہے۔

توحید کی خوبی اظہر من الشمس ہے، ماں باپ کے ساتھ حسن سلوک اور دیگر رشتہ داروں، محتاجوں اور مسافروں کے حقوق کی ادائیگی: اچھی بات ہے۔ ان کاموں کی خوبی ہی انسان کی طبیعت میں تعمیل کا جذبہ پیدا کرتی ہے۔ مگر منہیات کی صورتِ حال مختلف ہے۔ انسان فطری طور پر برائیوں کی طرف رغبت رکھتا ہے۔ حدیث میں یہ بات اس طرح بیان کی گئی ہے کہ جہنم کے چاروں طرف مرغوبات کی باڑھ باندھ دی گئی ہے یعنی جہنم میں لے جانے والے کام انسان کو مرغوب ہیں، اس لئے تاکیداً فرمایا کہ یہ سب کام اللہ تعالیٰ کو سخت ناپسند ہیں۔ پس مؤمن بندے کو ان کے قریب بھی نہیں جانا چاہئے، چاہے اس کا دل کتنا ہی تلملائے!

دوسری بات —— یہ وہ حکمت کی باتیں ہیں جو آپؐ کے پروردگار نے آپؐ پر وحی کے ذریعہ بھیجی ہیں —— یعنی مذکورہ احکام حکمت پر مبنی ہیں، انسانوں کو چاہئے کہ وہ ان کی قدر کریں، اور تعمیل کے لئے کمر ہمت کس لیں۔

آخر میں سب سے پہلا حکم جو اصل الاصول ہے: مکرر بیان کیا جاتا ہے: تاکہ اس کی اہمیت واضح ہو، اور سلسلہ کلام آگے چلے۔ ارشاد ہے —— اور تو اللہ کے ساتھ کوئی اور معبود تجویز مت کر، ورنہ جہنم میں ملامت خوردہ دُھتکارا ہوا ڈال دیا جائے گا —— شرک ناقابل معافی جرم ہے، اور آخرت میں اس کی سزا ابدی جہنم ہے۔ لہٰذا صرف ایک خدا کو اپناؤ، کسی کو اس کا شریک وسہیم مت بناؤ۔

کائنات اکیلے اللہ تعالیٰ نے بنائی ہے۔ پس اس کا ساجھی تجویز کرنا ناقابل معافی جرم ہے

اَفَاَصْفٰىكُمْ رَبُّكُمْ بِالْبَنِيْنَ وَاتَّخَذَ مِنَ الْمَلٰٓئِكَةِ اِنَاثًا ۭ اِنَّكُمْ لَتَقُوْلُوْنَ قَوْلًا عَظِيْمًا ۝ وَلَقَدْ صَرَّفْنَا فِيْ هٰذَا الْقُرْاٰنِ لِيَذَّكَّرُوْا ۭ وَمَا يَزِيْدُهُمْ اِلَّا نُفُوْرًا ۝ قُلْ لَّوْ كَانَ مَعَهٗٓ اٰلِهَةٌ كَمَا يَقُوْلُوْنَ اِذًا لَّابْتَغَوْا اِلٰى ذِي الْعَرْشِ سَبِيْلًا ۝ سُبْحٰنَهٗ وَتَعٰلٰى عَمَّا يَقُوْلُوْنَ عُلُوًّا كَبِيْرًا ۝ تُسَبِّحُ لَهُ السَّمٰوٰتُ السَّبْعُ وَالْاَرْضُ وَمَنْ فِيْهِنَّ ۭ وَاِنْ مِّنْ شَيْءٍ اِلَّا يُسَبِّحُ بِحَمْدِهٖ وَلٰكِنْ لَّا تَفْقَهُوْنَ تَسْبِيْحَهُمْ ۭ اِنَّهٗ كَانَ حَلِيْمًا غَفُوْرًا ۝

اَفَاَصْفٰىكُمْ (۱)	کیا خاص کیا ہے تم کو	رَبُّكُمْ	تمہارے رب نے	بِالْبَنِيْنَ	بیٹوں کے ساتھ

(۱) ہمزۂ استفہام انکاری ہے—— فَا عاطفہ اور معطوف علیہ مقدر ہے—— اَصْفَا کُمْ (فعل ماضی صیغہ واحد مذکر غائب کُمْ ضمیر جمع مذکر حاضر مفعول بہ) اَصْفٰی اِصْفَاءً: خالص کرنا۔ اَصْفَاہُ بِکَذَا: مخصوص کرنا مجرد۔ صَفَا یَصْفُوْا صَفْوًا: صاف ہونا۔

وَاتَّخَذَ(۱)	اور اپنایا ہے انھوں نے	نُفُوْرًا(۵)	نفرت میں	تُسَبِّحُ	پاکی بیان کرتے ہیں
مِنَ الْمَلٰٓئِكَةِ	فرشتوں میں سے	قُلْ	آپ کہئے	لَهُ	اس کی
اِنَاثًا	بیٹیوں کو؟	لَّوْ كَانَ	اگر ہوتے	السَّمٰوٰتُ	آسمان
اِنَّكُمْ	بیشک تم	مَعَهٗٓ	اللہ کے ساتھ	السَّبْعُ	ساتوں
لَتَقُوْلُوْنَ	یقیناً کہتے ہو	اٰلِهَةٌ	اور معبود	وَالْاَرْضُ	اور زمین
قَوْلًا	بات	كَمَا	جیسا کہ	وَمَنْ فِيْهِنَّ	اور جو مخلوق ان میں ہے
عَظِيْمًا	بڑی سخت!	يَقُوْلُوْنَ	وہ کہتے ہیں	وَاِنْ	اور نہیں
وَلَقَدْ	اور البتہ تحقیق	اِذًا	تب تو	مِّنْ شَيْءٍ	کوئی چیز
صَرَّفْنَا(۲)	پھر پھیر کر بیان کیا ہے ہم	لَّابْتَغَوْا	ضرور ڈھونڈ نکالتے وہ	اِلَّا	مگر
	نے (توحید کے مضمون کو)	اِلٰى ذِي	عرش والے کی طرف	يُسَبِّحُ	وہ پاکی بیان کرتی ہے
فِيْ هٰذَا الْقُرْاٰنِ	اس قرآن میں	الْعَرْشِ		بِحَمْدِهٖ	اسکی تعریف کے ساتھ
		سَبِيْلًا	راستہ	وَلٰكِنْ	مگر
لِيَذَّكَّرُوْا(۳)	تاکہ وہ اچھی طرح سمجھ لیں	سُبْحٰنَهٗ	وہ پاک ہے	لَّا تَفْقَهُوْنَ	نہیں سمجھتے ہو تم
وَمَا	اور نہیں	وَتَعٰلٰى	اور برتر ہے	تَسْبِيْحَهُمْ	انکے پاکی بیان کرنے کو
يَزِيْدُهُمْ(۴)	بڑھایا (پھیر پھیر کر	عَمَّا	ان باتوں سے جو	اِنَّهٗ كَانَ	بے شک وہ ہیں
	بیان کرنے نے) ان کو	يَقُوْلُوْنَ	وہ کہتے ہیں	حَلِيْمًا	بڑے بردبار
اِلَّا	مگر	عُلُوًّا كَبِيْرًا	بہت زیادہ برتر	غَفُوْرًا	بڑے بخشنے والے

پچھلی آیت میں شرکت کی ممانعت تھی۔اب اِن آیتوں میں مشرکین کی حماقت و جہالت کا نمونہ پیش کیا جاتا ہے۔

(۱)اِتَّخَذَ متعدی بدومفعول ہے اِنَاثًا مفعول اول ہے اور (كَائِنًا)مِن الملائكة مفعول ثانی ہے(۲)صَرَّف تَصْرِيْفًا: پھیر پھیر کر بیان کرنا،طرح طرح سے سمجھانا۔زیادہ تر یہ لفظ کسی چیز کو ایک حالت سے دوسری حالت کی طرف اور ایک امر سے دوسرے امر کی طرف پلٹنے اور تبدیل کرنے کے لئے بولا جاتا ہے۔تصریف الریاح ہواؤں کا الٹنا پلٹنا،مختلف جہات سے چلنا تصریف الکلام: بات کو پھیر پھیر کر بیان کرنا آیت میں صَرَّفْنَا کا مفعول محذوف ہے(۳)لِيَذَّكَّرُوْا باب تفعل سے ہے اس کی اصل لِيَتَذَكَّرُوْا ہے تَذَكُّرْ: نصیحت پکڑنا(۴)يَزِيْدُهُمْ کا فاعل محذوف ہے أی ذلك التصريف والتبيين (۵)نُفُوْرًا(مصدر)نَفَرَ (ن)نُفُوْرًا: بھاگنا،دور ہونا۱۲

مشرکانہ ذہنیت کی یہ کتنی بڑی کمزوری ہے کہ جو بات کسی بھی طرح اللہ تعالیٰ کے شایان شان نہیں، اُسے اللہ پاک کے لئے تجویز کرتے ہیں۔ وہ اللہ پاک کے لئے اولاد مانتے ہیں اور اولاد بھی کیسی؟ جسے وہ اپنے لئے پسند نہیں کرتے یعنی لڑکیاں۔ ارشاد ہے —— کیسی عجیب بات ہے: تمہارے رب نے تمہیں تو بیٹوں سے نوازا اور خود اپنے لئے فرشتوں کو بیٹیاں بنالیا —— یعنی اول تو اللہ تعالیٰ کی طرف اولاد کا انتساب ہی جہالت وسفاہت ہے، پھر اولاد میں سے بھی اللہ تعالیٰ کے لئے وہ صنف تجویز کی جسے خود پسند نہیں کرتے —— یقیناً تم بڑی بھاری بات کہتے ہو —— یعنی بڑی بھاری گستاخی کرتے ہو — مشرکین کے معبودوں میں جتنی دیویاں ہیں ان کے متعلق ان کا عقیدہ یہ ہے کہ یہ خدا کی بیٹیاں ہیں۔ مشرکین عرب بھی فرشتوں کو خدا کی بیٹیاں مانتے تھے۔ یہاں ان کے اس عقیدہ کو ان کی ناانصافی کے نمونہ کے طور پر پیش کیا گیا ہے —— اور ہم نے اس قرآن میں (توحید کے مضمون کو) طرح طرح سے بیان کیا ہے تاکہ لوگ اچھی طرح سمجھ لیں —— قرآن کریم میں مختلف عنوانوں سے اور نہج بدل بدل کر توحید کا مضمون بیان کیا گیا ہے کیونکہ یہ ادیان سماوی کا بنیادی مسئلہ ہے، اسی پر خدا پرستی کی عمارت کھڑی ہوتی ہے —— اور (یہ بات) ان کی نفرت ہی کو بڑھا رہی ہے —— یعنی بجائے نصیحت پذیر ہونے کے یہ بندگان خدا اور زیادہ بدکتے ہیں اور وحشت کھا کر بھاگتے ہیں۔

شرک کے بطلان کی دلیل —— آپ کہئے: اگر اللہ کے ساتھ اور معبود ہوتے، جیسا کہ یہ لوگ کہتے ہیں، تو ضرور عرش والے خدا تک انھوں نے راہ ڈھونڈھ لی ہوتی —— یعنی اگر کائنات میں اللہ تعالیٰ کیساتھ اور خدا بھی ہوتے تو اُن سب نے مل کر اللہ کے تخت سلطنت کو الٹ دیا ہوتا۔ کیونکہ اگر وہ واقعی خدا ہوتے تو عرش والے خدا پر چڑھائی کر دیتے، وہ دب کر رہنے والے کہاں تھے اور جب خداؤں میں جنگ چھڑ جاتی تو دنیا کا نظام درہم برہم ہو جاتا۔ حالانکہ نظام عالم کا صحیح طور پر چلنا معلوم ہے، شب وروز ایک ہی انداز پر آ جا رہے ہیں اور زمین وآسمان برقرار ہیں جو اس بات کی واضح دلیل ہے کہ ایک خدا کے سواء کوئی دوسرا اس کا شریک وسہیم نہیں [1] —— اللہ تعالیٰ پاک ہیں اور اُن باتوں سے بہت ہی برتر ہیں جو یہ لوگ کہہ رہے ہیں —— یعنی ان کا کوئی شریک وسہیم نہیں، نہ برابر کا نہ کمتر درجہ کا اور ان کی کوئی اولاد بھی نہیں، نہ لڑکے اور نہ لڑکیاں!

توحید کا اثبات: —— اللہ کی پاکی بیان کرتے ہیں ساتوں آسمان اور زمین اور جو مخلوقات ان میں ہیں کوئی چیز ایسی نہیں جو تعریف کے ساتھ ان کی پاکی بیان نہ کرتی ہو، مگر تم ان کا پاکی بیان کرنا سمجھتے نہیں، حقیقت یہ ہے کہ وہ بڑے

(۱) یہ برہانِ تمانع ہے، اور اس کی تقریر سورۃ المؤمنون (آیت ۹۱) کی تفسیر میں کی گئی ہے ۱۲

ہی بردبار بڑے ہی درگذر فرمانے والے ہیں ـــــ یعنی خواہ کوئی مخلوق ہو، آسمان ہوں، یا زمین ہوں۔ آسمانی اور زمینی مخلوقات سب زبان حال سے بھی اور زبان قال سے بھی اللہ تعالیٰ کی پاکی اور خوبیاں بیان کرتے ہیں مگر انسان اسے سمجھتا نہیں، کیونکہ ان کی زبان اور ہے اور انسان کی زبان اور۔ مشرکین ایسی عظیم ہستی کے لئے شرکاء تجویز کرتے ہیں اور اس پر عاجزی اور محتاجگی کا دھبہ لگاتے ہیں یہ اتنی بڑی گستاخی ہے کہ اُن کو فوراً ہلاک کردینا چاہئے مگر اللہ تعالیٰ بڑے بردبار ہیں۔ بندوں کو سنبھلنے کا موقعہ دیتے ہیں اگر وہ سنبھل جائیں اور شرک وکفر سے توبہ کرلیں تو وہ بڑے درگزر کرنے والے ہیں۔ سب گناہ معاف کردیں گے۔

زبان حال سے تسبیح: کا مطلب یہ ہے کہ کائنات کی تمام چیزیں یہاں تک کہ کافر بھی اپنے پورے وجود سے اس بات کی گواہی دے رہے ہیں کہ جس ذات نے ان کو پیدا کیا ہے اور جوان کا پروردگار ہے وہ ہر عیب اور ہر کمزوری سے پاک ہے اور ہر خوبی اور ہر کمال کے ساتھ متصف ہے اس نے ہر چیز کو جیسا اسے ہونا چاہئے ویسا ہی بنایا ہے۔ ہر مخلوق کی ضروریات وہی پوری کرتا ہے لہٰذا سب کی نیاز مندیوں کے حقدار بھی وہی تنہا ہیں ان کی معبودیت اور خدائی میں کوئی حصہ دار نہیں۔

زبان قال سے تسبیح: کا مطلب یہ ہے کہ ہر مخلوق اپنے شعور کے مطابق اور اپنی عقل وفہم کے لحاظ سے اور اپنے انداز میں زبان سے بھی تسبیح خواں اور حمد گُناں ہے۔ احادیث میں یہ مضمون بکثرت وارد ہوا ہے۔ آنحضرت ﷺ کے دست مبارک میں کنکریاں تسبیح پڑھتی تھیں۔ صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم نے اس کو اپنے کانوں سے سنا ہے۔ امام بخاری رحمہ اللہ نے بروایت حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ نقل کیا ہے کہ ہم کھانے کی تسبیح کی آواز سنا کرتے تھے جبکہ وہ کھایا جارہا ہوتا تھا اور ایک دوسری روایت میں ہے کہ ہم رسول اللہ ﷺ کے ساتھ کھانا کھاتے تو کھانے کی تسبیح کی آواز سنا کرتے تھے۔ اور صحیح مسلم میں بروایت حضرت جابر بن سمرۃ رضی اللہ عنہ مذکور ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: میں مکہ مکرمہ کے اس پتھر کو جانتا ہوں جو بعثت سے پہلے مجھے سلام کیا کرتا تھا (معارف القرآن)

اور قرآن کریم میں سورۃ صٓ آیت ۱۸ میں ہے کہ اللہ تعالیٰ نے پہاڑوں کو حکم دے رکھا تھا کہ وہ حضرت داؤد علیہ السلام کے ساتھ صبح وشام تسبیح کیا کریں اسی طرح پرندے بھی آپ کے پاس جمع ہوکر اللہ کی تسبیح کیا کرتے تھے۔

اللہ تعالیٰ نے ہر چیز کو شعور بخشا ہے اور ہر چیز شعوری طور پر اپنے خالق ومالک کی تسبیح کرتی ہے

وَاِذَا قَرَاْتَ الْقُرْاٰنَ جَعَلْنَا بَيْنَكَ وَبَيْنَ الَّذِيْنَ لَا يُؤْمِنُوْنَ بِالْاٰخِرَةِ حِجَابًا مَّسْتُوْرًا ۝ وَ

جَعَلْنَا عَلٰي قُلُوْبِهِمْ اَكِنَّةً اَنْ يَّفْقَهُوْهُ وَفِيْٓ اٰذَانِهِمْ وَقْرًا ۭ وَاِذَا ذَكَرْتَ رَبَّكَ فِي الْقُرْاٰنِ وَحْدَهٗ وَلَّوْا عَلٰٓي اَدْبَارِهِمْ نُفُوْرًا ﴿۴۶﴾ نَحْنُ اَعْلَمُ بِمَا يَسْتَمِعُوْنَ بِهٖٓ اِذْ يَسْتَمِعُوْنَ اِلَيْكَ وَاِذْ هُمْ نَجْوٰٓى اِذْ يَقُوْلُ الظّٰلِمُوْنَ اِنْ تَتَّبِعُوْنَ اِلَّا رَجُلًا مَّسْحُوْرًا ﴿۴۷﴾ اُنْظُرْ كَيْفَ ضَرَبُوْا لَكَ الْاَمْثَالَ فَضَلُّوْا فَلَا يَسْتَطِيْعُوْنَ سَبِيْلًا ﴿۴۸﴾

وَاِذَا	اور جب	اَنْ(۳)	(اس سے) کہ	اَعْلَمُ	خوب جانتے ہیں
قَرَاْتَ	پڑھتے ہیں آپ	يَّفْقَهُوْهُ	سمجھیں وہ اُسے	بِمَا(۷)	اس (غرض) کو جو
الْقُرْاٰنَ	قرآن	وَفِيْٓ اٰذَانِهِمْ	اور ان کے کانوں میں	يَسْتَمِعُوْنَ	سنتے ہیں وہ
جَعَلْنَا	(تو) کردیتے ہیں ہم	وَقْرًا(۴)	بوجھ	بِهٖٓ	اس کی وجہ سے
بَيْنَكَ	آپ کے درمیان	وَاِذَا	اور جب	اِذْ(۸)	جب
وَبَيْنَ الَّذِيْنَ	اور ان لوگوں کے	ذَكَرْتَ	ذکر کرتے ہیں آپ	يَسْتَمِعُوْنَ	کان لگاتے ہیں وہ
	درمیان جو	رَبَّكَ	اپنے رب کا	اِلَيْكَ	آپ کی طرف
لَا يُؤْمِنُوْنَ	ایمان نہیں رکھتے	فِي الْقُرْاٰنِ	قرآن میں	وَاِذْ هُمْ(۹)	اور جب وہ
بِالْاٰخِرَةِ	آخرت پر	وَحْدَهٗ(۵)	تنہا (صرف)	نَجْوٰٓى(۱۰)	سرگوشیاں کرتے ہیں
حِجَابًا مَّسْتُوْرًا(۱)	مخفی پردہ	وَلَّوْا	(تو) پھر جاتے ہیں وہ	اِذْ(۱۱)	جب
وَّجَعَلْنَا	اور کردیتے ہیں ہم	عَلٰٓي اَدْبَارِهِمْ	اپنی پشتوں پر	يَقُوْلُ	کہتے ہیں
عَلٰي قُلُوْبِهِمْ	ان کے دلوں پر	نُفُوْرًا(۶)	نفرت کرتے ہوئے	الظّٰلِمُوْنَ	ظالم لوگ
اَكِنَّةً(۲)	پردے	نَحْنُ	ہم	اِنْ	نہیں

(۱)مَسْتُوْرًا اسم مفعول ہے جس کے معنی ہیں پوشیدہ، مخفی از سَتَرَ (ن) سَتْرًا الشیءَ: چھپانا، مستور: چھپایا ہوا، نظر نہ آنے والا (۲)اَكِنَّةٌ: جمع ہے اس کا مفرد كِنَانٌ یا كِنٌّ ہے دیکھئے النحل ۸۱ (۳)أَنْ مصدریہ ہے اور اس سے پہلے مِنْ جارہ محذوف ہے(۴)اَلْوَقْرُ (اسم مصدر) بوجھ، گرانی (۵)وَحْدٌ مصدر ہے اور وَحْدَهٗ (مرکب اضافی) حال ہے لأنه فی قوۃ النکرۃ إذ ھو فی معنی منفردًا (۶)نُفُوْرًا حال ہے (۷)بِمَا میں باصلہ کی ہے عَلِمَ بِهٖ: جاننا اور مَا موصولہ ہے اور بِهٖ میں باسببیہ ہے اور ضمیر مَا کی طرف لوٹتی ہے (۸)إِذْ إلخ مفعول فیہ ہے أَعْلَمُ کا (۹) پہلے إِذْ پر معطوف ہے (۱۰)نَجْوٰى مصدر ہے اور هُمْ کی خبر ہے اور زید عدل کی طرح مبالغہ ہے (۱۱)دوسرے إِذْ سے بدل ہے ۱۲

تَتَّبِعُوْنَ	پیروی کرتے ہو تم	كَيْفَ	کیسی	فَضَلُّوْا	سو گمراہ ہوئے وہ
اِلَّا	مگر	ضَرَبُوْا	کسیں انھوں نے	فَلَا	پس نہیں
رَجُلًا مَّسْحُوْرًا	سحر زدہ (پاگل آدمی) کی	لَكَ	آپ پر	يَسْتَطِيْعُوْنَ	طاقت رکھتے وہ
اُنْظُرْ	دیکھئے	الْاَمْثَالَ	پھبتیاں	سَبِيْلًا	راہ (پانے) کی

گذشتہ آیات میں توحید کا تذکرہ تھا۔ ان آیات میں رسالت کا تذکرہ ہے۔ اور مشرکینِ مکہ کے انکارِ رسالت کی تین وجوہ بیان کی گئی ہیں:

پہلی وجہ —— قرآن کریم کی نصیحت سے اثر پذیر نہ ہونا —— اور جب آپؐ قرآن کریم سناتے ہیں تو ہم آپؐ کے اور آخرت پر ایمان نہ لانے والوں کے درمیان ایک مخفی پردہ حائل کردیتے ہیں —— جو نظر تو کسی کو آتا نہیں، مگر کام گہرے بادل کا کرتا ہے —— اور ہم ان کے دلوں پر قرآن کے فہم کے تعلق سے پردے ڈال دیتے ہیں، اور کانوں پر ڈاٹ لگا دیتے ہیں —— پس ان کے دل اوندھے ہوجاتے ہیں، کان بہرے ہوجاتے ہیں، اور آنکھیں کور ہوجاتی ہیں —— قرآن کریم بڑا ہی پُر تاثیر کلام ہے، مگر جو اس سے اوٹ میں ہوجائے، اس کو کیا فیض پہنچ سکتا ہے؟ آفتاب سارے جہاں کو روشن کرتا ہے، مگر جو تہ خانہ میں تمام دروازے اور تابدان بند کرکے بیٹھ جائے: اس کو روشنی کیسے پہنچ سکتی ہے؟ بات خواہ کتنی ہی پر کشش ہو، مگر جو سمجھنے کی کوشش ہی نہ کرے اس کو کیا حاصل ہوسکتا ہے؟

دوسری وجہ —— توحید سے نفرت —— اور جب آپؐ قرآن میں فقط اپنے رب کا تذکرہ کرتے ہیں، تو وہ لوگ نفرت سے پیٹھ پھیر کر چل دیتے ہیں —— ایک اللہ کا تذکرہ ان کو ایک آن نہیں بھاتا۔ ان کی لو بتوں سے لگی ہوئی ہے، اس لئے وہ رسول اللہ ﷺ کی باتوں پر کان نہیں دھرتے!

تیسری وجہ —— رسول کی ذات سے عداوت ونفرت —— ہم خوب جانتے ہیں جس غرض سے وہ لوگ قرآن سنتے ہیں، جس وقت وہ آپؐ کی بات کان لگا کر سنتے ہیں، اور جس وقت وہ باہم سرگوشیاں کرتے ہیں، جس وقت ظالم کہتے ہیں: ''تم ایک سحر زدہ شخص ہی کی پیروی کرتے ہو!'' —— اس آیت میں کافروں کی چار حالتیں بیان کی گئی ہیں: ایک: وہ فاسد غرض سے قرآن سنتے ہیں۔ وہ قرآن میں کوئی اعتراض کی بات ڈھونڈھتے ہیں، تاکہ دوسروں کو گمراہ کرسکیں۔ دوم: وہ صرف سر کے کانوں سے سنتے ہیں، گوشِ حق نیوش سے نہیں سنتے۔ سوم: باہم سرگوشیاں کرتے ہیں کہ قرآن کی بات کیسے ٹالی جائے؟ تاکہ کوئی اس کا اثر قبول نہ کرلے۔ چہارم: آپ ﷺ پر پھبتی کستے ہیں۔ ظالم کہتے ہیں: ''یہ شخص سحر زدہ پاگل ہے!'' اس کی باتیں دیوانے کی بڑ ہیں —— دیکھئے! ان لوگوں نے آپؐ

پر کیسی پھبتیاں کسیں! ـــــ بھلا کوئی جوڑ ہے دیوانے کی بڑ میں اور اس فصیح وبلیغ کلام میں! ـــــ سو وہ گمراہ ہوئے، پس وہ اب راہ یاب نہیں ہوسکتے! ـــــ کیونکہ جب وہ رسول کی ذات سے عداوت ونفرت میں اتنی دور چلے گئے تو اب ان کو راہِ راست کہاں نصیب ہوسکتی ہے!

بات اسی وقت اثر انداز ہوتی ہے، جب کہنے والے سے عقیدت ہو، اور گوشِ حق نیوش سے سنی جائے

وَ قَالُوْٓا ءَاِذَا كُنَّا عِظَامًا وَّرُفَاتًا ءَ اِنَّا لَمَبْعُوْثُوْنَ خَلْقًا جَدِيْدًا ﴿۴۹﴾ قُلْ كُوْنُوْا حِجَارَةً اَوْ حَدِيْدًا ﴿۵۰﴾ اَوْ خَلْقًا مِّمَّا يَكْبُرُ فِيْ صُدُوْرِكُمْ ۚ فَسَيَقُوْلُوْنَ مَنْ يُّعِيْدُنَا ؕ قُلِ الَّذِيْ فَطَرَكُمْ اَوَّلَ مَرَّةٍ ۚ فَسَيُنْغِضُوْنَ اِلَيْكَ رُءُوْسَهُمْ وَ يَقُوْلُوْنَ مَتٰى هُوَ ؕ قُلْ عَسٰٓى اَنْ يَّكُوْنَ قَرِيْبًا ﴿۵۱﴾ يَوْمَ يَدْعُوْكُمْ فَتَسْتَجِيْبُوْنَ بِحَمْدِهٖ وَ تَظُنُّوْنَ اِنْ لَّبِثْتُمْ اِلَّا قَلِيْلًا ﴿۵۲﴾ ع ۵

وَ قَالُوْٓا	اور انہوں نے کہا	كُوْنُوْا	ہوجاؤ تم	فَسَيَقُوْلُوْنَ	پس پوچھیں گے وہ
ءَاِذَا (۱)	کیا جب	حِجَارَةً	پتھر	مَنْ	کون
كُنَّا	ہوجائیں گے ہم	اَوْ حَدِيْدًا	یا لوہا	يُّعِيْدُنَا	لوٹائے گا ہمیں
عِظَامًا	ہڈیاں	اَوْ خَلْقًا	یا کوئی مخلوق	قُلِ	آپ کہئے:
وَّرُفَاتًا (۲)	اور چورا	مِّمَّا (۴)	ان میں سے جو	الَّذِيْ (۷)	وہ جس نے
ءَ اِنَّا	کیا بے شک ہم	يَكْبُرُ (۵)	بھاری ہو	فَطَرَكُمْ	تم کو پیدا کیا
لَمَبْعُوْثُوْنَ	البتہ اٹھائے جائیں گے	فِيْ صُدُوْرِكُمْ	تمہارے سینوں میں	اَوَّلَ مَرَّةٍ	پہلی مرتبہ
خَلْقًا جَدِيْدًا (۳)	از سرِ نو پیدا کرکے؟		(پھر بھی تم ضرور دوبارہ	فَسَيُنْغِضُوْنَ (۸)	پس مٹکائیں گے وہ
قُلْ	آپ کہئے		زندہ کئے جاؤ گے) (۶)	اِلَيْكَ	آپ کے سامنے

(۱) استفہام انکار واستبعاد کے لئے ہے (۲) رُفَات: بوسیدہ، گلا ہوا، چورا، وہ چیز جو خشک گھاس کی طرح بوسیدہ ہوکر چورا چورا ہوجائے (۳) خَلْقًا جَدِيْدًا حال ہے اور خَلْق بمعنی مخلوق ہے (۴) مِمَّا میں مِنْ جارّہ ہے اور مَا موصولہ ہے اور کائن سے متعلق ہوکر خَلْقًا کی صفت ہے (۵) كَبُرَ (ک) كِبَرًا وَ كُبْرًا: بڑا ہونا، دشوار ہونا۔ سخت ہونا، بھاری ہونا (۶) یہ كُوْنُوْا فعل امر کا جواب ہے جو محذوف ہے (۷) جملہ الذی فعل محذوف کا فاعل ہے اور اَوَّلَ مَرَّةٍ مفعول فیہ ہے فَطَرَ کا (۸) يُنْغِضُوْنَ از باب افعال اَنْغَضَ رَاسَهٗ: سر کو تعجب یا استہزاء سے ہلانا۔ نَغَضَ (ن ض) کپکپی سے ساتھ ہلنا اور بے قرار ہونا۔

رُءُوۡسَهُمۡ	اپنے سر	اَنۡ يَّكُوۡنَ	کہ ہو وہ	بِحَمۡدِهٖ (۴)	انکی تعریف کرتے ہوئے
وَيَقُوۡلُوۡنَ	اور کہیں گے	قَرِيۡبًا	قریب!	وَتَظُنُّوۡنَ	اور خیال کروگے تم
مَتٰى هُوَ	کب (ہوگا) وہ	يَوۡمَ (۲)	جس دن	اِنۡ لَّبِثۡتُمۡ	(کہ) نہیں ٹھیرے تم
قُلۡ	آپ کہئے:	يَدۡعُوۡكُمۡ	بلائیں گے وہ تم کو	اِلَّا	مگر
عَسٰٓى (۱)	ہوسکتا ہے	فَتَسۡتَجِيۡبُوۡنَ (۳)	پس تم تعمیل حکم کروگے	قَلِيۡلًا	تھوڑا

توحید ورسالت کے بعد اب آخرت کا ذکر ہے۔ مرکر زندہ ہونا برحق ہے۔ قرآن کریم نے یہ بات بھی طرح طرح سے سمجھائی ہے، مگر کافروں کے گلے نہیں اترتی —— اور وہ کہتے ہیں: ''جب ہم ہڈیاں اور چورا ہوجائیں گے، تو کیا واقعی ہم ازسرنو زندہ کئے جائیں گے؟!'' —— یعنی سچ سچ بتاؤ! یہ بات صحیح ہے! جب ہماری لاشیں گل سڑ کر ہڈیاں ہوجائیں گی، پھر وہ چورا چورا ہوجائیں گی، تو کیا وہ ذرّات دوبارہ جی اٹھیں گے؟! ہمیں یہ بات قطعاً ناممکن معلوم ہوتی ہے —— آپؐ جواب دیں: ''تم خواہ پتھر ہوجاؤ خواہ لوہا یا اس سے بھی زیادہ کوئی سخت چیز جس کا تم تصور کرسکتے ہو (پھر بھی تم ضرور زندہ کئے جاؤگے) —— یعنی بات ہڈیوں اور چورے پر نہ روکو، اگر تم اس سے بھی سخت کسی دھات کا تصور کرسکتے ہو تو کرو، تمہیں بہر حال زندہ ہونا ہے۔ یہ اللہ تعالیٰ کا اٹل فیصلہ ہے۔ وہ قادر مطلق ہیں۔ ان کے لئے یہ بات نہایت آسان ہے —— پس اب وہ پوچھیں گے: ''کون ہمیں دوبارہ زندہ کرے گا؟!'' —— یعنی ایسی کامل قدرت والا کون ہے جو بے جان چیزوں میں جان ڈال دے؟ —— آپؐ جواب دیں: ''جس نے پہلی بار تمہیں پیدا کیا ہے!'' —— وہی دوبارہ زندہ کرے گا۔ اس نے پہلے بھی تمہیں مٹی اور نطفہ سے بنایا ہے جو بے جان چیزیں تھیں، وہی دوبارہ خاک کے ان ذرّات میں حیاتِ نو پیدا کردے گا۔ کیونکہ زندگی کے لئے دو چیزیں ضروری ہیں: مادّہ میں قابلیت اور فاعل میں قدرت۔ اور یہ دونوں باتیں موجود ہیں۔ مٹی میں حیات کی وافر صلاحیت موجود ہے، اور اللہ تعالیٰ قادر مطلق ہیں۔ پس جب وہ لاش کے ذرّات پر وجود کا فیضان کریں گے تو وہ جی اٹھیں گے۔

جب یہ بات مدلل ہوگئی، اور منکرین لاجواب ہوگئے —— تو اب وہ آپ کے سامنے سر مٹکائیں گے —— یعنی تمسخر آمیز حرکتیں کریں گے —— اور کہیں گے: کب ہوگا وہ (زندہ ہونا؟) —— تاکہ ہم بھی وہ دلچسپ تماشا

(۱) عَسٰی تامہ ہے اور جملہ يَكُوْنُ بتاویل مصدر ہوکر اس کا فاعل ہے۔ (۲) يَوْمَ فعل اُذْكُرْ محذوف کی وجہ سے منصوب ہے (۳) اِسْتَجَابَة: جواب دینا (۴) بحمدہ حال ہے ضمیر فاعل سے ۱۲

دیکھیں! ـــــ آپؐ جواب دیں: ''کیا عجب ہے کہ وہ وقت قریب ہو!'' ـــــ مگر وہ وقت نظارہ بازی کا نہیں ہوگا ـــــ یاد کرو وہ دن جب اللہ تعالیٰ تم کو بلائیں گے، پس ان کی تعریف کرتے ہوئے تعمیل حکم کروگے ـــــ یعنی مطیع ومنقاد ہوکر خدا کی حمد وثنا کرتے ہوئے میدانِ محشر میں جمع ہوجاؤگے ـــــ اور تم خیال کروگے کہ بس ذرا سا ہی ٹھہرے ہو! ـــــ یعنی دنیا کی اور قبر کی زندگی تمہیں بس لمحہ بھر معلوم ہوگی۔ کیونکہ وقت ربڑ کی مثال ہے۔ آگے بہت دراز ہے، اور گذرا ہوا زمانہ چند لمحات سے زیادہ نہیں!

وَقُلْ لِّعِبَادِيْ يَقُوْلُوا الَّتِيْ هِيَ اَحْسَنُ ۭ اِنَّ الشَّيْطٰنَ يَنْزَغُ بَيْنَهُمْ ۭ اِنَّ الشَّيْطٰنَ كَانَ لِلْاِنْسَانِ عَدُوًّا مُّبِيْنًا ﴿۵۳﴾ رَبُّكُمْ اَعْلَمُ بِكُمْ ۭ اِنْ يَّشَاْ يَرْحَمْكُمْ اَوْ اِنْ يَّشَاْ يُعَذِّبْكُمْ ۭ وَمَآ اَرْسَلْنٰكَ عَلَيْهِمْ وَكِيْلًا ﴿۵۴﴾ وَرَبُّكَ اَعْلَمُ بِمَنْ فِي السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضِ ۭ وَلَقَدْ فَضَّلْنَا بَعْضَ النَّبِيّٖنَ عَلٰي بَعْضٍ وَّاٰتَيْنَا دَاوٗدَ زَبُوْرًا ﴿۵۵﴾

وَقُلْ	اور آپؐ کہیے	كَانَ(۴)	وہ ہے	اَوْاِنْ يَّشَاْ	یا اگر وہ چاہیں
لِّعِبَادِيْ(۱)	میرے بندوں سے	لِلْاِنْسَانِ	انسان کا	يُعَذِّبْكُمْ	(تو) سزا دیں تم کو
يَقُوْلُوا	(کہ) کہیں	عَدُوًّا	دشمن	وَمَآ	اور نہیں
الَّتِيْ هِيَ(۲)	جو (کہ) وہ	مُّبِيْنًا	کھلا	اَرْسَلْنٰكَ	بھیجا ہم نے آپ کو
اَحْسَنُ	بہتر ہو	رَبُّكُمْ	تمہارے رب	عَلَيْهِمْ	ان پر
اِنَّ الشَّيْطٰنَ	بے شک شیطان	اَعْلَمُ	خوب جانتے ہیں	وَكِيْلًا(۵)	ذمہ دار بنا کر
يَنْزَغُ(۳)	فساد ڈالتا ہے	بِكُمْ	تم کو	وَرَبُّكَ	اور آپ کے رب
بَيْنَهُمْ	ان کے درمیان	اِنْ يَّشَاْ	اگر وہ چاہیں	اَعْلَمُ	خوب جانتے ہیں
اِنَّ الشَّيْطٰنَ	یقیناً شیطان	يَرْحَمْكُمْ	(تو) مہربانی فرمائیں تم پر	بِمَنْ	ان کو جو

(۱) عِبَادِيْ میں اضافت تشریف کے لئے ہے یعنی اللہ کے محبوب بندے مؤمنین (۲) اَلَّتِيْ مع صلہ صفت ہے الکلمة محذوف کی اور الکلمة مفعول بہ ہے یقولوا کا (۳) نَزَغَ (ف،ض) نَزْغًا بَيْنَ الْقَوْمِ: فساد ڈالنا۔ نَزَغَ الشیطانُ بینھم: شیطان نے بعض کو بعض پر ورغلا دیا۔ اصل معنی نَزَغَ (ف) نَزْغًا کے انگلی چبھونا یا نیزہ مارنا ہیں (۴) كَانَ کا اسم ضمیر مستتر ہے اور عَدُوًّا مُبِيْنًا خبر ہے اور لِلْاِنْسَانِ، مُبِيْنًا سے متعلق ہے پھر جملہ كَانَ اِنَّ کی خبر ہے (۵) وَكِيْلًا ضمیر مفعول کاف سے حال ہے ۱۲

فِي السَّمٰوٰتِ	آسمانوں میں	فَضَّلْنَا	برتری بخشی ہم نے	وَّاٰتَيْنَا	اور دی ہم نے
وَالْاَرْضِ	اور زمین (میں ہیں)	بَعْضَ النَّبِيّٖنَ	بعض نبیوں کو	دَاوٗدَ	داؤدؑ کو
وَلَقَدْ	اور البتہ تحقیق	عَلٰي بَعْضٍ	بعض پر	زَبُوْرًا	زبور

تینوں بنیادی مسائل: توحید ورسالت اور آخرت کے بیان کے بعد، اب یہ بات بیان کی جارہی ہے کہ ان منکروں اور کٹر مخالفوں کے ساتھ کیسا برتاؤ کیا جائے۔ ابھی انھوں نے رسول اللہ ﷺ پر جو پھبتی کسی تھی، اور آپؐ کو پاگل قرار دیا تھا، اور جس طرح انھوں نے آخرت کی بات کا مذاق اڑایا تھا، اس کا تقاضا تو یہ ہے کہ ان کو ترکی بہ ترکی جواب دیا جائے۔ مگر اس کا کچھ فائدہ نہیں۔ بلکہ کبھی اس سے دعوت کا سارا کھیل بگڑ جاتا ہے۔ اس لئے ارشاد ہے:

—— اور آپؐ میرے بندوں سے (مسلمانوں سے) کہہ دیں کہ وہ ایسی بات کہیں جو بہترین ہو —— یعنی ان کی نامعقول باتوں کے جواب میں بھی سنجیدہ اور معقول بات کہیں۔ ان کی باتوں سے طیش میں آکر اشتعال انگیز کلمات استعمال نہ کریں۔ کیونکہ جو بات بہترین انداز سے کہی جاتی ہے وہی لمحۂ فکریہ پیدا کرتی ہے۔ کڑوی بات کا جواب میٹھی بات سے دیا جائے تو ضد میں کمی آتی ہے۔ اور یہ جان لیں کہ —— شیطان یقیناً لوگوں میں جھڑپ کروادیتا ہے —— وہ مخالف کو ہُشکار دیتا ہے، اور وہ مدّمقابل آجاتا ہے —— بیشک شیطان انسان کا کھلا دشمن ہے —— پس اس کے پلان کو خاک میں ملادو!

پھر اگر داعی سوچے کہ میں تو ان کی بھلائی کے لئے کوشاں ہوں، عداوت پر وہ اترے ہوئے ہیں، پھر میں نرمی کیوں برتوں؟ تو دونوں کو مخاطب بنا کر دو باتیں ارشاد فرماتے ہیں:

پہلی بات —— تمہارے پروردگار تمہارے احوال سے بخوبی واقف ہیں۔ اگر وہ چاہیں گے تو تم پر مہربانی فرمائیں، یا اگر چاہیں تو تم کو سزا دیں —— یہ بات مدعو قوم سے کہی گئی ہے کہ تمہارے سب احوال اللہ پاک کو معلوم ہیں۔ اگر تم کسی قابل نظر آئے تو تمہیں ایمان کی توفیق دیں گے۔ اور اگر تمہاری شامتِ اعمال رنگ لائی، اور تم دولتِ ایمان سے محروم رہ گئے تو تمہارے لئے سزا تیار رکھی ہے —— اور ہم نے آپ کو ان کا ذمہ دار بنا کر نہیں بھیجا —— یہ بات داعی کو بتائی کہ راہِ راست پر لانا اللہ تعالیٰ کا کام ہے۔ داعی کا کام بس بھلے انداز پر دعوت دینا ہے۔

دوسری بات —— اور آپ کے پروردگار ان سب کو جو آسمانوں اور زمین میں ہیں بخوبی جانتے ہیں —— یہ بات داعی کو سمجھائی کہ ایمان کی دولت کس کو دینی چاہئے کس کو نہیں، یہ بات اللہ تعالیٰ کو خوب معلوم ہے۔ داعی کو اس سلسلہ میں حد سے زیادہ حریص نہیں ہونا چاہئے —— اور واقعہ یہ ہے کہ ہم نے بعض انبیاء کو بعض پر برتری بخشی اور

داؤد (علیہ السلام) کو ہم نے زبور دی ـــــ یہ بات مدعو قوم کو سنائی کہ اللہ کی سنت انبیاء علیہم السلام کے حق میں یہ ہے کہ بعض کو بعض پر برتری بخشی گئی ہے۔ جیسے انبیاء بنی اسرائیل میں داؤد علیہ السلام کو برتری عطا فرمائی ہے، اور ان پر زبور نازل فرمائی۔ اسی طرح اللہ تعالیٰ نے مؤمنین کو کفار پر برتری بخشی ہے۔ پس جو فضل خداوندی کا خواہش مند ہے وہ زمرۂ مؤمنین میں شامل ہو جائے۔

قُلِ ادْعُوا الَّذِيْنَ زَعَمْتُمْ مِّنْ دُوْنِهٖ فَلَا يَمْلِكُوْنَ كَشْفَ الضُّرِّ عَنْكُمْ وَلَا تَحْوِيْلًا ﴿۵۶﴾ اُولٰٓئِكَ الَّذِيْنَ يَدْعُوْنَ يَبْتَغُوْنَ اِلٰى رَبِّهِمُ الْوَسِيْلَةَ اَيُّهُمْ اَقْرَبُ وَيَرْجُوْنَ رَحْمَتَهٗ وَيَخَافُوْنَ عَذَابَهٗ ؕ اِنَّ عَذَابَ رَبِّكَ كَانَ مَحْذُوْرًا ﴿۵۷﴾ وَاِنْ مِّنْ قَرْيَةٍ اِلَّا نَحْنُ مُهْلِكُوْهَا قَبْلَ يَوْمِ الْقِيٰمَةِ اَوْ مُعَذِّبُوْهَا عَذَابًا شَدِيْدًا ؕ كَانَ ذٰلِكَ فِى الْكِتٰبِ مَسْطُوْرًا ﴿۵۸﴾

قُلِ	آپ کہیے	يَدْعُوْنَ (۴)	پکارتے ہیں وہ	رَبِّكَ	آپ کے رب کی
ادْعُوا	پکارو تم	يَبْتَغُوْنَ	چاہتے ہیں	كَانَ	ہے وہ
الَّذِيْنَ	جن کو	اِلٰى رَبِّهِمُ	اپنے رب کی طرف	مَحْذُوْرًا	ڈرنے کی چیز
زَعَمْتُمْ (۱)	(معبود) خیال کرتے ہو تم	الْوَسِيْلَةَ	ذریعۂ تقرب	وَاِنْ	اور نہیں
مِّنْ دُوْنِهٖ (۲)	اللہ کے سوا	اَيُّهُمْ (۵)	کون ان میں سے	مِّنْ قَرْيَةٍ (۷)	کوئی بستی
فَلَا يَمْلِكُوْنَ	سو نہیں مالک وہ	اَقْرَبُ	زیادہ نزدیک ہو؟	اِلَّا نَحْنُ	مگر ہم
كَشْفَ الضُّرِّ	تکلیف ہٹانے کے	وَيَرْجُوْنَ (۶)	اور امید رکھتے ہیں وہ	مُهْلِكُوْهَا	اس کو ہلاک کرنے
عَنْكُمْ	تم سے	رَحْمَتَهٗ	اس کی مہربانی کی		والے ہیں
وَلَا تَحْوِيْلًا	اور نہ بدلنے کے	وَيَخَافُوْنَ	اور ڈرتے ہیں وہ	قَبْلَ يَوْمِ	قیامت کے دن سے
اُولٰٓئِكَ (۳)	یہ لوگ	عَذَابَهٗ	اس کے عذاب سے	الْقِيٰمَةِ	پہلے
الَّذِيْنَ	جن کو	اِنَّ عَذَابَ	بے شک سزا	اَوْ مُعَذِّبُوْهَا (۸)	یا اسکو سزا دینے والے ہیں

(۱) زَعَمَ کے دونوں مفعول محذوف ہیں أی زعمتموھم آلھۃً (۲) مِنْ دُوْنِهٖ: اَلَّذِيْنَ کا حال ہے (۳) أُولٰٓئِكَ مبتدا، يَبْتَغُوْنَ مع معطوفات خبر ہے (۴) يَدْعُوْنَ کا مفعول محذوف ہے أی يَدْعُوْنَهُمْ (۵) أَيُّهُمْ (مرکب اضافی) مبتدا۔ أَقْرَبُ خبر۔ پھر جملہ يَبْتَغُوْنَ کا مفعول بہ ہے (۶) يَرْجُوْنَ اور يَخَافُوْنَ کا عطف يَبْتَغُوْنَ پر ہے (۷) مِنْ زائدہ جنس کے استغراق کے لئے ہے ←

لکھی ہوئی	مَسۡطُوۡرًا	یہ بات	ذٰلِكَ	سخت سزا	عَذَابًا شَدِيۡدًا
	۝	کتاب (لوح محفوظ) میں	فِى الۡـكِتٰبِ	ہے	كَانَ

ابھی فرمایا تھا کہ اگر اللہ تعالیٰ چاہیں تو تم کو سزا دیں۔ اس موقع پر اگر منکرین یہ سوچیں کہ اگر اللہ تعالیٰ سزا دینے پر آئیں گے تو ہمارے دوسرے خدا ہماری مدد کریں گے۔ تو یہ ان کی خام خیالی ہے —— آپ کہیں: تم ان معبودوں کو پکار دیکھو جن کو تم نے اللہ تعالیٰ کے وَرے (معبود) بنا رکھا ہے: وہ نہ تو کسی تکلیف کو تم سے ہٹا سکتے ہیں، نہ ہی اس کو بدل سکتے ہیں —— یعنی کسی بھی تکلیف میں ان کا تجربہ کرلو: وہ تمہاری کچھ مدد نہیں کر سکتے، نہ کوئی تکلیف دور کر سکتے ہیں نہ ہلکی کر سکتے ہیں۔ پھر وہ اللہ کے عذاب الیم سے تم کو کیا بچالیں گے!

بلکہ تمہارے وہ معبود تو اللہ تعالیٰ کے عاجز بندے ہیں —— یہ لوگ جن کو مشرکین پکارتے ہیں: وہ خود اپنے رب کی طرف رسائی کا ذریعہ تلاش کرتے ہیں۔ چاہتے ہیں: کون ان میں سے اللہ سے قریب تر ہو جائے۔ اور وہ اللہ کی رحمت کے امیدوار ہیں۔ اور اس کے عذاب سے خائف ہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ آپ کے رب کا عذاب ڈرنے کی چیز ہے! —— مشرکین نے اللہ کے نیک بندوں کو: فرشتوں، پیغمبروں، اور ولیوں کو معبود سمجھ لیا ہے، حالانکہ یہ حضرات اللہ تعالیٰ کا بیش از بیش قرب ڈھونڈھتے ہیں۔ ان کی ساری محنت اللہ کا مقرب بندہ بننے کے لئے ہے۔ وہ امید وبیم کی حالت میں ہیں۔ اللہ کی رحمت کے امیدوار بھی ہیں، اور اس کے عذاب سے خائف بھی ہیں۔ اور اللہ کا عذاب واقعی ایسی ہولناک چیز ہے کہ اس سے کبھی مطمئن نہیں ہونا چاہئے۔

وسیلہ: تقرب حاصل کرنے کا ذریعہ یعنی ہر وہ چیز جس کو کسی چیز تک پہنچنے کا ذریعہ بنایا جائے۔ جیسے رسّی وسیلہ ہے۔ کیونکہ اس کے ذریعہ کنویں کے پانی تک پہنچا جاتا ہے۔ اور اللہ تعالیٰ تک پہنچنے کا وسیلہ: ایمان اور اعمال صالحہ ہیں۔ مذکورہ صالحین ایسے اعمال میں لگے ہوئے ہیں جو ان کو اللہ تعالیٰ سے قریب سے قریب تر کردیں، جو ہر وقت اللہ کی مرضی پیش نظر رکھتے ہیں، اور احکام شرعیہ کی پابندی کرتے ہیں۔ پس جب خود ان بندوں کا یہ حال ہے تو ان کے عقیدتمندوں کے لئے تو اور بھی ضروری ہے کہ وہ رب حقیقی کو خوش کرنے کی فکر کریں۔

یہاں کفار یہ خیال کر سکتے ہیں کہ اللہ کا وہ عذاب آ کیوں نہیں جاتا؟ اگلی آیت میں ان سے کہا جا رہا ہے کہ جلدی نہ مچاؤ، یہ بھی اپنے وقت پر ہو کر رہے گا۔ ارشاد ہے —— اور کوئی بھی بستی ایسی نہیں جس کو ہم قیامت سے پہلے ہلاک نہیں کریں گے، یا سخت سزا نہیں دیں گے۔ یہ بات نوشتہ (لوح محفوظ) میں لکھی ہوئی ہے —— اور اٹل ہے۔

← (۸) مُهۡلِكُوۡا اور مُعَذِّبُوۡا اصل میں مُهۡلِكُوۡنَ اور مُعَذِّبُوۡنَ تھا اضافت کی وجہ سے نون گرا ہے ۱۲

یعنی اللہ کے عذاب کے لئے، اللہ کے علم میں وقت طے ہے، جب وہ آپہنچے گا تو ٹلائے نہیں ٹلے گا۔ وہ وقت بدر کا دن تھا۔ اس دن ان کے سورما جنگ کا ایندھن بن گئے!

اللہ کے دشمن اس خوش فہمی میں ہرگز نہ رہیں کہ وہ ہمیشہ مزے اڑاتے رہیں گے۔ ایک وقت کے بعد ان کا انجام برا ہونے والا ہے

وَمَا مَنَعَنَآ اَنْ نُّرْسِلَ بِالْاٰيٰتِ اِلَّآ اَنْ كَذَّبَ بِهَا الْاَوَّلُوْنَ ۭ وَاٰتَيْنَا ثَمُوْدَ النَّاقَةَ مُبْصِرَةً فَظَلَمُوْا بِهَا ۭ وَمَا نُرْسِلُ بِالْاٰيٰتِ اِلَّا تَخْوِيْفًا ۝ وَاِذْ قُلْنَا لَكَ اِنَّ رَبَّكَ اَحَاطَ بِالنَّاسِ ۭ وَمَا جَعَلْنَا الرُّءْيَا الَّتِيْٓ اَرَيْنٰكَ اِلَّا فِتْنَةً لِّلنَّاسِ وَالشَّجَرَةَ الْمَلْعُوْنَةَ فِي الْقُرْاٰنِ ۭ وَنُخَوِّفُهُمْ ۙ فَمَا يَزِيْدُهُمْ اِلَّا طُغْيَانًا كَبِيْرًا ۝

وَمَا	اور نہیں	الْاَوَّلُوْنَ	پہلے لوگوں نے	بِالْاٰيٰتِ	معجزات کو
مَنَعَنَآ (۱)	روکا ہم کو	وَاٰتَيْنَا	اور دی ہم نے	اِلَّا	مگر
اَنْ	(اس سے) کہ	ثَمُوْدَ	ثمود کو	تَخْوِيْفًا	ڈرانے کے لئے
نُّرْسِلَ	بھیجیں ہم	النَّاقَةَ	اونٹنی	وَاِذْ	اور (یاد کرو) جب
بِالْاٰيٰتِ	(فرمائشی) معجزات	مُبْصِرَةً (۲)	آنکھیں کھولنے والی	قُلْنَا	کہا ہم نے
اِلَّآ	مگر	فَظَلَمُوْا	پس ناانصافی کی انہوں نے	لَكَ	آپ سے
اَنْ	اس بات نے کہ	بِهَا	اس کے ساتھ	اِنَّ رَبَّكَ	بیشک آپ کے رب نے
كَذَّبَ	جھٹلایا	وَمَا	اور نہیں	اَحَاطَ	گھیر رکھا ہے
بِهَا	ان کو	نُرْسِلُ	بھیجتے ہم	بِالنَّاسِ	لوگوں کو

(۱) مَنَعَ فعل ماضی، ضمیر جمع متکلم مفعول بہ۔ اَنْ مصدریہ سے پہلے مِنْ محذوف اور وہ مَنَعَ کا ظرف، اِلَّا استثنائے مُفرَّغ، اَنْ كَذَّبَ إلخ بتاویل مصدر ہو کر مَنَعَ کا فاعل (۲) مُبْصِرَةً اسم فاعل واحد مؤنث از اِبْصَار: دکھلانا مُبْصِرَةً: (روشن، واضح، واضح کرنے والی، دکھانے والی) الناقة کا حال ہے۔

وَمَا جَعَلْنَا	اور نہیں بنایا ہم نے	فِتْنَةً (۲)	آزمائش	وَ نُخَوِّفُهُمْ	اور ڈراتے ہیں ہم انکو
الرُّءْيَا (۱)	اُس مشاہدہ کو	لِّلنَّاسِ	لوگوں کے لئے	فَمَا	پس نہیں
الَّتِيْٓ	جو	وَالشَّجَرَةَ (۳)	اور اس درخت کو	يَزِيْدُهُمْ (۴)	بڑھاتا (ڈرانا) ان کو
اَرَيْنٰكَ	کرایا ہم نے آپ کو	الْمَلْعُوْنَةَ	جس کی مذمت کی گئی ہے	اِلَّا	مگر
اِلَّا	مگر	فِي الْقُرْاٰنِ	قرآن میں	طُغْيَانًا كَبِيْرًا	بڑی سرکشی میں

اس جگہ پہنچ کر کسی کے دل میں خیال پیدا ہوسکتا ہے کہ منکرین سے یہ بات منوانے کا آسان طریقہ یہ ہے کہ ان کے مطالبات پورے کردیئے جائیں۔ اور ان کو ان کے فرمائشی معجزات دکھا دیئے جائیں۔ تو وہ حسب وعدہ ایمان لے آئیں گے ـــــ کفار کے مطالبات کیا تھے؟ یہی تو تھے کہ صفا پہاڑی سونے کی بنادی جائے۔ مکہ کے آس پاس سے پہاڑ ہٹا کر قابل کاشت زمین بنادی جائے۔ جیسا کہ آیت ۹۰-۹۳ میں آرہا ہے۔ اور یہ مطالبات پورے کرنا اللہ تعالیٰ کے لئے کچھ بھی مشکل نہیں۔ پھر یہ آسان راستہ کیوں اختیار نہیں کیا گیا، جواباً ارشاد ہے ـــــ اور ہم نے (فرمائشی) نشانیاں بھیجنا اسی لئے بند کیا ہے کہ اگلوں نے ان کو جھٹلایا ـــــ یعنی گذشتہ اقوام کو ان کے فرمائشی معجزات دکھائے گئے، مگر وہ ایمان نہ لائے ـــــ اور ثمود کو ہم نے آنکھیں کھولنے والی اونٹنی دی تھی، مگر اس کے ذریعہ انھوں نے اپنا نقصان کیا! ـــــ ثمود نے حضرت صالح علیہ السلام سے یہ معجزہ طلب کیا تھا کہ فلاں پہاڑ کی چٹان سے اونٹنی نکالیے۔ اللہ تعالیٰ نے اپنی قدرت سے نکال دی۔ جو ان کی آنکھیں کھولنے کے لئے کافی تھی۔ مگر وہ ایمان نہ لائے۔ الٹے ظلم پر کمر بستہ ہوگئے۔ اور اونٹنی کی کوچیں کاٹ دیں تو اللہ نے سب کو ہلاک کردیا۔ اس مثال سے اور دیگر بہت سی مثالوں سے یہ بات ثابت ہے کہ فرمائشی معجزات دکھانے کا حاصل کچھ نہیں۔ پس اگر مکہ والوں کے مطالبات پورے کردیئے جائیں، تب بھی وہ ایمان نہیں لائیں گے۔

---

(۱) رُءْ يَا قرآن میں بغیر واو کے صرف ہمزہ کے ساتھ بغیر مرکز ہمزہ کے لکھا جاتا ہے۔ یہ رَاٰیٰ یَرَی کا مصدر ہے جس کے معنی بصارت یا بصیرت سے دیکھنے کے ہیں۔ نیز فُعْلٰی کے وزن پر اسم بھی ہے اس وقت ''خواب'' کے معنی ہوتے ہیں۔ اس آیت میں آنکھ سے دیکھنے کے معنی ہیں جیسا کہ ترجمان القرآن حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ نے بیان فرمایا ہے۔ معراج میں جو نشانیاں دکھلائی گئی تھیں وہ امور غیب سے تھیں اور رویتِ شہادت سے مختلف تھیں اس لئے ان کو عالم خواب کے مشابہ قرار دیکر رؤیا سے تعبیر کیا ہے (قاله إبن حجر فى الفتح ۱۲:۳۰۹ أميريه) (۲) فِتْنَةً مفعول ثانی ہے جَعَلْنَا کا (۳) الشَّجَرَةَ کا عطف الرؤیا پر ہے اور مَلْعُوْنَة (اسم مفعول) از لَعَنَ (ف) لَعْنًا: لعنت کرنا، رسوا کرنا، خیر سے بعید کرنا، دھتکارنا، سخت مذمت کرنا (۴) يَزِيْدُ کا فاعل ضمیر مستتر ہے اور طُغْيَانًا كَبِيْرًا مفعول ثانی ہے ۱۲

پھر سوال پیدا ہوگا کہ اگر بات ایسی ہے تو گذشتہ اقوام کی فرمائشیں کیوں پوری کی گئیں؟ جواب یہ ہے کہ ان کو معجزات تخویف و انذار کے لئے دکھائے گئے تھے۔ ارشاد ہے ـــــ اور ہم آیتیں (نشانیاں) صرف ڈرانے کے لئے بھیجتے ہیں ـــــ یعنی فرمائشی معجزات دکھانے کا مقصد صرف یہ ہوتا ہے کہ لوگ اللہ تعالیٰ کی قدرتِ قاہرہ سے ڈریں، اور اللہ کی طرف جھکیں ـــــ اور (ایسی آیتیں اللہ تعالیٰ نازل فرما چکے ہیں) یاد کرو جب ہم نے آپؐ سے کہا تھا کہ آپؐ کے رب نے یقیناً لوگوں کو گھیر رکھا ہے ـــــ علم سے بھی اور قدرت سے بھی۔ سورۃ البروج میں ہے: ﴿بَلِ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا فِيْ تَكْذِيْبٍ، وَاللّٰهُ مِنْ وَّرَائِهِمْ مُحِيْطٌ﴾ کافر جھٹلانے میں لگے ہوئے ہیں، اور اللہ تعالیٰ نے ان کو ہر طرف سے گھیر رکھا ہے۔ کیا یہ ارشاد انذار و تخویف کے لئے کافی نہیں؟!

اور اگر فرمائشی نشانیاں دکھانے ہی پر اصرار ہے، تو کفارِ مکہ کو دو فرمائشی معجزے ان کی فرمائش سے پہلے ہی دکھائے جاچکے ہیں۔ ارشاد ہے ـــــ اور ہم نے آپؐ کو (شبِ معراج میں) جو مشاہدہ کرایا تھا وہ لوگوں کی آزمائش ہی کے لئے تھا۔ اور وہ درخت بھی جس کی قرآن میں مذمت کی گئی ہے ـــــ ان دونوں معجزات کی تفصیل درج ذیل ہے:

۱ ـــ کفار یہ مطالبہ کرتے تھے کہ آپؐ آسمان میں چڑھ کر دکھائیں: ﴿أَوْ تَرْقٰى فِي السَّمَاءِ﴾ مگر وہ نہیں جانتے کہ یہ معجزہ ان کو ان کی فرمائش سے پہلے ہی دکھایا جاچکا ہے۔ شبِ معراج میں آپ ﷺ کو ساتوں آسمانوں کی سیر کرائی گئی ہے، اور عجائباتِ قدرت کا مشاہدہ کرایا گیا۔ مگر اس مشاہدہ سے منکرین کو کیا حاصل ہوا؟ انھوں نے اس مشاہدہ کو مذاق کا موضوع بنالیا۔ اور نبی پر جھوٹے اور جنونی ہونے کے الزامات لگانے لگے۔

۲ ـــ مشرکین کا ایک مطالبہ یہ تھا کہ آپؐ آسمان میں سے لکھی ہوئی کتاب لے آئیں، جسے ہم خود پڑھیں: ﴿حَتّٰى تُنَزِّلَ عَلَيْنَا كِتَابًا نَّقْرَؤُهٗ﴾ اور ظاہر ہے کہ نبی آسمان سے جو کتاب لائے گا، اس میں آسمانی خبریں ہونگی، تو کیا یہ لوگ اس کو مان لیں گے؟ دیکھئے اس قرآن میں ایک نہایت ناپسندیدہ درخت زقّوم کی خبر دی گئی، جو دوزخ کی تہ میں پیدا ہوتا ہے، اور دوزخی اس کو کھائیں گے۔ اس خبر کو مکہ والوں نے کس طرح لیا؟ ابوجہل نے کہا: ''لو بھئی! بھڑکتی آگ میں ہرا درخت!'' دوسرا بولا: ''زقّوم: یمنی زبان میں کھجور اور مکھن کو کہتے ہیں!'' تیسرے نے دعا کی: ''الٰہی! ہمارے گھروں کو زقّوم سے بھر دے!''

غرض: کس امید پر مشرکین کے مطالبات پورے کئے جائیں؟ اور جہاں تک تخویف و انذار کا تعلق ہے تو اللہ تعالیٰ حسبِ مصلحت مسلسل آیات و نشانات دکھاتے رہتے ہیں۔ ارشاد ہے ـــــ اور ہم ان کو ڈراتے رہتے ہیں، مگر ہر ڈراوا ان کی سرکشی میں اضافہ ہی کرتا ہے! ـــــ یعنی نہ کوئی نصیحت کارگر ہوتی ہے نہ نشانی! دن بدن ان کی سرکشی کا

پارہ چڑھتا جاتا ہے!

جب دل اندھے ہو جاتے ہیں تو نصیحت سر پر سے گذر جاتی ہے، اور جب آنکھ اندھی ہو جاتی ہے تو نشانی بے فائدہ ہو جاتی ہے

وَاِذْ قُلْنَا لِلْمَلٰٓئِكَةِ اسْجُدُوْا لِاٰدَمَ فَسَجَدُوْٓا اِلَّآ اِبْلِيْسَ ؕ قَالَ ءَاَسْجُدُ لِمَنْ خَلَقْتَ طِيْنًا ﴿۶۱﴾ قَالَ اَرَءَيْتَكَ هٰذَا الَّذِيْ كَرَّمْتَ عَلَيَّ ۡ لَئِنْ اَخَّرْتَنِ اِلٰى يَوْمِ الْقِيٰمَةِ لَاَحْتَنِكَنَّ ذُرِّيَّتَهٗٓ اِلَّا قَلِيْلًا ﴿۶۲﴾ قَالَ اذْهَبْ فَمَنْ تَبِعَكَ مِنْهُمْ فَاِنَّ جَهَنَّمَ جَزَآؤُكُمْ جَزَآءً مَّوْفُوْرًا ﴿۶۳﴾ وَاسْتَفْزِزْ مَنِ اسْتَطَعْتَ مِنْهُمْ بِصَوْتِكَ وَاَجْلِبْ عَلَيْهِمْ بِخَيْلِكَ وَرَجِلِكَ وَشَارِكْهُمْ فِي الْاَمْوَالِ وَالْاَوْلَادِ وَعِدْهُمْ ؕ وَمَا يَعِدُهُمُ الشَّيْطٰنُ اِلَّا غُرُوْرًا ﴿۶۴﴾ اِنَّ عِبَادِيْ لَيْسَ لَكَ عَلَيْهِمْ سُلْطٰنٌ ؕ وَكَفٰى بِرَبِّكَ وَكِيْلًا ﴿۶۵﴾

وَاِذْ	اور (یاد کرو) جب	اِبْلِيْسَ	ابلیس نے	اَرَءَيْتَكَ (۲)	بتلایئے آپ
قُلْنَا	کہا ہم نے	قَالَ	کہا اس نے	هٰذَا (۳)	یہ ہے
لِلْمَلٰٓئِكَةِ	فرشتوں سے	ءَاَسْجُدُ	کیا سجدہ کروں میں	الَّذِيْ	وہ جس کو
اسْجُدُوْا	سجدہ کرو	لِمَنْ	اس کو جسے	كَرَّمْتَ	آپ نے عزت بخشی
لِاٰدَمَ	آدم کو	خَلَقْتَ	بنایا آپ نے	عَلَيَّ	مجھ پر؟
فَسَجَدُوْٓا	پس سجدہ کیا انھوں نے	طِيْنًا (۱)	مٹی سے؟	لَئِنْ (۴)	بخدا اگر
اِلَّآ	مگر	قَالَ	(نیز) اس نے کہا	اَخَّرْتَنِ (۵)	مہلت دی آپ نے مجھے

(۱) طیناً منصوب بنزع خافض ہے أی من طِیْنٍ (۲) أَرَأَیْتَكَ میں ہمزۂ استفہام ہے رَأَیْتَ فعل بافاعل: کاف فاعل کی تاکید ہے لیکن محاورہ میں یہ بمعنی اَخْبِرْنِیْ (بتلائے) ہے۔ هٰذَا مبتدا اور الذی صلہ کے ساتھ خبر ہے اور هٰذَا سے پہلے ہمزۂ استفہام انکاری محذوف ہے (۴) لَئِنْ سے جملہ مستانفہ ہے (۵) أَخَّرْتَنِ تَأْخِیْرٌ سے ہے أَخَّرْتَ فعل ماضی، صیغہ واحد مذکر حاضر ن وقایہ اور ی ضمیر واحد متکلم محذوف ہے اور نون کا کسرہ اس کی علامت ہے۔

اِلٰی یَوْمِ الْقِیٰمَةِ	قیامت کے دن تک	مَّوْفُوْرًا	پوری	وَمَا	اور نہیں
لَاَحْتَنِكَنَّ(۱)	تو ضرور اپنے بس میں	وَاسْتَفْزِزْ(۳)	اور پیرا کھاڑ دے تو	یَعِدُهُمُ	وعدہ کرتا ان سے
	کرلوں گا	مَنِ	جس کے	الشَّیْطٰنُ	شیطان
ذُرِّیَّتَهٗ	اس کی اولاد کو	اسْتَطَعْتَ	(اکھاڑ) سکے	اِلَّا	مگر
اِلَّا قَلِیْلًا	تھوڑے لوگوں کے علاوہ	مِنْهُمْ(۴)	ان میں سے	غُرُوْرًا(۸)	دغا بازی والا
قَالَ	فرمایا	بِصَوْتِكَ	اپنی آواز سے	اِنَّ	بے شک
اذْهَبْ	جا	وَاَجْلِبْ(۵)	اور چڑھالا	عِبَادِیْ	میرے بندے
فَمَنْ	پھر جو شخص	عَلَیْهِمْ	ان پر	لَیْسَ	نہیں ہے
تَبِعَكَ	تیری پیروی کرے گا	بِخَیْلِكَ(۶)	اپنے سوار	لَكَ	تیرے لئے
مِنْهُمْ	ان میں سے	وَرَجِلِكَ(۷)	اور اپنے پیادے	عَلَیْهِمْ	ان پر
فَاِنَّ	تو بے شک	وَشَارِكْهُمْ	اور ساجھی بن جا ان کا	سُلْطٰنٌ	کچھ قابو
جَهَنَّمَ	دوزخ	فِی الْاَمْوَالِ	اموال میں	وَكَفٰی	اور کافی ہیں
جَزَآؤُكُمْ	تمہاری سزا ہے	وَالْاَوْلَادِ	اور اولاد میں	بِرَبِّكَ(۹)	آپ کے رب
جَزَآءً(۲)	سزا	وَعِدْهُمْ	اور وعدہ کر ان سے	وَكِیْلًا(۱۰)	کارسازی کے لئے

پیچھے مؤمنین سے یہ بات کہی گئی ہے کہ شیطان تمہارا صریح دشمن ہے، اور ابھی کفار کے بارے میں یہ بات واضح

(۱) لَاَحْتَنِكَنَّ، اِحْتِنَاكَ سے فعل مضارع، صیغہ واحد متکلم لام تاکید نون تاکید ثقیلہ اِحْتَنَكَ الفرسَ کے لغوی معنی ہیں گھوڑے کے منہ میں لگام دینا، اور مجازی معنی ہیں قابو میں کرنا (۲) جَزَاءً مَوْفُوْرًا مفعول مطلق ہے جَزَاؤُكُمْ (مصدر) کا (۳) اِسْتَفْزِزْ (فعل امر) اس کا مجرد فَزَّ (ن) فَزًّا ہے جس کے معنی ہیں گھبرا دینا۔ برانگیختہ کرنا، حواس باختہ بنادینا۔ لسان العرب میں ہے فَزَّهٗ فَزًّا وَاَفَزَّهٗ اَفْزَعَهٗ وأزعجهٗ وطَيَّر فؤاده۔ اور باب استفعال میں آکر معنی میں مبالغہ پیدا ہوگیا ہے پس اِسْتَفَزَّهٗ من الشیئ کے معنی ہیں قدم اکھاڑ دینا، گھبرا دینا۔ آگے آیت ۷۶ میں بھی یہ لفظ آرہا ہے (۴) مِنْهُمْ عَلٰی سبیل التنازع اِسْتَفْزِزْ اور اِسْتَطَعْتَ دونوں سے متعلق ہے اور استطعت کا مفعول بہ محذوف ہے أی من استطعت أَنْ تَسْتَفِزَّهٗ منهم (۵) اَجْلَبَ القومَ: جمع کرنا۔ اَجْلَبَ الجیش: چڑھالانا۔ جَلَبَهٗ (ن، ض) جَلْبًا: ہانک کرلانا اور بِخَیْلِكَ میں با زائدہ ہے (۶) خَیْل کے اصلی معنی گھوڑے کے ہیں مگر مجازاً سواروں کے لئے استعمال کرتے ہیں (۷) رَجِلٌ جمع ہے رَاجِلٌ کی جس کے معنی ہیں پیادہ (۸) غُرور مصدر یہ یا تو مبالغۃً محمول ہے یا اسم فاعل کے معنی میں ہے أی وعدًا ذا غُرور (۹) بِرَبِّكَ میں کفی کے فاعل پر با زائدہ آئی ہے (۱۰) وَكِیْلًا نسبت سے تمیز ہے ۱۲

کی گئی ہے کہ انذار کے لئے ان کو جو بھی نشانی دکھائی جاتی ہے، وہ ان کی سرکشی ہی بڑھاتی ہے۔ اب اس کی مثال میں شیطان کا حال پیش کیا جارہا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے اپنی قدرت کی نشانی دکھائی۔ اشرفِ مخلوقات انسان کو وجود بخشا۔ اس کو زیورِ علم سے آراستہ کیا۔ اور عملی طور پر اس کی مزیّت واضح کرنے کے لئے مخلوقات کو حکم دیا کہ وہ آدم علیہ السلام کو سجدہ کریں۔ چنانچہ فرشتوں جیسی برتر مخلوق نے سجدہ کیا۔ مگر ان کے شاگرد معلّم الملکوت شیطان نے انکار کیا، بلکہ وہ خدائی فیصلہ پر حرف گیر ہوا۔ اور اس نے اپنی برتری ظاہر کرتے ہوئے کہا کہ یہ انسان تو میری مٹھی میں ہیں۔ میں ان سب کو معدودے چند کے علاوہ اپنی راہ پر ڈال لونگا۔ یہی اس کی صریح دشمنی ہے۔ یہی حال مشرکین مکہ کا ہے کہ ان کو جو بھی نشانی دکھائی جاتی ہے، وہ ان کی سرکشی ہی میں اضافہ کرتی ہے۔ فرماتے ہیں: —— اور یاد کرو جب ہم نے فرشتوں سے کہا کہ آدم کو سجدہ کرو تو سب نے سجدہ کیا مگر ابلیس نے نہ کیا —— اس نے صاف انکار کردیا اور غرور میں آگیا —— وہ بولا: کیا میں اس کو سجدہ کروں جس کو آپ نے مٹی سے بنایا ہے؟ —— یعنی اس نے اللہ سے مناظرہ شروع کردیا۔ کہنے لگا: میں آدم سے بہتر ہوں۔ مجھے آپ نے آگ سے بنایا ہے اور اسے مٹی سے اور افضل مفضول کو سجدہ کرتا ہے؟! آدم کو حکم دیجئے کہ مجھے سجدہ کرے۔ اسی طرح —— اس نے کہا: ''بتلایئے یہ ہے وہ جسے آپ نے مجھ پر عزت بخشی ہے؟'' —— یعنی کیا یہ خاک کا پتلا اس قابل ہے کہ میں اس کو سجدہ کروں؟ میرا اس کا کیا مقابلہ؟ —— بخدا! اگر آپ نے مجھے قیامت کے دن تک مہلت دی تو معدودے چند کے علاوہ اس کی ساری اولاد کو اپنے قابو میں کرلوں گا —— یعنی میں ایسا زبردست ہوں، پھر مجھی کو حکم دیا جاتا ہے اس کو سجدہ! —— ارشاد فرمایا: ''دور ہو! جو بھی ان میں سے تیری پیروی کرے گا تو دوزخ تم سب کی بھرپور سزا ہے! —— یعنی دفع ہو یہاں سے! تجھے قیامت تک مہلت ہے، جا نکال اپنے ارمان! اور کر اس کی ذریت کو گمراہ، اور سن لے تیرا بھی اور ان میں سے جو تیرے پیچھے چلے گا ان سب کا ٹھکانہ جہنم ہے، وہی تمہاری بھرپور سزا ہے —— اور اپنی صدا سے ان میں سے جن کے پیر اکھاڑ سکے اکھاڑ دے —— یعنی وسوسہ اندازی کرکے، لہو ولعب کے ذریعہ، ڈھول تماشے سے، ریڈیو، ٹی وی سے اور مزامیر وبانسری کی آواز سے جس کے پیر راہ حق سے ہٹا سکے ہٹادے، اور گمراہ اور بے دین بنا سکے بنالے —— اور ان پر اپنے سوار اور پیادے چڑھالا —— یعنی اپنی ساری طاقت جھونک دے، پوری قوت سے لشکر کشی کر اور ان کو جتنا تباہ کرسکتا ہو کر ڈال —— اور ان کے اموال واولاد میں اپنا ساجھا کرلے —— مال میں شیطان کی شرکت کئی طرح سے ہوتی ہے (۱) حرام طریقہ پر مال کمانا (۲) شیطان کے اشاروں پر حرام جگہ میں خرچ کرنا (۳) فضول خرچی کرنا (۴) اللہ کا نام لئے بغیر کھانا وغیرہ —— اسی طرح اولاد میں بھی شیطان کی شرکت کئی طرح سے ہوتی ہے (۱) دعا پڑھے بغیر بیوی

سے صحبت کرنا (۲) اولاد کے مشرکانہ نام رکھنا (۳) ان کی حفاظت کے لئے ٹونے ٹونکے کرنا (۴) حرام آمدنی سے ان کی پرورش کرنا (۵) بداخلاقی اور گمراہی کی تعلیم دینا وغیرہ ـــــ اوران سے وعدے کر ـــــ یعنی ان کو سبز باغ دکھا، جھوٹی آرزوؤں میں پھنسا ـــــ اور شیطان کے وعدے تو دھوکے کی ٹٹی ہی ہوتے ہیں ـــــ ''ٹٹی'' بانس یا سرکنڈوں کا بنا ہوا چھپّر، جو دروازوں یا کھڑکیوں پر لگاتے ہیں یا جن پر بیلیں چڑھاتے ہیں اور'' دھوکے کی ٹٹی'' فریب میں لانے والی یا مغالطہ دینے والی چیزوں کو کہتے ہیں۔ یعنی شیطان کے وعدوں سے فریب کھانا احمقوں کا کام ہے، اس کے سب وعدے دغابازی اور فریب ہی ہوتے ہیں ـــــ یقیناً میرے خاص بندوں پر تیرا کچھ زور نہیں چلے گا ـــــ شیطان مؤمن بندوں کو زبردستی اپنی راہ پر نہیں کھینچ سکتا۔ اس کا کام صرف بہلانا، پھسلانا اور جھوٹے وعدے کرنا ہے۔ شیطان کو انسان پر ایسا اختیار نہیں دیا گیا کہ وہ زبردستی ہاتھ پکڑ کر ان کو گھسیٹ لے ـــــ اور کارسازی کے لئے تیرا پروردگار کافی ہے ـــــ یعنی اللہ تعالیٰ شیطان کے مکروفریب سے مؤمن بندوں کو بچانے والے ہیں اور جن کے محافظ اللہ تعالیٰ ہوں ان کا کوئی کیا بگاڑ سکتا ہے، اللہ تعالیٰ کی کارسازی کے سامنے شیطان کا مکروفسوں بے اثر ہوتا ہے۔

وساوس پریشان کریں تو دایاں ہاتھ دل پر رکھ کر سات بار کہیں سُبْحَانَ الْمَلِكِ الْقُدُّوْسِ الْخَلَّاقِ الْفَعَّال پھر ایک بار پڑھیں: اِنْ يَّشَاْ يُذْهِبْكُمْ وَيَاْتِ بِخَلْقٍ جَدِيْدٍ وَمَا ذٰلِكَ عَلَى اللّٰهِ بِعَزِيْزٍ ان شاءاللہ وساوس رُک جائیں گے

رَبُّكُمُ الَّذِيْ يُزْجِيْ لَكُمُ الْفُلْكَ فِي الْبَحْرِ لِتَبْتَغُوْا مِنْ فَضْلِهٖ ۭ اِنَّهٗ كَانَ بِكُمْ رَحِيْمًا ﴿۶۶﴾ وَاِذَا مَسَّكُمُ الضُّرُّ فِي الْبَحْرِ ضَلَّ مَنْ تَدْعُوْنَ اِلَّآ اِيَّاهُ ۚ فَلَمَّا نَجّٰىكُمْ اِلَى الْبَرِّ اَعْرَضْتُمْ ۭ وَكَانَ الْاِنْسَانُ كَفُوْرًا ﴿۶۷﴾ اَفَاَمِنْتُمْ اَنْ يَّخْسِفَ بِكُمْ جَانِبَ الْبَرِّ اَوْ يُرْسِلَ عَلَيْكُمْ حَاصِبًا ثُمَّ لَا تَجِدُوْا لَكُمْ وَكِيْلًا ﴿۶۸﴾ اَمْ اَمِنْتُمْ اَنْ يُّعِيْدَكُمْ فِيْهِ تَارَةً اُخْرٰى فَيُرْسِلَ عَلَيْكُمْ قَاصِفًا مِّنَ الرِّيْحِ فَيُغْرِقَكُمْ بِمَا كَفَرْتُمْ ۙ ثُمَّ لَا تَجِدُوْا لَكُمْ عَلَيْنَا بِهٖ تَبِيْعًا ﴿۶۹﴾ وَلَقَدْ كَرَّمْنَا بَنِيْٓ اٰدَمَ وَحَمَلْنٰهُمْ فِي الْبَرِّ وَالْبَحْرِ وَرَزَقْنٰهُمْ مِّنَ الطَّيِّبٰتِ وَفَضَّلْنٰهُمْ عَلٰي كَثِيْرٍ مِّمَّنْ خَلَقْنَا تَفْضِيْلًا ﴿۷۰﴾ ع ۷

رَبُّكُمُ (۱)	تمہارے پروردگار	تَدْعُوْنَ (۳)	پکارتے ہوتم	حَاصِبًا (۶)	سنگبار ہوا
الَّذِىْ	وہ ہیں جو	اِلَّآ (۴)	سوائے	ثُمَّ	پھر
يُزْجِىْ (۲)	لے چلتے ہیں	اِيَّاهُ	اللہ کے	لَا تَجِدُوْا	نہ پاؤتم
لَكُمُ	تمہارے لئے	فَلَمَّا	پھر جب	لَكُمْ	اپنے لئے
الْفُلْكَ	کشتی کو	نَجّٰىكُمْ	بچالاتے ہیں وہ تم کو	وَكِيْلًا	کوئی کارساز
فِى الْبَحْرِ	دریا میں	اِلَى الْبَرِّ (۵)	خشکی کی طرف	اَمْ اَمِنْتُمْ	یا بےفکر ہو گئے تم
لِتَبْتَغُوْا	تا کہ تلاش کروتم	اَعْرَضْتُمْ	(تو) پھر جاتے ہوتم	اَنْ	(اس سے) کہ
مِنْ فَضْلِهٖ	اس کے رزق میں سے	وَكَانَ	اور ہے	يُّعِيْدَكُمْ	لوٹائیں وہ تم کو
اِنَّهٗ كَانَ	بیشک وہ ہیں	الْاِنْسَانُ	انسان	فِيْهِ	دریا میں
بِكُمْ	تم پر	كَفُوْرًا	بڑا ناشکرا	تَارَةً اُخْرٰى (۷)	دوبارہ
رَحِيْمًا	بے حد مہربان	اَفَاَمِنْتُمْ	کیا تو بےفکر ہو گئے تم	فَيُرْسِلَ	پھر بھیجیں وہ
وَاِذَا	اور جب	اَنْ	(اس سے) کہ	عَلَيْكُمْ	تم پر
مَسَّكُمُ	پہنچتی ہے تم کو	يَّخْسِفَ	دھنسادیں وہ	قَاصِفًا (۸)	سخت طوفان
الضُّرُّ	کوئی تکلیف	بِكُمْ	تمہارے ساتھ	مِّنَ الرِّيْحِ	ہوا کا
فِى الْبَحْرِ	دریا میں	جَانِبَ الْبَرِّ	خشکی کی جانب کو	فَيُغْرِقَكُمْ	پس ڈبودیں وہ تم کو
ضَلَّ	(تو) غائب ہوجاتے ہیں	اَوْ يُرْسِلَ	بھیج دیں	بِمَا كَفَرْتُمْ (۹)	تمہارے کفر کی وجہ سے
مَنْ	وہ جن کو	عَلَيْكُمْ	تم پر	ثُمَّ	پھر

(۱) رَبُّكُمْ مبتدا الَّذِىْ مع صلہ خبر (۲) يُزْجِىْ، اِزْجَاء سے ہے زَجَا(ن) زَجْوًا وَزَجّٰى تَزْجِيَةً وَاَزْجٰى اِزْجَاءً: ہانکنا، چلانا، کہا جاتا ہے كَيْفَ تُزْجِىْ اَيَّامَكَ؟ تم اپنا زمانہ کس طرح بسر کرتے ہو؟ (۳) تَدْعُوْنَ کا مفعول محذوف ہے أى تدعونهٗ اور وہی ضمیر عائد ہے (۴) اگر مَنْ سے تمام آلهة مراد لئے جائیں تو استثناء متصل ہے اور اللہ کے سوا معبود مراد لئے جائیں تو استثناء منقطع ہے اور اِيَّاهُ واحد مذکر غائب کی ضمیر منصوب منفصل ہے (۵) اِلَى الْبَرِّ نَجّٰكُمْ سے متعلق ہے وهو متضمن لمعنى الإيصال (۶) حَاصِبًا حَصْبَاء سے اسم فاعل ہے حَصْبَاءُ کنکریوں کو کہتے ہیں۔ حَاصِبْ: پتھر برسانے والی ہوا، پتھروں کا مینہ (۷) تَارَةً أخرىٰ مفعول فيه ہے (۸) قَاصِفْ (اسم فاعل) ایسی تیز آندھی کہ جو چیز اس کی زد میں آجائے اس کو توڑ دے قَصَفَ (ض) قَصْفًا: توڑ دینا۔ اور باب سمع سے لازم ہے (۹) مَا مصدریہ ہے اور باسببیہ ہے ۱۲

لَا تَجِدُوْا	نہ پاؤ تم	كَرَّمْنَا	عزت بخشی ہم نے	مِّنَ الطَّيِّبٰتِ	نفیس چیزوں میں سے
لَكُمْ	اپنے لئے	بَنِيْٓ اٰدَمَ	اولاد آدم کو	وَفَضَّلْنٰهُمْ	اور فوقیت دی ہم نے انکو
عَلَيْنَا	ہم پر	وَحَمَلْنٰهُمْ	اور سوار کیا ہم نے ان کو	عَلٰى كَثِيْرٍ	بہت سوں پر
بِهٖ	اُس بارے میں	فِي الْبَرِّ	خشکی میں	مِّمَّنْ[2]	ان میں سے جن کو
تَبِيْعًا[1]	کوئی پیچھا کرنے والا	وَالْبَحْرِ	اور دریا (میں)	خَلَقْنَا	پیدا کیا ہم نے
وَلَقَدْ	اور البتہ تحقیق	وَرَزَقْنٰهُمْ	اور روزی دی ہم نے انکو	تَفْضِيْلًا[3]	فوقیت دینا

اب پھر توحید کا بیان شروع ہوتا ہے ان آیات میں توحید کی تین دلیلیں بیان کی گئی ہیں:

پہلی دلیل:—— برہان ربوبیت —— پروردگار عالم نے انسان کو پیدا کر کے اس کی تمام ضرورتوں کا انتظام فرمایا۔ پانی کی لطافت اور ہوا کی نزاکت اس کے لئے مسخر کی۔ کشتیاں سمندر میں رواں دواں ہیں، اور ہوائی جہاز فضا میں اڑتے پھرتے ہیں۔ تاکہ انسان ہر طرف سے فضل خداوندی سمیٹ کر لائے۔ ارشاد ہے —— تمہارے پروردگار وہ ہیں جو تمہارے لئے سمندر میں کشتی چلاتے ہیں تاکہ تم اللہ کا فضل تلاش کرو، بلاشبہ وہ تمہارے حال پر نہایت مہربان ہیں —— یعنی رب کریم کی عنایتیں دیکھو، انھوں نے صرف خشکی میں تمہارے لئے ذرائع معاش پیدا نہیں فرمائے بلکہ تمہاری رزق رسانی کے لئے سمندر کو بھی مسخر کر دیا۔ بڑے بڑے دُخانی جہاز سمندر کا سینہ چیرتے ہوئے ایک براعظم سے دوسرے براعظم تک پہنچ رہے ہیں تاکہ تم ان میں تجارتی سامان وغیرہ بھر کر لے جاؤ اور لے آؤ —— اور اب تو خدائے قدیر نے فضائے سماوی کو بھی انسان کیلئے مسخر کر دیا ہے۔ بڑے بڑے ہوائی جہاز فضا میں اڑتے پھرتے ہیں اور شہر شہر، ملک ملک پہنچ رہے ہیں تاکہ انسان خدا کے فضل کو حاصل کرے اور خدا کی مہربانیوں سے بہرہ ور ہو —— پروردگار عالم بلاشبہ انسان کے حال پر نہایت مہربان ہیں۔ وہ طرح طرح سے اس کی ضروریات کی کفالت فرماتے ہیں تاکہ انسان خدا کا شکر بجالائے، اور کسی اور کی چوکھٹ پر جبّہ سائی نہ کرے۔

دوسری دلیل:—— برہانِ وجدان —— انسان کی فطرت ایک خدا کے سوا کسی رب کو نہیں جانتی، اس کے دل کی گہرائیوں میں یہ شعور موجود ہے کہ نفع ونقصان کا مالک بس ایک اللہ ہی ہے۔ چنانچہ بے بسی کی حالت میں وہ اسی کو

(۱) تَبِيْعٌ: پیچھا کرنے والا، دعوے دار تبعٌ سے بروزن فعیل بمعنی فاعل چونکہ مدعی دعوی کے درپے ہوتا ہے اس لئے مجازاً مدعی کے معنی ہیں (۲) مِمَّنْ خَلَقْنَا میں عائد محذوف ہے اور مِنْ جارہ محذوف سے متعلق ہو کر کثیر کی صفت ہے (۳) تَفْضِيْلًا مفعول مطلق ہے فَضَّلْنَاهُمْ کا۔

پکارتا ہے ارشاد ہے ـــــ اور جب تم کو سمندر میں کوئی تکلیف پہنچتی ہے ـــــ تیز وتند ہوا کے جھونکے چلتے ہیں، اور ہر طرف سے موجیں اٹھتی ہیں ـــــ تو بجز اللہ کے جن کو تم پکارتے ہو سب غائب ہو جاتے ہیں ـــــ اس وقت تم صرف ایک اللہ سے التجا کرنے لگتے ہو یہ اس بات کی دلیل ہے کہ وہی تمہارا دستگیر ہے اور آڑے وقت میں وہی تمہاری مدد کر سکتا ہے ـــــ پھر جب وہ تم کو خشکی کی طرف بچالاتا ہے تو تم رخ پھیر لیتے ہو ـــــ مصیبت سے نکلتے ہی فطرت کی آواز کو بھول جاتے ہو۔ جونہی کشتی بھنور سے نکلتی ہے اور ساحل مراد سے لگتی ہے پھر وہی تمہاری غفلتیں ہوتی ہیں اور وہی تمہاری سرکشیاں! ـــــ اور انسان بڑا ہی ناشکرا ہے ـــــ اس سے بڑھ کر کیا ناشکری ہو سکتی ہے کہ دریا کی موجوں میں جو خدا یاد آیا تھا، کنارہ پر قدم رکھتے ہی اس کو فراموش کر دیا ـــــ کیا تم اس بات سے مطمئن ہو گئے کہ وہ خشکی کے کسی حصہ میں تم کو دھنسا دیں ـــــ قارون کا انجام تمہیں معلوم ہے اس کو زمین ہی میں دھنسایا گیا؟! ـــــ یا تم پر پتھراؤ کرنے والی آندھی بھیج دیں ـــــ جس طرح عاد کو تیز وتند ہوا کے ذریعہ ہلاک کیا تھا ـــــ پھر تم اپنے لئے کوئی کارساز نہ پاؤ ـــــ جو تمہیں زمین میں دھنسنے سے اور پتھروں کے مینہ سے بچالے ـــــ یا تم اس بات سے مطمئن ہو گئے کہ وہ تمہیں دوبارہ سمندر میں لے جائیں ـــــ یعنی کوئی ایسی ضرورت پیش آجائے کہ دوبارہ سمندر میں سفر ناگزیر ہو جائے ـــــ پھر تم پر ہوا کے جھکڑ بھیج دیں اور تم کو تمہارے کفر کے سبب سے ڈبو دیں، پھر اس سزا دینے پر تمہیں ہمارے خلاف کوئی دعوی کرنے والا نہ ملے ـــــ یعنی کون ہے جو اللہ تعالیٰ سے باز پرس کرے کہ ان نالائقوں کو ہلاک کیوں کیا؟ وہ قادر مطلق ہیں جس کو چاہیں سزا دیں، کوئی ان کے خلاف دعوی نہیں کر سکتا۔

اس وجدانی دلیل کا حاصل یہ ہے کہ جب تک اسباب سازگار رہتے ہیں انسان خدا کو بھولا رہتا ہے۔ مگر جب اسباب کا ساتھ چھوٹتا ہے تو وجدان بیدار ہوتا ہے۔ اور خدا پرستی کا جذبہ ابھرتا ہے انسان بے اختیار اللہ پاک کو پکارنے لگتا ہے اور اس کا دل گواہی دینے لگتا ہے کہ حقیقی آسرا صرف اللہ تعالیٰ کا ہے باقی سب رشتے بیکار، سب بھروسے دھوکا اور سب ہستیاں فریب ہیں ـــــ مگر یہ احساس وشعور دیر تک باقی نہیں رہتا، جہاں مصیبت ہٹی کہ دل پر غفلتوں کے پردے پڑ جاتے ہیں۔ تو کیا غافل انسان یہ گمان کرتا ہے کہ اب دوبارہ وہ کسی مصیبت میں نہیں پھنسے گا؟ اس کا یہ خیال غلط ہے اللہ تعالیٰ جب چاہیں ایک جھٹکے میں اس کا کام تمام کر سکتے ہیں۔

تیسری دلیل: ـــــ برہانِ نعمت ـــــ اللہ تعالیٰ انسان کی صرف چارہ سازی نہیں کرتے، بلکہ اس کو بے شمار نعمتوں سے نوازا ہے۔ ارشاد ہے ـــــ اور البتہ واقعہ یہ ہے کہ ہم نے بنی آدم کو عزت بخشی، اور خشکی اور تری میں اس

کے لئے سواریاں مہیا کہیں، اور نفیس چیزوں میں سے اس کو روزی دی، اور اپنی بہت سی مخلوقات پر اس کو نمایاں برتری بخشی ـــــ اس آیت میں چار نعمتوں کا بیان ہے:

پہلی نعمت: انسان کو شرف و برزگی عطا فرمائی، اور اس کو قابل احترام مخلوق بنایا انسان کی تعظیم وتکریم یہاں سے شروع ہوتی ہے کہ اس کو اللہ تعالیٰ نے زمین میں اپنا نائب اور خلیفہ بنایا، یہ انسان کے لئے سب سے بڑی عزت ہے، جس پر فرشتوں کو بھی رشک آیا تھا۔ پھر اس کو مسجود ملائکہ بنایا۔ یہ بھی اتنا بڑا شرف وامتیاز تھا کہ شیطان لعین کی آنکھ کا کانٹا بن گیا۔ پھر انسانوں میں نبوت ورسالت کا سلسلہ قائم فرمایا، ان پر اپنی کتابیں نازل فرمائیں۔ اور انہیں بہترین صورت، وافر عقل، اعلیٰ فہم اور معتدل مزاج دیا اور اس کے وجود میں کچھ ایسی قوتیں اور ظاہری اور باطنی خوبیاں جمع کردیں کہ وہ ساری کائنات پر راج کرنے لگا۔

دوسری نعمت: اللہ تعالیٰ نے انسان کے لئے سواریاں مہیا فرمائیں، تاکہ وہ بسہولت ایک جگہ سے دوسری جگہ منتقل ہوسکے۔ اگر سواریاں نہ ہوتیں تو کتنی دقّت پیش آتی۔ اللہ تعالیٰ نے اونٹ، گھوڑے اور ہاتھی جیسی طاقت ور مخلوقات اس کے لئے مسخر کردیں۔ جن پر وہ سواری کرنے لگا ورنہ کیا مجال تھی انسان کی کہ وہ ان جانوروں کو اپنے قابو میں کرتا! بے شک یہ اللہ تعالیٰ کی بڑی نعمت ہے۔ انھوں نے سمندر میں سفر کرنے کے لئے انسان کو جہاز رانی کا فن سکھایا۔ اس نے موٹر گاڑیاں اور ریلیں بنائیں، ہوا میں پرواز کے لئے ہوائی جہاز بنائے اور یہ کمزور انسان سالوں کی راہ گھنٹوں میں طے کرنے لگا یہ سب اس رب کریم کی بخشی ہوئی نعمت ہے۔

تیسری نعمت: قسم قسم کے عمدہ، حلال، طیب اور لذیذ کھانے، کپڑے لتّے رہائشی مکانات اور دنیوی آسائش کا سامان فراہم کیا۔ جانوروں میں کوئی کچا گوشت کھاتا ہے، کوئی گھاس، کوئی پھل کھاتا ہے۔ اور انسان اپنی غذا کے لئے ان سب چیزوں کے مرکبات تیار کرتا ہے اور نفاست پیدا کرکے لطف اندوز ہوتا ہے۔

چوتھی نعمت: انسان کو اشرف المخلوقات بنایا۔ اس کو فضیلتِ کلی کا سہرا پہنایا۔ جو انسان کے لئے سب سے بڑا امتیاز ہے۔

انسان کو اللہ تعالیٰ نے جو ان نعمتوں سے نوازا ہے تو اس کی شکر گزاری یہ ہے کہ وہ صرف اسی کی بندگی کرے۔ اس کو چھوڑ کر اوروں کی چوکھٹوں پر جبہ سائی نہ کرے۔

فائدہ: انسان تمام مخلوقاتِ ارضی وسماوی سے افضل ہے، اور یہ نوعی فضیلت ہے۔ اور افراد کے اعتبار سے: عام مؤمنین صالحین جیسے اولیاء کرام: عام فرشتوں سے افضل ہیں۔ اور خواص مؤمنین جیسے انبیاء خواص ملائکہ سے افضل ہیں۔ اور خواص ملائکہ جیسے جبرئیل علیہ السلام عام صالحین سے افضل ہیں۔ رہے کفار تو وہ بدترین خلائق ہیں، اور چوپایوں

سے بھی گئے گذرے ہیں۔

يَوْمَ نَدْعُوا كُلَّ أُنَاسٍ بِإِمَامِهِمْ ۚ فَمَنْ أُوتِيَ كِتَابَهُ بِيَمِينِهِ فَأُولَٰئِكَ يَقْرَءُونَ كِتَابَهُمْ وَلَا يُظْلَمُونَ فَتِيلًا ﴿٧١﴾ وَمَنْ كَانَ فِي هَٰذِهِ أَعْمَىٰ فَهُوَ فِي الْآخِرَةِ أَعْمَىٰ وَأَضَلُّ سَبِيلًا ﴿٧٢﴾

يَوْمَ	جس دن	بِيَمِينِهِ	اس کے داہنے ہاتھ میں	فِي هَٰذِهِ	اس (دنیا) میں
نَدْعُوا [۱]	بلائیں گے ہم	فَأُولَٰئِكَ	پس وہ لوگ	أَعْمَىٰ	اندھا
كُلَّ أُنَاسٍ	سب لوگوں کو	يَقْرَءُونَ	پڑھیں گے	فَهُوَ	تو وہ
بِإِمَامِهِمْ [۲]	انکے پیشواؤں کے ساتھ	كِتَابَهُمْ	اپنا نامۂ اعمال	فِي الْآخِرَةِ	آخرت میں (بھی)
فَمَنْ	پس جو شخص	وَلَا يُظْلَمُونَ	اور نہیں ظلم کئے جائیں گے وہ	أَعْمَىٰ	اندھا (ہوگا)
أُوتِيَ	دیا گیا	فَتِيلًا [۴]	تاگے کے برابر	وَأَضَلُّ	(بلکہ) زیادہ گم کردۂ
كِتَابَهُ [۳]	اس کا نامۂ اعمال	وَمَنْ كَانَ	اور جو شخص تھا	سَبِيلًا	راہ

دلائل توحید کے بعد ان آیات میں آخرت کا بیان ہے۔ اس کے بعد رسالت کا بیان آئے گا۔ اور آخرت کا بیان مقدم اس لئے کیا ہے کہ یہ مسئلہ مختصر ہے اور مسئلہ رسالت کے متعلقات ہیں، جن کا بیان دور تک چلے گا۔ نیز اس مسئلہ کا تعلق پچھلی پانچ آیتوں سے بھی ہے۔ حضرت عکرمہ رحمہ اللہ بیان کرتے ہیں کہ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما کے پاس یمن کے کچھ لوگ آئے۔ ان میں سے ایک نے حضرت ابن عباسؓ پر چوٹ کی۔ اور یہ آیت پڑھی ﴿مَنْ كَانَ فِي هَٰذِهِ أَعْمَىٰ فَهُوَ فِي الْآخِرَةِ أَعْمَىٰ﴾ یعنی جو دنیا میں اندھا ہے وہ آخرت میں بھی اندھا ہوگا۔ ابن عباسؓ آخر زمانہ

(۱) نَدْعُوْا فعل مضارع صیغہ جمع متکلم ہے اور واو جمع کا نہیں بلکہ لام کلمہ ہے از دَعَا يَدْعُوْا دُعَاءً: بلانا مگر قرآنی رسم الخط میں جو واو جمع کے واو کے مشابہ ہوتا ہے اس کے بعد الف لکھا جاتا ہے (۲) إمام: پیشوا، مقتداء، راہ نما فِعَالٌ کے وزن پر اسم ہے اور اس کے اصل معنی ہیں: مَنْ يُؤْتَمُّ بِهٖ یعنی وہ جس کا قصد کیا جائے، چونکہ مقتدا اور راہ نما کا قصد کیا جاتا ہے اس لئے اس کو امام کہتے ہیں الغرض جس کی پیروی کی جائے وہ امام ہے خواہ حق میں پیروی کی جائے یا باطل میں اور خواہ وہ انسان ہو یا غیر انسان۔ روح المعانی میں ہے والإمامُ: المُقْتدىٰ به والْمُتَّبَعُ، عاقلا كان أو غيره — مذکورہ مؤنث کے لئے یکساں ہے اور جمع کے موقع پر بلفظ مفرد بھی مستعمل ہے حضرت شاہ عبدالقادر صاحب دہلوی رحمہ اللہ نے جمع کا ترجمہ کیا ہے (۳) كِتَابَهٗ مفعول ثانی ہے أُوْتِيَ کا (۴) کھجور کی گٹھلی کے شگاف میں جو ڈورا ہوتا ہے اس کو فَتِيْل کہتے ہیں اور باریک تاگے کو بھی جو دو انگلیوں میں پکڑ کر بٹا جا سکے فتیل کہتے ہیں اور محاورہ میں نہایت حقیر اور معمولی چیز کے معنی ہیں ۱۲

میں نابینا ہو گئے تھے۔ابن عباسؓ نے فرمایا: تم آیت کا مطلب نہیں سمجھے یعنی آیت میں ظاہری اندھا ہونا مراد نہیں اور فرمایا﴿رَبُّكُمُ الَّذِيْ يُزْجِيْ لَكُمُ الْفُلْكَ فِي الْبَحْرِ﴾ سے ﴿تَفْضِيْلاً﴾ تک پڑھو، پھر فرمایا: ''ان آیتوں میں جو نعمتیں بیان کی گئی ہیں اور جن قدرتی نشانیوں کا تذکرہ ہے: جو شخص ان سے سبق نہیں لیتا اور اندھا رہتا ہے وہ آخرت کو نہیں سمجھ سکتا، نہ وہ اس سے فائدہ اٹھا سکتا ہے (درمنثور ۴: ۱۹۴)

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما کے اس ارشاد سے معلوم ہوا کہ ان آیتوں کا ربط گذشتہ پانچ آیتوں سے ہے یعنی جو لوگ اس دنیا میں دل کی آنکھیں کھولتے ہیں اور ہوش کے کانوں سے بات سنتے ہیں وہی توحید کو تسلیم کرتے ہیں اور شرک سے بچتے ہیں اور جو دنیا میں اندھے بنے رہتے ہیں اور کان بہرے کر لیتے ہیں وہ نہ توحید کے قائل ہوتے ہیں، نہ وہ آخرت کی تیاری کرتے ہیں۔اس لئے وہ آخرت میں اندھے ہونگے۔ارشاد ہے —— اس دن کو یاد کرو جب ہم تمام انسانوں کو ان کے پیشواؤں کے ساتھ بلائیں گے —— قیامت کے دن ہر فرقہ اس کے سردار کے ساتھ بلایا جائے گا۔کہا جائے گا: اے امت نوح اپنے نبی کے ساتھ آجاؤ، اے امت ابراہیم اپنے پیغمبر کے ساتھ آجاؤ، اسی طرح پکارا جائے گا: اے شیطان کے بچاریو! اپنے راہ نما شیطان کے ساتھ آجاؤ، اے بتوں کے بچاریو! اپنے اپنے معبودوں کے ساتھ آجاؤ، پھر جب سب لوگ اپنے رب کے سامنے کھڑے ہو جائیں گے تو نامۂ اعمال اڑائے جائیں گے —— پھر جن لوگوں کو نامۂ اعمال ان کے داہنے ہاتھ میں دیا جائے گا وہ اپنا نامۂ اعمال پڑھیں گے —— یعنی وہ خوشی سے پھولے نہ سمائیں گے، خود بھی اپنا نامۂ اعمال پڑھیں گے اور دوسروں سے بھی پڑھوائیں گے —— اور ان پر ذرہ برابر ظلم نہ کیا جائے گا —— یعنی ہر ایک کو اس کی محنت کا پورا پورا بدلہ دیا جائے گا بلکہ پورے سے بھی زیادہ دیا جائے گا کیونکہ نیک عمل کا بدلہ اگر عمل سے کم دیا جائے تو یہ ظلم ہے اور ظلم کا بارگاہ خداوندی میں گذر نہیں لیکن اگر زیادہ ثواب دیا جائے تو یہ فضل ہے اور اللہ تعالیٰ بے پایاں فضل والے ہیں —— اور جو شخص اس دنیا میں اندھا ہے —— ہدایت کی راہ اس کو نظر نہیں آتی اور اللہ تعالیٰ کی نشانیوں سے اس نے آنکھیں موند لی ہیں تو —— وہ آخرت میں بھی اندھا ہوگا —— وہ ابتدائے حشر میں بالکل اندھا اٹھایا جائے گا اس وقت وہ کہے گا کہ میرے رب آپ نے مجھے اندھا کیوں اٹھایا میں تو دنیا میں آنکھوں والا تھا؟ جواب ملے گا: یونہی تیرے پاس ہماری نشانیاں پہنچی تھیں مگر تو انہیں بھولے رہا۔لہٰذا آج تیرا کچھ خیال نہ کیا جائے گا (طٰہٰ ۱۲۵و۱۲۶) —— پھر وہ بینا کر دیا جائے گا اور اس کی نگاہ بہت زیادہ تیز ہو جائے گی (ق ۲۲) —— مگر وہ دل کا اب بھی اندھا ہی رہے گا جیسا کہ دنیا میں تھا —— بلکہ اور بھی گم کردۂ راہ ہوگا —— کیونکہ دنیا میں گمراہوں کے لئے سنبھلنے کا موقع ہے مگر آخرت میں کف افسوس ملنے کے علاوہ کوئی چارہ نہیں۔

وَاِنْ كَادُوْا لَيَفْتِنُوْنَكَ عَنِ الَّذِيْٓ اَوْحَيْنَآ اِلَيْكَ لِتَفْتَرِيَ عَلَيْنَا غَيْرَهٗ ۖ وَاِذًا لَّاتَّخَذُوْكَ خَلِيْلًا ﴿۷۳﴾ وَلَوْلَآ اَنْ ثَبَّتْنٰكَ لَقَدْ كِدْتَّ تَرْكَنُ اِلَيْهِمْ شَيْئًا قَلِيْلًا ﴿۷۴﴾ اِذًا لَّاَذَقْنٰكَ ضِعْفَ الْحَيٰوةِ وَضِعْفَ الْمَمَاتِ ثُمَّ لَا تَجِدُ لَكَ عَلَيْنَا نَصِيْرًا ﴿۷۵﴾ وَاِنْ كَادُوْا لَيَسْتَفِزُّوْنَكَ مِنَ الْاَرْضِ لِيُخْرِجُوْكَ مِنْهَا وَاِذًا لَّا يَلْبَثُوْنَ خِلٰفَكَ اِلَّا قَلِيْلًا ﴿۷۶﴾ سُنَّةَ مَنْ قَدْ اَرْسَلْنَا قَبْلَكَ مِنْ رُّسُلِنَا وَلَا تَجِدُ لِسُنَّتِنَا تَحْوِيْلًا ﴿۷۷﴾

وَاِنْ (۱)	اور بیشک	عَلَيْنَا	ہماری طرف	كِدْتَّ	قریب تھے آپ
كَادُوْا (۲)	قریب تھے وہ	غَيْرَهٗ	اُس وحی کے سوا	تَرْكَنُ	(کہ) جھک جاتے
لَيَفْتِنُوْنَكَ (۳)	کہ بچلادیں (پھیر	وَاِذًا	اور تب تو	اِلَيْهِمْ	ان کی طرف
	دیں) آپ کو	لَّاتَّخَذُوْكَ	ضرور بنالیتے وہ آپ کو	شَيْئًا قَلِيْلًا	کچھ کچھ
عَنِ الَّذِيْٓ	اس چیز سے	خَلِيْلًا	ولی دوست	اِذًا	تب تو
اَوْحَيْنَآ	جو وحی کی ہم نے	وَلَوْلَآ (۵)	اور اگر نہ ہوتی	لَّاَذَقْنٰكَ	ضرور چکھاتے ہم آپکو
اِلَيْكَ	آپ کی طرف	اَنْ	یہ بات کہ	ضِعْفَ الْحَيٰوةِ (۶)	زندگی میں دوہرا عذاب
لِتَفْتَرِيَ (۴)	تا کہ غلط بات منسوب	ثَبَّتْنٰكَ	ثابت قدم رکھا ہم نے آپکو	وَضِعْفَ	اور دوہرا عذاب
	کریں آپ	لَقَدْ	تو یقیناً	الْمَمَاتِ	موت (کے بعد)

(۱) اِنْ مخففه من المثقلہ ہے اصل میں اِنَّ تھا اس کا اسم ضمیر شان ہے اور فعل مضارع پر آنے والا لام لام فارقہ ہے جو نافیہ اور مخففہ کے درمیان امتیاز کے لئے آتا ہے (۲) كَادَ افعال مقاربہ میں سے ہے اور فعل مضارع پر داخل ہوتا ہے اگر یہ کلام مثبت میں ہو تو فعل کی نفی کرتا ہے یعنی یہ بتلاتا ہے کہ بعد میں آنے والا فعل واقع نہیں ہوا البتہ قرب الوقوع تھا جیسے: كَادَ يَزِيْغُ قُلُوْبُهُمْ اور كَادَ اَنْ يَزِلَّ اور اگر یہ کلام منفی میں ہو تو فعل کا اثبات کرتا ہے یعنی یہ بتلاتا ہے کہ بعد میں آنے والا فعل واقع ہوا، اگر چہ وقوع کی امید نہ تھی جیسے وَمَا كَادُوْا يَفْعَلُوْنَ اور لَمْ يَكَدْ اَنْ يَزِلَّ (۳) فَتَنَ (ض) فِتْنَةً: گمراہ کرنا، آزمائش میں ڈالنا ۱۲ (۴) اِفْتَرٰى اِفْتِرَاءً ا: جھوٹ باندھنا (۵) لَوْلَآ امتناعیہ ہے جو لو شرطیہ اور لا نافیہ سے مرکب ہے اور اَنْ مصدریہ ہے ثَبَّتْنَاكَ بتاویل مصدر ہو کر مبتدا ہے اور خبر موجودٌ محذوف ہے اور لَقَد كدت إلخ لولا کا جواب ہے والمعنى ولولا تَثْبِيْتُنَا اِيَّاكَ موجودٌ لَقَارَبْتَ الرُّكُوْنَ اِلَيْهِمْ (جمل) یعنی ہمارے جمانے کی وجہ سے آپ ان کی طرف جھکاؤ کے قریب بھی نہیں ہوئے۔ اور شَيْئًا قَلِيْلًا مفعول مطلق ہے تركن کا من غير لفظه (۶) مضاف پوشیدہ ہے اور اضافت بتقدیر فی ہے أی ضعفُ عذاب فی الحياة.

ثُمَّ لَا تَجِدُ	پھر نہ پاتے آپ	لِيُخْرِجُوكَ	تا کہ نکال دیں وہ آپ کو	مَنْ	(ان کا) جن کو
لَكَ	اپنے لئے	مِنْهَا	سرزمین (مکہ) سے	قَدْ أَرْسَلْنَا	بھیجا ہم نے
عَلَيْنَا	ہمارے مقابل	وَإِذًا	اور تب تو	قَبْلَكَ	آپ سے پہلے
نَصِيرًا	کوئی مددگار	لَا يَلْبَثُونَ	نہ ٹھہرنے پاتے وہ	مِنْ رُسُلِنَا	ہمارے رسولوں میں سے
وَإِنْ كَادُوا	اور بیشک قریب تھے وہ	خِلَافَكَ	آپ کے بعد	وَلَا تَجِدُ	اور نہیں پائیں گے آپ
لَيَسْتَفِزُّونَكَ(۱)	کہ اکھاڑ دیں آپ کو	إِلَّا قَلِيلًا	مگر تھوڑا	لِسُنَّتِنَا	ہمارے طریقہ کو
مِنَ الْأَرْضِ	زمین سے	سُنَّةَ(۲)	(جیسے) طریقہ	تَحْوِيلًا	بدلتا ہوا

اب رسالت کا بیان شروع ہوتا ہے۔ اور تین باتیں بیان کی جاتی ہیں:

پہلی بات: کفار پلان بنا رہے ہیں کہ آپؐ کو اللہ کی وحی سے ہٹادیں ــــــ اور کفار بلاشبہ تُلے ہوئے ہیں کہ آپؐ کو اس وحی سے ہٹادیں، جو ہم نے آپؐ کی طرف بھیجی ہے، تا کہ آپؐ ہمارے نام کوئی اور بات گھڑ دیں۔ اور ایسا کرنے کی صورت میں وہ آپؐ کو دلی دوست بنالیں گے ــــــ روایات میں اس سلسلہ کے متعدد واقعات آئے ہیں۔

پہلا واقعہ: قبیلۂ ثقیف خدمت نبوی میں آیا اور کہنے لگا کہ ہم مسلمان ہونا چاہتے ہیں مگر ہمیں چند امتیازات چاہئیں تا کہ ہم عربوں پر فخر کرسکیں۔ انھوں نے چار امتیازات مانگے: (۱) مسلمان ہوکر ہم نماز نہیں پڑھیں گے۔ (۲) ہمارے وَج نامی میدان کو حرم مکہ کی طرح محترم قرار دیا جائے (۳) ہمارا جو سود دوسروں پر نکلتا ہے وہ باقی رکھا جائے اور دوسروں کا جو ہم پر نکلتا ہے اسے ختم کردیا جائے (۴) اور ہم اپنے سب بتوں کو خود توڑیں گے مگر لات نامی بت کو ایک سال تک باقی رہنے دیا جائے ــــــ اور انھوں نے یہ بھی کہا کہ اگر عرب ہمارے امتیازات پر حرف گیری کریں تو آپ ان سے کہہ دیں کہ مجھے میرے رب نے یہ احکام دیئے ہیں۔

دوسرا واقعہ: قریش کے چند سرغنے جیسے امیہ بن خلف اور ابوجہل وغیرہ بارگاہِ نبوت میں حاضر ہوئے اور باہمی اختلاف کی خلیج کو پاٹنے کے لئے ایک فارمولہ پیش کیا کہ آیئے آپ ہمارے بتوں کی تھوڑی عبادت کرلیجئے ہم مسلمان ہوجاتے ہیں۔

تیسرا واقعہ: کفار مکہ آنحضرت ﷺ سے کہتے ہیں کہ آپ قرآن میں سے صرف وہ حصہ نکال دیجئے جو شرک اور بت پرستی کی برائی میں ہے ہم آپ کا دین قبول کرلیتے ہیں۔

(۱) دیکھئے آیت ۶۴ (۲) منصوب بنزع خافض ہے أی کسنةً مَنْ إلخ اور مابعد کی طرف مضاف ہے ۱۲

ان واقعات کی روشنی میں آیت کریمہ کے اشاروں کو بخوبی سمجھا جا سکتا ہے۔ ارشاد یہ فرمایا گیا ہے کہ یہ کفار تُلے بیٹھے ہیں، طرح طرح کی پلان بنارہے ہیں۔ اور آپ ﷺ پر زور ڈال رہے ہیں کہ آپؐ مصالحت کر لیں، اور وہ راہ اپنا لیں جو اللہ کی بتلائی ہوئی نہیں ہے۔ بالفرض آپؐ ایسا کریں تو وہ آپؐ کے جگری دوست بن جائیں گے، مگر وہ دوستی کس کام کی جو برحق نہ ہو!

دوسری بات: کفار کی چالوں کی سنگینی: —— اور اگر ہم آپؐ کو نہ جماتے تو آپؐ کچھ کچھ ان کی طرف جھکنے کو ہو جاتے —— یعنی ان کی چالیں ایسی خطرناک تھیں، اور ان کا گھیرا ایسا مضبوط تھا کہ اگر آپؐ معصوم نہ ہوتے تو کچھ کچھ آپؐ کا ان کی طرف میلان ہو جاتا —— یعنی پوری طرح ہمنوائی کا تو سوال ہی نہیں، البتہ کچھ میلان کا امکان تھا۔ مگر اللہ کی حفاظت کی وجہ سے آپؐ بال بال بچ گئے، اور ان کی طرف ادنی میلان بھی نہ ہوا —— مگر اس سے کفار کی چالوں کی سنگینی واضح ہوگئی۔ وہ بے حد خطرناک چالیں چلتے تھے۔ ایسا وار کرتے تھے کہ کوئی بچ ہی نہ سکے۔ مگر اللہ کی مدد اور توفیق نے آپ ﷺ کو اپنے موقف پر جمائے رکھا — اس کے بعد کفار کو مایوس کرنے کے لئے ارشاد ہے: ——

اور اس صورت میں ہم آپؐ کو دنیا میں بھی دُوہرے عذاب کا مزہ چکھاتے، اور موت کے بعد بھی، پھر آپؐ ہمارے مقابلہ میں کوئی مددگار نہ پاتے —— یہ بات نبی کو مخاطب بنا کر دوسروں کو سنائی گئی ہے یعنی جو تمہاری موافقت کرے گا وہ دارین میں دردناک سزا پائے گا۔ پس ہمارے نبی سے تم ایسی آس کیوں لگائے بیٹھے ہو۔

تیسری بات: مخالفین کو وارننگ: —— اور بلاشبہ کفار تُلے ہوئے ہیں کہ سرزمین مکہ سے آپؐ کے پیر اکھاڑ دیں، تاکہ وہ آپؐ کو یہاں سے باہر نکال دیں —— یعنی آپؐ اور مسلمان ان کی ایذا رسانیوں اور چالوں سے تنگ آ کر مکہ چھوڑ دیں —— اور اس صورت میں وہ خود بھی آپ کے بعد یہاں زیادہ دیر نہ ٹھہر سکیں گے —— یعنی یاد رکھیں اگر انھوں نے نبی کو شہر چھوڑنے پر مجبور کیا اور وہ یہاں سے نکل گئے تو مشرکین بھی زیادہ دنوں تک یہاں پنپ نہ سکیں گے —— یہی سنت الٰہی ہے ان لوگوں کے حق میں جن کو ہم نے آپ سے پہلے رسول بنا کر بھیجا ہے —— یعنی اللہ تعالیٰ کا ہمیشہ سے یہی دستور رہا ہے، پچھلی امتوں کے ساتھ اور ان کے انبیا کے ساتھ۔ جب بھی کسی بستی والوں نے پیغمبر خدا کو ستایا ہے اور اس کو شہر بدر کیا ہے تو بستی والے خود بھی اس بستی میں پنپ نہیں سکے۔ وہ عذاب الٰہی سے تباہ ہوئے —— اور آپ ہماری سنت میں کوئی تبدیلی نہیں پائیں گے —— یعنی اللہ تعالیٰ کا تمام قوموں کے ساتھ معاملہ یکساں ہے پس اگر مکہ والے آپ کو وطن چھوڑنے پر مجبور کریں گے تو بعد میں ان کا حشر بھی اچھا نہیں ہوگا۔

چنانچہ ایسا ہی ہوا: کفار مکہ کا ظلم وستم آنحضرت ﷺ کی اور مسلمانوں کی ہجرت کا سبب بنا آپؐ کا مکہ مکرمہ سے

نکلنا تھا کہ تقریباً ڈیڑھ سال بعد مکہ کے بڑے بڑے نامور سردار گھروں سے نکل کر بدر کے میدان میں نہایت ذلت کے ساتھ ہلاک ہوئے اور اس کے پانچ چھ سال بعد مکہ پر اسلام کا جھنڈا لہرانے لگا اور کفار کی حکومت وشوکت ختم ہوگئی۔

اَقِمِ الصَّلٰوةَ لِدُلُوۡكِ الشَّمۡسِ اِلٰی غَسَقِ الَّیۡلِ وَقُرۡاٰنَ الۡفَجۡرِ ؕ اِنَّ قُرۡاٰنَ الۡفَجۡرِ كَانَ مَشۡهُوۡدًا ﴿۷۸﴾ وَمِنَ الَّیۡلِ فَتَهَجَّدۡ بِهٖ نَافِلَةً لَّكَ ۖ عَسٰۤی اَنۡ یَّبۡعَثَكَ رَبُّكَ مَقَامًا مَّحۡمُوۡدًا ﴿۷۹﴾ وَقُلۡ رَّبِّ اَدۡخِلۡنِیۡ مُدۡخَلَ صِدۡقٍ وَّاَخۡرِجۡنِیۡ مُخۡرَجَ صِدۡقٍ وَّاجۡعَلۡ لِّیۡ مِنۡ لَّدُنۡكَ سُلۡطٰنًا نَّصِیۡرًا ﴿۸۰﴾ وَقُلۡ جَآءَ الۡحَقُّ وَزَهَقَ الۡبَاطِلُ ؕ اِنَّ الۡبَاطِلَ كَانَ زَهُوۡقًا ﴿۸۱﴾ وَنُنَزِّلُ مِنَ الۡقُرۡاٰنِ مَا هُوَ شِفَآءٌ وَّرَحۡمَةٌ لِّلۡمُؤۡمِنِیۡنَ ۙ وَلَا یَزِیۡدُ الظّٰلِمِیۡنَ اِلَّا خَسَارًا ﴿۸۲﴾

اَقِمِ (۱)	پورا اہتمام کر	الَّیۡلِ	رات کا	مَشۡهُوۡدًا (۵)	حاضری کا وقت
الصَّلٰوةَ	نماز کا	وَقُرۡاٰنَ الۡفَجۡرِ (۴)	اور صبح کے پڑھنے کا	وَمِنَ الَّیۡلِ (۶)	اور رات میں
لِدُلُوۡكِ (۲)	ڈھلنے سے	اِنَّ	بے شک	فَتَهَجَّدۡ (۷)	پس تہجد پڑھ
الشَّمۡسِ	سورج کے	قُرۡاٰنَ الۡفَجۡرِ	صبح کا پڑھنا	بِهٖ	قرآن کے ذریعہ
اِلٰی غَسَقِ (۳)	اندھیرا چھانے تک	كَانَ	ہے وہ	نَافِلَةً (۸)	مزید

(۱)اَقِمْ (امر) راست کر، سیدھا کر از اِقَامَةٌ (۲)دَلَكَ (ن) دُلُوۡكًا الشمسُ: سورج کا ڈھلنا اور سورج کا ڈوبنے کے قریب ہونا، حضرت ابن عباس اور حضرت ابن عمر، حضرت جابر رضی اللہ عنہم نے پہلے معنی کئے ہیں اور حضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہ نے دوسرے، اور لفظ دونوں معنی کو جامع ہے کیونکہ مادہ کے اصل معنی ہیں ایک حالت سے دوسری حالت کی طرف منتقل ہونا اور یہ بات زوال میں بھی پائی جاتی ہے اور غروب کے وقت بھی مگر زوال کے معنی زیادہ بہتر ہیں کیونکہ اس کے قائلین زیادہ ہیں — لدلوك اور إلى غسق الليل، أقم سے متعلق ہیں (۳)غَسَقَ (ن) غَسْقًا وَغَسَقًا الليلُ: رات کا تاریک ہونا الغاسق (اسم فاعل) رات جبکہ تاریکی بڑھ جائے (۴)قُرْآنَ الْفَجْرِ کا عطف أقم کے مفعول بہ الصلوٰة پر ہے — قرآن مصدر ہے جس کے معنی ہیں پڑھنا اور اللہ کی کتاب کو قرآن قرأت وتلاوت کی وجہ سے کہا جاتا ہے کیونکہ قرآن عموماً جہر کے ساتھ نماز میں، دینی محافل میں، مدارس میں اور دیگر تقریبات میں پڑھا جاتا ہے (۵)مَشْهُوْد (اسم مفعول) حاضر کیا ہوا۔ چونکہ نماز فجر کی قراءت میں رات اور دن کے ملائکہ حاضر ہوتے ہیں اس لئے اس کو مشہود کہا گیا ہے۔ قیامت کا دن بھی مشہود ہے (ہود آیت ۱۰۳) کیونکہ اس دن سب لوگ اللہ کے روبرو حاضر کئے جائیں گے اسی طرح عرفہ کا دن بھی مشہود ہے (بروج آیت ۳) کیونکہ اس دن سب لوگ میدان عرفہ میں حاضر ہوتے ہیں (۶)من الليل فعل محذوف سے متعلق ہے أی قُمْ قومةً من الليل يا اِسهَرْ من الليل — اور ←

لَكَ	اور آپ کے لئے	مُخْرَجَ (۲)	نکالنا	الْبَاطِلَ	باطل
عَسٰی	ہوسکتا ہے	صِدْقٍ	سچا (بہترین)	كَانَ	ہے (وہ)
اَنْ	کہ	وَاجْعَلْ (۳)	اور بنائیے آپ	زَهُوْقًا	تباہ شدہ
يَّبْعَثَكَ	اٹھائیں آپ کو	لِّيْ	میرے لئے	وَنُنَزِّلُ	اور بتدریج اتارتے ہیں ہم
رَبُّكَ	آپ کے رب	مِنْ لَّدُنْكَ	اپنے پاس سے	مِنَ الْقُرْاٰنِ (۵)	قرآن سے
مَقَامًا (۱)	مقام	سُلْطٰنًا	غلبہ	مَا هُوَ	جو (کہ) وہ
مَّحْمُوْدًا	ستودہ میں	نَّصِيْرًا (۴)	مدد کیا ہوا	شِفَآءٌ	شفا
وَقُلْ	اور کہئے	وَقُلْ	اور کہئے	وَّرَحْمَةٌ	اور مہربانی (ہے)
رَّبِّ	(اے) میرے پروردگار!	جَآءَ	آ گیا	لِّلْمُؤْمِنِيْنَ	ایمان والوں کے لئے
اَدْخِلْنِيْ	داخل کیجئے آپ مجھے	الْحَقُّ	حق	وَلَا يَزِيْدُ	اور نہیں بڑھاتا قرآن
مُدْخَلَ (۲)	داخل کرنا	وَزَهَقَ (۴)	اور گیا	الظّٰلِمِيْنَ	ناانصافوں کے لئے
صِدْقٍ	سچا (بہترین)	الْبَاطِلُ	باطل	اِلَّا	مگر
وَّاَخْرِجْنِيْ	اور نکالیے آپ مجھے	اِنَّ	بے شک	خَسَارًا	کھاٹا (نقصان)

مکہ مکرمہ میں سرزمین باوجود اپنی پہنائی کے اہل حق کے لئے تنگ ہوتی جارہی تھی، مخالفین طرح طرح کی ریشہ

← تَهَجَّدْ کا قُمْ محذوف پر عطف ہے — اور بِهٖ کی ضمیر مضاف الیہ کے بغیر صرف قرآن کی طرف راجع ہے اور جار مجرور تَهَجَّدْ سے متعلق ہیں۔(۷) تَهَجَّدْ (فعل امر) از باب تفعُّل، یہ فعل اضداد میں سے ہے هَجَدَ (ن) هُجُوْدًا: رات میں سونا اور بیدار ہونا — شریعت کی اصطلاح میں تہجد کے معنی ہیں رات کو سونے کے بعد اٹھ کر نفلیں پڑھنا (۸) نَافِلَةً مصدر ہے جیسے عَافِيَةً قَاقِبَةً وغیرہ فرائض وواجبات سے زائد کام نفل اور نافلہ کہلاتے ہیں — نافلةً لك فعل محذوف کا مفعول مطلق ہے اور اس فعل کا حذف واجب ہے

(۱) مَقَامًا مَحْمُوْدًا مفعول فیہ ہے (۲) مُدْخَلْ اور مُخْرَجْ (میم کے پیش کے ساتھ) باب افعال کے مصادر ہیں اَدْخَلَهٗ اِدْخَالاً وَمُدْخَلاً: داخل کرنا اَخْرَجَ اِخْرَاجًا وَمُخْرَجًا: نکالنا (۳) اِجْعَلْ کا مفعول اول سُلْطَانًا نَصِيْرًا ہے اور مفعول ثانی لِيْ ہے اور مِنْ لَدُنْكَ محذوف سے متعلق ہوکر سُلْطَان کی صفت ہے أي سلطانا كائنا من عندك (۴) نَصِيْرًا فَعِيل کا وزن بمعنی مفعول ہے أي منصوراً به (۴) زَهَقَ (ف) زُهُوْقًا الباطلُ: نیست ونابود ہونا، کمزور ہونا۔ زَهَقَ الشيءُ: تباہ ہونا، ہلاک ہونا۔ زَهَقَتِ الرُّوْح: روح کا جسم سے نکلنا (۵) مِنَ الْقُرْآن میں مِنْ بیانیہ ہے ۱۲

دوانیاں اور سازشیں کر رہے تھے اور ہر ممکن طریقہ سے مسلمانوں کے پیر اکھاڑنے کی کوشش کر رہے تھے، ان جانگداز حالات میں مسلمانوں میں صبر و ہمت پیدا کرنے کے لئے درج ذیل پانچ احکامات دیئے گئے:

① ۔ مسلمان پانچ فرض نمازوں کا اہتمام کریں اور بطور خاص فجر کی نماز کا اور اس میں طویل قراءت کا اہتمام کریں۔

② ــــ تہجد کی نماز کا اہتمام کریں اور اس میں زیادہ سے زیادہ قرآن کریم کی تلاوت کریں۔

③ ــــ دعا کا بطور خاص اہتمام کریں ــــ اور دعا کے کے جو الفاظ تلقین فرمائے گئے ہیں، ان میں اشارہ ہے کہ اب مکہ چھوڑنے کا وقت قریب آ گیا ہے مگر یہ مفارقت عارضی ہوگی۔

④ ــــ اللہ کی ذات سے پر امید رہا جائے اور بانگ دُہل اعلان کیا جائے کہ غلبہ بہر حال حق کا ہوگا اور باطل دم توڑ دے گا۔

⑤ ــــ قرآن کریم سے زیادہ سے زیادہ تعلق استوار کیا جائے کیونکہ وہ ظاہری اور باطنی پریشانیوں کا علاج بھی ہے اور نزول رحمت کا سبب بھی۔

آیتوں کا خلاصہ پڑھنے کے بعد اب تفصیل سے پانچوں احکام پڑھئے۔

پہلا حکم: ــــــ نماز کا اہتمام کیجئے، زوال آفتاب سے لے کر رات کا اندھیرا چھانے تک اور فجر کی قراءت کا بھی۔ بیشک فجر کی قراءت حاضری کا وقت ہے ــــــ یعنی مسلمان کفار کی منصوبہ بندیوں کی کچھ فکر نہ کریں، اپنے مالک کی طرف متوجہ رہیں۔ پانچ فرض نمازوں کو ٹھیک ٹھیک قائم کریں اور خاص طور پر فجر کی نماز میں خوب دل لگا کر قرآن کریم کی تلاوت کریں اور جان لیں کہ تعلق مع اللہ ہی وہ چیز ہے جو انسان کو تمام مشکلات سے نجات دلاتی ہے۔

آیت کو اچھی طرح سمجھنے کے لئے درج ذیل باتیں یاد رکھیں:

پہلی بات: اس آیت میں اقامتِ صلوٰۃ یعنی نماز کے اہتمام کا حکم دیا گیا ہے اور کسی چیز کی اقامت کے معنی ہیں: اس کو درست رکھنا، قائم کرنا اور اس کے حقوق بجالانا۔ قرآن کریم میں جہاں بھی نماز کا حکم دیا گیا ہے إِقَامَةٌ کا لفظ استعمال کیا گیا ہے پس نماز کے تمام ارکان، شرائط، سنن و آداب کی رعایت کرنا، مکروہات سے بچنا، مسجد، جماعت اور اذان و اقامت کا نظام بنا کر اجتماعی طور پر نماز ادا کرنا یہ سبھی باتیں اس حکم میں شامل ہیں۔

دوسری بات: زوال آفتاب سے لے کر رات کا اندھیرا چھانے تک چار نمازیں ہیں (۱) ظہر: جس کا وقت زوال سے شروع ہوتا ہے (۲) عصر: جس کا وقت دوسرے یا تیسرے مثل سے شروع ہوتا ہے (۳) مغرب: جس کا وقت سورج کے ڈوبتے ہی شروع ہوتا ہے (۴) عشا: جس کا وقت رات کی تاریکی مکمل ہو جانے پر یعنی شفق غروب ہو جانے پر شروع

ہوتا ہے۔

تیسری بات: فجر کی قراءت سے مراد فجر کی نماز ہے۔ قرآن کریم میں نماز کے لئے اکثر لفظ صلوٰۃ استعمال کیا گیا ہے مگر کہیں اس کے اجزاء (ارکان) میں سے کسی جز کا نام لے کر پوری نماز مراد لی گئی ہے۔ مثلاً قیام، قراءت، رکوع، سجدہ، ذکر، تسبیح، حمد وغیرہ۔ اور جہاں جس جز سے نماز مراد لی گئی ہے وہاں اس جز کی خصوصی اہمیت ہے۔ یہاں فجر کی قراءت کہہ کر فجر کی نماز مراد لی ہے۔ فجر کے وقت صرف قرآن کریم کی تلاوت مراد نہیں بلکہ نماز میں قرآن پڑھنا مراد ہے۔

چوتھی بات: فجر کی قراءت حاضری کا وقت ہے۔ اس کی تفصیل احادیث شریفہ میں یہ آئی ہے کہ فجر اور عصر کے وقت دن اور رات کے فرشتوں کی ڈیوٹیاں بدلتی ہیں اور فجر میں چونکہ جہری قراءت ہے اس لئے آنے جانے والے فرشتے نماز فجر میں اللہ کا کلام سننے کے لئے شریک جماعت ہوتے ہیں کیونکہ ذکر اللہ ہی ان کی غذا ہے اس وجہ سے فجر کی نماز میں لمبی قراءت مطلوب ہے۔ نیز انسانوں کے لئے بھی یہ وقت سکون اور دلجمعی کا ہے۔ طبیعت خوب حاضر ہوتی ہے اور بات دل میں اترتی ہے اس وجہ سے بھی فجر کی نماز میں لمبی قراءت مسنون ہے۔

پانچویں بات: فجر کی نماز کے لئے قراءت قرآن کی تعبیر اس لئے بھی اختیار کی گئی ہے کہ قرآن کریم کی اہمیت ظاہر ہو اور نماز کے اجزاء میں سے قراءت کا مقام متعین ہو، چنانچہ قراءت ہی کو نماز کا اصلی رکن قرار دیا گیا ہے باقی ارکان حضوری دربار خداوندی کے آداب ہیں [1]

دوسرا حکم: ــــــ اور رات میں: پس قرآن سے تہجد کی نماز پڑھیے، زائد ہے آپ کے لئے۔ بعید نہیں کہ آپ کے پروردگار آپ کو مقام محمود (ستودہ مرتبے) میں فائز کردیں ــــــ یعنی رات میں اٹھ کر تہجد کی نماز پڑھیے اور اس میں قرآن کریم کی خوب تلاوت کیجئے یہ مزید نماز ہے۔ اس سے بہت بڑا مرتبہ ملتا ہے۔

اس حکم کو بھی اچھی طرح سمجھنے کے لئے درج ذیل باتیں جان لیں:

پہلی بات: نفل عبادت خواہ نماز ہو، خیرات ہو، روزہ ہو، یا حج سب مطلوب شرعی ہیں۔ نفل عبادتیں بندے کو اللہ تعالیٰ سے قریب کرتی ہیں۔ حدیث شریف میں ہے کہ: ''بندہ فرائض کے ذریعہ جس قدر میرا قرب حاصل کرتا ہے اتنا کسی اور عبادت کے ذریعہ حاصل نہیں کرتا۔ اور بندہ نوافل کے ذریعہ برابر میرا قرب حاصل کرتا رہتا ہے۔ یہاں تک کہ میں اس سے محبت کرنے لگتا ہوں۔ اگر وہ مجھ سے کچھ مانگتا ہے تو دیتا ہوں اور کوئی دعا کرتا ہے تو قبول کرتا ہوں'' (مسند احمد ۶: ۲۵۶)

---

(۱) تفصیل کے لئے حضرت مولانا محمد قاسم صاحب نانوتوی قدس سرہ کی کتاب ''توثیق الکلام فی الانصات خلف الامام'' اور اس کی میری لکھی ہوئی شرح: ''کیا مقتدی پر فاتحہ واجب ہے؟'' مطالعہ فرمائیں ۱۲

دوسری بات: عبادات میں سب سے افضل فرائض ہیں، پھر واجبات کا درجہ ہے۔ کیونکہ وہ عملاً فرض ہیں پھر سنن مؤکدہ کا درجہ ہے، ان کے بعد تہجد کی نماز ہے، آخر میں رات دن کے دوسرے نوافل کا درجہ ہے۔ حدیث میں ہے: ''فرض نمازوں کے بعد بہترین نماز رات کے بیچ کی نماز (تہجد) ہے'' (مشکوٰۃ حدیث ۱۲۳۶) اور واجب نماز اور سنن مؤکدہ فرض نمازوں کے ساتھ ملحق ہیں اس لئے ان کا مرتبہ تہجد کی نماز سے بلند ہے۔

تیسری بات: دن میں چونکہ آدمی طرح طرح کے مشاغل میں گھرا رہتا ہے اس لئے اس آیت میں رات کی تخصیص کے ساتھ نفلیں پڑھنے کا حکم دیا، ورنہ دن رات میں آدمی جس قدر نوافل پڑھ سکے بہتر ہے۔

چوتھی بات: رات کی نفلیں خاص طور پر سوکر اٹھنے کے بعد، جن کو اصطلاح میں تہجد کہا جاتا ہے، ان کی شان ہی نرالی ہے۔ وہ فائدہ میں دیگر نوافل سے بہت زیادہ بڑھی ہوئی ہیں۔ اس وجہ سے خصوصیت کے ساتھ ان کی ادائیگی کا حکم دیا۔ حدیث میں ہے: ''ہر رات پروردگار عالم پہلے آسمان پر جب رات کا آخری تہائی حصہ باقی رہتا ہے، نزول فرماتے ہیں اور ارشاد فرماتے ہیں: ہے کوئی دعا کرنے والا جس کی دعا میں قبول کروں؟ ہے کوئی مانگنے والا جس کو میں عطا کروں؟ ہے کوئی بخشش چاہنے والا جس کی میں مغفرت کروں؟'' اور مسلم شریف کی روایت میں یہ بھی ہے کہ: ''پھر اللہ تعالیٰ اپنے دونوں ہاتھ پھیلاتے ہیں اور فرماتے ہیں کہ ہے کوئی جو ایسے شخص کو قرض دے جو نہ غریب ہے نہ نادہند؟ یہاں تک کہ پو پھٹتی ہے'' (مشکوٰۃ حدیث ۱۲۲۳)

ایک اور حدیث میں ہے: ''رات میں ایک گھڑی ایسی ہے جس میں اگر کوئی مسلمان اللہ تعالیٰ سے دارین کی کوئی بھلائی مانگے تو اللہ تعالیٰ ضرور عنایت فرماتے ہیں۔ اور یہ گھڑی ہر رات میں ہے'' (مشکوٰۃ حدیث ۱۲۲۴)

نیز حدیث میں ہے: ''رات کی نماز لازم پکڑو، وہ پچھلے نیک لوگوں کا طریقہ تھا اور وہ تم کو تمہارے رب سے قریب کرنے والی چیز ہے اور گناہوں کو مٹانے والی اور برائیوں سے روکنے والی عبادت ہے'' (مشکوٰۃ حدیث ۱۲۲۷)

پانچویں بات: اور قرآن سے تہجد پڑھنے کا مطلب یہ ہے کہ تہجد کی نماز میں زیادہ سے زیادہ قرآن پڑھا جائے۔ جلدی جلدی چند رکعتیں پڑھ لینے سے تہجد کا حق ادا نہیں ہوتا بلکہ یوں کہنا چاہئے کہ تلاوتِ قرآن ہی کے لئے نماز تہجد مشروع کی گئی ہے۔ حدیث میں ہے کہ آنحضرت ﷺ تہجد کی چار رکعتوں میں سورۃ البقرہ، آل عمران، نساء اور مائدہ یا انعام پڑھتے تھے (مشکوٰۃ حدیث ۱۲۰۰) اور ایک دوسری روایت میں ہے کہ جس نے دس آیتوں سے تہجد پڑھا وہ غافلوں میں شمار نہ ہوگا اور جس نے سو آیتوں سے پڑھا وہ قانتین (فرماں برداروں) میں شمار ہوگا اور جس نے ایک ہزار آیتوں سے تہجد پڑھا وہ دولت مندوں میں شمار ہوگا (مشکوٰۃ حدیث ۱۲۰۱)

چھٹی بات: تہجد کی نماز ابتدائے اسلام میں فرض تھی۔ سورۃ المزمل کے شروع میں اس کا تذکرہ ہے۔ پھر یہ فرضیت ختم کردی گئی۔ اب صرف مستحب ہے اور اس بات پر امت کا اجماع ہے اور آنحضرت ﷺ کے بارے میں راجح قول یہ ہے کہ آپؐ پر بھی فرض نہ تھی کیونکہ آپ اگرچہ پابندی سے تہجد پڑھتے تھے مگر گاہے چھوٹ بھی جاتی تھی اور آپؐ اس کی تلافی سورج نکلنے کے بعد بارہ رکعتیں ادا فرما کر کرتے تھے۔ مسلم شریف میں ایک طویل حدیث ہے جس میں سعد بن ہشام نے حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا سے چند سوالات کئے ہیں۔ ایک سوال تہجد کے بارے میں بھی کیا ہے، حضرت عائشہؓ نے پوچھا کیا تم نے سورۃ المزمل نہیں پڑھی؟ سعد نے جواب دیا: کیوں نہیں! حضرت عائشہؓ نے فرمایا کہ اللہ تعالیٰ نے اس سورت کے شروع میں تہجد کی نماز فرض کی تھی۔ حضور اور صحابہ ایک سال تک تہجد پڑھتے رہے اُس سورت کی آخری آیتیں ایک سال تک اللہ تعالیٰ نے روکے رکھیں پھر اس سورت کے آخر میں سہولت نازل فرمائی تو تہجد کی نماز نفل رہ گئی ـــ اور آنحضرت ﷺ کا طریقہ تھا کہ جب کوئی نماز شروع کرتے تو اس کی پابندی کرتے اور جب نیند کے غلبہ کی وجہ سے یا کسی تکلیف کی وجہ سے آپ تہجد ادا نہ کرسکتے تو دن میں بارہ رکعتیں پڑھ لیتے (مسلم شریف ۶:۲۶ مصری)

ساتویں بات: مقام محمود کا لفظی ترجمہ ہے: تعریف کیا ہوا مرتبہ۔ اور آیت پاک میں آنحضرت ﷺ کے تعلق سے اس کا مطلب ہے شفاعت کبری کا مقام۔ قیامت کے دن جب اولین وآخرین میدان حشر میں اکٹھا ہوں گے اور حساب کتاب شروع نہ ہوگا تو ساری خلقت پریشان ہوگی اور چاہے گی کہ کوئی بندۂ خدا سفارش کرے کہ حساب شروع ہوجائے مگر وہ دن اس قدر ہولناک ہوگا کہ کوئی پیغمبر شفاعت کی ہمت نہ کرے گا۔ اس وقت آنحضرت ﷺ شفاعت کریں گے۔ اس وقت ہر شخص کی زبان پر آپؐ کی تعریف ہوگی۔ گویا اس روز عظمت محمدی پوری شان کے ساتھ جلوہ گر ہوگی۔

اور امت کے تعلق سے مقام محمود کا مطلب یہ ہے کہ جو مسلمان نماز تہجد کی پابندی کرے گا اس کو لوگ قدر کی نگاہ سے دیکھیں گے رات کی عبادت کے انوار دن میں چہرے پر عیاں ہوتے ہیں اور آخرت میں ایسے بندوں کا مرتبہ بلند ہوگا۔ حدیث میں ہے: ''جنت میں کچھ کمرے ایسے ہیں جن کا اندر باہر سے دکھتا ہے اور جن کا باہر اندر سے نظر آتا ہے یہ کمرے اللہ تعالیٰ نے ان بندوں کے لئے تیار کئے ہیں جو نرم گفتگو کرتے ہیں، غریبوں کو کھانا کھلاتے ہیں، مسلسل روزے رکھتے ہیں اور رات میں جب لوگ سوتے ہیں وہ نماز پڑھتے ہیں''(۱)

(۱) فَتَهَجَّدْ کا خطاب اولین تو رسول اللہ ﷺ سے ہے۔ مگر آپ کے واسطہ سے یہ خطاب امت سے بھی ہے کیونکہ خصوصیت کی کوئی دلیل نہیں۔ بلکہ عمومیت کی دلیل موجود ہے، اور وہ یہ ہے کہ تہجد کی نماز امت کے لئے بھی مشروع ہے اور یہ نماز امت سے بھی مطلوب ہے اور ہمیشہ امت کے صالح افراد یہ نماز پڑھتے رہے ہیں ۱۲

آٹھویں بات: حقیقت یہ ہے کہ امت کا جب تک قرآن سے تعلق مستحکم رہا وہ دنیا میں سرخرو رہی اور جب اس کا قرآن سے تعلق کمزور پڑ گیا تو وہ ذلیل وخوار ہوئی۔ حدیث میں ہے کہ اللہ تعالیٰ قرآن کریم کے ذریعہ ایک قوم کو بلند کرتے ہیں اور دوسری قوم کو پست کرتے ہیں (مشکوۃ حدیث ۱۲۱۵) یعنی جب تک امت حاملِ قرآن رہے گی دنیا وآخرت میں سرخ رو رہی اور جب وہ تارک قرآن ہو جائے گی ذلیل وخوار ہوئی۔ اور آخرت میں اللہ کے رسول بارگاہ خداوندی میں شکایت کریں گے کہ: ''میرے پروردگار! میری قوم نے اس قرآن کو بالکل ہی نظر انداز کر دیا تھا'' (سورۃ الفرقان آیت ۳۰)

تیسرا حکم: —— اور دعا کیجئے: ''میرے پروردگار! مجھے بہترین طریقہ پر داخل فرما اور بہترین طریقہ پر نکال اور مجھے اپنی طرف سے مدد کیا ہوا غلبہ عطا فرما'' —— یعنی خدایا! آپ ہمیں جہاں بھی رکھیں ہر حال میں ہماری مدد فرمائیں۔ مکہ سے نکال کر کسی اور جگہ پہنچائیں تو بہترین انداز سے نکالیں، دشمنوں کی تمام اسکیموں کو خاک میں ملائیں اور جہاں پہنچائیں وہاں بھی عزت کا مقام عطا فرمائیں آج ہم کس مپرسی کی حالت میں ہیں مگر خدایا آپ کی قدرت کامل ہے آپ ہمیں غلبہ، قوت اور حکومت بخشیں جس کے ساتھ آپ کی مدد بھی شامل ہو۔

اس دعا میں اس طرف اشارہ ہے کہ اب مکہ مکرمہ چھوڑنے کا وقت قریب آ گیا ہے نیز یہ بھی اشارہ ہے کہ یہ چھوڑنا ہمیشہ کے لئے نہیں ہوگا، دوبارہ مکہ مکرمہ میں واپسی ہوگی اور یہ بھی صاف اشارہ ہے کہ قوت وغلبہ ملنے کا وقت بھی قریب آ پہنچا ہے۔ چنانچہ بعد کے حالات نے اس دعا کی حرف بہ حرف تصدیق کی۔ آنحضرت ﷺ بہ حفاظت خداوندی دشمنوں کے نرغے سے نکل کر مدینہ منورہ تشریف لے گئے وہاں پورے اعزاز کے ساتھ آپ کا استقبال کیا گیا اور آٹھ ہی سال میں مکہ مکرمہ میں فاتحانہ داخلہ ہوا۔ اور دس سال کے قلیل عرصہ میں وہ حکومت وغلبہ نصیب ہوا کہ جزیرۃ العرب میں مسلمانوں سے کوئی آنکھ ملانے والا باقی نہ رہا۔

چوتھا حکم: —— اور اعلان کیجئے کہ حق آ گیا اور باطل گیا۔ باطل بلاشبہ مٹنے ہی والا ہے! —— یعنی مسلمان مایوس نہ ہوں۔ رحمت خداوندی سے پُر امید رہیں۔ حق کا غلبہ ہونے والا ہے اور باطل کے دن آ گئے ہیں اور اس بات کو خوب مشتہر کر دیں اور لوگوں میں اعلان کر دیں تا کہ آئندہ جب یہ پیشین گوئی پوری ہو تو صداقت اسلام اور حقانیت قرآن کی ایک دلیل بن جائے۔

فائدہ: مذکورہ بالا دونوں آیتوں کے الفاظ عام ہیں، مگر بعد کے حالات نے واضح کیا کہ دونوں آیتوں کا تعلق درحقیقت مکہ مکرمہ سے ہے۔ داخل کرنے سے بھی مکہ میں داخل کرنا مراد ہے اور نکالنے سے بھی مکہ سے نکالنا مراد ہے اور داخل کرنے کو تفاؤلاً (نیک فالی کے طور پر) مقدم کیا گیا ہے اور اس داخل کرنے اور نکالنے کے درمیان اسلامی

حکومت قائم ہوگی جس کے شامل حال اللہ تعالیٰ کی مدد ہوگی۔ رہا یہ سوال کہ مکہ میں جس پر دشمنوں کا قبضہ ہے واپسی کیسے ہوگی؟ اس کا جواب دوسری آیت میں دیا گیا ہے کہ مکہ میں حق کا غلبہ ہوگا اور باطل مٹ جائے گا۔ چنانچہ ایسا ہی ہوا۔ فتح مکہ کے دن کعبہ میں جو تین سو ساٹھ بت تھے آنحضرت ﷺ کے اشارے سے سب اوندھے منہ گر پڑے اس وقت آپ کی زبان مبارک پر تھا: ﴿جَاءَ الْحَقُّ وَزَهَقَ الْبَاطِلُ، إِنَّ الْبَاطِلَ كَانَ زَهُوْقًا﴾

پانچواں حکم: ـــــ اور ہم قرآن میں بتدریج اس چیز کو نازل کرتے ہیں جو ایمان والوں کے لئے شفا اور مہربانی ہے اور ظالموں کے لئے وہ گھاٹا ہی بڑھاتی ہے ـــــ یعنی قرآن کی آیات سے جو بتدریج اترتی رہتی ہیں روحانی بیماریاں دور ہوتی ہیں۔ دلوں سے عقائد باطلہ، اخلاق ذمیمہ اور شکوک وشبہات کافور ہوتے ہیں اور صحت باطنی حاصل ہوتی ہے بلکہ بسا اوقات اس کی مبارک تاثیر سے بدنی صحت بھی حاصل ہوتی ہے۔

بہرحال ایمان لانے والے یعنی اس نسخہ شفا کو استعمال کرنے والے تمام قلبی وروحانی امراض سے نجات پاکر اللہ تعالیٰ کی خصوصی رحمت اور باطنی نعمت سے سرفراز ہوں گے۔ ہاں جو مریض اپنی جان کا دشمن ہو اور وہ دوا دارو سے دور بھاگے وہ نقصان ہی اٹھائے گا۔

پانچویں احکام کا خلاصہ: یہ ہے کہ مکہ کے جاں گسل حالات میں مسلمانوں کو نماز پنجگانہ کے اہتمام کی تلقین کی گئی، تہجد کا حکم دیا گیا، قرآن کریم سے زیادہ سے زیادہ تعلق استوار رکھنے کی ہدایت فرمائی گئی اور بشارت سنائی گئی کہ حالات بدلنے والے ہیں حق کا غلبہ ہوگا اور باطل رفو چکر ہوگا پس مسلمان کو کیسے ہی جانگداز حالات پیش آئیں اللہ کی رحمت سے کبھی مایوس نہیں ہونا چاہئے اللہ کی رحمت سے مایوسی کفر ہے۔

چھ آیاتِ شفا ﴿وَيَشْفِ صُدُوْرَ قَوْمٍ مُّؤْمِنِيْنَ﴾ ﴿شِفَاءٌ لِّمَا فِي الصُّدُوْرِ﴾ ﴿فِيْهِ شِفَاءٌ لِّلنَّاسِ﴾ ﴿وَنُنَزِّلُ مِنَ الْقُرْآنِ مَاهُوَ شِفَاءٌ وَّرَحْمَةٌ لِّلْمُؤْمِنِيْنَ﴾ ﴿وَإِذَا مَرِضْتُ فَهُوَ يَشْفِيْنِ﴾ ﴿قُلْ هُوَ لِلَّذِيْنَ آمَنُوْا هُدًى وَشِفَاءٌ﴾ کو عرق گلاب میں زعفران بھو کر چینی کی پلیٹ پر لکھیں اور چالیس دن تک مریض کو نہار منہ پلائیں ان شاء اللہ شفا نصیب ہوگی اور مرض کی پیچیدگی دور ہوگی۔

وَإِذَآ أَنْعَمْنَا عَلَى الْإِنْسَانِ أَعْرَضَ وَنَا بِجَانِبِهِ ۚ وَإِذَا مَسَّهُ الشَّرُّ كَانَ يَئُوسًا ﴿٨٣﴾ قُلْ كُلٌّ يَعْمَلُ عَلَىٰ شَاكِلَتِهِ فَرَبُّكُمْ أَعْلَمُ بِمَنْ هُوَ أَهْدَىٰ سَبِيلًا ﴿٨٤﴾

وَاِذَآ	اور جب	مَسَّهُ	چھوتی ہے اس کو	عَلٰى شَاكِلَتِهٖ (۲)	اپنے ڈھنگ سے
اَنْعَمْنَا	انعام فرماتے ہیں ہم	الشَّرُّ	تکلیف	فَرَبُّكُمْ	سو تمہارے پروردگار
عَلَى الْاِنْسَانِ	آدمی پر	كَانَ	تو جاتا ہے	اَعْلَمُ	بخوبی جانتے ہیں
اَعْرَضَ	(تو) وہ روگردانی کرتا ہے	يَئُوْسًا	مایوس	بِمَنْ	اس کو جو
وَنَا (۱)	اور بچاتا ہے	قُلْ	آپ کہیں	هُوَ	وہ
بِجَانِبِهٖ	اپنا پہلو	كُلٌّ	ہر شخص	اَهْدٰى	سب سے زیادہ راہ
وَاِذَا	اور جب	يَّعْمَلُ	کام کرتا ہے	سَبِيْلًا	یاب ہے

مسلمانوں کو مذکورہ احکام دینے کے بعد، اب کفار سے خطاب ہے: —— اور جب ہم انسان کو نعمتیں عطا کرتے ہیں تو وہ روگردانی اور پہلو تہی کرتا ہے —— یعنی خدا فراموش انسان کا عجیب حال ہے۔ اللہ تعالیٰ اپنے فضل وکرم سے نعمتوں سے نوازتے ہیں تو احسان مند نہیں ہوتا جتنا عیش آرام ملتا ہے اتنا ہی منعم حقیقی کی طرف سے اعراض کرتا ہے اور پہلو بچاتا ہے —— اور جب وہ مصیبت سے دوچار ہوتا ہے تو مایوس ہو جاتا ہے —— یعنی جب سخت وقت آتا ہے تو ایک دم آس توڑ کر ناامید ہو جاتا ہے یعنی دونوں حالتوں میں خدا سے بے تعلق رہتا ہے، پہلے غفلت کی بنا پر اور اب مایوسی کی وجہ سے۔ سچ ہے: انسان اللہ کی طرف متوجہ نہ ہونا چاہے تو ہر حال اس کو اللہ سے غافل کرنے کے لئے کافی ہے —— کہئے: ”ہر شخص اپنے ڈھنگ پر کام کر رہا ہے اور تمہارے پروردگار اس شخص کو بخوبی جانتے ہیں جو سب سے زیادہ راہ یاب ہے —— یعنی کفار اپنی فطرت کی روش پر رواں دواں ہیں۔ اور نبی اور ان کے اصحاب اپنی راہ پر گامزن ہیں۔ کس کی راہ راہِ راست ہے، وہ اللہ بخوبی جانتے ہیں، تم نہیں جانتے۔ اور اللہ تعالیٰ یہ بات ابھی علمی طور پر واضح کر رہے ہیں، کل عملی طور پر بھی اس کا فیصلہ فرما دیں گے۔ انتظار کرو۔

وضاحت: انسان کی ماحول، عادت اور رسم ورواج کے مطابق ایک طبیعت بن جاتی ہے، اُسی ڈھب پر وہ کام کرتا ہے اور اسی کو مناسب اور حق سمجھتا ہے۔ چنانچہ کفار اپنی روش پر خوش ہیں اور اپنی حالت پر مگن ہیں۔ قرآن کریم

(۱) نائی (فعل ماضی، صیغہ واحد مذکر غائب) مصدر نَأْيٌ باب فتح نَاٰى نَأْيًا فلانا وعن فلان: دور ہونا۔ صفت نَاءٍ مؤنث نَائِيَةٌ آیت میں باء سے متعدی ہے اس لئے ترجمہ ہے بچانا، دور کرنا، پھیر لینا۔ (۲) شَاكِلَةٌ (اسم فاعل صیغہ واحد مؤنث) فطری طریقہ اور روش شَكْلٌ سے جس کے معنی ہیں مانند، نظیر، کہا جاتا ہے لَسْتَ مِنْ شَكْلِيْ وَلَا شَاكِلَتِيْ (تو نہ میری طرح ہے نہ میری روش پر) اس مفہوم کے لئے دوسرا مترادف لفظ سَجِيَّةٌ ہے جس کے معنی ہیں فطری عادت ۱۲

ان کو جو باتیں سمجھاتا ہے وہ اس کو سمجھنے کے لئے تیار نہیں، بلکہ اس کو گمراہی سمجھتے ہیں اور اپنے غلط طریقہ کو سب سے زیادہ سیدھا راستہ تصور کرتے ہیں جبکہ مسلمان قرآن کی دعوت سمجھ چکے ہیں وہ اس کے بتائے ہوئے راستہ پر چل رہے ہیں اور مشرکین کے طریقہ کو نہایت خطرناک گمراہی تصور کرتے ہیں اور اللہ تعالیٰ کا علم دونوں جماعتوں کے احوال کو محیط ہے وہ سب کے طور وطریق کو برابر دیکھ رہے ہیں اور بخوبی جانتے ہیں کہ کون سیدھے راستہ پر ہے اور کون کجروی اختیار کئے ہوئے ہے اور وہ وقت جلد آرہا ہے جب اس کا عملی فیصلہ کردیا جائے گا۔

وَيَسْـَٔلُوْنَكَ عَنِ الرُّوْحِ ؕ قُلِ الرُّوْحُ مِنْ اَمْرِ رَبِّيْ وَمَآ اُوْتِيْتُمْ مِّنَ الْعِلْمِ اِلَّا قَلِيْلًا ۝۸۵ وَلَئِنْ شِئْنَا لَنَذْهَبَنَّ بِالَّذِيْٓ اَوْحَيْنَآ اِلَيْكَ ثُمَّ لَا تَجِدُ لَكَ بِهٖ عَلَيْنَا وَكِيْلًا ۝۸۶ اِلَّا رَحْمَةً مِّنْ رَّبِّكَ ؕ اِنَّ فَضْلَهٗ كَانَ عَلَيْكَ كَبِيْرًا ۝۸۷ قُلْ لَّئِنِ اجْتَمَعَتِ الْاِنْسُ وَالْجِنُّ عَلٰٓي اَنْ يَّاْتُوْا بِمِثْلِ هٰذَا الْقُرْاٰنِ لَا يَاْتُوْنَ بِمِثْلِهٖ وَلَوْ كَانَ بَعْضُهُمْ لِبَعْضٍ ظَهِيْرًا ۝۸۸ وَلَقَدْ صَرَّفْنَا لِلنَّاسِ فِيْ هٰذَا الْقُرْاٰنِ مِنْ كُلِّ مَثَلٍ ۡ فَاَبٰٓى اَكْثَرُ النَّاسِ اِلَّا كُفُوْرًا ۝۸۹

وَيَسْـَٔلُوْنَكَ	اور پوچھتے ہیں وہ آپ سے	وَلَئِنْ	اور البتہ اگر	عَلَيْنَا	ہمارے مقابلہ میں
عَنِ الرُّوْحِ	روح کے بارے میں	شِئْنَا	چاہیں ہم	وَكِيْلًا	کوئی کارساز
قُلِ	آپ کہئے	لَنَذْهَبَنَّ	(تو)ضرور لے جائیں ہم	اِلَّا	مگر
الرُّوْحُ	روح	بِالَّذِيْٓ	اس کو جو	رَحْمَةً	مہربانی (ہے)
مِنْ اَمْرِ رَبِّيْ	میرے رب کے حکم	اَوْحَيْنَآ	وحی کی ہے ہم نے	مِّنْ رَّبِّكَ	آپ کے رب کی
	سے (ایک چیز ہے)	اِلَيْكَ	آپ کی طرف	اِنَّ فَضْلَهٗ	بے شک اس کا فضل
وَمَآ	اور نہیں	ثُمَّ	پھر	كَانَ	ہے (وہ)
اُوْتِيْتُمْ	دیئے گئے ہو تم	لَا تَجِدُ	نہ پائیں آپ	عَلَيْكَ	آپ پر
مِّنَ الْعِلْمِ	علم میں سے	لَكَ	اپنے لئے	كَبِيْرًا	بڑا
اِلَّا قَلِيْلًا	مگر تھوڑا	بِهٖ	اس سلسلہ میں	قُلْ	آپ کہئے

لَئِنِ	اور البتہ اگر	بِمِثْلِهٖ	اس کے مانند	فِيْ هٰذَا	اس قرآن میں
اجْتَمَعَتِ	اکٹھا ہو جائیں	وَلَوْ كَانَ	اگرچہ ہو	الْقُرْاٰنِ	
الْاِنْسُ	انسان	بَعْضُهُمْ	ان کا بعض	مِنْ كُلِّ	ہر قسم کے
وَالْجِنُّ	اور جنات	لِبَعْضٍ	بعض کا	مَثَلٍ	عمدہ مضامین
عَلٰٓى اَنْ	اس کام کے لئے کہ	ظَهِيْرًا	مددگار	فَاَبٰٓى	سوا انکار کیا
يَّاْتُوْا	لائیں وہ	وَلَقَدْ	اور البتہ تحقیق	اَكْثَرُ	بیشتر
بِمِثْلِ	مانند	صَرَّفْنَا	پھیر پھیر کر بیان کئے	النَّاسِ	لوگوں نے
هٰذَا الْقُرْاٰنِ	اس قرآن (کے)		ہیں ہم نے	اِلَّا	بجز
لَا يَاْتُوْنَ	(تو) نہ لا سکیں وہ	لِلنَّاسِ	لوگوں کے لئے	كُفُوْرًا	کفر (کے)

مسئلہ رسالت چل رہا ہے۔ مشرکین نے رسول کی صداقت جانچنے کے لئے مشاورت کی۔ رسول اللہ ﷺ کی حیاتِ مبارکہ تو انہیں بے داغ نظر آئی۔ آپؐ ان کے درمیان جوان ہوئے تھے۔ آپؐ کی امانت و دیانت اور سچائی میں کبھی کسی کو شبہ نہیں ہوا تھا۔ اس لئے انھوں نے سوچا کہ وہ جو کلام پیش کرتے ہیں، اور اس کو اللہ کا کلام بتلاتے ہیں: اس کو جانچا جائے۔ خود تو علوم انبیاء سے واقف نہیں تھے، اس لئے ایک وفد مدینہ بھیجا۔ علماء یہود نے ان کو تین سوالات بتلائے اور یہ بھی بتلایا کہ اگر وہ سچے نبی ہیں تو دو کا جواب دیں گے، ایک کا نہیں دیں گے۔ اور اگر وہ جھوٹا شخص ہے تو تینوں کا جواب دے گا، یا کسی کا بھی جواب نہیں دے گا۔

وہ تین سوالات یہ تھے:

۱ — ان لوگوں کا حال بتاؤ جو قدیم زمانہ میں بادشاہ سے ڈر کر کسی غار میں چلے گئے تھے۔

۲ — اس بادشاہ کا حال سناؤ جس نے مشرق و مغرب کا سفر کیا تھا۔

۳ — روح کی حقیقت کیا ہے؟

وفد نے واپس آکر رسول اللہ ﷺ سے یہی سوالات کئے۔ قرآن کریم میں جوابات نازل ہوئے۔ پہلے دو سوالوں کے جوابات سورۂ کہف میں ہیں۔ اور روح کے متعلق ارشاد فرمایا: —— اور لوگ آپؐ سے روح کے متعلق پوچھتے ہیں۔ آپؐ جواب دیں کہ روح میرے رب کے حکم سے ایک چیز ہے — یعنی اس کی حقیقت نہیں کھولی، اور اس کی وجہ بتلائی —— اور تم لوگ بس تھوڑا سا علم دیئے گئے ہو! —— یعنی کسی مسئلہ کو سمجھنے کے لئے

علم کی ایک مقدار ضروری ہے۔ کندۂ ناتراش کو آسمان کی حقیقت نہیں سمجھائی جاسکتی۔ جنت وجہنم کے احوال سے پوری طرح واقف نہیں کیا جاسکتا۔ کیونکہ ماوراء طبیعیات کو جھانکنے کی سب میں صلاحیت نہیں ہوتی۔ اسی طرح روح بھی دوسری دنیا کی چیز ہے اور غیر محسوس ہے۔ اس کے بارے میں صرف اتنی بات بتلائی جو عام لوگوں کی سمجھ میں آسکتی ہے کہ وہ ایک وجودی چیز ہے، جو حکم خداوندی سے حیوان میں آموجود ہوتی ہے۔ اور جاندار جی اٹھتا ہے، اور جب وہ چیز بدن سے نکل جاتی ہے تو جاندار مرجاتا ہے۔

مشرکین کو قرآن کریم پسند نہیں تھا۔ کیونکہ وہ بتوں کو مسترد کرتا تھا۔ اور توحید کی تلقین کرتا تھا۔ آخرت یاد دلاتا تھا، اور اخلاقی ضابطوں میں جکڑتا تھا۔ اس لئے ان کا مطالبہ تھا کہ یہ قرآن بدل کر دوسرا لایئے، جس میں بتوں کی برائی نہ ہو، یا اسی میں کچھ تبدیلی کردیجئے (سورۂ یونس آیت ۱۵) ان کو جواب دیا جارہا ہے: —— اور بخدا! اگر ہم چاہیں تو جو وحی ہم نے آپ کی طرف بھیجی ہے اس کو واپس لے لیں —— یعنی قرآن میں تبدیلی یا ترمیم کی بات کیا کرتے ہو، اللہ تعالیٰ تو اس پر بھی قادر ہیں کہ قرآن کو اٹھالیں، قیامت کے قریب اللہ پاک ایسا کریں گے بھی —— پھر آپ کو اس سلسلہ میں ہمارے مقابلہ میں کوئی کارساز نہ ملے —— یعنی اللہ تعالیٰ نے انسانوں پر کرم فرمایا۔ ان کو قرآن جیسی بے بہا نعمت عطا فرمائی۔ کیونکہ وہ اپنے بندوں پر بے پایاں مہربان ہیں۔ پس اس نعمت کی قدر کرو، ٹھکراؤ نہیں۔

ملحوظہ: یہ ارشاد: ''جو وحی ہم نے آپ کی طرف بھیجی ہے'' اس کی مخاطب امتِ دعوت ہے، جو ابھی ایمان نہیں لائی۔ اور یہ قرآن کا اسلوب ہے کہ وہ مخاطب رسول اللہ ﷺ کو بناتا ہے، اور خطاب امت سے کرتا ہے۔

مشرکین کا مذکورہ مطالبہ اس خیال پر مبنی تھا کہ قرآن خود نبی ﷺ کا کلام ہے۔ حالانکہ ایسا کلام کسی بھی انسان کے بس کا نہیں۔ چنانچہ مشرکین کو چیلنج دیا —— آپ کہیں: بخدا! اگر جنّ وانسان اکٹھا ہوکر اس قرآن جیسا کلام بنانا چاہیں تو ہرگز نہیں بنا سکتے، گو وہ ایک دوسرے کے مددگار ہوجائیں —— یعنی آؤ بازو آزمالو! اور سب مل کر قرآن جیسا کلام بنالاؤ! —— اور واقعہ یہ ہے کہ ہم نے لوگوں کے نفع کے لئے اس قرآن میں ہر قسم کے عمدہ مضامین طرح طرح سے بیان کئے ہیں، پھر بھی اکثر لوگ انکار ہی پر جمے ہوئے ہیں! —— یعنی اللہ تعالیٰ انسانوں کی خیر خواہی کے لئے نہج بدل بدل کر بات سمجھاتے ہیں، مگر اکثر لوگ ناقدرے ہیں، اور وہ انکار ہی کو شیوہ بنائے ہوئے ہیں۔

لوگو! قرآن کی قدر کرو۔ قرآن وہ نعمت ہے جو اپنے ماننے والوں کو دنیا کی بالانشیں اور آخرت میں خلد آشیاں بناتا ہے!

وَقَالُوْا لَنْ نُّؤْمِنَ لَكَ حَتّٰى تَفْجُرَ لَنَا مِنَ الْاَرْضِ يَنْۢبُوْعًا ﴿۹۰﴾ اَوْ تَكُوْنَ لَكَ جَنَّةٌ مِّنْ نَّخِيْلٍ وَّعِنَبٍ فَتُفَجِّرَ الْاَنْهٰرَ خِلٰلَهَا تَفْجِيْرًا ﴿۹۱﴾ اَوْ تُسْقِطَ السَّمَآءَ كَمَا زَعَمْتَ عَلَيْنَا كِسَفًا اَوْ تَاْتِيَ بِاللّٰهِ وَالْمَلٰٓئِكَةِ قَبِيْلًا ﴿۹۲﴾ اَوْ يَكُوْنَ لَكَ بَيْتٌ مِّنْ زُخْرُفٍ اَوْ تَرْقٰى فِي السَّمَآءِ ۭ وَلَنْ نُّؤْمِنَ لِرُقِيِّكَ حَتّٰى تُنَزِّلَ عَلَيْنَا كِتٰبًا نَّقْرَؤُهٗ ۭ قُلْ سُبْحَانَ رَبِّيْ هَلْ كُنْتُ اِلَّا بَشَرًا رَّسُوْلًا ﴿۹۳﴾ ع ۱۰

وَقَالُوْا	اور کہا انہوں نے	جَنَّةٌ	کوئی باغ	عَلَيْنَا	ہم پر
لَنْ نُّؤْمِنَ	ہم ہرگز ایمان نہیں	مِّنْ نَّخِيْلٍ	کھجور کا	كِسَفًا (۳)	پارہ پارہ کر کے
	لائیں گے	وَّعِنَبٍ	اور انگور (کا)	اَوْ تَاْتِيَ	یا لے آئیں آپ
لَكَ	آپ پر	فَتُفَجِّرَ	پس جاری کردیں آپ	بِاللّٰهِ	اللہ تعالیٰ کو
حَتّٰى	یہاں تک کہ	الْاَنْهٰرَ	نہروں کو	وَالْمَلٰٓئِكَةِ	اور فرشتوں کو
تَفْجُرَ (۱)	بہادیں آپ	خِلٰلَهَا	اس کے بیچ میں	قَبِيْلًا (۴)	روبرو
لَنَا	ہمارے لئے	تَفْجِيْرًا	جاری کرنا	اَوْ يَكُوْنَ	یا ہو
مِنَ الْاَرْضِ	زمین سے	اَوْ تُسْقِطَ	یا گرادیں آپ	لَكَ	آپ کے لئے
يَنْۢبُوْعًا (۲)	کوئی چشمہ	السَّمَآءَ	آسمان کو	بَيْتٌ	کوئی گھر
اَوْ تَكُوْنَ	یا ہو	كَمَا	جیسا کہ	مِّنْ زُخْرُفٍ (۵)	سونے کا
لَكَ	آپ کے لئے	زَعَمْتَ	گمان کرتے ہیں آپ	اَوْ تَرْقٰى	یا چڑھیں آپ

(۱) فَجَرَ (ن) فَجْرًا الماءَ: پانی بہانا، جاری کرنا۔ فَجَّرَ تَفْجِيْرًا (تفعیل) الماءَ: پانی بہانا، جاری کرنا۔ یہ باب مبالغہ کے لئے ہے (۲) يَنْبُوْع کی جمع يَنَابِيْع ہے، چشمہ یعنی وہ سوت جس میں سے پانی پھوٹ کر نکلتا ہے۔ نَبَعَ (ف ض) الماءُ: کنویں یا چشمہ سے پانی کا پھوٹ کر نکلنا (۳) كِسَف جمع ہے كِسْفَة کی جیسے: قِطَعٌ جمع ہے قِطْعَةٌ کی جس کے معنی ہیں پارہ، ٹکڑا اور یہ اَلسَّمَاءَ کا حال ہے (۴) قَبِيْلٌ کے دو معنی ہیں: ۱- سامنے اور ظاہر، کہا جاتا ہے رَأَيْتُهٗ قَبِيْلًا: میں نے اس کو سامنے سے ظاہر طور پر دیکھا ۲- گروہ گروہ اس صورت میں یہ قَبِيْلَة کی جمع ہوگی اور پہلی صورت میں قَبِيْلًا اللہ کا حال ہے اور ملائکہ کا حال محذوف ہے اور دوسری صورت میں قَبِيْلًا ملائکۃ کا حال ہے (۵) زُخْرُف کے اصل معنی ہیں زینت، چونکہ سونا بھی زینت ہے اس لئے سونے کو بھی زخرف کہتے ہیں اور جب قول کے لئے استعمال کیا جاتا ہے تو ملمع سازی کے معنی ہوتے ہیں جیسے زُخْرُفُ الْقَوْلِ: فریب کی باتیں۔

فِي السَّمَاءِ	آسمان میں	عَلَيْنَا	ہم پر	هَلْ [3]	نہیں
وَلَنْ نُّؤْمِنَ	اور ہرگز یقین نہیں	كِتٰبًا	کوئی ایسا نوشتہ	كُنْتُ	ہوں میں
	کریں گے ہم	نَّقْرَؤُهٗ [2]	جس کو پڑھیں ہم	اِلَّا	مگر
لِرُقِيِّكَ [1]	آپ کے چڑھنے کا	قُلْ	جواب دیجئے:	بَشَرًا	آدمی
حَتّٰى	یہاں تک کہ	سُبْحَانَ	پاک ہے	رَّسُوْلًا	پیغامبر
تُنَزِّلَ	اتاریں آپ	رَبِّيْ	میرا پروردگار	۞	۞

رسالت کا مسئلہ چل رہا ہے۔ جب مشرکین سے قرآن کا چیلنج نہ اٹھ سکا، اور وہ قرآن کریم کا مثل پیش کرنے سے عاجز رہ گئے، تو انھوں نے معجزات کے مطالبے شروع کر دیئے ـــــ اور ان لوگوں نے کہا: (۱) ہم آپ کی بات ہرگز نہ مانیں گے تا آنکہ آپ ہمارے لئے سرزمین مکہ کو پھاڑ کر ایک چشمہ جاری کر دیں ـــــ اور اس بنجر اور بے آب وگیاہ سرزمین کو سرسبز وشاداب کر دیں ـــــ (۲) یا آپ کے لئے کھجور اور انگور کا ایک باغ ہو، پھر آپ اس کے بیچ میں نہریں رواں دواں کر دیں ـــــ تاکہ لوگ آپ کی ریاست وسیادت تسلیم کر لیں، اور آپ کا ٹھاٹھ دیکھ کر لوگ آپ کے گرویدہ ہو جائیں ـــــ (۳) یا آسمان کو اپنے قول کے مطابق پارہ پارہ کر کے ہم پر گرادیں ـــــ ''اپنے قول کے مطابق'' جیسا کہ سورۃ السبا آیت ۹ میں ہے کہ اگر اللہ تعالیٰ چاہیں تو کفار کو زمین میں دھنسا دیں، یا ان پر آسمان کے ٹکڑے گرا دیں۔ کفار یہ مطالبہ کر رہے ہیں کہ یہ کر کے دکھاؤ، تاکہ آپؐ کی صداقت اور اللہ کی انتہائی قدرت ظاہر ہو ـــــ (۴) یا آپؐ اللہ تعالیٰ کو اور فرشتوں کو ہمارے روبرو لے آئیں ـــــ یعنی خدا خود جلوہ گر ہو کر کہیں، اور فرشتے آ کر گواہی دیں کہ آپؐ سچے نبی ہیں تو ہم مانیں ـــــ (۵) یا آپ کے لئے سونے کا کوئی گھر ہو ـــــ جسے دیکھ کر لوگ مرعوب ہو جائیں اور آپؐ کی بڑائی تسلیم کر لیں ـــــ (۶) یا آپ آسمان پر چڑھیں ـــــ تاکہ پتہ چلے کہ آپؐ کا بالائی طاقت سے قوی رابطہ ہے، اور آپؐ اس حکومت کے نمائندے ہیں ـــــ اور آپ کا چڑھنا ہرگز تسلیم نہیں کریں گے یہاں تک کہ آپؐ اتار لائیں ہم پر کوئی ایسا نوشتہ جسے ہم خود پڑھیں! ـــــ اور اس میں آپؐ کے آسمان پر چڑھنے کی رسید بطور تصدیق لکھی ہو۔

جواب: ـــــ آپؐ کہیں: سبحان اللہ! ـــــ والعظمۃ للہ! ـــــ نہیں ہوں میں مگر ایک انسان رسول!

(۱) رُقِیٌّ: رَقِی (س) کا مصدر ہے جس کے معنی ہیں اوپر چڑھنا (۲) نَقْرَؤُهٗ جملہ فعلیہ كِتَابًا کی صفت ہے (۳) استفہام انکاری بمعنی نفی ہے ۱۲

—— یعنی کیا میں نے خدا ہونے کا کبھی دعویٰ کیا ہے جو تم یہ مطالبات مجھ سے کرنے لگے ہو؟ میرا دعویٰ تو اول روز سے یہی ہے کہ خدا کی طرف سے پیغام لانے والا ایک انسان ہوں۔ تمہیں اگر جانچنا ہے تو میرے پیغام کو جانچو، میرا اطمینان کرو، ایمان لانا ہے تو میرے پیغام کی صداقت کو دیکھ کر ایمان لاؤ انکار کرنا ہے تو اس میں کوئی نقص نکال کر دکھاؤ۔ یا اس کا مقابلہ کرو، میری صداقت کا اطمینان کرنا ہے تو میری زندگی کو، میرے اخلاق کو اور میرے کام کو دیکھو، یہ سب کچھ چھوڑ کر تم مجھ سے جو فرمائشیں کر رہے ہو یہ تو اللہ تعالیٰ کی قدرت والے کام ہیں، میرے بس کی یہ باتیں کب ہیں؟ میرا کام جو اُدھر سے ملے اس کو بے کم وکاست اِدھر پہنچا دینا ہے۔ میں اپنا فرض ادا کر رہا ہوں فرمائشی نشانات دکھلانا یا نہ دکھلانا اللہ تعالیٰ کی مشیت اور حکمت بالغہ پر موقوف ہے۔

یہ خیال غلط ہے کہ رسول خدائی اختیارات کا مالک ہوتا ہے اس کا کام صرف پیغام حق پہنچانا ہے

وَمَا مَنَعَ النَّاسَ اَنْ يُّؤْمِنُوْٓا اِذْ جَآءَهُمُ الْهُدٰٓى اِلَّآ اَنْ قَالُوْٓا اَبَعَثَ اللّٰهُ بَشَرًا رَّسُوْلًا ﴿۹۴﴾ قُلْ لَّوْ كَانَ فِي الْاَرْضِ مَلٰٓئِكَةٌ يَّمْشُوْنَ مُطْمَئِنِّيْنَ لَنَزَّلْنَا عَلَيْهِمْ مِّنَ السَّمَآءِ مَلَكًا رَّسُوْلًا ﴿۹۵﴾ قُلْ كَفٰى بِاللّٰهِ شَهِيْدًۢا بَيْنِيْ وَبَيْنَكُمْ ۭ اِنَّهٗ كَانَ بِعِبَادِهٖ خَبِيْرًۢا بَصِيْرًا ﴿۹۶﴾

وَمَا	اور نہیں	الْهُدٰٓى	ہدایت	رَّسُوْلًا	رسول بنا کر
مَنَعَ (۱)	روکا	اِلَّآ	مگر	قُلْ	آپ کہیے
النَّاسَ	لوگوں کو	اَنْ	(اس بات نے) کہ	لَّوْ كَانَ	اگر ہوتے
اَنْ	(اس بات سے) کہ	قَالُوْٓا	کہا انھوں نے	فِي الْاَرْضِ	زمین میں
يُّؤْمِنُوْٓا	ایمان لائیں وہ	اَبَعَثَ	کیا بھیجا	مَلٰٓئِكَةٌ	فرشتے
اِذْ	جبکہ	اللّٰهُ	اللہ تعالیٰ نے	يَّمْشُوْنَ (۲)	چلتے
جَآءَهُمُ	پہنچی ان کو	بَشَرًا	انسان کو	مُطْمَئِنِّيْنَ	باطمینان

(۱) مَنَعَ کا مفعول اول الناس ہے اور جملہ أَنْ يُّؤْمِنُوْا بتاویل مصدر ہو کر مفعول ثانی ہے اور اَنْ مصدریہ سے پہلے مِنْ محذوف ہے إِذْجَاءِ هُمْ مفعول فیہ ہے يُؤْمِنُوْا کا —— إِلَّا أَنْ قَالُوْا إلخ بتاویل مصدر ہو کر منع کا فاعل ہے اور بَشَرًا مفعول بہ ہے بَعَثَ کا اور رَسُوْلًا اس کا حال ہے (۲) جملہ يَمْشُوْنَ صفت ہے مَلَائِكَةٌ کی اور مُطْمَئِنِّيْنَ حال ہے يَمْشُوْنَ کے فاعل سے مَلَكًا مفعول بہ ہے نَزَّلْنَا کا اور رَسُوْلًا اس کا حال ہے۔

لَنَزَّلۡنَا	(تو) البتہ اتارتے ہم	قُلۡ	آپ کہئے	وَ بَيۡنَكُمۡ	اور تمہارے درمیان
عَلَيۡهِمۡ	ان پر	كَفٰى	کافی ہیں	اِنَّهٗ كَانَ	بیشک وہ ہیں
مِّنَ السَّمَآءِ	آسمان سے	بِاللّٰهِ[1]	اللہ تعالیٰ	بِعِبَادِهٖ[2]	اپنے بندوں کو
مَلَكًا	فرشتے کو	شَهِيۡدًۢا	بطور گواہ	خَبِيۡرًۢا	خوب جاننے والے
رَّسُوۡلًا	رسول بناکر	بَيۡنِىۡ	میرے درمیان	بَصِيۡرًا	خوب دیکھنے والے

مذکورہ جواب پر مشرکین یہ اعتراض کرتے ہیں کہ بشر پیغمبر نہیں ہوسکتا۔ بھلا جو کھاتا پیتا ہو، بیوی بچے رکھتا ہو، بازار میں چلتا پھرتا ہو، وہ رسول کیسے ہوسکتا ہے؟ اللہ تعالیٰ کو اگر رسول بھیجنا تھا تو کسی فرشتے کو رسول بنا کر بھیجتے۔ فرشتے پاکیزہ مخلوق ہیں۔ نبوت ورسالت ان کو زیب دیتی ہے۔ انسان کا رسول ہونا ہماری سمجھ سے بالاتر ہے ـــــ اِن آیتوں میں اس شبہ کا جواب دیا گیا ہے کہ یہ شبہ ہمیشہ لوگوں کو پیش آتا رہا ہے۔ اور فرشتوں کو رسول بنا کر نہ بھیجنے کی وجہ بیان فرمائی ہے: ارشاد ہے ـــــ اور جب بھی لوگوں کے پاس ہدایت پہنچی تو ان کو ایمان لانے سے صرف اس بات نے روکا کہ کہنے لگے: ''کیا اللہ نے بشر کو رسول بنا کر بھیجا ہے؟!'' ـــــ یعنی بشریت اور رسالت کا ایک ذات میں جمع ہونا جاہلوں کی سمجھ میں کبھی نہیں آیا۔ ہمیشہ ان کو اس پر اشکال رہا کہ آدمی رسول کیسے ہوسکتا ہے ـــــ آپ کہئے: اگر زمین میں فرشتے باطمینان چلتے پھرتے ہوتے تو ہم ضرور ان پر آسمان سے کوئی فرشتہ رسول بنا کر بھیجتے ـــــ یعنی اگر یہ زمین آدمیوں کے بجائے فرشتوں کی بستی ہوتی تو بیشک موزون تھا کہ ہم فرشتہ کو رسول بنا کر اتارتے، مگر جب یہاں فرشتوں کی بود وباش نہیں، بلکہ یہ زمین انسانوں کا مستقر ہے تو کسی فرشتہ کو رسول بنا کر بھیجنے کا آخر فائدہ کیا ہوگا؟ لوگ فرشتے سے استفادہ کیسے کریں گے؟ اور فرشتہ لوگوں کی دینی ضروریات کیسے پوری کرے گا؟ یہ کام تو انسان ہی کے ذریعہ انجام پاسکتا ہے اس لئے انسانوں کے لئے انسان ہی کا رسول ہونا نہ صرف یہ کہ موزوں ہے بلکہ ضروری ہے۔

پیغمبر کا کام صرف اتنا ہی نہیں ہوتا کہ وہ پیغام سنادے بلکہ اس کی یہ بھی ذمہ داری ہوتی ہے کہ وہ اپنے آپ کو اپنے پیغام کا نمونہ بنا کر پیش کرے تاکہ عوام اس عملی نمونہ سے استفادہ کریں۔ نیز ان لوگوں کے ذہن کی گتھیاں سلجھائے اور اس سلسلہ میں ضروری راہ نمائی کرے۔ ظاہر ہے فرشتہ یہ سب کام نہیں کرسکتا نہ وہ حاجات رکھتا ہے نہ ضروریات اور نہ وہ مشکلات سے دوچار ہوتا ہے پھر وہ انسانوں کی راہ نمائی کیسے کرسکتا ہے؟ نیز استفادہ کے لئے طبعی مناسبت ضروری

(۱) بِاللّٰهِ: كَفٰى کا فاعل ہے اور ب كفى کے فاعل پر زائد ہے اور شَهِيۡدًا تمیز ہے نسبت کے ابہام کو دور کرنے کے لئے آئی ہے (۲) بِعِبَادِهٖ مابعد سے متعلق ہے عَلٰى سَبِيۡلِ التَّنَازُع۔

ہے جو ہم جنس میں ہوتی ہے اس لئے انسانوں کی طرف انسان ہی کو رسول بنا کر بھیجنا قرین مصلحت ہے ـــــ اب بھی منکرین نہ مانیں تو ـــــ آپ کہہ دیں: میرے اور تمہارے درمیان اللہ تعالیٰ کی گواہی کافی ہے۔ وہ اپنے بندوں کو خوب جانتے اور خوب دیکھتے ہیں ـــــ یعنی دلائل واضحہ سے آپؐ کی نبوت ورسالت ثابت ہوجانے کے بعد اور تمام شکوک وشبہات دور کردینے کے بعد بھی لوگ نہ مانیں تو آپ کہئے کہ میرا حال اور تمہارا حال اللہ تعالیٰ بخوبی جانتے ہیں وہ کافی گواہ ہیں کہ میں سچا رسول ہوں اور جو کچھ تم میری مخالفت میں کررہے ہو اس کو بھی وہ بخوبی جانتے ہیں اور فیصلہ آخر کار انہی کو کرنا ہے جو دیر سویر تمہارے سامنے آکر رہے گا۔

یہ دنیا عمل کی جگہ ہے، فیصلہ کی جگہ نہیں، فیصلہ کا دن یوم جزا ہے جو جلد آرہا ہے

وَمَنْ يَّهْدِ اللّٰهُ فَهُوَ الْمُهْتَدِ ۚ وَمَنْ يُّضْلِلْ فَلَنْ تَجِدَ لَهُمْ اَوْلِيَآءَ مِنْ دُوْنِهٖ ۭ وَنَحْشُرُهُمْ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ عَلٰى وُجُوْهِهِمْ عُمْيًا وَّبُكْمًا وَّصُمًّا ۭ مَاْوٰىهُمْ جَهَنَّمُ ۭ كُلَّمَا خَبَتْ زِدْنٰهُمْ سَعِيْرًا ﴿٩٧﴾ ذٰلِكَ جَزَآؤُهُمْ بِاَنَّهُمْ كَفَرُوْا بِاٰيٰتِنَا وَقَالُوْٓا ءَاِذَا كُنَّا عِظَامًا وَّرُفَاتًا ءَاِنَّا لَمَبْعُوْثُوْنَ خَلْقًا جَدِيْدًا ﴿٩٨﴾ اَوَلَمْ يَرَوْا اَنَّ اللّٰهَ الَّذِيْ خَلَقَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ قَادِرٌ عَلٰٓى اَنْ يَّخْلُقَ مِثْلَهُمْ وَجَعَلَ لَهُمْ اَجَلًا لَّا رَيْبَ فِيْهِ ۭ فَاَبَى الظّٰلِمُوْنَ اِلَّا كُفُوْرًا ﴿٩٩﴾ قُلْ لَّوْ اَنْتُمْ تَمْلِكُوْنَ خَزَآئِنَ رَحْمَةِ رَبِّيْٓ اِذًا لَّاَمْسَكْتُمْ خَشْيَةَ الْاِنْفَاقِ ۭ وَكَانَ الْاِنْسَانُ قَتُوْرًا ﴿١٠٠﴾ ع

وَمَنْ	اور جس کو	وَمَنْ يُّضْلِلْ	اور جس کو گمراہ کریں	مِنْ دُوْنِهٖ	اللہ تعالیٰ کے سوا
يَّهْدِ اللّٰهُ (۱)	راہ دکھائیں اللہ تعالیٰ	فَلَنْ تَجِدَ	پس ہرگز نہیں پائے گا تو	وَنَحْشُرُهُمْ	اور اکٹھا کریں گے ہم انکو
فَهُوَ (۲)	پس وہ	لَهُمْ (۴)	ان کے لئے	يَوْمَ الْقِيٰمَةِ	قیامت کے دن
الْمُهْتَدِ (۳)	راہ پر آجانے والا ہے	اَوْلِيَآءَ	دوست	عَلٰى وُجُوْهِهِمْ (۵)	منہ کے بل

(۱) یَهْدِ (مضارع مجزوم) اصل میں یَهْدِیْ تھا ی جزم کی وجہ سے گر گئی ہے (۲) هُوَ کا مرجع مَنْ ہے جو لفظوں میں مفرد ہے۔ (۳) اَلْمُهْتَدِ (اسم فاعل) اصل میں اَلْمُهْتَدِیْ تھا ی کو ساقط کردیا ہے۔ مصدر اِهْتِدَاءٌ: راہ پانا (۴) لَهُمْ کی ضمیر مَنْ کی طرف لوٹتی ہے مَنْ معنیً جمع ہے (۵) عَلٰی وُجُوْهِهِمْ، مَاشِیْنَ سے متعلق ہوکر نَحْشُرُهُمْ کی ضمیر مفعول سے حال ہے اسی طرح عُمْیًا وغیرہ بھی احوال مترادفہ ہیں۔

عُمۡيًا	اندھے	وَّرُفَاتًا	اور چورا	فِيۡهِ	اس میں
وَّبُكۡمًا	گونگے	ءَاِنَّا	کیا یقیناً ہم	فَاَبَى	پس انکار کیا
وَّصُمًّا	اور بہرے	لَمَبۡعُوۡثُوۡنَ	البتہ اٹھائے جائیں گے	الظّٰلِمُوۡنَ	ظالموں نے
مَاۡوٰٮهُمۡ	ان کا ٹھکانہ	خَلۡقًا جَدِيۡدًا (۳)	از سرِ نو؟	اِلَّا	بجز
جَهَنَّمُ	دوزخ (ہے)	اَوَلَمۡ يَرَوۡا	کیا اور نہیں دیکھا انھوں نے	كُفُوۡرًا	کفر (کے)
كُلَّمَا	جب بھی	اَنَّ اللّٰهَ	کہ اللہ تعالیٰ	قُلْ	کہیے
خَبَتۡ (۱)	دھیمی پڑے گی	الَّذِىۡ	جنھوں نے	لَّوۡ	اگر
زِدۡنٰهُمۡ	(تو) زیادہ کردیں گے انکو	خَلَقَ	پیدا کیا	اَنۡتُمۡ (۶)	تم
سَعِيۡرًا	بطور سُلگنے کے	السَّمٰوٰتِ	آسمانوں کو	تَمۡلِكُوۡنَ	مالک ہوتے
ذٰلِكَ	یہ	وَالۡاَرۡضَ	اور زمین کو	خَزَآٮِٕنَ	خزانوں کے
جَزَآؤُهُمۡ	ان کی سزا (ہے)	قَادِرٌ	قادر ہیں	رَحۡمَةِ رَبِّىۡۤ	میرے رب کی رحمت کے
بِاَنَّهُمۡ (۲)	اس وجہ سے کہ انھوں نے	عَلٰۤى اَنۡ	اس بات پر کہ	اِذًا	تب تو
كَفَرُوۡا	انکار کیا	يَّخۡلُقَ	پیدا کریں وہ	لَّاَمۡسَكۡتُمۡ	ضرور ہاتھ روک لیتے تم
بِاٰيٰتِنَا	ہماری آیتوں کا	مِثۡلَهُمۡ	ان جیسوں کو	خَشۡيَةَ	اندیشہ سے
وَقَالُوۡۤا	اور انھوں نے کہا	وَجَعَلَ (۴)	اور مقرر کی ہے (اللہ نے)	الۡاِنۡفَاقِ (۷)	خرچ ہوجانے کے
ءَاِذَا	کیا جب	لَهُمۡ	ان کے لئے	وَكَانَ	اور ہے
كُنَّا	ہوجائیں گے ہم	اَجَلًا	ایک مدت	الۡاِنۡسَانُ	انسان
عِظَامًا	ہڈیاں	لَّا رَيۡبَ (۵)	کوئی شک نہیں	قَتُوۡرًا (۸)	بڑا تنگ دل

(۱) خَبَا (ن) خَبْوًا وَ خُبُوًّا: بجھنا، دھیما پڑنا۔ سَعِيْرًا (فَعِيْلٌ بمعنی مفعول) تمیز ہے، نسبت کے ابہام کو دور کرتی ہے (۲) بِأَنَّهُمْ إلخ مصدر جزَاءٌ سے متعلق ہے (۳) خَلْقًا جَدِيْدًا مفعول مطلق ہے من غير لفظ المصدر اور تاکید کے لئے ہے أی بعثًا جديدًا (۴) جملہ جَعَلَ معطوف ہے أَوَلَمْ يرَوْا پر اور چونکہ جملہ أَوَلَمْ يرَوْا، قَدَرَ کے معنی دیتا ہے اس لئے انشائیہ ہوکر بھی اس پر جملہ خبریہ کا عطف درست ہے (۵) لا رَيْبَ فيه صفت ہے أَجلًا کی (۶) أَنْتُمْ باب اشتغال (مَا أُضمر عامله على شريطة التفسير) سے ہے کیونکہ لَوْ کے بعد فعل کا آنا ضروری ہے یا أنتم کی تقدیر كُنْتُمْ ہے (۷) إِنْفَاقَ (افعال) یہاں لازم ہے یعنی خرچ ہوجانا (۸) قَتُوْرٌ صفت مشبہ ہے یعنی کنجوس طبیعت آدمی قَتَرَ (ن،ض) قَتْرًا وَ قُتُوْرًا: بہت ہی کم خرچ کرنا، کنجوسی کرنا ۱۲

اب سورت کے آخر میں منکرین رسالت وآخرت کوان کا انجام سنایا جارہا ہے کہ اگر تم نے قرآن کی دعوت قبول نہ کی تو دنیا میں بھی تمہارا بُرا حال ہوگا اور آخرت میں بھی تمہارا بُرا حشر ہوگا: ــــ اور اللہ تعالیٰ جس کو راہ پر لاویں وہی راہ یاب ہے اور جن کو گمراہ کردیں: آپ ان کے لئے اللہ تعالیٰ کے سوا کوئی مددگار نہ پائیں گے ــــ یعنی جو لوگ ہدایت پانے کے خواہش مند ہیں اللہ تعالیٰ ان کو راہ پر لے آتے ہیں یہی لوگ اللہ تعالیٰ کے محبوب ومقبول بندے ہیں ــــ اور جو لوگ ہدایت کے خواہش مند ہی نہیں گمراہی ان کو پسند ہے اللہ تعالیٰ ان کو ان کی پسندیدہ راہوں پر ڈال دیتے ہیں اور حق کے راستہ سے بچلا دیتے ہیں۔ یہی لوگ اللہ تعالیٰ کے نافرمان بندے ہیں ان کا دنیا میں کوئی حامی اور کارساز نہیں ــــ اور ہم قیامت کے دن منہ کے بل چلا کر، اور اندھا، بہرا اور گونگا بنا کر ان کو میدان حشر میں اکٹھا کریں گے ــــ کفار کو قیامت کے دن سر کے بل چلایا جائے گا۔ بخاری ومسلم میں حدیث ہے کہ ایک شخص نے دریافت کیا: یارسول اللہ! کفار کو منہ کے بل چلا کر کس طرح اکٹھا کیا جائے گا؟ یعنی آدمی چلتا تو پیروں سے ہے سر کے بل کیسے چلایا جائے گا؟ آنحضرت ﷺ نے فرمایا: ''جو اللہ پیروں سے چلاتا ہے کیا وہ اس پر قادر نہیں کہ سر کے بل چلائے؟!'' (مشکوۃ حدیث ۵۵۳۷) حضرت قتادہ رحمہ اللہ کو جب یہ حدیث پہنچی تو انھوں نے جواب دیا: کیوں نہیں! وہ ضرور اس پر قادر ہے۔ قسم ہے ہمارے رب کی عزت کی! (قرطبی) اور ترمذی شریف کی روایت میں یہ مضمون زائد ہے کہ: ''سنو! وہ منہ کے بل چلیں گے اور ہر ٹیلے اور کانٹے سے بچتے ہوئے چلیں گے'' (مشکوۃ حدیث ۵۵۴۶) ــ یعنی سر کے بل چلنے کی کیفیت تو ہم نہیں جانتے مگر اس بات پر ہمارا ایمان ہے کہ ایسا اللہ تعالیٰ کرسکتے ہیں ــــ ان کا ٹھکانہ دوزخ ہے۔ جب بھی اس کی آگ دھیمی پڑے گی ہم ان کی آگ کی دَہک بڑھادیں گے ــــ یعنی مقررہ اندازے سے عذاب کم نہیں ہونے دیا جائے گا جب بھی آگ کی لپٹیں ہلکی ہونگی دوزخ کو اور دہکایا جائے گا اور جب بھی ان کی کھالیں جل جائیں گی دوسری کھالیں بدل دی جائیں گی تاکہ وہ بار بار عذاب کا مزہ چکھیں ــــ یہ ان کی سزا ہے بایں وجہ کہ انھوں نے ہماری آیتوں کا انکار کیا اور کہا: کیا جب ہم ہڈیاں اور چورا ہوجائیں گے تو کیا واقعی ہم ازسرِ نو پیدا کرکے اٹھائے جائیں گے؟ ــــ یعنی یہ بات بعید از عقل ہے! جواب سنئے! ــــ کیا انھوں نے یہ بات نہیں جانی کہ جس خدا نے آسمانوں اور زمین کو پیدا کیا ہے وہ ان جیسوں کو پیدا کرنے پر پوری طرح قدرت رکھتا ہے ــــ یعنی سوچو، آسمان وزمین کا پیدا کرنا بھاری ہے یا انسانوں کا؟ جس خدا نے اتنے بڑے اجسام پیدا کئے ہیں اس کے لئے انسان جیسی چھوٹی سی مخلوق کا پیدا کرنا کیا مشکل ہے؟ کچھ بھی مشکل نہیں! ــــ مگر قبروں سے اٹھنے اور دوبارہ زندہ ہونے کا ایک وقت مقرر ہے ــــ اور اس نے ان کے لئے ایک وقت مقرر رکھا ہے

جس میں ذرہ برابر شک نہیں، پھر بھی اکثر لوگ انکار ہی پر جمے ہوئے ہیں ـــــ اور اگر کوئی سوچے کہ ٹھیک ہے دوبارہ زندہ ہونے کا تو وقت مقرر ہے مگر دنیا میں عذاب سے کیا مانع ہے؟ تو ـــــ آپ کہیے: اگر تم میرے رب کی رحمت کے خزانوں کے مالک ہوتے تو ضرور خرچ ہو جانے کے اندیشہ سے ہاتھ روک لیتے اور انسان بڑا ہی تنگ دل ہے ـــــ مگر اللہ تعالیٰ ایسے نہیں، ان کو نہ خرچ ہو جانے کا اندیشہ ہے نہ وہ تنگ دل یا تنگ دست ہیں یعنی یہ اللہ تعالیٰ کی رحمت ومہربانی ہے کہ وہ ایسے نالائقوں پر بھی دنیا میں کرم کی بارش برسا رہے ہیں۔ منکرین مزے اڑا رہے ہیں۔ عیش سے دن کاٹ رہے ہیں اور اللہ تعالیٰ ان کو مہلت دیئے ہوئے ہیں تا کہ دیر سویر وہ سنبھلنا چاہیں تو سنبھل جائیں۔

اللہ تعالیٰ کا بے پایاں کرم ہے، وہ اپنے دشمن کو بھی بڑا عیش دیتے ہیں۔ یہ ان کا قانونِ امہال ہے، اس سے کوئی دھوکہ نہ کھائے

وَلَقَدْ اٰتَيْنَا مُوْسٰى تِسْعَ اٰيٰتٍۢ بَيِّنٰتٍ فَسْـَٔلْ بَنِيْٓ اِسْرَآءِيْلَ اِذْ جَآءَهُمْ فَقَالَ لَهٗ فِرْعَوْنُ اِنِّىْ لَاَظُنُّكَ يٰمُوْسٰى مَسْحُوْرًا ﴿١٠١﴾ قَالَ لَقَدْ عَلِمْتَ مَآ اَنْزَلَ هٰٓؤُلَآءِ اِلَّا رَبُّ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ بَصَآئِرَ ۚ وَاِنِّىْ لَاَظُنُّكَ يٰفِرْعَوْنُ مَثْبُوْرًا ﴿١٠٢﴾ فَاَرَادَ اَنْ يَّسْتَفِزَّهُمْ مِّنَ الْاَرْضِ فَاَغْرَقْنٰهُ وَمَنْ مَّعَهٗ جَمِيْعًا ﴿١٠٣﴾ وَّقُلْنَا مِنْۢ بَعْدِهٖ لِبَنِيْٓ اِسْرَآءِيْلَ اسْكُنُوا الْاَرْضَ فَاِذَا جَآءَ وَعْدُ الْاٰخِرَةِ جِئْنَا بِكُمْ لَفِيْفًا ﴿١٠٤﴾

وَلَقَدْ	اور البتہ تحقیق	بَیِّنٰتٍ (۱)	کھلی	جَآءَھُمْ	پہنچے موسیٰ ان کے پاس
اٰتَیْنَا	ہم نے دیں	فَسْـَٔلْ (۲)	پس پوچھ	فَقَالَ لَهٗ	پس کہا اُن سے
مُوْسٰی	موسیٰ کو	بَنِیْٓ اِسْرَآءِیْلَ	بنی اسرائیل سے (اگر	فِرْعَوْنُ	فرعون نے
تِسْعَ	نو		یقین نہ ہو)	اِنِّیْ	بیشک میں
اٰیٰتٍ	نشانیاں (معجزے)	اِذْ (۳)	(یاد کرو) جب	لَاَظُنُّكَ	یقیناً گمان کرتا ہوں تجھ کو

(۱) بینات صفت ہے آیات کی (۲) فَا جزائیہ ہے اور شرط محذوف ہے أی إن کنت فی ریب۔ (۳) إِذْ ظرف ہے اُذْکُرْ محذوف کا اور فقال میں فا عاطفہ ہے اور معطوف علیہ مقدر ہے أی إذا جاء هم فبلّغهم الرسالة فقال له فرعون إلخ (جمل)

یٰمُوْسٰی	اے موسیٰ	وَاِنِّیْ	اور بیشک میں	وَّقُلْنَا	اور کہا ہم نے
مَسْحُوْرًا	سحر زدہ (عقل کا مارا)	لَاَظُنُّكَ	البتہ گمان کرتا ہوں تجھ کو	مِنْۢ بَعْدِهٖ	فرعون کے (ڈوبنے
قَالَ	کہا موسیٰ نے	يٰفِرْعَوْنُ	اے فرعون		کے) بعد
لَقَدْ	البتہ تحقیق	مَثْبُوْرًا[۳]	شامت زدہ!	لِبَنِیْٓ اِسْرَآءِيْلَ	بنی اسرائیل سے
عَلِمْتَ	جانتا ہے تو	فَاَرَادَ	پس چاہا اس نے	اسْكُنُوا	رہو سہو
مَآ[۱]	(کہ) نہیں	اَنْ	کہ	الْاَرْضَ	زمین میں
اَنْزَلَ	اتارا ہے	يَّسْتَفِزَّهُمْ[۴]	پیر اکھاڑ دے ان کے	فَاِذَا	پھر جب
هٰٓؤُلَآءِ	ان (نشانیوں) کو	مِّنَ الْاَرْضِ	سرزمین (مصر) سے	جَآءَ	آئے گا
اِلَّا	مگر	فَاَغْرَقْنٰهُ	سو ڈبو دیا ہم نے اسکو	وَعْدُ الْاٰخِرَةِ	آخرت کا وعدہ
رَبُّ السَّمٰوٰتِ	آسمانوں اور زمین	وَمَنْ	اور ان کو جو	جِئْنَا	(تو) لائیں گے ہم
وَالْاَرْضِ	کے رب نے	مَّعَهٗ	اس کے ساتھ تھے	بِكُمْ	تم کو
بَصَآئِرَ[۲]	بصیرت افروز بنا کر	جَمِيْعًا	سبھی کو	لَفِيْفًا[۵]	اکٹھا

پچھلی آیت میں مشرکین مکہ کو ان کا دنیوی اور اُخروی انجام سنایا گیا تھا اب ان کو فرعون اور فرعونیوں کا حال سنایا جاتا ہے جن کا دبدبہ مکہ والوں سے کہیں زیادہ تھا، وہ صدیوں پرانی حکومت کے مالک تھے مگر جب انھوں نے پیغام حق قبول کرنے سے انکار کیا اور اپنے پیغمبر کو خبطی تک کہہ ڈالا تو اللہ تعالیٰ نے دنیا ہی میں ان کو پکڑ لیا اور سب کو غرقاب کر دیا اور آخرت کا سخت معاملہ تو ابھی باقی ہے۔[۶]

---

(۱) مَا أَنْزَلَ إلخ عَلِمْتَ کے دومفعولوں کے قائم مقام ہے (۲) بَصَائِرَ حال ہے هؤلاء سے اور یہ بَصِيْرَةٌ کی جمع ہے جس کے معنی ہیں دل کی بینائی، سمجھ بوجھ اور حال ہونے کی صورت میں ترجمہ ہے کھلی، واضح، روشن، بصیرت افروز، دل کی بینائی بڑھانے والی (۳) مَثْبُوْرًا مفعول ثانی ہے اَظُنُّ کا اور اسم مفعول ہے جس کے معنی ہیں خیر سے محروم، شامت زدہ، تباہ حال، کم بختی کا مارا، ثَبَرَهٗ (ن) ثَبْرًا: لعنت کرنا، دھتکارنا، محروم کرنا، ہلاک کرنا (۴) يَسْتَفِزُّ کے لئے دیکھئے آیت ۶۴ کا حاشیہ (۵) لَفِيْفًا حال ہے كُمْ سے اور لفیف صفت مشبہ ہے جس کے معنی ہیں آدمیوں کا بڑا گروہ جس میں مختلف قبائل کے آدمی ہوں۔ لَفَّ (ن) الثوبَ: کپڑا لپیٹنا
(۶) یہاں یاد رکھنے کا نکتہ یہ ہے کہ مشرکین کو جب ان کا دنیوی انجام سنایا تو بات مختصر کی اور جب ان کو اخروی انجام سنایا تو تفصیل کی اور مثال میں اس کے برعکس ہے۔ فرعونیوں کا دنیوی انجام مفصل بیان کیا گیا ہے اور اُخروی انجام کی طرف صرف اشارہ کیا گیا ہے تا کہ ایک کا اجمال دوسرے کی تفصیل سے مل کر مضمون تام ہو جائے ۱۲

اور واقعہ یہ ہے کہ ہم نے موسیٰ کو نو نہایت واضح نشانیاں عطا کیں —— یعنی مکہ والے جو بار بار معجزات کی فرمائش کررہے ہیں اور کہتے ہیں کہ اگر ہماری مطلوبہ نشانیاں دکھادی جائیں تو ہم ایمان لے آئیں گے وہ سن لیں کہ فرعونیوں کے سامنے پیش کرنے کے لئے اللہ تعالیٰ نے موسیٰ علیہ السلام کو نو کھلی نشانیاں دی تھیں مگر ان کا انجام کیا ہوا؟ کیا فرعون اور اس کی قوم معجزات دیکھ کر ایمان لے آئی؟ نہیں بلکہ ان کی سرکشی اور بڑھ گئی —— وہ نو معجزات یہ تھے (۱) عصائے موسیٰ جو زمین میں پڑ ڈالنے سے اژدہا بن جاتا تھا (۲) ید بیضاء جو بغل میں دبا کر نکالنے سے سورج کی طرح چمکنے لگتا تھا (۳) پانی کا سیلاب (۴) ٹڈی دَل (۵) جوئیں یا چیچڑی یا سُرسُری (۶) مینڈک (۷) خون (۸) قحط سالیاں (۹) پھلوں کی کمی —— پہلی دو نشانیاں قرآن پاک میں متعدد جگہ مذکور ہیں اس کے بعد کی چار نشانیاں سورۃ الاعراف آیت ۱۳۳ میں مذکور ہیں اور آخری دو نشانیاں سورۃ الاعراف آیت ۱۳۰ میں مذکور ہیں۔

یہ سب موسیٰ علیہ السلام کے واضح معجزات تھے جو فرعونیوں کی آنکھیں کھولنے کے لئے کافی تھے مگر انھوں نے ایمان لانے کا بار بار عہد کرکے بھی خلاف ورزی کی اور بالآخر تباہ ہوئے۔ آج یہ مکہ والے جو معجزات کی فرمائش کررہے ہیں تو کیا وہ مان جائیں گے؟ اور نہیں مانیں گے تو ان کا حشر ان کے برادروں سے کچھ مختلف ہوگا؟

اور معجزات موسوی کے بارے میں اگر تمہیں کچھ شک ہو —— تو بنی اسرائیل سے تحقیق کرلو —— ان کے باخبر اور منصف مزاج علماء قرآن پاک کے بیان کی حرف بہ حرف تصدیق کریں گے۔

اور یاد کرو —— جب موسیٰ ان کے پاس پہنچے —— اور ان کو اللہ تعالیٰ کا پیغام سنایا —— تو فرعون نے ان سے کہا: اے موسیٰ! میرے خیال میں تو تو سحر زدہ ہے! —— رسول وسول کچھ نہیں بلکہ کسی نے تجھ پر جادو کردیا ہے جس سے تیری عقل ماری گئی ہے اور بہکی بہکی باتیں کرنے لگا ہے —— موسیٰ نے جواب دیا: تو بخوبی جانتا ہے کہ یہ بصیرت افروز نشانیاں آسمانوں اور زمین کے پروردگار نے نازل فرمائی ہیں —— یعنی زبان سے تو انکار کرتا ہے مگر تیرا دل خوب جانتا ہے کہ یہ عظیم الشان نشانیاں تیری اور تیری قوم کی آنکھیں کھولنے کے لئے رب کائنات نے دکھلائی ہیں اور دل میں تو میری صداقت کو سمجھ گیا ہے مگر تیری زبان اقرار کرنے کے لئے تیار نہیں —— اور اے فرعون! میرے خیال میں تو تو تباہ حال آدمی ہے —— یہ جواب ترکی بہ ترکی ہے یعنی تباہی کی گھڑی تیرے سر پر کھڑی ہے مگر تو غافل ہے!

پس فرعون نے چاہا کہ سرزمین مصر سے ان کے پیر اکھاڑ دے —— چنانچہ ستم کے پہاڑ توڑنے شروع کئے۔ اور طرح طرح کے ظلم کا ان کو تختۂ مشق بنایا تاکہ ان کو گھبرادے اور سرزمین مصر چھوڑنے پر مجبور کردے —— پس ہم نے اس کو اور جو لوگ اس کے ساتھ تھے سب کو غرقاب کردیا —— یعنی اس سے پہلے کہ وہ اللہ کے بندوں کو مٹائے

وہ خود ہی ملیا میٹ ہو گیا ــــــ اور ہم نے اس کے بعد ــــــ یعنی فرعون کی ہلاکت کے بعد ــــــ بنی اسرائیل سے کہہ دیا کہ تم زمین میں رہو سہو ــــــ اب تم فرعون کی محکومی اور غلامی سے آزاد ہو، چین سے زندگی بسر کرو ــــــ پھر جب آخرت کا وعدہ آئے گا تو ہم تم سب کو اکٹھا کر کے حاضر کریں گے ــــــ یعنی قیامت کے دن ہم تم کو اور فرعونیوں کو ایک مرتبہ پھر اکٹھا کریں گے اور شقی وسعید اور جنتی اور جہنمی ہونے کا دائمی فیصلہ کر دیں گے۔

فرعون کی تباہی کا حال مشرکین مکہ کو اس لئے سنایا گیا ہے کہ وہ بھی اس فکر میں تھے کہ مسلمانوں کو اور آنحضرت ﷺ کو سرزمین مکہ سے گھبرادیں، چنانچہ وہ طرح طرح سے مسلمانوں کو ستاتے تھے اور آنحضرت ﷺ کے ساتھ نازیبا برتاؤ کرتے تھے اس پر انہیں سنایا گیا کہ فرعون نے موسیٰ علیہ السلام اور بنی اسرائیل کے ساتھ یہی کچھ کرنا چاہا تھا مگر ہوا کیا؟ فرعون اور اس کے ساتھی ناپید کر دیئے گئے اور زمین پر موسیٰ علیہ السلام اور ان کی قوم کو بسایا گیا۔ پس آج اگر تم ان کی روش پر چل رہے ہو تو سن لو تمہارا انجام بھی ان سے کچھ مختلف نہ ہوگا۔

ملحوظہ: إِذْ جَاءَهُمْ میں ضمیر جمع بنی اسرائیل کی طرف لوٹتی ہے اور وہی موسیٰ علیہ السلام کی حقیقی امت ہیں۔ موسیٰ علیہ السلام کی بعثت درحقیقت بنی اسرائیل کی طرف ہے اور فرعون اور اس کی قوم موسیٰ علیہ السلام کی ضمناً امت ہیں جیسا کہ رسول انسانوں کی طرف مبعوث کئے جاتے ہیں اور جنات ضمناً ان کی امت ہوتے ہیں۔ یہی تفاوت ظاہر کرنے کے لئے إِذْ جَاءَهُمْ کو فَقَالَ لَهُ فِرْعَوْنُ سے پہلے لایا گیا ہے اگر بعد میں لایا جاتا تو ضمیر فرعون کی طرف بھی لوٹتی اور اس کا موسیٰ علیہ السلام کی اصلی امت ہونا لازم آتا جو خلاف واقعہ تھا۔ واللہ اعلم۔

جواب بُرکی بہ بُرکی جبکہ تسامح اور رعایت میں کوئی مصلحت نہ ہو: کرم اور کمالِ اخلاق کے منافی نہیں

وَبِالْحَقِّ أَنْزَلْنَاهُ وَبِالْحَقِّ نَزَلَ ۗ وَمَا أَرْسَلْنَاكَ إِلَّا مُبَشِّرًا وَنَذِيرًا ﴿١٠٥﴾ وَقُرْآنًا فَرَقْنَاهُ لِتَقْرَأَهُ عَلَى النَّاسِ عَلَىٰ مُكْثٍ وَنَزَّلْنَاهُ تَنْزِيلًا ﴿١٠٦﴾ قُلْ آمِنُوا بِهِ أَوْ لَا تُؤْمِنُوا ۚ إِنَّ الَّذِينَ أُوتُوا الْعِلْمَ مِنْ قَبْلِهِ إِذَا يُتْلَىٰ عَلَيْهِمْ يَخِرُّونَ لِلْأَذْقَانِ سُجَّدًا ﴿١٠٧﴾ وَيَقُولُونَ سُبْحَانَ رَبِّنَا إِنْ كَانَ وَعْدُ رَبِّنَا لَمَفْعُولًا ﴿١٠٨﴾ وَيَخِرُّونَ لِلْأَذْقَانِ يَبْكُونَ وَيَزِيدُهُمْ خُشُوعًا ۩ ﴿١٠٩﴾ قُلِ ادْعُوا اللَّهَ أَوِ ادْعُوا الرَّحْمَٰنَ ۖ أَيًّا مَا تَدْعُوا فَلَهُ الْأَسْمَاءُ الْحُسْنَىٰ ۚ وَلَا تَجْهَرْ بِصَلَاتِكَ وَلَا تُخَافِتْ بِهَا وَابْتَغِ بَيْنَ ذَٰلِكَ سَبِيلًا ﴿١١٠﴾ وَقُلِ الْحَمْدُ لِلَّهِ الَّذِي لَمْ

السجدۃ ۳

يَتَّخِذْ وَلَدًا وَّلَمْ يَكُنْ لَّهٗ شَرِيْكٌ فِى الْمُلْكِ وَلَمْ يَكُنْ لَّهٗ وَلِىٌّ مِّنَ الذُّلِّ وَكَبِّرْهُ تَكْبِيْرًا ﴿۱۱۱﴾ ع

وَبِالْحَقِّ(۱)	اور حق کے ساتھ	عَلٰى مُكْثٍ(۵)	ٹھیر ٹھیر کر	عَلَيْهِمْ	ان کے سامنے
اَنْزَلْنٰهُ	اتارا ہم نے قرآن کو	وَّنَزَّلْنٰهُ	اور بتدریج اتارا ہم نے اسکو	يَخِرُّوْنَ(۷)	(تو) گرتے ہیں وہ
وَبِالْحَقِّ(۱)	اور حق کے ساتھ	تَنْزِيْلًا	آہستہ آہستہ اتارنا	لِلْاَذْقَانِ(۸)	ٹھوڑیوں کے بل
نَزَلَ	اُترا وہ	قُلْ	آپ کہئے	سُجَّدًا	سجدہ کرتے ہوئے
وَمَآ	اور نہیں	اٰمِنُوْا(۶)	ایمان لاؤ تم	وَّيَقُوْلُوْنَ	اور کہتے ہیں وہ
اَرْسَلْنٰكَ	بھیجا ہم نے آپ کو	بِهٖٓ	اس قرآن پر	سُبْحٰنَ	پاک ہے
اِلَّا	مگر	اَوْ لَا تُؤْمِنُوْا	یا ایمان نہ لاؤ تم	رَبِّنَآ	ہمارا پروردگار
مُبَشِّرًا(۲)	خوشخبری سنانے والا	اِنَّ الَّذِيْنَ	بیشک جو لوگ	اِنْ كَانَ(۹)	بیشک ہے
وَّنَذِيْرًا	اور ڈرانے والا	اُوْتُوا	دیئے گئے ہیں	وَعْدُ رَبِّنَا	ہمارے رب کا وعدہ
وَقُرْاٰنًا(۳)	اور قرآن کو	الْعِلْمَ	علم	لَمَفْعُوْلًا	پورا ہو کر رہنے والا
فَرَقْنٰهُ	جدا جدا کیا ہم نے اس کو	مِنْ قَبْلِهٖٓ	قرآن سے پہلے	وَيَخِرُّوْنَ	اور گرتے ہیں وہ
لِتَقْرَاَهٗ	تا کہ پڑھیں آپ اس کو	اِذَا يُتْلٰى	جب تلاوت کیا جاتا	لِلْاَذْقَانِ	ٹھوڑیوں کے بل
عَلَى النَّاسِ(۴)	لوگوں کے سامنے		ہے (قرآن)	يَبْكُوْنَ(۱۰)	روتے ہوئے

(۱) دونوں جار مجرور بعد میں آنے والے فعل سے متعلق ہیں اور ب ملابست کی ہے (۲) مُبَشِّرًا اور نَذِيْرًا حال ہیں مفعول کی ضمیر سے (۳) قُرْآنًا باب اشتغال سے ہونے کی وجہ سے منصوب ہے یعنی ما أضمر عامله علي شريطة التفسير ہے (۴) على الناس اور عَلٰى مُكْثٍ دونوں لِتَقْرَأَهٗ سے متعلق ہیں اور ایک جنس کے دو حرف جر ایک فعل سے متعلق اس لئے ہوئے ہیں کہ دونوں کے معنی الگ الگ ہیں پہلے جار مجرور مفعول بہ کی جگہ میں ہیں اور دوسرے حال کی جگہ میں ہیں أي مُتَمَهِّلًا و مُتَرَسِّلًا (۵) مُكْث مصدر ہے اس کا باب نصر اور کرم ہے جس کے معنی ہیں انتظار کرتے ہوئے توقف کرنا یعنی اس کے مفہوم میں انتظار داخل ہے (۶) اٰمِنُوْا فعل امر ہے اور جواب امر محذوف ہے (۷) يَخِرُّوْنَ، خَرٌّ سے ہے جس کے معنی ہیں کسی چیز کا اوپر سے اس طرح گرنا کہ اس کے گرنے سے خَرِير کی آواز پیدا ہو۔ خریر: پانی کی روانی کی آواز یا ہوا کا سناٹا (۸) ذَقَنٌ کی جمع ہے جس کے اصلی معنی ہیں ٹھوڑی اور مجازی معنی ہیں چہرہ یہاں مجازی معنی مراد ہیں (۹) إِنْ مخففه من المثقله ہے اور اس کا اسم ضمیر شان ہے اور جملہ کان خبر ہے اور لمفعولاً پر لام فارقہ ہے (۱۰) يَبْكُوْنَ جملہ فعلیہ حال ہے فاعل کی ضمیر سے أي باكين من خشية الله۔

وَيَزِيدُهُمْ	اور بڑھاتا قرآن ان کا	بِصَلَاتِكَ	اپنی نماز	وَلَدًا	کسی اولاد کو
خُشُوعًا	خشوع	وَلَا تُخَافِتْ	اور نہ چپکے چپکے پڑھو	وَّلَمْ يَكُنْ	اور نہیں ہے
قُلِ	آپ کہئے	بِهَا	اپنی نماز	لَّهٗ	اس کے لئے
ادْعُوا اللّٰهَ	پکارو تم اللہ کو	وَابْتَغِ	اور تلاش کرو	شَرِيكٌ	کوئی ساجھی
أَوِ ادْعُوا	یا پکارو تم	بَيْنَ ذٰلِكَ	ان دونوں کے درمیان	فِي الْمُلْكِ	سلطنت میں
الرَّحْمٰنَ	رحمٰن کو	سَبِيلًا	کوئی راہ	وَلَمْ يَكُنْ لَّهٗ	اور نہیں ہے اس کیلئے
أَيًّا مَّا (۱)	جس کو بھی	وَقُلِ	اور آپ کہئے	وَلِيٌّ	کوئی مددگار
تَدْعُوا	پکاروگے تم	الْحَمْدُ	تمام تعریفیں	مِّنَ الذُّلِّ (۲)	کمزوری کی وجہ سے
فَلَهُ الْأَسْمَاءُ	پس اس کیلئے نام ہیں	لِلّٰهِ	اس اللہ کے لئے ہیں	وَكَبِّرْهُ	اور بڑائی بیان کیجئے
الْحُسْنٰى	اچھے اچھے	الَّذِي	جس نے		آپ ان کی
وَلَا تَجْهَرْ	اور نہ پکار کر پڑھو	لَمْ يَتَّخِذْ	نہیں بنایا	تَكْبِيرًا	خوب بڑائی بیان کرنا

اور ضمناً معاد کا مسئلہ آ گیا۔ اب رسالت اور آخر میں توحید کا ذکر کر کے سورت ختم کی جاتی ہے۔ ارشاد ہے ـــــ اور ہم نے حق کے ساتھ قرآن کو نازل کیا ہے اور حق ہی کے ساتھ وہ نازل ہوا ہے ـــــ یعنی قرآن دینِ برحق لے کر آیا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے اس کو اسی لئے نازل کیا ہے کہ لوگ سچا دین سیکھیں اور وہ ٹھیک اس سچائی کے ساتھ لوگوں کے پاس پہنچ بھی گیا ہے۔ اب اس سے فائدہ اٹھانا لوگوں کا کام ہے ـــــ اور آپؐ کو ہم نے صرف خوش خبری سنانے والا اور ڈرانے والا بنا کر بھیجا ہے ـــــ یعنی آپؐ کا کام صرف یہ ہے کہ لوگوں کے سامنے یہ قرآن پیش کر دیں اور حق بات ان کو پہنچا دیں اور بتا دیں کہ جو سچی بات مان لے گا اس کا دنیا و آخرت میں بھلا ہوگا اور جو نہیں مانے گا وہ اپنے نقصان کا ذمہ دار ہوگا۔ پیغمبر علیہ الصلوٰۃ والسلام کی کوئی ذمہ داری نہیں۔

قرآن کریم تھوڑا تھوڑا نازل کیا جاتا تھا۔ منکرین کو اس پر اشکال تھا کہ دفعۃً واحدۃً کیوں نازل نہیں کیا گیا؟ کیا اللہ تعالیٰ کو بھی سوچنے کی ضرورت ہے جو تھوڑا تھوڑا بنا کر بھیج رہے ہیں؟ سورۃ الفرقان آیت ۳۲ میں یہ اعتراض مذکور ہے،

(۱) أَيٌّ کلمہ شرط ہے اور ما زائدہ ہے اور أَيًّا مَّا مفعول بہ ہے تَدْعُوْا کا اور تَدْعُوْا کا جازم بھی یہی ہے پس یہ عامل بھی ہے اور معمول بھی، اور جزا محذوف ہے أی فهو حَسَن (۲) اَلذُّلّ مصدر ہے ذَلَّ يَذِلُّ کا۔ دوسرے کے دباؤ اور قہر کی بنا پر جو ذلت ہو اس کو ذُلّ کہتے ہیں اور بغیر قہر و دباؤ کے خود اپنی سرکشی اور سخت گیری کے بعد جو ذلت حاصل ہو وہ ذِلّ کہلاتی ہے ۱۲

اور وہاں اس کا جواب بھی ہے۔ یہاں بھی اس کی حکمت بیان کی جاتی ہے: ارشاد ہے ــــ اور قرآن کو ہم نے جدا جدا کیا تا کہ آپؐ اس کو ٹھیر ٹھیر کر لوگوں کے سامنے پڑھیں، اور ہم نے اس کو بتدریج تھوڑا تھوڑا کر کے اتارا ہے ــــ اس آیت میں دو باتوں کی ایک ہی حکمت بیان کی گئی ہے: ایک: قرآن کریم کی عبارت دوسری کتابوں کی طرح مسلسل کیوں نہیں؟ دوم: پورا قرآن ایک ساتھ کیوں نہیں اتارا گیا؟ جواب یہ ہے کہ ایسا سہولتِ تعلیم کے لئے کیا گیا ہے۔

پہلی بات کی تفصیل یہ ہے کہ قرآن کریم کا انداز بیان دوسری کتابوں سے مختلف ہے۔ اس کو چھوٹی بڑی ایک سو چودہ سورتوں میں تقسیم کیا گیا ہے۔ پھر ہر سورت کو آیتوں میں بانٹ کر جدا جدا کیا ہے۔ اور لمبی آیتوں کے درمیان بھی وقفے رکھے گئے ہیں، تا کہ لوگوں کے لئے پڑھنے میں، یاد کرنے میں اور سمجھنے میں سہولت ہو۔ اگر عبارت مسلسل ہوتی تو بات سمجھنے میں دقت ہوتی۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کا ارشاد ہے: ''قرآن کریم پانچ پانچ آیتیں کر کے سیکھو، کیونکہ جبرئیل علیہ السلام پانچ پانچ آیتیں اتارا کرتے تھے'' (رواہ البیہقی فی شعب الایمان) اور ابونضرہ فرماتے ہیں کہ حضرت ابوسعید خدری رضی اللہ عنہ ہمیں صبح پانچ آیتیں پڑھاتے تھے، اور شام پانچ آیتیں۔ اور فرماتے تھے کہ جبرئیل علیہ السلام بھی پانچ پانچ آیتیں لاتے تھے (حوالہ بالا)

اور دوسری بات کی تفصیل یہ ہے کہ نزولِ قرآن کے وقت قرآن کو بچوں نے نہیں، بلکہ بڑوں نے حفظ کیا تھا، اور ہر عمر کے بڑوں نے حفظ کیا تھا۔ اور جب ۲۳ سال میں قرآن کا نزول مکمل ہوا تو ہزاروں مرد وزن پورے قرآن کے یا اس کے کچھ حصہ کے حافظ موجود تھے۔ یہ تدریجی نزول کی برکت تھی۔

آیت پاک کا اچھی طرح مطلب سمجھنے کے لئے یہ بات بھی سمجھ لینی چاہئے کہ آج تو ہمیں چھپے ہوئے قرآن میسر ہیں ہم اس میں سے ایک مقدار متعین کر کے کسی بچہ کو یا بڑے کو دیدیتے ہیں اور وہ اپنے طور پر یاد کر لاتا ہے مگر آنحضرت ﷺ کے مبارک دور میں مطبوعہ قرآن تو کیا، ہاتھ سے لکھے ہوئے قرآن بھی عام طور پر لوگوں کو میسر نہیں تھے، اس زمانہ میں قرآن تلقین کے ذریعہ یاد کرایا جاتا تھا یعنی استاذ ایک آیت پڑھتا طالب علم اس کو دُہراتا۔ استاذ پھر پڑھتا طالب علم پھر دوہراتا۔ یہاں تک کہ وہ آیت یاد ہو جاتی۔ اب سوچئے اگر قرآن کریم مسلسل لمبی عبارت ہوتی تو اس کو کس طرح یاد کرایا جاتا؟ الگ الگ آیتیں ہونے کی وجہ سے ایک ایک آیت کر کے یاد کرانا آسان ہو گیا۔ لوگوں کے سامنے ٹھہر ٹھہر کر پڑھنے کا یہی مطلب ہے مسلسل ایک لمبی عبارت پڑھ کر سنا دی جائے تو اس کو یاد نہیں کیا جا سکتا اور ہر ہر آیت پر رُک رُک کر پڑھا جائے تو آسانی سے یاد بھی کیا جا سکتا ہے اور سمجھا بھی جا سکتا ہے۔

یہی وجہ ہے کہ جو سورتیں ابتدا میں نازل ہوئی ہیں ان کی آیتیں چھوٹی ہیں سورۃ المدثر پڑھ کر دیکھئے کتنی چھوٹی

آیتیں ہیں اور عبارت کی بندش کتنی مضبوط ہے ایک دو بار پڑھتے ہی یاد ہو جاتی ہیں بشرطیکہ عربی جانتا ہو پھر جب حفظ کرنے کی مشق ہو گئی تو بڑی آیتوں والی سورتیں نازل کی گئیں۔

فائدہ: سورتوں اور آیتوں میں قرآن کی تقسیم توقیفی ہے یعنی نزول قرآن کے ساتھ آسمان سے یہ تفصیلات بھی نازل ہوئی ہیں اور علمائے امت نے اس کے علاوہ اور بھی مختلف طرح سے قرآن کریم کو مفصل یعنی جدا جدا کیا ہے مثلاً:

① — حجاج بن یوسف کے زمانہ میں قرآن کریم کو تیس پاروں (ٹکڑوں) میں تقسیم کیا گیا۔ سورۃ الفاتحہ کے علاوہ باقی قرآن کو مساوی یا قریب بہ مساوی تیس حصوں میں بانٹ کر پہلے لفظ سے پارہ کا نام رکھا گیا پھر ہر پارہ کے چار مساوی حصے کئے گئے یعنی الرُّبع (چوتھائی) النِّصْفُ (آدھا) الثَّلٰثَۃُ (تین چوتھائی) کی اصطلاح مقرر کی گئی اور سورۃ الفاتحہ کو کسی پارہ میں شامل نہیں کیا گیا کیونکہ وہ سہارے قرآن کا فاتحہ یعنی دیباچہ ہے۔

② — اہل مصر و مغاربہ نے قرآن کو ساٹھ حصوں میں تقسیم کیا اور ہر حصہ کو حِزْب کے نام سے موسوم کیا جو تقریباً نصب پارہ ہوتا ہے پھر ہر حزب کے چار حصے کئے جن میں سے ہر ایک کو رُبْعِ حِزْب کہتے ہیں۔ عرب ممالک میں جو مصاحف رائج ہیں ان میں یہی تقسیم ہے۔

③ — تخمیس و تعشیر یعنی پانچ پانچ اور دس دس آیتوں پر نشانات بھی صحابہؓ اور تابعینؒ کے زمانہ سے لوگ لگاتے چلے آرہے ہیں۔ علامہ دانی فرماتے ہیں کہ اُمَّہاتِ مصاحف ہوں یا ان کے بعد کے قرآن، سب میں سورتوں اور سورتوں کی آیات کے شمار، اسی طرح خموس اور اعشار کی نشانی بنانے میں کوئی حرج نہیں، یہ کام بھی اولاً نصر بن عاصم لیثی بصری تابعی رحمہ اللہ کا ہے (قرآنی املا اور رسم الخط ص ۳۶) مگر اب مصاحف میں یہ علامات باقی نہیں ہیں صرف آیتوں کا شمار لکھا جاتا ہے۔

④ — آنحضرت ﷺ اور صحابہ کرام رضی اللہ عنہم نے پورے قرآن کو سات منزلوں میں تقسیم کیا تھا اور وہ اسی کے مطابق وِرد کرتے تھے وہ ایک ہفتہ میں قرآن کریم ختم کرتے تھے۔ یہ منازل فَمِیْ بِشَوْقٍ کے نام سے مشہور ہیں ف سے مراد الفاتحہ م سے مراد المائدہ ی سے یونس ب سے بنی اسرائیل ش الشعراء، و سے والصافات اور ق سے سورۂ قاف مراد ہے۔ ابوداؤد شریف میں روایت ہے کہ حضرت اَوس بن حذیفہ رضی اللہ عنہ قبیلۂ ثقیف کے وفد کے ساتھ خدمت نبوی میں حاضر ہوئے۔ آنحضرت ﷺ روزانہ اس وفد کے پاس عشا کی نماز کے بعد تشریف لے جاتے اور دین کی تعلیم دیتے ایک رات آپؐ دیر سے تشریف لے گئے تو اُن حضرات نے وجہ دریافت کی، آپؐ نے فرمایا کہ میرا قرآن کا وِرد باقی رہ گیا تھا اس کو پورا کرنے سے پہلے آنا مجھے پسند نہ آیا۔ اوس کہتے ہیں کہ میں نے صحابہ کرام سے دریافت کیا کہ آپ حضرات کس طرح قرآن کا وِرد کرتے ہیں؟ صحابہ نے بتایا کہ تین سورتیں (بقرہ، آل عمران اور نساء)

پانچ سورتیں (مائدہ، انعام، اعراف، انفال اور توبہ) سات سورتیں (یونس سے النحل تک) نو سورتیں (بنی اسرائیل سے الفرقان کے ختم تک) گیارہ سورتیں (الشعراء سے یٰس تک) تیرہ سورتیں (والصافات سے الحجرات تک) اور مفصلات تمام ایک ساتھ (ق سے ختم قرآن تک) (بذل المجہود ۷: ۱۸۴، مصری)

⑤ — بعض حضرات نے قرآن کے عاشقوں کے لئے پورے قرآن کی تین منزلیں بنائی ہیں۔ یہ حضرات تین دن میں قرآن ختم کرتے ہیں۔ یہ منازل فِیل کے نام سے مشہور ہیں۔ لفظ فیل کے معنی ہیں ہاتھی، یہ منزلیں چونکہ ہاتھی کی طرح بڑی ہیں اس لئے اس کو یہ نام دیا گیا ہے اس میں ف سے الفاتحہ ی سے یونس اور ل سے لقمان مراد ہے۔

⑥ — تقریباً ۳۰۰ھ کے آغاز میں علمائے ماوراء النہر نے تمام بڑی سورتوں کو رکوع میں تقسیم کیا اور ان میں اس بات کا لحاظ رکھا کہ ہر رکوع ایک مکمل مضمون ہوتا کہ نماز میں قراءت کرنے میں آسانی ہو اب ہر رکوع بمنزلہ ایک سورت کے ہے پس جس طرح سورت کا بعض حصہ پڑھنا مکروہ ہے رکوع کا بعض حصہ پڑھنا بھی مکروہ ہے۔ ہاں دو رکعتوں میں رکوع پورا کر لے تو حرج نہیں۔

اب خواہ کوئی ایمان لائے یا نہ لائے قرآن کی شان رفیع میں کچھ کمی نہیں آتی۔ کیونکہ اس پر ایمان لانے والے اور اس سے کما حقہ استفادہ کرنے والے بہت ہیں جو ایمان نہیں لائے گا وہ اپنا نقصان کرے گا ارشاد ہے ——— آپ کہہ دیجئے کہ تم خواہ اس قرآن پر ایمان لاؤ یا نہ لاؤ ——— قرآن کا کچھ نقصان نہیں! ——— بیشک جن لوگوں کو قرآن سے پہلے علم دیا گیا ہے، جب ان کے سامنے قرآن پڑھا جاتا ہے تو وہ ٹھوڑیوں کے بل سجدہ کرتے ہوئے گر پڑتے ہیں اور کہتے ہیں: ہمارے پروردگار پاک ہیں۔ ہمارے پروردگار کا وعدہ ضرور تکمیل پذیر ہونے والا ہے اور وہ ٹھوڑیوں کے بل روتے ہوئے گر پڑتے ہیں اور قرآن ان کا خشوع اور بڑھا دیتا ہے ——— یعنی جن لوگوں کو اللہ تعالیٰ نے پہلے سے علم وفہم دیا ہے جب وہ قرآن پاک سنتے ہیں تو فوراً ایمان لے آتے ہیں اور جب ان کے سامنے قرآن پاک پڑھا جاتا ہے تو ان کے رونگٹے کھڑے ہو جاتے ہیں، بدن سہم جاتا ہے اور ان پر لرزہ طاری ہو جاتا ہے اور صرف چہروں کے بل نہیں بلکہ ٹھوڑیوں کے بل سجدہ میں گر پڑتے ہیں اور اقرار کرتے ہیں کہ ہمارے پروردگار ہر برائی سے پاک ہیں وہ جھوٹا وعدہ کر ہی نہیں سکتے نہ وعدہ خلافی ان کے شان ہے انھوں نے غلبہ اسلام کے جو وعدے فرمائے ہیں وہ ضرور پورے ہونگے۔ اور ان پر گریہ طاری ہو جاتا ہے اور قرآن کریم سن کر ان کا انقیاد اور بڑھ جاتا ہے ——— اور ٹھوڑیوں کے بل گرنا مبالغہ ہے یعنی گویا ٹھوڑیاں بھی زمین سے ملا دیتے ہیں یا ٹھوڑیوں سے مراد چہرے ہیں۔

فائدہ: تلاوت قرآن کے وقت رونا مستحب ہے حضرت عبداللہ بن الشِّخّیر رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ میں

خدمت نبوی میں حاضر ہوا آپ نماز پڑھ رہے تھے اور سینۂ مبارک سے ہانڈی کی سنسناہٹ سی محسوس ہورہی تھی یعنی آپ نماز میں رورہے تھے (رواہ ابوداؤد واحمد والنسائی ۳:۱۳ مصری) ـــــ نیز دوسرے کی تلاوت سن کر رونا بھی سنت ہے۔ حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ آنحضرت ﷺ نے مجھ سے فرمایا: مجھے قرآن سناؤ، آپ ممبر پر تشریف فرما تھے میں نے عرض کیا: میں آپ کو سناؤں حالانکہ آپ پر قرآن نازل ہوا ہے؟ آپؐ نے فرمایا: میرا جی چاہتا ہے کہ میں دوسرے سے سنوں۔ ابن مسعودؓ فرماتے ہیں کہ میں نے سورۃ النساء پڑھنی شروع کی۔ جب میں ﴿فَكَيْفَ إِذَا جِئْنَا مِنْ كُلِّ أُمَّةٍ بِشَهِيْدٍ وَّجِئْنَا بِكَ عَلٰى هٰؤُلَاءِ شَهِيْدًا﴾ پر پہنچا آپؐ نے فرمایا کہ: ''بس کرو'' ابن مسعودؓ فرماتے ہیں کہ میں نے جو نظر اٹھا کر دیکھا تو آپ کی دونوں آنکھوں سے آنسو جاری ہیں (مشکوٰۃ حدیث ۲۱۹۵)

اس کے بعد توحید کا بیان شروع ہوتا ہے:

توحید کا مطلب یہ ہے کہ معبود برحق صرف ایک ذات ہے جو بے نظیر ہے، تمام خوبیاں اس میں جمع ہیں اور وہ ہر قسم کے عیوب ونقائص سے پاک ہے۔ کیونکہ جس ذات میں کسی خوبی کی کمی ہو وہ خدا نہیں ہوسکتی۔ نہ وہ ہستی خدا ہوسکتی ہے جس میں کوئی عیب پایا جائے۔ خدا کے لئے بے ہمہ (یکتا) اور باہمہ (بے نیاز) ہونا ضروری ہے۔ احتیاج، کمزوری اور مجبوری ان کے قریب بھی نہیں پھٹک سکتی۔

کمالات خداوندی پر جو الفاظ دلالت کرتے ہیں وہ صفات ثبوتیہ اور صفات کمالیہ کہلاتی ہیں اور جن کے ذریعہ عیوب ونقائص سے اللہ کی پاکی بیان کی جاتی ہے وہ صفات سلبیہ اور تنزیہات کہلاتی ہیں سب سے پہلے اللہ تعالیٰ کی صفات ثبوتیہ بیان کی جاتی ہیں ـــــ اور آیت پاک کا شان نزول یہ ہے کہ عربوں میں باری تعالیٰ کے لئے لفظ اللّٰہ کا استعمال تو خوب ہوتا تھا وہ اس نام سے بخوبی واقف تھے مگر الرحمن سے زیادہ واقف نہیں تھے اس لئے جب قرآن کریم میں اللہ تعالیٰ کی یہ صفت استعمال کی گئی تو وہ بدکنے لگے اور وحشت کھانے لگے۔ وہ جب آنحضرت ﷺ کی زبان مبارک سے الرحمٰن کا تذکرہ سنتے تو کہتے کہ محمد ہم کو تو دو خداؤں کو پکارنے سے روکتے ہیں اور خود اللہ کے سوا دوسرے خدا رحمان کو بھی پکارتے ہیں ان کو جواب دیا جاتا ہے ـــــ آپ کہہ دیجئے کہ تم خواہ اللہ کو پکارو یا رحمٰن کو ـــــ دونوں ایک ہی ذات کے نام ہیں، کسی بھی نام سے دعا کرسکتے ہو ـــــ جس نام سے بھی پکاروگے تو ان کے لئے اچھے نام ہیں ـــــ یعنی صرف الرحمٰن ہی اللہ تعالیٰ کی صفت نہیں ان کی تو بے شمار صفات ہیں اور کسی بھی صفت کے ذریعہ دعا مانگی جاسکتی ہے۔ صفات کے تعدد سے ذات کا تعدد لازم نہیں آتا۔

فائدہ: اسمائے حسنیٰ کا مفصل بیان سورۃ الاعراف آیت ۱۸۰ کی تفسیر میں گذر چکا ہے۔ وہاں یہ بات بھی بتلائی

جا چکی ہے کہ اللہ تعالیٰ کی صرف ننانوے صفات نہیں ہیں بلکہ ان کے اسمائے حسنیٰ غیر متناہی (بے شمار) ہیں اور ترمذی شریف اور بیہقی کی جو روایت وہاں بیان کی گئی ہے جس میں اللہ تعالیٰ کے ننانوے نام ذکر کر کے ارشاد فرمایا ہے کہ: ''جو ان ناموں کا احاطہ کرلے گا وہ جنت میں جائے گا'' اُس حدیث میں اللہ تعالیٰ کی صرف اُن صفات کو لیا گیا ہے جو انسانوں کی ہدایت اور ان کی تربیت سے تعلق رکھتی ہیں۔

اور اللہ تعالیٰ کی بے شمار صفات ہونے کی وجہ یہ ہے کہ ہر صفتی نام کوئی نہ کوئی خوبی بیان کرتا ہے اور اللہ تعالیٰ کی ذات میں کمالات اور خوبیاں اَن گنت ہیں اس لئے ضروری ہے کہ ان کے مبارک نام بھی ان گنت ہوں۔

اس کی مزید تفصیل یہ ہے کہ جب کسی ذات میں گوناگوں خوبیاں ہوتی ہیں اور زبان میں کوئی ایسا لفظ موجود نہیں ہوتا جس میں سب خوبیوں کی سمائی ہو تو ایسی مجبوری کی صورت میں متعدد الفاظ کے ذریعہ وہ خوبیاں ظاہر کی جاتی ہیں مثلاً ایک شخص مکمل دین پڑھا ہوا ہے تو اس کی اس خوبی کو ظاہر کرنے کے لئے اس کو ''مولوی'' کہیں گے۔ پھر اگر اس کو علم دین میں رسوخ حاصل ہے تو اس خوبی کو ظاہر کرنے کے لئے ''مولوی'' کا لفظ کافی نہیں بلکہ اب اس کو ''مولانا'' کہا جائے گا پھر اگر وہ دینی مسائل میں مہارت بھی رکھتا ہو تو ''مفتی'' کہلائے گا اور فن تجوید سے پوری طرح واقف ہو تو ''قاری'' اور لوگوں کے نزاعات بھی نمٹاتا ہو تو ''قاضی'' بھی کہا جائے گا اسی طرح خوبیاں بڑھیں گی تو القاب بھی بڑھیں گے۔

اب سمجھئے کہ اللہ پاک کی ذات والا صفات میں بے شمار اور گوناگوں خوبیاں اور کمالات ہیں اور عربی زبان بلکہ کسی بھی زبان میں ایسا کوئی لفظ موجود نہیں جو سب خوبیوں کو ایک ساتھ واضح کر سکے، اس مجبوری میں اللہ تعالیٰ پر متعدد صفات کا اطلاق کیا جاتا ہے اور چونکہ خوبیاں غیر متناہی ہیں اس لئے ان پر دلالت کرنے والے الفاظ بھی غیر متناہی ہیں۔

اگر صفات باری کے تعدد کی یہ وجہ آپ سمجھ گئے ہوں تو یہ بات اب بہت آسانی سے سمجھ میں آجائے گی کہ اس آیت میں اللہ کی صفات کمالیہ کی طرف اشارہ کیا گیا ہے۔ اس آیت میں یہ سمجھایا گیا ہے کہ وہ جامع الکمالات ہستی ہے، کوئی کمال ان کے لئے منتظر نہیں، ہر کمال ان کو حاصل ہے اور وہ غیر متناہی کمالات کے مالک ہیں اس لئے ان کے لئے اچھے اچھے اور مبارک نام بھی بہت ہیں (فائدہ تمام ہوا)

اور چونکہ مشرکین اللہ کی صفت الرحمٰن کے قائل نہیں تھے اس لئے وہ اس صفت کا مذاق اڑاتے تھے اور بدزبانی کرتے تھے۔ اس لئے آنحضرت ﷺ نے نماز آہستہ پڑھنی شروع کر دی تھی مگر اس میں خود اپنا نقصان تھا اس لئے مسلمانوں کو ہدایت دی ـــــ اور آپ اپنی نماز نہ بہت زیادہ بلند آواز سے پڑھیں اور نہ بالکل ہی پست آواز سے اور ان دونوں میں درمیانی راہ اختیار کریں ـــــ یعنی ٹھیک ہے آپ بہت زور سے نہ پڑھیں مگر بہت آہستہ بھی نہ

پڑھیں۔نماز اس طرح ادا کریں کہ نہ اپنا نقصان ہو نہ کفار کو ٹھٹھا کرنے کا موقع ملے۔ نہ اس قدر زور سے پڑھا جائے کہ دشمنان اسلام اپنی مجالس میں ہنسیں اور نہ اتنا آہستہ پڑھا جائے کہ مقتدی بھی نہ سن سکیں۔ بلکہ افراط وتفریط چھوڑ کر میانہ روی اختیار کریں تا کہ دل اثر پذیر بھی ہو اور کسی کو بدزبانی کا موقع بھی نہ ملے۔

یاد رہے کہ یہ حکم جہری نمازوں کے لئے ہے، ظہر اور عصر میں تو بالکل اخفا سنت متواترہ سے ثابت ہے اور جہری نمازوں میں مغرب، عشاء اور فجر تو داخل ہی ہیں، تہجد کی نماز بھی اس حکم میں داخل ہے۔ حدیث شریف میں ہے کہ ایک مرتبہ آنحضرت ﷺ نماز تہجد کے وقت حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کے پاس سے گذرے۔ دیکھا کہ وہ آہستہ تلاوت کر رہے ہیں اور حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے پاس سے گذرے تو دیکھا کہ وہ خوب بلند آواز سے تلاوت کر رہے ہیں۔ پھر جب دونوں حضرات آپ کے پاس اکٹھا ہوئے تو آپ ؐ نے حضرت ابوبکرؓ سے دریافت کیا کہ میں آپ کے پاس سے گذرا تھا تو آپ آہستہ پڑھ رہے تھے، کیوں؟ حضرت صدیقؓ نے جواب دیا کہ یارسول اللہ! مجھے جس کو سنانا تھا اس کو سنا رہا تھا یعنی تلاوت اللہ تعالیٰ کے ساتھ باتیں کرنا ہے اور اللہ تعالیٰ خفی سے خفی آواز بھی سنتے ہیں پھر بلند آواز سے پڑھنے کی کیا ضرورت ہے؟ جواب نہایت معقول اور تشفی بخش تھا پھر آپ ؐ نے حضرت عمرؓ سے دریافت کیا کہ تم زور زور سے کیوں پڑھ رہے تھے؟ انھوں نے عرض کیا کہ سوتوں کو جگا رہا تھا اور شیطان کو بھگا رہا تھا۔ یعنی اللہ تعالیٰ ہر طرح کی تلاوت سنتے ہیں مگر زور سے پڑھنے میں دو اور فائدے ہیں ان کو حاصل کرنے کے لئے زور سے پڑھ رہا تھا۔ ایک گھر میں جو لوگ سوئے پڑے ہیں وہ بھی بیدار ہو جائیں اور نماز میں مشغول ہو جائیں۔ دوسرے جس گھر میں قرآن کریم زور سے پڑھا جاتا ہے شیطان وہاں سے بھاگتا ہے۔ حضرت عمرؓ کا جواب بھی نہایت معقول تھا مگر پھر بھی آنحضرت ﷺ نے حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ سے فرمایا: آپ ذرا زور سے پڑھا کریں۔ کیونکہ بہت آہستہ پڑھنے سے طبیعت اکتا جاتی ہے اور حضرت عمر رضی اللہ عنہ سے فرمایا: آپ ذرا آہستہ پڑھیں کیونکہ جہر مُفرط تھکا دیتا ہے (مشکوٰۃ حدیث ۱۲۰۴) ـــــ اس حدیث سے یہ معلوم ہوا کہ آیت میں جو حکم دیا گیا ہے وہ کفار کے درمیان ہی عمل کرنے کے لئے نہیں بلکہ عام ہے۔

اس کے بعد سورت کی آخری آیت میں اللہ پاک کی صفاتِ ثبوتیہ اور صفاتِ سلبیہ کا بیان ہے یعنی اللہ کی خوبیوں کا بیان ہے اور جو باتیں اللہ کے شایان شان نہیں ان سے اللہ پاک کی تنزیہ اور پاکی بیان کی جاتی ہے۔ ارشاد ہے ـــــ اور آپ کہہ دیجئے کہ تمام تعریفیں اس اللہ کے لئے ہیں جس نے کوئی اولاد اختیار نہیں کی، اور نہ سلطنت میں اس کا کوئی ساجھی ہے اور نہ کمزوری کی وجہ سے اس کا کوئی مددگار ہے اور آپ اللہ کی خوب بڑائی بیان کیا کریں ـــــ یعنی ساری خوبیاں اور تعریفیں اللہ تعالیٰ کے لئے ہیں، وہ اپنے ہر کمال میں یگانہ ہیں اور ہر قسم کے عیب وقصور اور نقص

وفتور سے پاک ہیں۔ان کی ذات میں کسی طرح کی کمزوری نہیں جس کی تلافی کے لئے دوسرے کی حاجت پڑے، نہ چھوٹے سے مدد لینے کی جیسے باپ اولاد سے مدد لیتا ہے نہ برابر سے جیسے ایک شریک دوسرے شریک سے مدد لیتا ہے اور نہ بڑے سے جیسے کمزور آدمی ذلت ومصیبت کے وقت بڑے آدمیوں سے مدد لیتا ہے۔لہٰذا انسان کو چاہئے کہ وہ اللہ تعالیٰ کی عظمت وکبریائی کی طرف متوجہ ہواور دل سے ان کی بڑائی کا اقرار کرے اوران کو ہر طرح کی کمزوریوں سے برتر سمجھے اورزبان سے اس کا خوب ورد کرے اوراعلان کرے اور یہ بات پہنچائے جہاں تک پہنچے۔

فائدہ: یہ آخری آیت آیَۃُ الْعِزّ (عزت بخشنے والی آیت) ہےاس کا بہ کثرت ورد کرنے سے دنیا میں بھی عزت ملتی ہے اورآخرت میں بھی۔حدیث شریف میں ہے کہ آنحضرت ﷺ کے خاندان میں جب کوئی بچہ بولنا شروع کرتا تو آپؐ اس کو یہ آیت سکھا دیتے تھے (درمنثور۴: ۲۰۸)

اور حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ میں ایک روز رسول اللہ ﷺ کے ساتھ باہر نکلا۔میرا ہاتھ آپؐ کے ہاتھ میں تھا آپ کا گذر ایک شکستہ حال پریشان بال آدمی پر ہوا۔آپؐ نے اس سے حال پوچھا تو اس نے بیماری اورتنگدستی کا گلہ کیا۔آپؐ نے فرمایا میں تمہیں چند کلمات بتلاتا ہوں وہ پڑھو گے تو تمہاری بیماری اورتنگ دستی جاتی رہے گی وہ کلمات یہ ہیں: تَوَكَّلْتُ عَلَى الْحَيِّ الَّذِىْ لَايَمُوْتُ. اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ الَّذِىْ لَمْ يَتَّخِذْ آخر آیت تک۔حضرت ابو ہریرہؓ فرماتے ہیں کہ کچھ عرصہ کے بعد پھر آپؐ اس طرف تشریف لے گئے تو اس کو اچھے حال میں پایا۔آپؐ خوش ہوئے اس شخص نے عرض کیا یارسول اللہ! جب سے آپ نے مجھے یہ کلمات بتلائے ہیں میں برابر پابندی سے اس کو پڑھتا ہوں (درمنثور۴: ۲۰۸)

فائدہ(۱): ﴿لَمْ يَتَّخِذْ وَلَدًا﴾ یعنی اللہ تعالیٰ نے کوئی اولاد نہیں اپنائی۔اس میں متبنّٰی بنانے کی نفی کی ہے۔کیونکہ اللہ تعالیٰ کی صلبی اولاد کا تو سوال ہی نہیں۔مخلوق میں سے بھی کسی کو بیٹا بیٹی نہیں بنایا۔

فائدہ(۲): آیت کی ابتداء اورانتہا میں صفات ثبوتیہ کا بیان ہے۔الحمد للہ اور کبرہ تکبیرًا میں خوبیوں کی طرف اشارہ ہے۔اوردرمیان میں تین صفاتِ سلبیہ کا بیان ہے۔اورلطف یہ ہے کہ ﴿لَمْ يَتَّخِذْ وَلَدًا﴾ میں نصاریٰ کا رد ہے، اور ﴿لَمْ يَكُنْ لَّهٗ شَرِيْكٌ فِى الْمُلْكِ﴾ میں مشرکین کے شرک کا ابطال ہے، اور ﴿لَمْ يَكُنْ لَّهٗ وَلِيٌّ مِّنَ الذُّلِّ﴾ میں ان یہود پر رد ہے جن کے یہاں کشتی میں خدا تعالیٰ یعقوب علیہ السلام کے مقابلہ میں تاب نہیں لا سکا تھا۔ (العیاذ باللہ!)

﴿بحمدہ تعالیٰ سورہ بنی اسرائیل کی تفسیر مکمل ہوئی﴾

بسم اللہ الرحمن الرحیم

سورۃ الکھف

نمبر شمار	۱۸	نوعیتِ نزول	مکی	نمبر نزول	۶۹

آیات: ۱۱۰ رکوع: ۱۲ کلمات: ۱۲۰۱ حروف: ۶۶۲۰

یہ سورت ہجرت سے پہلے مکی دور میں نازل ہوئی ہے اور بڑی بابرکت سورت ہے حدیثوں میں اس کے بہت فضائل آئے ہیں۔ یہاں چند حدیثیں ذکر کی جاتی ہیں:

حدیث(۱) — حضرت انس رضی اللہ عنہ سے مرفوعاً روایت ہے کہ یہ پوری سورت یکبارگی نازل ہوئی ہے اور ستر ہزار فرشتے اس کے جلو میں آئے تھے (رواہ الدیلمی فی سند الفردوس) ملائکہ کی یہ ہمرکابی اس سورت کی عظمت شان ظاہر کرنے کے لئے تھی، تاکہ لوگ اس کی قدر کریں اور اس سے خوب استفادہ کریں۔

حدیث(۲) — حضرت علی رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا: ''جو شخص جمعہ کے دن سورۃ الکہف پڑھے گا وہ آٹھ روز تک ہر فتنہ سے محفوظ رہے گا اور اگر اس ہفتہ میں دجال نکل آئے گا تو وہ اس کے فتنہ سے بھی محفوظ رہے گا'' (اخرجہ الضیاء المقدسی فی المختارۃ وابن مردویہ) اس حدیث سے معلوم ہوا کہ اس سورت کو تمام فتنوں سے خاص طور پر دجال اکبر کے فتنہ سے بچانے میں خاص دخل ہے۔ آج کل فتنوں کا دور ہے۔ دجالی فتنے روز نئے نئے پیدا ہوتے رہتے ہیں پس لوگوں کو چاہئے کہ ان حالات میں اس سورت کا خاص طور پر ورد رکھیں تاکہ اللہ تعالیٰ فتنوں سے حفاظت فرمائیں۔

حدیث(۳) — حضرت ابوالدرداء رضی اللہ عنہ آنحضرت ﷺ سے روایت کرتے ہیں کہ جو شخص سورۃ الکہف کی ابتدائی دس آیتیں یاد کرلے وہ دجال کے فتنہ سے محفوظ رہے گا۔ ایک دوسری روایت میں حضرت ابوالدرداء رضی اللہ عنہ سے یہی مضمون سورۂ کہف کی آخری دس آیتوں کے بارے میں بھی منقول ہے (اخرجہ مسلم والنسائی واحمد وغیرہم) یہی مضمون حضرت ثوبان رضی اللہ عنہ سے بھی مروی ہے (اخرجہ النسائی وابویعلی) لہٰذا اس سورت کا پہلا رکوع اور آخری

رکوع ہر شخص کو یاد کر لینا چاہئے۔ اور روزانہ نماز میں ایک بار اس کو پڑھ لینا چاہئے، نماز میں موقعہ نہ ملے تو سوتے وقت یا کسی دوسرے وقت یاک بار ضرور پڑھ لینا چاہئے۔

حدیث(۴)ــــ مسند احمد میں حضرت معاذ بن انس رضی اللہ عنہ سے منقول ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا جو شخص سورۂ کہف کی ابتدائی اور آخری آیتیں پڑھ لے اس کے لئے سر سے قدم تک ایک نور ہوگا۔ اور جو پوری سورت پڑھے اس کے لئے زمین سے آسمان تک نور ہوگا (ابن کثیر) اور حضرت ابو سعید خدری رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ آنحضرت ﷺ نے فرمایا: جو شخص جمعہ کے دن سورۂ کہف پڑھ لے اس کے لئے آئندہ جمعہ تک نور ہوگا (اخرجہ الحاکم والبیہقی)

حدیث(۵) ــــ بعض روایات میں آیا ہے کہ جو شخص جمعہ کے دن سورۂ کہف کی تلاوت کرے اس کے لئے قدم سے آسمان کی بلندی تک نور ہوگا، جو قیامت کے دن کام آئے گا اور پچھلے جمعہ سے اس جمعہ تک کے سارے گناہ معاف ہوجائیں گے (اخرجہ ابن مردویہ عن عمرؓ)

حدیث(۶) ــــ حضرت اُسید بن حُضیر رضی اللہ عنہ ایک بار سورۂ کہف پڑھ رہے تھے۔ مکان میں گھوڑا بندھا ہوا تھا۔ اچانک گھوڑا ابدکنے لگا۔ انھوں نے دیکھا کہ ایک بادل چھایا ہوا ہے (انھوں نے پڑھنا موقوف کر دیا) اور آنحضرت ﷺ سے اس واقعہ کا تذکرہ کیا تو آپؐ نے فرمایا: پڑھتے رہتے، وہ تو سکینت تھی جو قرآن کی وجہ سے نازل ہوئی تھی (متفق علیہ)

حدیث(۷) ــــ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: جو شخص سورۂ کہف کی ابتدائی دس آیتیں سوتے وقت پڑھے وہ دجال کے فتنہ سے محفوظ رہے گا اور جو شخص آخری دس آیتیں سوتے وقت پڑھے گا، تو اس کے لئے سر سے قدم تک قیامت کے دن نور ہوگا (ابن مردویہ)

حدیث(۶) ــــ حضرت عبداللہ مغفل رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ آنحضرت ﷺ نے فرمایا: جس گھر میں سورۂ کہف پڑھی جاتی ہے اس میں اس رات شیطان داخل نہیں ہوسکتا (اخرجہ ابن مردویہ)

حدیث(۹) ــــ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا بیان فرماتی ہیں کہ آنحضرت ﷺ نے ارشاد فرمایا: کیا میں آپ لوگوں کو ایک ایسی سورت نہ بتلاؤں جس کی عظمت نے آسمان وزمین کے مابین کو بھر دیا ہے اور جو شخص اس کو جمعہ کے دن پڑھے گا اس کے گذشتہ جمعہ سے اس جمعہ تک کے، اور مزید تین دن کے، کل دس دن کے گناہ معاف کر دیئے جائیں گے اور جو اس کی آخری آیتیں سوتے وقت پڑھے گا وہ رات میں جس وقت بیدار ہونا چاہے گا اس کی آنکھ کھل جائے گی؟ صحابہ کرام نے عرض کیا کیوں نہیں! ضرور بتائیں یا رسول اللہ! آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا: وہ سورۂ کہف ہے۔

یہ نو احادیث ہیں، جو درمنثور سے لی گئی ہیں، یہ حدیثیں اس سورت کی اہمیت اور فضیلت پر روشنی ڈالنے کے لئے کافی ہیں۔ اللہ تعالیٰ ہمیں اس سورت کی قدر کرنے کی توفیق عطا فرمائیں (آمین)

سورت کا نام اور زمانۂ نزول: ـــــ اس سورت کی ابتدا میں کہف یعنی غار والوں کا واقعہ بیان کیا گیا ہے اس لئے اس سورت کا نام سورۃ الکہف ہے۔ یہ سورت ہجرت سے دو ڈھائی سال پہلے نازل ہوئی ہے۔ یہ وہ دور تھا جبکہ مکہ والوں نے ظلم وستم، قید وبند اور زدوکوب کے تمام حربے پوری سختی کے ساتھ استعمال کرنے شروع کر دیئے تھے اور مسلمانوں پر مکہ مکرمہ کی زمین تنگ ہوگئی تھی، ان حالات میں مسلمانوں کو اصحاب کہف کا قصہ سنایا گیا ہے تاکہ ان کی ہمت بندھے اور انہیں معلوم ہو کہ گذشتہ زمانہ میں بھی اہل ایمان اپنا ایمان بچانے کے لئے کیا کچھ کر چکے ہیں۔

آج بھی کسی ملک میں یا کسی بستی میں کفار کا بے پناہ غلبہ ہو اور مسلمانوں کو سانس لینے کی بھی گنجائش نہ دی جارہی ہو تو ان کو باطل کے سامنے سر نہیں جھکانا چاہئے اگر وطن میں قیام اور مقابلہ ممکن نہ ہو تو تن بہ تقدیر نکل کھڑا ہونا چاہئے۔ اللہ تعالیٰ کی زمین تنگ نہیں جو شخص اللہ تعالیٰ کی راہ میں وطن چھوڑتا ہے اس کو روئے زمین پر بہت جگہ ملے گی (النساء آیت ۱۰۰)

شانِ نزول ـــــ روایات میں آیا ہے کہ جب مکہ مکرمہ میں اسلام پھیلنا شروع ہوا تو قریش پریشان ہوئے۔ انھوں نے نضر بن الحارث اور عقبۃ بن ابی مُعیط وغیرہ چند آدمیوں کا ایک وفد مدینہ منورہ علمائے یہود کے پاس بھیجا اور ان سے صورت حال کے بارے میں مشورہ طلب کیا کہ تم خود کو اہل کتاب کہتے ہو اور تمہارا دعوی ہے کہ تمہارے پاس زمانۂ سابق کے پیغمبروں کا وہ علم ہے جو ہمارے پاس نہیں۔ لہٰذا محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) کے بارے میں ہمیں بتلاؤ کہ وہ دعویٔ نبوت میں کہاں تک سچے ہیں؟ اور تمہاری الہامی کتابوں میں اس سلسلہ میں کیا لکھا ہے؟ وفد نے یثرب پہنچ کر علمائے یہود سے اپنی آمد کا مقصد بیان کیا۔ علمائے یہود نے ان کو بتایا کہ ہماری کتابوں میں نبی آخر الزماں کی جو صفات درج ہیں ان کی رو سے وہ سچے نبی ہیں۔ تاہم تم لوگ ان سے تین سوالات کرو۔ اگر انھوں نے ان کے صحیح جوابات دیدئے تو سمجھ لو کہ وہ سچے نبی ہیں ورنہ باتیں بگھارنے والے ہیں۔ ایک ان سے اُن نوجوانوں کا حال دریافت کرو جو قدیم زمانہ میں اپنا دین بچانے کے لئے شہر سے نکل کر پہاڑ کی کھوہ میں جا چھپے تھے۔ کیونکہ ان کا واقعہ بڑا ہی عجیب ہے دوسرے اس بادشاہ کا حال دریافت کرو جس نے مشرق ومغرب کا دورہ کیا تھا۔ تیسرے ان سے روح کے بارے میں پوچھو کہ وہ کیا چیز ہے؟ ـــــ وفد واپس آیا اور لوگوں سے کہا کہ ہم ایک فیصلہ کن تجویز لے کر آئے ہیں اور سارا قصہ سنایا۔ پھر وہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوئے اور سوالات پیش کئے آپؐ نے فرمایا: میں کل ان کے جوابات دونگا مگر آپؐ ان شاء اللہ کہنا بھول گئے۔ وہ لوگ لوٹ گئے اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم وحی کے انتظار میں رہے مگر وعدہ

کے مطابق اگلے دن تک کوئی وحی نہ آئی۔ بلکہ پندرہ دن انتظار کرتے کرتے گذر گئے۔قریش نے مذاق اڑانا شروع کیا جس سے رسول اللہ ﷺ کو سخت رنج پہنچا۔

پندرہ دن کے بعد حضرت جبرئیل علیہ السلام سورۂ کہف لے کر آئے اور اس میں یہ آیت بھی نازل ہوئی کہ جب کسی کام کے کرنے کا وعدہ کیا جائے تو ان شاء اللہ کہہ کر معاملہ اللہ کے حوالے کیا جائے اپنے اوپر اعتماد نہ کیا جائے۔ اس سورت میں ان نوجوانوں کا پورا واقعہ بیان کیا گیا ہے، جن کو اصحاب کہف کہا جاتا ہے اور مشرق ومغرب کا سفر کرنے والے بادشاہ ذوالقرنین کا حال بھی سنایا گیا ہے اور روح کے بارے میں مختصر جواب دیا گیا ہے جو ترتیبِ قرآنی میں سورۃ الاسراء میں گذر چکا ہے۔

سورت کا مرکزی مضمون ـــــ مکی سورتوں کی طرح اس سورت کے بھی بنیادی مضامین یہ ہیں (۱) شرک کا بطلان (۲) توحید کا اثبات (۳) رسول کی صداقت (۴) قرآن کی حقانیت (۵) آخرت کی ضرورت (۶) دنیا کی بے ثباتی (۷) دین کے لئے قربانی دینے کی اہمیت (۸) کفار کا انجام بد (۹) مؤمنین کی فلاح وکامیابی ـــــ اور اس سورت میں چار واقعات ذکر کئے گئے ہیں۔

غار والوں کا قصہ ـــــ یہ چند نوجوانوں کا قصہ ہے جو توحید کے قائل تھے ان کا حال مکہ کے مٹھی بھر مظلوم مسلمانوں کے حال سے مشابہ تھا اور ان کی قوم کا رویہ کفار قریش کے رویہ سے مختلف نہ تھا۔اس قصہ کے ذریعہ جہاں توحید وشرک اور معاد کے مسائل پر روشنی ڈالی گئی ہے وہاں اہل ایمان کو یہ سمجھایا گیا ہے کہ کفار کے بے پناہ غلبہ ان کے پائے استقامت میں تزلزل پیدا نہ کرے۔اگر ان کے لئے مکہ کی سرزمین تنگ ہوگئی ہے تو ان کو اللہ تعالیٰ کے بھروسے پر تن بہ تقدیر مکہ سے نکل جانا چاہئے۔

دو باغ والے کا واقعہ ـــــ یہ شخص بے ایمان تھا اور اس کا ساتھی غریب تھا مگر ایمان دار تھا۔اس واقعہ سے بھی توحید وشرک کے مسئلہ پر روشنی ڈالی گئی ہے اور دنیا کی بے ثباتی ذہن نشین کی گئی ہے۔

حضرت موسیٰ اور حضرت خضر علیہما السلام کا واقعہ ـــــ اس واقعہ کے ذریعہ یہ سمجھایا گیا ہے کہ اللہ کی مشیت کا کارخانہ جن مصلحتوں پر چل رہا ہے ان تک انسان کی کوتاہ نظر نہیں پہنچ سکتی، اور اسی وجہ سے انسان بہت سی مرتبہ حیران ہوتا ہے کہ یہ کیوں ہوا؟ یا کیا ہوا؟ یہ تو غضب ہوگیا؟ حالانکہ اگر حقیقت حال سے پردہ اٹھا دیا جائے تو ہر انسان خود فیصلہ کرلے گا کہ جو کچھ ہو رہا ہے ٹھیک ہی ہو رہا ہے اور بظاہر جس چیز میں برائی نظر آتی ہے، وہ بھی کسی اچھے نتیجہ ہی کے لئے ہوتی ہے:

نہیں ہے چیز نکمّی کوئی زمانہ میں ❁ کوئی برائی نہیں قدرت کے کارخانے میں

ذوالقرنین کا قصہ ــــــ اس واقعہ کے ذریعہ بھی شرک وکفر کی برائی اور توحیدوایمان کی اہمیت واضح کی گئی ہے اور دنیا کی بےثباتی کا سبق دیا گیا ہے کہ ذوالقرنین مستحکم دیوار بنا کر بھی اللہ پر بھروسہ رکھتے تھے انھوں نے اس بات کا صاف اعلان کر دیا تھا کہ جب تک اللہ کی مرضی ہوگی یہ دیوار دشمنوں کو روکتی رہے گی اور جب ان کی مرضی بدلے گی دیوار میں رخنوں اور شگافوں کے علاوہ کچھ نہ رہے گا۔

پھر آخر میں قیامت تذکرہ ہے اور کفار کو ان کا انجام بد سنایا گیا ہے اور مؤمنین کو ان کے بہترین انجام سے مطلع کیا گیا ہے اور بالکل آخر میں دو نہایت اہم اعلان کر کے سورت ختم کی گئی ہے۔

پہلا اعلان: اللہ تعالیٰ کے علوم بے پایاں ہیں۔ ان کی کوئی حد و نہایت نہیں اور انبیا کے ذریعہ جو علوم انسانوں کے پاس بھیجے گئے ہیں وہ ان کے ظرف کا لحاظ کر کے نازل کئے گئے ہیں۔

دوسرا اعلان: آنحضرت ﷺ بھی دوسرے انسانوں کی طرح انسان ہیں البتہ وہ عظیم الشان رسول بھی ہیں، وہ جو کچھ بتاتے ہیں وحی کے ذریعہ بتاتے ہیں۔ ان کے پاس اپنا ذاتی علم کوئی نہیں لہٰذا لوگوں کو یہ بات ذہن سے نکال دینی چاہئے کہ اگر یہ سچے ہیں تو ہمارے ہر سوال کا جواب کیوں نہیں دیتے؟ اور پھٹ سے کیوں نہیں دیتے؟
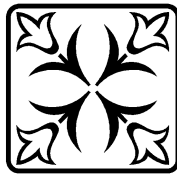
بِسۡمِ اللّٰهِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِيۡمِ

اَلۡحَمۡدُ لِلّٰهِ الَّذِىۡۤ اَنۡزَلَ عَلٰى عَبۡدِهِ الۡكِتٰبَ وَلَمۡ يَجۡعَلْ لَّهٗ عِوَجًا ۜ ﴿۱﴾ قَيِّمًا لِّيُنۡذِرَ بَاۡسًا شَدِيۡدًا مِّنۡ لَّدُنۡهُ وَيُبَشِّرَ الۡمُؤۡمِنِيۡنَ الَّذِيۡنَ يَعۡمَلُوۡنَ الصّٰلِحٰتِ اَنَّ لَهُمۡ اَجۡرًا حَسَنًا ﴿۲﴾ مّٰكِثِيۡنَ فِيۡهِ اَبَدًا ﴿۳﴾ وَّيُنۡذِرَ الَّذِيۡنَ قَالُوا اتَّخَذَ اللّٰهُ وَلَدًا ﴿۴﴾ مَا لَهُمۡ بِهٖ مِنۡ عِلۡمٍ وَّلَا لِاٰبَآئِهِمۡ ؕ كَبُرَتۡ كَلِمَةً تَخۡرُجُ مِنۡ اَفۡوَاهِهِمۡ ؕ اِنۡ يَّقُوۡلُوۡنَ اِلَّا كَذِبًا ﴿۵﴾ فَلَعَلَّكَ بَاخِعٌ نَّفۡسَكَ عَلٰۤى اٰثَارِهِمۡ اِنۡ لَّمۡ يُؤۡمِنُوۡا بِهٰذَا الۡحَدِيۡثِ اَسَفًا ﴿۶﴾ اِنَّا جَعَلۡنَا مَا عَلَى الۡاَرۡضِ زِيۡنَةً لَّهَا لِنَبۡلُوَهُمۡ اَيُّهُمۡ اَحۡسَنُ عَمَلًا ﴿۷﴾ وَاِنَّا لَجٰعِلُوۡنَ مَا عَلَيۡهَا صَعِيۡدًا جُرُزًا ﴿۸﴾

بِسۡمِ	بنام	لِلّٰهِ (۱)	اس اللہ کے لئے ہیں	وَلَمۡ يَجۡعَلۡ	اور نہیں بنائی
اللّٰهِ	خدا	الَّذِىۡۤ	جس نے	لَّهٗ	اس کے لئے
الرَّحۡمٰنِ	بے حد مہربان	اَنۡزَلَ	نازل فرمائی	عِوَجًا	ذرا کجی
الرَّحِيۡمِ	نہایت رحم والے	عَلٰى عَبۡدِهِ	اپنے بندے پر	قَيِّمًا (۲)	بالکل سیدھی
اَلۡحَمۡدُ	تمام تعریفیں	الۡكِتٰبَ	(آسمانی) کتاب	لِّيُنۡذِرَ (۳)	تاکہ ڈرائے وہ

(۱) لِلّٰه ثابتٌ سے متعلق ہوکر خبر، الذی صلہ کے ساتھ اللہ کی صفت، جملہ وَلَمْ يَجْعَلْ حال الکتاب سے — عِوَجٌ (اسم) کجی، ٹیڑھاپن، ابوزید لغوی کہتے ہیں کہ جو کجی آنکھوں سے نظر آئے وہ عَوَجْ بالفتح ہے اور جو عقل وشعور سے سمجھ میں آئے وہ عِوَجْ بکسر العین ہے مگر اس پر لَاتَرٰى فِيْهَا عِوَجًا وَلَاۤ اَمْتًا (طٰہٰ آیت ۱۰۷) سے اعتراض ہوتا ہے اس لئے ابن السکیت کہتے ہیں کہ کسرہ کے ساتھ عام ہے (۲) قَيِّمًا (صیغہ صفت) کے دو معنی ہیں (۱) درست، ٹھیک بمعنی مستقیم جیسے ذٰلِكَ دِيْنُ الْقَيِّمَةِ یہی طریقہ درست مضامین کا بتلایا ہوا ہے (البینۃ آیت ۵) (۲) درست کرنے والی یعنی ایسی کتاب جو معاش اور دنیا وآخرت دونوں کو درست کرنے والی ہے اس صورت میں بمعنی مُقَوِّمْ ہوگا — قَيِّمَا حال ہے الکتاب سے یا فعل محذوف کا مفعول ثانی ہے أی جَعَلَهٗ قَيِّمًا — امام حفص رحمہ اللہ نے عِوَجًا پر سکتہ کیا ہے یعنی سانس توڑے بغیر وقف کیا ہے تاکہ یہ واضح ہوجائے کہ قیما کا تعلق عِوَجًا سے نہیں ہے بلکہ الکتاب سے ←

بَأْسًا شَدِيْدًا	سخت عذاب سے	اللّٰهُ	اللہ تعالیٰ نے	بَاخِعٌ (٦)	غم میں گھونٹ دیں
مِّنْ لَّدُنْهُ	جو منجانب اللہ ہوگا	وَلَدًا	اولاد کو	نَّفْسَكَ	اپنے آپ کو
وَيُبَشِّرَ	اور خوشی سنائے	مَا (٤)	نہیں	عَلٰٓى اٰثَارِهِمْ	ان کے پیچھے
الْمُؤْمِنِيْنَ	اُن مؤمنین کو	لَهُمْ	ان کے لئے	اِنْ	اگر
الَّذِيْنَ	جو	بِهٖ	اس بارے میں	لَّمْ يُؤْمِنُوْا	وہ نہ ایمان لائیں
يَعْمَلُوْنَ	کرتے ہیں	مِنْ عِلْمٍ	کچھ علم	بِهٰذَا الْحَدِيْثِ	اس بات پر
الصّٰلِحٰتِ	نیک کام	وَّلَا	اور نہ	اَسَفًا	افسوس کرتے ہوئے
اَنَّ لَهُمْ (١)	کہ ان کے لئے	لِاٰبَآئِهِمْ	ان کے باپ داداوں کو	اِنَّا جَعَلْنَا	بیشک ہم نے بنایا
اَجْرًا حَسَنًا	اچھا اجر (ہے)	كَبُرَتْ (٥)	بھاری ہے	مَا	اس کو جو
مَّاكِثِيْنَ (٢)	ٹھہرنے والے ہیں وہ	كَلِمَةً	بات	عَلَى الْاَرْضِ	زمین پر ہے
فِيْهِ	اس میں	تَخْرُجُ	(جو) نکلتی ہے	زِيْنَةً (٧)	رونق
اَبَدًا	ہمیشہ	مِنْ اَفْوَاهِهِمْ	ان کے منہ سے	لَّهَا	اس کے لئے
وَّيُنْذِرَ (٣)	اور ڈرائے وہ	اِنْ يَّقُوْلُوْنَ	نہیں کہتے ہیں وہ	لِنَبْلُوَهُمْ	تاکہ جانچیں ہم ان کو
الَّذِيْنَ	ان کو جنھوں نے	اِلَّا	مگر	اَيُّهُمْ (٨)	کون ان میں سے
قَالُوا	کہا:	كَذِبًا	جھوٹ	اَحْسَنُ	زیادہ اچھا ہے
اتَّخَذَ	اختیار کیا	فَلَعَلَّكَ	پس شاید آپ	عَمَلًا	عمل کے اعتبار سے

← ہے یا یہ نیا جملہ ہے (۳) لِيُنْذِرَ میں لام تعلیل یا لام عاقبت ہے اور جار مجرور أَنْزَلَ سے متعلق ہیں اور يُنْذِر کا مفعول اول الکافرین محذوف ہے اور بَاسًا شَدِيْدًا مفعول ثانی ہے اور مِنْ لَدُنْهُ محذوف سے متعلق ہوکر بَأْسًا کی صفت ثانی ہے۔

(۱) أَنَّ سے پہلے با جارہ محذوف ہے بَشَّرَ بہ: خوش خبری دینا (۲) مَاكِثِيْنَ حال ہے لَهُمْ کی ضمیر سے اور فِيْهِ کی ضمیر کا مرجع اجر ہے (۳) دوسرے يُنْذِر کا پہلے يُنْذِرُ پر عطف ہے یہ خاص عطف عام پر ہے اور مفعول ثانی محذوف ہے أی بأسًا شَدِيْدًا (۴) مَالَهُمْ إلخ جملہ مستانفہ ہے اور لَهُمْ خبر مقدم ہے اور من علم مبتدا مؤخر ہے اور مبتدا پر من زائدہ ہے (جمل) اور وَلَا لِآبَائِهِمْ کا خبر پر عطف ہے اور بِهٖ کی ضمیر کا مرجع قول ہے (۵) كَبُرَتْ کا فاعل محذوف ہے أی كَبُرَتْ مَقَالَتُهُمْ اور كَلِمَةً تمیز ہے اور جملہ تَخْرُجُ صفت ہے كَلِمَةً کی (٦) بَاخِعٌ (اسم فاعل) بَخَعٌ مصدر، غم میں گھونٹ ڈالنے والا فَلَعَلَّكَ میں فا جزائیہ ہے اور یہ شرط کا جواب مقدم ہے اور أَسَفًا مفعول لہ ہے یا حال ہے بَاخِعٌ کے فاعل سے (۷) زِيْنَةً مفعول لہ بھی ہوسکتا ہے اگر جَعَلَ بمعنی خَلَقَ ہو اور مفعول ثانی بھی ہوسکتا ہے اگر جَعَلَ بمعنی صَيَّرَ ہو (۸) أَيُّهُمْ (مرکب اضافی) مبتدا، أَحْسَنُ خبر، عَمَلًا تمیز پھر جملہ نبلو کے دو مفعولوں کے قائم مقام ہے ۱۲

وَاِنَّا	اور بیشک ہم	مَا (۱)	اس کو جو	صَعِيْدًا	میدان
لَجٰعِلُوْنَ	ضرور بنانے والے ہیں	عَلَيْهَا	اس (زمین) پر ہے	جُرُزًا	چٹیل (بنجر)

اللہ کے نام سے شروع کرتا ہوں جو بے مہربان، نہایت رحم والے ہیں

سورۂ بنی اسرائیل رسالت وتوحید کے بیان پر ختم ہوئی تھی، یہ سورت انہی دو مضامین سے شروع ہورہی ہے۔ سب سے پہلے عظمتِ قرآن کا بیان ہے، پھر توحید کا۔ ان آیتوں میں درج ذیل چار باتیں بیان کی گئی ہیں:

۱ــــ حمد باری اور قرآن کریم کی عظمت شان۔

۲ــــ نزول قرآن کے تین مقاصد اس میں اس طرف اشارہ ہے کہ قرآن کوئی تاریخی کتاب نہیں۔

۳ــــ حامل قرآن کی ذمہ داری۔ اس میں نبی کریم ﷺ کے لئے تسلی کا سامان بھی ہے۔

۴ــــ اللہ تعالیٰ نے یہ کائنات کس مقصد سے پیدا کی ہے؟ اور اس کائنات کا آخری انجام کیا ہونے والا ہے؟

پہلی بات ــــــ تمام تعریفیں اُس اللہ کے لئے ہیں جس نے اپنے خاص بندے پر یہ کتاب نازل فرمائی ــــــ یعنی سب خوبیوں کے مالک، تمام تعریفوں کے سزاوار اور بہتر سے بہتر شکر کے مستحق وہی اللہ پاک ہیں جنھوں نے اپنے مخصوص اور محبوب بندے حضرت محمد مصطفیٰ ﷺ پر یہ عظیم الشان کتاب اتاری ــــــ اور اس میں ذرا کجی نہیں رکھی ــــــ اس کی عبارت انتہائی سلیس وفصیح، اسلوب بیان نہایت مؤثر اور شگفتہ اور تعلیم نہایت متوسط ومعتدل ہے۔ جو ہر زمانہ اور ہر مزاج کے مناسب اور عقل سلیم کے مطابق ہے، وہ ــــــ بالکل سیدھی ــــــ ہے، کوئی کتنا ہی غور کرے بال برابر کجی نہیں پائے گا اور یہ کتاب لوگوں کو راہ راست پر لانے والی ہے، وہ بندوں کی تمام ضروریات اور معاد ومعاش کے مصالح کی ضامن ہے اور مخلوق خدا کو کامل ومکمل بنانے والی ہے۔

دوسری بات: قرآن کتاب ہدایت ہے اور اس کے نزول کے تین مقاصد ہیں:

پہلا مقصد: ــــــ تاکہ وہ (مکہ والوں کو) ایک سخت عذاب سے ڈرائے جو منجانب اللہ ہوگا ــــــ اُس عذاب کی سختی کا اندازہ کون کرسکتا ہے جو اللہ تعالیٰ کی طرف سے ہونے والا ہے۔ یہ عذاب مشرکین پر دنیا میں بھی آسکتا ہے اور آخرت میں بھی۔

(۱) مَا عَلَيْهَا موصول صلہ مل کر مفعول اول اور صَعِيْدًا جُرُزًا موصوف صفت مل کر مفعول ثانی ــ جُرُز: بنجر، چٹیل جَرْزٌ سے جس کے معنی کاٹ دینے اور کھا کر صاف کر دینے کے ہیں اور بنجر زمین چونکہ درختوں اور گھاس سے خالی ہوتی ہے اس لئے وہ جُرُز کہلاتی ہے۔ اسی طرح جس زمین میں سے گھاس اور درختوں کو کاٹ پھاٹ کر صاف میدان کر دیا جائے وہ بھی جُرُز ہے ۱۲

دوسرا مقصد: ـــــ اور اُن مؤمنین کو جو نیک کام کرتے ہیں خوش خبری سنائے کہ ان کو اچھا اجر ملنے والا ہے ـــــ یعنی جو لوگ قرآن کی دعوت قبول کر کے اس کی بتلائی ہوئی راہ پر چل رہے ہیں اور نیک اعمال کر رہے ہیں ان کو قرآن جنت کی خوش خبری سناتا ہے ـــــ جس میں وہ ہمیشہ رہیں گے ـــــ وہاں ان کو دائمی خوشی اور ابدی راحت ملے گی، پس وہ دنیا کی چندروزہ پریشانیوں کا غم نہ کھائیں۔

تیسرا مقصد: ـــــ اور اُن لوگوں کو (بھی) ڈرائے جو کہتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ اولاد رکھتا ہے ـــــ یعنی یہ قرآن خاص طور پر ان لوگوں کو متنبہ کرنے کے لئے نازل کیا گیا ہے جو اللہ تعالیٰ کی طرف اولاد منسوب کرتے ہیں جیسے نصاریٰ عیسیٰ علیہ السلام کو اللہ کا بیٹا مانتے ہیں۔ مشرکین مکہ فرشتوں کو اللہ تعالیٰ کی بیٹیاں کہتے ہیں۔ کچھ یہودی بھی اللہ تعالیٰ کے لئے اولاد تجویز کرتے ہیں، اور ہندو بھی دیوی دیوتاؤں کے بارے میں کچھ ایسی قسم کا عقیدہ رکھتے ہیں ان سب اقوام کو قرآن کریم چوکنا کر رہا ہے کہ ایسے فاسد سراسر باطل اور لغو عقیدے سے باز آجاؤ۔ یہ محض بے اصل عقیدہ ہے ـــــ نہ تو ان کے پاس اس کی کوئی دلیل ہے نہ ان کے اسلاف کے پاس تھی ـــــ یعنی محض عقیدت مندی کے غلو میں انھوں نے یہ بات گھڑ لی ہے ـــــ بڑی سنگین بات ہے جو ان کے منہ سے نکلتی ہے ـــــ ان کو کچھ احساس نہیں کہ وہ کیسی سخت گمراہی کی بات کہہ رہے ہیں اور رب العالمین کی شان میں کتنی بڑی گستاخی کر رہے ہیں ـــــ وہ لوگ محض جھوٹ بکتے ہیں ـــــ بے دلیل محض ایک جھوٹی بات بکے چلے جا رہے ہیں۔

تیسری بات: حامل قرآن کی ذمہ داری کیا ہے؟ ارشاد ہے ـــــ پس ہوسکتا ہے اگر وہ لوگ اس بات پر ایمان نہ لائیں تو آپؐ ان کے پیچھے پچھتا کر اپنی جان کھو دیں! ـــــ یعنی اگر آپؐ دعوت وتبلیغ کا فرض ادا کرتے رہیں۔ دل میں گھٹنے کی اور غمگین ہونے کی ضرورت نہیں۔ نہ اس بات پر پچھتائیں کہ میری کوشش کامیاب کیوں نہیں ہوتی؟ ہدایت اللہ کے ہاتھ میں ہے۔ داعی کا کام صرف دعوت دینا ہے۔ آپ اپنی محنت میں کامیاب ہیں، کم نصیب اگر قبول نہ کریں تو انہیں کا نقصان ہے۔

چوتھی بات: جو سب سے زیادہ اہم ہے: وہ یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے یہ خوشنما کائنات، دنیا کی یہ دلفریب زندگی اور یہ بارونق زمین اس لئے نہیں پیدا کی کہ انسان اس پر مگن ہوجائے یہ زرق برق جہاں محض امتحان کے لئے پیدا کیا گیا ہے اس کے باغ وبہار چندروزہ ہیں پھر اس کو کاٹ چھانٹ کر چٹیل میدان بنا دیا جائے گا۔ ارشاد ہے ـــــ بیشک ہم نے جو کچھ زمین پر ہے اس کو زمین کے لئے رونق بنایا ہے ـــــ یعنی اللہ تعالیٰ نے زمین کی یہ زندگی بے کیف نہیں بنائی کہ نہ یہاں سامان راحت ہو نہ عیش کے اسباب۔ نہ آرزوئیں ہوں نہ اُمنگیں۔ بلکہ دل اکتا دینے والی

گھڑیاں ہوں جو کاٹے نہ کٹیں۔ بلکہ اللہ تعالیٰ نے دنیا کی یہ زندگی پُر کیف اور رزق برق بنائی ہے ہر طرح کی راحتوں کے اسباب پیدا کئے ہیں اور اتنی خوشنما بنائی ہے کہ انسان کا دل کبھی نہیں اکتا تا مگر یہ رونق اس لئے بھی نہیں ہے کہ انسان اس کی زینت پر فریفتہ ہو کر رہ جائے۔ اور اپنی تخلیق کا مقصد فراموش کردے۔ بلکہ یہ امتحان گاہ ہے —— تا کہ ہم لوگوں کو آزمائیں کہ ان میں سب سے زیادہ اچھا عمل کرنے والا کون ہے؟ —— تا کہ وہ جنت کے اونچے درجوں کا حقدار بنے۔ یہ مضمون سورۃ الملک کی دوسری آیت میں بھی آیا ہے ارشاد ہے: ﴿الَّذِیْ خَلَقَ الْمَوْتَ وَالْحَیَاۃَ لِیَبْلُوَکُمْ اَیُّکُمْ اَحْسَنُ عَمَلاً وَھُوَ الْعَزِیْزُ الْغَفُوْرُ﴾ ترجمہ: جس نے مرنا اور جینا بنایا تا کہ تم کو جانچے کہ کون تم میں سے سب سے زیادہ اچھے کام کرنے والا ہے اور وہ زبردست بڑا بخشنے والا ہے۔

مرنا جینا بنایا یعنی دنیا کی یہ زندگی بنائی۔ کیونکہ اسی زندگی میں یہ دونوں باتیں پائی جاتی ہیں اس سے پہلی زندگی میں عدم تھا اور آخرت میں زندگی ہوگی مرنا نہیں ہوگا۔ جینا پھر مرنا اسی دنیا میں ہے اور یہ سلسلہ اس لئے قائم کیا گیا ہے کہ لوگوں کے اعمال کی جانچ کی جائے کہ کون برے کام کرتا ہے کون اچھے، اور کون اچھے سے اچھے، تا کہ آئندہ زندگی میں اس کا انجام سامنے آئے۔ کیونکہ اگر دنیا کی یہ زندگی نہ ہوتی اور عمل نہ ہوتا تو جزا کس بات کی ہوتی؟ اور یہاں موت نہ آتی تو انسان کب تک عمل کرتا؟ اور نتیجۂ عمل سے ایک شاد کام ہوتا؟ اور اگر دوسری زندگی نہ ہوتی تو بھلے بُرے کی تمیز کیسے ہوتی؟ اور کب ہوتی؟ غرض انہی مصلحتوں کی وجہ سے اللہ تعالیٰ نے دنیا کی یہ چندروزہ زندگی پیدا کی ہے تا کہ انسان اس میں عمل کرے اور آنے والی زندگی میں اس کا پھل کھائے۔

فائدہ: ان آیتوں میں غور کرنے سے یہ بات واضح ہوتی ہے کہ دنیا کی یہ زندگی یہ دیکھنے کے لئے نہیں ہے کہ کون برے کام کرتا ہے یا کون بُرے سے بُرے کام کرتا ہے؟ اگرچہ یہ بات بھی ضمناً سامنے آ ہی جائے گی مثلاً تعلیم گاہ اس لئے قائم کی جاتی ہے کہ دیکھا جائے کہ کون اعلیٰ نمبرات حاصل کرتا ہے، اور کس کو طلائی یا نُقرئی تمغہ ملتا ہے۔ اگرچہ امتحان کے نتیجہ میں بعض بدشوق طلبہ فیل بھی ہو جاتے ہیں اور وہ سرزنش کے مستحق بھی ہوتے ہیں مگر تعلیم گاہ کے قیام کی غرض وہ طلبہ نہیں ہوتے۔ اسی طرح یہ عالم رنگ و بو بہتر سے بہتر کام کرنے والوں کو چھانٹنے کے لئے ہے تا کہ ان کو جنت کے بلند سے بلند درجے عطا فرمائے جائیں —— یہ حضرات سابقین اولین ہیں اور نسبۃً کچھ کم نمبرات حاصل کرنے والے اصحاب الیمین ہیں جو جنت کے فروتر درجات حاصل کریں گے اور بُرے کام کرنے والے بھی چھٹ جائیں گے جو جہنم رسید ہوں گے بلکہ بد سے بدتر اعمال کرنے والے بھی ہونگے جن کو جہنم میں سخت سے سخت سزا دی جائے گی مگر مقصد حیات صرف قسم اول کو چھانٹنا ہے تا کہ ان کا پوری طرح اعزاز کیا جاسکے۔ اللہ تعالیٰ ہم سب کو بہتر

سے بہتر اعمال کی توفیق عطا فرمائیں اور جنت کے بلند سے بلند درجات سے سرفراز فرمائیں (آمین)

اس کے بعد اس زمینی زندگی کا انجام سنئے ـــــ اور ہم یقیناً زمین کی تمام چیزوں کو ایک چٹیل میدان بنا دینے والے ہیں ـــــ یعنی جس روز یہ امتحان نمٹ جائے گا اسی روز یہ بساط عیش لپیٹ دی جائے گی اور یہ زمین ایک چٹیل میدان کے سوا کچھ نہ رہے گی۔ جو لوگ اس کے بناؤ سنگار پر ریجھ رہے ہیں وہ خوب سمجھ لیں کہ یہ رزق برق دنیا کوئی باقی رہنے والی چیز نہیں۔ دنیا کا ٹھاٹھ خواہ کتنا ہی جمع کرلو اور مادی ترقیات سے زمین کو گل وگلزار بنا لو جب تک آسمانی ہدایت سے تہی دست رہو گے حقیقی سرور وطمانینت اور ابدی نجات وفلاح سے ہم کنار نہیں ہوؤ گے۔ حقیقی کامیابی وہی لوگ حاصل کرتے ہیں جو اللہ کی خوشی پر دنیا کی ہر ایک خوشی قربان کردیتے ہیں اور راہ حق کی جادہ پیمائی میں کسی صعوبت سے نہیں گھبراتے، نہ دنیا کے بڑے بڑے طاقت ور جبّاروں کی تخویف وترہیب سے ان کا قدم ڈگمگاتا ہے۔

دنیا کا عیش چند روزہ ہے، یہاں جو کرنا ہے کرلے، انجام اِس کا فنا ہے

أَمْ حَسِبْتَ أَنَّ أَصْحٰبَ الْكَهْفِ وَالرَّقِيْمِ كَانُوْا مِنْ اٰيٰتِنَا عَجَبًا ۝٩ إِذْ أَوَى الْفِتْيَةُ إِلَى الْكَهْفِ فَقَالُوْا رَبَّنَآ اٰتِنَا مِنْ لَّدُنْكَ رَحْمَةً وَّهَيِّئْ لَنَا مِنْ أَمْرِنَا رَشَدًا ۝١٠ فَضَرَبْنَا عَلٰٓى اٰذَانِهِمْ فِي الْكَهْفِ سِنِيْنَ عَدَدًا ۝١١ ثُمَّ بَعَثْنٰهُمْ لِنَعْلَمَ أَيُّ الْحِزْبَيْنِ أَحْصٰى لِمَا لَبِثُوْٓا أَمَدًا ۝١٢ ع ۱۲/۱۳

أَمْ حَسِبْتَ (۱)	کیا تو خیال کرتا ہے	أَصْحٰبَ الْكَهْفِ (۲)	غار (کھوہ) والے	كَانُوْا	تھے وہ
أَنَّ	کہ	وَالرَّقِيْمِ (۳)	اور نوشتہ ناموں والے	مِنْ اٰيٰتِنَا	ہماری نشانیوں میں سے

(۱) أَمْ منقطعہ بمعنی استفہام انکاری ہے، جملہ أَنَّ أَصْحَابَ إلخ حَسِبْتَ کا مفعول بہ ہے، جملہ كَانُوْا إلخ أَنَّ کی خبر ہے اور عَجَبًا، كَانُوْا کی خبر ہے اور مصدر کا حمل یا تو مبالغۃً یا مضاف محذوف ہے أي ذاتَ عَجَبٍ اور مِنْ آيَاتِنَا محذوف سے متعلق ہو کر عَجَبًا کا حال ہے أي حَالَ كَوْنِهِمْ مِنْ جُمْلَةِ آيَاتِنَا (۲) اَلْكَهْفُ: کھوہ، غار۔ اور کہف میں فرق یہ ہے کہ غار چھوٹا ہوتا ہے اور کہف وسیع۔ اور اردو میں چھوٹا غار اور بڑا غار کہہ کر فرق کرتے ہیں جمع كُهُوْفٌ (۳) رَقِيْمٌ بروزن فَعِيْلٌ بمعنی مَرْقُوْمٌ: لکھا ہوا، نوشتہ، الرَّقِيْم کے بارے میں مفسرین کے چھ سے زیادہ اقوال ہیں (۱) اس بستی کا نام ہے جہاں سے اصحاب کہف نکلے تھے، اس کی اسناد ضعیف ہے قاله ابن الحجر في الفتح (۲) اس پہاڑی کا نام ہے جس میں وہ غار ہے (۳) کتے کا نام ہے (۴) وادی (میدان) کا نام ہے جو اس کوہ کے دامن میں ہے جس میں وہ غار ہے من رَقْمَةِ الْوَادِيْ یعنی وادی کا کنارہ (۵) وہ تختی جس ←

عَجَبًا	عجیب چیز!	رَحْمَةً	مہربانی	ثُمَّ	پھر
اِذْ	جب	وَّهَيِّئْ (۳)	اور مہیا کر	بَعَثْنٰهُمْ	اٹھایا ہم نے ان کو
اَوَى	پناہ لی	لَنَا	ہمارے لئے	لِنَعْلَمَ	تاکہ جانیں ہم
الْفِتْيَةُ (۱)	چند نوجوانوں نے	مِنْ اَمْرِنَا	ہمارے معاملہ میں	اَيُّ (۶)	کس نے
اِلَى الْكَهْفِ	ایک غار میں	رَشَدًا (۴)	راہ یابی	الْحِزْبَيْنِ	دو گروہوں میں سے
فَقَالُوْا	تو دعا کی انھوں نے	فَضَرَبْنَا	پس تھپک دیا ہم نے	اَحْصٰى (۷)	ضبط کیا ہے
رَبَّنَآ	اے ہمارے پروردگار	عَلٰٓى اٰذَانِهِمْ	ان کے کانوں پر	لِمَا	اس کو جو
اٰتِنَا	عطا فرما ہم کو	فِي الْكَهْفِ	غار میں	لَبِثُوْٓا	ٹھہرے وہ
مِنْ لَّدُنْكَ (۲)	خاص اپنے پاس سے	سِنِيْنَ (۵) عَدَدًا	سالہا سال تک	اَمَدًا	مدت کے اعتبار سے

یہ خوشنما دنیا اور یہ دل پسند جہاں ایک امتحان گاہ ہے اس کارخانہ کو دیکھنے کے لئے پیدا کیا گیا ہے کہ کون بہتر عمل کرتا ہے۔اس لئے جب تک مقصد کی راہ میں یہ دنیا رکاوٹ نہ بنے اس میں دل لگایا جاسکتا ہے مگر جب دنیا کی عیش کا

← میں اصحاب کہف کے نام اور حالات لکھے گئے تھے اور جو کہف کے دھانے پر نصب کی گئی تھی (رَقِيْمٌ بمعنى مَرْقُوْم)
(۲) سیسہ کی تختی جس پر اصحاب کہف کے نام وغیرہ لکھ کر شاہی خزانہ میں رکھی گئی تھی۔امام بخاری رحمہ اللہ نے اس قول کو اپنی صحیح میں تعلیقاً ذکر کیا ہے اور حافظ ابن حجر رحمہ اللہ نے اس کی اسناد کو بخاری کی شرط پر صحیح بتایا ہے (فتح الباری ۸:۴۰۶ کتاب التفسیر تفسیر سورۃ الکہف) اس لئے ہم نے یہی قول اختیار کیا ہے واللہ اعلم بالصواب

(۱) فِتْيَةٌ جمع قلت کا وزن ہے جس کا اطلاق تین تا دس پر ہوتا ہے (۲) مِنْ لَدُنْكَ محذوف سے متعلق ہوکر رَحْمَةً کا حال بھی ہوسکتا ہے اور آتِنَا سے متعلق بھی ہوسکتا ہے (۳) هَيِّءْ (فعل امر) هَيَّأَهُ تَهْيِئَةً (تفعیل): درست کرنا، تیار کرنا، مہیا کرنا۔ (۴) رَشَدٌ باب نصر کا مصدر ہے جس کے معنی ہیں راہ راست پانا۔امام راغب نے لکھا ہے کہ رَشَدٌ، رُشْدٌ سے اخص ہے کیونکہ رُشْد امور دنیویہ اور اخرویہ دونوں میں مستعمل ہے اور رَشَدٌ صرف امور اخرویہ میں اور مِنْ أَمْرِنَا محذوف سے متعلق ہوکر رُشْد کا حال بھی ہوسکتا ہے اور هَيِّءْ سے متعلق بھی ہوسکتا ہے (۵) سِنِيْنَ مفعول فیہ ہے اور عَدَدًا صفت ہے سِنِيْنَ کی اور مضاف محذوف ہے أي ذَوَاتَ عَدَدٍ (۶) أَيُّ الْحِزْبَيْنِ (مرکب اضافی) مبتدا جملہ اَحْصٰى خبر۔أَحْصٰى فعل ماضی فاعل ضمیر مستتر، مرجع كُلُّ وَاحِدٍ مِّنَ الْحِزْبَيْنِ؛ لِمَا لَبِثُوْا، أَحْصٰى کا مفعول بہ بواسطہ حرف جر اور اَمَدًا تمیز ہے (۷) اَحْصٰى کو تمام اکابر مفسرین نے فعل ماضی قرار دیا ہے اور احصاء کا مفہوم صرف یاد کرنے اور حفظ کرنا نہیں بلکہ اس کے مفہوم میں اِتِّعاظ کا مفہوم بھی شامل ہے اور کچھ مفسرین نے اس کو اسم تفضیل قرار دیا ہے اس صورت میں ترجمہ ہوگا: ''دو گروہوں میں سے کونسا ان کے ٹھیرنے کی مدت سے زیادہ واقف ہے''

مقصد حیات سے ٹکراؤ ہو جائے اور دین و دنیا کی ایک ساتھ تحصیل ممکن نہ رہے تو دنیا سے کنارہ کشی ضروری ہے اس وقت مؤمن دنیا کی رعنائیوں سے دل ہٹالیتا ہے بلکہ اگر زندگی سے ہاتھ دھو لینے پڑیں تو وہ اس سے بھی دریغ نہیں کرتا۔ اس سلسلہ میں غار والے بزرگوں کی داستانِ حیات بہترین نمونۂ عمل ہے۔ وہ کھوہ میں کچھ اس لئے نہیں جا بیٹھے تھے کہ دنیا سے ان کا دل بھر گیا تھا وہ بوڑھے کھوسٹ بھی نہیں ہو گئے تھے۔ بلکہ وہ سب جوان رعنا تھے۔ ان کی امیدوں کی کلیاں ابھی کھلنی باقی تھیں، ان کا دنیا کی بہاروں سے لطف اندوز ہونے کا زمانہ تھا، وہ معمولی گھرانوں کے افراد بھی نہیں تھے، اونچے خاندانوں کے چشم و چراغ تھے جن کو آسائش کا ہر سامان میسر تھا مگر جب انھوں نے دیکھا کہ دین و دنیا کو ساتھ لے کر چلنا ممکن نہیں، تو اُن بندگان خدا نے جو فیصلہ کیا وہ رہتی دنیا تک مسلمانوں کے لئے مشعل راہ ہے۔ وہ دنیا کی آسائشوں سے منہ موڑ کر اور زندگی کی لذتوں پر لات مار کر شہر سے چل دیئے اور سنسان جنگل میں ایک گہرے غار میں پناہ لی تا کہ دنیا ہاتھ سے چھوٹے تو چھوٹے، دین نہ چھوٹے۔ ان آیات پاک میں انہی نوجوانوں کی سبق آموز اور عبرت بھری داستان ہے۔

ان چار آیتوں میں پورے واقعہ کا خلاصہ کیا گیا ہے اس سے تاریخ نگاری اور مضمون نویسی کا سلیقہ سیکھا جاسکتا ہے یعنی اگر کوئی لمبا مضمون یا طویل داستان بیان کرنی ہو تو گفتگو کے آغاز ہی میں ساری بات کا نچوڑ پیش کر دینا چاہئے تا کہ مخاطب کو انتظار کی تکلیف سے نجات ملے، اور اجمال کے بعد تفصیل جاننے کا شوق پیدا ہو ارشاد ہے —— کیا آپ خیال کرتے ہیں کہ غار والے اور نوشتہ ناموں والے ہماری (قدرت کی) نشانیوں میں سے کچھ عجیب چیز تھے؟!
—— یعنی اللہ کی قدرت کی نشانیاں ہر سو پھیلی ہوئی ہیں۔ یہ بے ستونوں والا آسمان یہ چوڑی چکلی زمین، یہ بڑے بڑے دیو ہیکل پہاڑ اور یہ ٹھاٹھیں مارتے دریا اور سمندر کیا کم عجائبات قدرت ہیں، جو تم غار والوں اور نوشتہ ناموں والے بزرگوں کی داستان پوچھتے ہو۔ ایسا اندازہ ہوتا ہے کہ تمہارے نزدیک اس واقعہ سے بڑی کوئی حیرت کی بات نہیں۔ حالانکہ یہ واقعہ عجائبات قدرت میں ایک معمولی واقعہ ہے، تم نظر ڈالو گے تمہیں چاروں طرف نشانیاں ہی نشانیاں نظر آئیں گی۔

اس آیت میں انکار و استعجاب غار والوں کا واقعہ دریافت کرنے پر نہیں بلکہ اس کو ایک عجوبہ سمجھ کر سوال کرنے پر ہے، اگر لوگ یہ داستان نصیحت پذیری اور سبق حاصل کرنے کے لئے پوچھتے تو انکار کی کوئی بات نہیں تھی، بلکہ اس وقت سوال قابل ستائش ہوتا۔

اور اصحاب الکہف کے بعد اصحاب الرقیم اس لئے بڑھایا کہ اصحاب الکہف متعدد ہیں۔ مفسرین کرام نے پانچ سے

زیادہ اصحاب الکہف کا تذکرہ کیا ہے۔

۱ ــــ ضحاک کہتے ہیں کہ روم کے ایک شہر میں ایک غار ہے جس میں اکیس آدمی لیٹے ہوئے ہیں ایسا معلوم ہوتا ہے کہ سو رہے ہیں۔

۲ ــــ ابن عطیہ ملک شام کے ایک غار کا تذکرہ کرتے ہیں جس میں کچھ مردہ لاشیں ہیں اور اس غار کے پاس ایک مکان اور مسجد کی تعمیر بھی ہے۔

۳ ــــ ابن عطیہ نے دوسرا واقعہ اندلس کے شہر غرناطہ کا بیان کیا ہے وہاں ایک بستی کو شہ میں ایک غار ہے جس میں کچھ مردہ لاشیں ہیں۔ان کے قریب ایک مسجد بھی ہے۔

۴ ــــ ابن عباس رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ ساحل عقبہ کے پاس فلسطین سے نیچے اَیلہ کے قریب یہ غار ہے۔

۵ ــــ ایک واقعہ ''افسوس'' شہر کا بیان کیا گیا ہے جس کا اسلامی نام طرسوس ہے۔ یہ شہر ایشائے کوچک کے مغربی ساحل پر ہے۔

غرض دین کو بچانے کے لئے پہاڑ کی کھوہ میں پناہ لینے کے متعدد واقعات پیش آئے ہیں۔قرآن کریم نے ان میں سے اُن اصحاب کہف کا واقعہ بیان کیا ہے جن کے نام اور حالات ایک سیسے کی تختی پر لکھ کر شاہی خزانہ میں رکھ لئے گئے تھے۔ کیونکہ یہ اونچے خاندان کے نوجوان تھے۔ان کی اچانک گمشدگی ان کے خاندانوں کے لئے، عام لوگوں کے لئے اور حکومت وقت کے لئے تشویش کا باعث بن گئی تھی۔لوگوں نے ان نوجوانوں کو ڈھونڈھنے میں کوئی کسر باقی نہیں چھوڑی تھی مگر ناکام رہے تھے اس لئے ان کے نام، حلیے اور حالات وغیرہ لکھ کر شاہی خزانہ میں رکھ لئے تھے۔

ارشاد ہے: وہ وقت یاد کرو ــــ جب چند نوجوان غار میں پناہ گزیں ہوئے، انھوں نے دعا کی: اے ہمارے پروردگار! ہم کو اپنی رحمت خاص سے نواز دے اور ہمارے لئے دینی معاملہ میں راہ یابی کی شکل پیدا فرما! ــــ یعنی ہم آپ کی مدد کے بغیر راہ راست پر استوار نہیں رہ سکتے۔دشمن ہاتھ دھوکر ہمارے پیچھے پڑا ہوا ہے اور قتل کرنے کے درپے ہے ــ اللہ تعالیٰ نے اُن شکستہ حال بندوں کی دعا قبول فرمائی اور ان کی حفاظت کا بہترین انتظام فرمایا، ارشاد ہے ــــ پس ہم نے اس غار میں ان کے کانوں کو سالہا سال تک تھپک دیا ــــ اور ان گہری کو نیند سلا دیا ــــ پھر ہم نے ان کو اٹھایا ــــ یعنی بیدار کیا ــــ تا کہ ہم دیکھیں کہ دو جماعتوں میں سے کس نے اُس مدت کو زیادہ یاد رکھا ہے جو وہ لوگ ٹھہرے ــــ جس وقت اصحاب کہف بیدار ہوئے ہیں، شہر میں ایک اہم مسئلہ میں نزاع چل رہا تھا اور لوگ دو جماعتوں میں بٹ گئے تھے۔ یہ مسئلہ بعث بعد الموت کا مسئلہ تھا ایک جماعت کہتی تھی

کہ مرنے کے بعد حیات جسمانی نہیں، دوسری جماعت معاد جسمانی اور روحانی دونوں کی قائل تھی، آیت پاک میں دو جماعتوں سے یہی دو جماعتیں مراد ہیں جیسا کہ آگے تفصیل سے آرہا ہے۔ ایسے اختلاف کے وقت میں اللہ تعالیٰ نے اصحاب کہف کو بیدار کیا تا کہ لوگ مدت دراز کے بعد ان کے سوکر بیدار ہونے سے بعث بعد الموت پر استدلال کریں اور جان لیں کہ نیند موت کی بہن ہے جب اتنی لمبی مدت کے بعد بیداری ہوسکتی ہے تو زندگی کیوں ممکن نہیں؟

اللہ کی قدرت دیکھو! اصحاب کہف کو سُلا کر ان کے دین کی حفاظت کی اور جگا کر لوگوں کے دین کی حفاظت کی

نَحْنُ نَقُصُّ عَلَيْكَ نَبَاَهُمْ بِالْحَقِّ ۭ اِنَّهُمْ فِتْيَةٌ اٰمَنُوْا بِرَبِّهِمْ وَزِدْنٰهُمْ هُدًى ﴿١٣﴾ وَّرَبَطْنَا عَلٰي قُلُوْبِهِمْ اِذْ قَامُوْا فَقَالُوْا رَبُّنَا رَبُّ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ لَنْ نَّدْعُوَا مِنْ دُوْنِهٖٓ اِلٰـهًا لَّقَدْ قُلْنَآ اِذًا شَطَطًا ﴿١٤﴾ هٰٓؤُلَاۗءِ قَوْمُنَا اتَّخَذُوْا مِنْ دُوْنِهٖٓ اٰلِهَةً ۭ لَوْلَا يَاْتُوْنَ عَلَيْهِمْ بِسُلْطٰنٍۢ بَيِّنٍ ۭ فَمَنْ اَظْلَمُ مِمَّنِ افْتَرٰى عَلَي اللّٰهِ كَذِبًا ﴿١٥﴾ وَاِذِ اعْتَزَلْتُمُوْهُمْ وَمَا يَعْبُدُوْنَ اِلَّا اللّٰهَ فَاْوٗٓا اِلَى الْكَهْفِ يَنْشُرْ لَكُمْ رَبُّكُمْ مِّنْ رَّحْمَتِهٖ وَيُهَيِّئْ لَكُمْ مِّنْ اَمْرِكُمْ مِّرْفَقًا ﴿١٦﴾

نَحْنُ	ہم	اٰمَنُوْا(۲)	ایمان لائے وہ	فَقَالُوْا	پس کہا انھوں نے
نَقُصُّ	بیان کرتے ہیں	بِرَبِّهِمْ	اپنے رب پر	رَبُّنَا	ہمارے رب
عَلَيْكَ	آپ کے سامنے	وَزِدْنٰهُمْ	اور زیادہ کی ہم نے انکی	رَبُّ السَّمٰوٰتِ	آسمان اور زمین
نَبَاَهُمْ	ان کا واقعہ	هُدًى	ہدایت	وَالْاَرْضِ	کے رب ہیں
بِالْحَقِّ(۱)	ٹھیک ٹھیک	وَّرَبَطْنَا	اور گرہ دی ہم نے	لَنْ نَّدْعُوَا(۴)	ہرگز نہ پکاریں گے ہم
اِنَّهُمْ	بے شک وہ لوگ	عَلٰي قُلُوْبِهِمْ	ان کے دلوں پر	مِنْ دُوْنِهٖٓ	ان کے سوا
فِتْيَةٌ	چند نوجوان تھے	اِذْ قَامُوْا(۳)	جب کھڑے ہوئے وہ	اِلٰـهًا	کسی معبود کو

(۱) بِالْحَقِّ محذوف سے متعلق ہو کر نَبَاً کا حال ہے أی مُتَلَبِّسًا بالحق (۲) جملہ آمَنُوْا صفت ہے فِتْيَةٌ کی۔ (۱) اِذْ قَامُوْا اِلخ ظرف ہے رَبَطْنَا کا (۲) لَنْ نَدْعُوَا (فعل مضارع منصوب بلن، صیغہ جمع متکلم) آخر کا واو جمع کا واو نہیں ہے بلکہ لام کلمہ ہے مگر چونکہ واو جمع کے مشابہ ہے اس لئے قرآنی رسم الخط میں اس کے بعد الف لکھا جاتا ہے جو پڑھا نہیں جاتا اور اس پر چھوٹا سا ←

لَقَدْ قُلْنَآ	البتہ تحقیق کہی ہم نے	بَيِّنٍ	کھلی؟	اِلَّا	سوائے
اِذًا	تب تو	فَمَنْ	پس کون	اللّٰهَ	اللہ تعالیٰ کے
شَطَطًا (۱)	بڑی بے جابات	اَظْلَمُ	بڑا ناانصاف ہے	فَاْوٗٓا (۳)	تو پناہ لو تم
هٰٓؤُلَآءِ	یہ	مِمَّنِ	اس شخص سے جو	اِلَى الْكَهْفِ	کسی غار میں
قَوْمُنَا	ہماری قوم ہے	افْتَرٰی	باندھتا ہے	يَنْشُرْ	پھلائیں گے
اتَّخَذُوْا	ٹھہرالئے ہیں انھوں نے	عَلَى اللّٰهِ	اللہ تعالیٰ پر	لَكُمْ	تم پر
مِنْ دُوْنِهٖٓ	اللہ تعالیٰ کے سوا	كَذِبًا	جھوٹ!	رَبُّكُمْ	تمہارے رب
اٰلِهَةً	معبود	وَ اِذِ	اور جب	مِّنْ رَّحْمَتِهٖ	اپنی مہربانی میں سے
لَوْلَا	کیوں نہیں	اعْتَزَلْتُمُوْهُمْ	کنارہ کش ہو گئے تم	وَيُهَيِّئْ	اور مہیا کریں گے
يَاْتُوْنَ	لاتے وہ		ان سے	لَكُمْ	تمہارے لئے
عَلَيْهِمْ	ان پر	وَمَا (۲)	اور جن کو	مِّنْ اَمْرِكُمْ	تمہارے معاملہ میں سے
بِسُلْطٰنٍ	کوئی دلیل	يَعْبُدُوْنَ	پوجتے ہیں وہ	مِّرْفَقًا (۴)	اسباب راحت

اصحاب کہف کا مفصل قصہ: ـــــ ہم آپ سے ٹھیک ٹھیک ان کا واقعہ بیان کرتے ہیں ـــــ یعنی قرآن کے بیان میں کوئی بات خلاف واقعہ نہیں اور ہو بھی نہیں سکتی کیونکہ قرآن کلام ہے خالق کائنات کا، جوغیب وشہادت کے

→ گول دائرہ اس کے نہ پڑھے جانے کی علامت ہے

(۱) شَطَطَ نصر اور ضرب کا مصدر ہے اس کے اصلی معنی ہیں حد سے زیادہ دور ہونا اور جو بات حق سے بہت دور ہو اس کو بھی شَطَطْ کہتے ہیں (۲) وَمَا يَعْبُدُوْنَ کا عطف هُمْ پر ہے (۳) فَأْوٗا میں فا جزائیہ ہے اس کے بعد اِوْا فعل امر، صیغہ جمع مذکر حاضر ہے اَوىٰ يَاْوِیْ (ض) اُوِيًّا وَاِوَاءً ا إِلَى الْبَيْتِ: ٹھکانہ لینا، اترنا، اور اِوْا کی اصل اِءْ وِيُوْا ہے آخر کی ی امر کی وجہ سے گرگئی پھر پہلے واو کو دوسرے واو کی مناسبت سے ضمہ دیدیا اور شروع میں ہمزۂ ساکنہ، ہمزۂ متحرکہ کے بعد آیا ہے اس لئے اس کو ماقبل کی حرکت کے موافق ی سے بدل دیا تو اِيْوُوْا ہوا۔ اور آیت پاک میں چونکہ اس پر فا داخل ہوئی ہے اس لئے امر کا ہمزہ ساکن ہو گیا کیونکہ وہ ہمزہ وصلی ہے اور ہمزہ اور ی دو ساکن اکٹھا ہونے کی وجہ سے ی گرگئی تو فَاْوُوْا ہوا۔ پھر دوسرے واو کو قرآنی رسم الخط میں الٹے پیش کی شکل میں لکھا گیا تو فَاْوٗا ہوا (٦) اَلْمِرْفَقْ (اسم آلہ) وہ چیز جس کے ذریعہ نفع حاصل کیا جائے۔ کہنی کو بھی مرفق اسی لئے کہتے ہیں کہ اس کے سہارے آدمی آرام پاتا ہے۔ جمع مَرَافِقْ، مِرْفَقَةٌ: تکیہ، مَرَافِقُ الدَّار: مکان سے فائدہ حاصل کرنے کی جگہیں، جیسے پرنالہ، بیت الخلاء، دروازہ راستہ وغیرہ اسباب راحت مِنْ أَمْرِكُمْ، مِرْفَقًا کا حال بھی ہو سکتا ہے اور فعل يُهَيِّءُ سے متعلق بھی ۱۲

جاننے والے ہیں کائنات کا کوئی ذرّہ ان کے علم سے پوشیدہ نہیں ـــــ وہ چند نوجوان تھے جو اپنے پروردگار پر ایمان لائے تھے اور ہم نے ہدایت میں ان کو ترقی بخشی تھی ـــــ یہ چند نوجوان کسی ظالم بادشاہ کے عہد میں تھے۔ بادشاہ غالی بت پرست تھا اور جبر و اکراہ سے بت پرستی کی اشاعت کرتا تھا یہ نوجوان سچے دین پر ایمان لے آئے تھے ان کا تعلق عمائدین سلطنت سے تھا، ان کے دل نور تقوی سے لبریز تھے۔ حق تعالیٰ نے ان کو ایمان میں پختگی کی دولت سے مالا مال کیا تھا ـــ یہ نوجوان کس مذہب پر تھے؟ اس میں اختلاف ہے۔ بعض نے کہا ہے کہ نصرانی یعنی اصل دین مسیحی کے پیروکار تھے۔ لیکن علامہ ابن کثیر رحمہ اللہ نے مختلف قرائن سے اس بات کو ترجیح دی ہے کہ اصحاب کہف کا قصہ مسیح علیہ السلام سے پہلے کا ہے ـــــ یہ نوجوان شاہی دربار میں طلب کئے گئے یا از خود دین کی دعوت لیکر وہاں پہنچے اور بادشاہ کے روبرو اپنی ایمانی جرأت اور استقلال کا وہ مظاہرہ کیا کہ دیکھنے والے دنگ رہ گئے۔ ارشاد ہے ـــــ اور ہم نے ان کے دل اس وقت مضبوط کر دیئے جب وہ (دربار میں جوابدہی کے لئے یا دعوت دینے کے لئے) کھڑے ہوئے۔ پس انھوں نے کہا ہمارے پروردگار وہی ہیں جو آسمانوں اور زمین کے پروردگار ہیں، ہم ان کو چھوڑ کر کسی دوسرے معبود کی ہرگز عبادت نہ کریں گے ـــــ اگر ہم ایسا کریں ـــــ تو اس صورت میں ہم یقیناً بہت بے جا بات کہیں گے ـــــ یعنی جب وہ نوجوان بت پرست ظالم بادشاہ کے روبرو دین کی دعوت دینے کے لئے پہنچے تو اللہ تعالیٰ نے ان کے دل مضبوط کر دیئے یا بادشاہ نے ان نوجوانوں کو اپنے دربار میں حاضر کر کے سوالات کئے تو قتل کے خوف کے باوجود اللہ تعالیٰ نے ان کے دلوں پر اپنی محبت اور عظمت ایسی مسلط کر دی کہ وہ ذرہ برابر نہیں گھبرائے اور اپنے عقیدے کا صاف صاف اظہار کر دیا کہ ہم بتوں کو خدا نہیں مانتے، ہم خالق ارض و سماء ہی کو خدا مانتے ہیں۔ اور اس کے سوا کسی معبود کی عبادت نہیں کرتے اور آئندہ بھی ہم سے یہ امید نہ رکھی جائے کہ ہم اس حقیقی معبود کو چھوڑ کر دوسرے فرضی معبودوں کو اختیار کر لیں گے۔ اگر ہم ایسا کریں گے تو یہ ایک نہایت نامعقول بات ہوگی۔ جس کی ہم سے امید نہ رکھی جائے ـــــ یہ ہماری قوم ہے جو خدا کو چھوڑ کر دوسرے معبود ٹھہرائے ہوئے ہے وہ ان کے معبود ہونے پر کوئی واضح دلیل کیوں نہیں لاتی؟ ـــــ یعنی شرک تو محض بے اصل عقیدہ ہے اس پر کوئی ٹھوس دلیل نہیں۔ کچھ ڈھکوسلے ہیں جن سے لوگ استدلال کرتے ہیں، حالانکہ عقیدے کے لئے نہایت واضح اور مضبوط دلیل درکار ہوتی ہے جو ہماری قوم میں سے کسی کے پاس نہیں ـــــ پس اس سے بڑا ظالم کون ہے جو اللہ تعالیٰ پر جھوٹ باندھے! ـــــ یعنی جب شرک کی معقولیت کی کوئی دلیل نہیں تو اللہ تعالیٰ کا شریک ٹھہرانا کتنا بڑا غضب ڈھانا ہے!

نوجوانوں کی یہ باتیں سن کر کچھ تو بادشاہ کو ان کی جوانی پر رحم آیا اور کچھ دوسرے مشاغل مانع ہوئے نیز وہ عمائدین

شہر کے متعلقین تھے اس لئے ایک دم ان پر ہاتھ ڈالنا مصلحت معلوم نہ ہوا اس لئے ان کو چند یوم کی مہلت دی تا کہ وہ اپنے معاملہ میں غور وفکر اور نظر ثانی کر لیں۔ وہ حضرات دربار سے نکلے اور باہم مشورہ کے لئے بیٹھے اور یہ طے کیا کہ اب شہر میں قیام خطرہ سے خالی نہیں۔ مناسب یہ ہے کہ شہر کے قریب کسی کھوہ میں روپوش ہو جائیں اور واپسی کے لئے کسی مناسب موقع کا انتظار کریں ـــــ اور جب تم ان لوگوں سے اور ان کے اُن معبودوں سے جو اللہ کے سوا ہیں، بے تعلق ہو گئے تو اب کسی غار میں چل کر پناہ لو، تمہارا پروردگار تم پر اپنی خاص مہربانی پھیلا دے گا اور تمہارے لئے تمہارے معاملہ میں آسانی مہیا فرمائے گا ـــــ یعنی جب مشرکین کے دین سے ہم علیحدہ ہیں تو ظاہری طور پر بھی ہمیں ان سے علیحدہ رہنا چاہئے اور دنیا چھٹنے کا غم نہیں کھانا چاہئے اللہ تعالیٰ کی مہربانی کا امیدوار رہنا چاہئے وہ ہمارے معاملات میں آسانی پیدا فرمائیں گے اور ہر قسم کی سہولتیں فراہم کریں گے اس لئے بے فکر ہو کر شہر سے چل دو اور کسی کھوہ میں جا بیٹھو۔ کیونکہ مؤمن کا اعتماد اسباب پر نہیں ہوتا بلکہ اللہ تعالیٰ پر ہوتا ہے اور دین کی رسّی مضبوط پکڑنے کے لئے اگرچہ ماحول سازگار نہیں، مگر اللہ کے بھروسہ پر راہ حق میں قدم اٹھا دینا چاہئے۔

وَتَرَى الشَّمْسَ إِذَا طَلَعَتْ تَّزٰوَرُ عَنْ كَهْفِهِمْ ذَاتَ الْيَمِيْنِ وَإِذَا غَرَبَتْ تَّقْرِضُهُمْ ذَاتَ الشِّمَالِ وَهُمْ فِيْ فَجْوَةٍ مِّنْهُ ۭ ذٰلِكَ مِنْ اٰيٰتِ اللّٰهِ ۭ مَنْ يَّهْدِ اللّٰهُ فَهُوَ الْمُهْتَدِ ۚ وَمَنْ يُّضْلِلْ فَلَنْ تَجِدَ لَهٗ وَلِيًّا مُّرْشِدًا ﴿١٧﴾ وَتَحْسَبُهُمْ اَيْقَاظًا وَّهُمْ رُقُوْدٌ ڰ وَّنُقَلِّبُهُمْ ذَاتَ الْيَمِيْنِ وَذَاتَ الشِّمَالِ ڰ وَكَلْبُهُمْ بَاسِطٌ ذِرَاعَيْهِ بِالْوَصِيْدِ ۭ لَوِ اطَّلَعْتَ عَلَيْهِمْ لَوَلَّيْتَ مِنْهُمْ فِرَارًا وَّلَمُلِئْتَ مِنْهُمْ رُعْبًا ﴿١٨﴾

ع ۲ ۵ ۱۴

وَتَرَى	اور تو دیکھے گا	طَلَعَتْ	نکلتا ہے وہ	ذَاتَ الْيَمِيْنِ(۲)	داہنی جانب
الشَّمْسَ	سورج کو	تَّزٰوَرُ(۱)	کترا جاتا ہے	وَإِذَا	اور جب
إِذَا	جب	عَنْ كَهْفِهِمْ	ان کی کھوہ سے	غَرَبَتْ	ڈوبتا ہے

(۱) تَزٰوَرُ اصل میں تَتَزَاوَرُ تھا ایک تا حذف کی گئی ہے (فعل مضارع، صیغہ واحد مؤنث غائب) تَزَاوَرَ الْقَوْمُ: ایک دوسرے کی زیارت کرنا اور جب اس کے صلہ میں عَنْ آئے تو معنی ہوتے ہیں انحراف کرنا، رخ بچانا، سینہ موڑنا، بچ کر نکل جانا، کترا جانا تَقْرِضُهُمْ (مضارع، واحد مؤنث غائب) قَرَضَ قَرْضًا: کترا جانا، کترنا (۲) ذَاتَ، ذُوْ کا مؤنث ہے اور یہ سب ظرف مکان مفعول فیہ واقع ہوئے ہیں اور ذات کا لفظ مُقْحَمْ (زائد) ہے، زینت کلام کے لئے لایا گیا ہے ۱۲

تَّقْرِضُهُمْ	کترا جاتا ہے ان سے	فَلَنْ تَجِدَ	تو ہرگز نہیں پائے گا تو	بَاسِطٌ	پھیلائے ہوئے ہے
ذَاتَ الشِّمَالِ	بائیں جانب	لَهٗ	اس کے لئے	ذِرَاعَيْهِ	اپنے دونوں بازو
وَهُمْ	اور وہ	وَلِيًّا	کوئی سرپرست	بِالْوَصِيْدِ[۴]	دہلیز پر
فِيْ فَجْوَةٍ[۱]	ایک فراخ جگہ میں ہیں	مُّرْشِدًا	راہ بتلانے والا	لَوِ	اگر
مِّنْهُ	غار کے	وَتَحْسَبُهُمْ	اور خیال کرتا ہے تو انکو	لَوِاطَّلَعْتَ	جھانک لے تو
ذٰلِكَ	یہ	اَيْقَاظًا[۳]	جاگتا ہوا	عَلَيْهِمْ	ان کو
مِنْ اٰيٰتِ اللّٰهِ	اللہ کی نشانیوں میں سے ہے	وَّهُمْ	حالانکہ وہ	لَوَلَّيْتَ	(تو) ضرور پیٹھ پھیرے تو
مَنْ	جس کو	رُقُوْدٌ	سوئے ہوئے ہیں	مِنْهُمْ	ان سے
يَّهْدِ اللّٰهُ	ہدایت دیں اللہ تعالیٰ	وَّنُقَلِّبُهُمْ	اور کروٹ بدلتے ہیں	فِرَارًا[۵]	بھاگتے ہوئے
فَهُوَ	پس وہ		ہم ان کی	وَّلَمُلِئْتَ	اور ضرور بھر جائے تو
الْمُهْتَدِ[۲]	راہ یاب ہے	ذَاتَ الْيَمِيْنِ	دائیں	مِنْهُمْ	ان کی طرف سے
وَمَنْ	اور جس کو	وَ ذَاتَ الشِّمَالِ	اور بائیں	رُعْبًا[۶]	دہشت سے
يُّضْلِلْ	بے راہ کریں	وَكَلْبُهُمْ	اور ان کا کتا	❁	❁

اصحاب کہف آپس میں صلاح ومشورہ کر کے کسی پہاڑ کی کھوہ میں جا بیٹھے اور وہاں پہنچتے ہی تھکے ماندے سو گئے، اب ان آیتوں میں اللہ تعالیٰ اس غار کے اور اس میں اصحاب کہف کے احوال بیان فرماتے ہیں۔ ان آیتوں میں ان کے تین احوال بیان کئے گئے ہیں اور تینوں ہی عجیب وغریب ہیں۔ جو اللہ تعالیٰ کی خاص عنایت اور ان حضرات کی کرامت سے بطور خرق عادت ظاہر ہوئے تھے۔

پہلا حال: اس غار کی صورت حال یہ تھی کہ صبح وشام دھوپ اصحاب کہف کے قریب سے گذرتی مگر ان کے

(۱) فَجْوَةٌ (اسم) وسیع میدان، کشادہ زمین، دو پہاڑوں کے درمیان شگاف اور وسیع زمین فَجَّ (ن) فَجًّا مَابَيْنَ رِجْلَيْهِ: دونوں پیروں کو کشادہ اور بعید کرنا فَجَّ (س) فَجَجًا: چلنے میں ٹانگوں کے درمیان کشادگی ہونا۔ اَلْفَجّ: درہ، جمع فِجَاجٌ (۲) اصل اَلْمُهْتَدِيْ تھا آخر سے یا حذف کردی گئی ہے اور دال کا کسرہ اس کی علامت ہے (۳) جمع يَقِظٌ کی اور رُقُوْدٌ جمع رَاقِدٌ کی (۴) اَلْوَصِيْدُ (اسم) گھر کی دہلیز، گھر کا صحن بِالْوَصِيْدِ جار مجرور بَاسِطٌ اسم فاعل سے متعلق ہیں اور ذِرَاعَيْهِ مفعول بہ ہے بَاسِطٌ کا (۵) فِرَارًا، وَلَّيْتَ کا مفعول مطلق ہے مِنْ غَيْرِ لَفْظِ المصدر یا حال یا مفعول لہ ہے (۶) رُعْبًا، مُلِئْتَ (فعل مجہول) کا مفعول ثانی ہے یا تمیز ہے۔

جسموں پرنہیں پڑتی تھی۔ارشاد ہے ــــــ اور جب سورج نکلتا تو آپ دیکھیں گے وہ ان کے غار کی داہنی جانب کترا جاتا ہے اور جب ڈوبتا ہے تو بھی ان سے بائیں جانب کترا جاتا ہے اور وہ لوگ غار کے ایک کشادہ حصہ میں ہیں۔ یہ بات اللہ تعالیٰ کی نشانیوں میں سے ہے ــــــ دھوپ انسان کی ایک ناگزیر ضرورت ہے مگر اس کی تمازت تکلیف دہ ہے۔ دھوپ سے انسان کو بہت سے فوائد حاصل ہوتے ہیں بدن میں زندگی کے آثار پیدا ہوتے ہیں، سردی گرمی میں اعتدلال قائم ہوتا ہے اندھیرے کی خوفنا کی دور ہوتی ہے اور روشنی حاصل ہوتی ہے اور دھوپ سے نقصان بھی پہنچتا ہے بدن کالا پڑ جاتا ہے، لباس متاثر ہوتا ہے اور گرمی ستاتی ہے۔ اللہ تعالیٰ نے اصحاب کہف کے لئے ایسا انتظام فرمایا کہ وہ دھوپ کے فوائد سے متمع بھی ہوں اور اس کی مضرتوں سے محفوظ بھی رہیں۔ دھوپ ان کے قریب تک آتی مگر ان پر نہ پڑتی۔ اللہ تعالیٰ کی قدرت کاملہ نے ان کی ایسے ٹھکانے کی طرف راہ نمائی کی جہاں مامون ومطمئن ہوکر وہ لوگ آرام کرتے رہے۔ نہ جگہ کی تنگی تھی کہ جی گھٹے، نہ کسی وقت دھوپ ستاتی تھی۔ غار اندر سے کشادہ اور ہوادار تھا جس میں وہ مزے کی نیند لے رہے تھے۔

دھوپ کا ان کے قریب سے گذرنا اور ان کے جسموں پر نہ پڑنا غار کی کسی خاص وضع کی بنا پر بھی ہوسکتا ہے۔ مثلاً: اس کا دروازہ جنوب یا شمال کی جانب ایسی وضع پر ہو کہ دھوپ اس کے اندر نہ پہنچے، بعض مفسرین نے اس کی خاص وضع متعین کرنے کے لئے یہ تکلف کیا ہے کہ ریاضی کے اصول وقواعد کی رو سے اس جگہ کا طول بلد اور عرض بلد بیان کیا ہے اور غار کا رخ متعین کیا ہے مگر زُجاج فرماتے ہیں کہ دھوپ کا ان سے الگ رہنا کسی خاص وضع اور ہیئت کی بنا پر نہیں تھا بلکہ بطور خرق عادت تھا اور اللہ پاک کا یہ ارشاد کہ: ''یہ بات اللہ تعالیٰ کی نشانیوں میں سے ہے'' بظاہر اسی پر دلالت کرتا ہے کہ دھوپ سے حفاظت کا یہ سامان غار کی کسی خاص وضع اور ہیئت کا نتیجہ نہ تھا بلکہ یہ بات اللہ تعالیٰ کی قدرت کاملہ کی ایک نشانی تھی (قرطبی)

ایسے عمدہ اور آرام دہ غار تک ان حضرات کی رسائی کیسے ہوئی؟ ارشاد ہے ــــــ اللہ تعالیٰ جسے ہدایت بخشیں وہی راہ یاب ہے اور جسے بے راہ کردیں اس کے لئے آپ ہرگز راہ بتلانے والا سرپرست نہیں پائیں گے ــــــ یعنی اللہ تعالیٰ ہی کی ہدایت ہدایت ہے، اسی سے انسان راہ یاب ہوتا ہے۔ اگر وہ ہاتھ نہ پکڑیں تو انسان کبھی بھی منزل مقصود تک نہیں پہنچ سکتا۔ خواہ کوئی سا معاملہ ہو، دین کا ہو یا دنیا کا، چھوٹا ہو یا بڑا، انہی کی دستگیری سے کامیابی ملتی ہے ان کے علاوہ نہ کوئی داتا ہے نہ دستگیر تمام حاجات کا مرجع انہی کی ذات ہے۔ ظاہری اور باطنی رہنمائی اسب انہی کے قبضے میں ہے۔ دیکھ لو کس طرح اصحاب کہف کو راہ ہدایت پر ثابت قدم رکھا اور ظاہری طور پر بھی کیسے عجیب غار کی طرف راہ

نمائی فرمائی!

دوسرا حال: اصحاب کہف کی سونے کی حالت بھی عجیب تھی۔ ارشاد ہے ـــــ اور آپ ان کو جاگتا ہوا خیال کریں گے حالانکہ وہ سو رہے ہیں اور ہم دائیں بائیں ان کی کروٹ بدلتے رہتے ہیں اور ان کا کتا غار کے دہانے پر ہاتھ پھیلائے بیٹھا ہے ـــــ یعنی اصحاب کہف پر زمانۂ دراز تک نیند مسلط کر دینے کے باوجود ان کے اجسام پر نیند کے آثار نہیں تھے، بلکہ ایسی حالت تھی کہ ان کو دیکھنے والا یہ محسوس کرتا تھا کہ وہ جاگ رہے ہیں آنکھیں کھلی ہوئی ہیں، بدن میں ڈھیلا پن، جو نیند کی حالت میں ہوتا ہے، نہیں تھا۔ سانس میں کوئی تبدیلی نہیں تھی۔ کتا بھی چاق و چوبند دہلی پر براجمان تھا۔ ظاہر ہے کہ یہ حالت بھی غیر معمولی اور ایک قسم کی کرامت تھی۔ اس میں بظاہر حکمت یہ تھی کہ کوئی ان کو سوتا ہوا سمجھ کر ان پر حملہ نہ کر دے یا جو سامان ان کے ساتھ تھا وہ چرا نہ لے جائے اور کروٹیں بدلنے سے بھی دیکھنے والے کو بیداری کا گمان ہوتا تھا اور کروٹیں بدلنے میں مصلحت یہ تھی کہ مٹی ایک کروٹ کو کھا نہ لے۔

تیسرا حال: غار والوں کی حفاظت کے لئے غیبی سامان۔ ارشاد ہے ـــــ اگر تم ان کو جھانک کر دیکھو تو وہاں سے الٹے پاؤں بھاگ کھڑے ہو اور تم ان کی دہشت سے بھر جاؤ ـــــ یہ رعب و ہیبت کس بنا پر، اور کن اسباب سے تھا؟ اس میں بحث فضول ہے، سچی اور صاف بات یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے ان کی حفاظت کے لئے ان پر یہ کیفیت طاری کی تھی تا کہ دیکھنے والوں پر ان کی ہیبت طاری ہو جائے اور وہ پوری طرح ان کو دیکھ نہ سکیں اور اس جگہ میں بھی دہشت رکھی تھی تا کہ لوگ ان کو تماشہ نہ بنائیں اور وہ بے آرام نہ ہوں۔

وَكَذٰلِكَ بَعَثْنٰهُمْ لِيَتَسَآءَلُوْا بَيْنَهُمْ ۭ قَالَ قَاۗىِٕلٌ مِّنْهُمْ كَمْ لَبِثْتُمْ ۭ قَالُوْا لَبِثْنَا يَوْمًا اَوْ بَعْضَ يَوْمٍ ۭ قَالُوْا رَبُّكُمْ اَعْلَمُ بِمَا لَبِثْتُمْ ۭ فَابْعَثُوْٓا اَحَدَكُمْ بِوَرِقِكُمْ هٰذِهٖٓ اِلَى الْمَدِيْنَةِ فَلْيَنْظُرْ اَيُّهَآ اَزْكٰى طَعَامًا فَلْيَاْتِكُمْ بِرِزْقٍ مِّنْهُ وَلْيَتَلَطَّفْ وَلَا يُشْعِرَنَّ بِكُمْ اَحَدًا ۝۱۹ اِنَّهُمْ اِنْ يَّظْهَرُوْا عَلَيْكُمْ يَرْجُمُوْكُمْ اَوْ يُعِيْدُوْكُمْ فِيْ مِلَّتِهِمْ وَلَنْ تُفْلِحُوْٓا اِذًا اَبَدًا ۝۲۰

وَكَذٰلِكَ بَعَثْنٰهُمْ	اور اسی طرح ہم نے ان کو جگایا	لِيَتَسَآءَلُوْا بَيْنَهُمْ	تا کہ پوچھیں آپس میں	قَالَ قَاۗىِٕلٌ مِّنْهُمْ	کہا کہنے والے نے ان میں سے

کَمْ(1)	کتنی دیر	بِوَرِقِكُمْ (2)	تمہارے ان روپیوں	اَحَدًا	کسی کو
لَبِثْتُمْ	ٹھیرے ہو تم؟	هٰذِهٖٓ	کے ساتھ	اِنَّهُمْ	بے شک وہ
قَالُوْا	جواب دیا دوسروں نے	اِلَى الْمَدِيْنَةِ	شہر کی طرف	اِنْ	اگر
لَبِثْنَا	ہم ٹھیرے ہیں	فَلْيَنْظُرْ	پھر دیکھے وہ	يَّظْهَرُوْا	واقف ہو گئے
يَوْمًا	ایک دن	اَيُّهَآ (3)	ان میں سے کونسا	عَلَيْكُمْ	تم پر
اَوْ بَعْضَ يَوْمٍ	یا دن کا بھی کچھ حصہ	اَزْكٰى طَعَامًا	ستھرا کھانا ہے	يَرْجُمُوْكُمْ	تو سنگسار کریں گے تمکو
قَالُوْا	انھوں نے کہا	فَلْيَاْتِكُمْ	پس لائے وہ تمہارے پاس	اَوْ يُعِيْدُوْكُمْ	یا لوٹا دیں گے تم کو
رَبُّكُمْ	تمہارا رب	بِرِزْقٍ	کچھ کھانا	فِيْ مِلَّتِهِمْ	اپنے مذہب میں
اَعْلَمُ	بخوبی جانتا ہے	مِّنْهُ	اس میں سے	وَلَنْ تُفْلِحُوْٓا	اور ہرگز کامیاب نہ
بِمَا لَبِثْتُمْ	تمہارے ٹھیرنے کو	وَلْيَتَلَطَّفْ (4)	اور چاہئے کہ نرمی برتے		ہوؤ گے تم
فَابْعَثُوْٓا	پس بھیجو تم	وَلَا يُشْعِرَنَّ (5)	اور ہرگز خبر نہ ہونے دے	اِذًا	تب
اَحَدَكُمْ	اپنے میں سے کسی کو	بِكُمْ	تمہاری	اَبَدًا (6)	کبھی بھی

اصحاب کہف جس طرح عجیب طریقے پر سُلائے گئے، ایک طویل مدت کے بعد حیرت انگیز طور پر اٹھائے گئے۔ ان کی بیداری بھی کرشمۂ قدرت تھی، زمانۂ دراز کی نیند کے بعد بھی وہ صحیح سالم اور غذا نہ ملنے کے باوجود قوی وتندرست اٹھے، ارشاد ہے —— اور اُسی طرح —— یعنی جس طرح حیرت انگیز طریقہ سے سلایا تھا —— ہم نے ان کو جگایا تا کہ وہ آپس میں پوچھ پاچھ کریں —— یہ بیدار کرنے کی علت نہیں بلکہ عام طور پر پیش آنے والی صورت کا

---

(۱) کَمْ کی تمیز محذوف ہے أی کم مدةً (۲) اَلْوَرَقُ (اسم جنس) چاندی کا سکہ یا مطلق چاندی اور رِقَّةٌ: مطلق چاندی (۳) أَيُّهَا (مرکب اضافی) مبتدا، أَزْكٰى خبر، طَعَامًا تمیز مُحَوَّلْ عن المضاف إليه (جمل) پھر جملہ يَنْظُرُ کا مفعول بہ اور أَيُّهَا کی ضمیر کا مرجع الأطعمة ہے جو باہمی گفتگو کے وقت معہود ذہنی ہے (۴) لِيَتَلَطَّفْ (فعل امر غائب صیغہ واحد مذکر غائب) مصدر تَلَطُّفٌ (تَفَعُّلٌ) حسن تدبیر سے کام کرنا، نرمی برتنا — وَلْيَتَلَطَّفْ کی تَ پر قرآن کا نصف اول تعداد حروف کے اعتبار سے پورا ہوتا ہے اور درمیانی لام سے نصف ثانی شروع ہوتا ہے اس وجہ سے مصاحف میں عام طور پر اس کلمہ کو قدرے جلی لکھا جاتا ہے (۵) لَايُشْعِرَنَّ (فعل نہی بانون تاکید ثقیلہ، صیغہ واحد مذکر غائب) مصدر اِشْعَارٌ (افعال) جتلانا، خبر دینا، بتلا دینا (۴) أَبَدًا کا ترجمہ کلام مثبت میں ''ہمیشہ'' ہوتا ہے جیسے مَاكِثِيْنَ فِيْهِ أَبَدًا (وہ اس میں ہمیشہ رہیں گے) اور کلام منفی میں ''کبھی بھی''، ''قطعاً''، ''ہرگز'' ہوتا ہے جیسے وَاللّٰهِ لَاأُكَلِّمُكَ ابَدًا (بخدا میں آپ سے کبھی نہ بولونگا یا ہرگز نہ بولوں گا)

بیان ہے ـــــ ان میں سے ایک کہنے والے نے کہا: تم کتنی دیر ٹھیرے ہو؟ دوسروں نے جواب دیا: دن بھر یا اس سے بھی کچھ کم ٹھہرے ہوں گے ـــــ یعنی نیند اتنی گہری تھی کہ ان لوگوں کو اس طویل مدت کا مطلق احساس نہ ہوا، کہنے لگے ابھی تو ہم سوئے ہیں! دیر ہی کتنی ہوئی ہے! دن بھر سوئے ہوں گے یا ابھی دن بھی پورا نہیں ہوا! پھر انھیں کچھ احساس ہوا کہ شاید یہ وہ دن نہیں جس میں ہم غار میں داخل ہوئے تھے، چنانچہ ـــــ وہ کہنے لگے کہ تمہارے پروردگار ہی تمہارے ٹھہرنے کی مدت کو بہتر جانتے ہیں ـــــ یعنی تعیین وقت کی بحث اللہ کے حوالہ کرو، اب کام کی بات کرو، دیکھو بھوک لگ رہی ہے ـــــ اب اپنے میں سے کسی کو یہ روپیہ دے کر شہر کی طرف بھیجو ـــــ وہ حضرات اپنے ساتھ کچھ رقم بھی لے گئے تھے تاکہ بوقت ضرورت کام آئے اس سے معلوم ہوا کہ ضروری خرچ کا اہتمام کرنا زہد و توکل کے منافی نہیں ـــــ پھر وہ تحقیق کرے کہ کونسا کھانا سب سے زیادہ ستھرا ہے ـــــ یعنی حلال ہے، کیونکہ حلال کھانا ہی سب سے زیادہ ستھرا ہے اور اس کے حلال ہونے کی بنیاد بھی یہی ہے ـــــ یہیں سے یہ ہدایت ملتی ہے کہ مسلمانوں کو ہمیشہ کھانے پینے کی چیزوں میں حلال وحرام کا خیال رکھنا چاہئے اور جس شہر میں یا جس بازار میں یا جس ہوٹل میں زیادہ تر حرام کھانے ہوں وہاں تحقیق کے بغیر کھانا جائز نہیں۔ اسی طرح جو اقوام پاکی ناپاکی کی تمیز نہیں رکھتیں بلکہ بعض جانوروں کے پیشاب کو تبرک سمجھتی ہیں ان کے کھانوں سے احتراز اولی ہے ـــــ پھر وہ اس میں سے تمہارے لئے کچھ کھانا لے آئے ـــــ علماء نے اس سے یہ مسئلہ نکالا ہے کہ کئی آدمی اپنے مشترک سرمایہ سے کھانا خریدیں اور سب مل کر کھائیں، تو یہ جائز ہے اگرچہ بعض کم کھائیں اور بعض زیادہ ـــــ اور چاہئے کہ وہ جوش تدبیری سے کام لے ـــــ یعنی اس کو نہایت ہوشیاری سے آجانا چاہئے اور نرمی وتدبیر سے معاملہ کرنا چاہئے تاکہ کسی کو پتہ نہ لگے ـــــ اور وہ ہرگز کسی کو تمہاری بھنک نہ پڑنے دے ـــــ یعنی کسی کو تمہارے بارے میں احساس تک نہ ہونے دے اور اگر کسی وجہ سے پھنس جائے تو تمہارا اتا پتا ہرگز نہ بتائے ـــــ اگر وہ لوگ تمہاری خبر پالیں گے تو یقیناً تم کو سنگسار کر دیں گے یا اپنے دھرم میں لوٹا لیں گے اور اس صورت میں تم ہرگز کامیاب نہ ہوسکو گے ـــــ یعنی اگر دین کی خاطر قتل کر دیئے گئے تو کوئی پریشانی کی بات نہیں لیکن اگر جبر واکراہ سے تمہیں مرتد بنالیا گیا تو اس صورت میں تم کو کبھی کامیابی حاصل نہ ہوسکے گی، نہ دنیا میں نہ آخرت میں۔ دنیا میں تو اس لئے نہیں کہ یہ چند روزہ زندگی ہے اس کی کامیابی کیا خاک کامیابی ہے اور آخرت میں اس لئے نہیں کہ وہاں کی کامیابی کے لئے ایمان شرط ہے۔

دنیا کی فانی زندگی بنانے کی فکر نہ کرو آخرت کی دائمی زندگی کی فکر کرو۔ اس کی کامیابی اصل کامیابی ہے!

وَكَذٰلِكَ اَعْثَرْنَا عَلَيْهِمْ لِيَعْلَمُوْٓا اَنَّ وَعْدَ اللّٰهِ حَقٌّ وَّاَنَّ السَّاعَةَ لَا رَيْبَ فِيْهَا ۚ
اِذْ يَتَنَازَعُوْنَ بَيْنَهُمْ اَمْرَهُمْ فَقَالُوا ابْنُوْا عَلَيْهِمْ بُنْيَانًا ۭ رَبُّهُمْ اَعْلَمُ بِهِمْ ۭ قَالَ
الَّذِيْنَ غَلَبُوْا عَلٰٓي اَمْرِهِمْ لَنَتَّخِذَنَّ عَلَيْهِمْ مَّسْجِدًا ﴿۲۱﴾ سَيَقُوْلُوْنَ ثَلٰثَةٌ رَّابِعُهُمْ
كَلْبُهُمْ ۚ وَيَقُوْلُوْنَ خَمْسَةٌ سَادِسُهُمْ كَلْبُهُمْ رَجْمًۢا بِالْغَيْبِ ۚ وَيَقُوْلُوْنَ سَبْعَةٌ
وَّثَامِنُهُمْ كَلْبُهُمْ ۭ قُلْ رَّبِّيْٓ اَعْلَمُ بِعِدَّتِهِمْ مَّا يَعْلَمُهُمْ اِلَّا قَلِيْلٌ ڣ فَلَا تُمَارِ فِيْهِمْ
اِلَّا مِرَاۗءً ظَاهِرًا ۠ وَّلَا تَسْتَفْتِ فِيْهِمْ مِّنْهُمْ اَحَدًا ﴿۲۲﴾ وَلَا تَقُوْلَنَّ لِشَايْءٍ اِنِّىْ فَاعِلٌ
ذٰلِكَ غَدًا ﴿۲۳﴾ اِلَّآ اَنْ يَّشَاۗءَ اللّٰهُ ۡ وَاذْكُرْ رَّبَّكَ اِذَا نَسِيْتَ وَقُلْ عَسٰٓي اَنْ يَّهْدِيَنِ
رَبِّيْ لِاَقْرَبَ مِنْ هٰذَا رَشَدًا ﴿۲۴﴾ وَلَبِثُوْا فِيْ كَهْفِهِمْ ثَلٰثَ مِائَةٍ سِنِيْنَ وَازْدَادُوْا
تِسْعًا ﴿۲۵﴾ قُلِ اللّٰهُ اَعْلَمُ بِمَا لَبِثُوْا ۚ لَهٗ غَيْبُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ ۭ اَبْصِرْ بِهٖ وَ
اَسْمِعْ ۭ مَا لَهُمْ مِّنْ دُوْنِهٖ مِنْ وَّلِيٍّ ۡ وَّلَا يُشْرِكُ فِيْ حُكْمِهٖٓ اَحَدًا ﴿۲۶﴾

وَكَذٰلِكَ	اوراسی طرح	وَعْدَ اللّٰهِ	اللہ کا وعدہ	يَتَنَازَعُوْنَ	کھینچا تانی کررہے تھے وہ
اَعْثَرْنَا (۱)	واقف کیا ہم نے	حَقٌّ	سچا ہے	بَيْنَهُمْ	آپس میں
	(لوگوں کو)	وَّاَنَّ (۲)	اور یہ کہ	اَمْرَهُمْ	ان کے معاملہ میں
عَلَيْهِمْ	ان کے (حال) پر	السَّاعَةَ	قیامت	فَقَالُوا	پس کہا انھوں نے
لِيَعْلَمُوْٓا	تاکہ جان لیں وہ	لَا رَيْبَ فِيْهَا	کوئی شک نہیں اس میں	ابْنُوْا	بناؤ تم
اَنَّ	کہ	اِذْ (۳)	(یادکرو) جب	عَلَيْهِمْ	ان پر

(۱) اَعْثَرَہٗ (افعال) عَلَى السِّرِّ: بھید پر مطلع کرنا، بتادینا۔ عَثَرَ (ن، ض، س، ک) عُثُوْرًا وَعِثَارًا کے اصل معنی ہیں منہ کے بل گرنا۔ کہا جاتا ہے اَلْجَوَادُ لَايَكَادُ يَعْثُر: عمدہ گھوڑا شاید ہی اوندھا گرے۔ مَنْ سَلَكَ الْجَدَدَ أَمِنَ الْعِثَار: جو ہموار سخت زمین پر چلتا ہے وہ لغزش سے محفوظ رہتا ہے، پھر مجازاً بے طلب کسی بات سے واقف ہوجانے کے لئے استعمال ہونے لگا اور أَعْثَرْنَا کا مفعول محذوف ہے اور لِيَعْلَمُوْا أَعْثَرْنَا سے متعلق ہے (۲) أَنَّ السَّاعَةَ کا عطف أَنَّ وَعْدَ اللّٰهِ پر ہے (۳) إِذْ فعل محذوف اُذْكُرْ کا ظرف ہے

بُنْيَانًا(1)	کوئی عمارت	وَيَقُوْلُوْنَ	اور کہیں گے وہ	لِشَایْءٍ	کسی چیز کے بارے میں
رَبُّهُمْ	ان کے رب	سَبْعَةٌ	سات تھے	اِنِّيْ	بے شک میں
اَعْلَمُ	خوب جانتے ہیں	وَّثَامِنُهُمْ	اور ان کا آٹھواں	فَاعِلٌ	کرنے والا ہوں
بِهِمْ	ان کو	كَلْبُهُمْ	ان کا کتا تھا	ذٰلِكَ	وہ (کام)
قَالَ	کہا	قُلْ	کہیے	غَدًا	آئندہ کل
الَّذِيْنَ	ان لوگوں نے جو	رَّبِّيْٓ	میرے رب	اِلَّآ	مگر
غَلَبُوْا	غالب تھے	اَعْلَمُ	خوب جانتے ہیں	اَنْ يَّشَآءَ	یہ کہ چاہیں
عَلٰٓى اَمْرِهِمْ	اپنے معاملہ پر	بِعِدَّتِهِمْ	ان کی گنتی کو	اللّٰهُ	اللہ تعالیٰ
لَنَتَّخِذَنَّ	ضرور بنائیں گے ہم	مَّا	نہیں	وَاذْكُرْ	اور یاد کیجئے آپ
عَلَيْهِمْ	ان پر	يَعْلَمُهُمْ	جانتے ان کو	رَّبَّكَ	اپنے رب کو
مَّسْجِدًا	مسجد	اِلَّا قَلِيْلٌ	مگر تھوڑے لوگ	اِذَا	جب
سَيَقُوْلُوْنَ	آپ کہیں گے	فَلَا تُمَارِ(2)	پس نہ بحث کیجئے آپ	نَسِيْتَ	بھول جائیں آپ
ثَلٰثَةٌ	تین تھے	فِيْهِمْ	ان کے بارے میں	وَقُلْ	اور کہیے
رَّابِعُهُمْ	ان کا چوتھا	اِلَّا	مگر	عَسٰٓى	امید ہے
كَلْبُهُمْ	ان کا کتا تھا	مِرَآءً	بحث کرنا	اَنْ	کہ
وَيَقُوْلُوْنَ	اور کہیں گے وہ	ظَاهِرًا	سرسری	يَّهْدِيَنِ(3)	راہ دکھاوے مجھ کو
خَمْسَةٌ	پانچ تھے	وَّلَا تَسْتَفْتِ	اور نہ پوچھئے آپ	رَبِّيْ	میرا رب
سَادِسُهُمْ	اور ان کا چھٹا	فِيْهِمْ	ان کے بارے میں	لِاَقْرَبَ	نزدیک تر بات کی
كَلْبُهُمْ	ان کا کتا تھا	مِّنْهُمْ	ان میں سے	مِنْ هٰذَا	اس سے (بھی)
رَجْمًا	پتھر پھینکنا ہے	اَحَدًا	کسی سے	رَشَدًا(4)	راستی کے اعتبار سے
بِالْغَيْبِ	نشانہ دیکھے بغیر	وَلَا تَقُوْلَنَّ	اور ہرگز نہ کہیں آپ	وَلَبِثُوْا	اور ٹھہرے وہ لوگ

(۱) اَلْبُنْيَان: عمارت۔ کہا جاتا ہے كَاَنَّهُمْ الْبيان المرصوص: وہ لوگ گویا مضبوط عمارت کی طرح ہیں (۲) لَاتُمَارِ (فعل نہی) مَارٰی مِرَآءً وَمُمَارَاةً: جھگڑا کرنا، کسی ایسی بات میں گفتگو کرنا جس میں شبہ اور تردد ہو (۳) يَهْدِيَنِ کے آخر میں ن وقایہ ہے اور ی متکلم کی ضمیر محذوف ہے جسکی علامت نون کا کسرہ ہے يَهْدِیْ فعل مضارع صیغہ واحد مذکر غائب (۴) رَشَدًا یا تو يَهْدِیْ کا مفعول مطلق ہے یا تمیز ہے

فِيْ كَهْفِهِمْ	اپنی کھوہ میں	بِمَا	اس (مدت) کو جو	وَ اَسْمِعْ	اور کیسے سننے والے ہیں!
ثَلٰثَ	تین	لَبِثُوْا	ٹھہرے وہ	مَا لَهُمْ	نہیں ہے ان کے لئے
مِائَةٍ سِنِيْنَ (۱)	سوسال	لَهٗ	انہی کے لئے	مِّنْ دُوْنِهٖ	اللہ کے سوا
وَ ازْدَادُوْا (۲)	اور بڑھے وہ	غَيْبُ	بھید (ہے)	مِنْ وَّلِيٍّ	کوئی مددگار
تِسْعًا	نو	السَّمٰوٰتِ	آسمانوں	وَّ لَا يُشْرِكُ	اور نہیں شریک کرتے وہ
قُلِ اللّٰهُ	آپ کہئے اللہ تعالیٰ	وَ الْاَرْضِ	اور زمین (کا)	فِيْ حُكْمِهٖ	اپنے حکم میں
اَعْلَمُ	خوب جانتے ہیں	اَبْصِرْ بِهٖ (۳)	اور کیسے دیکھنے والے ہیں!	اَحَدًا	کسی کو

ان آیتوں پر اصحاب کہف کا قصہ ختم ہورہا ہے۔ ان آیتوں میں پانچ باتیں بیان فرمائی گئی ہیں:

۱ــــ عرصۂ دراز کے بعد اصحاب کہف کے بیدار ہونے میں کیا حکمت تھی؟

۲ــــ لوگوں میں اصحاب کہف کے معاملہ میں نزاع ہوا، کچھ لوگ غار پر یادگار بنانا چاہتے تھے، مگر ارباب حکومت نے مسجد بنانے کا فیصلہ کیا۔

۳ــــ اصحاب کہف کی تعداد کیا تھی؟ اس سلسلہ میں مختلف اقوال ذکر کرکے صحیح تعداد کی طرف اشارہ کیا گیا۔

۴ــــ اصحاب کہف کا جس قدر واقعہ قرآن کریم نے بیان کیا ہے اسی پر اکتفا کی جائے، مزید بحث نہ کی جائے۔ نیز اس سلسلہ میں دوسروں سے قطعاً معلومات حاصل نہ کی جائیں اور سرسری بحث کے دوران کوئی بات آئندہ بتانے کا وعدہ کیا جائے تو اس کو ان شاء اللہ کے ساتھ مقید کیا جائے۔ کیونکہ ممکن ہے ان مزید باتوں کا بیان کرنا اللہ کی مصلحت نہ ہو۔

۵ــــ اصحاب کہف کتنی مدت سوئے؟

اب یہ باتیں تفصیل سے ملاحظہ فرمائیے:

پہلی بات: اصحاب کہف کی بیداری میں اور لوگوں کے ان کے حال سے واقف ہونے میں حکمت کیا تھی؟ــــــ اصحاب کہف معاملہ اہل شہر پر اس لئے منکشف کیا گیا کہ ان کا عقیدۂ آخرت مضبوط ہو اور ان کو یقین آئے کہ قیامت کے دن سب مُردے زندہ ہوں گے۔ تفسیر قرطبی میں ہے کہ جس بادشاہ کے عہد میں اصحاب کہف شہر سے نکلے تھے وہ

(۱) مِائَةٌ تمیز ہے ثَلَاثٌ کی اور سِنِيْنَ عطف بیان ہے (۲) اِزْدَادَ اِزْدِيَادًا: زیادہ ہونا، بڑھنا اور تِسْعًا مفعول بہ ہے اور اِزْدِيَادٌ باب افتعال سے ہے اس کی ت دال سے بدل گئی ہے (۳) اَفْعِلْ بِهٖ فعل تعجب کا وزن ہے اور اَسْمِعْ کے بعد بِهٖ محذوف ہے اور بِهٖ میں فاعل پر با زائد ہے ۱۲

مر چکا تھا اور اس پر صدیاں گذر گئی تھیں اور جس زمانہ میں اصحاب کہف بیدار ہوئے تھے شہر پر اہل حق کا قبضہ تھا اور ان کا بادشاہ ایک نیک آدمی تھا مگر شہر میں قیامت کے بارے میں اور مردوں کے زندہ ہونے کے بارے میں شدید اختلاف چل رہا تھا۔ ایک فرقہ اس بات کا قطعاً منکر تھا کہ بدن گلنے سڑنے کے بعد اور ریزہ ریزہ ہو جانے کے بعد پھر دوبارہ زندہ کیا جائے گا۔ بادشاہ ان گمراہ لوگوں کے بارے میں بہت فکر مند تھا کہ کس طرح ان کو قائل کیا جائے؟ جب کوئی تدبیر نہ سوجھی تو اس نے ٹاٹ کے کپڑے پہن کر اور راکھ کے ڈھیر پر بیٹھ کر اللہ تعالیٰ سے التجا کی کہ خدایا! آپ ہی کوئی ایسی صورت پیدا فرما دیں کہ ان لوگوں کا عقیدہ صحیح ہو جائے اور یہ راہ راست پر آ جائیں۔

بادشاہ کی دعا قبول ہوئی۔ اللہ تعالیٰ نے اس کی آرزو اس طرح پوری کی کہ اصحاب کہف بیدار ہوئے اور انھوں نے اپنا ایک آدمی بازار بھیجا، وہ کھانا خریدنے کے لئے دوکان پر پہنچا اور تین سو برس پہلے کا روپیہ پیش کیا، دوکاندار حیران رہ گیا کہ یہ سکہ کہاں سے آیا؟ اس نے بازار کے دوسرے دوکانداروں کو دکھلایا۔ سب نے کہا اس شخص کو کہیں سے پرانا خزانہ مل گیا ہے خریدار نے انکار کیا کہ مجھے نہ کوئی خزانہ ملا ہے نہ کہیں سے لایا ہوں، یہ میرا اپنا روپیہ ہے۔

بازار والوں نے اس کو بادشاہ کے سامنے پیش کیا۔ بادشاہ نیک اللہ والا آدمی تھا، اس نے سلطنت کے خزانے میں وہ تختی دیکھی تھی جس میں اصحاب کہف کے نام، حالات اور ان کے غائب ہونے کا واقعہ لکھا ہوا تھا۔ بادشاہ نے اس تختی کی روشنی میں حالات کی تحقیق کی تو اس کو اطمینان ہو گیا کہ یہ شخص انہی لوگوں میں سے ہے۔ بادشاہ بہت مسرور ہوا اور اس شخص سے کہا کہ ہمیں اس غار پر لے چلو جہاں سے تم آئے ہو۔

بادشاہ اہل شہر کے ایک بڑے مجمع کے ساتھ غار پر پہنچا جب غار قریب آیا تو اصحاب کہف کے ساتھی نے کہا کہ ذرا آپ حضرات ٹھہریں۔ میں جا کر اپنے ساتھیوں کو صورت حال سے باخبر کرتا ہوں تا کہ وہ گھبرا نہ جائیں۔ اس کے بعد روایات میں اختلاف ہے۔ ایک روایت یہ ہے کہ اس ساتھی نے جا کر باقی ساتھیوں کو تمام حالات سنائے کہ اب بادشاہ مسلمان ہے اور قوم بھی مسلمان ہے وہ سب ملنے کے لئے آئے ہیں۔ اصحاب کہف اس خبر سے خوش ہوئے اور بادشاہ کا انھوں نے استقبال کیا پھر وہ اپنی غار کی طرف لوٹ گئے اور اکثر روایات میں یہ ہے کہ جس وقت اس ساتھی نے پہنچ کر باقی حضرات کو یہ سارا ماجرا سنایا اسی وقت سب کی وفات ہو گئی بادشاہ سے ملاقات نہ ہو سکی۔ ایک روایت میں یہ ہے کہ ملاقات کے بعد اصحاب کہف نے بادشاہ اور اہل شہر سے کہا کہ اب ہم آپ سے رخصت چاہتے ہیں۔ اور غار کے اندر چلے گئے اسی وقت اللہ تعالیٰ نے ان سب کو وفات دیدی (ماخوذ از معارف القرآن)

بہر حال جب اہل شہر کے سامنے قدرت الٰہی کا یہ عجیب واقعہ آیا تو سب کو یقین آ گیا کہ جس ذات کی قدرت میں

یہ بات ہے کہ وہ تین سو برس تک انسانوں کو بغیر کسی غذا اور سامان زندگی کے زندہ رکھے اور اس طویل عرصہ تک ان کو نیند میں رکھنے کے بعد پھر صحیح سالم، چاق و چوبند اور توانا تندرست اٹھاوے اس کے لئے کیا مشکل ہے کہ مرنے کے بعد پھر زندہ کردے۔ اس واقعہ سے ان کا بعث بعد الموت کا استبعاد دور ہو گیا اور وہ خوب سمجھ گئے کہ مالک الملک کی قدرت کو انسانی قدرت پر قیاس کرنا حماقت و جہالت کے سوا کچھ نہیں۔ ارشاد ہے ـــــ اور اسی طرح ہم نے لوگوں کو ان کے حال پر مطلع کیا ـــــ یعنی جس طرح ہم نے اپنی خاص قدرت وحکمت سے اصحاب کہف کو سلایا اور جگایا اسی طرح اپنی خصوصی حکمت وقدرت سے عام خلقت کو بھی ان کے حال پر مطلع کیا ـــــ تاکہ لوگ جانیں کہ اللہ کا وعدہ سچا ہے اور یہ کہ قیامت میں کوئی شک نہیں ـــــ وہ ضرور برپا ہوگی۔

شہر کے جو لوگ پہلے سے اللہ کے وعدے کو سچا مانتے تھے اور قیامت پر یقین رکھتے تھے ان کا ایمان اصحاب کہف کے واقعہ سے یقیناً بڑھ گیا ہوگا اور جو لوگ شک میں مبتلا تھے یا منکر تھے ان میں سے بہت سے لوگ اس مشاہدہ کے بعد ایمان لے آئے ہوں گے، وہی ﴿لِنَعْلَمَ أَيُّ الْحِزْبَيْنِ أَحْصٰى لِمَا لَبِثُوْا اَمَدًا﴾ کا مصداق ہیں کیونکہ احصاء کا مفہوم کسی بات کی حقیقت کا پوری طرح ادراک کرنا ہے اور یہی وہ لوگ ہیں، جنھوں نے اصحابِ کہف کے قیام کی طویل مدت کا پوری طرح ادراک کر لیا تھا یعنی اس سے جو نتیجہ اخذ کرنا چاہئے تھا وہ کر لیا تھا اور جو لوگ ایسے واضح مشاہدہ کے بعد بھی شک وشبہ میں مبتلا رہے یا انکار پر مصر رہے، حقیقت یہ ہے کہ انھوں نے اصحاب کہف کے معاملہ سے کچھ بھی سبق نہ لیا۔

دوسری بات: تمام شہر والے اصحاب کہف کی بزرگی اور تقدس کے قائل ہو چکے تھے اب ان میں اختلاف ہوا کہ ان کی غار پر کیا بنایا جائے؟ کچھ لوگوں کا خیال تھا کہ غار کے پاس کوئی عمارت یادگار کے طور پر بنائی جائے۔ یاد کرو ـــــ جب لوگ آپس میں ان کے معاملہ میں جھگڑ رہے تھے پس کچھ لوگوں نے کہا کہ ان کے پاس کوئی عمارت بنا دو ـــــ یعنی انھوں نے فرط عقیدت میں چاہا کہ اس غار کے پاس کوئی مکان بطور یادگار تعمیر کردیں۔ اللہ تعالیٰ اس تجویز کی بے ہودگی کی طرف اشارہ فرماتے ہیں ـــــ ان کے پروردگار ان کو خوب جانتے ہیں ـــــ لوگ جانیں یا نہ جانیں: اس سے کیا فرق پڑتا ہے؟ نیز بندوں کا کمال یہ ہے کہ وہ اللہ تعالیٰ کو یاد رکھیں۔ اور لوگوں میں جو یادگاریں قائم کرنے کا جذبہ پایا جاتا ہے وہ اس وقت قابل ستائش ہے جب کوئی رفاہی کام کیا جائے۔ مسجد، مدرسہ، پل، سڑک وغیرہ بنائی جائے۔ کیونکہ یہ ایصالِ ثواب کی ایک صورت ہے۔ اشوک کی لاٹ یا تاج محل جیسی عمارتیں بنانا شرعاً کوئی پسندیدہ عمل نہیں۔ چنانچہ ـــــ ان لوگوں نے جو ان کے معاملات پر غالب تھے کہا کہ ہم ضرور ان کے پاس ایک مسجد بنائیں گے ـــــ یعنی حکام وقت کی رائے یہ ہوئی کہ یہاں مسجد بنائی جائے تاکہ زائرین کو سہولت ہو

اور مسجد کے اعمال سے ان اہل اللہ کو فیض پہنچے۔

مسئلہ: اگر کسی نیک آدمی کی قبر پر زائرین بکثرت آتے ہوں تو ان کے قیام، نماز اور دیگر سہولتوں کے لئے قریب میں مسجد بنانا جائز ہے اس میں کوئی گناہ نہیں بشرطیکہ وقف قبرستان میں نہ بنائی جائے۔ اور جن احادیث میں انبیاء کی قبروں کو مسجد بنانے پر لعنت آئی ہے اس سے مراد خود قبور کو سجدہ گاہ بنانا ہے جو بالاتفاق شرک اور حرام ہے (معارف القرآن)

مسئلہ: کسی مسجد کے پاس یا کسی مکان میں کسی عام میت کی یا کسی نیک آدمی کی تدفین جائز نہیں اموات کی تدفین عام قبرستان میں ہونی چاہئے۔ حدیث میں ہے: صَلُّوْا فِیْ بُیُوْتِکُمْ، وَلَاتَتَّخِذُوْھَا قُبُوْرًا (ترمذی ۱:۶۰) یعنی اپنے گھروں میں نماز پڑھو اور ان کو قبریں مت بناؤ ـــــ اور آنحضرت ﷺ کی تدفین جو مکان میں اور مسجد کے پاس ہوئی تھی وہ آپ کی خصوصیت تھی۔

مسئلہ: کسی بزرگ کی قبر کے پاس تبرک کے لئے مسجد بنانا بعض علماء کے نزدیک جائز ہے۔ بشرطیکہ مسجد بنانے سے مقصود اس بزرگ کی تعظیم یا اس کی روحانیت کی طرف متوجہ ہونا نہ ہو۔ اور علامہ توربشتی حنفی (شارح مصابیح) ناجائز کہتے ہیں۔ وہ فرماتے ہیں کہ اگر مسجد بنانے کا مقصد اس بزرگ کی تعظیم ہے تو یہ شرک جلی ہے اور اگر ان کی روحانیت سے استفادہ ہے تو یہ شرک خفی ہے اور اگر یہ دونوں باتیں نہیں ہیں تو بھی قبوریوں کے ساتھ اور یہود و نصاری کے ساتھ مشابہت ہے اس لئے جائز نہیں (معارف السنن ۳:۳۰۵)

تیسری بات: اصحاب کہف کی تعداد کیا تھی؟ نزول قرآن کے وقت اس سلسلہ میں مختلف رائیں تھیں۔ ارشاد ہے ـــــ اب لوگ کہیں گے: وہ تین ہیں اور چوتھا ان کا کتا ہے۔ اور کہیں گے: وہ پانچ ہیں چھٹا ان کا کتا ہے۔ یہ اٹکل پچو تیر چلانا ہے ـــــ یعنی یہ دونوں قول ایسے ہیں جیسے کوئی بے نشانہ دیکھے تیر چلائے! ـــــ اور کہیں گے: وہ سات ہیں اور آٹھواں ان کا کتا ہے۔ آپ کہیں: میرے پروردگار ہی ان کی تعداد کو بہتر جانتے ہیں۔ ان کی تعداد کو کم ہی لوگ جانتے ہیں ـــــ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے فرمایا: میں ان کم لوگوں میں سے ہوں: اصحاب کہف سات تھے، کیونکہ اللہ تعالیٰ نے پہلے دونوں قولوں کو اٹکل پچو کے تیر قرار دیا ہے اور تیسرے قول کی تردید نہیں کی ـــــ نیز اسلوب بیان بھی بدلا ہوا ہے۔ پہلے دونوں جملوں کے درمیان واو عطف نہیں لایا گیا جبکہ تیسرے جملہ میں وَثَامِنُھُمْ عطف کے ساتھ لایا گیا ہے گویا اس قول کا قائل بصیرت کے ساتھ گفتگو کر رہا ہے۔ واللہ اعلم

چوتھی بات: جس طرح اصحاب کہف کی تعداد میں اختلاف تھا، دیگر جزئیات میں بھی اختلاف ہوسکتا تھا مثلاً اصحاب کہف کے نام کیا تھے؟ ان کا کتا کس رنگ کا تھا؟ اس لئے اس سلسلہ میں ایک اصولی ہدایت دی جاتی ہے

—— پس آپ ان لوگوں کے بارے میں سرسری بحث سے زیادہ بحث نہ کیجئے —— یعنی واقعہ کی جو تفصیلات اللہ تعالیٰ نے بیان فرمادی ہیں، ان کے علاوہ دیگر باتیں اگر زیر بحث آئیں تو آپ ان میں بس سرسری گفتگو کریں۔ کیونکہ نص کے بغیر آدمی کوئی بات قطعیت سے نہیں کہہ سکتا۔ اس لئے اپنے دعوی کے اثبات میں کاوش کرنا اور دوسرے کی تردید میں زور صرف کرنا بیکار ہے اس کا کوئی خاص فائدہ نہیں —— اور ان کے بارے میں ان لوگوں میں سے کسی سے کچھ نہ پوچھئے —— یعنی وحی کے ذریعہ اصحاب کہف کے بارے میں جو معلومات آپ کو دیدی گئی ہیں ان پر قناعت کیجئے۔ یہود و نصاری سے اس بارے میں کچھ نہ پوچھئے کہ ان کی معلومات مستند نہیں نہ ان کی کتابیں محفوظ ہیں۔ اسی طرح اثریات کے ماہرین کی باتوں پر بھی کان نہ دھریئے، وہ ہوا پر محل تعمیر کرتے ہیں۔

اور اگر کوئی شخص اصحاب کہف کے بارے میں یا کسی دوسرے معاملہ میں آپ سے کوئی بات دریافت کرے تو آپ یہ وعدہ نہ فرمائیں کہ میں کل اس کا جواب دوں گا کیونکہ یہ بات اللہ تعالیٰ کی مشیت پر موقوف ہے۔ کیا معلوم اس کا جواب دینا مصلحت ہے یا نہیں؟ ارشاد ہے —— اور کسی چیز کے بارے میں کبھی یہ نہ کہا کریں کہ میں کل یہ کام کروں گا مگر یہ کہ اللہ تعالیٰ چاہیں —— اور وحی نازل فرمائیں تو میں تمہارے سوال کا جواب دوں گا —— اور جب آپ بھول جائیں تو اپنے پروردگار کو یاد کریں —— یعنی کسی وقت مذکورہ ہدایت ذہن سے نکل جائے، اور آپ مشیت خداوندی پر تعلیق کئے بغیر کوئی وعدہ فرمالیں، تو یاد آنے پر ان شاء اللہ کہہ لیں۔

مسئلہ: جب مستقبل میں کسی کام کا ارادہ ہو تو قطعیت کے ساتھ نہیں کہنا چاہئے کہ میں اس کو ضرور کروں گا اس لئے کہ آدمی نہیں جانتا کہ کل کیا ہوگا؟ اور کہنے والا اس کائنات میں موجود بھی ہوگا یا نہیں؟ لہٰذا اس معاملہ کو خدا کے سپرد کرتے ہوئے ان شاء اللہ ضرور کہنا چاہئے۔

درمیان میں ایک پیشین گوئی سنیں: —— اور آپؐ کہیں کہ مجھے امید ہے میرا پروردگار اس سے بھی زیادہ بہتری کی بات کی طرف میری رہنمائی کرے گا —— یعنی عنقریب اصحاب کہف جیسا معاملہ آپ ﷺ کو بھی پیش آنے والا ہے بلکہ اس سے بھی عجیب! آپ اپنا آبائی وطن چھوڑ کر ہجرت فرمائیں گے، راستہ میں کئی دن تک غار ثور میں پوشیدہ رہیں گے، دشمن غار کے منہ تک پہنچ جائیں گے مگر آپؐ کو نہ پاسکیں گے، آپ بخیریت مدینہ پہنچ جائیں گے اور وہاں آپ پر فتح و کامرانی کی راہیں کھلیں گی۔

پانچویں بات: اصحاب کہف غار میں کتنی مدت ٹھہرے؟ پورے تین سو سال یا نو سال زائد؟ —— اور وہ لوگ اپنے غار میں تین سو برس ٹھہرے اور وہ نو سال اور بڑھے —— یعنی کل تین سو نو سال تک وہ خوابیدہ رہے اور جو قدیم مسیحی

روایتوں اور نوشتوں میں لکھا ہے کہ وہ تین سو سات سال سوئے اور بعض نسخوں میں تین سو ترپن سال ہے (تفسیر ماجدی) وہ صحیح نہیں ارشاد ہے ـــــ آپ کہئے: اللہ تعالیٰ ہی ان کے قیام کی مدت کو بخوبی جانتے ہیں ـــــ لوگ صحیح نہیں جانتے ـــــ انہی کو ـــــ یعنی اللہ ہی کو ـــــ آسمانوں اور زمین کے سب پوشیدہ احوال معلوم ہیں، وہ کیسے اچھے دیکھنے والے ہیں! اور کیسے اچھے سننے والے ہیں!! ـــــ یعنی جتنی مدت وہ سوتے رہے: تاریخ والے کئی طرح بتاتے ہیں۔ ٹھیک وہ ہے جو اللہ تعالیٰ نے بتایا ہے کیونکہ آسمان وزمین کے سب پوشیدہ راز انہی کو معلوم ہیں۔ ان کا سننا اور ان کا دیکھنا کیسا کچھ ہے اس کا تم اندازہ نہیں کر سکتے ـــــ لوگوں کے لئے ان کے سوا کوئی مددگار نہیں اور نہ وہ اپنے فیصلہ میں کسی کو شریک کرتے ہیں ـــــ یعنی جس طرح ان کا علم محیط ہے ان کی قدرت واختیار بھی کامل ہے اور جس طرح آسمان وزمین کی پوشیدہ باتیں جاننے میں ان کا کوئی شریک نہیں اختیارات قدرت میں بھی کوئی شریک وسہیم نہیں۔ اصحاب کہف کے معاملہ میں غور کرو، یہ بات بخوبی سمجھ میں آجائے گی کہ اللہ تعالیٰ ان کے ناصر ومددگار تھے اس لئے بہترین سامان فرمایا اور ان کے سونے اور جاگنے کے بارے میں جو فیصلہ فرمایا وہ انہی نے فرمایا، کسی کو اس فیصلہ میں شریک نہیں کیا۔

قرآن کریم نے اصحاب کہف کی تعداد کے سلسلہ میں اختلاف ذکر کر کے صحیح تعداد کی طرف صرف اشارہ فرمایا ہے اور سونے کی مدت کو صاف صراحۃً بیان کیا ہے اور اختلاف کرنے والوں کے اقوال کی طرف اشارہ کر کے ان کی تردید کی ہے اس فرق کی وجہ یہ ہے کہ تعداد کی بحث فضول ہے۔ البتہ مدت دراز تک خلافِ عادت سوتے رہنا اور بغیر غذا کے صحیح تندرست رہنا پھر اتنے عرصہ کے بعد صحت مند توانا اور تندرست بیدار ہونا حشر ونشر کی دلیل ہے اس سے مسئلۂ قیامت وآخرت پر استدلال کیا جا سکتا ہے اس لئے اس کو صراحۃً بیان فرمایا۔

اور سیدھی تعبیر "تین سو نو سال" اختیار کرنے کے بجائے یہ تعبیر کہ "وہ اپنے غار میں تین سو برس ٹھیرے اور وہ نو سال اور بڑھے" اس لئے اختیار فرمائی ہے کہ اس عدد کی اہمیت واضح ہو۔ قاری توجہ سے ان کی مدت قیام پر غور کرے۔ وہ عدد سے سرسری نہ گزر جائے۔ اور اس کی نظیر سورۃ العنکبوت کی آیت ۱۴ ہے: ﴿فَلَبِثَ فِيهِمْ أَلْفَ سَنَةٍ إِلَّا خَمْسِينَ عَامًا﴾ یعنی نوح علیہ السلام اپنی قوم میں ایک ہزار برس (دعوت کا کام کرنے کے لئے) ٹھہرے، مگر پچاس سال کم۔ اس میں ساڑھے نو سو سال کے بجائے جو تعبیر اختیار کی گئی ہے وہ مدتِ قیام کی اہمیت ظاہر کرنے کے لئے ہے۔

اور یہ خیال قرین صواب نہیں کہ تین سو سال شمسی حساب سے ہیں اور تین سو نو سال قمری حساب سے۔ کیونکہ حساب سے تفاوت ٹھیک نو سال کا نہیں ہوتا۔ اسی طرح یہ خیال بھی درست نہیں کہ سونے کی مدت تین سو سال تھی مگر لوگوں نے اس میں نو سال کا اضافہ کیا۔ کیونکہ اس صورت میں انتشار ضمائر لازم آئے گا، جو فصاحت کلام کے خلاف

ہے نیز تین سو نو سال کا کوئی قول موجود نہیں۔

وَاتْلُ مَآ اُوْحِيَ اِلَيْكَ مِنْ كِتَابِ رَبِّكَ ۚ لَا مُبَدِّلَ لِكَلِمٰتِهٖ ۚ وَلَنْ تَجِدَ مِنْ دُوْنِهٖ مُلْتَحَدًا ﴿۲۷﴾ وَاصْبِرْ نَفْسَكَ مَعَ الَّذِيْنَ يَدْعُوْنَ رَبَّهُمْ بِالْغَدٰوةِ وَالْعَشِيِّ يُرِيْدُوْنَ وَجْهَهٗ وَلَا تَعْدُ عَيْنٰكَ عَنْهُمْ ۚ تُرِيْدُ زِيْنَةَ الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا ۚ وَلَا تُطِعْ مَنْ اَغْفَلْنَا قَلْبَهٗ عَنْ ذِكْرِنَا وَاتَّبَعَ هَوٰىهُ وَكَانَ اَمْرُهٗ فُرُطًا ﴿۲۸﴾ وَقُلِ الْحَقُّ مِنْ رَّبِّكُمْ ۚ فَمَنْ شَآءَ فَلْيُؤْمِنْ وَّمَنْ شَآءَ فَلْيَكْفُرْ ۚ اِنَّآ اَعْتَدْنَا لِلظّٰلِمِيْنَ نَارًا ۙ اَحَاطَ بِهِمْ سُرَادِقُهَا ۚ وَاِنْ يَّسْتَغِيْثُوْا يُغَاثُوْا بِمَآءٍ كَالْمُهْلِ يَشْوِي الْوُجُوْهَ ۚ بِئْسَ الشَّرَابُ ۚ وَسَآءَتْ مُرْتَفَقًا ﴿۲۹﴾ اِنَّ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ اِنَّا لَا نُضِيْعُ اَجْرَ مَنْ اَحْسَنَ عَمَلًا ﴿۳۰﴾ اُولٰٓئِكَ لَهُمْ جَنّٰتُ عَدْنٍ تَجْرِيْ مِنْ تَحْتِهِمُ الْاَنْهٰرُ يُحَلَّوْنَ فِيْهَا مِنْ اَسَاوِرَ مِنْ ذَهَبٍ وَّيَلْبَسُوْنَ ثِيَابًا خُضْرًا مِّنْ سُنْدُسٍ وَّاِسْتَبْرَقٍ مُّتَّكِـِٕيْنَ فِيْهَا عَلَى الْاَرَآئِكِ ۚ نِعْمَ الثَّوَابُ ۚ وَحَسُنَتْ مُرْتَفَقًا ﴿۳۱﴾

ع ۱۶

وَاتْلُ	اور پڑھیں آپ	وَلَنْ تَجِدَ	اور ہرگز نہیں پائے گا تو	بِالْغَدٰوةِ	صبح میں
مَآ اُوْحِيَ	اس کو جو وحی کی گئی	مِنْ دُوْنِهٖ	ان کے سوا	وَالْعَشِيِّ	اور شام میں
اِلَيْكَ	آپ کی طرف	مُلْتَحَدًا (۲)	کوئی جائے پناہ	يُرِيْدُوْنَ	چاہتے ہیں وہ
مِنْ كِتَابِ	آپ کے رب کی	وَاصْبِرْ (۳)	اور روکے رکھیں آپ	وَجْهَهٗ	ان کا چہرہ (خوشنودی)
رَبِّكَ (۱)	کتاب سے	نَفْسَكَ	خود کو	وَلَا تَعْدُ (۴)	اور نہ ہٹیں
لَا مُبَدِّلَ	کوئی بدلنے والا نہیں	مَعَ الَّذِيْنَ	ان لوگوں کے ساتھ جو	عَيْنٰكَ	آپ کی آنکھیں
لِكَلِمٰتِهٖ	ان کے ارشادات	يَدْعُوْنَ	پکارتے (عبادت کرتے) ہیں	عَنْهُمْ	ان سے
	(وعدوں) کو	رَبَّهُمْ	اپنے رب کو	تُرِيْدُ	چاہتے ہوئے

(۱) مِنْ بیانیہ مَا موصولہ کا بیان ہے (۲) مُلْتَحَدٌ (اسم ظرف بروزن اسم مفعول یا مصدر میمی) پناہ کی جگہ یا پناہ۔ مصدر اِلْتِحَاد (افتعال) مجرد۔ لَحَدَ (ف) لَحْدًا: بغلی قبر کھودنا (۳) صَبَرَ (ض) صَبْرًا: روکنا، استقلال سے رہنا، صبر کے اصلی معنی ہیں: نفس کو عقل وشرح کے مطابق رکھنا (۴) لَا تَعْدُ (فعل نہی صیغہ واحد مؤنث غائب، آخر سے واو حرف علت فعل نہی ہونے کی وجہ سے گر گیا ←

زِيْنَةَ	رونق	مِنْ رَّبِّكُمْ	تمہارے رب کی	يَّسْتَغِيْثُوْا (۶)	فریاد کریں وہ
الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا	دنیوی زندگانی کی		طرف سے (آ گیا)	يُغَاثُوْا (۷)	(تو) فریاد رسی کئے
وَلَا تُطِعْ	اور نہ کہنا مانیں آپ	فَمَنْ شَآءَ	پس جو چاہے		جائیں گے وہ
مَنْ	اس کا	فَلْيُؤْمِنْ	سو ایمان لائے	بِمَآءٍ	ایسے پانی سے
اَغْفَلْنَا قَلْبَهٗ	جسکے دل کو غافل کیا ہم نے	وَّ مَنْ شَآءَ	اور جو چاہے	كَالْمُهْلِ (۸)	جو تلچھٹ کی طرح (ہے)
عَنْ ذِكْرِنَا	اپنی یاد سے	فَلْيَكْفُرْ	سو انکار کرے	يَشْوِي (۹)	بھون ڈالے گا وہ
وَاتَّبَعَ	اور پیروی کی اس نے	اِنَّآ (۳)	بے شک ہم نے	الْوُجُوْهَ	چہروں کو
هَوٰىهُ	اپنی خواہش کی	اَعْتَدْنَا	تیار رکھی ہے	بِئْسَ (۱۰)	برا ہے
وَكَانَ	اور ہے	لِلظّٰلِمِيْنَ	ناانصافوں کے لئے	الشَّرَابُ	مشروب
اَمْرُهٗ	اس کا معاملہ	نَارًا	آگ	وَسَآءَتْ (۱۱)	اور بری ہے (وہ آگ)
فُرُطًا (۱)	حد سے گذرا ہوا	اَحَاطَ بِهِمْ (۴)	گھیر رکھا ہے ان کو	مُرْتَفَقًا (۱۲)	آرام کی جگہ کے اعتبار سے
وَقُلِ	اور کہیں آپ	سُرَادِقُهَا (۵)	اس کی قنات نے	اِنَّ الَّذِيْنَ	بے شک جو لوگ
الْحَقُّ (۲)	دین حق	وَاِنْ	اور اگر	اٰمَنُوْا	ایمان لائے

← ہے) ازعَدَا (ن) عَدْوًا: کسی چیز سے تجاوز کرنا، دوڑنا — عَيْنَاكَ فاعل ہے — جملہ تُرِيْدُ إلخ حال ہے عَيْنَاكَ کے کاف سے۔

(۱) اَلْفُرُط (وصف یا مصدر) حد سے گذرا ہوا، چھوڑا ہوا کام۔ فَرَطَ (ن) فِي الأمر: کوتاہی کرنا (۲) اَلْحَقُّ فعل محذوف کا فاعل ہے أي جاءَ الحق (۳) یہ لف ونشر مشوش ہے إِنَّا أَعْتَدْنَا کا تعلق وَمَنْ شَاءَ فَلْيَكْفُرْ سے ہے اور إِنَّ الَّذِيْنَ آمَنُوْا إلخ کا تعلق فَمَنْ شَاءَ فَلْيُؤْمِنْ سے ہے (۴) جملہ أَحَاطَ بِهِمْ إلخ نَارًا کی صفت ہے (۵) سُرَادِقٌ مفرد اس کی جمع سُرَادِقَات ہے یہ فارسی کلمہ ''سرادر'' یا ''سراپردہ'' کا معرب ہے سُرَادِقٌ: ہر وہ چیز جو کسی چیز کا احاطہ کئے ہوئے ہو، خواہ چار دیواری ہو یا شامیانہ یا خیمہ (۶) يَسْتَغِيْثُوْا (مضارع مجزوم، صیغہ جمع مذکر غائب) مصدر اِسْتِغَاثَةٌ: مدد طلب کرنا، مادہ، اَلْغَوْثُ: مدد۔ يَسْتَغِيْثُوْا کی اصل يَسْتَغْوِثُوْا ہے واو کا کسرہ ماقبل کو دیا پھر واو کو ی سے بدل دیا، خیال رہے کہ اس کا مادہ غَيْثٌ (بارش) نہیں ہے (۷) يُغَاثُوْا (مضارع مجہول، صیغہ جمع مذکر غائب) اَغَاثَةٌ: مدد کرنا، اعانت کرنا مادّہ الغوث. (۸) اَلْمُهْل (اسم) تیل کی تلچھٹ، ہر معدنی چیز جبکہ پگھلی ہوئی ہو، زرد پیپ، زخم کا پانی (۹) جملہ يَشْوِيْ إلخ مَاءٌ کی صفت بھی ہو سکتا ہے اور اَلْمُهْل کا حال بھی (۱۰) الشَّرَابُ فاعل ہے اور مخصوص بالذم محذوف ہے أي ذلك الماء السمتغاث به (۱۱) سَآءَتْ کا فاعل هِيَ ضمیر مستتر ہے جو نَار کی طرف لوٹتی ہے اور مُرْتَفَقًا تمیز ہے (۱۲) اَلْمُرْتَفَقُ (ظرف مکان) آرام کی جگہ اِرْتِفَاقٌ کے اصلی معنی ہیں کہنی کھڑی کر کے اس کا پر گال رکھ کر آرام کرنا۔ جہنم کے لئے اس لفظ کا استعمال استہزاءً یا مشاکلۃً کیا گیا ہے۔

وَعَمِلُوا	اور کیے انھوں نے	عَدْنٍ	ہیشگی کے	خُضْرًا	سبز رنگ کے
الصّٰلِحٰتِ	نیک کام	تَجْرِیْ	بہتی ہیں	مِّنْ سُنْدُسٍ (۵)	باریک ریشم کے
اِنَّا (۱)	بے شک ہم	مِنْ تَحْتِهِمُ (۳)	ان کے نیچے سے	وَّاِسْتَبْرَقٍ	اور دبیز ریشم سے
لَا نُضِيْعُ	نہیں ضائع کرتے	الْاَنْهٰرُ	نہریں	مُّتَّكِـِٕيْنَ (۶)	ٹیک لگائے ہوئے ہونگے
اَجْرَ	بدلہ	يُحَلَّوْنَ	زیور پہنائے جائیں گے وہ	فِيْهَا	جنتوں میں
مَنْ	ان کا جنھوں نے	فِيْهَا	ان باغوں میں	عَلَى الْاَرَآىِٕكِ	چھپر کھٹوں پر
اَحْسَنَ عَمَلًا	اچھا کیا کام	مِنْ اَسَاوِرَ (۴)	کنگنوں سے	نِعْمَ	اچھا ہے
اُولٰۤىِٕكَ	یہ لوگ	مِنْ ذَهَبٍ	سونے کے	الثَّوَابُ	صلہ (بدلہ)
لَهُمْ (۲)	ان کے لئے (ہیں)	وَّيَلْبَسُوْنَ	اور پہنیں گے	وَحَسُنَتْ	اور اچھی ہے (وہ جنت)
جَنّٰتُ	باغات	ثِيَابًا	کپڑے	مُرْتَفَقًا	آرام کی جگہ کے اعتبار سے

ابھی ضمناً یہ پیشین گوئی آئی تھی کہ آنحضرت ﷺ کے ساتھ اصحاب کہف سے بھی زیادہ عجیب معاملہ پیش آنے والا ہے اور وہ معاملہ رُشد وہدایت، صلاح وفلاح اور خوبی اور بہتری کے اعتبار سے اصحاب کہف کے واقعہ سے بھی بہتر ہوگا۔ اب اس پیشین گوئی کے تعلق سے کچھ احکام دیئے جاتے ہیں۔ ان آیتوں میں تین باتیں بیان کی گئی ہیں:

۱ــــ پیشین گوئی ضرور پوری ہوگی۔ اللہ تعالیٰ نہ تو وعدہ خلافی کرنے والے ہیں نہ کوئی دوسرا ان کے وعدوں کو

(۱) جملہ اِنَّا لَا نُضِيْعُ إلخ خبر ہے اِنَّ الَّذِيْنَ آمَنُوْا کی اور جملہ لَا نُضِيْعُ خبر ہے دوسرے اِنَّ کی۔ اَجْرَ مفعول بہ ہے اور مابعد کی طرف مضاف ہے مَنْ أَحْسَنَ إلخ موصول صلہ مل کر مضاف الیہ ہیں (۲) لَهُمْ خبر مقدم ہے اور جَنّٰتُ إلخ مبتدا مؤخر۔ پھر جملہ اُوْلٰئِكَ کی خبر ہے (۳) مِنْ تَحْتِهِمْ میں مجاز بالحذف ہے أي من تحت مساكنهم (۴) مِنْ أَسَاوِرَ میں من ابتدائیہ یا مفعول بہ پر من زائدہ ہے اور من ذهب میں من بیانیہ ہے اور جار مجرور محذوف سے متعلق ہوکر أَسَاوِرَ کی صفت ہیں ــــ اَسَاوِرُ کا مفرد سِوَارٌ ہے جس کے معنی ہیں کنگن، پہنچی، دستینہ، کلائی کا ایک زیور (۵) سُنْدُسٌ: باریک ریشم، یہ کلمہ معرب ہے اکثر علمائے لغت کے نزدیک اس کی اصل فارسی ہے اور شَيْذَلَه جو فقہائے شافعیہ میں سے ہیں اور مفسر بھی ہیں، مشکلات القرآن میں ان کی تصنیف بھی ہے وہ اس لفظ کو ہندی بتاتے ہیں اور روح المعانی میں ہے کہ بھروچ کے لوگوں نے یہ کپڑا اسکندر ثانی کی خدمت میں پیش کیا تھا۔ اس نے دریافت کیا کہ یہ کیا کپڑا ہے؟ وفد نے جو سنکرت میں گفتگو کر رہا تھا جواب دیا کہ اس کا نام سُند ون ہے۔ رومیوں نے اس کو سُندوس کر دیا پھر عربوں نے اس کو سُنْدُسْ کر دیا۔ اگر یہ قصہ صحیح تو سنکرت کے ماہرین ہیں اس لفظ کی اصل بتا سکتے ہیں (۶) متکئین حال ہے یلبسون کی ضمیر فاعل سے حال ہے۔

بدل سکتا ہے لہٰذا آپؐ اپنا کام کرتے رہیں اور آپؐ اور سب مسلمان اللہ تعالیٰ سے معاملہ استوار رکھیں۔

۲ــــ آپؐ مخلص مؤمنین کی طرف متوجہ رہیں گو وہ فقراء ہوں آپؐ کی نگاہیں ان سے بڑھ کر خوش عیش لوگوں پر نہ پڑیں اور آپؐ ہوا پرستوں کی بات پر کان نہ دھریں۔

۳ــــ اعلان کردیں کہ حق آ گیا ہے۔ پس جس کا جی چاہے مان لے اور جس کا جی چاہے انکار کردے۔ اللہ تعالیٰ کا اس میں نہ نفع ہے نہ نقصان، پھر انکار کرنے والوں کو ان کا انجام سنا دیں اور ایمان لانے والوں کو حسن انجام کی خوش خبری دیدیں۔

اب تفصیل کے ساتھ یہ مضامین پڑھیں:

پہلی بات: ــــ اور آپ اپنے پروردگار کی کتاب کو جو آپ کی طرف وحی کی گئی ہے پڑھیں ــــ یعنی آپ اپنے مرض منصبی کی انجام دہی میں مشغول رہیں اور جو کافی شافی کتاب آپ کے پروردگار نے عنایت فرمائی ہے اُسے پڑھ کر سناتے رہیں ــــ اللہ کے فرمودات کو کوئی بدلنے والا نہیں ــــ یعنی جو وعدے اللہ تعالیٰ نے اپنے کلام پاک میں کئے ہیں ان کو کوئی طاقت بدل نہیں سکتی۔ پیشین گوئی حرف بہ حرف پوری ہوگی، اور حالات خواہ کیسے ہی ناسازگار ہوں ــــ اور اللہ تعالیٰ کے سوا آپ ہرگز کوئی جائے پناہ نہیں پائیں گے ــــ یہ بات کفار کو سنائی گئی ہے کہ جب وعدہ پورا ہوگا تو کفار کو کوئی جائے پناہ نہیں ملے گی۔

دوسری بات: آپؐ ہمیشہ مخلص مؤمنین پر اپنی توجہات مبذول رکھیں، کیونکہ وہی اسلام کا اصل سرمایہ ہیں اور ان کے فقر و فاقہ پر نظر نہ ڈالیں کہ وہ آنکھ جھپکتے بدل جانے والے احوال ہیں اور خدا فراموشوں کی ایک نہ سنیں ان کی ہر بات راہ راست سے ہٹا دینے والی ہے۔ ارشاد ہے ــــ اور آپؐ خود کو ان لوگوں کے ساتھ روکے رکھیں جو صبح و شام ــــ یعنی مدام ــــ اپنے پروردگار کو پکارتے ہیں: وہ ان کی خوشنودی چاہتے ہیں ــــ یعنی اللہ تعالیٰ کی خوشنودی حاصل کرنے کے لئے، نہایت اخلاص کے ساتھ، ہمیشہ عبادت میں مشغول رہتے ہیں: ذکر کرتے ہیں، قرآن کریم پڑھتے ہیں، نماوں کی پابندی کرتے ہیں، حلال و حرام میں تمیز کرتے ہیں اور اللہ کے حقوق کو پہچانتے ہیں۔ اگرچہ دنیوی حیثیت سے وہ معزز اور مالدار نہیں، جیسے حضرت عمار، حضرت صہیب، حضرت بلال اور حضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہم: ایسے مخلصین کو اپنی صحبت سے مستفید کرتے رہیں۔ اور لوگوں کے کہنے پر ان کو اپنی مجلس سے دور نہ کریں ــــ اور آپؐ کی نگاہیں ــــ توجہات ــــ اُن سے نہ ہٹیں، دنیوی زندگانی کی رونق چاہتے ہوئے ــــ یعنی ان غریب، شکستہ حال مخلصین کو چھوڑ کر دنیاداروں کی طرف اس غرض سے نظر نہ اٹھائیں کہ ان کے مسلمان ہونے سے اسلام کو بڑی

تقویت ملے گی ـــــ اور آپؐ ایسے شخص کا کہنا نہ مانیں جس کے دل کو ہم نے اپنی یاد سے غافل کر دیا ہے اور وہ اپنی خواہش پر چلتا ہے اور اس کا معاملہ حد سے گذرا ہوا ہے ـــــ یعنی جن کے دل دنیا کے نشہ میں مست ہو کر خدا کی یاد سے غافل ہو گئے ہیں، جو ہر وقت نفس کی خوشی اور خواہش کی پیروی میں مشغول رہتے ہیں اور جن کی خدا بیزاری حدود سے تجاوز کر گئی ہے، ایسے بدمست غافلوں کی بات پر آپ کان نہ دھریں، خواہ وہ کیسے ہی دولت منداور جاہ وثروت والے ہوں۔

روایات میں متعدد ایسے واقعات آئے ہیں جن سے اس مضمون پر روشنی پڑتی ہے:

پہلا واقعہ: عُیینۃُ بن حِصْن فَزَارِیْ خدمت نبوی میں حاضر ہوا۔ آپؐ کے پاس حضرت سلمان فارسی رضی اللہ عنہ بیٹھے ہوئے تھے، ان کا لباس خستہ اور ہیئت فقیرانہ تھی۔ عیینہ نے کہا: ہمیں آپؐ کے پاس آنے اور آپ کی بات سننے سے یہی لوگ مانع ہیں، ایسے خستہ حال لوگوں کے پاس ہم نہیں بیٹھ سکتے، آپ ان کو اپنی مجلس سے ہٹا دیں یا کم از کم ہمارے لئے علیحدہ مجلس منعقد کریں تو ہم حاضر ہو کر آپ سے استفادہ کریں۔

دوسرا واقعہ: امیۃ بن خلف جُمَحی نے آنحضرت ﷺ کو مشورہ دیا کہ شکستہ حال مسلمانوں کو آپؐ اپنے قریب نہ رکھیں، بلکہ قریش کے سرداروں کو ساتھ لگائیں یہ لوگ آپ کا دین قبول کر لیں گے تو اسلام کو ترقی ہوگی۔

تیسرا واقعہ: عیینہ بن بدر اور اَقرع بن حابس تمیمی نے آنحضرت ﷺ سے کہا: اگر آپؐ مجلس میں صدر نشیں ہوں اور ان رذیلوں کو اپنے پاس سے ہٹا دیں اور ان کے جُبّوں کی بدبو سے ہمیں نجات دیدیں ـــ ان کی مراد حضرت سلمان فارسی، حضرت ابوذر غفاری اور فقرائے مؤمنین تھے جو اس زمانہ میں اُون کے جُبّے پہنتے تھے ـــ تو ہم آپؐ کی مجلس میں بیٹھیں، آپ سے باتیں کریں اور آپؐ کی تعلیمات سے استفادہ کریں۔

یہ سب واقعات درمنثور میں ہیں جب اس قسم کے بے ہودہ مشورے بار بار سامنے آئے تو یہ آیت کریمہ اور اسی مضمون کی دوسری آیتیں نازل ہوئی۔ سورۃ الانعام آیت ۵۲ میں بھی یہ مضمون ہے۔ ان آیتوں میں نبی کریم ﷺ سے کہا گیا ہے کہ جو لوگ رضائے الٰہی کی خاطر شب وروز اپنے رب کو یاد کرتے ہیں: ان کی تربیت کی طرف توجہ فرمائیں۔ نگاہ ان سے ہرگز نہ ہٹائیں۔ کیا آپ چاہتے ہیں کہ ان مخلص لوگوں کو چھوڑ کر دنیوی ٹھاٹھ رکھنے والے لوگوں سے راہ ورسم پیدا کریں اور وہ آپ کے ہم نشیں بنیں؟ یہ بات اگرچہ آنحضرت ﷺ کو مخاطب بنا کر کہی گئی ہے مگر درحقیقت سردارانِ قریش کو سنائی گئی ہے کہ تمہاری یہ دکھاوے کی شان وشوکت جس پر تم آپے سے باہر ہو رہے ہو، اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول کی نگاہ میں کچھ وقعت نہیں رکھتی۔ تم سے وہ غریب لوگ زیادہ قیمتی ہیں جن کے دل میں اخلاص ہے اور جو اپنے رب کی یاد سے کبھی غافل نہیں ہوتے۔ تمہیں بات سنی ہو سنو، نہ سنی ہو نہ سنو، مگر یہ سودا دماغ

سے نکال دو کہ تمہاری خاطر ان مخلصین کو دھکا دیدیا جائے گا۔

تیسری بات: عام اعلان کیا جائے کہ حق لوگوں تک پہنچ چکا ہے اور اللہ کی حجت تام ہو چکی ہے۔ اب لوگوں کی مرضی ہے: مانیں یا نہ مانیں۔ اللہ تعالیٰ کو کسی کے ماننے نہ ماننے کی پرواہ نہیں جو کچھ نفع نقصان ہوگا انہیں کا ہوگا۔ پس ماننے والے اور نہ ماننے والے دونوں ہی اپنا انجام سن لیں۔ ارشاد ہے ـــــ اور آپؐ کہہ دیں کہ دین حق تمہارے پروردگار کی طرف سے آگیا ـــــ یعنی دین حق اپنی پوری تابانی کے ساتھ اللہ تعالیٰ کی طرف سے جلوہ گر ہو چکا ہے اور راہ ہدایت خوب واضح ہو چکی ہے ـــــ اب جس کا جی چاہے مان لے اور جس کا جی چاہے انکار کرے ـــــ یہ تخییر نہیں، بلکہ تہدید ہے، پس جو نہیں مانے گا وہ سن لے ـــــ ہم نے ظالموں کے لئے آتش دوزخ تیار کر رکھی ہے ـــــ اس کی ہولناکی خدا کی پناہ! ـــــ اُس آگ کی قناتیں اس کو گھیرے ہوئے ہیں ـــــ اور وہ سراپردے بھی آگ ہی کے ہیں، اُن کے گھیرے سے جہنمی کبھی نہ نکل سکیں گے۔ حدیث شریف میں ہے کہ ان قناتوں کی موٹائی چالیس سالہ مسافت ہے ـــــ اور اگر لوگ فریاد کریں گے تو ایسے پانی سے ان کی دادرسی کی جائے گی جو تیل کی تلچھٹ کی طرح ہے جو ان کا منہ بھون ڈالے گی ـــــ یعنی جہنم میں جب گرمی کی شدت سے جہنمیوں کو پیاس لگے گی اور وہ فریاد کریں گے اور پانی پانی چلائیں گے، تو تیل کی تلچھٹ یا پگھلی ہوئی دھات یا پیپ کی طرح کا پانی دیا جائے گا، جو گرم اس قدر ہوگا کہ منہ کو بھون ڈالے گا ـــــ کیسا برا مشروب ہے اور کیسی بری آرام گاہ ہے ـــــ اے اللہ ہم سب کو اُس بری جگہ سے بچا (آمین)

اور قرآن کریم کی دعوت قبول کرنے والوں کا بہترین انجام بھی سنئے: ـــــ بیشک جو لوگ ایمان لائے اور انھوں نے اچھے کام کئے ہم ان لوگوں کا اجر ضائع نہیں کریں گے جو اچھی طرح کام کرتے ہیں ـــــ یعنی ان کی ادنی سے ادنی نیکی بھی ضائع نہ ہوگی اور ہر نیکی کا ان کو پورا پورا بدلہ ملے گا ـــــ ایسے ہی لوگوں کے لئے سدا بسنے کے باغات ہیں ـــــ یہ دوزخیوں کی سختیوں اور ہولناکیوں کے مقابلہ میں اہل جنت کے عیش کا بیان ہے ان کو بسنے کے لئے ایسے باغات دیئے جائیں گے جو کبھی ان سے چھینے نہیں جائیں گے۔ جنتی سدا ان میں رہیں گے ـــــ ان کے نیچے نہریں بہتی ہونگی ـــــ جس سے منظر بھی خوشنما ہوگا اور باغات بھی سدا بہار ہونگے ـــــ ان کو وہاں سونے کے کنگن پہنائے جائیں گے ـــــ قدیم زمانہ میں بادشاہ سونے کے کنگن پہنتے تھے، اہل جنت کو بھی یہ شاہانہ زیور پہنایا جائے گا ـــــ اور وہ باریک اور دبیز ریشم کے سبز کپڑے پہنیں گے ـــــ جنت میں مردوں کے لئے بھی زیور اور ریشمی کپڑے جائز ہیں یہ چیزیں وہاں مردوں کو بھی خوب زیب دیں گی اور دنیا میں مردوں کے لئے سونے کا کوئی بھی زیور

یہاں تک کہ انگوٹھی اور گھڑی کی چین بھی جائز نہیں۔اسی طرح ریشمی کپڑے مردوں کے لئے جائز نہیں۔حدیث شریف میں ہے کہ جوشخص دنیا میں یہ دونوں چیزیں پہنے گا آخرت میں وہ ان سے محروم رہے گا البتہ ساڑھے چار گرام تک چاندی کی انگوٹھی جائز ہے۔اور چار انگشت تک ریشم کی چوڑی پٹی جائز ہے،لمبی خواہ کتنی بھی ہو —— اور یہ جو تعبیر میں فرق ہوا ہے کہ زیور تو پہنائے جائیں گے اور لباس پہنیں گے یعنی ایک فعل مجہول ہے اور دوسرا معروف تو اس کی وجہ یہ ہے کہ لوگوں کی عادت یہی ہے کہ زیور دوسرا پہناتا ہے اور لباس آدمی خود پہنتا ہے —— وہ وہاں مسہریوں پر تکیے لگائے ہوئے بیٹھے ہوں گے —— یعنی نہایت عزت وآرام کے ساتھ چھپر کھٹوں پر گاؤ تکیے لگائے ہوئے آپس میں باتیں کرتے ہوں گے —— کیسا اچھا صلہ ہے اور کیسی اچھی آرام گاہ ہے! —— اللہ تعالیٰ ہر مؤمن کو یہ نعمتیں عطا فرمائے،ان کے ایمان کی حفاظت فرمائے اور ان کو جنت والے کاموں کی توفیق بخشے (آمین)

کلمہ طیبہ جنت کی چابی ہے اور نیک اعمال اس کے دندانے۔اور چابی کام اسی وقت کرتی ہے جب اس میں دندانے درست ہوں

وَاضْرِبْ لَهُمْ مَّثَلًا رَّجُلَيْنِ جَعَلْنَا لِاَحَدِهِمَا جَنَّتَيْنِ مِنْ اَعْنَابٍ وَّحَفَفْنٰهُمَا بِنَخْلٍ وَّ جَعَلْنَا بَيْنَهُمَا زَرْعًا ﴿٣٢﴾ كِلْتَا الْجَنَّتَيْنِ اٰتَتْ اُكُلَهَا وَلَمْ تَظْلِمْ مِّنْهُ شَيْئًا ۙ وَّفَجَّرْنَا خِلٰلَهُمَا نَهَرًا ﴿٣٣﴾ وَّكَانَ لَهٗ ثَمَرٌ ۚ فَقَالَ لِصَاحِبِهٖ وَهُوَ يُحَاوِرُهٗۤ اَنَا اَكْثَرُ مِنْكَ مَالًا وَّاَعَزُّ نَفَرًا ﴿٣٤﴾ وَدَخَلَ جَنَّتَهٗ وَهُوَ ظَالِمٌ لِّنَفْسِهٖ ۚ قَالَ مَاۤ اَظُنُّ اَنْ تَبِيْدَ هٰذِهٖۤ اَبَدًا ﴿٣٥﴾ وَّمَاۤ اَظُنُّ السَّاعَةَ قَآئِمَةً ۙ وَّلَئِنْ رُّدِدْتُّ اِلٰى رَبِّيْ لَاَجِدَنَّ خَيْرًا مِّنْهَا مُنْقَلَبًا ﴿٣٦﴾ قَالَ لَهٗ صَاحِبُهٗ وَهُوَ يُحَاوِرُهٗۤ اَكَفَرْتَ بِالَّذِيْ خَلَقَكَ مِنْ تُرَابٍ ثُمَّ مِنْ نُّطْفَةٍ ثُمَّ سَوّٰىكَ رَجُلًا ﴿٣٧﴾ لٰكِنَّا۠ هُوَ اللّٰهُ رَبِّيْ وَلَاۤ اُشْرِكُ بِرَبِّيْۤ اَحَدًا ﴿٣٨﴾ وَلَوْلَاۤ اِذْ دَخَلْتَ جَنَّتَكَ قُلْتَ مَا شَآءَ اللّٰهُ ۙ لَا قُوَّةَ اِلَّا بِاللّٰهِ ۚ اِنْ تَرَنِ اَنَا اَقَلَّ مِنْكَ مَالًا وَّوَلَدًا ﴿٣٩﴾ فَعَسٰى رَبِّيْۤ اَنْ يُّؤْتِيَنِ خَيْرًا مِّنْ جَنَّتِكَ وَيُرْسِلَ عَلَيْهَا حُسْبَانًا مِّنَ السَّمَآءِ فَتُصْبِحَ صَعِيْدًا زَلَقًا ﴿٤٠﴾

اَوْ يُصْبِحَ مَآؤُهَا غَوْرًا فَلَنْ تَسْتَطِيْعَ لَهٗ طَلَبًا ﴿۴۱﴾ وَاُحِيْطَ بِثَمَرِهٖ فَاَصْبَحَ يُقَلِّبُ كَفَّيْهِ عَلٰى مَآ اَنْفَقَ فِيْهَا وَهِيَ خَاوِيَةٌ عَلٰى عُرُوْشِهَا وَيَقُوْلُ يٰلَيْتَنِيْ لَمْ اُشْرِكْ بِرَبِّيْٓ اَحَدًا ﴿۴۲﴾ وَلَمْ تَكُنْ لَّهٗ فِئَةٌ يَّنْصُرُوْنَهٗ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ وَمَا كَانَ مُنْتَصِرًا ﴿۴۳﴾ هُنَالِكَ الْوَلَايَةُ لِلّٰهِ الْحَقِّ ۭ هُوَ خَيْرٌ ثَوَابًا وَّخَيْرٌ عُقْبًا ﴿۴۴﴾

وَاضْرِبْ (1)	اور بیان کیجئے	زَرْعًا	کھیتی	فَقَالَ	پس کہا اس نے
لَهُمْ	ان کے لئے	كِلْتَا (3)	دونوں	لِصَاحِبِهٖ	اپنے ساتھی سے
مَّثَلًا	مضمون	الْجَنَّتَيْنِ	باغ	وَهُوَ	اور وہ
رَّجُلَيْنِ	دو شخصوں کا	اٰتَتْ	دیا انھوں نے	يُحَاوِرُهٗ (6)	اس سے باتیں کر رہا تھا
جَعَلْنَا	بنائے ہم نے	اُكُلَهَا	اپنا پھل	اَنَا	میں
لِاَحَدِهِمَا	ان میں سے ایک کیلئے	وَلَمْ تَظْلِمْ (4)	اور نہیں گھٹایا باغ نے	اَكْثَرُ	زیادہ ہوں
جَنَّتَيْنِ	دو باغ	مِّنْهُ شَيْئًا	پھل میں سے ذرا بھی	مِنْكَ	تجھ سے
مِنْ اَعْنَابٍ	انگور کے	وَّفَجَّرْنَا	اور بہائی ہم نے	مَالًا	مال میں
وَّحَفَفْنٰهُمَا (2)	اور گھیرا ہم نے دونوں کو	خِلٰلَهُمَا (5)	دونوں کے درمیان	وَّاَعَزُّ (7)	اور گرامی قدر ہوں
بِنَخْلٍ	کھجور کے درختوں سے	نَهَرًا	نہر	نَفَرًا	جماعت میں
وَّجَعَلْنَا	اور بنائی ہم نے	وَّكَانَ لَهٗ	اور تھا اس کے لئے	وَدَخَلَ	اور داخل ہوا
بَيْنَهُمَا	دونوں کے درمیان	ثَمَرٌ	پھل	جَنَّتَهٗ	اپنے باغ میں

(۱)ضَرْب کا استعمال جب مَثَلْ کے ساتھ ہوتو اس کے دو مفعول ہوتے ہیں یہاں ایک مفعول مَثَلًا ہے اور دوسرا رَجُلَیْنِ اور دونوں درحقیقت ایک ہی چیز ہوتے ہیں۔ نیز رَجُلَیْنِ کو مَثَلًا سے بدل بھی بنا سکتے ہیں (۲)حَفَفْنَا (ماضی، جمع متکلم) حَفَّ (ن) حَفًّا: گھیرنا۔ حَفَّهٗ بِكَذَا: احاطہ کر لینا (۳) كِلْتَا لفظ کے اعتبار سے تثنیہ اور معنی کے اعتبار سے مفرد ہے چنانچہ آتَتْ خبر مفرد آئی ہے۔ اور خِلَالَهُمَا میں تثنیہ کی ضمیر آئی ہے — كِلْتَا الْجَنَّتَيْنِ (مرکب اضافی) مبتدا اور جملہ آتَتْ خبر ہے — آتَتْ (ماضی واحد مؤنث غائب) آتٰی اِيْتَاءً الشيئَ: دینا (۴) ظَلَمَهٗ (ض) حَقَّه: گھٹانا (۵) دیکھئے بنی اسرائیل آیت نمبر ۵ (۶) يُحَاوِرُ از باب مفاعلہ۔ حَاوَرَهٗ مُحَاوَرَةً وَحِوَارًا: گفتگو کرنا، جواب دینا (۷) أَعَزُّ کا مُفَضَّلْ منه محذوف ہے أى منك اور مَالًا اور نَفَرًا تمیز ہیں۔

وَهُوَ	اور وہ	خَيْرًا	بہتر	رَجُلًا	آدمی
ظَالِمٌ	ظلم کرنے والا تھا	مِّنْهَا	اس باغ سے	لٰكِنَّا (۸)	لیکن میں
لِّنَفْسِهٖ (۱)	اپنی ذات پر	مُنْقَلَبًا (۴)	پلٹنے کی جگہ	هُوَ	شان یہ ہے
قَالَ	کہا اس نے	قَالَ لَهٗ	کہا اس سے	اللّٰهُ	(کہ) اللہ تعالیٰ
مَآ اَظُنُّ	نہیں خیال کرتا ہوں میں	صَاحِبُهٗ	اس کے ساتھی نے	رَبِّيْ	میرے رب ہیں
اَنْ تَبِيْدَ (۲)	کہ برباد ہو	وَهُوَ	اور وہ	وَلَآ اُشْرِكُ	اور نہیں شریک ٹھہراتا میں
هٰذِهٖٓ	یہ باغ	يُحَاوِرُهٗٓ	اس سے باتیں کر رہا ہے	بِرَبِّيْٓ	میرے رب کے ساتھ
اَبَدًا	کبھی بھی	اَكَفَرْتَ (۵)	کیا انکار کیا تو نے	اَحَدًا	کسی کو
وَّمَآ اَظُنُّ	اور نہیں خیال کرتا میں	بِالَّذِيْ	اس کا جس نے	وَلَوْلَآ	اور کیوں نہ
السَّاعَةَ	قیامت کو	خَلَقَكَ	پیدا کیا تجھ کو	اِذْ دَخَلْتَ (۹)	جب داخل ہوا تو
قَآئِمَةً	برپا ہونے والی	مِنْ تُرَابٍ	خاک سے	جَنَّتَكَ	اپنے باغ میں
وَّلَئِنْ	اور بخدا اگر	ثُمَّ	پھر	قُلْتَ	کہا تو نے
رُّدِدْتُّ (۳)	پھیرا گیا میں	مِنْ نُّطْفَةٍ (۶)	قطرہ سے	مَا شَآءَ (۱۰)	جو کچھ چاہتے ہیں
اِلٰى رَبِّيْ	میرے رب کی طرف	ثُمَّ	پھر	اللّٰهُ	اللہ تعالیٰ (وہی ہوتا ہے)
لَاَجِدَنَّ	(تو) ضرور پاؤنگا میں	سَوّٰىكَ (۷)	ٹھیک بنایا تجھ کو	لَا قُوَّةَ	نہیں کچھ طاقت

(۱)لِنَفْسِہٖ: ظَالِمٌ (اسم فاعل) کا مفعول بہ ہے اور لام زائد ہے (۲) جملہ تَبِیْدَ بتاویل مصدر ہو کر أَظُنُّ کا مفعول ہے— تَبِیْدُ (مضارع واحد مؤنث غائب) بَادَ (ض) بَیْدًا وَ بَیَادًا: ہلاک ہونا بیابان میں کسی چیز کا متفرق اور پراگندہ ہونا، مکمل برباد ہونا۔ (۳) رُدِدْتُ (ماضی مجہول واحد متکلم) رَدَّ (ن) رَدًّا: لوٹانا، واپس کرنا۔ پھیرنا (۴) مُنْقَلَبًا تمیز ہے۔ مُنْقَلَبٌ (اسم ظرف) لوٹنے کی جگہ (مصدر میمی) لوٹنا (۵) استفہام توبیخ (ملامت کرنے) اور تقریع (جھڑکنے) کے لئے ہے (۶) نَطَفَ (ن، ض) نَطْفًا الماءُ: تھوڑا تھوڑا پانی بہنا۔ نَطَفَتِ الْقِرْبَۃُ مشک کا ٹپکنا النُّطفة: (۱) صاف پانی تھوڑا ہو یا زیادہ (۲) مرد یا عورت کا مادہ۔ جمع نُطَفٌ وَ نِطَافٌ (۷) سوّٰی تَسْوِیَۃً: پورا پورا بنانا، برابر کرنا۔ یہ فعل بمعنی صَیَّرَ اور جَعَلَ ہے اور رَجُلاً اس کا مفعول ثانی ہے (۸) لٰکِنَّا دو لفظ ہیں لٰکِنْ (حرف استدراک) اور اَنَا (ضمیر واحد متکلم) خلاف قیاس ہمزہ کو اس کی حرکت کے ساتھ حذف کر دیا پھر نون کا نون میں ادغام کیا۔ أَنَا کے آخر کا الف حالت وقف میں تو پڑھا جاتا ہے مگر حالت وصل میں نہیں پڑھا جاتا اس لئے اس پر گول دائرہ بنایا گیا جو الف کے نہ پڑھے جانے کی نشانی ہے۔ لٰکِنَّا میں جو لٰکِنْ ہے وہ بے عمل ہے اور اس میں جو أَنَا ہے وہ مبتدا اول ہے هُوَ (ضمیر شان) مبتدا ثانی۔ اَللّٰہ مبتدا ثالث، رَبِّیْ خبر (۹) اِذْ دَخَلْتَ قُلْتَ کا ظرف مقدم ہے (۱۰) مَا موصولہ جملہ شَاءَ اللّٰهُ صلہ ←

اِلَّا بِاللّٰهِ	مگر اللہ کی مدد سے	حُسْبَانًا (۳)	کوئی آفت	يُقَلِّبُ	الٹنے پلٹنے
اِنْ تَرَنِ (۱)	اگر دیکھتا ہے تو مجھ کو	مِّنَ السَّمَآءِ	آسمان سے	كَفَّيْهِ	اپنی ہتھیلیوں کو
اَنَا	(کہ) میں	فَتُصْبِحَ (۴)	پس ہو جائے وہ	عَلٰى (۸)	اس پر جو
اَقَلَّ	کم ہوں	صَعِيْدًا	زمین	مَآ اَنْفَقَ	خرچ کیا اس نے
مِنْكَ	تجھ سے	زَلَقًا (۵)	میدان	فِيْهَا	اس باغ میں
مَالًا	مال میں	اَوْ يُصْبِحَ	یا ہو جائے	وَهِيَ	اور وہ
وَّوَلَدًا	اور اولاد میں	مَآؤُهَا	اس کا پانی	خَاوِيَةٌ (۹)	گرا پڑا ہے
فَعَسٰى	تو ہو سکتا ہے	غَوْرًا (۶)	زمین میں اترا ہوا	عَلٰى عُرُوْشِهَا	اپنی چھتریوں پر
رَبِّيْٓ	میرا رب	فَلَنْ تَسْتَطِيْعَ	پس نہ طاقت رکھتے تو	وَيَقُوْلُ	اور کہہ رہا ہے وہ
اَنْ يُّؤْتِيَنِ (۲)	کہ دے مجھے	لَهٗ	اس کو	يٰلَيْتَنِيْ	کیا خوب
خَيْرًا	بہتر	طَلَبًا	تلاش کرنے کی	لَمْ اُشْرِكْ	نہ شریک ٹھہراتا میں
مِّنْ جَنَّتِكَ	تیرے باغ سے	وَاُحِيْطَ	اور گھیرا گیا	بِرَبِّيْٓ	میرے رب کے ساتھ
وَيُرْسِلَ	اور بھیج دے	بِثَمَرِهٖ	اس کے پھل کو	اَحَدًا	کسی کو
عَلَيْهَا	اس باغ پر	فَاَصْبَحَ (۷)	پس لگا وہ	وَلَمْ تَكُنْ لَّهٗ	اور نہیں تھی اس کے لئے

← پھر موصول صلہ مل کر یا تو خبر ہیں اور مبتدا الْاَمْرُ محذوف ہے یا مبتدا ہیں اور خبر كَائِنٌ محذوف ہے اور بِاللّٰه محذوف سے متعلق ہو کر لائے نفی جنس کی خبر ہے۔

(۱) تَرَنِ (مضارع مجزوم واحد مذکر حاضر) نون سے پہلے ی (لام کلمہ) محذوف ہے، ن وقایہ کا ی ضمیر متکلم مفعول اول محذوف ہے اور نون کا کسرہ اس کی علامت ہے رَاى يَرىٰ رُؤْيَةً: دیکھنا، آنکھ سے یا دل سے۔ اَنَا دو مفعولوں کے درمیان ضمیر فصل ہے اَقَلَّ مفعول ثانی ہے اور مَالًا وَوَلَدًا تمیز ہیں اور فَعَسٰى جزاء ہے (۲) يُؤْتِيَنِ کے آخر میں بھی نون وقایہ ہے اور ی ضمیر متکلم محذوف ہے، فعل مضارع منصوب واحد مذکر غائب ہے آتى يؤتى ايتاءً: دینا (۳) حُسْبَان کے دو معنی ہیں (۱) بھبوکا یعنی لو کا بگولہ، گرم ہوا کا جھکڑ (۲) عذاب، آفت — لفظ کے اصل معنی ہیں حساب کے مطابق سزا۔ اور یہ لفظ باب نصر کا مصدر ہے جس کے معنی ہیں شمار کرنا (۴) تُصْبِحُ فعل ناقص ہے ضمیر هِيَ مستتر اس کا اسم اور صَعِيْدًا زَلَقًا (مرکب توصیفی) خبر (۵) الزَّلَقُ: پھسلن کی جگہ، چکنی سپاٹ زمین جس میں کچھ نہ ہو، پٹپڑا یعنی ایسی صاف زمین جس پر پیر پھسلنے لگیں۔ زَلِقَ (س، ن) زَلَقًا: پھسلنا (۶) غَارَ غَوْرًا: پانی کا زمین کے اندر اتر جانا کسی بھی چیز کا اندر کی طرف چلا جانا جیسے غَارَتْ عَيْنُهٗ: اس کی آنکھ اندر کو دھنس گئی (۷) اَصْبَحَ کا يُقَلِّبُ کے ساتھ ملا کر ترجمہ کیا گیا ہے "لگا" اسی کا ترجمہ ہے (۸) عَلٰى مَا اِلخ يُقَلِّبُ سے متعلق ہے (۹) خَاوِيَةٌ (اسم فاعل) افتادہ، گری ہوئی، خَوٰى خَوَاءً البيتُ: گرنا، خالی ہونا۔

فِئَةٌ	کوئی جماعت	مُنْتَصِرًا	بدلہ لینے والا	هُوَ	وہ
يَّنْصُرُوْنَهٗ (۱)	(جو) مدد کرتی اس کی	هُنَالِكَ (۲)	اس وقت	خَيْرٌ	بہتر ہیں
مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ	اللہ تعالیٰ کے سوا	الْوَلَايَةُ	کارسازی	ثَوَابًا	بدلہ کے اعتبار سے
وَمَا	اور نہیں	لِلّٰهِ	اللہ کے لئے (ہے)	وَّخَيْرٌ	اور بہتر ہیں
كَانَ	تھا وہ	الْحَقِّ	جو برحق ہیں	عُقْبًا (۳)	اچھے انجام کے اعتبار سے

مکہ مکرمہ کے متکبر سردار غریب مسلمانوں کے ساتھ بیٹھنے کے لئے تیار نہیں تھے۔ان کا مطالبہ تھا کہ ان پھٹے حالوں کو ہٹا دیا جائے تو ہم آ کر سنیں،ان میں یہ غرور و پندار کیوں تھا؟ دنیا کی چند کوڑیوں کی وجہ سے۔اللہ تعالیٰ نے ان کو دنیا میں خوشحال بنایا تھا اس لئے وہ آپے سے باہر ہو گئے تھے اور اپنے ہی بھائیوں کو کوڑی کے آدمی سمجھنے لگے تھے۔اب ان فریب خوردہ سرداروں کو ایک مثال سنائی جاتی ہے۔یہ مثال ایک کافر مالدار اور ایک غریب ایماندار کی ہے۔اس واقعہ سے دنیا کی بے ثباتی اور آخرت کی پائیداری،کفر و غرور کی بدانجامی اور ایمان و تقوی کی نیک فرجامی ظاہر ہوگی۔یہ بڑی عبرت انگیز داستان ہے۔ارشاد ہے —— اور آپ لوگوں کے (فائدے کے) لئے دو شخصوں کی مثال بیان کیجئے —— ان میں سے ایک ملحد مالدار شیخی بگھارنے والا تھا اور دوسرا موحّد،دیندار غریب آدمی تھا —— ان میں سے ایک کو ہم نے انگور کے دو باغ دیئے تھے اور اُن کے گرد ہم نے کھجور کے درختوں کی باڑ لگائی تھی اور اُن دونوں کے درمیان ہم نے کاشت کی زمین رکھی تھی —— انگور کا باغ بجائے خود قیمتی ہوتا ہے پھر ایک چھوڑ دو باغ اللہ تعالیٰ نے اس کو دیئے تھے پھر ان کے گرداگرد خرموں کی باڑ لگی ہوئی تھی۔اس پر مستزاد یہ کے باغوں کے درمیان کی جگہ بھی بے کار نہیں تھی بلکہ سرسبز و شاداب کھیتی سے لہلہا رہی تھی اور وہ کافر آسودگی اور مالداری کا کامل نمونہ بنا ہوا تھا —— دونوں ہی باغ خوب پھلے،اور بار آور ہونے میں انھوں نے ذرا کمی نہ کی —— یعنی ایسا نہیں ہوا کہ ایک باغ پھلا ہو اور دوسرا نہ پھلا ہو یا ایک درخت زیادہ آیا ہو اور دوسرا کم،بلکہ دونوں ہی باغ خوب آئے کسی میں کوئی نقصان اور کمی نہیں تھی —— اور اُن باغوں کے درمیان ہم نے نہر جاری کی تھی —— جس سے منظر بڑا فرحت بخش بنا ہوا تھا اور

(۱) جملہ يَنْصُرُوْنَهٗ پہلی صفت ہے فِئَةٌ کی اور مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ: كَائِنَةً سے متعلق ہو کر دوسری صفت ہے (۲) هُنَالِكَ خبر اول مقدم، اَلْوِلَايَةُ مبتدا مؤخر۔لِلّٰهِ خبر ثانی،اَلْحَقُّ اللہ کی صفت۔اَلْوِلَايَةُ (مصدر) وَلِيَ يَلِي وِلَايَةً وَوَلَايَةً الشئَ وَعَلَى الشَّئِ: والی ہونا،متصرف ہونا،کارساز ہونا (۳) عُقْبًا تمیز ہے،عُقْبٌ: بدلہ،جزا،ثواب؛ امام راغب نے لکھا ہے کہ عقب اور عُقْبیٰ دونوں کا استعمال ثواب کے ساتھ مخصوص ہے ۱۲

باغ بھی سرسبز وشاداب رہتا تھا ـــــ اور اس شخص کے پاس اور بھی دولت تھی ـــــ یعنی باغوں کی شادابی اور کھیتی کی سرسبزی کے علاوہ اور بھی بے حساب دولت اس کے پاس جمع تھی۔ثمر کے معنی پھل کے علاوہ دولت کے بھی آتے ہیں اور وہی یہاں مراد ہیں۔غرض اس شخص کو ہر طرح کی خوشحالی اور دولت وثروت حاصل تھی، کمی کسی چیز کی نہیں تھی ـــــ پس وہ اپنے ساتھی سے باتیں کرتے ہوئے کہنے لگا:''میں تجھ سے بڑا مالدار ہوں اور تجھ سے زیادہ گرامی قدر جماعت والا ہوں ـــــ یہ بات محض شیخی بھی ہوسکتی ہے اور حقیقی بھی ہوسکتی ہے یعنی دیکھ مال ودولت اور جتھا میرے پاس تجھ سے کہیں زیادہ ہے۔اب بتا اگر میرا طریقہ خلاف حق ہوتا اور میں اللہ تعالیٰ کے نزدیک ناپسندیدہ ہوتا تو اس مرفہ حالی میں کیوں ہوتا؟ ـــــ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اس کا غریب ساتھی، جو پکا موحد اور دیندار تھا، اس کو نصیحت کیا کرتا ہوگا، وہ اس کو کفر وشرک کی برائی سمجھاتا ہوگا اور توبہ وانابت کی تلقین کرتا ہوگا اس کے جواب میں وہ کافر کہہ رہا ہے کہ میں مال میں جتھے میں بلکہ ہر چیز میں تجھ سے بڑھا ہوا ہوں پھر کس طرح یقین کروں کہ میں باطل پر ہوں اور تجھ جیسا مفلس حق پر ہے۔میری اور تیری صورت حال سے تو یہی ظاہر ہوتا ہے کہ میرا مسلک صحیح اور تیرا مذہب غلط ہے ـــــ اور وہ اپنے باغ میں داخل ہوا ـــــ مع اپنے اُس مسلمان دیندار ساتھی کے ـــــ اپنی جان پر ظلم کرتا ہوا ـــــ یعنی وہ شرک میں مبتلا تھا۔کبر وغرور کا نشہ دماغ میں بھرا ہوا تھا ـــــ کہنے لگا:''میں نہیں سمجھتا کہ یہ باغ کبھی بھی برباد ہوگا، اور مجھے توقع نہیں کہ قیامت برپا ہوگی اور بخدا! اگر میں اپنے پروردگار کی طرف لوٹایا گیا تو ضرور اس سے بھی زیادہ شاندار جگہ پاؤں گا ـــــ یعنی میری اس جائداد کے اجڑنے اور ویران ہونے کے قطعاً کوئی آثار نہیں، میں سمجھتا ہوں کہ میرا یہ باغ سدا آباد رہے گا۔رہی قیامت کی بات تو اول تو میں اس کا قائل ہی نہیں، یہ سب ڈھکوسلے ہیں۔لیکن اگر تیرے عقیدے کے مطابق حشر ونشر ہوگا تو میں جس طرح عیش وعشرت کی زندگی یہاں بسر کررہا ہوں، وہاں بھی اس سے زیادہ چین وآرام سے رہوں گا۔کیونکہ تیرے قول کے مطابق جنت اللہ کے مقبول بندوں کے لئے ہے اور میری مقبولیت کے آثار تو دیکھ ہی رہا ہے اگر میں اللہ کے نزدیک مقبول نہ ہوتا تو یہ سب اسباب راحت مجھے کیوں ملتے؟ اس لئے تیرے قول کے مطابق بھی مجھے وہاں اچھے اچھے باغات اور اسباب راحت ملیں گے۔

مؤمن بندے کا جواب: مؤمن آدمی نے اس سے چار باتیں کہیں:

پہلی بات: ـــــ اس سے اس کے ساتھی نے باتیں کرتے ہوئے کہا:''کیا تو اُس ذات کا انکار کرتا ہے جس نے تجھے مٹی سے، پھر ایک قطرہ سے پیدا کیا پھر تجھے پورا آدمی بنا دیا؟'' ـــــ یعنی تیری باتوں سے یہ صاف ظاہر ہوتا ہے کہ تو خدا کا اور اس کی قدرت کا منکر ہے مگر تو اس پر غور نہیں کرتا کہ جس ہستی نے تجھ کو مٹی سے، پھر منی کے

قطرے سے پیدا کیا پھر تیرے سب اعضا اور قوی درست کئے اور تجھے توانا تندرست مرد بنا دیا، وہ ہستی مٹی میں رَل مل جانے کے بعد دوبارہ تجھ کو پیدا نہیں کر سکتی؟ کر سکتی ہے اور یہ کام ان کے لئے نہایت آسان ہے۔

ہر انسان مٹی سے پیدا کیا گیا ہے اس طرح کہ مادۂ منویہ خون سے بنتا ہے اور خون غذا سے اور غذا زمین سے پیدا ہوتی ہے۔ غذا میں مٹی کا نچوڑ آجاتا ہے۔ سورۃ المؤمنون آیت ۱۲ میں ہے ﴿وَلَقَدْ خَلَقْنَا الْإِنْسَانَ مِنْ سُلٰلَةٍ مِّنْ طِيْنٍ﴾ اور ہم نے انسان کو مٹی کے خلاصہ سے بنایا۔ چنانچہ آدم اور حوا علیہما السلام جب تک جنت میں رہے ان کی اولاد نہیں ہوئی۔ کیونکہ انسان کی تخلیق مٹی سے مقدر تھی۔ جب دونوں زمین پر اتارے گئے اور انھوں نے زمین سے پیدا ہونے والی غذا کھانی شروع کی تب اس سے خون بن کر مادہ تیار ہوا اور اولاد کا سلسلہ شروع ہوا۔

غرض مٹی ہر انسان کا اولین مادۂ تخلیق ہے اور اس کا آخری مرحلہ نطفہ ہے جو شکم مادر میں پہنچ کر جسم کی تخلیق کا ذریعہ بنتا ہے۔ پھر اس میں روح پھونکی جاتی ہے اور انسان زندہ ہو جاتا ہے پھر پیدا ہونے کے بعد جب اس پر ایک معتد بہ وقت گذر جاتا ہے تو وہ ہٹا کٹا مرد بن جاتا ہے۔ پس انسان اگر اپنی تخلیق اور اس کے مواد اور مراحل پر غور کرے تو اس کا بعث بعد الموت کا استبعاد آسانی سے دور ہو سکتا ہے۔

دوسری بات: ـــــ رہا میں تو میرے پروردگار وہی اللہ تعالیٰ ہیں اور ان کے ساتھ کسی کو بھی شریک نہیں کرتا ـــــ یعنی میرا عقیدہ یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ ہی تنہا میرے پروردگار ہیں، خدائی میں ان کا کوئی حصہ دار نہیں، نہ ان کے حکم و اختیار کے سامنے کوئی دم مار سکتا ہے۔

تیسری بات: ـــــ اور جب تو اپنے باغ میں داخل ہوا تو اس وقت تو نے یہ کیوں نہ کہا کہ: ''جو اللہ کو منظور ہوتا ہے وہی ہوتا ہے بغیر اللہ کی مدد کے کوئی طاقت نہیں'' ـــــ یعنی مال اللہ تعالیٰ کی بڑی نعمت ہے۔ شکر گذاری سے اس کو پائیداری حاصل ہوتی ہے اور اِترانے اور کفر بکنے سے آفت آتی ہے، تجھے چاہئے تھا کہ باغ میں داخل ہوتے وقت کہتا کہ خدا جو چاہے سو عطا کرے، تیرے یا میرے یا کسی کے چاہنے سے کیا ہوتا ہے؟ ہم میں جو کچھ زور وقوت ہے اللہ ہی کی امداد و اعانت سے ہے۔ اللہ تعالیٰ جب تک چاہیں گے تیرا یہ باغ قائم رہے گا اور جب وہ چاہیں گے ویران ہو جائے گا۔

فائدہ: مَاشَآءَ اللّٰه، لَاقُوَّةَ إِلَّا بِاللّٰهِ بڑا بابرکت جملہ ہے۔ حدیث شریف میں ہے کہ جو شخص اپنا کوئی مال دیکھے اور وہ اس کو پسند آئے اور وہ مَاشَآءَ اللّٰهُ لَاقُوَّةَ إِلَّا بِاللّٰهِ کہے تو اس مال کو کبھی کوئی آفت نہ پہنچے گی۔ دوسری روایت میں ہے کہ جب بھی اللہ تعالیٰ کسی کو مال وعیال میں کوئی نعمت عطا فرمائیں اور وہ مَاشَآءَ اللّٰهُ لَاقُوَّةَ إِلَّا بِاللّٰهِ

کہے تو تاحیات اللہ تعالیٰ اس نعمت سے ہر آفت دور فرما دیتے ہیں (یہ دونوں روایتیں امام بیہقی رحمہ اللہ کی شعب الایمان میں حضرت انس رضی اللہ عنہ سے مروی ہیں)

اور امام مالک رحمہ اللہ تو جب بھی اپنے مکان میں داخل ہوتے مَاشَآءَ اللّٰهُ کہہ کر داخل ہوتے، کسی نے وجہ دریافت کی تو آپ نے یہ آیت کریمہ پڑھی یعنی امام مالک رحمہ اللہ کے نزدیک گھر میں داخل ہونے والے کو بھی یہ ذکر کرنا چاہئے۔

روایات میں آیا ہے کہ اگر کوئی شخص پسندیدہ چیز کو دیکھ کر مَاشَآءَ اللّٰهُ کہہ لے تو اس کو نظر نہیں لگتی

چوتھی بات: —— اگر تو مجھے مال اور اولاد میں اپنے سے کم پاتا ہے تو کچھ بعید نہیں میرا پروردگار مجھے تیرے باغ سے بہتر (کوئی نعمت) عطا فرما دیں اور تیرے باغ پر آسمان سے کوئی آفت بھیج دیں جس سے وہ صاف میدان بن کر رہ جائے —— یعنی کوئی گرم بگولہ اٹھے یا کوئی آسمانی آفت آئے جو باغ کو تہس نہس کر کے چٹیل میدان بنا دے —— یا اس کا پانی زمین میں اتر جائے پھر تو اسے کسی طرح بھی نہ نکال سکے —— یعنی نہر کا پانی خشک ہوئے پھر باوجود کوشش کے جاری نہ ہو سکے اور باغ و کاشت کا ستیاناس ہو جائے۔

انجام: اس مؤمن بندے کی فہمائش کا کوئی اثر اس مغرور کافر نے قبول نہ کیا۔ وہ برابر اپنی روش پر قائم رہا اور خدا بیزاری اس کا شیوہ بنا رہا تو اس کے باغ کا اور دوسری دولتوں کا انجام کیا ہوا: —— اور اس کا سارا پھل مارا گیا —— سب سامان عیش تباہ ہو گیا —— پھر وہ باغ میں اپنی لگائی ہوئی لاگت پر کف افسوس ملتا رہ گیا اور باغ اپنی ٹٹیوں پر گرا پڑا تھا —— یعنی اس کے باغ کا آخری انجام وہی ہوا جو اس مرد مؤمن کی زبان سے نکلا تھا۔ رات کو آگ کا بھبوکا آیا اور سب باغ جل کر خاکستر ہو گیا اور وہ اپنی اصل پونجی بھی کھو بیٹھا —— اور وہ کہہ رہا ہے: ''کیا خوب ہوتا کہ میں اپنے پروردگار کے ساتھ کسی کو شریک نہ ٹھہراتا'' —— مگر اب پچھتائے کیا ہوت ہے جب چڑیاں چگ گئیں کھیت! —— اور اس کے لئے خدا کے سوا کوئی ایسا جتھا نہ تھا جو اس کی مدد کرتا اور نہ وہ خود بدلہ لے سکا —— یعنی جب آفت نازل ہوئی تو نہ جتھا کام آیا نہ اولاد۔ نہ فرضی معبودوں نے کوئی تعاون کیا جن کو خدائی میں شریک ٹھہرا رکھا تھا۔ اور نہ خود اس کی ذات میں اتنی طاقت تھی کہ خدائی آفت کا مقابلہ کرتا —— ایسے مواقع پر مدد کرنا بس اللہ کا برحق کا کام ہے —— اللہ تعالیٰ کے سوا کوئی بھی نصرت پر قادر نہیں، ایسی خطرناک گھڑیوں میں صرف اللہ ہی کی مدد کشتی بھنور سے نکال سکتی ہے اور وہی نقصان کا نعم البدل عطا فرماتے ہیں —— انہی کا انعام بہتر ہے اور انہی کا ظاہر کیا ہوا انجام بخیر ہے —— یعنی وہ جو بدلہ اور انعام دیں، دنیا و آخرت میں وہی بہتر صلہ ہے اور جو مآل کار

ظاہر فرمائیں وہی بندے کے حق میں بہتر ہے۔ انہی کا عطا کیا ہوا ثواب دنیا وعقبیٰ میں کام آتا ہے اور وہی انسان کا انجام بخیر کرنے والے ہیں۔

وَاضۡرِبۡ لَهُمۡ مَّثَلَ الۡحَيٰوةِ الدُّنۡيَا كَمَآءٍ اَنۡزَلۡنٰهُ مِنَ السَّمَآءِ فَاخۡتَلَطَ بِهٖ نَبَاتُ الۡاَرۡضِ فَاَصۡبَحَ هَشِيۡمًا تَذۡرُوۡهُ الرِّيٰحُ‌ ؕ وَكَانَ اللّٰهُ عَلٰى كُلِّ شَىۡءٍ مُّقۡتَدِرًا ۝۴۵ اَلۡمَالُ وَالۡبَنُوۡنَ زِيۡنَةُ الۡحَيٰوةِ الدُّنۡيَا‌ ۚ وَالۡبٰقِيٰتُ الصّٰلِحٰتُ خَيۡرٌ عِنۡدَ رَبِّكَ ثَوَابًا وَّخَيۡرٌ اَمَلًا ۝۴۶

وَاضۡرِبۡ	اور بیان کیجئے	الۡاَرۡضِ	زمین (کا)	وَالۡبَنُوۡنَ	اور بیٹے
لَهُمۡ	ان کے لئے	فَاَصۡبَحَ	پھر ہوگیا وہ سبزہ	زِيۡنَةُ(۴)	رونق (ہیں)
مَّثَلَ	مثال	هَشِيۡمًا(۲)	چورا	الۡحَيٰوةِ الدُّنۡيَا	دنیوی زندگی (کی)
الۡحَيٰوةِ الدُّنۡيَا	دنیوی زندگی (کی)	تَذۡرُوۡهُ	جسکو اڑائے پھرتی ہیں	وَالۡبٰقِيٰتُ(۵)	اور باقی رہنے والے
كَمَآءٍ(۱)	جیسے پانی	الرِّيٰحُ	ہوائیں	الصّٰلِحٰتُ	نیک اعمال
اَنۡزَلۡنٰهُ	برسایا ہم نے اس کو	وَكَانَ	اور ہیں	خَيۡرٌ(۶)	بہتر (ہیں)
مِنَ السَّمَآءِ	آسمان سے	اللّٰهُ	اللہ تعالیٰ	عِنۡدَ رَبِّكَ	آپکے رب کے نزدیک
فَاخۡتَلَطَ	پس رل مل گیا	عَلٰى كُلِّ شَىۡءٍ	ہر چیز پر	ثَوَابًا	ثواب کے اعتبار سے
بِهٖ	پانی کی وجہ سے	مُّقۡتَدِرًا(۳)	پوری قدرت رکھنے والے	وَّخَيۡرٌ	اور بہتر (ہیں)
نَبَاتُ	سبزہ	اَلۡمَالُ	مال	اَمَلًا	امید کے اعتبار سے

دنیا کی ریبائش چندروزہ ہے ایک مثال سے یہ حقیقت سمجھائی جاتی ہے ارشاد ہے: —— اور آپ لوگوں کے

(۱) كَمَاءٍ، اِضْرِبْ کا مفعول ثانی ہے اور هِيَ مقدر کی خبر بھی ہوسکتا ہے اور جملہ أَنْزَلْنَاهُ، مَآءٌ کی صفت ہے (۲) هَشِيْمٌ صفت مشبہ، فعیل بمعنی مفعول، شکستہ، ریزہ ریزہ، بھوسہ۔ هَشَمَ (ض) هَشْمًا: ہر خشک چیز کو ریزہ ریزہ کرنا (۳) مُقْتَدِرٌ (اسم فاعل) پوری قدرت رکھنے والا، قابو یافتہ، مصدر۔ اِقْتِدَارٌ (۴) زِيْنَةٌ مصدر ہے جس میں واحد تثنیہ جمع برابر ہیں اس وجہ سے زِيْنَةٌ مفرد دو چیزوں کی خبر آیا ہے (۵) اَلْبَاقِيَاتُ کا موصوف مقدر ہے أي الكلمات يا الأعمال (۶) خَيْرٌ اسم تفضیل ہے اور تفاضل کفار کے خیال کے اعتبار سے ہے ورنہ حقیقت میں دنیا کی چیزوں میں کوئی خیریت نہیں ۱۲

لئے دنیوی زندگی کی مثال بیان کیجئے ــــــ دنیا کا حال بس ایسا سمجھو ــــــ جیسے ہم نے بادلوں سے پانی برسایا، پس اس کی وجہ سے زمین کا سبزہ رل مل گیا ــــــ یعنی ہر طرح کا سبزہ، اچھا برا، انسانوں کے کام کا اور جانوروں کے کھانے کا ایک ساتھ ایک جگہ اگ آیا، اور ایک دوسرے کے ساتھ مل کر بڑھنے لگا اور سبزہ زار تیار ہو گیا ــــــ پھر وہ ایسا چورا ہو گیا جس کو ہوا اڑائے پھرتی ہے ــــــ یعنی چند ہی روز بعد زمین کی تر و تازگی پر زوال آ گیا۔ اس کی بہار خزاں سے بدل گئی۔ ایک ہوا چلی اور سبزہ پیلا پڑنے لگا، پھر خشک ہو گیا اور ٹوٹ ٹوٹ کر ریزہ ریزہ ہو گیا اور ہوائیں اس کو اِدھر اُدھر اڑانے لگیں۔ یہی انجام دنیا کا ہونے والا ہے۔ آج دنیا آباد ہے اچھے اور برے سبھی لوگ زمین میں رلے ملے زندگی کا سانس لے رہے ہیں مگر کل قیامت کو جب اس دنیا پر زوال آئے گا تو اس کے پہاڑ دُھنی ہوئی روئی کے گالوں کی طرح اڑنے لگیں گے، اور یہ زمین سپاٹ میدان بنا دی جائے گی ــــــ اور اللہ تعالیٰ ہر چیز پر پوری قدرت رکھنے والے ہیں ــــــ بہار بھی انہی کے حکم سے آئی تھی اور اب خزاں بھی انہی کے حکم سے آ گئی۔ انہی کے اشارہ سے زمین آباد ہوئی تھی اب انہی کے حکم سے اجڑ گئی۔ پس خوش حال اس دھوکہ میں نہ رہیں کہ ان کی نعمتیں لازوال ہیں، جس خدا کے حکم سے یہ سب کچھ ملا ہے اسی خدا کے حکم سے یہ سب چھن بھی سکتا ہے۔ دنیا اِترانے کی چیز نہیں اس کی بہار محض عارضی ہے۔ سدا باقی رہنے والی زندگی آخرت کی ہے اس کے لئے جو بھی سامان فراہم کیا جائے، کام آنے والا ہے ــــــ مال اور بیٹے دنیوی زندگانی کی آرائش ہیں ــــــ یعنی یہ چیزیں صرف دنیا کی ساتھی ہیں ان کی وجہ سے جو شان و شوکت اور عزت و ناموری حاصل ہوتی ہے وہ صرف دنیا تک باقی رہتی ہے یہ چیزیں فی نفسہٖ آخرت میں کام آنے والی نہیں۔ آخرت میں کام آنے والی چیزیں اعمال صالحہ ہیں ــــــ اور باقی رہنے والے نیک اعمال آپ کے پروردگار کے پاس ثواب کے اعتبار سے بہتر ہیں اور امید کے اعتبار سے بھی بہتر ہیں ــــــ یعنی آخرت میں اعمال صالحہ سے جو امیدیں وابستہ کی جائیں گی وہی پوری ہونگی، رہا دنیا کا مال و منال اور آل اولاد تو ان سے کبھی دنیا کی امیدیں بھی پوری نہیں ہوتیں، آخرت میں ان سے نفع کی کیا توقع کی جا سکتی ہے۔

باقیات صالحات سے مراد تمام اعمال صالحہ ہیں۔ پانچوں نمازیں، تمام اذکار، سب مالی عبادتیں اور دوسرے نیک اعمال اس لفظ کا مصداق ہیں مگر احادیث میں ایک خاص ذکر کو باقیات صالحات کا مصداق بتایا گیا ہے تاکہ انسان ہر حال میں، چلتے پھرتے، اٹھتے بیٹھتے ان کا ورد کرے۔ اور آخرت کے لئے ان کا ذخیرہ کرے۔

حدیث ــــــ مسند احمد وغیرہ میں حضرت ابو سعید خدری رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: باقیات صالحات کو زیادہ سے زیادہ جمع کرو، عرض کیا گیا: وہ کیا ہیں؟ آپ نے فرمایا سُبْحَانَ اللّٰہِ، وَالْحَمْدُ لِلّٰہِ،

وَلَآاِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ، وَاللّٰهُ اَكْبَرَ، وَلَاقَوْلَ وَلَاقُوَّةَ اِلَّا بِاللّٰهِ.

حدیث ــــ عقیلی نے حضرت نعمان بن بشیر رضی اللہ عنہ سے نقل کیا ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: سُبْحَانَ اللّٰهِ، وَالْحَمْدُ لِلّٰهِ، وَلَآاِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ، وَاللّٰهُ اَكْبَرُ یہی باقیات صالحات ہیں۔ یہی بات طبرانی نے بروایت حضرت سعد بن عبادۃ رضی اللہ عنہ بھی بیان کی ہے

حدیث ــــ مسلم اور ترمذی میں حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: سُبْحَانَ اللّٰهِ وَالْحَمْدُ لِلّٰهِ، وَلَآاِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ، وَاللّٰهُ اَكْبَرُ میرے نزدیک ان تمام چیزوں سے محبوب ہیں جن پر سورج کی روشنی پڑتی ہے یعنی سارے جہاں سے بہتر ہیں۔

حدیث ــــ طبرانی نے حضرت ابو الدرداء رضی اللہ عنہ سے روایت کی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ''سُبْحَانَ اللّٰهِ، وَالْحَمْدُ لِلّٰهِ، وَلَآاِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ، وَاللّٰهُ اَكْبَرُ، وَلَاقَوْلَ وَلَاقُوَّةَ اِلَّا بِاللّٰهِ باقیات صالحات ہیں اور یہ کلمات گناہوں کو اس طرح جھاڑ دیتے ہیں جس طرح (پت جھڑ کے موسم میں) درخت پتوں کو جھاڑتا ہے اور یہ کلمات جنت کے خزانوں میں سے ہیں۔

فائدہ: اس آیت میں مال اور اولاد کو حیات دنیا کی زینت کہا گیا ہے۔ یہ حکم فی نفسہ ہے۔ لیکن اگر انہی کو خدا پرستی اور دین طلبی کا ذریعہ بنالیا جائے اور ان سے طاعت الٰہی اور خدمت دین کا کام لیا جائے تو یہی مال واولاد مقصود ومطلوب بن جاتے ہیں اور ان کا شمار باقیات صالحات میں ہونے لگتا ہے۔ حدیث شریف میں ہے: جب انسان وفات پاجاتا ہے تو اس کے اعمال موقوف ہوجاتے ہیں مگر تین عمل جاری رہتے ہیں (۱) صدقۂ جاریہ (۲) وہ علم جس سے فائدہ اٹھایا جارہا ہو (۳) نیک اولاد، جو مرنے والے کے لئے دعا کرے (رواہ مسلم) اور تفسیر قرطبی میں عبید بن عُمیر کا قول نقل کیا گیا ہے کہ باقیات صالحات نیک لڑکیاں ہیں، وہ اپنے والدین کے لئے سب سے بڑا ذخیرہ ہیں اور دلیل میں حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کی یہ روایت پیش کی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: میں نے اپنی امت کے ایک آدمی کو دیکھا جس کو جہنم میں لے جانے کا حکم دیا گیا۔ اس کی نیک لڑکیاں اس کو چمٹ گئیں اور رونے لگیں اور اللہ تعالیٰ سے فریاد کرنے لگیں: یا اللہ! انھوں نے دنیا میں ہم پر بڑا احسان کیا ہے اور ہماری پرورش میں بڑی محنت اٹھائی ہے! اللہ تعالیٰ نے اس پر رحم فرما کر بخش دیا۔

وَيَوْمَ نُسَيِّرُ الْجِبَالَ وَتَرَى الْاَرْضَ بَارِزَةً ۙ وَّحَشَرْنٰهُمْ فَلَمْ نُغَادِرْ مِنْهُمْ اَحَدًا ۟

وَعُرِضُوْا عَلٰى رَبِّكَ صَفًّا ؕ لَقَدْ جِئْتُمُوْنَا كَمَا خَلَقْنٰكُمْ اَوَّلَ مَرَّةٍ ۢ بَلْ زَعَمْتُمْ اَلَّنْ نَّجْعَلَ لَكُمْ مَّوْعِدًا ﴿۴۸﴾ وَوُضِعَ الْكِتٰبُ فَتَرَى الْمُجْرِمِيْنَ مُشْفِقِيْنَ مِمَّا فِيْهِ وَيَقُوْلُوْنَ يٰوَيْلَتَنَا مَالِ هٰذَا الْكِتٰبِ لَا يُغَادِرُ صَغِيْرَةً وَّلَا كَبِيْرَةً اِلَّآ اَحْصٰىهَا ۚ وَوَجَدُوْا مَا عَمِلُوْا حَاضِرًا ؕ وَلَا يَظْلِمُ رَبُّكَ اَحَدًا ﴿۴۹﴾ ع ۵ ۱۸

وَيَوْمَ	اور جس دن	صَفًّا	قطار میں	وَوُضِعَ	اور رکھ دی جائے گی
نُسَيِّرُ	ہم چلائیں گے	لَقَدْ	البتہ تحقیق	الْكِتٰبُ	کتاب (نامۂ اعمال)
الْجِبَالَ	پہاڑوں کو	جِئْتُمُوْنَا	آ پہنچے تم ہمارے پاس	فَتَرَى	پس دیکھیں گے آپ
وَتَرَى	اور دیکھیں گے آپ	كَمَا[3]	جیسا	الْمُجْرِمِيْنَ	مجرموں کو
الْاَرْضَ	زمین کو	خَلَقْنٰكُمْ	پیدا کیا ہم نے تم کو	مُشْفِقِيْنَ	ڈرنے والا
بَارِزَةً	کھلی	اَوَّلَ مَرَّةٍ	پہلی بار	مِمَّا	اس سے جو
وَّحَشَرْنٰهُمْ[1]	اور جمع کریں گے ہم ان کو	بَلْ	بلکہ	فِيْهِ	اس میں ہے
فَلَمْ نُغَادِرْ[2]	پس نہ چھوڑیں گے ہم	زَعَمْتُمْ	سمجھتے تھے تم	وَيَقُوْلُوْنَ	اور وہ کہیں گے
مِنْهُمْ	ان میں سے	اَلَّنْ[4]	کہ ہرگز نہیں	يٰوَيْلَتَنَا	ہائے ہماری کم بختی!
اَحَدًا	کسی کو	نَّجْعَلَ	مقرر کریں گے ہم	مَا[5]	کیا (ہوا)
وَعُرِضُوْا	اور پیش کئے گئے وہ	لَكُمْ	تمہارے لئے	لِ هٰذَا	اس نامۂ اعمال کو
عَلٰى رَبِّكَ	آپ کے رب کے روبرو	مَّوْعِدًا	کوئی معیاد	الْكِتٰبِ	

(۱) حَشَرْنَاهُمْ، عُرِضُوْا اور وُضِعَ تینوں فعل ماضی بمعنی مستقبل ہیں، تَحَقُّقِ وقوع کی طرف اشارہ کرنے کے لئے ماضی لائے گئے ہیں (۲) لَمْ نُغَادِرْ کا عطف حَشَرْنَاهُمْ پر ہے کیونکہ نُغَادِرُ (مضارع) بھی لَمْ کی وجہ سے ماضی منفی ہوگیا ہے (۳) كَمَا إلخ یا تو مفعول مطلق ہے یا ضمیر مرفوع سے حال ہے پہلی صورت میں كَمَا إلخ مصدر محذوف کی صفت ہے أي مَجِيْئًا كَائِنًا كَمَا إلخ (۴) أَلَّنْ دو لفظ ہیں أَنْ مُخَفَّفه من الْمُثَقَّلَه، اور اس کا اسم ضمیر شان محذوف ہے أي أَنَّهٗ اور جملہ لَنْ نَجْعَلَ خبر ہے دوسرا کلمہ لَنْ (حرف نصب) ہے پھر نون کا لام میں ادغام کیا گیا ہے اور قرآنی رسم الخط میں ن کو رسماً حذف کیا ہے ــــ اور لَكُمْ مفعول ثانی ہے نَجْعَلُ کا اور مَوْعِدًا مفعول اول ہے۔ (۵) مَا استفہامیہ مبتدا ہے اور استفہام تعجب کے لئے ہے۔ لام جارہ ہے هٰذَا الْكِتَاب اسم اشارہ اور مشار الیہ مل کر مجرور، جار مجرور محذوف سے متعلق ہو کر خبر اور جملہ لَا يُغَادِرُ یا تو حالیہ ہے یا مستانفہ، تقدیر عبارت ←

لَا يُغَادِرُ	نہیں چھوڑی اس نے	اَحْصٰىهَا	احاطہ کرلیا اس نے اسکا	حَاضِرًا	موجود
صَغِيْرَةً (۱)	کوئی چھوٹی بات	وَوَجَدُوْا	اور پایا انھوں نے	وَلَا يَظْلِمُ	اور نہیں ظلم کرتے
وَّلَا كَبِيْرَةً	اور نہ کوئی بڑی بات	مَا	جو کچھ	رَبُّكَ	آپ کے رب
اِلَّآ	مگر	عَمِلُوْا	کیا تھا انھوں نے	اَحَدًا	کسی پر

یہ باغ و بہار زندگی اور سرسبز وشاداب زمیں کس طرح اُجڑ جائے گی اور آخرت کس طرح قائم ہوگی اور آخرت کی گھڑی کفار کے لئے کس قدر حسرت بھری ہوگی۔ سنئے: ـــــ اور (یاد کرو) جس دن ہم پہاڑوں کو چلائیں گے ـــــ اور وہ بادلوں کی طرح چل پڑیں گے، سورۃ النباء آیت ۲۰ میں ہے: پہاڑ ریت کی طرح ہوجائیں گے، اور سورۃ الواقعہ میں ہے: پہاڑ بالکل ریزہ ریزہ ہوجائیں گے پھر وہ پراگندہ غبار ہوجائیں گے ـــــ اور آپ زمین کو کھلا میدان دیکھیں گے ـــــ اس دن پہاڑ، دریا، ٹیلے، عمارتیں، درخت سب ناپید ہوچکے ہوں گے اور زمین کے سب ابھار مٹ چکے ہونگے۔ سورۂ طٰہ میں ہے: لوگ آپ سے پہاڑوں کی نسبت پوچھتے ہیں؟ آپ بتایئے کہ میرا پروردگار ان کو بالکل اڑادے گا پھر زمین کو ایک ہموار میدان بنادے گا جس میں آپ نہ تو ناہمواری دیکھیں گے اور نہ کوئی بلندی (آیات ۱۰۵-۱۰۷) ـــ اور حدیث میں ہے کہ قیامت کے دن تمام لوگوں کو سفید بھوری زمین پر جمع کیا جائے گا جو میدے کی روٹی کی طرح ہوگی اس میں کسی بھی انسان کی کوئی علامت باقی نہ رہے گی (مشکوٰۃ حدیث ۵۵۳۳)

اور ہم انسانوں کو جمع کریں گے اور ان میں سے کسی کو بھی نہیں چھوڑیں گے ـــــ یعنی اُس روز ایک شخص بھی خدائی عدالت سے غیر حاضر نہ رہ سکے گا۔ آدم علیہ السلام سے قیامت تک جو بھی انسان پیدا ہوچکا ہے، دوبارہ پیدا کردیا جائے گا اور سب کو ایک ہی وقت میں ایک ہی جگہ میں جمع کردیا جائے گا ـــــ اور وہ آپ کے پروردگار کے روبرو صف بستہ پیش کئے جائیں گے ـــــ تاکہ کوئی کسی کی آڑ میں چھپ نہ سکے، اس صورت میں تمام اہل محشر ایک صف میں کھڑے کئے جائیں گے اور صَفًّا کے معنی ''کھڑے ہونے کی حالت میں'' بھی ہوسکتے ہیں یعنی بارگاہ خداوندی میں سب کی حاضری حالت قیام میں ہوگی وہاں سب کو کھڑا رہنا ہوگا۔ کوئی بیٹھ نہ سکے گا۔ اور صَفًّا کے معنی صُفُوْفًا یعنی قطار در قطار کے بھی ہوسکتے ہیں۔ حدیث میں ہے: اہل جنت کی کل ایک سو بیس صفیں ہوں گی، جن میں →

ہے أَيُّ شَيْءٍ ثَبَتَ لِهٰذَا الْكِتَابِ حَالَ كَوْنه لَايُغَادِرُ إلخ ـــ یہ لام جارہ قرآنی رسم الخط میں ھذا سے علیحدہ لکھا جاتا ہے اور یہ امر توقیفی ہے اس کی کوئی خاص وجہ معلوم نہیں۔

(۱) صَغِيْرَةً اور كَبِيْرَةً کا موصوف هَنَةٌ (چیز) محذوف ہے هَنَةٌ مؤنث ہے هَنٌ کا یا فِعْلَةٌ (کام) مقدر مانا جائے ۱۲

سے اسّی صفیں اس امت محمدیہ کی ہوں گی۔ یعنی اس امت کی تعداد سب امتوں سے زیادہ ہوگی ــــــ اور جولوگ قیامت کا انکار کرتے ہیں ان سے کہا جائے گا: ــــــ آگئے تم ہمارے پاس جس طرح ہم نے تم کو پہلی بار پیدا کیا تھا ــــــ یعنی جاہ ومال، آل واولاد اور اپنی ہر اس چیز سے خالی ہاتھ، جس پر تم دنیا میں ناز کیا کرتے تھے، ننگ دھڑ نگ ہماری بارگاہ میں آپہنچے؟ سورۃ الانعام آیت ۹۴ میں ہے: ''تم ہمارے پاس تنہا آگئے جس طرح ہم نے تم کو پہلی مرتبہ پیدا کیا تھا اور جو کچھ ہم نے تم کو دیا تھا اس کو اپنے پیچھے چھوڑ آئے'' اور سورۂ مریم آیت ۸۰ میں ہے: ''اس کی بیان کی ہوئی چیزوں کے یعنی مال واولاد کے ہم مالک رہ جائیں گے اور وہ ہمارے پاس (مال واولاد سے) تنہا ہوکر آوے گا''

اور بخاری ومسلم کی حدیث میں ہے: رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ''اے لوگو! تم قیامت کے دن اپنے رب کے روبرو ننگے پاؤں، ننگے بدن اور غیر مختون ہونے کی حالت میں جمع کئے جاؤ گے'' پھر آنحضرت ﷺ نے سورۃ الانبیاء کی آیت ۱۰۴ پڑھی: ''جس طرح ہم نے پہلی مرتبہ پیدا کرتے وقت ہر چیز کی ابتدا کی تھی اسی طرح اس کو دوبارہ پیدا کردیں گے۔ یہ ہمارے ذمہ وعدہ ہے اور ہم ضرور اس کو پورا کریں گے'' اور قیامت کے دن سب سے پہلے جس کو لباس پہنایا جائے گا وہ ابراہیم علیہ السلام ہوں گے'' (مشکوٰۃ حدیث ۵۵۳۵) ــــــ ایک دوسری روایت میں ہے کہ مذکورہ بالا ارشاد سن کر حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا نے سوال کیا: یارسول اللہ! کیا یہ سب مرد وزن ننگے ہوں گے اور ایک دوسرے کو دیکھتے ہوں گے؟ آپؐ نے فرمایا: اُس دن معاملہ اس سے زیادہ سنگین ہوگا کہ کوئی کسی کو دیکھے (مشکوٰۃ حدیث ۵۵۳۶) یعنی اس روز ہر ایک کو ایسی فکر دامن گیر ہوگی کہ کسی کو کسی کی طرف دیکھنے کا ہوش نہیں ہوگا۔ سب کی نظریں اوپر کو اٹھی ہوئی ہونگی ــــــ اور ترمذی شریف کی روایت میں ہے کہ قیامت کے دن لوگ تین طرح سے میدان میں اکٹھا کئے جائیں گے کوئی پیدل ہوگا، کوئی سوار ہوگا اور کوئی چہروں کے بل چل رہا ہوگا (مشکوٰۃ حدیث ۲۶۴۶)

منکرین قیامت سے یہ بھی کہا جائے گا ــــــ بلکہ تم نے یہ سمجھ رکھا تھا کہ ہم نے تمہارے لئے کوئی وعدے کا وقت مقرر نہیں کیا ــــــ یعنی تمہیں انبیائے کرام نے بتایا تھا کہ جس طرح اللہ تعالیٰ نے تم کو پہلی بار پیدا کیا ہے، اسی طرح دوبارہ پیدا کئے جاؤ گے، مگر تم اسے ماننے کے لئے تیار نہیں تھے۔ بتاؤ، اب تم دوبارہ پیدا ہوگئے یا نہیں؟ اور انبیاء کی بات سچی ثابت ہوئی یا نہیں؟ ــــــ اور نامۂ اعمال (ہاتھوں میں) رکھ دیا جائے گا ــــــ کسی کے دائیں ہاتھ میں اور کسی کے بائیں ہاتھ میں ــــــ پھر آپ دیکھیں گے: مجرم اس کے مندرجات سے ڈر رہے ہوں گے ــــــ وہ اپنے گناہوں کی فہرست پڑھ کر خوف کھا رہے ہوں گے ــــــ اور کہہ رہے ہوں گے ہائے ہماری کم بختی! یہ کیسی کتاب ہے! اس نے ہماری کوئی چھوٹی بات چھوڑی نہ بڑی بات، مگر اس نے سب کا احاطہ کرلیا! ــــــ یعنی اس

دن مجرم اپنی قسمت کو کوسیں گے، اپنے نصیب کو روئیں گے اور حسرت ویاس سے کہیں گے: یہ عجیب ریکارڈ ہے اس نے تو ہمارے کرتوتوں میں سے ایک ذرہ بھی نہیں چھوڑا! وہ وقت منکروں کے لئے حسرت ناک ہوگا! —— اور جو کچھ انھوں نے کیا تھا سب موجود پائیں گے اور آپ کا پروردگار کسی پر ظلم نہیں کرے گا!

اس آیت سے معلوم ہوا کہ گناہ کبیرہ بھی ہوتے ہیں اور صغیرہ بھی۔ علمائے کرام نے صغیرہ اور کبیرہ کی مختلف تعریفیں کی ہیں۔ امام رازی رحمہ اللہ نے اس سلسلہ میں ایک ضابطہ لکھا ہے کہ طاعات کی دو قسمیں ہیں: ایک امر الٰہی کی تعظیم کرنا۔ دوسرے خلق خدا پر شفقت کرنا۔ پس جو بات اللہ تعالیٰ کے معاملہ میں جتنی زیادہ جہالت پر مبنی ہوگی اسی قدر وہ بڑا گناہ ہوگی اس طرح جو کام دوسروں کو جتنا زیادہ ضرر پہنچانے والا ہوگا وہ اسی قدر بڑا گناہ ہوگا۔

وَإِذْ قُلْنَا لِلْمَلٰٓئِكَةِ اسْجُدُوْا لِاٰدَمَ فَسَجَدُوْٓا إِلَّآ إِبْلِيْسَ ۭ كَانَ مِنَ الْجِنِّ فَفَسَقَ عَنْ أَمْرِ رَبِّهٖ ۭ أَفَتَتَّخِذُوْنَهٗ وَذُرِّيَّتَهٗٓ أَوْلِيَآءَ مِنْ دُوْنِيْ وَهُمْ لَكُمْ عَدُوٌّ ۭ بِئْسَ لِلظّٰلِمِيْنَ بَدَلًا ۝ مَآ أَشْهَدْتُّهُمْ خَلْقَ السَّمٰوٰتِ وَالْأَرْضِ وَلَا خَلْقَ أَنْفُسِهِمْ ۠ وَمَا كُنْتُ مُتَّخِذَ الْمُضِلِّيْنَ عَضُدًا ۝ وَيَوْمَ يَقُوْلُ نَادُوْا شُرَكَآءِيَ الَّذِيْنَ زَعَمْتُمْ فَدَعَوْهُمْ فَلَمْ يَسْتَجِيْبُوْا لَهُمْ وَجَعَلْنَا بَيْنَهُمْ مَّوْبِقًا ۝ وَرَاَ الْمُجْرِمُوْنَ النَّارَ فَظَنُّوْٓا أَنَّهُمْ مُّوَاقِعُوْهَا وَلَمْ يَجِدُوْا عَنْهَا مَصْرِفًا ۝

ع ۱۹

وَإِذْ قُلْنَا	اور (یاد کرو) جب ہم نے کہا	لِاٰدَمَ	آدم کو	مِنَ الْجِنِّ	جنات میں سے
لِلْمَلٰٓئِكَةِ	فرشتوں سے	فَسَجَدُوْٓا	پس سجدہ کیا انھوں نے	فَفَسَقَ (۲)	پس نکل گیا
اسْجُدُوْا	سجدہ کرو	إِلَّآ إِبْلِيْسَ	مگر ابلیس نے	عَنْ أَمْرِ رَبِّهٖ	اپنے رب کے حکم سے
		كَانَ (۱)	تھا وہ	أَفَتَتَّخِذُوْنَهٗ (۳)	پس کیا بناتے ہو تم اس کو

(۱) كَانَ إلخ جملہ مستانفہ ہے (۲) فَسَقَ (ن،ض،ک) فِسْقًا وَفُسُوْقًا: حق وصلاح کے راستہ سے ہٹ جانا، بدکار رہونا، لفظ کے اصلی معنی ہیں کسی چیز سے باہر نکلنا، کہا جاتا ہے فَسَقَتِ الرُّطْبَةُ عَنْ قِشْرِهَا: کھجور اس کے چھلکے سے باہر نکل آئی۔ شریعت کی اصطلاح میں معنی ہیں: حدود شریعت سے نکل جانا۔ نزول قرآن سے پہلے یہ لفظ انسانوں کے لئے استعمال نہیں کیا جاتا تھا، شریعت نے یہ اصطلاح مقرر کی ہے (۳) استفہام انکار وحیرت کے لئے ہے اور فا تعقیب کے لئے ہے۔

وَذُرِّيَّتَهٗ	اوراس کی نسل (چیلے	وَلَا خَلْقَ	اورنہ خودان کے	لَهُمْ	ان کو
	چانٹوں) کو	اَنْفُسِهِمْ	بنانے میں	وَجَعَلْنَا	اورکریں گے ہم
اَوْلِيَآءَ	دوست (رفیق)	وَمَا كُنْتُ	اورنہیں ہوں میں	بَيْنَهُمْ	ان کے درمیان
مِنْ دُوْنِيْ (۱)	مجھ کوچھوڑ کر	مُتَّخِذَ	بنانے والا	مَّوْبِقًا (۷)	ہلاکت کی جگہ
وَهُمْ	حالانکہ وہ	الْمُضِلِّيْنَ (۴)	گمراہوں کو	وَرَاَ (۸)	اوردیکھا
لَكُمْ	تمہارے	عَضُدًا (۵)	بازو (مددگار)	الْمُجْرِمُوْنَ	مجرموں نے
عَدُوٌّ	دشمن ہیں!	وَيَوْمَ	اور (یادکرو) جس دن	النَّارَ	دوزخ کو
بِئْسَ (۲)	بُرا ہے (ابلیس)	يَقُوْلُ	فرمائیں گے وہ	فَظَنُّوْٓا	پس خیال کیاانھوں نے
لِلظّٰلِمِيْنَ	ظالموں کے لئے	نَادُوْا	پکارو	اَنَّهُمْ	کہ وہ
بَدَلًا	بدلہ	شُرَكَآءِيَ	میرے اُن ساجھیوں کو	مُّوَاقِعُوْهَا (۹)	اس میں گرنے والے ہیں
مَآ	نہیں	الَّذِيْنَ	جن کو	وَلَمْ	اورنہیں
اَشْهَدْتُّهُمْ (۳)	موجودکیامیں نے ان کو	زَعَمْتُمْ (۶)	تم خیال کرتے تھے	يَجِدُوْا	پائیں گے وہ
خَلْقَ السَّمٰوٰتِ	آسمانوں اورزمین	فَدَعَوْهُمْ	پس پکاریں گے وہ انکو	عَنْهَا	جہنم سے بچ کر
وَالْاَرْضِ	کے بنانے میں	فَلَمْ يَسْتَجِيْبُوْا	سوجواب نہ دیں گے وہ	مَصْرِفًا (۱۰)	کوئی جائے پناہ

(۱) مِنْ دُوْنِیْ محذوف سے متعلق ہوکر اولیاء کی صفت ہے (۲) بِئْسَ فعل ماضی ضمیر مستتر فاعل اور وہی مخصوص بالذم ہے لِلظّٰلِمِیْنَ: بِدَلًا سے متعلق اور بَدَلًا فاعل مستتر کی تمیز ہے (۳) اِشْهَاد کے معنی ہیں (۱) دکھلانا (۲) گواہ بنانا (۳) حاضر کرنا۔ اس کا مجرد شَهِدَ (س) شُهُوْدًا المجلسَ: حاضر ہونا، شَهِدَ الشیَٔ: معائنہ کرنا، اطلاع پانا۔ شَهِدَ عَلٰی كَذَا: گواہی دینا (۴) مُضِلّ (اسم فاعل) گمراہ کرنے والا، مصدر اِضْلَال (۵) عَضُد: بازو، ہاتھ کا کہنی سے لیکر کندھے تک کا حصہ، مجازی معنی ہیں (۱) معین ومددگار (۲) قوت بازو (۶) شُرَكَاءِ یَ کے قرینہ سے زَعَمْتُم کے دونوں مفعول محذوف ہیں اَیْ زَعَمْتُمُوْهُمْ شُرَكَآءَ (۷) مَوْبِق (ظرف مکان) ہلاکت کی جگہ، جہنم کا ایک خاص درجہ وَبَقَ (ض،س) وُبُوْقًا: ہلاک ہونا (۸) رَأَ کے آخر میں ی قرآنی رسم الخط میں نہیں لکھی جاتی کیونکہ وہ پڑھی نہیں جاتی۔ رَآی کی اصل رَاَیَ ہے، یامتحرم ماقبل مفتوح ہونے کی وجہ سے ی کوالف سے بدلا تو رَآ ہوا۔ کوفی اب بھی آخر میں ی لکھتے ہیں اور بصری نہیں لکھتے۔ عربی زبان میں کوفیوں کا رسم الخط رائج ہے۔ ان کے نزدیک یہ ی علامتی ہے کہ اس کوالف سے بدلا گیا ہے پھر جب رَآی کو اَلْمُجْرِمُوْنَ سے ملایا تو الف ساقط ہوگیا تو ی کو بھی ساقط کردیا اور رَاَ لکھا گیا (۹) مُوَاقِعُوْ (اسم فاعل، جمع مذکر) اصل میں مُوَاقِعُوْنَ تھا اضافت کی وجہ سے نون گرا ہے مُوَاقِعٌ: ایک دوسرے سے قریب ہونے والا۔ مصدر مُوَاقَعَةٌ (۱۰) مَصْرِف (ظرف مکان) لوٹنے کی جگہ، جائے پناہ ۱۲

شیطان انسان کا ازلی دشمن ہے وہ روزِ آفرینش ہی سے انسان سے حسد رکھتا ہے اس لئے جو بھی انسان اس کے پھندے میں پھنستا ہے، آخرت تک اس کا پیچھا نہیں چھوڑتا۔ پس عقل مند وہ ہے جو ہوشیار رہے اور اس کی چالوں سے بچ جائے اور وہ لوگ تو بڑا ہی غضب ڈھاتے ہیں جو رحیم وشفیق رب کو چھوڑ کر، اُس دشمنِ خدا کو اور اس کی ذرّیت کو اپنا خیر خواہ سمجھتے ہیں اور سرپرست بناتے ہیں —— نیز ان آیتوں میں کفار مکہ کو تنبیہ کی جارہی ہے کہ تم جو غریب مسلمانوں کو حقیر سمجھتے ہو اور اپنے کو لمبا کھینچتے ہو یہ تمہارے ازلی دشمن شیطان کی تسویل کا نتیجہ ہے۔ اس نے بھی یہی کہا تھا کہ میں آدم سے بہتر ہوں پھر اس کے سامنے کیوں جھکوں؟ تم بھی غریب مسلمانوں پر کچھ اسی قسم کا تفوق جتلاتے ہو حالانکہ تمہیں اپنے دشمن کی روش چھوڑ کر فرشتوں کے نقش قدم پر چلنا چاہئے، جنھوں نے بے چون وچرا حکم الٰہی کی تعمیل کی تھی —— غرض ان آیتوں میں چار باتیں بیان کی ہیں:

اول: اپنے ازلی دشمن شیطان کی پیروی مت کرو۔ اس کو اور اس کے چیلوں کو دوست مت بناؤ، اللہ کی باتیں سنو اور ان سے رشتہ جوڑو۔ جو لوگ اللہ تعالیٰ کو چھوڑ کر شیطان کو سرپرست بناتے ہیں وہ اپنے لئے بہت برا بدل تجویز کرتے ہیں۔

دوم: شیاطین اور مشرکین کے دوسرے جھوٹے سہارے سب اللہ تعالیٰ کے بے بس بندے ہیں۔ کائنات کی تخلیق میں ان کی کسی طرح کی شرکت نہیں۔ پھر وہ خدائی میں ساجھے دار کیونکر ہو گئے؟ اور ان کی عبادت کیسے روا ہو گئی؟

سوم: مشرکین کے معبود آڑے وقت میں ان کی کوئی مدد نہیں کر سکتے۔ قیامت کے دن بھی جبکہ مشرکین مدد کے زیادہ سے زیادہ محتاج ہوں گے وہ کوئی مدد نہیں کر سکیں گے پھر مشرکین کس امید پر ان کو پوجتے ہیں؟

چہارم: شرک کا انجام بھیانک ہے ہر گناہ معاف ہو سکتا ہے مگر شرک کی معافی نہیں ہو سکتی۔ لہٰذا اس گناہ سے بچو۔

اب تفصیل سے یہ چاروں باتیں پڑھیں:

پہلی بات: —— اور (یاد کرو) جب ہم نے فرشتوں سے کہا کہ آدم کو سجدہ کرو —— تاکہ تمام مخلوقات کا انقیاد ظاہر ہو۔ اور آدم علیہ السلام کی خلافت ارضی کی ذمہ داریوں سے عہدہ برآ ہو سکیں —— پس انھوں نے سجدہ کیا —— یعنی فرشتوں نے آدم علیہ السلام کی بڑائی کا برملا اعتراف کیا —— مگر ابلیس نے نہ کیا —— اس نے انکار کر دیا اور گھمنڈ میں آ گیا۔ کہنے لگا: میں آدم سے بہتر ہوں پھر اس کے سامنے کیوں جھکوں؟ —— وہ جنات میں سے تھا پس اس نے اپنے پروردگار کی حکم عدولی کی —— یعنی ابلیس چونکہ فرشتہ نہیں تھا، جو معصیت سے معصوم ہوتے ہیں بلکہ جنّی تھا اس لئے اطاعت سے باہر ہو گیا —— جنات انسانوں کی طرح با اختیار مخلوق ہیں۔ انہیں پیدائشی فرمانبردار نہیں بنایا گیا بلکہ کفر وایمان اور اطاعت ومعصیت پر ان کو قدرت دی گئی ہے چنانچہ ابلیس نے خود اپنے اختیار

سے فسق وعصیاں کی راہ اختیار کی اور حکم خداوندی سے روگردانی کی ــــــ کیا اب بھی تم مجھے چھوڑ کر اس کو اور اس کی ذریت کو اپنا سرپرست بناتے ہو؟ حالانکہ وہ تمہارے دشمن ہیں! ــــــ یعنی تم کیا غضب کرتے ہو کہ رب رحیم کی جگہ شیطان لعین اور شیطان زادوں کو اپنا کارساز اور چارہ ساز بناتے ہو، جن کا کام ہی تمہیں بھڑکانا اور ضرر پہنچانا ہے ــــــ برا ہاتھ لگا ظالموں کے بدل! ــــــ یعنی دیکھو، یہ ظالم خدا ناشناس کیسے احمق ہیں کہ کارساز سمجھنا چاہئے تھا اللہ تعالیٰ کو اور یہ بجائے ان کے ابلیس اور اس کی ذریت کو کارساز بنائے ہوئے ہیں۔

آدم علیہ السلام کو جو سجدہ کرایا گیا تھا وہ سجدۂ عبادت نہیں تھا۔ عبادت صرف اللہ تعالیٰ کا حق ہے۔ غیر اللہ کی عبادت کبھی بھی جائز نہیں رہی۔ سورۃ الانبیاء میں ارشاد پاک ہے: ﴿وَمَا أَرْسَلْنَا مِنْ قَبْلِكَ مِنْ رَّسُوْلٍ إِلَّا نُوْحِيْ إِلَيْهِ أَنَّهُ لَآ إِلٰهَ إِلَّآ أَنَا فَاعْبُدُوْنِ﴾ ترجمہ: ہم نے آپؐ سے پہلے کوئی ایسا پیغمبر نہیں بھیجا جس کے پاس ہم نے یہ وحی نہ بھیجی ہو کہ میرے سوا کوئی معبود نہیں، پس میری ہی عبادت کرو (آیت ۲۵) بلکہ وہ سجدہ انقیاد واطاعت کی علامت تھا اور ایسا سجدہ گذشتہ امتوں میں جائز تھا جیسے سجدۂ تحیہ (سلامی کا سجدہ) جائز تھا۔ ہماری شریعت میں غیر اللہ کیلئے ہر قسم کا سجدہ حرام کر دیا گیا ہے۔

اور سجدہ کرنے کا حکم فرشتوں میں سے جو زمین پر رہتے تھے انہی کو دیا گیا تھا۔ قرآن کریم میں یہ واقعہ متعدد جگہ آیا ہے مگر کسی جگہ کوئی ایسا لفظ نہیں جس سے یہ پتہ چلے کہ یہ حکم صرف فرشتوں کے لئے تھا۔ بلکہ یہاں صراحت ہے کہ ابلیس کو بھی یہ حکم تھا۔ اس سے یہ بات واضح ہوئی کہ سجدہ کرنے کا حکم ملائکہ کے علاوہ دیگر مخلوقات کو بھی دیا گیا تھا۔

اور فرشتوں کا تذکرہ ہر جگہ اس لئے کیا گیا ہے کہ وہ اس وقت کی مخلوقات میں سب سے افضل تھے۔ اس لئے جب ان کو حکم ہوا تو دیگر مخلوقات کو بدرجۂ اولیٰ ہوگا۔ مثلاً بادشاہ کوئی حکم وزراء رؤساء کو دے تو ملک کی عام پبلک خود بخود اس حکم کی مخاطب ہو جاتی ہے۔

فائدہ (۱) ابلیس جنات میں سے تھا وہ کوئی فرشتہ نہیں تھا اور یہ جو عام طور پر مشہور ہے کہ وہ فرشتہ تھا اور فرشتہ بھی کیسا معلّم الملکوت (فرشتوں کا استاذ) یہ خیال اسرائیلی روایات کی بنا پر پیدا ہوا ہے۔ علامہ ابن کثیر رحمہ اللہ ان روایات کے بارے میں فرماتے ہیں کہ ان میں سے بہت سی روایات کا حال اللہ تعالیٰ بہتر جانتے ہیں اور ان میں سے کچھ تو قطعاً غلط ہیں۔ کیونکہ وہ قرآن کی قطعی نصوص کے خلاف ہیں (تفسیر ابن کثیر ۳: ۸۹)

اور حضرت حسن بصری رحمہ اللہ جو اکابر تابعین میں سے ہیں ارشاد فرماتے ہیں کہ ابلیس لحہ بھر کے لئے بھی فرشتہ نہیں تھا۔ اللہ تعالیٰ ان لوگوں کا ناس کریں جو یہ کہتے ہیں کہ ابلیس فرشتہ تھا۔ حالانکہ اللہ تعالیٰ صاف فرماتے ہیں کہ وہ جنّی تھا (درمنثور ۴: ۲۲۷) پس اس صریح نص کے مقابلہ میں کسی کا بھی قول قابل اعتنا نہیں۔

اور ارشاد پاک ﴿كَانَ مِنَ الْجِنِّ﴾ کا مقصود ابلیس کی اصل بتلانا نہیں بلکہ اس بات کو موجّہ کرنا ہے کہ ابلیس نے حکم کیوں نہیں مانا؟ وجہ یہ بتائی گئی ہے کہ ابلیس چونکہ جنّی تھا فرشتہ نہ تھا اس لئے اطاعت سے باہر ہوجانا اس کے لئے ممکن ہوا فرشتہ ہوتا تو یہ بات ممکن نہ ہوتی۔ کیونکہ فرشتے فطرۃً مطیع ہوتے ہیں وہ نافرمانی نہیں کرسکتے (دیکھئے سورۃ التحریم آیت ۶)

فائدہ(۲) انسان کے موارثِ اعلیٰ حضرت آدم علیہ السلام ہیں۔ اور جنّات کے مورثِ اعلیٰ جَانٌّ ہیں اور ابلیس جان کی نسل میں سے ایک ملعون شخص ہے۔ جیسے بنی آدم میں فرعون وشداد اور نمرود وبوجہل وغیرہ سرکش افراد ہوئے ہیں۔ اور ابلیس (مایوس) اس کا صفتی نام ہے اور علَم (خاص نام) عزازیل ہے اور شیطان بھی اس کا وصفی نام ہے جس کے معنی ہیں سرکش۔ اسی نے آدم علیہ السلام کو سجدہ کرنے سے انکار کیا تھا، تمام جنات نے سجدہ کرنے سے انکار نہیں کیا تھا۔ کیونکہ جنّات میں بھی مؤمن بندے تھے اور ہیں۔ انھوں نے نہ پہلے حکم عدولی کی تھی نہ آج کرتے ہیں۔

فائدہ(۳): ذریت کے معنی نسل اور اولاد کے ہیں اور توالد وتناسل کا سلسلہ جس طرح انسانوں میں ہے جنّات میں بھی ہے البتہ فرشتوں میں یہ سلسلہ نہیں اس لئے یہ بات تو طے ہے کہ ابلیس کی بھی اولاد ہے مگر جنّات میں اولاد کی کیا صورت ہے؟ یہ بات معلوم نہیں یاد رکھنے کی بات یہ ہے کہ ابلیس کی تمام نسبی اولاد کے لئے کافر و شیطان ہونا ضروری نہیں جس طرح انسانوں میں آزر کا بیٹا ابراہیم ہوسکتا ہے، ابلیس کی اولاد بھی مسلمان ہوسکتی ہے اور اس صورت میں وہ اولاد ابلیس کی ذریت نہیں ہوگی۔ نوح علیہ السلام کے کافر بیٹے کے بارے میں ارشاد باری ہے: ﴿إِنَّهُ لَيْسَ مِنْ أَهْلِكَ إِنَّهُ عَمَلٌ غَيْرُ صَالِحٍ﴾ وہ تمہارے خاندان میں سے نہیں اس کے کام خراب ہیں (ہود آیت ۴۶) اسی قیاس پر جو اولاد مؤمن ہو وہ کافر باپ کی اولاد نہیں۔ پس دیگر مؤمن جنوں کی اولاد کافر سرکش ہوسکتی ہے اور وہی ابلیس کی ذریت ہے۔

اور بعض مفسرین نے ذریت کے مجازی معنی لئے ہیں یعنی اتباع واعوان جن میں شیاطین الانس اور شیاطین الجن دونوں داخل ہیں۔ کیونکہ شیطان بھی وصفی نام ہے، ہر سرکش کافر شیطان ہے خواہ وہ انسان ہو یا جن۔ سورۃ الانعام آیت ۱۱۲ میں ہے: ﴿وَكَذٰلِكَ جَعَلْنَا لِكُلِّ نَبِيٍّ عَدُوًّا شَيَاطِيْنَ الْإِنْسِ وَالْجِنِّ يُوْحِيْ بَعْضُهُمْ إِلٰى بَعْضٍ زُخْرُفَ الْقَوْلِ غُرُوْرًا﴾ ترجمہ: اسی طرح ہم نے ہر نبی کے دشمن بہت سے شیطان پیدا کئے ہیں کچھ آدمی اور کچھ جنّ۔ جن میں سے بعض بعض کو چکنی چپڑی باتوں کا وسوسہ ڈالتے ہیں تا کہ ان کو دھوکہ میں ڈالدیں۔

اور ابلیس شیطان اکبر ہے اور دیگر شیاطین چھوٹے شیاطین ہیں اور قیامت تک مہلت صرف اسی شیطان اکبر کو ملی ہے تمام شیاطین کو یا تمام جنّات کو نہیں ملی وہ انسانوں کی طرح مرتے جیتے ہیں۔

فائدہ(۴): شیاطین کو دوست، کارساز اور سرپرست بنانے کا مطلب یہ ہے کہ آدمی اللہ کے احکام اور اس کی

ہدایات کو چھوڑ کر شیاطین الانس والجن کے احکام کی پیروی کرے۔ان کے نقش قدم پر چلے اوران کا منشا پورا کرے۔ قرآن کریم میں اس کو طاغوت (بدی وشرارت کے سرغنہ) کی پیروی کرنا بھی کہا گیا ہے اور یہ بھی درحقیقت ان شیاطین کو اللہ کا شریک ٹھہرانا ہے۔اگرچہ آدمی زبان سے ان کو شریک نہ بناتا ہو، بلکہ زبان سے لعنت بھیجتا ہو،مگران کے اوامر کی پیروی کرتا ہوتو وہ شرک کا مجرم ہے۔سورۃ التوبہ آیت ۳۱ میں ہے کہ جولوگ اللہ کے احکام کے مقابلہ میں علماء مشائخ کے احکام کی پیروی کرتے ہیں وہ ان کو رب بناتے ہیں۔آج بہت سے نام نہاد مسلمان ایسے ہیں جو علانیہ شیطان پرلعنت بھیجتے ہیں۔مگر وہ احکام الٰہی پس پُشت ڈال کر شیطان کی پیروی کرتے ہیں۔یہ سب لوگ عملاً شیطان کو خدا کے ساتھ شریک کرتے ہیں۔

دوسری بات: —— میں نے آسمان وزمین پیدا کرتے وقت ان کو دکھلانہیں لیا تھا —— کہ ذرا دیکھ لو! ٹھیک بنے ہیں یا کچھ اونچ نیچ رہ گئی ہے؟ یعنی مشورہ کی حد تک بھی ان کی شرکت نہیں تھی۔کیونکہ زمین وآسمان کی پیدائش کے وقت وہ سرے سے موجود ہی نہیں تھے —— اور نہ خود ان کی تخلیق —— ان کو دکھلائی گئی تھی یعنی ان میں سے ایک کی تخلیق دوسرے کو نہیں دکھلائی گئی نہ ان میں سے کسی سے مدد لی —— اور میں ایسا نہیں کہ گمراہ کرنے والوں کو درست و باز و بناؤں —— یعنی بفرض محال مدد بھی لیتا تو ان بدبخت نابجاروں سے مدد لیتا،جن کا کام ہی لوگوں کو میری راہ سے بہکانا ہے۔اُن میں سے اپنے معاملہ میں مدد یا مشورہ لوں گا؟

آیت پاک کا خلاصہ: یہ ہے کہ یہ شیاطین جن کو تم نے اپنا سرپرست اور چارہ ساز بنا رکھا ہے یہ سب تمہارے ہی جیسے بے بس بندے ہیں۔کائنات خداوندی میں کسی طرح کا بھی اختیار نہیں رکھتے۔اللہ تعالیٰ نے آسمان وزمین بناتے وقت ان سے کوئی مشورہ نہیں لیا، نہ وہ اس وقت موجود تھے۔کائنات کے خالق و مالک تنہا اللہ تعالیٰ ہیں وہی اپنی مخلوقات کا نظم وانتظام چلا رہے ہیں۔نہ ان کا کوئی شریک ہے نہ مددگار۔نہ مشیر ہے نہ وزیر۔سورۃ السبا آیت ۲۲ میں ہے:''جن کو تم خدا کے سوا معبود مان رہے ہوان کو پکارو، وہ ذرہ برابر اختیار نہیں رکھتے، نہ آسمانوں میں نہ زمین میں، اور نہ ان کی ان دونوں میں کوئی شرکت ہے اور نہ ان میں سے کوئی اللہ کا مددگار ہے''

تیسری بات: —— اور (یاد کرو) جب حق تعالیٰ فرمائیں گے: پکارو تم ان کو جن کو تم میرا شریک مانتے تھے —— یعنی شیاطین الانس والجن کو اور دوسرے معبودوں کو آواز دو تا کہ وہ اس مصیبت کی گھڑی میں تمہاری مدد کریں —— پس وہ پکاریں گے پس وہ ان کو جواب ہی نہ دیں گے —— یعنی وہ ان کی کچھ مدد نہ کرسکیں گے جس سے ان عابدین پر مایوسی چھا جائے گی —— اور ہم ان کے درمیان ہلاکت کی جگہ حائل کردیں گے —— یعنی دونوں

کے بیچ میں آگ کی خلیج آڑ کردی جائے گی جس کی وجہ سے ایک دوسرے کے نزدیک بھی نہ جاسکے گا۔کام آنا تو درکنار!

چوتھی بات: —— اور مجرم لوگ دوزخ کو دیکھیں گے تو یقین کرلیں گے کہ وہ اس میں گرنے والے ہیں —— مسلم شریف میں روایت ہے کہ قیامت کے دن جہنم لائی جائے گی اور اس کی ستر ہزار لگامیں ہونگی، ہر لگام پر ستر ہزار فرشتے ہوں گے جو اسے گھسیٹ کر لائیں گے۔اور مسند احمد کی روایت میں ہے کہ کافر چالیس سالہ مسافت سے جہنم کو دیکھ لیں گے اور وہ یقین کرلیں گے کہ انھیں ضرور اس میں گرنا ہے —— اور وہ جہنم سے بچ کر کوئی جائے پناہ نہ پائیں گے —— یعنی ان کے لئے فرار کا کوئی راستہ نہیں ہوگا۔

وَلَقَدْ صَرَّفْنَا فِيْ هٰذَا الْقُرْاٰنِ لِلنَّاسِ مِنْ كُلِّ مَثَلٍ ۭ وَكَانَ الْاِنْسَانُ اَكْثَرَ شَيْءٍ جَدَلًا ۝ وَمَا مَنَعَ النَّاسَ اَنْ يُّؤْمِنُوْٓا اِذْ جَاۗءَهُمُ الْهُدٰى وَيَسْتَغْفِرُوْا رَبَّهُمْ اِلَّآ اَنْ تَاْتِيَهُمْ سُنَّةُ الْاَوَّلِيْنَ اَوْ يَاْتِيَهُمُ الْعَذَابُ قُبُلًا ۝ وَمَا نُرْسِلُ الْمُرْسَلِيْنَ اِلَّا مُبَشِّرِيْنَ وَمُنْذِرِيْنَ ۚ وَيُجَادِلُ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا بِالْبَاطِلِ لِيُدْحِضُوْا بِهِ الْحَقَّ وَاتَّخَذُوْٓا اٰيٰتِيْ وَمَآ اُنْذِرُوْا هُزُوًا ۝ وَمَنْ اَظْلَمُ مِمَّنْ ذُكِّرَ بِاٰيٰتِ رَبِّهٖ فَاَعْرَضَ عَنْهَا وَنَسِيَ مَا قَدَّمَتْ يَدٰهُ ۭ اِنَّا جَعَلْنَا عَلٰي قُلُوْبِهِمْ اَكِنَّةً اَنْ يَّفْقَهُوْهُ وَفِيْٓ اٰذَانِهِمْ وَقْرًا ۭ وَاِنْ تَدْعُهُمْ اِلَى الْهُدٰى فَلَنْ يَّهْتَدُوْٓا اِذًا اَبَدًا ۝ وَرَبُّكَ الْغَفُوْرُ ذُو الرَّحْمَةِ ۭ لَوْ يُؤَاخِذُهُمْ بِمَا كَسَبُوْا لَعَجَّلَ لَهُمُ الْعَذَابَ ۭ بَلْ لَّهُمْ مَّوْعِدٌ لَّنْ يَّجِدُوْا مِنْ دُوْنِهٖ مَوْىِٕلًا ۝ وَتِلْكَ الْقُرٰٓى اَهْلَكْنٰهُمْ لَمَّا ظَلَمُوْا وَجَعَلْنَا لِمَهْلِكِهِمْ مَّوْعِدًا ۝ۧ

ع

وَلَقَدْ صَرَّفْنَا (۱)	اور البتہ تحقیق طرح طرح سے بیان کئے ہم	لِلنَّاسِ مِنْ كُلِّ مَثَلٍ (۲)	لوگوں کے لئے ہر قسم کے عمدہ مضامین	الْاِنْسَانُ اَكْثَرَ شَيْءٍ	انسان ہر چیز سے زیادہ
فِيْ هٰذَا الْقُرْاٰنِ	اس قرآن میں	وَكَانَ	اور ہے	جَدَلًا	جھگڑالو

(۱) صَرَّفْنَا کے لئے دیکھیں بنی اسرائیل آیت ۴۱ (۲) مِنْ كُلِّ مَثَلٍ مفعول بہ ہے صَرَّفْنَا کا اور مِنْ مفعول بہ پر زائد ہے (۳) جَدَلًا تمیز ہے

وَمَا	اور نہیں	قُبُلًا [٢]	روبرو (کھلا)	وَاتَّخَذُوْٓا	اور بنالیا انھوں نے
مَنَعَ [١]	روکا	وَمَا نُرْسِلُ	اور نہیں بھیجتے ہم	اٰيٰتِيْ	میری آیتوں کو
النَّاسَ	لوگوں کو	الْمُرْسَلِيْنَ	رسولوں کو	وَمَآ [٦]	اور اس (عذاب) کو
اَنْ يُّؤْمِنُوْٓا	ایمان لانے سے	اِلَّا	مگر	اُنْذِرُوْا	(جس سے) ڈرائے گئے
اِذْ جَآءَهُمُ	جب پہنچی ان کو	مُبَشِّرِيْنَ [٣]	بشارت دینے والے	هُزُوًا	ٹھٹھا
الْهُدٰى	ہدایت	وَمُنْذِرِيْنَ	اور ڈرانے والے	وَمَنْ	اور کون
وَيَسْتَغْفِرُوْا	اور مغفرت چاہنے سے	وَيُجَادِلُ [٤]	اور جھگڑا کرتے ہیں	اَظْلَمُ	بڑا ظالم ہے
رَبَّهُمْ	ان کے رب سے		(رسولوں کے ساتھ)	مِمَّنْ [٧]	اس شخص سے جو
اِلَّآ	مگر	الَّذِيْنَ	وہ جنھوں نے	ذُكِّرَ	نصیحت کیا گیا
اَنْ	اس بات نے کہ	كَفَرُوْا	انکار کیا	بِاٰيٰتِ رَبِّهٖ	اسکے رب کی آیتوں سے
تَاْتِيَهُمْ	پہنچے ان کو	بِالْبَاطِلِ	باطل طریقہ پر	فَاَعْرَضَ	پھر منہ پھیر لیا اس نے
سُنَّةُ الْاَوَّلِيْنَ	اگلے لوگوں کا معاملہ	لِيُدْحِضُوْا [٥]	تاکہ پھسلادیں	عَنْهَا	ان آیتوں سے
اَوْ يَاْتِيَهُمُ	یا پہنچے ان کو	بِهٖ	اس کے ذریعہ	وَنَسِيَ	اور بھول گیا وہ
الْعَذَابُ	عذاب	الْحَقَّ	سچی بات کو	مَا	ان گناہوں کو جو

(۳) مَنَعَ فعل ماضی اَلنَّاسَ مفعول اول، أَنْ مصدریہ، جملہ یُؤْمِنُوْا بتاویل مصدر ہوکر مفعول ثانی أَنْ سے پہلے مِنْ جارہ محذوف، إِذْ جَاءِ هُمْ ظرف یُؤْمِنُوْا کا، یَسْتَغْفِرُوْا کا عطف یُؤْمِنُوْا پر، أَنْ تَاْتِیَهُمْ میں بھی أَنْ مصدریہ ہے اور جملہ تَاْتِیَهُمْ بتاویل مصدر ہوکر مَنَعَ کا فاعل اور مضاف طَلَبٌ یا اِنْتِظَارٌ محذوف، اور مضاف الیہ اس کے قائم مقام اور یَأْتِیَهُمْ کا عطف تَاْتِیَهُمْ پر اور قُبُلاً حال اَلْعَذَابَ کا۔ (۴) قُبُلاً (بضمتین) ایک لغت ہے قِبَلٌ (بکسر ففتح) میں جس کے معنی ہیں آنکھوں کے سامنے یا قَبِیْلٌ کی جمع ہے جیسے سُبُلٌ جمع ہے سَبِیْلٌ کی اور اس کے معنی ہیں گروہ گروہ، نوع بہ نوع، قسم قسم (۳) مُبَشِّرِیْنَ اور مُنْذِرِیْنَ حال ہیں مُرْسَلِیْنَ سے (۴) یُجَادِلُ کا مفعول محذوف ہے أی یُجَادِلُ الْمُرْسَلِیْنَ (۵) لِیُدْحِضُوْا متعلق ہے یُجَادِلُ سے۔ اِدْحاض (افعال) پھسلانا، ٹلانا۔ دَحَضَتْ (ف) رِجْلُهٗ: اس کا پاؤں پھسل گیا۔ مَکَانٌ دَحْضٌ: پھلسنے کی جگہ۔ حُجَّةٌ دَاحِضَةٌ: باطل دلیل

(۶) ما مصدریہ یا موصولہ اور عائد محذوف أی أُنْذِرُوْا بہ یہ آیَاتِیْ پر معطوف ہے اور هُزُوًا مفعول ثانی ہے (۷) مَنْ موصولہ لفظاً مفرد ہے اس لئے آگے پانچ مفرد ضمیریں اس کی طرف لوٹتی ہیں یعنی (۱) ذُکِّرَ (۲) رَبِّهٖ (۳) اَعْرَضَ (۴) نَسِیَ (۵) یَدَاهُ کی ضمیریں اور معنًی جمع ہے اس لئے آگے پانچ جمع کی ضمیریں اس کی طرف لوٹتی ہیں یعنی (۱) قُلُوْبُهُمْ (۲) یَفْقَهُوْهُ (۳) آذَانِهِمْ (۴) تَدْعُهُمْ (۵) لَنْ یَّهْتَدُوْا کی ضمیریں۔

لفظ	ترجمہ	لفظ	ترجمہ	لفظ	ترجمہ
قَدَّمَتْ	آگے بھیجے ہیں	فَلَنْ يَّهْتَدُوْٓا	تو ہرگز نہ آویں وہ	مَّوْعِدٌ	ایک وعدہ ہے
يَدٰهُ	اسکے دونوں ہاتھوں نے	اِذًا	اس وقت	لَّنْ يَّجِدُوْا	ہرگز نہیں پائیں گے وہ
اِنَّا جَعَلْنَا	بیشک ہم نے کردیئے	اَبَدًا	کبھی بھی	مِنْ دُوْنِهٖ	اس سے وَرے
عَلٰى قُلُوْبِهِمْ	ان کے دلوں پر	وَرَبُّكَ (۲)	اور آپ کے رب	مَوْئِلًا (۳)	کوئی سرک جانے کی جگہ
اَكِنَّةً (۱)	پردے	الْغَفُوْرُ	بڑی مغفرت والے	وَتِلْكَ (۴)	اور یہ
اَنْ	اس سے کہ	ذُو الرَّحْمَةِ	مہربانی والے ہیں	الْقُرٰٓى	بستیاں
يَّفْقَهُوْهُ	سمجھیں وہ اس کو	لَوْ يُؤَاخِذُهُمْ	اگر پکڑیں وہ ان کو	اَهْلَكْنٰهُمْ	غارت کیا ہم نے ان کو
وَفِيْٓ اٰذَانِهِمْ	اور ان کے کانوں میں	بِمَا كَسَبُوْا	انکے کرتوں کی وجہ سے	لَمَّا	جب
وَقْرًا	بوجھ	لَعَجَّلَ	تو جلدی دیدیں	ظَلَمُوْا	ظلم کیا انھوں نے
وَاِنْ	اور اگر	لَهُمُ	ان کو	وَجَعَلْنَا	اور مقرر کیا ہم نے
تَدْعُهُمْ	بلاویں آپ ان کو	الْعَذَابَ	سزا	لِمَهْلِكِهِمْ (۵)	ان کی ہلاکت کے لئے
اِلَى الْهُدٰى	ہدایت کی طرف	بَلْ لَّهُمْ	بلکہ ان کے لئے	مَّوْعِدًا	ایک مقررہ وقت

ان آیات میں منکرین سے تین باتیں کہی گئی ہیں:

۱ ۔ انسان بڑا جھگڑالو ہے وہ اللہ تعالیٰ کی وعیدوں کا مذاق اڑاتا ہے مگر یاد رکھے: حجت تام کردی گئی ہے، ہر مؤثر طریقے سے اور بہترین انداز سے بات پیش کی جاچکی ہے۔ اب بس عذاب کا کوڑا برسنا باقی ہے۔

۲ ۔ کفار کی حق بیزاری اور دین دشمنی کی وجہ سے ان سے حق بات سننے کی اور سمجھنے کی صلاحیت سلب کرلی گئی ہے لہٰذا اب ان کے ایمان کی امید نہ رکھی جائے۔

۳ ۔ اللہ تعالیٰ انسانوں کی حرکتوں پر فوراً گرفت نہیں کرتے، ڈھیل دیتے ہیں تاکہ انسان دیر سویر راہ راست پر آنا

(۱) أَكِنَّةً کے لئے دیکھئے النحل ۸۱ (۲) رَبُّكَ مبتدا، اَلْغَفُوْرُ خبر اول، ذُو الرَّحْمَةِ خبر ثانی اور مَا كَسَبُوْا میں ما مصدریہ یا موصولہ (۳) مَوْئِلٌ (اسم ظرف) جائے پناہ، لوٹنے کی جگہ۔ وَأَلَ يَئِلُ وَأْلاً من كذا: نجات ڈھونڈھنا۔ وَأَلَ إليه: پناہ لینا۔ وَأَلَ إلى الله: رجوع کرنا، توبہ کرنا (۴) تِلْكَ الْقُرٰى (اسم اشارہ اور مشار الیہ) مبتدا، جملہ أَهْلَكْنَاهُمْ خبر یا فعل ناصب محذوف جس کی تفسیر بعد والا فعل کررہا ہے اس صورت میں یہ باب اشتغال سے ہوگا (۵) مَهْلِك (مصدر میمی) ہلاک ہونا، تباہ ہونا (ظرف مکان) ہلاکت کی جگہ جمع مَهَالِك۔

چاہے تو آ جائے۔

اب یہی تینوں باتیں تفصیل سے پڑھیے:

پہلی بات: کفار کی ضد، اور کٹھ حجتی ـــــ اور واقعہ یہ ہے کہ ہم نے اس قرآن میں لوگوں کے لئے ہر قسم کے عمدہ مضامین طرح طرح سے بیان کئے ہیں ـــــ قرآن کریم میں مختلف عنوانوں اور دلائل وشواہد سے باتیں سمجھائی گئی ہیں، فہمائش کرنے میں کوئی کسری باقی نہیں چھوڑی، مگر نافرمان انسان ماننے کے لئے تیار نہیں ـــــ اور انسان بڑا جھگڑالو ہے! ـــــ کتنی ہی صاف اور سیدھی بات کہی جائے کٹھ حجی کئے بغیر نہیں رہتا۔ حدیث میں ایک جھگڑالو آدمی کا واقعہ ہے جو قیامت کے دن اللہ تعالیٰ سے جھگڑا کرے گا۔ اسے بارگاہ خداوندی میں پیش کیا جائے گا اور پوچھا جائے گا: ہم نے جو رسول بھیجے تھے ان کے ساتھ تیرا طرز عمل کیسا رہا؟ وہ کہے گا: پروردگار! میں آپ پر ایمان لایا اور آپ کے رسول پر بھی اور عمل میں اس کی اطاعت کی۔ اللہ تعالیٰ فرمائیں گے: یہ تیرا نامہ اعمال ہے اس میں تو کچھ بھی نہیں! وہ کہے گا میں اس نامہ اعمال کو نہیں مانتا۔ اللہ تعالیٰ فرمائیں گے: ہمارے یہ فرشتے جو تیری نگرانی کرتے تھے تیرے خلاف گواہی دیتے ہیں! وہ کہے گا: میں ان شہادت بھی نہیں مانتا اور نہ ان کو پہنچانتا ہوں۔ اللہ تعالیٰ فرمائیں گے: یہ لوح محفوظ ہے اس میں بھی تیرا یہی حال لکھا ہے۔ وہ کہے گا: پروردگار! کیا آپ نے مجھے ظلم سے پناہ نہیں دی؟ اللہ تعالیٰ فرمائیں گے: بیشک تو ظلم سے ہماری پناہ میں ہے، تب وہ کہے گا: میرے رب! میں ایسی بن دیکھی شہادتوں کو کیسے مان لوں؟ میں تو ایسی شہادت کو مان سکتا ہوں جو میرے اندر سے ہو۔ اللہ تعالیٰ فرمائیں گے: اچھا اب ہم تیرے خلاف تیری ہی ذات میں سے گواہ کھڑے کرتے ہیں۔ وہ سوچ میں پڑ جائے گا کہ اس کی ذات میں سے اس کے خلاف کون گواہی دے گا؟ پھر اس کے منہ پر مہر لگا دی جائے گی (اور اس کی قوت گویائی اعضا کی طرف منتقل کر دی جائے گی) اور اس کے ہاتھ پاؤں اس کے کفر وشرک پر گواہی دیں گے پھر اس کی مہر توڑ دی جائے گی، اور اس کو جہنم رسید کیا جائے گا۔ اس کا بعض حصہ بعض کو لعنت کرے گا۔ وہ اپنے اعضاء سے کہے گا: تمہارا بیڑا غرق ہو! میں تو تمہارے ہی لئے جھگڑا کر رہا تھا۔ اس کے اعضاء جواب دیں گے: تجھ پر خدا کی مار! کیا تو سمجھتا ہے کہ اللہ تعالیٰ سے کوئی بات چھپائی جاسکتی ہے؟ اللہ تعالیٰ یہی بات ارشاد فرماتے ہیں کہ انسان مخلوقات میں سب سے زیادہ جھگڑالو واقع ہوا ہے (یہ روایت تفسیر قرطبی سے لی گئی ہے اور اس کا آخری حصہ مسلم شریف میں بروایت حضرت انس رضی اللہ عنہ مروی ہے)

آگے انسان کے جھگڑالو پن کی تفصیل ہے ارشاد ہے ـــــ اور جب بھی لوگوں کے پاس ہدایت پہنچی تو ان کو ایمان لانے سے اور اپنے رب کے حضور میں معافی مانگنے سے صرف اس بات نے روکا کہ ان کو بھی اگلے لوگوں کا سا

معاملہ پیش آجائے یا عذاب ان کے روبرو آ کھڑا ہو ـــــ یعنی ہدایت پہنچ جانے کے بعد ایمان نہ لانے اور توبہ نہ کرنے کا کوئی معقول عذر ان کے پاس نہیں ہے، بس اس بات کا ان کو انتظار ہے کہ گذشتہ اقوام کی طرح عام تباہی ان پر ڈال دی جائے یا وہ زندہ رہیں اور عذاب درعذاب میں مبتلا کر دیئے جائیں ـــــ اور ہم رسولوں کو صرف بشارت دینے والا اور ڈرانے والا بنا کر بھیجتے ہیں ـــــ یعنی رسولوں کی بعثت کا مقصد صرف یہ ہے کہ وہ لوگوں کو فرمانبرداری کے اچھے نتائج سے اور نافرمانی کے برے انجام سے خبردار کر دیں۔ ان کے پاس کوڑا نہیں ہوتا کہ وہ زبردستی لوگوں سے منوالیں ـــــ اور کافر ناحق کا جھگڑا کھڑا کرتے ہیں تاکہ وہ اس کے ذریعہ سچی بات کو ٹلا دیں ـــــ یعنی کفار جھوٹے جھگڑے کھڑے کر کے اور کٹ حجتی کر کے چاہتے ہیں کہ حق کی آواز پست کر دیں اور جھوٹ کے زور سے سچائی کا قدم ڈگمگا دیں مگر ایسا کبھی نہیں ہوگا۔

اور آیات الٰہی اور تنبیہات خداوندی کے ساتھ ان کا برتاؤ کیسا ہے؟ ـــــ اور انھوں نے میری آیتوں کو اور اس عذاب کو جس سے ان کو ڈرایا گیا ٹھٹھا بنالیا ـــــ یعنی عذاب سے ڈرانے کا مقصد تو یہ تھا کہ ان کے قلوب لرز جاتے، بدن سہم جاتے اور وہ اپنی غلط روش چھوڑ دیتے مگر اس کے برعکس سنگ دل منکروں نے الٹا اسی کا مذاق بنالیا اور ہنسی اڑاتے ہوئے کہنے لگے: ''خدایا! اگر واقعی یہ قرآن آپ کی طرف سے ہے تو ہم پر آسمان سے پتھر برسا، یا ہم پر کوئی دردناک عذاب ڈال دے'' (الانفال آیت ۳۲)

دوسری بات: ظالموں سے قبول حق کی توفیق سلب کر لی گئی ـــــ اور اس شخص سے بڑا ظالم کون ہے جس کو اس کے رب کی آیتوں سے نصیحت کی گئی پھر اس نے منہ پھر لیا، اور وہ ان حرکتوں کو بھول گیا جو اپنے ہاتھوں سے آگے بھیج چکا ہے؟! بیشک ہم نے ان کے دلوں پر پردے ڈال دیئے ہیں اور ان کے کانوں میں گرانی پیدا کر دی ہے ـــــ کیونکہ جب بندہ ایک عرصہ تک حق کی مخالفت کرتا رہتا ہے، نصیحت کے مقابلہ میں جھگڑوں پر تُل جاتا ہے اور حق کا مقابلہ جھوٹ اور مکر وفریب سے کرنے لگتا ہے تو اس سے حق کو سمجھنے کی اور سننے کی توفیق سلب کر لی جاتی ہے، دلوں پر پردے ڈال دیئے جاتے ہیں اور کانوں میں ڈاٹ ٹھونک دی جاتی ہے ـــــ اور اگر آپ ان کو ہدایت کی طرف بلائیں تو وہ اس وقت ہرگز راہ راست پر نہ آئیں ـــــ ''اس وقت'' یعنی جب ان کے کان اور دل ان کی ضد کی وجہ سے قبول حق کی استعداد کھو بیٹھے تو اب ان کے راہ پر آنے کی توقع نہیں!

تیسری بات: مجرموں کی فوراً گرفت کرنا اللہ تعالیٰ کی سنت نہیں ـــــ اور آپ کے پروردگار بڑے ہی درگذر کرنے والے، رحم فرمانے والے ہیں، اگر وہ ان کے کرتوتوں پر ان کی داروگیر کرنے لگیں تو فوراً ہی عذاب بھیج دیں

ـــــ یعنی حرکتیں تو ان کی ایسی ہیں کہ عذاب بھیجنے میں لمحہ بھر کی تاخیر نہ کی جائے، مگر اللہ تعالیٰ کا یہ طریقہ نہیں کہ جہاں کسی نے قصور کیا فوراً پکڑ لیا، بلکہ وہ اپنی غفاری اور شان رحیمی سے مجرموں کو سنبھلنے کا موقع دیتے ہیں ــــ بلکہ ان کے لئے ایک وعدہ ہے وہ اس سے وَرے ہر گز کوئی سرک جانے کی جگہ نہیں پائیں گے ــــ جس میں چھپ کر اپنے کو محفوظ کر لیں۔ مثال مطلوب ہو تو سنیں: ــــ اور یہ بستیاں ہم نے ان کو اس وقت غارت کیا جب انھوں نے نا انصافی کی، اور ہم نے ان کی ہلاکت کے لئے ایک معیاد مقرر کی ــــ یعنی عاد وثمود، مدین وسبا اور قوم لوط علیہ السلام کی بستیاں، اور ان کے اجڑے دیار تمہاری گذرگاہیں ہیں، تم اپنے تجارتی سفروں میں آتے جاتے ان کا مشاہدہ کرتے ہو، دیکھ لو جب انھوں نے کفر وعصیان کو شیوہ بنایا تو ہم نے ان سب کو غارت کر دیا اور ان کی ہلاکت کے لئے بھی ہم نے ایک معیاد مقررہ کی تھی اسی مقررہ وقت پر وہ تباہ ہوئے۔ تمہیں بھی ڈرنا چاہئے اگر تم بھی ان کے نقش قدم پر چلتے رہے تو وقت مقررہ پر تمہیں بھی عذاب الٰہی آگھیرے گا اور اس وقت تمہارے لئے کوئی راہ فرار نہ ہوگی۔

وَإِذْ قَالَ مُوسَىٰ لِفَتَاهُ لَا أَبْرَحُ حَتَّىٰ أَبْلُغَ مَجْمَعَ الْبَحْرَيْنِ أَوْ أَمْضِيَ حُقُبًا ﴿٦٠﴾ فَلَمَّا بَلَغَا مَجْمَعَ بَيْنِهِمَا نَسِيَا حُوتَهُمَا فَاتَّخَذَ سَبِيلَهُ فِي الْبَحْرِ سَرَبًا ﴿٦١﴾ فَلَمَّا جَاوَزَا قَالَ لِفَتَاهُ آتِنَا غَدَاءَنَا لَقَدْ لَقِينَا مِنْ سَفَرِنَا هَٰذَا نَصَبًا ﴿٦٢﴾ قَالَ أَرَأَيْتَ إِذْ أَوَيْنَا إِلَى الصَّخْرَةِ فَإِنِّي نَسِيتُ الْحُوتَ وَمَا أَنْسَانِيهُ إِلَّا الشَّيْطَانُ أَنْ أَذْكُرَهُ ۚ وَاتَّخَذَ سَبِيلَهُ فِي الْبَحْرِ عَجَبًا ﴿٦٣﴾ قَالَ ذَٰلِكَ مَا كُنَّا نَبْغِ ۚ فَارْتَدَّا عَلَىٰ آثَارِهِمَا قَصَصًا ﴿٦٤﴾ فَوَجَدَا عَبْدًا مِنْ عِبَادِنَا آتَيْنَاهُ رَحْمَةً مِنْ عِنْدِنَا وَعَلَّمْنَاهُ مِنْ لَدُنَّا عِلْمًا ﴿٦٥﴾ قَالَ لَهُ مُوسَىٰ هَلْ أَتَّبِعُكَ عَلَىٰ أَنْ تُعَلِّمَنِ مِمَّا عُلِّمْتَ رُشْدًا ﴿٦٦﴾ قَالَ إِنَّكَ لَنْ تَسْتَطِيعَ مَعِيَ صَبْرًا ﴿٦٧﴾ وَكَيْفَ تَصْبِرُ عَلَىٰ مَا لَمْ تُحِطْ بِهِ خُبْرًا ﴿٦٨﴾ قَالَ سَتَجِدُنِي إِنْ شَاءَ اللَّهُ صَابِرًا وَلَا أَعْصِي لَكَ أَمْرًا ﴿٦٩﴾ قَالَ فَإِنِ اتَّبَعْتَنِي فَلَا تَسْأَلْنِي عَنْ شَيْءٍ حَتَّىٰ أُحْدِثَ لَكَ مِنْهُ ذِكْرًا ﴿٧٠﴾ ع

ع ۹ / ۲۰

وَاِذْ قَالَ	اور جب کہا	فَاتَّخَذَ	پس لے لی اس نے	نَصَبًا (۷)	تھکن (تکلیف) سے
مُوْسٰی	موسیٰ (علیہ السلام) نے	سَبِیْلَهٗ	اپنی راہ	قَالَ	کہا خادم نے
لِفَتٰىهُ (۱)	اپنے خادم سے	فِی الْبَحْرِ	دریا میں	اَرَءَیْتَ (۸)	کیا دیکھا آپ نے
لَآ اَبْرَحُ (۲)	نہیں ہٹوں گا میں	سَرَبًا (۶)	گھستے ہوئے (سرنگ بنا کر)	اِذْ اَوَیْنَآ (۹)	جب ٹھیرے ہم
	(برابر چلتا رہوں گا میں)	فَلَمَّا	پھر جب	اِلَی الصَّخْرَةِ	اس پتھر کے پاس
حَتّٰٓی اَبْلُغَ	یہاں تک کہ پہنچوں میں	جَاوَزَا	آگے بڑھے دونوں	فَاِنِّیْ نَسِیْتُ	تو بالکل بھول گیا میں
مَجْمَعَ الْبَحْرَیْنِ (۳)	دو دریاؤں کے سنگم پر	قَالَ	(تو) کہا موسیٰ نے	الْحُوْتَ	مچھلی کو
اَوْ اَمْضِیَ	یا چلتا رہوں میں	لِفَتٰىهُ	اپنے خادم سے	وَمَآ اَنْسٰنِیْهُ (۱۰)	اور نہیں بھلایا مجھے اسکو
حُقُبًا (۴)	قرنوں (صدیوں)	اٰتِنَا	دے تو ہم کو	اِلَّا الشَّیْطٰنُ	مگر شیطان نے
فَلَمَّا بَلَغَا	پھر جب پہنچے دونوں	غَدَآءَنَا	ہمارا ناشتہ	اَنْ اَذْکُرَهٗ (۱۱)	کہ یاد کروں میں اس کو
مَجْمَعَ بَیْنِهِمَا (۵)	دو دریاؤں کے سنگم پر	لَقَدْ لَقِیْنَا	تحقیق ملاقات کی ہم نے	وَاتَّخَذَ	اور بنالی اس نے
نَسِیَا	(تو) بھول گئے دونوں	مِنْ سَفَرِنَا	ہمارے اس سفر کی	سَبِیْلَهٗ	اپنی راہ
حُوْتَهُمَا	اپنی مچھلی	هٰذَا	وجہ سے	فِی الْبَحْرِ	دریا میں

(۱) فَتٰی کے اصل معنی ہیں جوان، لڑکا اور مجازی معنی ہیں خادم، غلام۔ جمع فِتْیَةٌ عام طور پر مفسرین نے یہاں خادم مرادلیا ہے۔ خادم عموماً جوان ہوتا ہے اس لئے عرب اس کو فَتٰی کہتے ہیں (روح) اور حضرت حسن بصریؒ نے غلام ترجمہ کیا ہے (کبیر) (۲) لَاأَبْرَحُ (فعل ناقص) بمعنی لَاأَزَالُ اس کا اسم ضمیر مستتر اور خبر محذوف ہے أی لا أبرحُ أَسِیْرُ (میں برابر چلتا رہوں گا) اور اگر یہ فعل تام ہو تو خبر کی حاجت نہیں بَرِحَ (س) بَرَحًا: ہٹنا، پلٹنا (۳) مَجْمَعٌ (ظرف مکان، مضاف) ملنے کی جگہ (۴) حُقُبٌ: زمانہ کی ایک مقررہ مدت۔ مگر اس مدت میں اہل لغت کا اختلاف ہے ستر سال سے تین ہزار سال تک کے اقوال ہیں۔ مجازی معنی مدت دراز اور غیر منقطع زمانہ کے ہیں جمع اَحْقَاب جیسے عُنُقٌ کی جمع اَعْنَاقٌ (۵) مَجْمَعٌ (ظرف) کی اضافت بَیْنَ (ظرف) کی طرف اِتِّسَاعًا (مجازاً) ہے (۶) سَرَبٌ: سرنگ، نالی جس سے پانی آئے اور وحشی جانور کا سوراخ۔ سَرَبَ (ن) سُرُوْبًا الرَّجُلُ: گھستے چلے جانا، سَرَبَ الماءُ: پانی کا جاری ہونا۔ سَرَبًا اِتَّخَذَ کا مفعول ثانی ہے (۷) نَصَبٌ (اسم) کوفت، تھکان، تکلیف۔ یہ لفظ لَقِیْنَا کا مفعول بہ ہے (۸) أَرَأَیْتَ: ہمزۂ استفہام، رَأَیْتَ فعل با فاعل مفعول بہ محذوف، محاورہ میں یہ بمعنی اَخْبِرْنِیْ (بتلایئے) آتا ہے مگر یہاں چونکہ کوئی بات دریافت طلب نہیں اس لئے اَمَا یاتنبّہ (لیجئے، دیکھئے) کے معنی میں ہے (۹) اَوٰی کے لئے دیکھئے الکہف آیت ۱۶ (۱۰) اَنْسَانِیْهِ از اَنْسٰی اِنْسَاءً: بھلا دینا۔ اَنْسٰی (ماضی واحد مذکر غائب) ن وقایہ ی ضمیر واحد متکلم مفعول اول، ہٗ ضمیر واحد مذکر غائب مفعول ثانی......ہٗ میں اصل یہ ہے کہ وہ مضموم ہو، مگر جب اس سے پہلے ی ساکنہ یا کسرہ آتا ہے تو ہٗ کو ←

عَجَبًا (۱)	عجیب طرح سے	عَبْدًا	ایک بندے کو	هَلْ	کیا
قَالَ	کہا موسیٰ نے	مِّنْ عِبَادِنَآ	ہمارے بندوں میں سے	اَتَّبِعُكَ	میں آپ کے ساتھ رہ
ذٰلِكَ	یہی ہے	اٰتَيْنٰهُ	دی تھی ہم نے اس کو		سکتا ہوں
مَا	جو	رَحْمَةً	خاص مہربانی	عَلٰٓى اَنْ (۵)	اس شرط پر کہ
كُنَّا نَبْغِ (۲)	چاہتے تھے ہم	مِّنْ عِنْدِنَا (۴)	اپنے پاس سے	تُعَلِّمَنِ	سکھلائیں آپ مجھے
فَارْتَدَّا	پس الٹے پھرے دونوں	وَعَلَّمْنٰهُ	اور سکھلایا تھا ہم نے اسکو	مِمَّا	اس میں سے جو
عَلٰٓى اٰثَارِهِمَا	اپنے پیروں کے نشان پر	مِنْ لَّدُنَّا	خاص اپنے پاس سے	عُلِّمْتَ	سکھلائے گئے ہیں آپ
قَصَصًا (۳)	پہچانتے ہوئے (پیروی	عِلْمًا	علم	رُشْدًا (۶)	بھلی راہ
	کرتے ہوئے)	قَالَ لَهٗ	کہا اس بندے سے	قَالَ	کہا اس بندے نے
فَوَجَدَا	پس پایا دونوں نے	مُوْسٰى	موسیٰ نے	اِنَّكَ	بے شک آپ

← بھی کسرہ دیدیا جاتا ہے جیسے عَلَيْهِ، فِيْهِ، بِهٖ وغیرہ۔ مگر دو جگہ امام حفصؒ نے اصل کے مطابق پڑھا ہے ایک یہاں دوسرے سورۃ الفتح آیت ۱۰ میں عَلَيْهُ اللّٰهَ جس کی وجہ تفصیل سے ملا علی قاری رحمہ اللہ نے شرح شاطبیہ ص ۳۲۰ میں بیان کی ہے (۱۱) أَنْ اَذْكُرَهٗ میں أَنْ مصدریہ، جملہ أَذْكُرَهٗ بتاویل مصدر ہوکر اَنْسَانِيْ کے مفعول ثانی ہٗ سے بدل اشتمال أي وَمَا انسانی ذِكْرَهٗ إلا الشيطانُ؛ ذَكَرَ الشَيْءَ: دل میں یاد کرنا دوسرے سے ذکر کرنے کے لئے ذَكَرَ لَهٗ آتا ہے۔

(۱) عَجَبًا اِتَّخَذَ کا مفعول ثانی بھی ہوسکتا ہے اور مفعول مطلق بھی۔ اس صورت میں موصوف محذوف ہوگا أَيْ اتِّخَاذًا عَجَبًا (۲) نَبْغِ اصل میں نَبْغِيْ تھا ی جو لام کلمہ ہے رسم الخط میں چھوڑ دی گئی ہے اور سورۂ یوسف آیت ۶۵ میں لکھی گئی ہے۔ امام رازی رحمہ اللہ نے ی حذف کرنے کی وجہ تخفیف بتائی ہے کیونکہ اس کی علامت غین کا کسرہ موجود ہے۔ قاعدہ کے مطابق اسماء میں تو ی حذف ہوتی ہے جیسے: قَاضِيْ سے قَاضٍ مگر فعل میں حذف نہیں کی جاتی مگر کبھی خلاف قیاس فعل میں بھی حذف کرتے ہیں کیونکہ جب وہ ساکن کے ساتھ ملتی ہے تو حذف ہوجاتی ہے مثلاً: مَانَبْغِ الْيَوْمَ؟ اس لئے غیر ساکن کے ساتھ بھی اس کو حذف کردیا (کبیر) (۳) قَصَصًا (مصدر) حال ہے یعنی نشانِ قدم تلاش کرتے ہوئے قَصَّ (ن) قَصَصًا اَثَرَهٗ: آہستہ آہستہ پیروی کرنا (۴) مِنْ عِنْدِنَا محذوف سے متعلق ہوکر رَحْمَةً کا حال ہے اور مِنْ لَدُنَّا بھی محذوف سے متعلق ہوکر عِلْمًا کا حال ہے، رعایت فاصلہ کی وجہ سے مقدم کیا گیا ہے اور عِلْمًا مفعول ثانی ہے ــــ لَدُنْ، عِنْدَ کے معنی میں ظرف ومکان ہے مگر عند سے زیادہ قرب پر دلالت کرتا ہے اور اس سے اخص ہے اور مبنی ہے اور لَدُنَّا سے علم لَدُنِّيْ (علم وہبی) ماخوذ ہے (۵) عَلٰى أَنْ إلخ کاف سے حال ہے أي حال كَوْنِكَ مُعَلِّمًا لِيْ ــــ أَنْ مصدریہ، تُعَلِّمَنِ کے آخر میں ن وقایہ اس کے بعد ی ضمیر واحد متکلم محذوف، نون کا کسرہ اس کی علامت ہے اور رُشْدًا مفعول ثانی ہے تُعَلِّمَنِ کا (۶) رَشَدَ (ن) رُشْدًا ہدایت پانا مزید دیکھئے الکہف آیت ۱۰۔

لَنْ تَسْتَطِيْعَ	ہرگز طاقت نہیں رکھتے	قَالَ	کہا موسیٰ نے	قَالَ	کہا اس بندے نے
مَعِيَ	میرے ساتھ	سَتَجِدُنِيْٓ	عنقریب پائیں گے	فَاِنِ	تو اگر
صَبْرًا	صبر کی		آپ مجھے	اتَّبَعْتَنِيْ	پیروی کریں آپ میری
وَكَيْفَ	اور کیسے	اِنْ شَآءَ اللّٰهُ	اگر اللہ نے چاہا	فَلَا تَسْـَٔلْنِيْ	تو نہ پوچھیں آپ مجھ سے
تَصْبِرُ	صبر کریں گے آپ	صَابِرًا	صبر کرنے والا	عَنْ شَيْءٍ	کسی چیز کے بارے میں
عَلٰي مَا	ان باتوں پر جن کو	وَّلَآ اَعْصِيْ	اور نہیں نافرمانی کروں	حَتّٰٓي اُحْدِثَ(۲)	یہاں تک کہ شروع
لَمْ تُحِطْ(۱)	نہیں احاطہ کیا ہے آپ نے		گا میں		کروں میں
بِهٖ	ان کا	لَكَ	آپ کے	لَكَ	آپ کے سامنے
خُبْرًا	واقفیت کے اعتبار سے	اَمْرًا	کسی حکم کی	مِنْهُ ذِكْرًا	اس کا تذکرہ

حضرت موسیٰ علیہ السلام کا تعلیمی سفر نامہ: اب تحصیل علم کے لئے موسیٰ علیہ السلام کا سفر کا واقعہ ذکر کیا جاتا ہے۔ یہ واقعہ مختلف مقاصد کے لئے سنایا گیا ہے:

۱ — مسلمانوں کے تعلق سے اس کا مقصد یہ ہے کہ مشرکین کے عذاب میں تاخیر سے مسلمان بے چین نہ ہوں۔ اللہ تعالیٰ کے کام پر اسرار ہوتے ہیں۔ عوام تو عوام خواص بھی ان کی حکمتوں کو نہیں پہنچ سکتے۔ موسیٰ علیہ السلام کے واقعہ میں غور کرنے سے یہ بات سمجھ میں آجائے گی۔ جب ایک جلیل القدر پیغمبر کی نظر بعض معمولی واقعات کی تہ تک نہیں پہنچ سکی قوموں کی تباہی کا معاملہ تو نہایت اہم معاملہ ہے۔ اس کے اسرار اور حکمتوں کو، اور اس کی مقررہ مدت کے رموز اور مصلحتوں کو اللہ تعالیٰ کے سوا کون جان سکتا ہے؟

۲ — اور مشرکین کے تعلق سے مقصد یہ ہے کہ ان کو جو غریبوں کے ساتھ شریک تعلیم ہونے سے عار آتی ہے: وہ موسیٰ علیہ السلام کے اس واقعہ میں غور کریں۔ انھوں نے اپنے چھوٹے کو بھی بعض خاص علوم میں استاذ بنانے سے عار نہیں کیا۔

۳ — اور یہود کے تعلق سے، جنھوں نے امتحانی سوالات دیئے تھے، مقصد یہ ہے کہ وہ جو خود کو بڑا عالم سمجھتے ہیں، اور اپنی کتابوں کو تمام علوم کا جامع خیال کرتے ہیں: وہ جان لیں کہ یہ ان کا زعم باطل ہے۔ خود موسیٰ علیہ السلام کے

(۱) اَحَاطَ بِهٖ: گھیرنا أَحَاطَ بِهٖ عِلْمًا: پوری طرح سے جان لینا، واقف ہوجانا اور خُبْرًا یا تو تمیز ہے یا مفعول مطلق ہے کیونکہ یہ فعل کے ہم معنی ہیں (۲) اَحْدَثَ اِحْدَاثًا: پیدا کرنا، نکالنا کسی چیز کو نئے سرے سے شروع کرنا۔

زمانہ میں ان سے بڑے عالم موجود تھے، جن سے استفادہ کے لئے آپؑ نے سفر کیا۔

۴ — اور آنے والے واقعہ کے تعلق سے مقصد یہ ہے کہ ذوالقرنین کا سفر حکومت و دولت حاصل کرنے کے لئے تھا، جس کی کچھ اہمیت نہیں۔ قابل لحاظ موسیٰ علیہ السلام کا سفر ہے، جو تحصیلِ علم کے لئے تھا۔ پس یہود کو چاہئے تھا کہ وہ امتحان کے لئے یہ واقعہ پوچھتے نہ کہ وہ!

واقعہ کی ابتداء: متفق علیہ حدیث ہے۔ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ ایک مرتبہ حضرت موسیٰ علیہ السلام نے اپنی قوم میں مؤثر وعظ کہا۔ جس سے آنکھیں نم ہو گئیں۔ اور دل پگھل گئے۔ لوگوں نے پوچھا: اس وقت سب سے بڑا عالم کون ہے؟ آپ نے فرمایا: میں! اللہ تعالیٰ کو یہ جواب ناپسند آیا۔ حکم آیا کہ میرا ایک بندہ دو دریاؤں کے سنگم پر ہے، وہ آپ سے زیادہ علم رکھتا ہے۔ موسیٰ علیہ السلام نے عرض کیا: خدایا! مجھے اس کا پتہ نشان بتا دیا جائے۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ایک مچھلی لے لو، دو دریاؤں کے سنگم پر جہاں مچھلی گم ہو جائے، وہاں وہ بندہ ملے گا۔ چنانچہ موسیٰ علیہ السلام نے مچھلی لیکر سفر شروع کیا —— اور جب موسیٰ نے اپنے خادم (یوشع بن نون) سے کہا: ''میں برابر چلتا رہونگا، یہاں تک کہ دو دریاؤں کے سنگم پر پہنچ جاؤں، یا ایک عمر بیت جائے!'' —— یعنی منزل پر پہنچ کر ہی دم لونگا، یا صدیاں چلتا رہونگا، ہمت نہ ہارونگا۔ یا تن رسد بجاناں، یا جاں زتن برآید! —— یہ ہے علم کی سچی طلب! علم کا ایسا متوالا ضرور کامیاب ہوتا ہے۔ طالب علموں کے لئے اس ارشاد میں بڑا سبق ہے۔

مجمع البحرین (دو دریاؤں کے سنگم) کی تعیین مشکل ہے۔ اگر یہ واقعہ قیام مصر کے زمانہ میں پیش آیا ہے تو سوڈان میں خرطوم شہر کے پاس جہاں دریائے نیل کی دو شاخیں ملتی ہیں: وہ جگہ مراد ہے۔ مگر جمہور مفسرین کا خیال یہ ہے کہ یہ واقعہ وادئ سینا کی اسارت کے زمانہ کا ہے، پس بحر قلزم کی دو شاخیں: خلیج عقبہ اور خلیج سویز جہاں ملتی ہیں: وہ جگہ مراد ہے۔

پھر جب وہ دونوں دو دریاؤں کے سنگم پر پہنچے تو دونوں اپنی مچھلی بھول گئے۔ پس اس نے دریا میں سرنگ نما راہ بنالی —— یعنی دونوں منزل بہ منزل بڑھتے رہے، یہاں تک کہ دریاؤں کے سنگم پر پہنچ گئے۔ اور ایک پتھر پر سر رکھ کر سو گئے۔ اور ستا کر آگے کی راہ لی۔ اور مچھلی والا تھیلا دونوں وہی بھول گئے۔ یہ مچھلی کھانے کے لئے نہیں تھی، بطور علامت تھی کہ جہاں وہ گم ہو جائے وہیں وہ بندۂ خدا ملے گا —— ان حضرات کے روانہ ہونے کے بعد مچھلی زندہ ہو کر سمندر میں چلی گئی، اور جس راستہ سے گئی تھی، وہاں سرنگ نما سوراخ بن گیا۔ ''پس'' کا یہی مطلب ہے کہ ان کے بھول کر روانہ ہونے کے بعد مچھلی دریا میں چلی گئی، اور یہ چلا جانا: گم ہونا تھا، جس کو علامت مقرر کیا گیا تھا —— پھر جب دونوں آگے بڑھے تو موسیٰ نے اپنے خادم سے کہا: ''ہمارا ناشتہ لاؤ، آج کے سفر میں تو ہم تھک گئے!'' —— رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

''موسیٰ علیہ السلام کو اس وقت تکان محسوس ہوا جب وہ منزلِ مقصود سے آگے بڑھے'' یعنی بامقصد محنت سے آدمی نہیں تھکتا، بے مقصد محنت تھکا دیتی ہے ـــــــ رہی یہ بات کہ موسیٰ علیہ السلام کو تو پتہ ہی نہیں کہ ہم منزلِ مقصود سے آگے جارہے ہیں۔ پھر ان کو تکان کیوں محسوس ہوا؟ اس کا جواب یہ ہے کہ نفس الامری بات کا قلب نبوت پر انعکاس ہوا، جس سے طبیعت متأثر ہوئی۔ جیسے رسول اللہ ﷺ ایک مرتبہ جہری نماز پڑھا رہے تھے، پیچھے کسی نے سراً پڑھا۔ نماز کے بعد آپؐ نے پوچھا: کیا کسی نے میرے پیچھے پڑھا؟ ایک شخص نے کہا: جی ہاں! آپؐ نے فرمایا: ''میں سوچ رہا تھا: قرآن پڑھنے میں مجھ سے جھگڑا کیوں کیا جارہا ہے''! یعنی امر منکر کا قلب نبوت پر اثر پڑا، اور آپ کے لئے قراءت دشوار ہوگئی۔

مسئلہ: ارشادِ موسیٰ: ''آج ہم تھک گئے!'' سے یہ مسئلہ نکلتا ہے کہ اپنی تکلیفوں کا اظہار جائز ہے، کمال کے منافی نہیں۔ البتہ بے صبری اور شکوہ شکایت ممنوع ہے (جصاص)

اور موسیٰ علیہ السلام کے ناشتہ طلب کرنے سے معلوم ہوا کہ نبی بھوکے ہوتے ہیں، وہ زادراہ بھی ساتھ رکھتے ہیں، اور تکان بھی محسوس کرتے ہیں۔ ان میں سے کوئی بات نہ ولایت کے منافی ہے نہ نبوت کے۔ پس جو خوش عقیدہ لوگ بزرگوں کی جانب بھوک پیاس اور بشری ضرورتوں کا انتساب بے ادبی تصور کرتے ہیں: وہ صحیح عقیدہ کے لوگ نہیں۔

القصہ: جب موسیٰ علیہ السلام نے ناشتہ مانگا، تو ـــــــ خادم نے کہا: ارے! ہم جب اس چٹان کے پاس ٹھہرے تھے تو میں اس مچھلی کو بھول گیا ـــــــ یہ حسنِ ادب ہے کہ بھولنے کو اپنی طرف منسوب کیا، مخدوم کو اس میں شامل نہ کیا، ویسے سامان کا ذمہ دار بھی خادم ہی ہوتا ہے۔ اگرچہ اس میں مخدوم کی بھی کچھ نہ کچھ ذمہ داری ہوتی ہے، چنانچہ پہلے فرمایا ہے کہ دونوں اپنی مچھلی بھول گئے ـــــــ اور شیطان ہی نے مجھے بھلا دیا کہ میں اس کو یاد کروں ـــــــ یعنی میں غفلت کی وجہ سے نہیں بھولا، بلکہ کم بخت شیطان نے بھلا دیا، اور ایسا بھولا دیا کہ اس پورے وقت میں اس کا خیال ہی نہ آیا ـــــــ اور اس مچھلی نے عجیب طریقہ سے دریا میں اپنی راہ بنالی ـــــــ یہ اللہ پاک کا ارشاد ہے یعنی اب مچھلی تھیلے میں نہیں رہی تھی، سمندر میں جاچکی تھی۔ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ''وہ مچھلی کے لئے سَرَب یعنی سرنگ بناتے ہوئے جاتا تھا، اور موسیٰ علیہ السلام اور ان کے خادم کے لئے عَجَب یعنی حیرت انگیز تھا'' یعنی پہلی تعبیر نفس الامر کے اعتبار سے ہے، اور یہ دوسری ناظر کے اعتبار سے ـــــــ موسیٰ نے کہا: اسی جگہ کی ہمیں تلاش تھی ـــــــ وہی مقام ہماری منزل تھا، ہمیں وہیں رک جانا تھا ـــــــ پس دونوں اپنے قدموں کے نشان دیکھتے ہوئے واپس لوٹے، پس ان دونوں نے ہمارے بندوں میں سے ایک بندے کو پایا، جس کو ہم نے اپنی رحمت سے نوازا تھا، اور جس کو ہم نے خاص اپنے پاس سے علم دیا تھا ـــــــ احادیث میں اس بندہ کا نام خضر (سبزہ زار) آیا ہے۔ اور یہ وجہ بھی بیان کی گئی ہے کہ وہ ایک مرتبہ سفید سوکھی

زمین پر بیٹھے تو وہ یکا یک سبز زار ہو کر لہلہانے لگی (رواہ البخاری والترمذی) —— اللہ تعالیٰ نے حضرت خضر علیہ السلام کو رحمتِ خاصہ سے نوازا تھا، اور اسرار کونیہ کا علم عطا فرمایا تھا۔ اور اس میں اختلاف ہے کہ آپ انسان تھے یا کوئی فرشتہ؟ پھر انسان تھے تو ولی تھے یا نبی؟ اور کیا وہ اب بھی حیات ہیں یا وفات پا چکے ہیں؟ نصوص میں اس سلسلہ میں کوئی صراحت نہیں۔ اور علماء و مفسرین کی آراء مختلف ہیں۔ قرینِ قیاس یہ ہے کہ آپ انسان نہیں خاص قسم کے فرشتے تھے، جن کو رجال الغیب کہا جاتا ہے۔ یہ رجال اس لئے کہ عناصر سے پیدا شدہ ہوتے ہیں، نورِ محض سے پیدا نہیں ہوتے۔ اور غیب اس لئے کہ عام طور پر نظر نہیں آتے، کیونکہ وہ لطیف مادّہ سے پیدا کئے گئے ہیں۔

القصہ —— موسیٰ نے اس بندے سے کہا: "کیا میں آپ کے ساتھ رہ سکتا ہوں، اس مقصد کے لئے آپ مجھے اس رشد و ہدایت (علم دین) کی تعلیم دیں، جس کی آپ کو تعلیم دی گئی ہے؟" —— سبحان اللہ! کس قدر تواضع اور ادب سے گفتگو فرما رہے ہیں —— اس بندے نے جواب دیا: "آپ میرے ساتھ ہرگز صبر نہیں کر سکیں گے!" —— یعنی میرے بعض کام ظاہر شریعت کے خلاف ہونگے، آپ ضرور ان پر نکیر کریں گے —— اور ایسی باتوں پر آپ کیسے صبر کر سکتے ہیں جن کی حقیقت سے آپ پوری طرح واقف نہیں؟ —— یعنی حضرت خضر علیہ السلام نے حضرت موسیٰ علیہ السلام کی طرف سے عذر بھی خود ہی بیان کر دیا کہ جب آپ کو میرے کاموں کا منشا معلوم نہیں ہوگا تو آپ نکیر کریں گے ہی! —— موسیٰ نے کہا: "اگر اللہ نے چاہا تو آپ مجھے صابر پائیں گے، اور میں آپ کے کسی حکم کی خلاف ورزی نہ کرونگا —— موسیٰ علیہ السلام کو وعدہ کرتے وقت خیال بھی نہیں تھا کہ یہ مقبول بندہ کوئی ایسا کام بھی کرے گا، جس پر نکیر ضروری ہو جائے گی —— اس بندے نے کہا: "اگر آپ میرے ساتھ چلتے ہیں، تو آپ مجھ سے کوئی بات نہ پوچھیں، تا آنکہ میں خود ہی آپ کے سامنے اس کا تذکرہ چھیڑوں —— یعنی اجازت ہے، چلئے، مگر میری یہ بات سن لیں کہ اگر کوئی بات بظاہر نامناسب نظر آئے، تو فوراً نکیر نہ کریں۔ کسی مناسب وقت پر میں خود ہی اپنے کئے ہوئے کام کی حقیقت واضح کر دونگا (باقی)

طالب علم کے لئے استاذ کی اطاعت اور فروتنی ضروری ہے۔ اس کے بغیر علم حاصل نہیں ہوتا

فَانْطَلَقَا ۗ حَتّٰىٓ اِذَا رَكِبَا فِي السَّفِيْنَةِ خَرَقَهَا ۭ قَالَ اَخَرَقْتَهَا لِتُغْرِقَ اَهْلَهَا ۚ لَقَدْ جِئْتَ شَيْـــًٔا اِمْرًا ﴿٧١﴾ قَالَ اَلَمْ اَقُلْ اِنَّكَ لَنْ تَسْتَطِيْعَ مَعِيَ صَبْرًا ﴿٧٢﴾ قَالَ لَا تُؤَاخِذْنِيْ بِمَا نَسِيْتُ وَلَا تُرْهِقْنِيْ مِنْ اَمْرِيْ عُسْرًا ﴿٧٣﴾ فَانْطَلَقَا ۗ

حَتّٰٓى اِذَا لَقِيَا غُلٰمًا فَقَتَلَهٗ ۙ قَالَ اَقَتَلْتَ نَفْسًا زَكِيَّةًۢ بِغَيْرِ نَفْسٍ ۭ لَقَدْ جِئْتَ شَيْــــًٔا نُّكْرًا ﴿۷۴﴾ قَالَ اَلَمْ اَقُلْ لَّكَ اِنَّكَ لَنْ تَسْتَطِيْعَ مَعِيَ صَبْرًا ﴿۷۵﴾ قَالَ اِنْ سَاَلْتُكَ عَنْ شَيْءٍۢ بَعْدَهَا فَلَا تُصٰحِبْنِيْ ۚ قَدْ بَلَغْتَ مِنْ لَّدُنِّيْ عُذْرًا ﴿۷۶﴾ فَانْطَلَقَا ۪ حَتّٰٓى اِذَآ اَتَيَآ اَهْلَ قَرْيَةِۨ اسْتَطْعَمَآ اَهْلَهَا فَاَبَوْا اَنْ يُّضَيِّفُوْهُمَا فَوَجَدَا فِيْهَا جِدَارًا يُّرِيْدُ اَنْ يَّنْقَضَّ فَاَقَامَهٗ ۭ قَالَ لَوْ شِئْتَ لَتَّخَذْتَ عَلَيْهِ اَجْرًا ﴿۷۷﴾ قَالَ هٰذَا فِرَاقُ بَيْنِيْ وَبَيْنِكَ ۚ سَاُنَبِّئُكَ بِتَاْوِيْلِ مَا لَمْ تَسْتَطِعْ عَّلَيْهِ صَبْرًا ﴿۷۸﴾

فَانْطَلَقَا ۪	پس دونوں چلے	اَلَمْ اَقُلْ (۲)	کیا نہیں کہا تھا میں نے	لَقِيَا	ملے وہ دونوں
حَتّٰٓى اِذَا	یہاں تک کہ جب	اِنَّكَ	بیشک آپ	غُلٰمًا	ایک لڑکے سے
رَكِبَا	سوار ہوئے دونوں	لَنْ تَسْتَطِيْعَ	ہرگز طاقت نہیں رکھتے	فَقَتَلَهٗ	تو مار ڈالا اس بندے
فِي السَّفِيْنَةِ	ایک کشتی میں	مَعِيَ	میرے ساتھ		نے اس کو
خَرَقَهَا	(تو) پھاڑ ڈالا اس	صَبْرًا	صبر کی	قَالَ	کہا موسیٰ نے
	بندے نے کشتی کو	قَالَ	کہا موسیٰ نے	اَقَتَلْتَ	کیا مار ڈالا آپ نے
قَالَ	کہا موسیٰ نے	لَا تُؤَاخِذْنِيْ	نہ گرفت کیجئے میری	نَفْسًا زَكِيَّةً	ایک ستھری جان کو
اَخَرَقْتَهَا	کیا پھاڑ ڈالا آپ نے اسکو	بِمَا نَسِيْتُ (۳)	میرے بھولنے پر	بِغَيْرِ نَفْسٍ	بغیر کسی جان کے
لِتُغْرِقَ	تاکہ ڈبودیں آپ	وَلَا تُرْهِقْنِيْ (۴)	اور نہ ڈالئے مجھ پر	لَقَدْ جِئْتَ	البتہ تحقیق کی آپ نے
اَهْلَهَا	اس کے لوگوں کو	مِنْ اَمْرِيْ	میرے معاملہ میں	شَيْئًا نُّكْرًا (۵)	نہایت نامعقول بات
لَقَدْ جِئْتَ	البتہ تحقیق کی آپ نے	عُسْرًا	تنگی	قَالَ	کہا اس بندے نے
شَيْئًا اِمْرًا (۱)	بڑی بری بات کو	فَانْطَلَقَا ۪	پھر چلے دونوں	اَلَمْ اَقُلْ	کیا نہیں کہا تھا میں نے
قَالَ	کہا اس بندے نے	حَتّٰٓى اِذَا	یہاں تک کہ جب	لَّكَ	آپ سے

(۱) اِمْرٌ: عجیب بات، خلاف شرع اور خلاف عقل سلیم بات (۲) یہاں پہلی جگہ لَكَ نہیں ہے کیونکہ ابھی ناراضگی ہلکی ہے (۳) مَا مصدریہ ہے اور جار مجرور لَاتُؤَاخِذْنِيْ سے متعلق ہیں (۴) اَرْهَقَهٗ عُسْرًا: تکلیف دینا، سختی ڈالنا کہا جاتا ہے: لَاتُرْهِقْنِيْ لَاأَرْهَقَكَ اللّٰهُ: تو میرے اوپر سختی نہ ڈال، اللہ تیرے اوپر سختی نہ ڈالے (۵) النُّكْرُ (مصدر) برا کام، بہت برا کام نَكِرَ (س) نَكْرًا وَنُكْرًا الأمرَ: ناواقف ہونا۔ نَكِرَ الرَّجُلَ: نہ پہچاننا۔

اِنَّكَ	بیشک آپ	اَتَیَآ	پہنچے دونوں	لَوْ شِئْتَ	اگر چاہتے آپ
لَنْ تَسْتَطِیْعَ	ہرگز طاقت نہیں رکھتے	اَهْلَ قَرْیَةِ	ایک گاؤں والوں کے پاس	لَتَّخَذْتَ (۴)	تو لیتے آپ
مَعِیَ	میرے ساتھ	اسْتَطْعَمَآ	(تو) کھانا مانگا دونوں نے	عَلَیْهِ	اس کام پر
صَبْرًا	صبر کی	اَهْلَهَا	گاؤں والوں سے	اَجْرًا	اجرت
قَالَ	کہا موسیٰ نے	فَاَبَوْا	پس انکار کیا انھوں نے	قَالَ	کہا اس بندے نے
اِنْ سَاَلْتُكَ	اگر پوچھوں میں آپ سے	اَنْ یُّضَیِّفُوْهُمَا (۲)	ان دونوں کی مہمانی	هٰذَا فِرَاقُ	یہ جدائی ہے
عَنْ شَیْءٍ	کوئی بات		کرنے سے	بَیْنِیْ وَ بَیْنِكَ	میرے اور آپ کے
بَعْدَهَا	اس کے بعد	فَوَجَدَا	پس پائی دونوں نے		درمیان
فَلَا تُصٰحِبْنِیْ (۱)	تو ساتھ نہ رکھیں آپ مجھے	فِیْهَا	گاؤں میں	سَاُنَبِّئُكَ	اب بتلائے دیتا ہوں
قَدْ بَلَغْتَ	تحقیق پہنچے آپ	جِدَارًا	ایک دیوار		میں آپ کو
مِنْ لَّدُنِّیْ	میری جانب سے	یُّرِیْدُ	(جو) چاہتی تھی	بِتَاْوِیْلِ	حقیقت
عُذْرًا	عذر کو	اَنْ یَّنْقَضَّ (۳)	ڈھ پڑنا	مَا لَمْ	اس کی کہ نہ
فَانْطَلَقَا	پھر چلے دونوں	فَاَقَامَهٗ	پس سیدھا کر دیا اس	تَسْتَطِعْ	طاقت رکھی آپ نے
حَتّٰی	یہاں تک کہ		بندے نے اس کو	عَّلَیْهِ صَبْرًا	اس پر صبر کی
اِذَآ	جب	قَالَ	کہا موسیٰ نے	❁	❁

القصہ: ــــــ پھر دونوں چلے ــــــ یعنی باہم قول وقرار کر کے دونوں دریا کے کنارے کنارے روانہ ہوئے ــــــ اب خادم کا تذکرہ نہیں ہے۔ ممکن ہے موسیٰ علیہ السلام نے حضرت خضر علیہ السلام سے ملاقات کے بعد خادم کو واپس بھیج دیا ہو اور اس کا بھی امکان ہے کہ مجمع البحرین پر ٹھہرا دیا ہو، تا کہ واپسی میں ساتھ لے لیں اور یہ بھی ممکن ہے کہ وہ ساتھ ہو مگر تابع ہونے کی وجہ سے اس کا تذکرہ نہ کیا گیا ہو۔ مفسرین کرام عام طور پر یہ تیسرا احتمال لیتے ہیں۔

آگے کوئی ایسا مقام آیا جس سے آگے جانے کے لئے کشتی درکار تھی۔ چنانچہ دونوں حضرات کشتی میں سوار ہوئے۔

(۱) لَاتُصَاحِبْ (فعل نہی) از باب مفاعلہ مُصَاحَبَة کے معنی ہیں ایک ساتھ زندگی بسر کرنا، کسی کو ساتھ رکھنا (۲) ضَیَّفَهٗ: مہمان بنانا۔ مہمان کا کھانا پیش کرنا (باب تفعیل) (۳) اِنقَضَّ اِنْقِضَاضًا (باب اِفعِلاّل) گر پڑنا، ٹوٹ پڑنا (۴) بصریوں کے نزدیک اِتَّخَذْتَ (افتعال) تَخِذَهٗ (س) تَخْذًا سے بنا ہے جس کے معنی ہیں لینا۔ اور دوسرے حضرات کے نزدیک اَخَذَ سے بنا ہے اس کے معنی بھی ہیں لینا اور لَتَّخَذْتَ کے شروع میں دونوں قولوں میں ہمزہ رسم الخط میں چھوڑ دیا گیا ہے کیونکہ وہ پڑھا نہیں جاتا ۱۲

یہاں سوال پیدا ہوتا ہے کہ اگر حضرت خضر زمینی فرشتے تھے تو ان کو دریا پار کرنے کے لئے کشتی کی کیا ضرورت ہے؟ جواب یہ ہے کہ ساتھی کی رعایت ملحوظ ہے، اور کشتی سے متعلق بھی ایک امر خداوندی کی تعمیل کرنی ہے ـــــ یہاں تک کہ جب دونوں ایک کشتی میں سوار ہوئے تو اس بندے نے کشتی کو پھاڑ ڈالا ـــــ جس طرح کرتا پھاڑ دیا جاتا ہے تو عیب دار ہو جاتا ہے، اسی طرح اس بندۂ خدا نے کشتی کسی نمایاں جگہ سے پھاڑ دی تا کہ عیب دار معلوم ہو، اور پھاڑی ایسی جگہ سے کہ عیب تو خوب نظر آئے مگر پانی اس میں داخل نہ ہو۔ دیکھنے والا بس یہ سمجھے کہ کشتی نہیں کباڑ ہے ـــــ موسیٰ نے کہا: کیا آپ نے اس کو پھاڑ ڈالا تا کہ کشتی والوں کو ڈبو دیں آپ نے یقیناً بڑی بھاری حرکت کر ڈالی! ـــــ اس ارشاد سے اندازہ ہوتا ہے کہ حضرت خضر علیہ السلام نے کشتی اترتے وقت پھاڑی تھی، چنانچہ موسیٰ علیہ السلام نے کشتی والوں کے ڈوب جانے کا اندیشہ ظاہر کیا، اپنا کوئی تذکرہ نہیں کیا ـــــ یعنی جب کشتی آگے روانہ ہوگی اور دریا میں موجیں اٹھیں گی تو پانی کشتی میں داخل ہوگا، پس یہ عمل نہ شرعاً روا ہے نہ اخلاقاً۔ آپ نے یہ بہت ہی معیوب کام کیا ـــــ اس بندے نے کہا: کیا میں نے کہا نہیں تھا کہ آپ میرے ساتھ ہرگز صبر نہیں کر سکیں گے ـــــ سو دیکھئے وہی بات سامنے آئی ـــــ موسیٰ نے کہا: بھول چوک پر آپ میری گرفت نہ فرمائیں اور آپ مجھ پر میرے معاملہ میں تنگی نہ ڈالیں ـــــ یعنی مجھ سے بھول ہوگئی۔ بھول پر آپ گرفت نہ کریں ـــــ یہاں سے یہ بات ثابت ہوئی کہ انبیائے کرام سے بھی بھول ہوتی ہے۔ سورۂ طٰہ آیت ۱۵۵ میں آدم علیہ السلام کے بھولنے کی صراحت ہے۔ اور حدیث شریف میں ہے کہ ایک بار آپ ﷺ نے ظہر کی یا عصر کی پانچ رکعتیں پڑھا دیں اور آخر میں سجدۂ سہو کیا اور نماز کے بعد ارشاد فرمایا کہ: ''میں ایک انسان ہوں جس طرح آپ لوگوں کو یاد رہتا ہے مجھے بھی یاد رہتا ہے اور جس طرح آپ لوگوں کو بھول پڑتی ہے مجھے بھی بھول پڑتی ہے'' (مسند احمد ۱: ۴۲۰) الغرض بھول ہو جانا کمال نبوت کے منافی ہے نہ کار نبوت کے۔ حضرت خضر علیہ السلام نے موسیٰ علیہ السلام کا عذر قبول کر لیا ـــــ پھر دونوں چلے ـــــ یعنی کشتی سے اتر کر خشکی کی راہ لی ـــــ یہاں تک کہ جب دونوں ایک لڑکے سے ملے تو اس بندے نے اس لڑکے کو مار ڈالا ـــــ ایک گاؤں کے قریب چند لڑکے کھیل رہے تھے ان میں سے ایک کو جو زیادہ خوبصورت اور سیانا تھا پکڑ کر مار ڈالا۔ کس طرح مارا؟ اس کی تفصیل مروی نہیں کوئی کہتا ہے کہ سر اکھاڑ دیا، کوئی لکھتا ہے کہ پتھر سے سر ٹکرا دیا۔ غرض لڑکے کی موت کا کوئی ظاہری سبب بھی بنا جسے عام لوگوں نے دیکھا اور در پردہ حضرت خضر علیہ السلام کا ہاتھ تھا، جسے موسیٰ علیہ السلام نے دیکھا ـــــ موسیٰ نے کہا: کیا آپ نے ایک بے گناہ کی جان لے لی، جس نے کسی کا خون نہیں کیا! بخدا! آپ نے بہت ہی برا کام کیا! ـــــ یعنی آپ کی پہلی حرکت ہی کیا اچھی تھی مگر اس بار تو آپ نے

غضب ہی کر دیا۔ کشتی کے نقصان کا تدارک تو ممکن ہے، مگر یہ تو جان کا معاملہ ہے اس کی تلافی کی تو کوئی صورت نہیں
—— اس بندے نے کہا: کیا میں نے آپ سے کہا نہیں تھا کہ آپ میرے ساتھ ہرگز صبر نہیں کر سکتے! —— اس مرتبہ خفگی بڑھ گئی ہے اس لئے لَكَ بڑھایا ہے۔ موسیٰ علیہ السلام نے بھی اس بار بھول کر نہیں ٹوکا تھا بلکہ عمداً نکیر کی تھی۔ کیونکہ احکام شریعت کی خلاف ورزی پر تحمل جب عام صالحین سے نہیں ہوسکتا تو موسیٰ علیہ السلام تو پیغمبر تھے، ان کا کام ہی ہر قسم کی بدی کو روکنا اور نیکی کو پھیلانا تھا وہ بھلا ایک اس امر منکر پر خاموش کیسے رہ سکتے تھے! —— موسیٰ نے کہا: اس کے بعد اگر میں آپ سے کچھ پوچھوں تو آپ مجھے اپنے ساتھ نہ رکھیں، یقیناً آپ نے میرے لئے کوئی عذر باقی نہ چھوڑا —— یعنی آپ اس حد کو پہنچ جائیں گے کہ مجھے اپنے سے جدا کرنے میں حق بجانب ہونگے —— پھر دونوں چلے، یہاں تک کہ جب وہ ایک بستی والوں کے پاس پہنچے تو دونوں نے گاؤں والوں سے کھانا مانگا۔ پس گاؤں کے لوگوں نے دونوں کی ضیافت کرنے سے انکار کر دیا —— یعنی ایک بستی میں پہنچ کر وہاں کے لوگوں سے ملے اور چاہا کہ بستی والے مہمان بنا کر کھانا کھلائیں۔ قدیم زمانہ میں جبکہ سراؤں کا رواج نہ تھا، نہ ہوٹلوں اور کھانے پینے کی دوکانوں کا سلسلہ تھا تو مسافر اپنا حق سمجھتے تھے کہ بستی والوں سے کھانا پانی طلب کریں۔ اور بستی والے بھی ان کی مہمانداری اپنا فرض سمجھتے تھے اور بڑی خوش دلی سے یہ فریضہ انجام دیتے تھے۔ مگر اس گاؤں کے لوگوں کی قسمت میں یہ سعادت نہیں تھی۔ انھوں نے موسیٰ وخضر جیسے مقربین کی مہمانی سے انکار کر دیا —— یہاں پھر ایک بار سوال پیدا ہوتا ہے کہ اگر حضرت خضر فرشتے تھے تو ان کو کھانے کی کیا ضرورت تھی؟ جواب یہ ہے کہ ساتھی کی موافقت مقصود ہے۔ پھر جب کھانا مل جائے گا تو کھانے والا کھالے گا اور دوسرا کوئی عذر کر دے گا۔ غرض آیت پاک سے حضرت خضر علیہ السلام کا کھانا مانگنا ثابت ہوتا ہے اور اتنی بات ان کے فرشتہ ہونے کے منافی نہیں۔ کھانا کھانا ثابت نہیں جو فرشتہ ہونے کے منافی ہو۔ واللہ اعلم —— پھر انھوں نے گاؤں میں ایک دیوار دیکھی جو گرنا چاہتی تھی پس اس بندے نے اس دیوار کو سیدھا کر دیا —— یعنی گاؤں والوں کا برتاؤ دیکھ کر چاہئے تو یہ تھا کہ ایسے تنگ دل اور بے مروت لوگوں پر غصہ آتا مگر حضرت خضر علیہ السلام نے غصہ کے بجائے ان پر احسان کیا، بستی میں ایک بڑی بھاری دیوار جھکی ہوئی تھی۔ قریب تھا کہ زمین بوس ہو جائے، لوگ اس کے نیچے سے گذرتے ہوئے خوف کھاتے تھے، حضرت خضر نے ہاتھ لگا کر اس کو سیدھا کر دیا —— موسیٰ نے کہا اگر آپ چاہتے تو اس کام کی اجرت لیتے —— یعنی بستی والوں نے مسافر کا حق نہ سمجھا پھر ان کی دیوار مفت میں بنا دینے کی کیا ضرورت تھی؟! اگر کچھ معاوضہ لے کر دیوار سیدھی کرتے تو ہمارا ابھی کام بن جاتا اور ان تنگ دل بخیلوں کو بھی تنبیہ ہوتی —— اس بندے نے کہا: بس میرا آپ کا

ساتھ ختم ہوا اب میں آپ کو ان باتوں کی حقیقت بتاتا ہوں جن پر آپ صبر نہیں کر سکے ـــــ یعنی حسب وعدہ اب آپ مجھ سے علیحدہ ہو جائیں۔ آپ کا نباہ میرے ساتھ نہیں ہوسکتا۔ لیکن جدا ہونے سے پہلے چاہتا ہوں کہ ان واقعات کے پوشیدہ اسرار کھول دوں، جن کو دیکھ کر آپ صبر وضبط نہ کر سکے۔

أَمَّا السَّفِينَةُ فَكَانَتْ لِمَسَاكِينَ يَعْمَلُونَ فِي الْبَحْرِ فَأَرَدْتُ أَنْ أَعِيبَهَا وَكَانَ وَرَاءَهُمْ مَلِكٌ يَأْخُذُ كُلَّ سَفِينَةٍ غَصْبًا ﴿٧٩﴾ وَأَمَّا الْغُلَامُ فَكَانَ أَبَوَاهُ مُؤْمِنَيْنِ فَخَشِينَا أَنْ يُرْهِقَهُمَا طُغْيَانًا وَكُفْرًا ﴿٨٠﴾ فَأَرَدْنَا أَنْ يُبْدِلَهُمَا رَبُّهُمَا خَيْرًا مِنْهُ زَكَاةً وَأَقْرَبَ رُحْمًا ﴿٨١﴾ وَأَمَّا الْجِدَارُ فَكَانَ لِغُلَامَيْنِ يَتِيمَيْنِ فِي الْمَدِينَةِ وَكَانَ تَحْتَهُ كَنْزٌ لَهُمَا وَكَانَ أَبُوهُمَا صَالِحًا فَأَرَادَ رَبُّكَ أَنْ يَبْلُغَا أَشُدَّهُمَا وَيَسْتَخْرِجَا كَنْزَهُمَا رَحْمَةً مِنْ رَبِّكَ وَمَا فَعَلْتُهُ عَنْ أَمْرِي ذَٰلِكَ تَأْوِيلُ مَا لَمْ تَسْطِعْ عَلَيْهِ صَبْرًا ﴿٨٢﴾

ع ۱۲ / ۱۰

أَمَّا السَّفِينَةُ	رہی کشتی	مَلِكٌ	ایک بادشاہ	طُغْيَانًا	سرکشی سے
فَكَانَتْ	تو تھی وہ	يَأْخُذُ	(جو) لے لیتا تھا	وَكُفْرًا	اور کفر سے
لِمَسَاكِينَ	چند ایسے غریب لوگوں کی	كُلَّ سَفِينَةٍ	ہر کشتی کو	فَأَرَدْنَا	پس چاہا اس نے
يَعْمَلُونَ	جو کام کرتے تھے	غَصْبًا	چھین کر	أَنْ يُبْدِلَهُمَا	کہ بدل دے ان کو
فِي الْبَحْرِ	دریا میں	وَأَمَّا الْغُلَامُ	اور رہا لڑکا	رَبُّهُمَا	ان کا پروردگار
فَأَرَدْتُ	پس چاہا میں نے	فَكَانَ	تو تھے	خَيْرًا	بہتر
أَنْ أَعِيبَهَا	کہ عیب دار کردوں	أَبَوَاهُ	اس کے ماں باپ	مِنْهُ	اس سے
	میں اس کو	مُؤْمِنَيْنِ	ایمان دار	زَكَاةً	پاکیزگی کے اعتبار سے
وَكَانَ	اور تھا	فَخَشِينَا	پس ڈرے ہم	وَأَقْرَبَ	اور قریب تر
وَرَاءَهُمْ (۱)	ان کے آگے	أَنْ يُرْهِقَهُمَا	کہ چھا جائے وہ دونوں پر	رُحْمًا (۲)	شفقت کے اعتبار سے

(۱) وَرَاءَ کے معنی آگے، پیچھے دونوں آتے ہیں اصل میں مصدر ہے اور اس کے معنی ہیں آڑ، حد فاصل (۲) رُحْمٌ (مصدر) شفقت، مہربانی رَحِمَهُ (س) رَحْمَةً وَرُحْمًا: مہربان ہونا، شفقت کرنا۔

وَاَمَّا الْجِدَارُ	اور رہی دیوار	وَكَانَ اَبُوْهُمَا	اور تھا ان کا باپ	رَحْمَةً (۱)	مہربانی سے
فَكَانَ	تو تھی وہ	صَالِحًا	نیک آدمی	مِّنْ رَّبِّكَ	تیرے رب کی
لِغُلٰمَيْنِ يَتِيْمَيْنِ	دو یتیم بچوں کی	فَاَرَادَ	پس چاہا	وَمَا فَعَلْتُهٗ	اور نہیں کیا میں نے اسکو
فِي الْمَدِيْنَةِ	اس شہر میں	رَبُّكَ	آپ کے رب نے	عَنْ اَمْرِيْ	اپنی طرف سے
وَكَانَ	اور تھا	اَنْ يَّبْلُغَا	کہ پہنچیں دونوں	ذٰلِكَ تَاْوِيْلُ	یہ ہے مطلب
تَحْتَهٗ	اس کے نیچے	اَشُدَّهُمَا	اپنی جوانی کو	مَا	ان باتوں کا جو
كَنْزٌ	خزانہ	وَيَسْتَخْرِجَا	اور نکالیں دونوں	لَمْ تَسْطِعْ (۲)	نہیں طاقت رکھی آپ نے
لَّهُمَا	ان دونوں کا	كَنْزَهُمَا	اپنے خزانے کو	عَّلَيْهِ صَبْرًا	اس پر صبر کرنے کی

پہلے واقعہ کی حقیقت: ——— رہی کشتی: تو وہ چند غریب آدمیوں کی تھی، جو دریا میں محنت مزدوری کرتے تھے، پس میں نے چاہا کہ اس کو عیب دار کردوں، اور ان کے آگے ایک ایسا بادشاہ تھا جو ہر کشتی کو زبردستی چھین لیتا تھا ——— یعنی وہ کشتی جدھر جارہی تھی اس طرف آگے ایک ظالم بادشاہ کی عملداری شروع ہوتی تھی جو ہر اچھی کشتی کو چھین لیتا تھا۔ اس لئے اگر میں اس کشتی میں سوراخ نہ کرتا تو وہ بادشاہ اسے بھی پکڑ لیتا اور ان غریبوں کے ہاتھ سے ذریعۂ معاش چلا جاتا۔ اب یہ لوگ اس کی مرمت تھوڑے میں کرالیں گے اور نقصان عظیم سے بچ جائیں گے۔

مسکین: اس شخص کو کہتے ہیں جس کے پاس کچھ نہ ہو اور فقیر وہ ہے جس کے پاس بقدر گذارہ نہ ہو، سورۃ البلد آیت ۱۶ میں ہے: ﴿أَوْ مِسْكِينًا ذَامَتْرَبَةٍ﴾ خاک نشیں مسکین یعنی جس کے پاس بچھونا تک نہ ہو، مٹی پر پڑتا ہو اس آیت میں کشتی والوں کو کشتی کے باوجود مسکین کہا گیا ہے یہ یا تو ترس کھاتے ہوئے کہا گیا ہے یا کشتی ان کی ملک نہ ہوگی، عاریت ہوگی یا مالک کوئی اور ہوگا اور یہ لوگ محنت مزدوری کرتے ہونگے (شامی کتاب الزکوۃ باب المصرف)

دوسرے واقعہ کی حقیقت: ——— رہا لڑکا: تو اس کے ماں باپ ایماندار تھے، پس ہمیں اندیشہ ہوا کہ وہ لڑکا ان دونوں پر سرکشی اور کفر سے چھا جائے، اس لئے ہم نے چاہا کہ اس کے پروردگار اس کے بدلے میں ان کو ایسی اولاد عطا فرمائیں جو پاکیزگی میں اس سے بہتر ہو اور شفقت میں بھی اس سے بڑھ کر ہو ——— یعنی اس لڑکے کی سرشت میں کفر وسرکشی تھی، والدین اس کے نیک اور صالح تھے، حضرت خضر علیہ السلام کو وحی سے یہ بات معلوم ہوئی کہ یہ لڑکا

(۱) رَحْمَةً یا تو يَبْلُغَا اور يَسْتَخْرِجَا کا مفعول لہ ہے یا فعل محذوف فَعَلْتُهٗ کا مفعول بہ ہے (۲) اِسْطَاعَ يَسْطِيْعُ (حذف تا کے ساتھ) ایک لغت ہے استطاع يستطيع استطاعة میں، جس کے معنی ہیں طاقت رکھنا ۱۲

بڑا ہو کر والدین کے لئے فتنہ بنے گا، والدین اپنی طبعی محبت کی وجہ سے بے دینی میں اس کا ساتھ دیں گے۔اس لئے حضرت خضر علیہ السلام نے اس لڑکے کا کام تمام کر دیا۔اور لڑکے کا مارا جانا والدین کے حق میں رحمت اور ان کے دین کی حفاظت کا ذریعہ بن گیا اور جو صدمہ ان پر پہنچا حق تعالیٰ نے اس کی تلافی ایسی اولاد سے کر دی جو پاکیزگی میں مقتول لڑکے سے بہتر تھی اور ماں باپ پر شفقت و مہربانی میں بھی بڑھ کر تھی —— کہتے ہیں کہ اس کے بعد اللہ تعالیٰ نے ان کو ایک نیک لڑکی دی جو ایک نبی سے منسوب ہوئی اور ایک نبی اس سے پیدا ہوئے، جس سے ایک امت چلی۔

یہاں دو سوال پیدا ہوتے ہیں:

ایک: یہ کہ جب اللہ تعالیٰ کے علم میں یہ بات تھی کہ وہ لڑکا بڑا ہو کر کافر ہوگا اور ماں باپ کو بھی گمراہ کرے گا تو پھر علم الٰہی کے مطابق ہونا ضروری تھا۔ کیونکہ علم الٰہی کے خلاف کوئی چیز نہیں ہوسکتی۔ پھر وہ مارا کیسے گیا؟ اور اللہ کا علم غلط کیسے ہو گیا؟

دوم: یہ کہ جب اللہ تعالیٰ کو منظور تھا کہ اس کے ماں باپ ایمان پر قائم رہیں اور اس وجہ سے حکمت مقتضی ہوئی کہ پیش آنے والی رکاوٹ دور کر دی جائے چنانچہ حضرت خضر علیہ السلام کو بھیج کر اس کو قتل کرا دیا، پس اس سے بہتر تو یہ تھا کہ اس لڑکے کو پیدا ہی نہ کرتے، یا کرتے تو اس کو اس قدر شریر نہ ہونے دیتے یا جہاں لاکھوں کافر دنیا میں موجود ہیں اس کے والدین کو بھی کافر ہو جانے دیتے؟!

پہلے سوال کا جواب: سمجھنے کے لئے پہلے تین باتیں سمجھ لیں:

① —— علم معلوم کے تابع ہوتا ہے، اس کا برعکس نہیں ہوتا۔ مثلاً کوئی شخص تاج محل دیکھے، اور ویسا ہی جانے جیسا وہ ہے، تو یہ جاننا مطابقِ واقعہ اور صحیح ہے۔ اس صورت میں تاج محل کا علم: معلوم یعنی خود تاج محل کے تابع ہوگا۔ اور اگر کوئی شخص ذہن میں خیالی تاج محل بنائے، تو آگرہ والے تاج محل کا اس کے مطابق ہونا ضروری نہیں، کیونکہ معلوم علم کے تابع نہیں ہوتا۔

② —— اللہ کے علم میں اور مخلوقات کے علم میں یہ فرق ہے کہ اللہ کا علم حضوری ہے، یعنی وہ وجودِ معلوم کا محتاج نہیں۔ ازل میں اللہ تعالیٰ ہر چیز کو جانتے ہیں۔ اور مخلوقات کا علم کسبی ہے، وہ وجودِ معلومات کا محتاج ہے یعنی کوئی شئ معلوم ہوگی تبھی اس کا علم ہوگا۔ پس تا ابد جو کچھ ہونے والا ہے: اللہ تعالیٰ کو ازل میں اس کا علم حاصل ہے۔ مگر اللہ کے جاننے سے لازم نہیں آتا کہ ویسا ہی ہو۔ یہ بات اس وقت ضروری ہوگی جب معلوم علم کے تابع ہو، جیسے ہمارے کسی بات کو جاننے سے —— مثلاً استاذ ایک طالب علم کے بارے میں جانتا ہے کہ وہ اول آئے گا یا فیل ہوگا —— ویسا

ہی ہونا ضروری نہیں۔ پس فرق اتنا ہے کہ اللہ تعالیٰ عالم الغیب والشہادہ ہیں، اور ہماری معلومات محدود ہیں۔

۳ — مسئلۂ تقدیر کا حاصل یہ ہے کہ بندے پیدا ہوکر جو اچھے برے کام کرتے ہیں: اللہ تعالیٰ ان کو ازل سے جانتے ہیں، اور جانتے ہی نہیں، سب کچھ لوح محفوظ میں لکھ بھی رکھا ہے۔ مگر اس جاننے اور لکھنے سے بھی انسان مجبور نہیں ہوتا، کیونکہ معلوم علم کے تابع نہیں ہوتا۔ بلکہ جو کچھ پیش آنے والا ہے، اور بندے اپنی مرضی سے جو اچھے برے کام کرنے والے ہیں اللہ تعالیٰ ان کو ازل سے جانتے ہیں اور ان کو لکھ بھی لیا ہے۔ کیونکہ ان کا علم حضوری ہے، وجودِ معلوم کا محتاج نہیں۔ اور اللہ تعالیٰ کا یہ جاننا مطابقِ واقعہ ہے، کیونکہ جو علم معلوم سے ماخوذ ہو وہی صحیح علم ہوتا ہے۔ پس اللہ تعالیٰ کے علم کے خلاف اس لئے نہیں ہوسکتا کہ اللہ تعالیٰ وہی جانتے ہیں جو ہونے والا ہے —— یہ مضمون یوں بھی سمجھا جاسکتا ہے کہ تقدیر کے معنی پلاننگ کے ہیں۔ اور اللہ تعالیٰ نے ازل میں کائنات کے لئے جو اندازہ مقرر کیا ہے: اس میں یہ بھی طے ہے کہ انسان جزوی اختیار رکھنے والی مخلوق ہوگی۔ پھر وہ اپنی مرضی اور اپنے جزوی اختیار سے جو کچھ کرے گی، اس کو اللہ تعالیٰ ازل سے جانتے ہیں، اور اس کو لکھ بھی لیا ہے۔

اب جواب آسانی سے سمجھ میں آجائے گا کہ اللہ تعالیٰ ازل میں صرف یہی نہیں جانتے کہ وہ لڑکا بڑا ہوکر ضرور کافر ہوگا، اور اس کے والدین اس کے فتنہ میں مبتلا ہونگے۔ بلکہ علم الٰہی میں پوری تفصیل ہے کہ اگر وہ لڑکا بڑا ہوتا تو کافر ہوتا، اور اس کے والدین کے لئے فتنہ بنتا، مگر وہ بلوغ سے پہلے بچپن ہی میں مرجائے گا یا ماردیا جائے گا، اس لئے وہ نہ کافر ہوگا، نہ اپنے والدین کے لئے فتنہ ہوگا۔

دوسرے سوال کا جواب: یہ ہے کہ تکوینیات کے بارے میں انسان کا علم نہ ہونے کے بار بر ہے۔ حضرت خضر علیہ السلام نے اس سے تو پردہ اٹھایا کہ اس لڑکے کو مار ڈالنے میں یہ حکمت تھی مگر یہ بات کوئی نہیں جانتا کہ اس کو پیدا کرنے میں کیا حکمت ہے۔ مثلاً انسان کے بدن میں کئی جگہ بال اگتے ہیں، ناخن بڑھتے ہیں۔ شریعت کا حکم یہ ہے کہ ان کو صاف کیا جائے اور یہ نظافت کا تقاضا ہے مگر سوال پیدا ہوتا ہے کہ جب ان کا کاٹنا ضروری ہے تو اللہ تعالیٰ نے ان کو پیدا ہی کیوں کیا؟ جواب یہ ہے کہ اس کی حکمت اللہ ہی بہتر جانتے ہیں۔ ہم صرف اجمالاً یہ بات جانتے ہیں کہ ان بالوں کو پیدا کرنے میں بھی کوئی نہ کوئی مصلحت ضرور ہے۔ اسی طرح اس لڑکے کو پیدا کرنے میں بھی کوئی حکمت ہے، جو ہم نہیں جانتے، اللہ تعالیٰ ہی بہتر جانتے ہیں۔ حضرت خضر نے بھی اس راز سربستہ کو نہیں کھولا اس لئے عقل انسانی کے لئے بجز اعتراف عجز و قصور کے کوئی راہ نہیں، ہمیں تو بس یہ بات یاد رکھنی چاہئے کہ دنیا میں جو چیزیں: مہلک، خراب اور بُری سمجھی جاتی ہیں ان میں بھی مجموعۂ عالم کے اعتبار سے خیر اور بے شمار فائدے ہیں۔

آخری واقعہ کی حقیقت: ــــــ اور رہی دیوار: تو وہ دو یتیم لڑکوں کی تھی، جو اس شخص میں رہتے تھے اور اس کے نیچے ان کا خزانہ مدفون تھا اور ان کا باپ نیک آدمی تھا۔ اس لئے آپ کے پروردگار نے چاہا کہ وہ دونوں جوان ہوں اور آپ کے پروردگار کی مہربانی سے اپنا خزانہ نکال لیں۔ اور میں نے کچھ اپنے اختیار سے یہ کام نہیں کیا ــــــ بلکہ بامر الٰہی کیا ہے ــــــ حضرت ابو الدرداء رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ اس دیوار کے نیچے سونے چاندی کا ذخیرہ تھا (رواہ الترمذی والحاکم) جو ان کے باپ سے ان کو میراث میں پہنچا تھا۔ اگر دیوار گر پڑتی تو یتیم بچوں کا جو مال وہاں گڑا ہوا تھا ظاہر ہو جاتا اور بدنیت لوگ اٹھا لیتے۔ بچوں کا باپ چونکہ نیک آدمی تھا اس لئے اس کی برکت سے اللہ تعالیٰ نے اس کے مال کو اس کی اولاد کے لئے محفوظ رکھا اور حضرت خضر کو بھیج کر دیوار درست کرا دی۔ اور مال کی یہ حفاظت اللہ تعالیٰ کی مہربانی سے تھی۔ حضرت خضر کا دیوار کا سیدھا کرنا بامر خداوندی تھا اور جو کام خدا کے حکم سے کرنا ضروری ہو اس پر مزدوری لینا جائز نہیں، یہیں سے یہ ضابطہ بنا ہے کہ ''طاعاتِ مقصودہ پر اجارہ باطل ہے'' ــــــ یہ حقیقت ہے ان باتوں کی جن پر آپ سے صبر نہ ہو سکا۔

فائدہ(۱): دنیا میں کوئی بھی اچھا یا برا کام اللہ تعالیٰ کی مشیت و ارادے کے بغیر نہیں ہوتا خیر و شر سب ان کی مخلوق ہیں اور ان کے ارادے اور مشیت کے تابع ہیں۔ مگر ادب کا تقاضا یہ ہے کہ شر کی نسبت اللہ تعالیٰ کی طرف نہ کی جائے چنانچہ حضرت خضر علیہ السلام نے جب کشتی توڑنے کا ذکر کیا تو چونکہ وہ کام بظاہر ایک عیب اور برائی تھا اس لئے اس کے ارادے کی نسبت اپنی طرف کی، اسی طرح لڑکے کو قتل کرنے اور اس کے بدلے میں اس سے بہتر اولاد دینے کا ذکر کیا تو اس میں قتل تو برائی تھی اور بدلے میں بہتر اولاد دینا بھلائی تھی، اس لئے امر مشترک ہونے کی وجہ سے جمع متکلم کا صیغہ استعمال کیا تا کہ اس میں جتنا ظاہری شر ہے وہ اپنی طرف اور جو خیر ہے وہ اللہ تعالیٰ کی طرف منسوب ہو جائے اور تیسرے واقعہ میں دیوار کھڑی کر کے یتیموں کا مال محفوظ کرنا سراسر خیر ہی خیر تھا اس لئے اس کی پوری نسبت اللہ تعالیٰ کی طرف کر دی (ماخوذ از معارف القرآن)

فائدہ(۲): حضرت موسیٰ اور حضرت خضر علیہما السلام کے واقعہ میں ہمارے لئے جو سب سے بڑا سبق ہے وہ یہ ہے کہ ہمیں یقین رکھنا چاہئے کہ کائنات میں جو کچھ ہو رہا ہے وہ ٹھیک حکمت خداوندی کے مطابق ہو رہا ہے۔ کائنات میں کوئی بات بایں معنی شر نہیں کہ سبب کا مقتضی پورا نہ ہو یا سبب کی ضد صادر ہو۔ ہر چیز خدا نے جس مقصد سے پیدا کی ہے وہ اس مقصد کی تکمیل میں لگی ہوئی ہے البتہ ایسا ہو سکتا ہے کہ کوئی کام انسان کی مصلحت سے ہم آہنگ نہ ہو یا اس کے حق میں زیادہ بہتر نہ ہو مگر مجموعۂ عالم کے اعتبار سے وہ بھی خیر ہی ہوتا ہے۔ پس ظاہر بین نگاہیں دنیا میں بظاہر جو

کچھ ہوتا دیکھتی ہیں اس سے کبھی غلط نتیجہ اخذ کر لیتی ہیں اس وجہ سے کہ ان کے سامنے اللہ کی مصلحتیں نہیں ہوتیں مثلاً ظالموں کا پھلنا پھولنا، اور بے گناہوں کا تکلیفوں میں مبتلا ہونا، نافرمانوں پر انعامات کی بارش کا ہونا اور فرمانبرداروں پر مصائب کا ہجوم ہونا، بدکاروں کا عیش اڑانا اور نیکوکاروں کا خستہ حالی میں بسر کرنا: یہ سب وہ مناظر ہیں جو آئے دن انسانوں کے سامنے آتے رہتے ہیں اور جو لوگ حقیقت حال سے واقف نہیں وہ غلط فہمیوں کا شکار ہو جاتے ہیں۔ ایسے ہی معاملات میں غور کرنے کے لئے اللہ تعالیٰ نے اس واقعہ کے ذریعہ کارخانۂ قدرت پر سے پردہ ہٹا کر ہم کو ایک جھلک دکھائی ہے تا کہ ہم جان لیں کہ یہاں شب و روز جو کچھ ہو رہا ہے وہ عین حکمت و مصلحت کے مطابق ہو رہا ہے اگر چہ ہماری کوتاہ نظریں اس کی حقیقت تک نہ پہنچ سکیں۔ مگر ہمیں یقین کرنا چاہئے کہ باغبان باغ کی مصلحت ملحوظ رکھ کر ہی کام کر رہا ہے۔

وَيَسْـَٔلُوْنَكَ عَنْ ذِي الْقَرْنَيْنِ ؕ قُلْ سَاَتْلُوْا عَلَيْكُمْ مِّنْهُ ذِكْرًا ؕ﴿۸۳﴾ اِنَّا مَكَّنَّا لَهٗ فِي الْاَرْضِ وَاٰتَيْنٰهُ مِنْ كُلِّ شَيْءٍ سَبَبًا ۙ﴿۸۴﴾ فَاَتْبَعَ سَبَبًا ﴿۸۵﴾ حَتّٰٓى اِذَا بَلَغَ مَغْرِبَ الشَّمْسِ وَجَدَهَا تَغْرُبُ فِيْ عَيْنٍ حَمِئَةٍ وَّوَجَدَ عِنْدَهَا قَوْمًا ؕ قُلْنَا يٰذَا الْقَرْنَيْنِ اِمَّآ اَنْ تُعَذِّبَ وَاِمَّآ اَنْ تَتَّخِذَ فِيْهِمْ حُسْنًا ﴿۸۶﴾ قَالَ اَمَّا مَنْ ظَلَمَ فَسَوْفَ نُعَذِّبُهٗ ثُمَّ يُرَدُّ اِلٰى رَبِّهٖ فَيُعَذِّبُهٗ عَذَابًا نُّكْرًا ﴿۸۷﴾ وَاَمَّا مَنْ اٰمَنَ وَعَمِلَ صَالِحًا فَلَهٗ جَزَآءَ ۨ الْحُسْنٰى ۚ وَسَنَقُوْلُ لَهٗ مِنْ اَمْرِنَا يُسْرًا ؕ﴿۸۸﴾ ثُمَّ اَتْبَعَ سَبَبًا ﴿۸۹﴾ حَتّٰٓى اِذَا بَلَغَ مَطْلِعَ الشَّمْسِ وَجَدَهَا تَطْلُعُ عَلٰى قَوْمٍ لَّمْ نَجْعَلْ لَّهُمْ مِّنْ دُوْنِهَا سِتْرًا ۙ﴿۹۰﴾ كَذٰلِكَ ؕ وَقَدْ اَحَطْنَا بِمَا لَدَيْهِ خُبْرًا ﴿۹۱﴾

وَيَسْـَٔلُوْنَكَ	اور پوچھتے ہیں لوگ آپ سے	قُلْ	آپ کہیے	مِّنْهُ(۲)	اس کے کچھ
عَنْ ذِي	ذوالقرنین کے	سَاَتْلُوْا(۱)	اب میں پڑھتا ہوں	ذِكْرًا(۳)	حالات
الْقَرْنَيْنِ	بارے میں	عَلَيْكُمْ	تمہارے سامنے	اِنَّا	بے شک ہم نے

(۱) سین محض تاکید کے لئے ہے، استقبال کے لئے نہیں ہے کیونکہ پورا کلام مسلسل نازل ہوا ہے (۲) مِنْهُ میں دو احتمال ہیں (۱) راجح یہ ہے کہ من تبعیضیہ ہے اور ضمیر ذوالقرنین کی طرف راجع ہے اور مضاف محذوف ہے أی من أخبارہ پھر جار مجرور در حقیقت ذِكْرًا کی صفت ہیں مگر مقدم ہونے کی وجہ سے ترکیب میں حال واقع ہیں (۲) اور ضعیف احتمال یہ ہے کہ ضمیر اللہ تعالیٰ کی طرف راجع ہو اور من ابتدائیہ ہو یعنی اللہ تعالیٰ کی طرف سے میں (رسول اللہ ﷺ) یہ احوال پڑھ کر سناتا ہوں (۳) ذکرًا، سَأَتْلُوا کا ←

مَكَّنَّا [۱]	اقتدار دیا تھا	حَمِئَةٍ [۵]	کیچڑ کے	فَسَوْفَ	تو عنقریب
لَهٗ	اس کو	وَّوَجَدَ	اور پایا اس نے	نُعَذِّبُهٗ	سزا دیں گے ہم اس کو
فِي الْاَرْضِ	زمین میں	عِنْدَهَا	چشمہ کے پاس	ثُمَّ يُرَدُّ	پھر لوٹایا جائے گا وہ
وَاٰتَيْنٰهُ	اور دیا تھا ہم نے اس کو	قَوْمًا	ایک قوم کو	اِلٰى رَبِّهٖ	اس کے رب کی طرف
مِنْ كُلِّ شَيْءٍ	ہر چیز میں سے	قُلْنَا	کہا ہم نے	فَيُعَذِّبُهٗ	پس سزا دیں گے وہ
سَبَبًا [۲]	سبب کے طور پر	يٰذَا الْقَرْنَيْنِ	اے ذوالقرنین!		اس کو
فَاَتْبَعَ [۳]	پس پیچھے پڑا وہ	اِمَّآ اَنْ [۶]	یا تو یہ کہ	عَذَابًا	سزا
سَبَبًا	ایک سبب کے	تُعَذِّبَ	سزا دے تو	نُّكْرًا	بری
حَتّٰٓى اِذَا	یہاں تک کہ جب	وَاِمَّآ اَنْ	اور یا یہ کہ	وَاَمَّا مَنْ	اور رہا وہ جو
بَلَغَ	پہنچا وہ	تَتَّخِذَ	لے تو	اٰمَنَ	ایمان لایا
مَغْرِبَ	ڈوبنے کی جگہ میں	فِيْهِمْ	ان میں	وَعَمِلَ صَالِحًا	اور کیا اس نے نیک کام
الشَّمْسِ	سورج کے	حُسْنًا	خوبی	فَلَهٗ جَزَآءَ [۸]	تو اس کے لئے بدلہ ہے
وَجَدَهَا [۴]	(تو) پایا سورج کو	قَالَ	کہا اس نے	ۨ الْحُسْنٰى	عمدہ
تَغْرُبُ	ڈوب رہا ہے وہ	اَمَّا مَنْ [۷]	رہا وہ جس نے	وَسَنَقُوْلُ	اور اب کہیں گے ہم
فِيْ عَيْنٍ	چشمہ میں	ظَلَمَ	ظلم کیا	لَهٗ	اس سے

← مفعول بہ ہے اور مِنْهُ پہلی صورت میں بمعنی نَبَاءٌ (خبر) ہے اور دوسری صورت میں بمعنی قرآن ہے۔

(۱) مَكَّنَّا (ماضی، جمع متکلم) مصدر تَمْكِيْنٌ (تفعیل) قدم جمانا، با اقتدار کرنا (۲) سَبَبٌ: رسّی، ذریعہ، وسیلہ، جمع أَسْبَابٌ: سبب اصل میں اس رسّی کو کہتے ہیں جس کے ذریعہ درخت پر چڑھا جائے اسی مناسبت سے ہر اس شئ کا نام سبب ہے جو کسی دوسری شئ تک پہنچنے کا ذریعہ ہو (۳) اَتْبَعَهٗ: پیروی کرنا، لاحق ہونا، مجرد تَبِعَ (س) سے اس کے معنی میں مبالغہ ہے (۴) وَجَدَ بمعنی رَأَى ہے یعنی محسوس کیا (۵) حَمِئَةٌ (صفت مشبہ) از حَمِيءَ (س) حَمْئًا وَحَمَأً الماءُ: پانی میں کیچڑ ملی ہوئی ہونا (۶) إِمَّا، إِنْ اور مَا سے مرکب ہے اور یہ حرف تفصیل ہے اور أَنْ تُعَذِّبَ میں أَنْ مصدریہ ہے اور جملہ تُعَذِّبَ بتاویل مصدر ہو کر یا تو مبتدا ہے اور خبر محذوف ہے أي إما تَعذيبُك وَاقِعٌ، یا خبر ہے اور مبتدا محذوف ہے أي إِمَّا أمرك تعذيبك یا فعل محذوف کا مفعول ہے أي إِمَّا تُوْقِعُ تعذيبك اور إِمَّا أن تتخذ میں بھی یہی احتمالات ہیں اور حُسْنًا کا مضاف محذوف ہے أي أمرًا ذَا حَسَنٍ یا مصدر کا حمل مبالغۃ ہے (۷) أَمَّا بھی حرف تفصیل ہے مگر اس میں شرط کے معنی ہیں اس لئے اس کے بعد جواب پر ف کا آنا ضروری ہے (۸) لَهٗ خبر مقدم ہے اور اَلْحُسْنٰى مبتدا مؤخر اور جَزَاءً حال ہے یا تمیز أي لَهُ الْحُسْنٰى جَزَاءً كَمَا يُقَالُ: لك هذا الثوب هبةً۔

مِنْ اَمْرِنَا	ہمارے معاملہ میں	الشَّمْسِ	سورج کے	سِتْرًا	کوئی پردہ
يُسْرًا [1]	آسانی	وَجَدَهَا	(تو) پایا اس نے سورج کو	كَذٰلِكَ [3]	یوں ہی ہے
ثُمَّ اَتْبَعَ	پھر پیچھا کیا اس نے	تَطْلُعُ	نکل رہا ہے وہ	وَقَدْ اَحَطْنَا [4]	اور گھیر لیا ہم نے
سَبَبًا	ایک سبب کا	عَلٰى قَوْمٍ	ایسی قوم پر	بِمَا لَدَيْهِ	ان چیزوں کو جو اس
حَتّٰى اِذَا	یہاں تک کہ جب	لَّمْ نَجْعَلْ [2]	(کہ) نہیں بنایا ہم نے		کے پاس ہیں
بَلَغَ	پہنچا وہ	لَّهُمْ	ان کے لئے	خُبْرًا [5]	واقفیت کے
مَطْلِعَ	نکلنے کی جگہ میں	مِّنْ دُوْنِهَا	اس سے وَرے		اعتبار سے

مشرکین مکہ نے یہود مدینہ کے مشورہ سے اصحاب کہف کے احوال کے ساتھ، ذوالقرنین کے احوال بھی دریافت کئے تھے اس لئے اصحاب کہف کے احوال بیان کرنے کے بعداب ذوالقرنین کے احوال بیان کئے جاتے ہیں:

ذوالقرنین ایک نیک نہاد بادشاہ تھے نبی یا رسول نہیں تھے۔ حضرت علی کرم اللہ وجہہ سے یہی مروی ہے کہ لَمْ يَكُنْ نَبِيًّا وَلَامَلَكًا (ذوالقرنین نہ تو نبی تھے اور نہ فرشتہ) حافظ ابن حجر رحمہ اللہ نے اس روایت کی توثیق کی ہے اور لکھا ہے کہ یہی اکثر علماء کی رائے ہے [6] حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے بھی یہی بات مروی ہے کہ ذوالقرنین نیک اور صالح بادشاہ تھے اللہ تعالیٰ نے ان کے اعمال کو پسند فرمایا اور قرآن میں ان کی تعریف کی اور وہ فاتح اور کامیاب بادشاہ تھے۔ (البدایہ والنہایہ ۲:۱۰۳)

ذوالقرنین کے واقعہ میں قرآن کریم نے خاص طور پر دو باتوں کو نمایاں کیا ہے:

ایک: ذوالقرنین جب پہلی مُہم سر کرتے ہوئے دنیا کے مغربی کنارے پر پہنچے تو وہاں ان کو ایک قوم ملی جو کافر تھی۔ ذوالقرنین نے ان کو اسلام کی دعوت دی۔ اس قوم کا مفصل حال ذکر کرنے سے مقصود شرک کی برائی اور توحید کی تلقین ہے۔

دوسری: تیسرے سفر کی تفصیلات بیان کرتے ہوئے ذوالقرنین کا یہ قول نقل کیا ہے کہ ایک دن میری بنائی ہوئی یہ آہنی دیوار بھی پیوند خاک ہو جائے گی! اس سے یہ حقیقت ذہن نشین کرنی مقصود ہے کہ دنیا کی بڑی سے بڑی اور

(۱) مضاف محذوف ہے أي ذَايُسْرٍ یا مصدر کا اطلاق مبالغۃً ہے (۲) جملہ لَمْ نَجْعَلْ صفت ہے قَوْمٌ کی (۳) مبتدا محذوف کی خبر ہے أي الأمر كذلك (۴) أَحَطْنَا کے معنی کے لئے دیکھیں سورۃ الکہف آیت ۶۸ (۵) خُبْرًا مصدر ہے خَبُرَ (ک) خُبْرًا الشيئ وَبِهِ: حقیقت حال سے واقف ہونا (۶) فتح الباری ۶:۳۸۳ باب قصۃ یاجوج وماجوج، کتاب الانبیاء۔

مضبوط سے مضبوط عمارت بھی اک دن ختم ہوجانے والی ہے۔ ہمیشہ باقی رہنے والی چیزیں آخرت کی چیزیں ہیں آخرت کا عیش ہی حقیقی عیش ہے۔اس لئے اسی کی فکر کرنی چاہئے۔کاش یہ بات لوگوں کی سمجھ میں آجائے اور ہماری آنکھوں سے غفلت کا پردہ ہٹ جائے:

اورلوگ آپؐ سے ذوالقرنین کے بارے میں پوچھتے ہیں؟ ـــــ ذوالقرنین کے لفظی معنی ہیں دوسینگوں والا۔ آپ کا یہ نام کیوں پڑا؟ اس میں سخت اختلاف ہے۔کتابوں میں دس بارہ قول لکھے ہیں، چند یہ ہیں:

۱ــ اس بادشاہ کو ذوالقرنین اس لئے کہا گیا کہ وہ روم وفارس کا فرمانروا تھا۔قرآن کے معنی ہیں سینگ، بطور استعارہ حکومت کے معنی میں استعمال کیا گیا ہے۔

۲ــ چونکہ یہ بادشاہ فتوحات کرتا ہوا اقصائے مغرب ومشرق تک پہنچا تھا اس لئے ذوالقرنین کہلایا یعنی دنیا کے دو کناروں کا مالک۔

۳ ــ اس بادشاہ کی زلفیں دراز تھیں اور وہ ہمیشہ بالوں کو دو حصے کرکے ان کی پٹیاں گوندھ کر دونوں کاندھوں پر ڈالے رکھتا تھا اس لئے اس کا یہ لقب ہوا۔

۴ــ وہ اپنے تاج میں سُرخاب کے دو پر دوسینگوں کی طرح لگایا کرتا تھا۔اس لئے اس کا یہ لقب پڑ گیا۔

۵ــ اس کے سر پر چوٹ کے دونشان تھے۔اس لئے سینگ سے تشبیہ دے کر ذوالقرنین نام رکھا گیا۔

غرض یہ لقب قرآن کریم کا دیا ہوا نہیں ہے پہلے سے مشہور چلا آرہا تھا۔یہودی اس بادشاہ کو اسی نام سے موسوم کرتے تھے ــ مؤرخین میں ذوالقرنین کی تعیین میں بھی سخت اختلاف ہے کیونکہ ذوالقرنین لقب والے کئی بادشاہ گذرے ہیں۔ قرین صواب یہ ہے کہ ذوالقرنین سے مراد ایران کا وہ بادشاہ ہے جسے یہودی خورس، یونانی سائرس، فارسی گورش، یا کی ارش اور عرب کَیْ خُسْرو کہتے ہیں جس کا انتقال ۵۲۹ قبل مسیح میں ہوا ہے (قصص القرآن) دوسرا مشہور قول یہ ہے کہ ذوالقرنین سے مراد مشہور تاریخی فاتح اسکندر یونانی (متوفی ۳۲۳ ق م) ہے اور ابن کثیر رحمہ اللہ کی رائے یہ ہے کہ ذوالقرنین اور اسکندر مقدونی کے درمیان تقریباً دو ہزار سال سے بھی زیادہ کا فصل ہے۔واللہ اعلم بالصواب۔

آپ کہئے: میں ابھی تم کو اس کا کچھ حال سناتا ہوں ـــــ یعنی قرآن کریم میں ذوالقرنین کا قصہ تاریخی انداز پر بیان نہیں کیا گیا۔تفصیل وار سوانح حیات بیان کرنا مؤرخ کا کام ہے اور قرآن کریم کوئی تاریخی کتاب نہیں ہے وہ تو ایک ہدایت نامہ ہے اس لئے واقعہ کے جو اجزاء مقصد ہدایت سے ہم آہنگ ہوں گے وہی بیان کئے جائیں گے۔ دوسری غیر ضروری باتیں نظر انداز کردی جائیں گی مثلاً (۱) ذوالقرنین کس ملک کے بادشاہ تھے اور وہ کس عہد کے آدمی

تھے؟ (۲) ان کو ذوالقرنین کیوں کہا جاتا تھا؟ (۳) وہ مشرق ومغرب میں کس حد تک پہنچے تھے؟ (۴) جس قوم نے دیوار بنانے کی درخواست کی تھی وہ کونسی قوم تھی؟ (۵) یاجوج وماجوج کون ہیں؟ اور کہاں رہتے ہیں؟ (۶) دیوار کہاں بنائی تھی؟ اس قسم کی باتیں قرآن کی اصل غرض سے زائد ہیں اس لئے ان کو بیان نہیں کیا جائے گا اور جو باتیں قرآن نے چھوڑ دی ہیں ان کو جزم ویقین کے ساتھ کوئی بیان نہیں کرسکتا۔

شانِ حکومت: ـــــ ہم نے ان کو زمین میں اقتدار عطا کیا تھا اور ہم نے ان کو ہر قسم کے وسائل بخشے تھے ـــــ یعنی وہ جاہ وحشمت، شان وشوکت رکھنے والے جلیل القدر بادشاہ تھے۔ خدا نے ان کو حکومت چلانے کے لئے ہر قسم کے ساز وسامان سے نوازا تھا۔ سَبَبٌ عربی میں ہر اس چیز کو کہتے ہیں جس سے مقصد برآری میں مدد لی جائے خواہ وہ آلاتِ حرب ہوں، وسائل مادیہ ہوں یا علم وبصیرت اور تجربہ ہو ـــــ اور ہر قسم سے مراد وہ تمام امور ہیں جن کی ایک بڑے فاتح کشور کُشا کو نظامِ حکومت چلانے کے لئے ضرورت ہوتی ہے ـــــ اور ''ہم'' نے کا مطلب یہ ہے کہ یہ اقتدار اور یہ اسباب ذوالقرنین کو رواجی طور پر حاصل نہیں ہوئے تھے کیونکہ وہ آباؤاجداد سے کسی بڑی حکومت کے وارث نہیں ہوئے تھے بلکہ وہ ایک معمولی آغاز سے ترقی کرکے عظیم بادشاہ بن گئے تھے اور یہ مقدرت ان کو معجزانہ طور پر محض عنایت ربانی اور فضل خداوندی سے حاصل ہوئی تھی۔

ذوالقرنین کا مغربی سفر: ـــــ ذوالقرنین نے سب سے پہلے اپنے پایۂ تخت سے مغرب کی جانب سفر کا ارادہ کیا ـــــ چنانچہ انھوں نے سفر کا سروسامان کیا ـــــ اور مکمل تیاری کرکے سفر پر روانہ ہوئے۔ یہ ترجمہ شاہ عبدالقادر صاحب قدس سرہٗ کے ترجمہ سے ماخوذ ہے آپ نے ترجمہ کیا ہے ''پھر پیچھے پڑا وہ ایک سامان کے'' اور حضرت تھانوی رحمہ اللہ نے ترجمہ کیا ہے ''وہ ایک راہ پر ہولئے'' یہ ترجمہ جلالین سے ماخوذ ہے۔ غرض سبب کا ترجمہ ''سامان'' بھی ہوسکتا ہے اور ''راہ'' بھی ـــــ یہاں تک کہ وہ غروبِ آفتاب کی جگہ پر پہنچے تو انھیں آفتاب ایک سیاہ پانی کے چشمہ میں ڈوبتا ہوا دکھائی دیا ـــــ یعنی جب وہ چلتے چلتے جانب مغرب میں اس حد تک پہنچ گئے کہ سامنے سمندر آگیا اور آگے بڑھنے کا کوئی راستہ نہ رہا تو وہ رک گئے اور ان کو وہاں ایسا نظر آیا جیسے سورج سیاہ دلدل میں چھپتا ہے، کیونکہ سمندر کے کنارے کھڑے آدمی کو ایسا ہی نظر آتا ہے۔

اور سیاہ پانی کے چشمہ سے مراد ایسی جھیل ہے جس کے نیچے سیاہ کیچڑ ہو، جس کی وجہ سے پانی کا رنگ بھی سیاہ دکھائی دیتا ہو۔ مؤرخین کا خیال ہے کہ یہ مقام بحر ایجین (Aegean Sea) ہے جو ترکی کی مغربی جانب میں واقع ہے اس سمندر کا تعلق بحر اسود (Black Sea) سے ہے۔ آبنائے باسفورس نے بحر اسود کو بحر مَرمَرہ سے ملایا ہے اور آبنائے

دردنیل نے بحر مرمرہ کو بحر ایجین سے ملایا ہے اس وجہ سے ان سمندروں کا پانی سیاہ نظر آتا ہے۔ اور بحر ایجین نے چھوٹے چھوٹے جزیروں والی جھیلوں کی شکل اختیار کر لی ہے واللہ اعلم۔

ذوالقرنین نے یہ سفر کیوں کیا تھا؟ قرآن کریم نے مقصد سفر کی طرف کوئی اشارہ نہیں کیا اس لئے کوئی قطعی بات نہیں کہی جاسکتی، ممکن ہے کشور کشائی اور ممالک کو فتح کرنے کے لئے کیا ہو اور یہ بھی ممکن ہے کہ کسی بغاوت کو فرو کرنے کے لئے کیا ہو —— اور ان کو وہاں ایک قوم ملی، ہم نے کہا: ''اے ذوالقرنین! یا تو آپ ان لوگوں کو سزا دیں یا ان کے ساتھ نرمی کا برتاؤ کریں'' —— یعنی یہ قوم پوری طرح تمہارے قابو میں ہے، ان کے ملک پر تمہارا قبضہ ہو چکا ہے پس جس طرح چاہو ان کے ساتھ معاملہ کرو، چاہو تو ان کو کفر کی پاداش میں سزا دو اور چاہو تو ان کے ساتھ حسن سلوک کرو —— اللہ کا یہ فرمان ضروری نہیں کہ وحی یا الہام کے ذریعہ یا کسی نبی کے واسطہ سے ذوالقرنین کو پہنچا ہو، یہ ضمیر کی آواز بھی ہوسکتی ہے، جیسے ﴿أَوحىٰ رَبُّكَ اِلَى النَّحْلِ﴾ میں وحی سے مراد یہ ہے کہ اللہ نے شہد کی مکھی کے دل میں یہ بات ڈالی۔ اسی طرح یہاں بھی بظاہر یہی مطلب معلوم ہوتا ہے کہ ذوالقرنین کے دل میں یہ خیال پیدا ہوا کہ یہ ایک امتحان کی گھڑی ہے۔ یہ قوم میرے سامنے بے بس کھڑی ہے۔ میں چاہوں تو ان پر ظلم بھی کرسکتا ہوں اور چاہوں تو شرافت کا سلوک بھی کرسکتا ہوں اس نازک موقعہ میں ذوالقرنین نے بہترین فیصلہ کیا —— انھوں نے کہا: رہا وہ شخص جو ظلم (یعنی شرک وکفر اختیار) کرے گا تو ہم اس کو سزا دیں گے۔ پھر وہ اپنے رب کی طرف لوٹایا جائے گا پس وہ اسے اور بھی سخت سزا دیں گے۔ اور رہا وہ جو ایمان لائے گا اور نیک کام کرے گا: اس کو بدلے میں بھلائی ملے گی اور ہم بھی اپنے برتاؤ میں اس سے آسان بات کہیں گے —— یعنی ذوالقرنین نے فیصلہ کیا کہ اس قوم کو اسلام کی دعوت دی جائے۔ چنانچہ انھوں نے اعلان کیا کہ ہدایت کا راستہ واضح ہونے کے بعد بھی جو شخص شرک وکفر کو اپنائے گا، ہم اس کو سزا دیں گے اور بعد از مرگ تو اس کے لئے سخت سزا تیار ہی ہے۔ اور جو ایمان کا راستہ اختیار کرے گا اور عمل صالح میں لگ جائے گا اس کو اس کے عمل کا بھرپور بدلہ آخرت میں بھلائی کی شکل میں ملے گا اور دنیا میں بھی ہم اس کے ساتھ نیک سلوک کریں گے۔

فائدہ: دعوت میں ترغیب وترہیب دونوں ہی کی ضرورت پڑتی ہے۔ ذوالقرنین نے اسی مصلحت سے کفر پر مصر رہنے والوں کے لئے سزا کا اعلان کیا ورنہ حقیقت میں دین کے معاملہ میں کوئی زور جبر نہیں۔ مگر ترہیب (ڈرانے) کی حد تک کوئی حرج بھی نہیں۔

فائدہ: ذوالقرنین کی دعوت کا نتیجہ کیا رہا؟ قرآن کریم نے اس کی طرف کوئی اشارہ نہیں کیا، ممکن ہے سب لوگوں

نے اسلام قبول کرلیا ہو اور یہ بھی ممکن ہے کہ کچھ لوگ گمراہی پر مصر رہے ہوں۔ واللہ اعلم۔

ذوالقرنین کا مشرقی سفر ـــــ ذوالقرنین مغربی سفر سے لوٹنے کے بعد پایۂ تخت سے جانب مشرق ایک دوسرے سفر پر روانہ ہوئے ـــــ پھر انھوں نے سروسامان کیا، یہاں تک کہ وہ طلوعِ آفتاب کی جگہ پر پہنچے، تو انھوں نے آفتاب کو ایک ایسی قوم پر طلوع ہوتے دیکھا، جن کے لئے ہم نے آفتاب سے وَرے کوئی آڑ نہیں بنائی تھی ـــــ یعنی ان قبائل کے پاس دھوپ سے بچنے کے لئے کوئی بھی سامان: مکان، خیمہ، لباس وغیرہ نہیں تھا۔ آفتاب کی شعاعیں ان کے جسموں پر راست پڑتی تھیں۔ وہ بالکل ہی تمدن سے ناآشنا تھے، نہ ان میں گھر بنانے کا رواج تھا، نہ چھت ڈالنے کا دستور تھا۔ نہ وہ کپڑا بنانے کی صنعت سے واقف تھے۔ وہ لوگ بالکل فطری زندگی گزارتے تھے ـــــ یہ لوگ کون تھے؟ کس ملک کے باشندے تھے؟ ان کا دین ومذہب کیا تھا؟ ذوالقرنین نے ان کے ساتھ کیا سلوک کیا؟ یہ سب باتیں قرآن نے بیان نہیں کیں۔ قرآن کا مقصد صرف ذوالقرنین کی مُہم جوئی اور الوالعزمی بیان کرنا ہے ـــــ صورتِ حال اسی طرح تھی، اور ہم ذوالقرنین کے پاس جو کچھ تھا اس سے پوری طرح باخبر ہیں ـــــ یعنی اصل حقیقت اور واقعہ وہی ہے جو قرآن نے بیان کیا ہے، خواہ وہ کتنا ہی مستبعد معلوم ہو، ذوالقرنین کے جملہ احوال سے اللہ تعالیٰ بخوبی واقف ہیں ان کے علم سے اس بادشاہ کے معاملات کا ایک ذرہ بھی مخفی نہیں۔

فائدہ: غروب آفتاب کی جگہ اور طلوع آفتاب کی جگہ سے مراد یہ ہے کہ ذوالقرنین اپنے مرکز حکومت سے اقصائے مغرب اور اقصائے مشرق تک پہنچے۔ یعنی جانب مغرب اس حد تک پہنچے کہ خشکی کا سلسلہ ختم ہوکر سمندر شروع ہوگیا۔ اور مشرق کی جانب وہ یہاں تک پہنچے کہ وہاں خانہ بدوش قبائل کے علاوہ کوئی شہری آبادی نہ تھی، آگے سلسلۂ کوہ تھا۔ جن کے پیچھے سے سورج نکلتا ہوا محسوس ہوتا تھا۔ یہ مطلب نہیں ہے کہ وہ ساری دنیا کے حکمران ہوگئے تھے۔ اور رُبع مسکون گھوم گئے تھے، کیونکہ تاریخی طور پر یہ بات کسی بھی بادشاہ کے لئے ثابت نہیں، حتی کہ حضرت سلیمان علیہ السلام کے لئے بھی یہ بات ثابت نہیں۔ نہ سورج کا کوئی حقیقی مطلع اور حقیقی مغرب ہے۔ واللہ اعلم۔

ثُمَّ اَتْبَعَ سَبَبًا ﴿۹۲﴾ حَتّٰٓى اِذَا بَلَغَ بَيْنَ السَّدَّيْنِ وَجَدَ مِنْ دُوْنِهِمَا قَوْمًا ۙ لَّا يَكَادُوْنَ يَفْقَهُوْنَ قَوْلًا ﴿۹۳﴾ قَالُوْا يٰذَا الْقَرْنَيْنِ اِنَّ يَاْجُوْجَ وَمَاْجُوْجَ مُفْسِدُوْنَ فِى الْاَرْضِ فَهَلْ نَجْعَلُ لَكَ خَرْجًا عَلٰٓى اَنْ تَجْعَلَ بَيْنَنَا وَبَيْنَهُمْ سَدًّا ﴿۹۴﴾ قَالَ مَا مَكَّنِّيْ فِيْهِ رَبِّيْ خَيْرٌ فَاَعِيْنُوْنِيْ بِقُوَّةٍ اَجْعَلْ بَيْنَكُمْ وَبَيْنَهُمْ رَدْمًا ﴿۹۵﴾ اٰتُوْنِيْ زُبَرَ الْحَدِيْدِ ۭ حَتّٰٓى اِذَا سَاوٰى بَيْنَ الصَّدَفَيْنِ

قَالَ انْفُخُوْا ۭ حَتّٰٓى اِذَا جَعَلَهٗ نَارًا ۙ قَالَ اٰتُوْنِيْٓ اُفْرِغْ عَلَيْهِ قِطْرًا ۝۹۶ فَمَا اسْطَاعُوْٓا اَنْ يَّظْهَرُوْهُ وَمَا اسْتَطَاعُوْا لَهٗ نَقْبًا ۝۹۷ قَالَ هٰذَا رَحْمَةٌ مِّنْ رَّبِّيْ ۚ فَاِذَا جَاۗءَ وَعْدُ رَبِّيْ جَعَلَهٗ دَكَّاۗءَ ۚ وَكَانَ وَعْدُ رَبِّيْ حَقًّا ۝۹۸ وَتَرَكْنَا بَعْضَهُمْ يَوْمَىِٕذٍ يَّمُوْجُ فِيْ بَعْضٍ وَّنُفِخَ فِي الصُّوْرِ فَجَمَعْنٰهُمْ جَمْعًا ۝۹۹ وَّعَرَضْنَا جَهَنَّمَ يَوْمَىِٕذٍ لِّلْكٰفِرِيْنَ عَرْضَا ۝۱۰۰ الَّذِيْنَ كَانَتْ اَعْيُنُهُمْ فِيْ غِطَاۗءٍ عَنْ ذِكْرِيْ وَكَانُوْا لَا يَسْتَطِيْعُوْنَ سَمْعًا ۝۱۰۱

ع ۱۱

ثُمَّ اَتْبَعَ	پھر پیچھے پڑا وہ	يَفْقَهُوْنَ	(کہ) سمجھے	لَكَ	آپ کے لئے
سَبَبًا	ایک سبب کے	قَوْلًا	کوئی بات	خَرْجًا (۴)	کچھ محصول
حَتّٰٓى اِذَا	یہاں تک کہ جب	قَالُوْا	کہا انھوں نے	عَلٰٓى اَنْ	اس شرط پر کہ
بَلَغَ	پہنچا وہ	يٰذَا الْقَرْنَيْنِ	اے ذوالقرنین!	تَجْعَلَ	بنادیں آپ
بَيْنَ السَّدَّيْنِ (۱)	دو پہاڑوں کے درمیان	اِنَّ يَاْجُوْجَ	بیشک یاجوج	بَيْنَنَا وَبَيْنَهُمْ	ہمارے اور انکے درمیان
وَجَدَ	(تو) پایا اس نے	وَمَاْجُوْجَ (۳)	اور ماجوج	سَدًّا	کوئی آڑ
مِنْ دُوْنِهِمَا	ان دونوں سے ورے	مُفْسِدُوْنَ	فساد مچاتے ہیں	قَالَ	کہا ذوالقرنین نے
قَوْمًا	ایک قوم کو	فِي الْاَرْضِ	اس علاقہ میں	مَا	جو کچھ
لَّا يَكَادُوْنَ (۲)	(جو) نہیں قریب تھی	فَهَلْ نَجْعَلُ	پس کیا مقرر کریں ہم	مَكَّنِّيْ (۵)	مقدرت دی ہے مجھ کو

(۱) سَدٌّ دراصل سَدَّ يَسُدُّ کا مصدر ہے، جس کے معنی ہیں: رخنہ کو استوار کرنا اور خلل کو بند کرنا۔ چونکہ دیوار، پہاڑ اور بند میں یہ صفت موجود ہے اس لئے سب کو سَدٌّ کہتے ہیں ـــــ بَيْنَ السَّدَّيْنِ مفعول بہ ہے بَلَغَ کا۔ لأنّه من الظروف المتصرفة کیونکہ بَيْنَ، بَانَ كَذَا کا مصدر ہے (لغات القرآن) (۲) كَادَ: چونکہ یہاں کلام منفی میں آیا ہے اس لئے اپنے مدخول کا اثبات کرتا ہے۔ (۳) یاجوج وماجوج عجمی (غیر عربی) لفظ ہیں اور دو قوموں کے اجداد کے نام ہیں۔ یہ دونوں قومیں حضرت نوح علیہ السلام کے صاحب زادے یافث کی نسل سے ہیں (۴) خَرْج: محصول، باج، ٹیکس، جمع اَخْرَاج بعض حضرات نے خَرْج اور خَرَاج میں یہ فرق کیا ہے کہ خَرْج: وہ مال ہے جو انسانوں کے عوض میں لیا جائے، اور خَرَاج عام ٹیکس ہے (۵) مَكَّنِّيْ اصل میں مَكَّنَ نِيْ تھا مَكَّنَ (ماضی واحد مذکر غائب) مصدر تَمْكِيْنٌ: با اقتدار اور با اختیار بنانا اور نِيْ میں ن وقایہ اور ی ضمیر واحد متکلم، مفعول بہ، پھر لام کلمہ کے نون کو ساکن کرکے نون وقایہ میں ادغام کردیا۔

فِيْهِ	اس میں	سَاوٰى(۵)	برابر کردیا اس نے	اَنْ يَّظْهَرُوْهُ(۱۰)	کہ چڑھیں وہ اس پر
رَبِّيْ	میرے رب نے	بَيْنَ الصَّدَفَيْنِ(۶)	دو پھانکوں کے درمیان	وَمَا اسْتَطَاعُوْا	اور نہ طاقت رکھی انھوں نے
خَيْرٌ(۱)	بہتر ہے	قَالَ	تو حکم دیا اس نے	لَهٗ	اس میں
فَاَعِيْنُوْنِيْ	پس مدد کرو تم میری	انْفُخُوْا(۷)	دہکاؤ (پھونکو)	نَقْبًا	سوراخ کرنے کی
بِقُوَّةٍ	قوت (زور) سے	حَتّٰٓى اِذَا	یہاں تک کہ جب	قَالَ هٰذَا	کہا ذوالقرنین نے یہ
اَجْعَلْ	بنادوں میں	جَعَلَهٗ	کردیا ذوالقرنین نے اسکو	رَحْمَةٌ	مہربانی ہے
بَيْنَكُمْ	تمہارے	نَارًا	آگ (لال انگارا)	مِّنْ رَّبِّيْ	میرے رب کی
وَبَيْنَهُمْ	اور ان کے درمیان	قَالَ	تو حکم دیا اس نے	فَاِذَا جَآءَ	پھر جب آئے گا
رَدْمًا(۲)	ایک مضبوط دیوار	اٰتُوْنِيْٓ	(کہ) لادو مجھے	وَعْدُ رَبِّيْ	میرے رب کا وعدہ
اٰتُوْنِيْ(۳)	لادو تم مجھے	اُفْرِغْ(۸)	ریڑھ دوں میں	جَعَلَهٗ	(تو) کردیں گے وہ اسکو
زُبَرَ(۴)	بڑے بڑے ٹکڑے	عَلَيْهِ	اس پر	دَكَّآءَ(۱۱)	پیوندخاک (ریزہ ریزہ)
الْحَدِيْدِ	لوہے (کے)	قِطْرًا(۹)	پگھلا ہوا تانبا (پیتل)	وَكَانَ	اور ہے
حَتّٰٓى اِذَا	یہاں تک کہ جب	فَمَا اسْطَاعُوْٓا	پس نہ طاقت رکھی انھوں نے	وَعْدُ رَبِّيْ	میرے رب کا وعدہ

(۱) خیر اور شر کا استعمال دوطرح ہوتا ہے ایک بطور اسم جیسے يَدْعُوْنَ اِلَى الْخَيْرِ، دوسرے اسم تفضیل کے طور پر جیسے خَيْرُ الزَّادِ التَّقْوٰى اس آیت میں اسم بھی ہوسکتا ہے اور اسم تفضیل بھی، پہلی صورت میں ترجمہ ہوگا: ''بہت کچھ ہے'' اور دوسری صورت میں ''بہتر ہے'' أي خيرٌ مما تريدون أن تَبْذُلُوْهُ (۲) رَدْمٌ: موٹی اور مضبوط دیوار، سد محکم۔ رَدْمٌ دراصل باب ضرب کا مصدر ہے جس کے معنی ہیں رخنہ کو پتھروں سے بند کرنا مگر یہاں بمعنی اسم مفعول ہے (۳) آتُوْنِيْ: تم میرے پاس لاؤ آتُوْا فعل امر ن وقایہ، ی ضمیر واحد متکلم، آتَى اِيْتَاءً ا فلانًا الشيءَ: دینا (۴) زُبَرٌ جمع۔ مفرد زُبْرَةٌ جیسے غُرَفٌ جمع، مفرد غُرْفَةٌ زبرة: لوہے کا تختہ، لوہے کا بڑا ٹکڑا (۵) سَاوٰى مُسَاوَاةً: برابر کرنا، برابر ہونا۔ فاعل ضمیر مستتر، بَيْنَ الصَّدَفَيْنِ مفعول بہ ہے (۶) صَدَفٌ: پہاڑ کی پھانک، کنارۂ کوہ، جہاں جا کر پہاڑ کا اوپر کا سرا تمام ہوتا ہے (۷) اُنْفخوا (امر، جمع مذکر حاضر) تم پھونکو، تم دھونکو از نَفْخٌ: پھونک مارنا (۸) اُفْرِغْ (مضارع واحد متکلم) میں ڈال دوں، میں انڈیل دوں مصدر اِفْرَاغٌ اور آتُوْنِيْ کا مفعول قِطْرًا محذوف ہے لِدَلَالَةِ الثاني عليه (۹) قِطْرٌ کا ترجمہ عام طور پر پگھلا ہوا تانبا کیا جاتا ہے مگر ابن عباسؓ نے پیتل ترجمہ کیا ہے (۱۰) يَظْهَرُوْهُ بتاویل مصدر ہوکر مَااسْتَطَاعُوْا کا مفعول ہے اور اسطاعو ااصل میں استطاعو اتھات اور ط دو قریب المخرج حرف جمع ہوئے تو ت کو حذف کردیا استطاع استطاعةً: سکنا، طاقت رکھنا۔ یعنی ان چیزوں کا بتمام وکمال پایا جانا۔ استطاعت کہلاتا ہے جن کی وجہ سے فعل سرزد ہوتا ہے۔ ظَهَرَ البيتَ (ف) چڑھنا (۱۱) دَكَّاءُ: ہموار برابر جمع دَكَّاوَاتٌ دَكٌّ (ن) دَكًّا: ریزہ ریزہ کرنا۔

حَقًّا	برحق	فَجَمَعْنٰهُمْ	پس اکٹھا کریں گے	الَّذِيْنَ	جولوگ
وَتَرَكْنَا	اور چھوڑ دیا ہم نے		ہم ان کو	كَانَتْ	تھیں
بَعْضَهُمْ	ان کے بعض کو	جَمْعًا	سب کو	اَعْيُنُهُمْ	ان کی آنکھیں
يَوْمَئِذٍ	اس دن	وَّعَرَضْنَا	اور پیش کریں گے ہم	فِيْ غِطَآءٍ (۳)	پردے میں
يَّمُوْجُ (۱)	ٹھاٹھیں مارتا	جَهَنَّمَ	دوزخ کو	عَنْ ذِكْرِيْ	میری یاد سے
فِيْ بَعْضٍ	بعض میں	يَوْمَئِذٍ	اس دن	وَكَانُوْا (۴)	اور تھے وہ
وَّنُفِخَ	اور پھونکا جائے گا	لِّلْكٰفِرِيْنَ	کافروں کے سامنے	لَا يَسْتَطِيْعُوْنَ	نہیں طاقت رکھتے تھے
فِي الصُّوْرِ (۲)	صور میں	عَرْضًا	پیش کرنا	سَمْعًا	سننے کی

ذوالقرنین کا تیسرا سفر: ـــــ مشرق ومغرب کے سفروں سے فارغ ہوکر ذوالقرنین نے ایک اور سفر کیا۔ یہ سفر کس جانب تھا؟ قرآن کریم نے اس کی کوئی وضاحت نہیں کی۔ مؤرخین کا عام خیال یہ ہے کہ یہ سفر شمال کی جانب تھا اور ایک رائے یہ ہے کہ یہ سفر بھی مشرق ہی کی جانب تھا ـــ پھر انھوں نے سروسامان کیا، یہاں تک کہ جب وہ دو پہاڑوں کے درمیان پہنچے تو ان کو ان پہاڑوں سے اِس طرف ایک ایسی قوم ملی جو مشکل ہی سے کوئی بات سمجھتی تھی ـــــ یعنی اس قوم کے لئے ذوالقرنین اور ان کے لشکر کی زبان بالکل اجنبی تھی۔ وہ قریب نہیں تھے کہ ان لوگوں کی بات سمجھیں لیکن بہرحال بدقت سمجھ گئے، جیسے: ﴿وَمَا كَادُوْا يَفْعَلُوْنَ﴾ (سورۃ البقرۃ آیت ۷۱) یعنی وہ کرتے ہوئے معلوم نہ ہوتے تھے قریب نہیں تھے کہ گائے ذبح کریں مگر حیل وحجت کے بعد ذبح کی، اسی طرح یہ قوم بھی معلوم نہیں ہوتا تھا کہ بات سمجھے گی مگر کوشش سے سمجھ گئی ـــــ ان لوگوں نے عرض کیا: اے ذوالقرنین! یاجوج وماجوج اس سرزمین میں آکر فساد مچاتے ہیں تو کیا ہم آپ کے لئے کچھ خرچ بایں شرط مقرر کردیں کہ آپ ہمارے اور ان کے درمیان کوئی روک بنادیں؟ ـــــ تاکہ وہ ہمارے علاقہ میں گھس کر ہمیں پریشان نہ کریں ـــــ یاجوج وماجوج

(۱) مَاجَ (ن) مَوْجًا: لہریں، مارنا یعنی کثرت کی وجہ سے ایسا معلوم ہوتا تھا کہ ایک دریا ہے جس کی لہریں اٹھ رہی ہیں اور پچھلی لہر اگلی لہر میں گھسی جارہی ہے اور جملہ يَمُوْجُ مفعول ثانی ہے تَرَكْنَا کا اور تَرَكْنَا بمعنی جَعَلْنَا ہے اور بعضھم مفعول اول ہے اور ضمیر کا مرجع یاجوج وماجوج ہیں اور یومئذ یموج سے متعلق ہے (۲) الصور: القَرْنُ يُنْفَخُ فيه: (رواہ ابوداؤد والنسائی مشکوۃ حدیث نمبر ۵۵۲۸) یعنی صور ایک سینگ ہے جس میں پھونکا جائے گا (۳) غِطَاءٌ: ڈھکنا یعنی وہ سرپوش جو طباق کی قسم میں سے ہو، کپڑے وغیرہ کا نہ ہو اور مرادی معنی ہیں غفلت (۴) كَانُوْا کا عطف كَانَتْ پر ہے پھر جملہ صلہ ہے اور موصول صلہ مل کر اَلْكَافِرُوْنَ کی صفت ہیں یعنی یہ لوگ کافر یاجوج وماجوج میں سے تھے۔

کے بارے میں تمام صحیح روایات، محدثین، مفسرین اور مؤرخین متفق ہیں کہ وہ حضرت نوح علیہ السلام کے صاحب زادے یافث کی اولاد ہیں۔ وہ کوئی عجیب الخلقت مخلوق نہیں بلکہ دنیائے انسانی کی عام آبادی کی طرح وہ بھی انسان ہیں۔ وہ ان پہاڑوں کی دوسری جانب آباد تھے اور ان کی بہت بڑی تعداد تھی۔ وہ کبھی کبھی موقعہ پا کر یلغار کرتے ہوئے مجاور قوموں میں گھس آتے تھے اور لوٹ مار کر کے لوٹ جاتے تھے ـــــ ذوالقرنین نے جواب دیا: جس چیز میں میرے پروردگار نے مجھے مقدرت دی ہے وہ بہتر ہے ـــــ یعنی مال اور خزانہ میرے پاس خدا کا دیا ہوا کافی ہے مجھے تمہاری مالی مدد کی ضرورت نہیں ـــــ البتہ تم زور وطاقت سے میری مدد کرو ـــــ یعنی ہاتھ پیر کی طاقت اور جسمانی محنت سے میرا ہاتھ بٹاؤ ـــــ میں تمہارے اور ان کے درمیان خوب مضبوط دیوار بنادونگا ـــــ تاکہ تم ان کے شر سے محفوظ ہو جاؤ ـــــ تم مجھے لوہے کے بڑے بڑے ٹکڑے دو ـــــ یعنی دیوار چننے میں میری مدد کرو ـــــ یہاں تک کہ جب اس نے دونوں پھانکوں کے بیچ میں دیوار چن کر برابر کر دی تو حکم دیا کہ دھکاؤ یہاں تک کہ ذوالقرنین نے اس کو لال انگارا کر دیا تو حکم دیا کہ مجھے لادو، میں اس پر پگھلا ہوا تانبا ڈال دوں ـــــ یعنی پہلے لوہے کے بڑے بڑے ٹکڑوں کی اوپر نیچے تہیں جمائیں۔ جب ان کی بلندی دونوں پہاڑوں کی چوٹی تک پہنچ گئی تو لوگوں کو حکم دیا کہ خوب آگ دُھونکو، جب لوہا آگ کی طرح سرخ ہو کر تپنے لگا، اس وقت پگھلا ہوا تانبا اوپر سے ڈالدیا جو لوہے کی درزوں میں گھس کر بالکل پیوست ہو کر جم گیا اور باہم مل کر دیوار بن گیا ـــــ پس یاجوج وماجوج نہ تو اس پر چڑھ سکے اور نہ اس میں سوراخ کر سکے ـــــ یعنی اس دیوار کی بلندی اور استحکام کے باعث اُن وحشی اور جنگ جو قبائل کی تاخت وتاراج سے امن ہو گیا۔ جب یہ غیر معمولی اور حیرت انگیز کام مکمل ہو گیا تو ـــــ ذوالقرنین نے کہا کہ یہ میرے پروردگار کی رحمت ہے۔ پھر جب میرے پروردگار کے وعدے کا وقت آئے گا تو وہ اس دیوار کو پیوند خاک کر دیں گے اور میرے پروردگار کا وعدہ برحق ہے ـــــ ذوالقرنین نے یہ بات بطور شکر نعمت کہی ہے کہ خدا کا کرم ہے: اتنا بڑا کام میرے ہاتھوں انجام پا گیا! اس موقعہ پر ذوالقرنین نے یہ بات بھی واضح کر دی کہ سر دست میں نے ان موذیوں کے شر سے تم کو محفوظ کر دیا مگر جب اس دیوار کی مدت پوری ہو جائے گی اور اس کے ٹوٹنے کا وقت آئے گا تو یہ مضبوط آہنی دیوار بھی زمین بوس ہو جائے گی۔ یعنی جس طرح دنیا کی ہر شئ فانی ہے یہ دیوار بھی اپنے وقت پر فنا ہو جائے گی ـــــ اور ہم نے اس روز ان کے بعض کو بعض میں ٹھاٹھیں مارتا ہوا چھوڑ دیا ـــــ یعنی اس جانب کا راستہ بند ہو جانے کے بعد وہ قومیں آپس ہی میں جنگ وپیکار میں مشغول ہو گئیں اور وہ قومیں اتنی کثیر تعداد میں تھیں کہ جب ان کی باہم جنگ ہوتی تو ایسا محسوس ہوتا جیسے سمندر موجیں مار رہا ہے ـــــ اور ''اس روز'' کا مطلب یہ

ہے کہ جب ان کے لئے اس جانب کا راستہ مسدود ہو گیا ـــــ اور ''چھوڑ دیا'' کا مطلب یہ ہے کہ وہ آپس میں لڑتے بھڑتے رہے ـــــ اور صور پھونکا جائے گا پھر ہم سب کو اکٹھا کر کے جمع کر لائیں گے ـــــ یعنی قیامت کے دن جب صور پھونکا جائے گا تو یاجوج وماجوج کا ایک ایک فرد حاضر کر دیا جائے گا، ان میں سے کوئی بھی غائب نہیں رہ سکے گا ـــ اور دوسرا مطلب یہ ہے کہ آج تو دیوار نے دونوں موقوں کو الگ الگ کر دیا ہے مگر قیامت کے روز یہ اور وہ سب جمع کر دیئے جائیں گے ـــــ اور اس دن ہم جہنم کو ان کافروں کے روبرو پیش کریں گے جن کی آنکھوں پر میری یاد سے پردہ پڑا ہوا تھا اور وہ سن ہی نہیں سکتے تھے ـــــ یعنی یاجوج وماجوج میں سے جو کافر ہیں ان کے سامنے، اسی طرح دیگر تمام کفار کی سامنے قیامت کے دن جہنم کھلے طور پر پیش کی جائے گی، جس کو وہ سر کی آنکھوں سے دیکھیں گے اور یقین کر لیں گے کہ ان کو ضرور اس میں گھسنا ہے اور یہ نتیجہ ہوگا اس کا کہ وہ دنیا میں اللہ کی یاد سے غافل تھے، اور ان کے کان اللہ کی باتوں سے بہرے تھے۔

آیات پاک کی یہ تفسیر امام العصر علامہ محمد انور شاہ کشمیری قدس سرہٗ سابق شیخ الحدیث دار العلوم دیوبند نے عقیدۃ الاسلام ص ۲۰۱ میں کی ہے۔ آپ کی عربی عبارت کا ترجمہ یہ ہے:

''یہ بات سمجھ لینی چاہئے کہ ﴿هٰذَا رَحْمَةٌ مِّنْ رَّبِّیْ، فَإِذَا جَآءَ وَعْدُ رَبِّیْ جَعَلَهٗ دَكَّآءَ وَكَانَ وَعْدُ رَبِّیْ حَقًّا﴾ ذوالقرنین کا اپنا قول ہے اور کوئی قرینہ سیاق وسباق میں ایسا موجود نہیں جس سے دیوار کے ٹوٹنے کو علامت قیامت میں شمار کیا جائے۔ اور شاید ذوالقرنین کو یہ پتہ بھی نہ ہو کہ اشراط ساعۃ میں خروج یاجوج وماجوج بھی ہے۔ انھوں نے ﴿وَعْدُ رَبِّیْ﴾ سے صرف اس کا کسی وقت میں ٹوٹ جانا مراد لیا ہے۔ پس اس صورت میں ارشاد باری ﴿وَتَرَكْنَا بَعْضَهُمْ يَوْمَئِذٍ يَّمُوْجُ فِيْ بَعْضٍ﴾ استمرار تجددی پر دلالت کرتا ہے یعنی برابر ایسا ہوتا رہے گا کہ ان میں سے بعض قبائل بعض پر حملہ آور ہوں۔ یہاں تک کہ قیامت کا وقت آ جائے، ہاں وہ ارشاد جو سورۃ الانبیاء میں آیا ہے یعنی ﴿حَتّٰى إِذَا فُتِحَتْ يَاْجُوْجُ وَمَاجُوْجُ وَهُوْ مِنْ كُلِّ حَدَبٍ يَّنْسِلُوْنَ﴾ تو یہ بات بلاشبہ علامات قیامت میں سے ہے مگر اس میں دیوار کا قطعاً کوئی ذکر نہیں۔ پس اس فرق کو ہمیشہ ملحوظ رکھنا چاہئے یعنی سورۃ الانبیاء کی آیت میں فتح سے عروج وخروج مراد ہے دیوار کا ٹوٹنا اور یاجوج ماجوج کا نکلنا مراد نہیں کیونکہ اُس آیت میں دیوار کا ذکر نہیں''

فائدہ (۱): وہ پہاڑ کونسے تھے جن کے درمیان ذوالقرنین نے دیوار بنائی تھی؟ اور وہ قوم کونسی تھی جن کی حفاظت کے لئے یہ سامان کیا گیا تھا؟ اور ذوالقرنین کی دیوار اب تک باقی ہے یا ٹوٹ پھوٹ چکی ہے؟ یہ وہ سوالات ہیں جن کے جوابات قرآن کریم میں نہیں ہیں۔ اس لئے یقین سے کوئی بات نہیں کہی جاسکتی۔ مؤرخین کا بیان ہے کہ ایران

سے جانب شمال بحر کاسپین (Caspian Sea) یعنی بحر قزوین (خزر) اور بحر اسود کے درمیان جو سلسلۂ کوہ ہے جس کو جبال کا کیشیا (Caucasus) جن کو جبال قَفْقَاز، قَفْقَاس اور تَفْلِيْس بھی کہتے ہیں۔ ان پہاڑوں میں ایک درّہ (گھاٹی) دَرَّهٔ دَارْيَال کے نام سے ہے۔ ذوالقرنین نے وہاں دیوار بنائی تھی۔ ان پہاڑوں کے مشرق میں بحر قزوین واقع ہے اور مغرب میں بحر اسود، اور بیچ میں سلسلۂ کوہ ہے اور گزرنے کا کوئی راستہ اس درّہ کے علاوہ نہیں۔ ذوالقرنین نے اس کو دیوار بنا کر مسدود کر دیا تھا —— اور وہ تُرک قبائل تھے جن کی حفاظت کے لئے یہ انتظام کیا گیا تھا —— اور خیال یہ ہے کہ سد ذوالقرنین اب باقی نہیں، ٹوٹ پھوٹ چکی ہے۔ البتہ سیاحوں نے وہاں اُس دیوار کے آثار دیکھے ہیں اور ممکن ہے کہ اب بھی ہوں۔ قرآن وحدیث میں کوئی صحیح اور صریح بات ایسی نہیں ہے جس سے قیامت سے کچھ پہلے تک اس دیوار کا بحالہ باقی رہنا ثابت ہوتا ہو۔

فائدہ (۲): یاجوج وماجوج کون ہیں؟ اکثر علما کی رائے یہ ہے کہ وہ عام انسانوں کی طرح آدم علیہ السلام کی اولاد ہیں اور حضرت نوح علیہ السلام کی ذریت میں سے ہیں۔ علامہ ابن کثیر رحمہ اللہ نے البدایہ والنہایہ (۲:۱۱۰) میں لکھا ہے کہ ''صحیح بات یہ ہے کہ وہ عام بنی آدم کی طرح ہیں اور انہی کی شکل وصورت اور جسمانی اوصاف رکھتے ہیں'' —— اور حافظ ابن حجر عسقلانی رحمہ اللہ نے فتح الباری (۶:۳۸۶) میں تحریر فرمایا ہے کہ ''یاجوج وماجوج: یافث بن نوح علیہ السلام کی اولاد میں سے دو قبیلے ہیں'' —— حضرت قتادہ رحمہ اللہ سے بھی یہی بات مروی ہے —— اور روح المعانی میں ہے: ''یاجوج وماجوج، یافث بن نوح علیہ السلام کی اولاد میں سے دو قبیلے ہیں اور یہی رائے وہب بن مُنبہ کی ہے اور متاخرین میں سے اکثر کی یہی رائے ہے'' —— بائبل کتاب پیدائش باب ۱۰ آیت ۲ میں بھی یافث کے ایک لڑکے کا نام ماجوج آیا ہے اور یاجوج کے بارے میں بائبل کا بیان مختلف ہے۔

غرض یاجوج وماجوج کوئی عجوبۂ روزگار مخلوق نہیں، نہ وہ برزخی مخلوق ہیں اور اس قسم کی جو روایات ہیں ان کا اسلامی روایات سے کچھ تعلق نہیں۔ وہ سب اسرائیلیات ہیں جو ''غرق مئے ناب اولیٰ'' کا مصداق ہیں۔ علامہ یاقوت حموی نے معجم البلدان میں، ابن کثیر نے البدایہ والنہایہ میں، حافظ ابن حجر نے فتح الباری میں اور مجاہد ملت مولانا حفظ الرحمٰن رحمہ اللہ نے قصص القرآن جلد سوم میں ان روایات کی تغلیط کی ہے اور سمجھنے کے لئے واضح بات یہ ہے کہ جب یاجوج وماجوج بنی آدم اور ذریت نوح ہیں تو پھر وہ دوسری ذریت سے اتنے مختلف کیسے ہو سکتے ہیں جتنا ان روایات میں دکھایا گیا ہے مثلاً:

(۱) یاجوج وماجوج بالشت، ڈیڑھ بالشت یا زیادہ سے زیادہ ایک ہاتھ کا قد رکھتے ہیں اور بعض غیر معمولی طویل

القامت ہیں۔

(۲) ان کے کان اتنے بڑے ہیں کہ ایک کو اوڑھتے ہیں اور دوسرے کو بچھاتے ہیں۔

(۳) ان کی غذا کے لئے قدرت سال بھر میں دو مرتبہ سمندر سے ایسی مچھلیاں پھینک دیتی ہے جن کے سر اور دم کا فاصلہ اس قدر طویل ہوتا ہے کہ دس رات دن اگر کوئی شخص اس پر چلتا رہے تب اس فاصلہ کو طے کر سکتا ہے۔

(۴) وہ یک برزخی مخلوق ہیں جو آدم علیہ السلام کی صلب سے تو ہیں مگر حضرت حواء رضی اللہ عنہا کے بطن سے نہیں ہیں کیونکہ وہ آدم علیہ السلام کے ایسے نطفہ سے پیدا ہوئے ہیں جو احتلام کی حالت میں نکلا تھا اور مٹی میں رل مل گیا تھا۔

اس قسم کی تمام باتیں قطعاً بے دلیل اور اٹکل کے تیر ہیں اسلامی روایات سے ان کا دور کا بھی واسطہ نہیں۔

فائدہ(۳): دنیا کی موجودہ اقوام میں سے یاجوج وماجوج کون ہیں؟ اس کا جواب بھی یقین کے ساتھ نہیں دیا جا سکتا۔ کیونکہ یاجوج وماجوج بہت قدیم نام ہیں اور مرور ایام کے ساتھ نام بدل جاتے ہیں۔ آج دنیا میں کوئی قوم ان ناموں سے موسوم نہیں اس لئے اس کی تعیین دشوار ہے۔ علمائے کرام کی ایک رائے یہ ہے کہ یاجوج وماجوج منگولیا (تاتار) کے ان وحشی قبائل کو کہا جاتا ہے جو یورپ امریکہ اور روس کی اقوام کے منبع ومنشا ہیں ان کے دو بڑے قبیلے موگ اور یوچی کہلاتے تھے جو عربی زبان میں یاجوج وماجوج بن گئے ہیں واللہ اعلم۔

فائدہ(۴): یاجوج وماجوج کے بارے میں اس قدر بے سروپا روایتیں کیوں مشہور ہوئیں؟ — اس کی وجہ یہ ہے کہ یاجوج وماجوج کا تذکرہ یہودیوں کی کتابوں میں بھی ہے۔ کتاب پیدائش کا حوالہ پہلے گذر چکا ہے۔ علاوہ ازیں حزقیل باب ۳۸ و ۳۹ میں بھی ان کا تذکرہ ہے۔ اس وجہ سے یہودیوں نے حسب فطرت یاجوج وماجوج کے بارے میں بعید از عقل کہانیاں تصنیف کر لیں اور کعب احبار کے ذریعہ جو یہودی النسل تھے اور ان کے قصوں کے بڑے عالم تھے، وہ سب کہانیاں مسلمانوں میں پھیل گئیں۔ مولانا حفظ الرحمٰن صاحب لکھتے ہیں:

''وہ اسلام لانے کے بعد یا تو تفریح کے طور پر ان کو سنایا کرتے تھے یا اس لئے کہ اس رطب ویابس میں سے جو دور از کار باتیں ہوں وہ رد کر دی جائیں اور جن سے قرآن اور احادیث نبوی کی تائید ہوتی ہو ان کو ایک تاریخی حیثیت میں لے لیا جائے۔ مگر نقل کرنے والوں نے اس حقیقت پر نظر نہ رکھتے ہوئے اس پورے طومار کو جو ''غرق مئے ناب اولیٰ'' کا مصداق تھا اس طرح نقل کرنا شروع کر دیا جس طرح حدیثی روایات کو نقل کیا جاتا ہے'' (قصص القرآن ۳: ۱۹۵)

فائدہ(۵): یاجوج وماجوج کا خروج وعروج بھی، دجال کے ظہور کی طرح علامات قیامت میں سے ہے۔ سورۃ الانبیاء آیت ۹۶ میں ہے ﴿ حَتّٰى إِذَا فُتِحَتْ يَاْجُوْجُ وَمَاجُوْجُ وَهُمْ مِنْ كُلِّ حَدَبٍ يَّنْسِلُوْنَ وَاقْتَرَبَ الْوَعْدُ

الْحَقُّ﴾ یعنی یہ بات ناممکن ہے کہ ہلاک شدہ انسان دنیا میں لوٹ آئیں یہاں تک کہ جب یاجوج وماجوج کھول دیئے جائیں گے اور وہ ہر بلندی سے پھسلتے آئیں گے اور سچا وعدہ نزدیک آپہنچے گا الخ۔ اس آیت کا مطلب یہ ہے کہ نفخ صور سے پہلے قیامت کی نشانیوں میں سے ایک نشانی یہ ظاہر ہوگی کہ یاجوج وماجوج کے تمام قبیلے ایک ساتھ امنڈ آئیں گے اور دنیا میں عام غارت گری شروع کردیں گے اور اپنی مقامی بلندیوں سے تیزی کے ساتھ اترتے ہوئے زمین کے گوشہ گوشہ میں پھیل جائیں گے۔ غرض آیت پاک میں فتح سے مراد عروج اور ان کا یکبارگی دھاوا بولنا ہے دیوار توڑ کر نکلنا مراد نہیں۔ کیونکہ اس آیت میں دیوار کا کوئی تذکرہ نہیں۔

فائدہ(۶): یاجوج وماجوج کے بارے میں ایک مشہور حدیث یہ ہے کہ وہ روزانہ سد ذوالقرنین کو کھودتے ہیں (لَيَحْفِرُوْنَ السَّدَّ) شام کو جب اتنی پتلی رہ جاتی ہے کہ سورج کی کرنیں نظر آنے کے قریب[1] ہوجاتی ہے تو ان کا سردار کہتا ہے کہ اب کام ختم کرو۔ اب یہ اس قابل ہوگئی ہے کہ کل تم اس کو کھود ڈالوگے۔ مگر جب اگلے روز کام پر واپس آتے ہیں تو دیوار کو پہلے سے بھی زیادہ مضبوط ومستحکم پاتے ہیں۔ پھر وہ کھودنا شروع کرتے ہیں۔ یہ سلسلہ اسی طرح چلتا رہے گا تا آنکہ مقررہ مدت آجائے اور اللہ تعالیٰ کو منظور ہو کہ وہ انسانی دنیا پر چھا جائیں تو ان کا سردار کہے گا کہ اب واپس چلو کل ان شاء اللہ اس کو کھود ڈالوگے۔ چنانچہ دوسرے دن ان کو دیوار ویسی ہی ملے گی اور وہ اس کو کھود ڈالیں گے اور لوگوں پر نکل پڑیں گے الخ۔

یہ روایت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ کا مضمون ہے۔ اور کعب احبار سے مروی روایت میں یہ ہے کہ وہ روزانہ دیوار کو چاٹتے ہیں (يَلْحَسُوْنَهٗ) اور یہی روایت لوگوں میں مشہور ہے۔ کعب احبار کی روایت عام کتابوں میں نہیں ہے۔ حافظ ابن حجر رحمہ اللہ نے عبداللہ بن حمید کی مسند کا حوالہ دیا ہے۔ اور حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ کی حدیث ترمذی شریف ابن ماجہ، مسند احمد، صحیح ابن حبان اور مستدرک حاکم وغیرہ کتابوں میں ہے اور سب کی ایک ہی سند ہے یعنی قتادة عن أبي رافع عن أبي هريرة عن رسول الله ﷺ پھر قتادہ کے نیچے اس کی متعدد سندیں ہیں۔ اس حدیث کی ایک دوسری سند عاصم عن ابی صالح عن ابی ہریرۃ بھی ہے مگر یہ روایت موقوف ہے مرفوع نہیں۔ یعنی اس سند سے یہ روایت حضرت ابو ہریرہ کا قول ہے آنحضرت ﷺ کا ارشاد نہیں۔ یہ سند عبد بن حمید کی کتاب میں ہے کما ذکره الحافظ۔

حافظ ابن حجر رحمہ اللہ نے حدیث ابو ہریرہؓ کے لئے ایک شاہد بھی ذکر کیا ہے اور وہ حضرت حذیفہ رضی اللہ عنہ کی

(۱) الفاظ یہ ہیں حَتّٰى إِذَا كَادُوْا يَرَوْنَ شُعَاعَ الشَّمْسِ گویا یاجوج وماجوج کسی ایسی جگہ بند ہیں کہ وہاں سورج کی روشنی نہیں پہنچتی ۱۲

حدیث ہے جو ابن مردویہ نے روایت کی ہے مگر اس کی سند بے حد ضعیف ہے یعنی وہ متابعت کے قابل نہیں۔

الغرض حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ کی حدیث کو عام طور پر صحیح سمجھا جاتا ہے۔ البانی نے بھی اس کو **سلسلة الأحاديث الصحيحه** میں نمبر ۱۷۳۵ پر ذکر کیا ہے۔ مگر ابن کثیر نے تفسیر میں اس پر سخت تنقید کی ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ ان کی سند اگر چہ عمدہ ہے مگر آنحضرت ﷺ کی طرف اس کی نسبت غلط ہے (**إسناده جيد ولكن متنه في رفعه نَكَارَةٌ**) نیز وہ یہ بھی فرماتے ہیں کہ اس قسم کی ایک اسرائیلی کہانی کعب احبار سے بھی مروی ہے اور حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ اکثر کعب احبار کے پاس بیٹھتے تھے اس لئے ممکن ہے کہ حضرت ابو ہریرہ نے یہ مضمون کعب احبار سے سنا ہو اور ایک کہانی کے طور پر بیان کیا ہو مگر نیچے کے کسی راوی نے غلط فہمی سے اس کو مرفوع کر دیا ہو۔

اس کے علاوہ علامہ ابن کثیر رحمہ اللہ نے درایۃً دو اعتراض کئے ہیں ایک یہ کہ یہ حدیث قرآن کے خلاف ہے۔ دوسرا یہ کہ یہ صحیح حدیث کے خلاف ہے۔ تفصیل کے لئے ان کی تفسیر دیکھیں۔ مزید غور کیا جائے تو اس کی سند میں درج ذیل دو کمزوریاں ہیں:

۱ ــ قتادہ مدلِّس ہیں۔ حافظ فرماتے ہیں کہ ابن مردویہ کی روایت میں قتادہ اور ابو رافع کے درمیان ایک راوی کا واسطہ[۱] ہے۔ امام ابوداؤد فرماتے ہیں کہ قتادہ نے ابو رافع سے کوئی حدیث نہیں سنی[۲] پس یہ رواست منقطع ہے۔

۲ ــ ابو رافع جن کا نام نُفَیع لقب صائغ (سنار) اور نسبت مدنی ثم بصری ہے، کعب احبار کے بھی شاگرد ہیں۔ مِزّی رحمہ اللہ نے تہذیب الکمال میں ابو رافع کے اساتذہ میں کعب احبار کا نام بھی لکھا ہے اور کعب احبار کے تلامذہ میں بھی ابو رافع کا نام لکھا ہے اور سنن ابوداؤد میں ابو رافع کی کعب احبار سے ایک روایت بھی مروی ہے[۳] اور وہ **الجراد من صيد البحر** ہے۔ ابو رافع یہی روایت حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے بھی نقل کرتے ہیں[۴] اس لئے بہت ممکن ہے کہ یاجوج و ماجوج والی روایت بھی انھوں نے کعب احبار سے سنی ہو اور حضرت ابو ہریرہ کی طرف منسوب کر دی ہو۔ اور اس کا ایک قرینہ یہ ہے کہ ترمذی شریف میں اس کی سند اس طرح ہے **عن أبي رافع عن حديث أبي هريرة** معلوم نہیں سند میں یہ لفظ ''حدیث'' کیوں بڑھایا ہے۔ ممکن ہے ابو رافع نے حضرت ابو ہریرہؓ کی حدیثیں سناتے ہوئے یہ حدیث بھی سنائی ہو، جو درحقیقت کعب احبار سے سنی ہوئی ہے اور اس کو قتادہ کے مجہول استاذ نے حضرت ابو ہریرہ کی طرف منسوب کر دیا ہو۔

(۱) فتح الباری ۱۳: ۱۰۹ (۲) **قال أبو داود: يقال: قتادة لم يسمع من أبي رافع؛ زاد في نسخة: شيئا** (بذل المجهود ۲۰: ۱۲۸) (۳) **بذل المجهول** ۹: ۱۰۱ (۴) بذل ۹: ۱۰۰۔

اور ابورافع کے حالات میں حافظ نے تہذیب التہذیب میں ایک عجیب بات لکھی ہے کہ خود ابورافع بیان کرتے تھے کہ حضرت عمر میرے ساتھ دل لگی کیا کرتے تھے اور فرمایا کرتے تھے کہ أَكْذَبُ الناسِ الصائِغُ (صائغ سب سے بڑا جھوٹا ہے) اور یہ بھی فرماتے تھے کہ الیوم و غدًا یعنی آج بھی اور آئندہ بھی۔ حالانکہ حضرت عمرؓ کا مزاج دل لگی کرنے کا نہیں تھا۔ پھر یہ دل لگی تو عجیب ہے کہیں ایسا تو نہیں کہ قلندر ہر چہ گوید دیدہ گوید اور کہیں ایسا تو نہیں کہ انہی ابورافع نے یہ حدیث آنحضرت ﷺ کی طرف منسوب کردی ہو! کیونکہ ابوصالح بہرحال صائغ سے مضبوط راوی ہیں۔ اور وہ حدیث کو موقوف بیان کرتے ہیں۔ واللہ اعلم بالصواب۔

فائدہ(۷): یاجوج وماجوج کے بارے میں چند صحیح روایات درج ذیل ہیں۔

پہلی حدیث: صحیحین میں روایت ہے کہ ایک مرتبہ رسول اللہ ﷺ نیند سے ایسی حالت میں بیدار ہوئے کہ چہرۂ مبارک سرخ ہو رہا تھا اور زبان مبارک پر یہ کلمات تھے: لَآ اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ، وَيْلٌ لِّلْعَرَبِ مِنْ شَرٍّ قَدِ اقْتَرَبَ فُتِحَ الْيَوْمَ مِنْ رَدْمِ يَاجُوْجَ وَمَاجُوْجَ مِثْلَ هٰذِهٖ؛ وَحَلَّقَ تِسْعِيْنَ[1] یعنی اللہ تعالیٰ کے سوا کوئی معبود نہیں، عرب کے لئے خرابی ہے اس شر سے جو قریب آچکا ہے۔ آج سد یاجوج وماجوج اتنی کھول دی گئی، اور آپؐ نے نوے کا حلقہ بنایا یعنی انگوٹھے اور انگشت شہادت کو ملا کر حلقہ بنا کر دکھلایا ـــــ اس حدیث شریف میں مذکور واقعہ خواب کا واقعہ ہے یعنی خواب میں آنحضرت ﷺ نے یہ منظر دیکھا ہے اور خواب اکثر تمثیلی رنگ میں نظر آتا ہے اور اس کی تعبیر ہوتی ہے چنانچہ اس خواب کی تعبیر آپ نے یہ بیان فرمائی کہ عرب کے لئے شرور وفتن کے دور کا آغاز ہونے والا ہے۔ غرض اس حدیث کا یہ مطلب نہیں کہ واقعۃً دیوار میں اتنا سوراخ اس روز ہوگیا تھا جیسے آنحضرت ﷺ نے ذوالفقار تلوار کے بارے میں جنگ احد کے موقعہ پر خواب دیکھا تھا کہ آپ نے اس کو ہلایا تو اس کی دھار جھڑ گئی اور یہ بات خواب میں آپ کو ناگوار ہوئی۔ بیدار ہونے کے بعد آپ نے اس کی تعبیر اُس شکست سے بیان فرمائی جو جنگ احد میں پیش آئی، ذوالفقار کی دھار حقیقت میں جھڑی نہیں تھی۔

دوسری حدیث: صحیحین میں حضرت ابوسعید خدری رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ''قیامت کے روز اللہ تعالیٰ حضرت آدم علیہ السلام سے فرمائیں گے کہ آپ اپنی ذریت میں سے جہنم کی کھیپ نکالیں۔ آدم علیہ السلام تناسب دریافت کریں گے۔ ارشاد ہوگا کہ ہزار میں سے نوسوننانوے جہنم کے لئے علیحدہ کریں اور ایک جنت کے لئے''۔ یہ ارشاد سن کر صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم سہم گئے کہ ہزار میں سے ایک جنتی ہوگا تو کس کا نمبر آئے گا؟

(۱) بخاری حدیث ۳۳۴۶، فتح الباری ۶:۳۸۱۔

آپ نے فرمایا: ''غم نہ کرو، تم میں سے ایک ہوگا اور یاجوج و ماجوج میں سے ایک ہزار ہوں گے''[1] ــــــ ابن کثیر رحمہ اللہ نے لکھا ہے کہ اس حدیث سے معلوم ہوا کہ یاجوج و ماجوج کی تعداد انسانی آبادی میں سب سے زیادہ ہے۔

تیسری حدیث: مسلم شریف میں حضرت نواس بن سَمعان رضی اللہ عنہ کی ایک طویل روایت ہے، اس کا وہ حصہ جو یاجوج و ماجوج سے متعلق ہے یہ ہے:

''جب حضرت عیسیٰ علیہ السلام قتل دجال سے فارغ ہو جائیں گے تو حق تعالیٰ کا حکم آئے گا کہ میں اپنے بندوں میں سے ایسے بندے بھیج رہا ہوں جن کے مقابلہ کی کسی میں طاقت نہیں۔ آپ مسلمانوں کو جمع کر کے کوہ طور پر چلے جائیں اور حق تعالیٰ یاجوج و ماجوج کو بھیجیں گے۔ وہ سرعت سیر کے سبب ہر بلندی سے پھسلتے ہوئے دکھائی دیں گے۔ ان میں سے پہلے لوگ بُحیرۂ طبریہ[2] سے گذریں گے۔ اور اس کا سب پانی پی کر ایسا کر دیں گے کہ جب ان میں سے دوسرے لوگ اس بحیرہ سے گذریں گے تو کہیں گے کہ یہاں کبھی پانی رہا ہوگا۔ پھر اللہ تعالیٰ ایک وبا بھیجیں گے جس سے سب یاجوج و ماجوج مر جائیں گے''[3]

اس روایت کے ایک طریق میں یہ بھی ہے کہ بحیرۂ طبریہ سے گذرنے کے بعد یاجوج و ماجوج بیت المقدس کے پہاڑوں میں سے ایک پہاڑ جبل الخمر پر چڑھ جائیں گے اور کہیں گے کہ ہم نے زمین والوں کو سب کو قتل کر دیا، آؤ اب ہم آسمان والوں کا خاتمہ کریں اور وہ آسمان کی طرف تیر پھینکیں گے حق تعالیٰ کے حکم سے وہ تیر خون آلود ہو کر ان کی طرف واپس آئیں گے (تا کہ وہ احمق خوش ہوں کہ انھوں نے آسمان والوں کا بھی خاتمہ کر دیا)

چیونٹی کی جب موت آتی ہے تو اس کے پر لگتے ہیں اور وہ آسمان پر اڑنے کی کوشش کرتی ہے

اَفَحَسِبَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْٓا اَنْ يَّتَّخِذُوْا عِبَادِيْ مِنْ دُوْنِيْٓ اَوْلِيَاۗءَ ۭ اِنَّآ اَعْتَدْنَا جَهَنَّمَ لِلْكٰفِرِيْنَ نُزُلًا ﴿۱۰۲﴾ قُلْ هَلْ نُنَبِّئُكُمْ بِالْاَخْسَرِيْنَ اَعْمَالًا ﴿۱۰۳﴾ۭ اَلَّذِيْنَ ضَلَّ سَعْيُهُمْ فِي الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا وَهُمْ يَحْسَبُوْنَ اَنَّهُمْ يُحْسِنُوْنَ صُنْعًا ﴿۱۰۴﴾ اُولٰۗىِٕكَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا بِاٰيٰتِ رَبِّهِمْ وَلِقَاۗىِٕهٖ فَحَبِطَتْ اَعْمَالُهُمْ فَلَا نُقِيْمُ لَهُمْ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ وَزْنًا ﴿۱۰۵﴾ ذٰلِكَ جَزَاۗؤُهُمْ

(۱) بخاری شریف حدیث نمبر ۳۳۴۸ (۲) بحیرۂ طبریہ بحر میت اور فلسطین سے شمال کی طرف ایک جھیل ہے، نہر اُردن اس میں گرتی ہے، شہر طبریہ اس کے پاس ہے اور حَیفا پورٹ سے جانب مشرق واقع ہے (۳) مسلم شریف ۱۸: ۶۳ مصری باب ذکر الدجال۔

جَهَنَّمُ بِمَا كَفَرُوْا وَاتَّخَذُوْٓا اٰيٰتِيْ وَرُسُلِيْ هُزُوًا ﴿۱۰۶﴾ اِنَّ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ كَانَتْ لَهُمْ جَنّٰتُ الْفِرْدَوْسِ نُزُلًا ﴿۱۰۷﴾ خٰلِدِيْنَ فِيْهَا لَا يَبْغُوْنَ عَنْهَا حِوَلًا ﴿۱۰۸﴾

اَفَحَسِبَ	کیا تو خیال کرتے ہیں	اَلَّذِيْنَ	(وہ) جو	فَلَا نُقِيْمُ	پس نہ قائم کریں گے ہم
الَّذِيْنَ (۱)	وہ لوگ جنہوں نے	ضَلَّ	اکارت گئی	لَهُمْ	ان کے لئے
كَفَرُوْٓا	انکار کیا	سَعْيُهُمْ	ان کی محنت	يَوْمَ الْقِيٰمَةِ	قیامت کے دن
اَنْ يَّتَّخِذُوْا	کہ بنائیں وہ	فِي الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا	دنیا کی زندگی میں	وَزْنًا	کوئی وزن
عِبَادِيْ	میرے بندوں کو	وَهُمْ	اور وہ	ذٰلِكَ (۴)	یہ
مِنْ دُوْنِيْٓ	مجھے چھوڑ کر	يَحْسَبُوْنَ	خیال کرتے ہیں	جَزَآؤُهُمْ	ان کا بدلہ
اَوْلِيَآءَ	کارساز (حمایتی)	اَنَّهُمْ	کہ وہ	جَهَنَّمُ	دوزخ ہے
اِنَّآ اَعْتَدْنَا	بیشک تیار کیا ہے ہم نے	يُحْسِنُوْنَ	اچھے کر رہے ہیں	بِمَا كَفَرُوْا	ان کے کفر کی وجہ سے
جَهَنَّمَ	دوزخ کو	صُنْعًا	کام	وَاتَّخَذُوْٓا	اور انکے بنانے کی وجہ سے
لِلْكٰفِرِيْنَ	کافروں کے لئے	اُولٰٓئِكَ	یہ لوگ	اٰيٰتِيْ	میری آیتوں کو
نُزُلًا (۲)	مہمانی	الَّذِيْنَ	جنھوں نے	وَرُسُلِيْ	اور میرے رسولوں کو
قُلْ	آپ کہئے	كَفَرُوْا	انکار کیا	هُزُوًا	مذاق
هَلْ نُنَبِّئُكُمْ	کیا بتائیں ہم تم کو	بِاٰيٰتِ رَبِّهِمْ	اپنے رب کی آیتوں کا	اِنَّ الَّذِيْنَ	بے شک جو لوگ
بِالْاَخْسَرِيْنَ	سب سے زیادہ گھاٹے	وَلِقَآئِهٖ	اور ان سے ملنے کا	اٰمَنُوْا	ایمان لائے
	میں رہنے والے	فَحَبِطَتْ	پس غارت ہوگئے	وَعَمِلُوا	اور کئے انھوں نے
اَعْمَالًا (۳)	اعمال کے اعتبار سے؟	اَعْمَالُهُمْ	ان کے اعمال	الصّٰلِحٰتِ	نیک کام

(۱) اَلَّذِيْنَ كَفَرُوْا، حَسِبَ کا فاعل ہے اور أَنْ يَتَّخِذُوْا مفعول بہ قائم مقام دو مفعولوں کے ہے — عَبَادِيْ مفعول اول ہے يَتَّخِذُوْا کا اور أَوْلِيَاءَ مفعول ثانی ہے اور مِنْ دُوْنِيْ حال ہے عَبَادِيْ کا (۲) نُزُلًا مفعول ثانی ہے اَلنُّزُل (اسم) کھانا جو مہمان کے سامنے پیش کیا جائے، مہمان کے قیام کی جگہ جمع أَنْزَالٌ (۳) أَعْمَالًا: تمیز ہے اور اس کو جمع یا تو مشاکلۃً لایا گیا ہے یا انواع اعمال کو شامل ہونے کی وجہ سے جمع لایا گیا ہے کیونکہ تمیز میں اصل مفرد ہونا ہے اور اَلَّذِيْنَ مع صلہ مبتدا محذوف کی خبر ہے اور الأخسرين کی صفت، بدل اور عطف بیان بھی ہو سکتے ہیں (۴) ذٰلِكَ مبتدا ہے اور جَزَاءُ هُمْ اس سے بدل (بدل اشتمال یا بدل کل) اور جہنم خبر ہے اور ذٰلِكَ مذکر اس لئے ہے کہ خبر حقیقت میں بدل کی ہے۔

كَانَتْ لَهُمْ	ان کے لئے ہیں	نُزُلًا	مہمانی	لَا يَبْغُوْنَ	نہیں چاہیں گے وہ
جَنّٰتُ	باغات	خٰلِدِيْنَ	ہمیشہ رہنے والے ہیں وہ	عَنْهَا	ان سے
الْفِرْدَوْسِ (۱)	بہشت (ٹھنڈی چھاؤں) کے	فِيْهَا	ان میں	حِوَلًا (۱)	تبدیلی

ان آیتوں میں کافروں کا اخروی انجام تفصیل سے بیان کیا گیا ہے اور مقابلہ میں مؤمنین کا بہترین انجام بھی ذکر کیا ہے۔ یہ قرآن کریم کا خاص اسلوب ہے کہ جب وہ ایک فریق کا تذکرہ کرتا ہے تو دوسرے فریق کا تذکرہ بھی ضرور کرتا ہے تاکہ ترغیب وترہیب اور انداز وتبشیر کے دونوں پہلو ایک ساتھ ہوجائیں۔

ان آیتوں میں کافروں کے بارے میں دو باتیں بیان کی گئی ہیں: (۱) آخرت میں ان کا کوئی والی وارث نہ ہوگا (۲) آخرت میں کافروں کو ان کے نیک کاموں کا بدلہ کیوں نہیں ملے گا؟ —— اس کے بعد مؤمنین صالحین کا اخروی انجام ذکر کیا گیا ہے:

مشرکین کے جھوٹے سہارے آخرت میں کچھ کام نہ آئیں گے۔ ارشاد ہے —— پس کیا وہ لوگ جنھوں نے کفر کیا: گمان کرتے ہیں کہ وہ مجھ کو چھوڑ کر میرے بندوں کو کارساز بنالیں گے! —— یعنی جب صور پھونکا جائے گا اور اولین وآخرین میدانِ حشر میں جمع کئے جائیں گے تو نفسی نفسی کا عالم ہوگا، حساب کتاب سر پے کھڑا ہوگا اس روز کیا مشرکین کے جھوٹے معبود ان کو عذاب سے بچالیں گے؟ کیا کفار یہ سوچتے ہیں کہ وہ میرے خاص بندوں کو جن کی وہ دنیا میں پرستش کرتے رہے ہیں اپنی حمایت میں کھڑا کرلیں گے؟ ہرگز نہیں! اس دن اللہ کے منشا کے بغیر کوئی کسی کی سفارش نہیں کرسکے گا اور جب اللہ تعالیٰ کے خاص بندے اس روز کچھ نہیں کرسکیں گے تو دیگر مخلوقات جن کی کفار پوجا کرتے ہیں کیا نفع پہنچاسکتی ہیں؟ —— ہم نے کافروں کی ضیافت کے لئے جہنم تیار کر رکھی ہے —— پس کفار کا اللہ تعالیٰ کی رحمت سے امید باندھنا فضول ہے۔ اللہ تعالیٰ کی رحمت ان بندوں کے حصہ میں آتی ہے جو اللہ پر سچا ایمان رکھتے ہیں۔ جو لوگ غیر اللہ سے لو لگائے رہتے ہیں ان کے نصیب میں جہنم کے انگارے ہیں اور وہی ان کی مہمانی کا کھانا ہے اور کیسا برا ہے وہ کھانا!

(۱) فِرْدُوْس کے بارے میں مختلف اقوال ہیں کہ یہ عربی لفظ ہے یا فارسی یا قبطی۔ فارسی میں فردوس اس باغ کو کہتے ہیں جس کے درخت پھیلتے جائیں اور قبطی میں انگور کی ٹٹیوں کو کہتے ہیں جمع فَرَادِيْس اور نُزُلاً كَانَتْ کی خبر بھی ہوسکتا ہے اس وقت لَهُمْ محذوف سے متعلق ہوکر حال ہوجائے گا اور اگر لَهُمْ خبر مقدم ہو تو نُزُلاً حال ہوگا (۲) حِوَلاً (مصدر) تَحَوَّلَ الرَّجُلُ: ایک جگہ سے دوسری جگہ منتقل ہونا۔

کافروں کو آخرت میں نیک کاموں کا بدلہ کیوں نہیں ملے گا؟ —— اگر سوال کیا جائے کہ کفار بھی تو دنیا میں اچھے کام کرتے ہیں۔ غریبوں کی مدد کرتے ہیں، رفاہی ادارے قائم کرتے ہیں، عدل وانصاف برتتے ہیں، مہربانی اور رحم دلی کا مظاہرہ کرتے ہیں اور بعض لوگ تو ایسے خیراتی کام کرتے ہیں جس سے ایک دنیا فائدہ اٹھاتی ہے تو کیا ان کو ان کاموں کا آخرت میں کچھ بھی صلہ نہ ملے گا؟ جواب یہ ہے کہ ان کے لئے آخرت میں کوئی صلہ نہیں اور اس کی دو وجہیں ہیں:

پہلی وجہ: یہ ہے کہ کفار کے سارے مقاصد دنیا تک محدود ہیں ان کو نتائج اعمال اسی دنیا میں مطلوب ہیں اس لئے ان کے اعمال اسی دنیائے فانی کے ساتھ فنا ہوجائیں گے۔ آخرت میں کام آنے والے تو بس وہی اعمال ہیں جو اللہ کی خوشنودی کے لئے کئے گئے ہیں اور کافر چونکہ اللہ تعالیٰ پر صحیح ایمان نہیں رکھتا نہ آخرت کا اسے سچا یقین ہے اس لئے اس کے اعمال آخرت میں بے کار ہونگے۔ ارشاد ہے —— آپ دریافت کیجئے: کیا ہم تم کو ایسے لوگ بتائیں جو اعمال کے اعتبار سے سب سے زیادہ گھاٹے میں ہونگے؟ یہ وہ لوگ ہیں جن کی کری کرائی محنت دنیا کی زندگی میں اکارت گئی اور وہ اسی خیال میں رہے کہ وہ اچھے کام کررہے ہیں —— یعنی وہ لوگ دنیا میں رات دن دوڑ دھوپ کرتے رہے اور اس خوش فہمی میں رہے کہ ہمارا دن پُن آخرت میں کام آئے گا مگر موت کے بعد جب آنکھ کھلی تو پتا چلا کہ کچھ بھی ساتھ نہیں آیا، سب کام دنیا ہی میں رہ گئے۔ کیونکہ ان کی ساری تگ ودو اور کدوکاوش بس دنیا کے لئے تھی۔

دوسری وجہ: یہ ہے کہ آخرت میں اجر پانے کے لئے ایمان شرط ہے اور کفار چونکہ ایمان نہیں رکھتے اس لئے آخرت میں ان کے لئے کوئی صلہ نہیں۔ ارشاد ہے —— یہ وہ لوگ ہیں جنھوں نے اپنے پروردگار کی آیتوں کا اور ان کے حضور میں پیشی کا انکار کیا، چنانچہ ان کے سارے اعمال اکارت گئے۔ پس قیامت کے دن ہم ان کا ذرّہ بھر بھی وزن قائم نہ کریں گے —— یعنی ان کے اعمال جو ظاہر میں بڑے اچھے نظر آتے ہیں میزان حساب میں ان کا کوئی وزن نہ ہوگا۔ آنحضرت ﷺ کا ارشاد ہے: ''قیامت کے دن ایک آدمی لمبا اور فربہ آئے گا جو اللہ کے نزدیک مچھر کے پر کے برابر بھی وزن نہ رکھتا ہوگا'' پھر فرمایا کہ اگر اس کی تصدیق چاہو تو قرآن کی یہ آیت پڑھو ﴿فَلَا نُقِيْمُ لَهُمْ يَوْمَ الْقِيَامَةِ وَزْنًا﴾ —— اور حضرت ابوسعید خدری رضی اللہ عنہ کا ارشاد ہے کہ قیامت کے دن ایسے ایسے اعمال لائے جائیں گے جو جسامت میں تہامہ کے پہاڑوں کے برابر ہوں گے مگر میزان عمل میں ان کا کوئی وزن نہ ہوگا۔

غرض جس شخص کا عقیدہ اور ایمان درست نہ ہو وہ خواہ کتنے ہی اچھے اعمال کرے اور کتنی ہی محنت اٹھائے وہ آخرت میں بیکار اور ضائع ہیں۔ قرآن کریم میں جگہ جگہ اعمال کی قبولیت کے لئے ایمان کی شرط لگائی گئی ہے اس لئے کفار کو ان کے اچھے کاموں کا آخرت میں کوئی صلہ نہیں ملے گا۔

کفار کا انجام: ـــــ یہ ان کی جزا جہنم ہے اس وجہ سے کہ انھوں نے کفر اختیار کیا اور میری آیتوں کا اور میرے رسولوں کا مذاق اڑایا ـــــ یعنی صرف کفر و شرک ہی اختیار نہ کیا بلکہ ترقی کر کے یہاں تک پہنچ گئے کہ اللہ کی کتابوں کا پیغمبروں کا اور احکام الٰہی کا تمسخر کیا اس کا صلہ یہ جہنم ہے۔

مؤمنین کا انجام: ـــــ بیشک جو لوگ ایمان لائے اور انھوں نے نیک کام کئے، ان کی میزبانی کے لئے بہشت کے باغات ہیں جن میں وہ ہمیشہ رہیں گے اور وہ وہاں سے انتقال مکانی کی خواہش نہ کریں گے ـــــ فردوس جنت کا سب سے اعلیٰ اور افضل درجہ ہے۔ فردوس ایسے باغ کو کہتے ہیں جس کے گرد دیوار بنی ہوئی ہو، وسیع ہو، اس میں گھنے درخت ہوں اور ہر قسم کے پھل، خصوصاً انگور پائے جاتے ہوں ـــ جنت کا یہ مقام اہل ایمان کے لئے لازوال دائمی نعمت ہے، جو شخص جنت میں داخل ہوگا وہ وہاں سے کبھی نہ نکالا جائے گا نہ اس کا وہاں کبھی جی اکتائے گا کہ وہ دوسری جگہ منتقل ہونے کی خواہش کرے وہ جنت کی نوع بہ نوع نعمتوں اور دل کش فضاؤں سے ہمیشہ مسرور محفوظ ہوتا رہے گا۔

حدیث شریف میں ہے کہ: ''جو شخص اللہ پر اور اس کے رسول پر ایمان لائے، نماز کا اہتمام کرے اور رمضان کے روزے رکھے یعنی تمام فرائض و واجبات کی ادائیگی کا اہتمام کرے: اللہ تعالیٰ اسے ضرور جنت میں داخل فرمائیں گے، خواہ اس نے راہ خدا میں جہاد کیا ہو یا زیاد بوم میں بیٹھا رہا ہو''۔ صحابہ نے عرض کیا کہ یا رسول اللہ! کیا ہم یہ خوشخبری لوگوں کو سنا دیں؟ آپ نے ارشاد فرمایا: ''جنت میں سو درجے ایسے ہیں جو اللہ تعالیٰ نے راہِ خدا میں جہاد کرنے والوں کے لئے تیار کئے ہیں۔ ہر دو درجوں کے درمیان آسمان و زمین کا تفاوت ہے۔ لہٰذا جب تم اللہ تعالیٰ نے مانگو تو جنت الفردوس مانگو کیونکہ وہ جنت کا اعلیٰ اور افضل درجہ ہے اور اس سے اوپر عرش الٰہی ہے اور وہیں سے جنت کی نہریں نکلتی ہیں''

> جنت اللہ کی خوشنودی کا گھر ہے۔ اور وہ ان لوگوں کی میراث ہے جو مؤمن ہیں اور نیکی اور پاکبازی کی زندگی گزارتے ہیں

قُلْ لَّوْ كَانَ الْبَحْرُ مِدَادًا لِّكَلِمٰتِ رَبِّيْ لَنَفِدَ الْبَحْرُ قَبْلَ اَنْ تَنْفَدَ كَلِمٰتُ رَبِّيْ وَلَوْ جِئْنَا بِمِثْلِهٖ مَدَدًا ﴿۱۰۹﴾ قُلْ اِنَّمَآ اَنَا بَشَرٌ مِّثْلُكُمْ يُوْحٰٓى اِلَيَّ اَنَّمَآ اِلٰهُكُمْ اِلٰهٌ وَّاحِدٌ ۚ فَمَنْ كَانَ يَرْجُوْا لِقَآءَ رَبِّهٖ فَلْيَعْمَلْ عَمَلًا صَالِحًا وَّلَا يُشْرِكْ بِعِبَادَةِ رَبِّهٖٓ اَحَدًا ﴿۱۱۰﴾ ع ۱۲

قُلْ	آپ کہئے	لَوْ كَانَ	اگر ہو	الْبَحْرُ	سمندر

مِدَادًا (۱)	روشنائی	مَدَدًا (۵)	مدد کے طور پر	اِلٰهٌ وَّاحِدٌ	ایک معبود ہے
لِّكَلِمٰتِ (۲)	باتوں کے لئے	قُلْ	آپ کہئے	فَمَنْ	پس جو شخص
رَبِّيْ	میرے رب کی	اِنَّمَآ (۶)	بس	كَانَ يَرْجُوْا	آرزومند ہے
لَنَفِدَ (۳)	تو ختم ہوجائے	اَنَا	میں	لِقَآءَ رَبِّهٖ	اپنے رب سے ملنے کا
الْبَحْرُ	سمندر	بَشَرٌ	ایک انسان ہوں	فَلْيَعْمَلْ (۷)	تو چاہئے کہ کرے وہ
قَبْلَ اَنْ تَنْفَدَ (۴)	ختم ہونے سے پہلے	مِّثْلُكُمْ	تم جیسا	عَمَلًا صَالِحًا	نیک کام
كَلِمٰتُ رَبِّيْ	میرے رب کی باتیں	يُوْحٰٓى	وحی کی جاتی ہے	وَّلَا يُشْرِكْ	اور نہ شریک کرے وہ
وَلَوْ	اگرچہ	اِلَيَّ	میری طرف	بِعِبَادَةِ	عبادت میں
جِئْنَا	لائیں ہم	اَنَّمَآ	(کہ) بس	رَبِّهٖٓ	اپنے رب کی
بِمِثْلِهٖ	ویسا ہی	اِلٰهُكُمْ	تمہارا معبود	اَحَدًا	کسی کو

(۱) مِدَادٌ (اسم) روشنائی، مثال وطریقہ اور تعداد وغیرہ کیلئے مستعمل ہے جیسے هُمْ عَلٰى مِدَادٍ وَاحِدٍ: وہ ایک مثال پر ہیں۔ سُبْحَانَ اللّٰهِ مِدَادَ كَلِمَاتِهِ اللہ کے لئے پاکی ہے ان کی باتوں کی تعداد کے مطابق یعنی غیر متناہی۔۔۔ یہاں پہلے معنی مراد ہیں اور البحر سے مراد جنس ہے جو قلیل وکثیر سب پر صادق آتی ہے کوئی معین سمندر مراد نہیں (۲) مضاف محذوف ہے أی لکتابه کلمات إلخ (۳) نَفِدَ (س) نَفَادًا الشيءُ: ختم ہونا، نمٹ جانا (۴) جملہ تَنْفَدُ بتاویل مصدر ہوکر قَبْلَ کا مضاف الیہ ہے (۵) مَدَدًا تمیز ہے اور مَدَدٌ کے معنی ہیں زیادتی کمک مگر آیت میں عام زیادتی مراد نہیں بلکہ روشنائی کی افزونی اور ایسی زیادتی مراد ہے جو کسی پانی کے سرچشمے اور سوت سے پیہم ہوتی رہے (۶) إِنَّمَا میں إِنَّ حرف مشبہ بالفعل ہے اور ما کافہ ہے۔ مَا نے إِنَّ کا لفظی عمل روک دیا ہے اور پورا کلمہ إِنَّمَا حصر کے لئے ہے۔۔۔ اور أَنَّمَا میں بھی أَنَّ حرف مشبہ بالفعل اور ما کافہ ہے۔ اس مَا نے بھی أَنَّ کا لفظی عمل روک دیا ہے اور یہ بھی کلمۂ حصر ہے۔۔۔ اور دونوں کا معنوی عمل باقی ہے۔ إِنَّ کا کام جملہ کی تاکید ہے اور أَنَّ جملہ کی تاکید کے ساتھ مابعد کو بتاویل مفرد بھی کرتا ہے۔۔۔ ابن ہشام نحوی (متوفی ۷۶۱ھ) مغنی اللبیب ص ۵۹ میں تحریر فرماتے ہیں: "اصح یہ ہے کہ أَنَّ (مفتوحہ) إِنَّ (مکسورہ) کی فرع ہے اور اسی وجہ سے زمخشری کا یہ دعوی صحیح ہے کہ أَنَّمَا (مفتوحہ) إِنَّمَا (مکسورہ) کی طرح مفید حصر ہے اور یہ دونوں کلمات حصر اس آیت میں جمع ہیں۔ پہلا کلمہ صفت کو موصوف پر منحصر کرنے کے لئے ہے اور دوسرا برعکس"۔۔۔ إِنَّمَا أَنَا بَشَرٌ مِّثْلُكُمْ میں مخاطبین جیسی بشریت (صفت) مقصور ہے اور أَنَا (موصوف) مقصور علیہ ہے اور أَنَّمَا اِلٰهُكُمْ اِلٰهٌ وَّاحِدٌ میں معبود برحق (موصوف) مقصور ہے اور وحدانیت (صفت) مقصور علیہ ہے۔۔۔ پس پہلے جملہ کا مطلب یہ ہے کہ میں تو بس تم ہی جیسا ایک آدمی ہوں، اللہ کی ساری باتیں نہیں جانتا جیسا کہ تم نہیں جانتے، صرف وہی باتیں جانتا ہوں جو میری طرف وحی کی جاتی ہیں اور دوسرے جملہ کا مطلب یہ ہے کہ معبود برحق میں صرف وحدانیت کی صفت ہے تعدد کی صفت نہیں ہے جیسا کہ مشرکین کا خیال ہے۔۔۔ مثلکم صفت ہے بشرٌ کی اور إنما إلهكم بتاویل مفرد ہوکر یوحی کا نائب فاعل ہے (۷) لِيَعْمَلْ امر غائب ہے ۱۲

یہ اس سورت کی آخری موعظتیں ہیں۔ان دو آیتوں میں دو اہم باتیں بیان کی گئی ہیں:
ایک: اللہ تعالیٰ کے علوم غیر متناہی ہیں۔ان کے کلمات بے نہایت ہیں اور ان کی بے باتیں بے پایاں ہیں۔
دوسری: رسول اللہ ﷺ بھی ایک بشر ہیں البتہ آپ کو اللہ تعالیٰ نے وحی سے سرفراز فرمایا ہے۔
یہ دو باتیں اس سورت کے خاتمہ میں اس لئے بیان کی گئی ہیں کہ اس سورت میں قریش کے تین سوالات کے جوابات نازل کئے گئے ہیں۔یہ جوابات کچھ بہت زیادہ مفصل نہیں دیئے گئے بلکہ روح کے بارے میں تو بہت ہی مختصر جواب دیا ہے اس لئے اب بطور تنبیہ اعلان کیا جاتا ہے کہ جہاں تک مخاطبین کے فہم کی رسائی تھی،قرآن کریم کے موضوع کو ملحوظ رکھ کر جوابات دئے گئے ہیں۔اس سے کوئی یہ خیال نہ کرے کہ اللہ تعالیٰ کی معلومات بس اتنی ہی ہیں۔ اللہ کے علوم کی تو کوئی نہایت نہیں۔وہ بے پایاں علم رکھنے والے ہیں۔
دوسری بات اس موقعہ پر یہ پیش آئی تھی کہ رسول اللہ ﷺ نے دوسرے دن جواب دینے کا وعدہ فرمایا تھا مگر پندرہ دن تک وحی نہیں آئی۔جس سے مکہ والوں کو آوازے کسنے کا موقعہ مل گیا۔اس لئے اعلان کیا گیا کہ رسول اللہ ﷺ ایک انسان ہیں۔سب باتوں کا ان کو علم نہیں۔جو باتیں ان کی طرف وحی کی جاتی ہیں وہی بتاتے ہیں۔پھر حکیمانہ اسلوب سے بات کا رخ پھیر دیا ہے کہ آپ پر سب سے اہم وحی توحید کی آئی ہے کیونکہ آخرت کی کامیابی کا مدار اسی پر ہے۔
پہلی بات: اللہ پاک کی باتیں بے پایاں ہیں —— آپ فرمادیجئے کہ اگر سمندر میرے پروردگار کی باتیں لکھنے کے لئے روشنائی بن جائیں تو وہ میرے پروردگار کی باتیں ختم ہونے سے پہلے ہی ختم ہوجائیں گے اگرچہ ہم ویسے ہی سمندر ان کی مدد کے لئے لے آئیں —— یعنی اللہ کے علم وحکمت کی باتیں بے نہایت اور بے کراں ہیں ان میں سے جو باتیں تمہارے ظرف اور قرآن کے موضوع کے مطابق تھیں بیان کی گئیں۔یہ اللہ کے سارے علوم نہیں۔اللہ کے علوم تو بے اندازہ ہیں،فرض کرو،اگر تمام سمندروں کا پانی سیاہی بن جائے،جس سے خدا کی باتیں لکھنی شروع کی جائیں تو سمندر ختم ہوجائیں مگر خدا کی باتیں ختم نہ ہونگی۔اگرچہ تم سمندروں میں ویسے ہی دوسرے سمندر ملاتے جاؤ۔
فائدہ: قرآن کریم منطقی اصطلاحیں استعمال نہیں کرتا وہ ایسی واضح تعبیرات وتمثیلات میں بات پیش کرتا ہے جن کو ہر شخص آسانی سے سمجھ سکتا ہے۔اس آیت میں بھی ایسی ہی واضح تمثیل کے ذریعہ کلمات خداوندی کا غیر متناہی ہونا سمجھایا ہے۔انسان کی معلومات می سمندروں کے پانی سے زیادہ کوئی چیز نہیں۔اس لئے اس مثال کو اختیار کیا ہے۔
دوسری بات: رسول اللہ ﷺ ایک انسان ہیں نہ خدا ہیں نہ فرشتہ۔جو باتیں آپؐ کی طرف وحی کی جاتی ہیں وہی بتلاتے ہیں اور سب سے اہم وحی ان کی طرف یہ کی گئی ہے کہ معبود برحق بے ہمہ اور یگانہ ہیں —— آپ فرمادیجئے کہ میں تم ہی جیسا ایک انسان ہوں (البتہ) میری طرف وحی کی جاتی ہے کہ تمہارا معبود ایک ہی معبود ہے۔

پس جو شخص اپنے پروردگار کی ملاقات کا آرزومند ہو اسے چاہئے کہ نیک عمل کرے اور اپنے پروردگار کے ساتھ عبادت میں کسی کو شریک نہ کرے —— یعنی میں صاف اعلان کرتا ہوں کہ میں تمام انسانوں کی طرح ایک انسان ہوں کوئی فرشتہ یا غیبی مخلوق نہیں ہوں نہ خدائی صفات کا حامل ہوں۔ اگر تمہارے سوالوں کا جواب میں نے حسب وعدہ دوسرے دن نہ دیا تو اس کی وجہ یہ ہے کہ میں جو کچھ بتاتا ہوں وحی سے بتاتا ہوں اور وحی میرے اختیار کی چیز نہیں۔ اور میرے پاس سب سے اہم وحی یہ آئی ہے کہ تمہارے معبود بہمہ وجوہ بے ہمتا، بے ہمہ اور یگانہ ہیں، دُوئی، تعدد اور شرکت کا ان کی بارگاہ میں کوئی گذر نہیں۔ جو دُوئی کی بو بھی ان میں ہوتی تو کہیں دو چار خدا ہوتے، اربوں کھربوں ہوتے! کیونکہ خدا کی تمام صفات: صفاتِ کمالیہ ہیں پس تعدد بھی کامل درجہ کا ہوگا —— اور آخرت کی کامیابی خالص توحید اور عمل صالح پر موقوف ہے پس جو شخص اللہ تعالیٰ سے ملاقات کا خواہش مند ہے اُسے چاہئے کہ عمل صالح کرے اور عبادتوں کو شائبہ شرک سے بھی بچائے، کامیابی کی یہی کنجی ہے۔

فائدہ(۱): اس آیت میں صراحت ہے کہ رسول اللہ ﷺ بشر ہیں یعنی اپنی نوع کے اعتبار سے انسان ہیں اور وہ بھی ''تم ہی جیسے''، یعنی ماہیت اور لوازم ماہیت میں آپ ﷺ بھی جملہ انسانوں کی طرح ہیں۔ البتہ اوصاف و کمالات میں آپ کا کوئی ثانی نہیں۔ اس لئے آپ کے بشر ہونے سے خود بشریت رشک ملائکہ بن گئی ہے لہٰذا جو شخص رسول اللہ ﷺ کو بشر اور انسان نہیں مانتا اور بلا تاویل صاف انکار کرتا ہے، وہ کافر ہے کیونکہ وہ قرآن کریم کی صریح نص کا منکر ہے۔

رہا آپ ﷺ کو بشر یا بھائی یا باوا یا انسان یا آدمی کہہ کر پکارنا یا اپنے جیسا کہنا یا ماننا تو یہ کچھ لوگوں کا بزرگوں پر کیچڑ اچھالنے کے لئے کھڑا کیا ہوا مسئلہ ہے۔ جب آنحضرت ﷺ دنیا میں موجود ہی نہیں تو پکارنے کا کیا سوال ہے؟

رہا اپنے جیسا کہنا یا ماننا تو وہ اگر مسئلہ کی وضاحت کے لئے ہے ضروری ہے۔ خود قرآن کریم میں یہ بات پوری صراحت کے ساتھ موجود ہے۔ تاکہ امت آپ ﷺ کو بندگی کے مقام سے آگے نہ بڑھادے۔ اور توہین کے لئے کہنے کی کسی امتی سے امید نہیں جاسکتی۔

فائدہ(۲): جس طرح رسول اللہ ﷺ اپنی نوع کے اعتبار سے بشر ہیں صفت ہدایت اور کمالِ رسالت کے اعتبار سے مینارۂ نور ہیں۔ اسی نور کی روشنی میں انسانیت کو خدا تعالیٰ کا راستہ ملتا ہے اور یہ نور ابد تک درخشندہ و تابندہ رہے گا۔ پس آپ ﷺ بیک وقت نور بھی ہیں اور بشر بھی۔ نور و بشر کو دو خانوں میں بانٹ کر ایک کی نفی کرنا اور دوسرے کا اثبات کرنا صحیح نہیں۔ قرآن کریم میں بشر کا اطلاق تو آپ ﷺ پر صاف اور صریح موجود ہے مگر نور کا اطلاق قطعی نہیں۔ سورۂ مائدہ کی آیت ۱۵ میں جو نور کا لفظ آیا ہے۔ مفسرین کرام نے اس کی تین تفسیریں کی ہیں۔ ارشاد ہے:

قَدْ جَاءَ كُمْ مِنَ اللّٰهِ نُوْرٌ وَّكِتٰبٌ مُّبِيْنٌ، واقعہ یہ ہے کہ تمہارے پاس اللہ تعالیٰ کی طرف سے روشنی اور

يَهْدِىْ بِهِ اللّٰهُ مَنِ اتَّبَعَ رِضْوَانَهٗ سُبُلَ السَّلَامِ وَيُخْرِجُهُمْ مِنَ الظُّلُمَاتِ إِلَى النُّوْرِ بِإِذْنِهٖ وَيَهْدِيْهِمْ إِلٰى صِرَاطٍ مُّسْتَقِيْمٍ (آیات ۱۵ و۱۶)

واضح کتاب آچکی ہے جس کے ذریعہ اللہ تعالیٰ اس شخص کو سلامتی کی راہیں دکھلاتا ہے جو رضائے حق کا طالب ہے اور ان کو اپنی توفیق سے تاریکیوں سے نکال کر نور ہدایت کی طرف لاتا ہے اور ان کو راہ راست پر قائم رکھتا ہے۔

اس آیت میں مفسرین نے نور سے قرآن کریم، اسلام اور رسول اللہ ﷺ تینوں کو مراد لیا ہے۔ اور علامہ ابن کثیر رحمہ اللہ نے صرف قرآن کریم مراد لیا ہے۔ یہی رائے صاحب کشاف علامہ جار اللہ زمخشری رحمہ اللہ کی ہے اس لئے راجح تفسیر یہی ہے۔ اس کا ایک قرینہ یہ ہے کہ آگے بِہٖ میں مفرد ضمیر آئی ہے اگر نور اور کتاب مبین دو چیزیں ہوتیں تو تثنیہ کی ضمیر آتی۔ دوسرا قرینہ یہ ہے کہ قرآن کریم میں کسی جگہ کسی نبی کو نور نہیں کہا گیا۔ البتہ کتب سماوی توریت وانجیل کو سورۂ مائدہ آیت ۴۴ و ۴۶ میں نور کہا گیا ہے پس اس آیت میں بھی نور کا اطلاق قرآن کریم پر کیا گیا ہے اور عطف تفسیری ہے اور عطف کے لئے فی الجملہ مغائرت یعنی وصف کے اعتبار سے مغائرت کافی ہے۔

فائدہ (۳): ایک حدیث لوگوں میں یہ مشہور ہے کہ سب سے پہلے اللہ تعالیٰ نے آنحضرت ﷺ کا نور پیدا کیا (أَوَّلُ مَاخَلَقَ اللّٰهُ نُوْرِىْ) اس حدیث کی سند کا پتہ نہیں۔ مواہب لدُنیہ میں یہ حدیث مصنف عبدالرزاق کے حوالہ سے بلاسند ذکر کی گئی ہے (زرقانی ۱:۴۶) میں نے مصنف عبدالرزاق میں یہ حدیث تلاش کی مگر نہیں ملی۔ علامہ زرقانی نے بیہقی کا بھی حوالہ دیا ہے میں نے بیہقی کی دلائل النبوۃ میں بھی تلاش کی مگر نہیں ملی۔ البانی نے بھی مشکوٰۃ شریف کے حاشیہ میں لکھا ہے کہ میں اس کی سند تلاش کرتے کرتے تھک گیا مگر نہیں ملی۔ علامہ اسماعیل عجلونی (متوفی ۱۱۶۲ھ) نے كشفُ الْخفَاء ومُزِيْلُ الإِلْبَاسِ عَمَّا اشتهر من الأحاديث على ألسِنة الناس میں اس کو ''مواہب'' کے حوالہ سے درج کیا ہے مگر نہ کوئی سند ذکر کی ہے نہ حدیث پر کوئی حکم لگایا ہے یہ حدیث کافی لمبی ہے جو درج ذیل ہے۔

''حضرت جابر رضی اللہ عنہ نے دریافت کیا: یارسول اللہ! میرے ماں باپ آپ پر قربان! مجھے بتلایئے: اللہ تعالیٰ نے سب سے پہلے کیا چیز پیدا فرمائی؟ آپؐ نے فرمایا: جابر! اللہ تعالیٰ نے تمام چیزوں سے پہلے آپ کے نبی کا نور اپنے نور سے پیدا کیا۔ وہ نور قدرت خداوندی سے جہاں اللہ نے چاہا گھومتا رہا۔ اس وقت میں نہ تو لوح تھی نہ قلم، نہ جنت نہ جہنم۔ نہ فرشتہ نہ آسمان۔ نہ زمین نہ سورج۔ نہ چاند نہ جنات اور نہ انسان۔ پھر جب اللہ نے مخلوق کو پیدا کرنا چاہا تو اس نور کے چار حصے کئے اور پہلے جز سے قلم، دوسرے جز سے لوح اور تیسرے جز سے عرش کو پیدا کیا اور چوتھے جز کے پھر چار اجزا کئے۔ اور پہلے جز سے حاملین عرش کو، دوسرے جز سے کرسی کو اور تیسرے جز سے باقی فرشتوں کو پیدا کیا۔ اور چوتھے جز کے پھر چار اجزاء کئے اور پہلے جز سے آسمانوں کو، دوسرے جز سے زمینوں کو اور تیسرے جز سے

جنت وجہنم کو پیدا کیا اور چوتھے جز کے پھر چار اجزا کئے۔ پہلے جز سے مؤمنوں کی نگاہوں کی روشنی کو، دوسرے جز سے ان کے دلوں کی روشنی کو یعنی اللہ تعالیٰ کی معرفت کو اور تیسرے جز سے ان کے اُنس کا نور یعنی توحید (لا الہ الا اللہ محمد رسول اللہ) کو پیدا کیا آخر حدیث تک [1]

ابھی یہ حدیث اور بھی ہوگی۔ عجلونی نے اتنی ہی نقل کی ہے۔ زرقانی رحمہ اللہ کو بھی آگے معلوم نہیں۔ یہ پوری حدیث پڑھنے سے صاف ظاہر ہوتا ہے کہ یہ قطعاً موضوع روایت ہے۔ واللہ اعلم۔

فائدہ (۴): سیرت کی بعض کتابوں میں ہے کہ رسول اللہ ﷺ کا سایہ نہیں تھا کیونکہ نور کا سایہ نہیں ہوتا۔ نیز زمین محل کثافت ہے اس لئے اس پر آپؐ کا سایہ پڑنا آپؐ کی شان کے خلاف ہے [2] —— یہ بات بھی صحیح نہیں۔ امداد الفتاوی میں موئے مبارک کے بارے میں ایک فتوی ہے:

''موئے مبارک کے لئے ضروری نہیں کہ اس کا سایہ نہ پڑے اور جس گھر میں ہو اس پر ابر کا سایہ رہے اور کبھی اس گھر والوں پر کوئی تکلیف نہ آئے یہ باتیں خود جناب سرور کائنات ﷺ کے لئے ضروری نہیں تھیں۔ آپؐ کا سایہ بھی تھا آپ پر دھوپ بھی پڑتی تھی۔ اگر کبھی بطور معجزہ آپ کا سایہ نہ پڑا ہو اور ابر سایہ فگن ہوا ہو تو کچھ بعید نہیں۔ لیکن استمرار ثابت نہیں۔ اور آپ بیمار بھی ہوتے تھے تو جب کل کے لئے یہ امر ضروری نہیں تو جز کے واسطے کیا ضرور؟ واللہ اعلم [3]

مسند امام احمد بن حنبل کی ایک روایت سے بھی آپ ﷺ کے لئے سایہ کا ہونا ثابت ہے۔ یہ روایت مسند میں تین جگہ آئی ہے [4] اس کا خلاصہ یہ ہے کہ حجۃ الوداع کے سفر میں حضرت صفیہ رضی اللہ عنہا کی سواری ہلاک ہوگئی۔ آپ نے حضرت زینب رضی اللہ عنہا سے فرمایا کہ تمہارے پاس زائد سواری ہے، ایک صفیہ کو دیدو، انھوں نے انکار کیا اور ان کے منہ سے حضرت صفیہ رضی اللہ عنہا کی شان میں ایک سخت بات نکل گئی۔ آپ ان سے ناراض ہوگئے اور تقریباً تین ماہ ان کے پاس تشریف نہیں لے گئے تا آنکہ وہ مایوس ہوگئیں۔ اس کے بعد روایت کے الفاظ یہ ہیں:

فلما كان شهرُ ربيع الأول دخلَ عليها فرأت ظِلَّهُ، فقالت: إنَّ هذا لظِلُّ رَجُلٍ، وما يدخل عليَّ النبيُّ صلى الله عليه وسلم، فمن هذا؟ فدخل النبي صلى الله عليه وسلم إلخ (۶:۳۳۸)

پھر جب ماہ ربیع الاول آیا تو آپ حضرت زینبؓ کے پاس تشریف لے گئے انھوں نے آپؐ کا سایہ دیکھا اور دل میں سوچنے لگیں کہ یہ کسی آدمی کا سایہ ہے اور نبی کریم ﷺ تو میرے پاس تشریف لاتے نہیں، پھر یہ سایہ کس کا ہوسکتا ہے؟ وہ یہ سوچ رہی تھیں کہ نبی ﷺ مکان میں داخل ہوئے الخ۔

(۱) کشف الخفا ۱:۳۱۱ (۲) دیکھئے مدارج النبوت ۱:۱۳۶ و ۱۳۷۔ زرقانی شرح مواہب ۵:۲۴۹ (۳) امداد الفتاوی ۴:۵۷ (۴) دیکھئے مسند امام احمد ۶:۱۳۲ و ۲۶۱ و ۳۳۸۔

اس حدیث شریف سے صراحتاً یہ بات ثابت ہوتی ہے کہ آپ ﷺ کا سایہ تھا اور وہ زمین پر پڑتا بھی تھا۔

فائدہ(۵): آخر آیت میں جس شرک کی ممانعت کی گئی ہے وہ عام ہے خواہ شرک جلی ہو یعنی شرک اکبر ہو یا شرک خفی یعنی شرک اصغر، شرک جلی وہ ہے جو مشرکین کرتے ہیں اور شرک خفی ریا ؤ نمود کا نام ہے اور جس طرح شرک جلی سے عمل باطل ہو جاتا ہے ریاکاری بھی عمل کا ناس کر دیتی ہے۔ کوئی بھی عمل جو دنیوی غرض کے لئے کیا گیا ہو، شہرت و وجاہت اس سے مقصود ہو اور لوگوں کو دکھلانے اور سنانے کے لئے کیا گیا ہو: وہ مقبول نہیں۔ نیت کا کھوٹ عمل کو ضائع کر دیتا ہے بلکہ وہ عمل آخرت میں وبال جان بن جائے گا۔ احادیث شریفہ میں یہ مضمون بکثرت آیا ہے۔ چند حدیثیں درج ذیل ہیں:

پہلی حدیث: ـــــ اللہ تعالیٰ تبارک وتعالیٰ فرماتے ہیں: ''میں شرکاء میں سے شرک سے سب سے زیادہ بے نیاز ہوں پس جس نے کوئی ایسا عمل کیا ہو جس میں میرے علاوہ کسی کو شریک کیا ہو تو میں اس عمل سے بری ہوں اور وہ عمل اسی شریک کے لئے ہے'' (مشکوۃ حدیث ۵۳۱۵) یعنی اللہ تعالیٰ اس عمل کو قبول نہیں فرماتے۔ ایک دوسری حدیث میں اس کی تفصیل اس طرح آئی ہے کہ قیامت کے دن جب اللہ تعالیٰ سب لوگوں کو میدان حشر میں اکٹھا کریں گے تو ایک منادی پکارے گا: ''جس نے اللہ کے لئے کئے ہوئے کام میں کسی کو شریک کیا ہو وہ اپنا بدلہ اسی سے مانگے کیونکہ اللہ تعالیٰ شرکاء میں سب سے زیادہ بھاگی داری سے بے نیاز ہیں'' (مشکوۃ حدیث ۵۳۱۸)

دوسری حدیث: ـــــ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ''جس نے جہاد کیا اور اس کی نیت جہاد سے عقال (اونٹ باندھنے کی رسّی) کی ہے تو اس کو وہی ملے گا جس کی اس نے نیت کی ہے'' (اخرجہ النسائی وغیرہ)

تیسری حدیث: ـــــ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما بیان کرتے ہیں کہ ایک شخص اللہ کی راہ میں جہاد کرتا تھا۔ اس کی خواہش تھی کہ لوگوں میں اس کی بہادری اور خدمات کا چرچا ہو۔ اس نے اپنے اس عمل کے بارے میں رسول اللہ ﷺ سے دریافت کیا پس یہ آیت کریمہ نازل ہوئی (اخرجہ الحاکم ۲:۱۱۱) معلوم ہوا کہ جہاد میں ایسی نیت کرنے سے بھی جہاد کا ثواب باطل ہو جاتا ہے۔

چوتھی بات: ـــــ جندب بن زُہیر کے بارے میں بیان کیا گیا ہے کہ جب وہ نماز پڑھتے یا روزہ رکھتے یا صدقہ کرتے اور دیکھتے کہ لوگ ان اعمال کی وجہ سے ان کی تعریف کرتے ہیں تو اس سے ان کو خوشی ہوتی تھی اور وہ اپنا عمل اور بڑھا دیتے تھے۔ اس پر یہ آیت کریمہ نازل ہوئی (اخرجہ ابن مندہ)

فائدہ(۶): اخلاص وریا کے اعتبار سے عمل کی چار صورتیں ہیں:

۱۔ شروع سے آخر تک عمل محض اللہ تعالیٰ کے لئے ہو اور عمل پورا ہونے کے بعد بھی کسی کو اس کا پتہ نہ چلے ـــــ یہ عمل نہایت اعلیٰ درجہ کا ہے اور خالص سونے کی مثال ہے۔ حدیث شریف میں ایسے سات آدمیوں کا ذکر ہے جن کو

قیامت کے دن جب کوئی سایہ نہ ہوگا اللہ تعالیٰ اپنا سایہ عطا فرمائیں گے۔ان میں سے ایک شخص وہ ہے جس نے کوئی خیرات کی اوراس کو چھپایا یہاں تک کہ اس کے بائیں ہاتھ کو بھی پتہ نہ چلا کہ اس کے داہنے ہاتھ نے کیا خرچ کیا ہے۔
(مشکوۃ حدیث ۷۰۱)

۲۔ عمل از ابتدا تا انتہا محض ریا اور نمود کے لئے ہو یعنی دنیوی اغراض کے لئے کیا ہو یا لوگوں کی تعریفیں وصول کرنے کے لئے کیا گیا ہو ـــــ ایسا عمل بے کار اور بے فائدہ ہے بلکہ آخرت میں وہ عمل وبال جان بن جائے گا۔ حدیث شریف میں ایسے تین شخصوں کا حال بیان کیا گیا ہے جن کو قیامت کے دن سب سے پہلے فیصلہ سنایا جائے گا۔ ایک شہید، دوسرا قاری، تیسرا بڑا مالدار۔ اللہ تعالیٰ ان کو اپنی نعمتیں یاد دلائیں گے اور پوچھیں گے کہ انھوں نے اللہ کے لئے کیا کام کئے؟ وہ اپنے اپنے کارنامے گنائیں گے۔ جواب ارشاد ہوگا کہ یہ کام تو ہمارے لئے کب کئے تھے؟ اول نے اس لئے کئے تھے کہ اس کی بہادری کا ڈنکا بجے۔ دوم نے اس لئے کئے تھے کہ اس کی عالم کی حیثیت سے شہرت ہو اور سوم نے سخی مشہور ہونے کے لئے خرچ کیا تھا۔ پھر حکم ہوگا: ان کو گھسیٹ کر اوندھے منہ جہنم میں ڈال دو (اخرجہ مسلم)

۳۔ عمل شروع تو اخلاص کے ساتھ ہوا ہو مگر پورا ہونے سے پہلے اس میں ریا ؤ نمود شامل ہو گیا ہو ـــــ یہ ریا بھی عمل کو ضائع کر دیتی ہے۔ حضرت ابوسعید خدری رضی اللہ عنہ بیان فرماتے ہیں کہ ایک بار رسول اللہ ﷺ ہمارے پاس تشریف لائے۔ ہم دجال کا تذکرہ کر رہے تھے۔ آپ نے فرمایا: کیا میں تم کو مسیح دجال سے زیادہ خوفناک بات نہ بتلاؤں؟ ہم نے عرض کیا: ضرور بتلائیں۔ آپ نے فرمایا: ''وہ شرک خفی ہے۔ اور وہ یہ ہے کہ ایک شخص نماز شروع کرے پھر وہ اپنی نماز اس لئے لمبی کرے کہ اس کو کوئی شخص دیکھ رہا ہے'' (مشکوۃ حدیث ۵۳۳۳)

۴۔ پورا عمل ازل اول تا آخر اخلاص پر مبنی ہو اور عمل پورا ہونے کے بعد بھی نہ اس نے ظاہر کیا نہ اس کی خواہش کی مگر کسی وجہ سے خود بخود اس کے عمل کی شہرت ہوگئی اور لوگ تعریفیں کرنے لگے اور اس کو وہ تعریفیں اچھی معلوم ہونے لگیں۔ یہ بات عمل کے لئے مضر نہیں۔ صحیح مسلم میں حضرت ابوذر غفاری سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ سے پوچھا گیا: ایک شخص نیک عمل کرتا ہے پھر لوگوں کو سنتا ہے کہ وہ اس کے عمل کی تعریف کر رہے ہیں تو کیا حکم ہے؟ آنحضرت ﷺ نے فرمایا: تِلْكَ عَاجِلُ بُشْرَى الْمُؤْمِنِ: یہ مؤمن کے لئے نقد بشارت ہے (مشکوۃ حدیث ۵۳۱۷) یعنی اس کا یہ عمل اللہ کے نزدیک مقبول ہے اور اس کی فوری خوش خبری اس طرح دیدی گئی کہ اپنے بندوں کی زبان سے تعریف کرادی۔

اور حدیث میں ہے کہ حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ نے عرض کیا: یا رسول اللہ! بعض اوقات میں اپنے گھر میں نماز میں مشغول ہوتا ہوں، اچانک کوئی آجاتا ہے تو مجھے اچھا معلوم ہوتا ہے کہ اس نے مجھے اس حال میں دیکھ لیا (تو کیا یہ ریا ہے؟) آپؐ نے فرمایا: ''ابو ہریرہ! تم پر خدا کی رحمت ہو! تمہیں اس صورت میں دو اجر ملیں گے ایک چپکے سے عمل

کرنے کا جو پہلے ہی سے کررہے تھے۔دوسرا علانیہ عمل کرنے کا جو اس آدمی کے آنے کے بعد ہوا (مشکوۃ حدیث ۵۳۲۲)

حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ ہی سے یہ حدیث بھی مروی ہے کہ جب کوئی بندہ علانیہ بھی شاندار نماز پڑھتا ہے اور خفیہ بھی تو اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں: هٰذَا عَبْدِیْ حَقًّا یہ میرا کھرا بندہ ہے (مشکوۃ حدیث ۵۳۲۹)

ہر عمل میں اخفا افضل ہے البتہ کسی عارض سے مثلاً رفع تہمت یا امید اقتداء وغیرہ سے اظہار کو ترجیح ہوجاتی ہے (تھانویؒ)

فائدہ (۷): شرک خفی یعنی اعمال صالحہ میں ریاؤنمود بہت خطرناک چیز ہے اس سے حتی الامکان بچنے کا اہتمام کرنا چاہئے۔حضرت محمود بن لبید رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ آنحضرت ﷺ نے فرمایا: مجھے تمہارے بارے میں سب سے زیادہ خوف شرک اصغر کا ہے۔صحابہ نے دریافت کیا کہ شرک اصغر کیا چیز ہے؟ آپؐ نے فرمایا ریاء (مشکوۃ حدیث ۵۳۳۴)

حدیث — حضرت شداد بن اوس رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: جوشخص دکھلاوا کرنے کے لئے نماز پڑھتا ہے اس نے شرک کیا، جوشخص دکھلاوا کرنے کے لئے روزہ رکھتا ہے اس نے شرک کیا اور جس شخص نے دکھلاوا کرنے کے لئے خیرات کی اس نے شرک کیا (مشکوۃ حدیث ۵۳۳۱)

حدیث — حضرت شداد ایک بار رورہے تھے کسی نے وجہ پوچھی تو فرمایا کہ میں نے ایک حدیث سنی ہے وہ یاد آگئی اس نے مجھے رُلادیا۔میں نے رسول اللہ ﷺ سے سنا ہے کہ مجھے اپنی امت کے بارے میں سب سے زیادہ ڈر دو باتوں کا ہے۔ایک شرک کا دوسرا مخفی خواہش کا۔حضرت شداد نے دریافت کیا: یارسول اللہ! کیا آپ کی امت آپ کے بعد شرک میں مبتلا ہوجائے گی؟ آپؐ نے فرمایا: ''ہاں! مگر سنو، وہ سورج، چاند، پتھر اور مورتی کو نہیں پوجے گی بلکہ اپنے اعمال کا دکھلاوا کرے گی اور مخفی خواہش یہ ہے کہ ایک شخص نے روزہ رکھا پھر اس کے سامنے مزے دار کھانا آیا تو اس نے روزہ توڑ دیا'' (مشکوۃ حدیث ۵۳۳۲)

حدیث — آنحضرت ﷺ نے یہ بھی ارشاد فرمایا ہے کہ ''جوشخص اپنے نیک عمل کی شہرت چاہے گا اللہ تعالیٰ چوراہے پر اس کا بھانڈا پھوڑیں گے اور جو اپنے عمل کا دکھلاوا کرے گا اللہ تعالیٰ اس کو رسوا کریں گے۔(مشکوۃ حدیث ۵۳۱۶)

شرک خفی چیونٹی کی چال سے بھی زیادہ دھیمی آواز سے داخل ہوتا ہے لہٰذا اس چور سے ہوشیار رہو (حدیث)

فائدہ(۸): یہ پوری سورت بڑی بابرکت سورت ہے اوراس کی ابتدائی دس آیتیں اورآخری دس آیتیں تو بے حد قیمتی ہیں۔ سورت کے دیباچہ میں بہت سی حدیثیں اس سورت کے فضائل میں ذکر کی جاچکی ہیں۔ یہاں چند حدیثیں دوبارہ پڑھ لیجئے:

حدیث(۱) — حضرت ابوسعید خدری رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ''جو شخص جمعہ کے روز سورۂ کہف پڑھ لے تو دوسرے جمعہ تک اس کے لئے نور ہو جائے گا'' (رواہ الحاکم والبیہقی)

حدیث(۲) — آنحضرت ﷺ نے ارشاد فرمایا: ''جو شخص سورۂ کہف کی ابتدائی دس آیتیں زبانی یاد کرلے پھر اس کو دجال پالے تو وہ اس کا کچھ نہیں بگاڑ سکے گا اور جو شخص سورۂ کہف کی آخری آیتیں (آخری رکوع) زبانی یاد کرلے تو وہ آیتیں اس کے لئے قیامت کے دن نور ہونگی'' (اخرجہ ابوعبید وابن مردویہ عن ابی الدرداء)

حدیث(۳) — رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا: ''جو شخص سورۂ کہف کی ابتدائی دس آیتیں سوتے وقت پڑھے وہ دجال کے فتنہ سے محفوظ رہے گا اور جو اس کی آخری (دس) آیتیں سوتے وقت پڑھے اس کے لئے قیامت کے دن سرتاپا نور ہوگا'' (اخرجہ ابن مردویہ عن عائشہ)

حدیث(۴) — رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا: ''اگر میری امت پر صرف سورۂ کہف کی آخری آیتیں نازل کی جاتیں تو وہ ان کی ہدایت کے لئے کافی تھیں'' (اخرجہ الطبرانی وابن مردویہ عن ابی حکیم)

حدیث(۵) — مسند دارمی میں ہے کہ زرّ بن حُبیش نے حضرت عبدہ کو بتلایا کہ جو آدمی سورۂ کہف کی آخری آیتیں (**قُلْ لَوْ كَانَ الْبَحْرُ مِدَادً** سے آخر سورت تک) پڑھ کر سوئے وہ جس وقت بیدار ہونے کی نیت کرے گا بیدار ہوگا۔ عبدہ کہتے ہیں: ہم نے اس کا تجربہ کیا۔ بالکل ایسا ہی پایا (مسند دارمی ۲:۴۵۴)

حدیث(۶) — اسماعیل بن ابی رافع کہتے ہیں کہ ہمیں یہ روایت پہنچی ہے کہ جو شخص سورۂ کہف کی آخری پانچ آیتیں سوتے وقت پڑھے گا وہ محفوظ رہے گا اور رات کو جس وقت اٹھنے کا ارادہ کرے گا اٹھ جائے گا (اخرجہ ابن الضریس فی فضائل القرآن الدر المنثور ۴:۲۵۷)

اللہ تعالیٰ یہ سورت جمعہ کو پڑھنے کی اور اس کی ابتدائی اور آخری دس دس آیتیں یاد کرنے کی اور نمازوں میں اور سوتے وقت پڑھنے کی توفیق عطا فرمائیں۔ اور ان کی برکت سے تمام دجالی فتنوں سے اور خاص طور پر دجالِ اکبر کے فتنے سے محفوظ فرمائیں۔ (آمین)
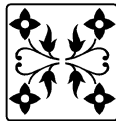
سورۂ مریم

نمبرشمار ۱۹ نزول کانمبر ۴۴ نزول کی نوعیت مکی آیات ۹۸ رکوع ۶

سورت کا نام اور زمانۂ نزول: اس سورت کا نام آیت ۱۶ سے ماخوذ ہے۔ اس کو سورۂ کٓھٰیٰعٓصٓ بھی کہتے ہیں۔ یہ مکی سورت ہے، اور مکی دور کے وسط میں نازل ہوئی ہے۔ حبشہ کی ہجرت سے پہلے یہ سورت نازل ہو چکی تھی۔ اور حضرت ابراہیم علیہ السلام کے واقعہ میں اشارہ ہے کہ نبی ﷺ اور مظلوم مسلمانوں کو بھی ابراہیم علیہ السلام کی طرح وطن چھوڑنا پڑسکتا ہے۔ حبشہ کی طرف پہلی مرتبہ ہجرت ۵ نبوی میں ہوئی ہے۔ پھر کچھ مدت کے بعد اور لوگوں نے ہجرت کی، اور وہاں اسّی نوّے مرد اور عورتیں پہنچ گئیں۔ قریش نے جب یہ صورتِ حال دیکھی تو دو سفیر نجاشی رحمہ اللہ کے دربار میں بھیجے، تاکہ وہ ان مہاجرین کو واپس لائیں۔ سفراء نے نجاشی سے کہا: ہمارے کچھ نوجوان بھاگ کر آپ کے ملک میں آئے ہیں۔ وہ ہمارے دین سے نکل گئے ہیں۔ اور آپ کے دین میں بھی داخل نہیں ہوئے، بلکہ انھوں نے ایک نیا دین نکال لیا ہے! بادشاہ نے تحقیقِ حال کے لئے مسلمانوں کو دربار میں طلب کیا۔ دربار میں مہاجرین کی طرف سے حضرت جعفر رضی اللہ عنہ نے ایک برجستہ تقریر کی، جس سے نجاشی بہت متأثر ہوا۔ اس نے دریافت کیا کہ عیسیٰ علیہ السلام کے بارے میں تمہارا کیا خیال ہے؟ حضرت جعفر رضی اللہ عنہ نے جواب دیا: ''وہ اللہ کے بندے اور اس کے رسول ہیں۔ وہ اللہ کا ایک بول اور اس کی روح ہیں۔ جسے اللہ نے کنواری مریم میں ڈالا'' پھر آپؓ نے اس سورت کے ابتدائی دو رکوع پڑھے۔ بادشاہ سنتا رہا اور روتا رہا۔ جب تلاوت پوری ہوئی تو اس نے ایک تنکا اٹھایا، اور کہا: ''بخدا! عیسیٰ علیہ السلام اس سے اس تنکے کے برابر بھی زیادہ نہیں تھے!'' پھر وفد کو ٹکا سا جواب دے دیا۔

ربط: گذشتہ سورت میں اصحابِ کہف اور ذوالقرنین کے واقعات بیان ہوئے ہیں۔ یہ واقعات یہود مدینہ کے مشورہ سے مشرکین مکہ نے دریافت کئے تھے۔ ان میں توحید کی دعوت اور شرک کی تردید تھی۔ اصحابِ کہف نے بھرے

دربار میں بادشاہ کو توحید کی دعوت تھی۔ اور ذوالقرنین نے بھی اپنے مغربی سفر میں ایک قوم کو توحید کی طرف بلایا ہے۔ اور آخری آیت میں بھی توحید اور توحید میں اخلاص کی تاکید ہے۔ اسی طرح اس سورت کا مرکزی مضمون بھی شرک کی تردید اور توحید کا اثبات ہے۔

سورت کے مضامین: اس سورت کا مرکزی مضمون شرک کی تردید اور توحید کی تعلیم ہے۔ قرآن کریم کے اولین مخاطب کفار مکہ اور اہلِ کتاب تھے۔ اور دونوں شرک میں مبتلا تھے۔ کفار مورتیوں کو پوجتے تھے، اور عیسائی حضرت مسیح علیہ السلام کی شان میں غلو کرتے تھے۔ وہ ان کو مقام عبدیت سے اٹھا کر مقام الوہیت پر فائز کر چکے تھے۔ چنانچہ پہلے مسیح علیہ السلام کی معجزاتی گفتگو کے ذریعہ نصاریٰ کے عقیدے کی تردید کی گئی۔ پھر حضرت ابراہیم علیہ السلام اور ان کے باپ کے درمیان جو گفتگو ہوئی ہے: اس کے ذریعہ مشرکین کے شرک کی تردید کی۔ اور چونکہ مسیح علیہ السلام کی ولادت ایک نشانی تھی، اس لئے اس کی تمہید میں حضرت زکریا اور حضرت یحییٰ علیہما السلام کا تذکرہ آیا ہے۔ حضرت یحییٰ علیہ السلام کی ولادت جن حالات میں ہوئی ہے: وہ بھی ایک نشانی اور رحمتِ خداوندی تھی۔ اور ابراہیم علیہ السلام کے واقعہ کے بعد ان کے خاندان کے چند انبیاء کا تذکرہ ہے، جو خلیل اللہ کی دل بستگی کا سامان، ان کی رفعتِ شان اور ذکر خیر کا ذریعہ ہیں۔ یہ مضامین چوتھے رکوع تک چلے گئے ہیں۔ پھر انبیاء کے بعد گمراہی کس طرح پیدا ہوئی اس کی نشاندہی کی ہے۔ اس کے بعد جنت کے کچھ احوال مذکور ہیں۔ پھر منکرین آخرت کے استعجاب اور ان کے انجام کا بیان ہے۔ اور ایک خاص بات یہ بیان کی گئی ہے کہ دوزخ پر ہر ایک کو پہنچنا ہے۔ اس کے بعد کفار کی تین غلط فہمیوں کا ازالہ کیا گیا ہے، پھر مؤمنین کو تسلی دی گئی ہے، اور ان لوگوں پر رد کیا ہے جو اللہ کے لئے اولاد مانتے ہیں۔ اور آخر میں دو اہم نصیحتوں پر سورت ختم کی گئی ہے۔

آیاتہا ۹۸ (۱۹) سُوْرَةُ مَرْيَمَ مَكِّيَّةٌ (۴۴) رکوعاتہا ۶

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ

كٓهٰيٰعٓصٓ ﴿۱﴾ ذِكْرُ رَحْمَتِ رَبِّكَ عَبْدَهٗ زَكَرِيَّا ﴿۲﴾ اِذْ نَادٰى رَبَّهٗ نِدَآءً خَفِيًّا ﴿۳﴾ قَالَ رَبِّ اِنِّيْ وَهَنَ الْعَظْمُ مِنِّيْ وَاشْتَعَلَ الرَّاْسُ شَيْبًا وَّلَمْ اَكُنْۢ بِدُعَآئِكَ رَبِّ شَقِيًّا ﴿۴﴾ وَاِنِّيْ خِفْتُ الْمَوَالِيَ مِنْ وَّرَآءِيْ وَكَانَتِ امْرَاَتِيْ عَاقِرًا فَهَبْ لِيْ مِنْ لَّدُنْكَ وَلِيًّا ﴿۵﴾ يَّرِثُنِيْ وَيَرِثُ مِنْ اٰلِ يَعْقُوْبَ ۖ وَاجْعَلْهُ رَبِّ رَضِيًّا ﴿۶﴾ يٰزَكَرِيَّآ اِنَّا نُبَشِّرُكَ بِغُلٰمِ ِۨ اسْمُهٗ يَحْيٰى ۙ لَمْ نَجْعَلْ لَّهٗ مِنْ قَبْلُ سَمِيًّا ﴿۷﴾ قَالَ رَبِّ اَنّٰى يَكُوْنُ لِيْ غُلٰمٌ وَّكَانَتِ امْرَاَتِيْ عَاقِرًا وَّقَدْ بَلَغْتُ مِنَ الْكِبَرِ عِتِيًّا ﴿۸﴾ قَالَ كَذٰلِكَ ۚ قَالَ رَبُّكَ هُوَ عَلَيَّ هَيِّنٌ وَّقَدْ خَلَقْتُكَ مِنْ قَبْلُ وَلَمْ تَكُ شَيْــًٔا ﴿۹﴾ قَالَ رَبِّ اجْعَلْ لِّيْٓ اٰيَةً ۭ قَالَ اٰيَتُكَ اَلَّا تُكَلِّمَ النَّاسَ ثَلٰثَ لَيَالٍ سَوِيًّا ﴿۱۰﴾ فَخَرَجَ عَلٰى قَوْمِهٖ مِنَ الْمِحْرَابِ فَاَوْحٰٓى اِلَيْهِمْ اَنْ سَبِّحُوْا بُكْرَةً وَّعَشِيًّا ﴿۱۱﴾ يٰيَحْيٰى خُذِ الْكِتٰبَ بِقُوَّةٍ ۭ وَاٰتَيْنٰهُ الْحُكْمَ صَبِيًّا ﴿۱۲﴾ وَّحَنَانًا مِّنْ لَّدُنَّا وَزَكٰوةً ۭ وَكَانَ تَقِيًّا ﴿۱۳﴾ وَّبَرًّاۢ بِوَالِدَيْهِ وَلَمْ يَكُنْ جَبَّارًا عَصِيًّا ﴿۱۴﴾ وَسَلٰمٌ عَلَيْهِ يَوْمَ وُلِدَ وَيَوْمَ يَمُوْتُ وَيَوْمَ يُبْعَثُ حَيًّا ﴿۱۵﴾ ع

كٓهٰيٰعٓصٓ	کاف، ہا، یا، عین، صاد	زَكَرِيَّا	زکریا (پر)	قَالَ	کہا
ذِكْرُ	(یہ) تذکرہ (ہے)	اِذْ نَادٰى	جب پکارا انھوں نے	رَبِّ	اے میرے رب!
رَحْمَتِ	مہربانی کا	رَبَّهٗ	اپنے رب کو	اِنِّيْ	بیشک میں
رَبِّكَ	آپ کے رب کی	نِدَآءً	پکارنا	وَهَنَ	کمزور ہو گئیں
عَبْدَهٗ (۱)	اپنے بندے	خَفِيًّا	پوشیدہ	الْعَظْمُ (۲)	ہڈیاں

(۱) عبدہ: رحمۃ (مصدر) کا مفعول بہ ہے، اور زکریا: بدل یا عطف بیان ہے۔ (۲) العظم (مفرد) اسم جنس کے معنی میں ہے اس لئے آگے اس کا ترجمہ: ''ہڈی ہڈی'' کیا گیا ہے۔ اور منی محذوف سے متعلق ہو کر العظم کا حال ہے۔

مِنِّيْ	میری	يَعْقُوْبَ	یعقوب (کے)	وَقَدْ بَلَغْتُ	اور تحقیق پہنچ چکا میں
وَاشْتَعَلَ	اور بھڑک گیا	وَاجْعَلْهُ	اور بنا اس کو	مِنَ الْكِبَرِ	بڑھاپے کی
الرَّأْسُ	سر	رَبِّ	اے میرے رب!	عِتِيًّا [۲]	آخری حد کو
شَيْبًا [۱]	بڑھاپے سے	رَضِيًّا	پسندیدہ	قَالَ	فرمایا:
وَلَمْ اَكُنْ	اور نہیں رہا میں	يٰزَكَرِيَّآ	اے زکریا	كَذٰلِكَ	اسی طرح
بِدُعَآئِكَ	آپ سے مانگ کر	اِنَّا	بیشک ہم	قَالَ	فرمایا
رَبِّ	اے میرے رب!	نُبَشِّرُكَ	خوشخبری دیتے ہیں آپکو	رَبُّكَ	آپ کے رب نے
شَقِيًّا	نامراد	بِغُلٰمِ	ایسے لڑکے کی	هُوَ	وہ
وَاِنِّيْ	اور بیشک میں	اسْمُهٗ	جس کا نام	عَلَيَّ	میرے لئے
خِفْتُ	اندیشہ کرتا ہوں	يَحْيٰى	یحییٰ (ہے)	هَيِّنٌ	آسان ہے
الْمَوَالِيَ	متعلقین کا	لَمْ نَجْعَلْ	نہیں بنایا ہم نے	وَقَدْ	اور تحقیق
مِنْ وَّرَآءِيْ	میرے پیچھے	لَّهٗ	اس کیلئے	خَلَقْتُكَ	میں نے پیدا کیا آپ کو
وَكَانَتِ	اور ہے	مِنْ قَبْلُ	قبل ازیں	مِنْ قَبْلُ	قبل ازیں
امْرَاَتِيْ	میری بیوی	سَمِيًّا	کوئی ہم نام	وَلَمْ تَكُ	اور نہیں تھے آپ
عَاقِرًا	بانجھ	قَالَ	کہا اس نے	شَيْئًا	کچھ بھی
فَهَبْ	پس عطا فرما	رَبِّ	اے میرے رب!	قَالَ رَبِّ	کہا اے میرے رب!
لِيْ	مجھے	اَنّٰى يَكُوْنُ	کیسے ہوگا	اجْعَلْ	مقرر کیجئے
مِنْ لَّدُنْكَ	خاص اپنے پاس سے	لِيْ	میرے	لِّيْٓ	میرے لئے
وَلِيًّا	کوئی کارساز	غُلٰمٌ	لڑکا	اٰيَةً	کوئی نشانی
يَّرِثُنِيْ	جو وارث ہو میرا	وَّكَانَتِ	اور ہے	قَالَ	فرمایا
وَيَرِثُ	اور وارث ہو	امْرَاَتِيْ	میری بیوی	اٰيَتُكَ	آپ کی نشانی
مِنْ اٰلِ	خاندان کا	عَاقِرًا	بانجھ	اَلَّا	(یہ ہے) کہ نہ

(۱) شیبًا: تمیز ہے۔ (۲) عِتِیّ: کی اصل عُتُوْوٌ ہے۔ دو پیش اور دو واو مسلسل ثقیل تھے، اس لئے تاء کو کسرہ دیا تو پہلا واو یاء ہوگیا، پھر دوسرا واو بھی یاء ہوگیا، کیونکہ اس سے پہلے سکون ہے (روح)

تُكَلِّمَ	بات کریں آپ	يٰيَحْيٰى	اے یحییٰ	بِوَالِدَيْهِ	اپنے والدین کے ساتھ
النَّاسَ	لوگوں سے	خُذِ	لیں آپ	وَلَمْ يَكُنْ	اور نہیں تھے وہ
ثَلٰثَ	تین	الْكِتٰبَ	کتاب (تورات)	جَبَّارًا	سرکش
لَيَالٍ	راتیں	بِقُوَّةٍ	مضبوطی سے	عَصِيًّا	نافرمان
سَوِيًّا [1]	تندرست ہوتے ہوئے	وَاٰتَيْنٰهُ	اور دی ہم نے ان کو	وَسَلٰمٌ	اور سلامتی ہو
فَخَرَجَ	پس نکلے وہ	الْحُكْمَ	دانائی	عَلَيْهِ	ان پر
عَلٰى قَوْمِهٖ	اپنی قوم پر	صَبِيًّا	بچپن میں	يَوْمَ	جس دن
مِنَ الْمِحْرَابِ	حجرۂ عبادت سے	وَّحَنَانًا	اور رقّتِ قلب	وُلِدَ	وہ جنے گئے
فَاَوْحٰى	پس اشارہ کیا	مِّنْ لَّدُنَّا	خاص ہمارے پاس سے	وَيَوْمَ	اور جس دن
اِلَيْهِمْ	ان کی طرف	وَزَكٰوةً	اور پاکیزگی	يَمُوْتُ	وہ مریں گے
اَنْ سَبِّحُوْا	کہ پاکی بیان کرو	وَكَانَ	اور تھے وہ	وَيَوْمَ	اور جس دن
بُكْرَةً	صبح	تَقِيًّا	پرہیزگار	يُبْعَثُ	وہ اٹھائے جائیں گے
وَّعَشِيًّا	اور شام	وَّبَرًّۢا	اور نیک سلوک کرنیوالے	حَيًّا	زندہ کر کے

حروف مقطّعات: —— **کاف، ھا، یا، عین، صاد** —— ان حروف کا یقینی مطلب اللہ تعالیٰ اور رسول اللہ ﷺ کے علاوہ کوئی نہیں جانتا۔ اور سورۂ آل عمران آیت ۷ میں ہے کہ مضبوط علم والے متشابہات کو اللہ پر چھوڑتے ہیں، وہی ان کا مطلب بہتر جانتے ہیں۔

پہلا واقعہ: اس کے بعد حضرت زکریا علیہ السلام کا واقعہ ذکر کیا جاتا ہے —— یہ تذکرہ ہے آپ کے رب کی مہربانی کا اپنے خاص بندے زکریا پر —— حضرت زکریا علیہ السلام بنی اسرائیل کے جلیل القدر پیغمبر ہیں، بڑھئی کا پیشہ کرتے تھے (بخاری) اور اپنے ہاتھ کی کمائی سے کھاتے تھے۔ آپ لاولد تھے، اہلیہ صاحبہ بانجھ تھیں، اور اولاد کی کوئی امید نہیں رہی تھی۔ مگر جب آپ نے حضرت مریم رضی اللہ عنہا کے پاس بے موسم کے پھل دیکھے، تو دل میں اولاد کی خواہش پیدا ہوئی۔

لڑکے کی دعا: —— یاد کرو: جب انھوں نے اپنے رب کو خاموش صدا دی —— یعنی اللہ سے پست آواز

(۱) سویا: حال ہے تکلم کے فاعل سے۔

میں دعا کی۔ دعا کا یہی ادب ہے (اعراف آیت ۵۵) کیونکہ ایسی دعا ریاء سے پاک ہوتی ہے، اور اخلاص سے بھری ہوتی ہے۔ نیز سورۂ آل عمران آیت ۳۸ میں صراحت ہے کہ آپؑ نے یہ دعا حضرت مریم کے سامنے کی تھی: ﴿هُنَالِكَ دَعَا زَكَرِيَّا﴾ اس لئے بھی پوشیدہ دعا کرنا قرینِ مصلحت تھا ــــــ عرض کیا: اے میرے رب! میری ہڈی ہڈی کمزور ہوگئی، اور سر بڑھاپے سے شعلہ زن ہوا، اور میں آپ سے مانگ کر اے میرے رب! کبھی نامراد نہیں ہوا ــــــ کیسا پیارا انداز ہے! ــــــ اور مجھے اپنے پیچھے اقرباء کا ڈر ہے ــــــ کہ وہ میری صحیح جانشینی نہیں کریں گے ــــــ اور میری اہلیہ بانجھ ہے ــــــ یعنی اولاد کا ظاہری سامان کچھ نہیں ــــــ پس آپ مجھے خاص اپنے پاس سے ــــــ یعنی اپنی قدرتِ کاملہ سے ــــــ کوئی کارساز عطا فرمائیں ــــــ یعنی بیٹا عنایت فرمائیں، مگر صاف اس لئے نہیں کہا کہ بیٹا محض بیٹا ہونے کی حیثیت سے مطلوب نہیں تھا بلکہ دینی کارسازی کے مقصد سے مطلوب تھا، اس لئے اس مقصد کا تذکرہ کیا۔ عرض کیا ــــــ جو میرا وارث ہو، اور یعقوب (علیہ السلام) کے خاندان (بنی اسرائیل) کا وارث ہو ــــــ یعنی بنی اسرائل کی دینی خدمات سنبھالے، اور اس کام میں میرا جانشیں ہو ــــــ اور آپ اس کو پسندیدہ بنائیں ــــــ یعنی اس کے اخلاق واعمال اچھے ہوں۔ آپ کا بھی پسندیدہ بندہ ہو اور لوگوں کا بھی، تاکہ لوگ اس کی دینی قیادت تسلیم کریں۔

فائدہ: احادیث سے یہ بات ثابت ہے کہ انبیاء علیہم السلام کے ترکہ میں وراثت جاری نہیں ہوتی، ان کا چھوڑا ہوا مال صدقہ ہوتا ہے۔ ان کی وراثت علم میں چلتی ہے، جو ان کے علم کا جتنا زیادہ حصہ لیتا ہے: وہ اتنا ہی بڑا وارث ہوتا ہے۔ اس آیت میں بھی وراثتِ مال مراد نہیں، نیابتِ دینی مراد ہے۔ اور اس کا قرینہ یہ ہے کہ ایک شخص سارے بنی اسرائیل کا وارث نہیں ہوسکتا۔ اور یہ بات شانِ نبوت کے بھی خلاف ہے کہ نبی دنیا کی حقیر متاع پر رال ٹپکائے، اور حضرت زکریا علیہ السلام کچھ ایسے بڑے مالدار بھی نہیں تھے، وہ تو محنت کر کے گزارہ کرتے تھے۔

لڑکے کی خوش خبری: اللہ پاک نے بتوسط فرشتہ ارشاد فرمایا: ــــــ اے زکریا! ہم تمہیں ایک ایسے لڑکے کی خوش خبری دیتے ہیں جس کا نام یحییٰ ہے ــــــ یعنی اللہ تعالیٰ نے بشارت کیساتھ ہی اس کا نام بھی تجویز کر دیا۔ اور نام بھی کیسا؟ انوکھا! ارشاد ہے: ــــــ ہم نے قبل ازیں اس کا کوئی ہم نام نہیں بنایا ــــــ بعض لوگ اس سے استدلال کرتے ہیں اور کہتے ہیں کہ بچہ کا نام انوکھا ہونا چاہئے۔ مگر یہ استدلال دو وجہ سے درست نہیں: ایک: اس وجہ سے کہ بعض سلف نے سَمِيٌّ کے معنی شبیہ اور ہم صفت کے کئے ہیں۔ یعنی اس شان وصفت کا کوئی شخص ان سے پہلے نہیں ہوا۔ پس یہ آیت صریح نہ رہی۔ دوم: اس وجہ سے کہ حدیث میں ہے: إن أحبَّ أسمائِكم إلى الله: عبد الله وعبد الرحمن:

تمہارے ناموں میں اللہ تعالیٰ کو سب سے زیادہ پسند: عبداللہ اور عبدالرحمٰن ہیں (رواہ مسلم) پس جب لوگ بکثرت یہ نام رکھیں گے تو انوکھا پن کہاں رہے گا!

حضرت زکریا علیہ السلام نے جب یہ خوش خبری سنی تو تازہ لذت حاصل کرنے کے لئے، اور بات پکی کرنے کے لئے ـــــ عرض کیا: اے میرے رب! میرے لڑکا کیسے ہوگا، جبکہ میری بیوی بانجھ ہے، اور میں بڑھاپے کی آخری حد کو پہنچ گیا ہوں! ـــــ اللہ تعالیٰ نے بتوسط فرشتہ ـــــ ارشاد فرمایا: اسی طرح ہوگا ـــــ یعنی موجودہ مایوس کن حالات ہی میں لڑکا ہوگا، اور فرشتہ نے یہ بھی کہا ـــــ اور آپ کے رب نے فرمایا ہے کہ یہ میرے لئے آسان ہے، اور میں نے اس سے پہلے آپ کو پیدا کیا ہے، جبکہ آپ کچھ بھی نہیں تھے ـــــ یعنی جو قادر مطلق لاشئ کو شئ کر سکتا ہے: وہ بوڑھے مرد اور بانجھ عورت سے بچہ کیوں پیدا نہیں کر سکتا!

علوق کی نشانی: ـــــ زکریا (علیہ السلام) نے عرض کیا: اے میرے رب! میرے لئے کوئی نشانی مقرر فرمایئے ـــــ اللہ نے فرشتہ کے توسط سے ـــــ ارشاد فرمایا: آپ کے لئے نشانی یہ ہے کہ آپ لوگوں سے بات نہ کر سکیں تین راتیں تندرست ہونے کی حالت میں ـــــ یعنی باوجود تندرست ہونے کے مسلسل تین رات دن آپ لوگوں کے ساتھ زبان سے بات نہ کر سکیں تو سمجھ لیں کہ حمل قرار پا گیا۔ اس مدت میں آپ کی زبان خالص ذکر اللہ کے لئے وقف ہوجائے گی۔ چنانچہ سورۂ آل عمران میں آپ کو ان دنوں میں بکثرت اللہ کو یاد کرنے کا، اور صبح وشام تسبیح میں مشغول رہنے کا حکم دیا گیا ہے ـــــ سبحان اللہ! ہم خُرما ہم ثواب! نشانی بھی ایسی کہ نشانی بھی اور ذکر الٰہی بھی! ـــــ پھر جب وہ وقتِ موعود آیا ـــــ تو آپ عبادت کے کمرے سے اپنی قوم کی طرف نکلے، پس ان سے اشارہ سے کہا کہ تم صبح وشام یادِ الٰہی میں مشغول ہوجاؤ ـــــ یعنی آپ نے نعمتِ الٰہی کی خوشی میں چاہا کہ دوسرے لوگ بھی ذکر وفکر میں آپ کے شریک حال ہوجائیں۔

حضرت یحییٰ کے احوال: پھر جب اللہ تعالیٰ نے یحییٰ علیہ السلام کو منصب نبوت عطا فرمایا، تو ارشاد فرمایا: ـــــ اے یحییٰ! آپ کتاب مضبوطی سے پکڑیں ـــــ یعنی تورات پر مضبوطی سے قائم رہیں، اور بنی اسرائیل کو بھی اس پر قائم کریں ـــــ اور ہم نے ان کو بچپن ہی میں دانائی، اور خاص اپنے پاس سے رقّتِ قلبی اور پاکیزگی عطا فرمائی ـــــ چنانچہ آپ کو ایک مرتبہ لڑکوں نے کھیلنے کے لئے بلایا، آپ نے جواب دیا: ہم اس کام کے لئے پیدا نہیں ہوئے! ـــــ اور آپ خدا کے خوف سے اس قدر روتے تھے کہ رخساروں پر آنسوؤں کی نالیاں بن گئی تھیں ـــــ اور حدیث میں ہے کہ آپ نے نہ کبھی کوئی گناہ کیا، نہ گناہ کا ارادہ کیا (درمنثور) ـــــ اور آپ پرہیزگار اور اپنے والدین کے ساتھ حسن

سلوک کرنے والے تھے —— اور ایسا ہی بندہ اللہ کے نزدیک اور لوگوں کے نزدیک پسندیدہ ہوتا ہے —— اور وہ سرکش نافرمان نہیں تھے —— جیسے آرزو کے بیٹے ہوتے ہیں —— اور ان پر سلامتی ہو جس دن وہ پیدا ہوئے، اور جس دن وہ وفات پائیں گے، اور جس دن وہ زندہ کر کے اٹھائے جائیں گے —— یعنی تمام احوال واوقات میں: ولادت سے وفات تک، اور موت سے قیامت تک، کسی وقت بھی آپ کے لئے کوئی خطرہ نہیں۔

وَاذْكُرْ فِي الْكِتٰبِ مَرْيَمَ ۘ اِذِ انْتَبَذَتْ مِنْ اَهْلِهَا مَكَانًا شَرْقِيًّا ﴿۱۶﴾ فَاتَّخَذَتْ مِنْ دُوْنِهِمْ حِجَابًا ۫ فَاَرْسَلْنَآ اِلَيْهَا رُوْحَنَا فَتَمَثَّلَ لَهَا بَشَرًا سَوِيًّا ﴿۱۷﴾ قَالَتْ اِنِّيْٓ اَعُوْذُ بِالرَّحْمٰنِ مِنْكَ اِنْ كُنْتَ تَقِيًّا ﴿۱۸﴾ قَالَ اِنَّمَآ اَنَا رَسُوْلُ رَبِّكِ ۖ لِاَهَبَ لَكِ غُلٰمًا زَكِيًّا ﴿۱۹﴾ قَالَتْ اَنّٰى يَكُوْنُ لِيْ غُلٰمٌ وَّلَمْ يَمْسَسْنِيْ بَشَرٌ وَّلَمْ اَكُ بَغِيًّا ﴿۲۰﴾ قَالَ كَذٰلِكِ ۚ قَالَ رَبُّكِ هُوَ عَلَيَّ هَيِّنٌ ۚ وَلِنَجْعَلَهٗٓ اٰيَةً لِّلنَّاسِ وَرَحْمَةً مِّنَّا ۚ وَكَانَ اَمْرًا مَّقْضِيًّا ﴿۲۱﴾ فَحَمَلَتْهُ فَانْتَبَذَتْ بِهٖ مَكَانًا قَصِيًّا ﴿۲۲﴾ فَاَجَآءَهَا الْمَخَاضُ اِلٰى جِذْعِ النَّخْلَةِ ۚ قَالَتْ يٰلَيْتَنِيْ مِتُّ قَبْلَ هٰذَا وَكُنْتُ نَسْيًا مَّنْسِيًّا ﴿۲۳﴾ فَنَادٰىهَا مِنْ تَحْتِهَآ اَلَّا تَحْزَنِيْ قَدْ جَعَلَ رَبُّكِ تَحْتَكِ سَرِيًّا ﴿۲۴﴾ وَهُزِّيْٓ اِلَيْكِ بِجِذْعِ النَّخْلَةِ تُسٰقِطْ عَلَيْكِ رُطَبًا جَنِيًّا ﴿۲۵﴾ فَكُلِيْ وَاشْرَبِيْ وَقَرِّيْ عَيْنًا ۚ فَاِمَّا تَرَيِنَّ مِنَ الْبَشَرِ اَحَدًا ۙ فَقُوْلِيْٓ اِنِّيْ نَذَرْتُ لِلرَّحْمٰنِ صَوْمًا فَلَنْ اُكَلِّمَ الْيَوْمَ اِنْسِيًّا ﴿۲۶﴾ فَاَتَتْ بِهٖ قَوْمَهَا تَحْمِلُهٗ ۭ قَالُوْا يٰمَرْيَمُ لَقَدْ جِئْتِ شَيْـًٔا فَرِيًّا ﴿۲۷﴾ يٰٓاُخْتَ هٰرُوْنَ مَا كَانَ اَبُوْكِ امْرَاَ سَوْءٍ وَّمَا كَانَتْ اُمُّكِ بَغِيًّا ﴿۲۸﴾ فَاَشَارَتْ اِلَيْهِ ۭ قَالُوْا كَيْفَ نُكَلِّمُ مَنْ كَانَ فِي الْمَهْدِ صَبِيًّا ﴿۲۹﴾ قَالَ اِنِّيْ عَبْدُ اللّٰهِ ۭ اٰتٰىنِيَ الْكِتٰبَ وَجَعَلَنِيْ نَبِيًّا ﴿۳۰﴾ وَّجَعَلَنِيْ مُبٰرَكًا اَيْنَ مَا كُنْتُ ۠ وَاَوْصٰنِيْ بِالصَّلٰوةِ وَالزَّكٰوةِ مَا دُمْتُ حَيًّا ﴿۳۱﴾ وَّبَرًّۢا بِوَالِدَتِيْ ۡ وَلَمْ يَجْعَلْنِيْ جَبَّارًا شَقِيًّا ﴿۳۲﴾ وَالسَّلٰمُ عَلَيَّ يَوْمَ وُلِدْتُّ وَيَوْمَ اَمُوْتُ وَيَوْمَ اُبْعَثُ حَيًّا ﴿۳۳﴾ ذٰلِكَ عِيْسَى ابْنُ مَرْيَمَ ۚ قَوْلَ الْحَقِّ الَّذِيْ فِيْهِ يَمْتَرُوْنَ ﴿۳۴﴾ مَا كَانَ لِلّٰهِ اَنْ يَّتَّخِذَ مِنْ وَّلَدٍ ۙ سُبْحٰنَهٗ ۭ اِذَا قَضٰٓى اَمْرًا فَاِنَّمَا يَقُوْلُ

لَهٗ كُنْ فَيَكُوْنُ ۝۳۵ وَاِنَّ اللّٰهَ رَبِّيْ وَرَبُّكُمْ فَاعْبُدُوْهُ ۭ هٰذَا صِرَاطٌ مُّسْتَقِيْمٌ ۝۳۶ فَاخْتَلَفَ الْاَحْزَابُ مِنْۢ بَيْنِهِمْ ۚ فَوَيْلٌ لِّلَّذِيْنَ كَفَرُوْا مِنْ مَّشْهَدِ يَوْمٍ عَظِيْمٍ ۝۳۷ اَسْمِعْ بِهِمْ وَاَبْصِرْ ۙ يَوْمَ يَاْتُوْنَنَا لٰكِنِ الظّٰلِمُوْنَ الْيَوْمَ فِيْ ضَلٰلٍ مُّبِيْنٍ ۝۳۸ وَاَنْذِرْهُمْ يَوْمَ الْحَسْرَةِ اِذْ قُضِيَ الْاَمْرُ ۘ وَهُمْ فِيْ غَفْلَةٍ وَّهُمْ لَا يُؤْمِنُوْنَ ۝۳۹ اِنَّا نَحْنُ نَرِثُ الْاَرْضَ وَمَنْ عَلَيْهَا وَاِلَيْنَا يُرْجَعُوْنَ ۝۴۰ ع

ع ۲ / ۲۵ / ۵

وَاذْكُرْ	اور ذکر کیجئے	بَشَرًا	انسان	غُلٰمًا	لڑکا
فِي الْكِتٰبِ	کتاب میں	سَوِيًّا[1]	تندرست کا	زَكِيًّا	پاکیزہ
مَرْيَمَ	مریم کا	قَالَتْ	کہا اس نے	قَالَتْ	کہا اس نے
اِذِ	جب	اِنِّيْٓ	بیشک میں	اَنّٰى	کیسے
انْتَبَذَتْ	علحدہ ہوئیں	اَعُوْذُ	پناہ مانگتی ہوں	يَكُوْنُ	ہوگا
مِنْ اَهْلِهَا	اپنے گھر والوں سے	بِالرَّحْمٰنِ	مہربان ذات کی	لِيْ	میرے
مَكَانًا	جگہ میں	مِنْكَ	تجھ سے	غُلٰمٌ	لڑکا
شَرْقِيًّا	مشرقی	اِنْ كُنْتَ	اگر ہے تو	وَّلَمْ يَمْسَسْنِيْ	اور نہیں ہاتھ لگایا مجھے
فَاتَّخَذَتْ	پس اس نے بنایا	تَقِيًّا	پرہیزگار	بَشَرٌ	کسی انسان نے
مِنْ دُوْنِهِمْ	ان سے وَرے	قَالَ	کہا (روح) نے	وَّلَمْ اَكُ	اور نہیں ہوں میں
حِجَابًا	پردہ	اِنَّمَآ	صرف	بَغِيًّا	بدکار
فَاَرْسَلْنَآ	پس بھیجا ہم نے	اَنَا	میں	قَالَ	کہا فرشتہ نے
اِلَيْهَا	اس کی طرف	رَسُوْلُ	بھیجا ہوا ہوں	كَذٰلِكِ	اسی طرح (ہوگا)
رُوْحَنَا	ہماری روح کو	رَبِّكِ	تیرے رب کا	قَالَ	فرمایا
فَتَمَثَّلَ	پس پیکر محسوس اختیار کیا	لِاَهَبَ	تا کہ عطا کروں میں	رَبُّكِ	تیرے رب نے
لَهَا	اس کے سامنے	لَكِ	تجھے	هُوَ	وہ

(۱) سَوِيًّا (صفت) سیدھا، درست: جو جسمانی ساخت اور اخلاق میں معتدل ہو۔

عَلَيَّ	میرے لئے	النَّخْلَةِ	کھجور کے	النَّخْلَةِ	کھجور کے
هَيِّنٌ	آسان ہے	قَالَتْ	کہا اس نے	تُسٰقِطْ	گرائے گا وہ
وَلِنَجْعَلَهٗٓ [1]	اور تا کہ بنائیں ہم اسے	يٰلَيْتَنِيْ	اے کاش میں	عَلَيْكِ	تجھ پر
اٰيَةً	نشانی	مِتُّ	مرجاتی	رُطَبًا	کھجوریں
لِّلنَّاسِ	لوگوں کے لئے	قَبْلَ هٰذَا	اس سے پہلے	جَنِيًّا	چنیدہ
وَرَحْمَةً	اور مہربانی	وَكُنْتُ	اور ہوتی میں	فَكُلِيْ	پس کھا تو
مِّنَّا	ہماری	نَسْيًا [3]	بھولی	وَاشْرَبِيْ	اور پی تو
وَكَانَ	اور ہے وہ	مَّنْسِيًّا	بسری	وَقَرِّيْ [6]	اور ٹھنڈی کر
اَمْرًا	ایک بات	فَنَادٰىهَا	پس پکارا اسکو فرشتہ نے	عَيْنًا	آنکھ
مَّقْضِيًّا	طے شدہ	مِنْ تَحْتِهَآ	اس کے پائین سے	فَاِمَّا	پس اگر
فَحَمَلَتْهُ	پس حمل رہ گیا اس کو	اَلَّا [4]	کہ نہ	تَرَيِنَّ [7]	دیکھے تو
	لڑکے کا	تَحْزَنِيْ	غم کر تو	مِنَ الْبَشَرِ	انسانوں میں سے
فَانْتَبَذَتْ	پس علحدہ ہوئی وہ	قَدْ جَعَلَ	تحقیق بنائی	اَحَدًا	کسی کو
بِهٖ	حمل کے ساتھ	رَبُّكِ	تیرے رب نے	فَقُوْلِيْٓ	پس کہہ تو
مَكَانًا	جگہ میں	تَحْتَكِ	تیرے پائین میں	اِنِّيْ	بیشک میں نے
قَصِيًّا [2]	دور	سَرِيًّا [5]	چھوٹی نہر	نَذَرْتُ	منت مانی ہے
فَاَجَآءَهَا	پس لایا اس کو	وَهُزِّيْٓ	اور ہلا تو	لِلرَّحْمٰنِ	مہربان ذات کے لئے
الْمَخَاضُ	دردِ زہ	اِلَيْكِ	اپنی طرف	صَوْمًا	روزے کی
اِلٰى جِذْعِ	تنے کی طرف	بِجِذْعِ	تنے کو	فَلَنْ	پس ہرگز نہیں

(۱) تعليلٌ لمعلَّل محذوف أى نجعلُ وَهْبَ الغلامِ (روح) یعنی اس طور پر اس لئے پیدا کریں گے کہ وہ نشانی بنے۔
(۲) قَصِيٌّ (صفت) دور، مادّہ: قَصًا: دوری۔ اسی سے الأقصى ہے (۳) نَسْيًا (اسم) ایسی متروک چیز جسے یاد نہ کیا جائے۔ مَنْسِيًّا: (اسم مفعول) فراموش کردہ از نسیان بسری: ذہن سے اتری ہوئی (۴) أَلَّا: دو لفظ ہیں: أَن مصدریہ اور لا نافیہ (۵) سَرِيّ: وہ چھوٹی نہر جو نخلستان کی طرف رواں ہو (۶) قَرِّي: امر حاضر معروف، واحد مؤنث۔ از قَرّ: خنکی (۷) تَرَيِنَّ: مضارع واحد مؤنث حاضر بانون تاکید ثقیلہ۔

اُكَلِّمَ	بات کرونگی میں	فَاَشَارَتْ	پس اشارہ کیا اس نے	مَا دُمْتُ	جب تک رہوں میں
الْيَوْمَ	آج	اِلَيْهِ	لڑکے کی طرف	حَيًّا	زندہ
اِنْسِيًّا (۱)	کسی انسان سے	قَالُوْا	کہا انھوں نے	وَّبَرًّا	اور نیک سلوک کرنیوالا
فَاَتَتْ	پس آئی وہ	كَيْفَ	کیسے	بِوَالِدَتِيْ	اپنی والدہ کے ساتھ
بِهٖ	لڑکے کے ساتھ	نُكَلِّمُ	بات کریں ہم	وَلَمْ يَجْعَلْنِيْ	اور نہیں بنایا مجھے
قَوْمَهَا	اپنی قوم کے پاس	مَنْ كَانَ	اس سے جو ہے	جَبَّارًا	سرکش
تَحْمِلُهٗ	گود میں اٹھائے ہوئے	فِي الْمَهْدِ	پالنے میں	شَقِيًّا	بدبخت
قَالُوْا	کہا لوگوں نے	صَبِيًّا	بچہ	وَالسَّلٰمُ	اور سلامتی ہو
يٰمَرْيَمُ	اے مریم	قَالَ	کہا لڑکے نے	عَلَيَّ	مجھ پر
لَقَدْ	بخدا تحقیق	اِنِّيْ	بیشک میں	يَوْمَ	جس دن
جِئْتِ	آئی تو	عَبْدُ اللّٰهِ	اللہ کا بندہ ہوں	وُلِدْتُّ	جنا گیا میں
شَيْئًا	چیز کو	اٰتٰنِيَ	دی اللہ نے مجھے	وَيَوْمَ	اور جس دن
فَرِيًّا (۲)	عجیب!	الْكِتٰبَ	کتاب (انجیل)	اَمُوْتُ	مرونگا میں
يٰاُخْتَ	اے بہن	وَجَعَلَنِيْ	اور بنایا مجھے	وَيَوْمَ	اور جس دن
هٰرُوْنَ	ہارون (کی)	نَبِيًّا	پیغمبر	اُبْعَثُ	اٹھایا جاؤنگا میں
مَا كَانَ	نہیں تھے	وَّجَعَلَنِيْ	اور بنایا مجھے	حَيًّا	زندہ کرکے
اَبُوْكِ	تیرے ابا	مُبٰرَكًا	برکت والا	ذٰلِكَ	یہ (ہیں)
امْرَاَ	کوئی آدمی	اَيْنَ مَا	جہاں کہیں	عِيْسَى	عیسیٰ
سَوْءٍ	برے	كُنْتُ	ہوؤں میں	ابْنُ	بیٹے
وَّمَا كَانَتْ	اور نہیں تھی	وَاَوْصٰنِيْ	اور وصیت کی مجھے	مَرْيَمَ	مریم (کے)
اُمُّكِ	تیری ماں	بِالصَّلٰوةِ	نماز	قَوْلَ (۳)	(کہتا ہوں) بات
بَغِيًّا	کوئی بدکار عورت	وَالزَّكٰوةِ	اور زکات کی	الْحَقِّ	سچی

(۱) اِنْس: (آدمی) کی طرف منسوب۔ ی نسبت کی ہے (۲) الفرِیّ: عجیب بات، حیرت انگیز بات، گھڑی ہوئی بات۔ ←

الَّذِیۡ	جو کہ	فَاعۡبُدُوۡهُ	پس اس کی عبادت کرو	فِیۡ ضَلٰلٍ	گمراہی میں ہیں
فِیۡهِ	اس میں	هٰذَا	یہ	مُّبِیۡنٍ	کھلی
یَمۡتَرُوۡنَ	لوگ شک کرتے ہیں	صِرَاطٌ	راستہ (ہے)	وَاَنۡذِرۡهُمۡ	اور آپ ان کو ڈرائیں
مَا کَانَ	نہیں مناسب ہے	مُّسۡتَقِیۡمٌ	سیدھا	یَوۡمَ	دن سے
لِلّٰهِ	اللہ کے لئے	فَاخۡتَلَفَ	پس اختلاف کیا	الۡحَسۡرَةِ	پچھتاوے کے
اَنۡ یَّتَّخِذَ	کہ بنائیں وہ	الۡاَحۡزَابُ	گروہوں نے	اِذۡ	جب
مِنۡ وَّلَدٍ	کوئی بھی اولاد	مِنۡۢ بَیۡنِهِمۡ	آپس میں	قُضِیَ	نمٹا دیا جائے گا
سُبۡحٰنَهٗ	پاک ذات ہے وہ	فَوَیۡلٌ	پس بڑی خرابی ہے	الۡاَمۡرُ	معاملہ
اِذَا	جب	لِّلَّذِیۡنَ	ان کیلئے جنھوں نے	وَهُمۡ	اور وہ
قَضٰۤی	طے کرتے ہیں وہ	کَفَرُوۡا	انکار کیا	فِیۡ غَفۡلَةٍ	غفلت میں ہیں
اَمۡرًا	کسی بات کو	مِنۡ مَّشۡهَدِ [1]	حاضر ہونے سے	وَّهُمۡ	اور وہ
فَاِنَّمَا	تو صرف	یَوۡمٍ عَظِیۡمٍ	بڑے دن کے	لَا یُؤۡمِنُوۡنَ	مانتے نہیں
یَقُوۡلُ	کہتے ہیں	اَسۡمِعۡ بِهِمۡ	کیسے کچھ شنوا ہونگے	اِنَّا نَحۡنُ	اور بیشک ہم ہی
لَهٗ	اس سے	وَاَبۡصِرۡ [2]	اور کیسے کچھ بینا ہونگے	نَرِثُ	وارث ہونگے
کُنۡ	ہو جا	یَوۡمَ	جس دن	الۡاَرۡضَ	زمین کے
فَیَکُوۡنُ	پس وہ ہو جاتی ہے	یَاۡتُوۡنَنَا	وہ ہمارے پاس آئیں گے	وَمَنۡ	اور ان کے جو
وَاِنَّ اللّٰهَ	اور بیشک اللہ	لٰکِنِ	مگر	عَلَیۡهَا	زمین پر ہیں
رَبِّیۡ	میرے رب ہیں	الظّٰلِمُوۡنَ	ظالم لوگ	وَاِلَیۡنَا	اور ہماری طرف
وَرَبُّکُمۡ	اور تمہارے رب ہیں	الۡیَوۡمَ	آج	یُرۡجَعُوۡنَ	لوٹائے جائیں گے وہ

دوسرا واقعہ: حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی ولادت کا ہے۔ قرآن کریم میں اس واقعہ کی تمہید میں حضرت یحییٰ علیہ السلام

← (۳) قولَ الحق: مفعول مطلق ہے فعل محذوف کا أی أقول إلخ.

(۱) مشهد (مصدر میمی) حاضر ہونا۔ اور ظرف مکان بھی ہے، مگر یہاں مصدر بہتر ہے (۲) أبصر کے بعد بھم محذوف ہے، اور أفْعِلْ بہ: فعل تعجب کا وزن ہے۔

کی ولادت کا تذکرہ کیا جاتا ہے، کیونکہ دونوں واقعے اللہ تعالیٰ کی قدرت کی نشانیاں ہیں۔ یحییٰ علیہ السلام کا وجود بوڑھے مرد اور بانجھ عورت سے ہوا ہے، اور عیسیٰ علیہ السلام کا وجود بغیر مرد کے صرف عورت سے ہوا ہے۔ اور ایک نشانی دوسری نشانی کے لئے مددگار رہوتی ہے، سمجھنے میں بھی اور تسلیم کرنے میں بھی۔ اس لئے اُس واقعہ کے بعد اب یہ واقعہ ذکر کیا جاتا ہے۔ ارشاد ہے —— اور آپ قرآن میں مریم کا تذکرہ کیجئے: جب وہ اپنے گھر والوں سے جانبِ مشرق کی طرف جدا ہوئیں، پس اس نے ان کے وَرے پردہ ڈال لیا —— یعنی جب وہ بالغ ہوئیں، اور پہلی ماہواری آئی، اور وہ اس سے پاک ہوئیں، تو نہانے کے لئے مکان کے مشرقی حصہ میں گئیں۔ مشرقی حصہ یہ محض اتفاقی بات ہے (روح) اور گھر والوں سے آڑ کرنے کے لئے پردہ ڈال لیا۔ پھر جب نہا کر فارغ ہوئیں، اور کپڑے پہن لئے —— تو ہم نے اس کی طرف ہماری روح (حضرت جبرئیل علیہ السلام) کو بھیجا، پس اس نے مریم کے سامنے ایک تندرست انسان کا پیکر اختیار کیا —— روح کے لغوی معنی ہیں: حیات اور جان۔ اور حیات مادّی بھی ہوتی ہے اور روحانی بھی۔ چنانچہ قرآن کی اصطلاح میں انسانی جان کو بھی روح کہا گیا ہے، کیونکہ وہ جسمانی زندگی کا سبب ہے اور وحی اور وحی لانے والے فرشتے حضرت جبرئیل علیہ السلام کو بھی روح کہا گیا ہے، کیونکہ وہ دینی زندگی کا سبب ہیں۔ سورہ بنی اسرائیل آیت ۸۵ میں جس روح کے بارے میں سوال ہے: وہ انسانی جان ہے۔ اور سورۃ الشوری آیت ۵۲ میں، اور سورۃ النحل آیت ۲ میں روح سے وحی مراد ہے۔ اور سورۃ القدر آیت ۴ میں روح سے حضرت جبرئیل علیہ السلام مراد ہیں۔

اور حضرت جبرئیل علیہ السلام انسانی صورت میں اس لئے متمثّل ہوئے کہ اس کے بغیر غیر نبی فرشتہ کو نہیں دیکھ سکتا —— اور تندرست یعنی کامل انسان کی صورت میں اس لئے نمودار ہوئے کہ فرشتے عموماً خوش منظر صورتوں ہی میں متمثّل ہوتے ہیں —— اور مرد کی شکل میں اس لئے سامنے آئے کہ مرد عورت سے کامل ہے —— رہی یہ بات کہ وہ کس انسان کی صورت میں نمودار ہوئے تھے؟ اس کا جواب ممکن نہیں، اور خواہ مخواہ کی احتمال آفرینی شرعاً پسندیدہ نہیں۔

جب درونِ پردہ ایک شخص سامنے آکر کھڑا ہو گیا تو حضرت مریم رضی اللہ عنہا گھبرا گئیں —— کہا اس نے: میں تجھ سے مہربان اللہ کی پناہ چاہتی ہوں —— یعنی اس کا واسطہ دیتی ہوں —— اگر تو پرہیزگار ہے —— تو ہٹ جا، مجھ سے کچھ تعرض نہ کر —— اس آدمی نے کہا: میں تیرے رب کا بھیجا ہوا (فرشتہ) ہی ہوں —— پس خوف نہ کھا، اور میں اس لئے بھیجا گیا ہوں —— تا کہ تجھے پاکیزہ لڑکا عطا کروں —— وہ حضرت مریمؑ کے چاک گریبان میں پھونک مارے گا، جس سے حمل قرار پائے گا، جیسا کہ آگے آرہا ہے —— مریم نے کہا: میرے لڑکا کیسے ہوگا، درانحالیکہ مجھے کسی انسان نے ہاتھ نہیں لگایا —— یعنی میرا نکاح نہیں ہوا —— اور نہ میں بدکار عورت

ہوں ـــــ یعنی عالم اسباب میں اولاد ہونے کی یہی دو صورتیں ہیں، اور وہ دونوں نہیں پائی جاتیں، پھر میرے لڑکا کیونکر ہوگا؟ ـــــ فرشتے نے کہا: اسی طرح ـــــ ہوگا یعنی اسباب ظاہری کے توسط کے بغیر ہوگا ـــــ تیرے رب نے فرمایا ہے: وہ میرے لئے آسان ہے ـــــ اور ہم اس طور پر لڑکا اس لئے پیدا کریں گے ـــــ تاکہ ہم اس کو لوگوں کے لئے نشانی اور اپنی مہربانی بنائیں ـــــ اس کی تفصیل آگے آرہی ہے ـــــ اور وہ ایک طے شدہ بات ہے ـــــ پس کوئی اور سوال نہ کیا جائے۔

عیسیٰ علیہ السلام کی انوکھی ولادت میں، اور خود ان کی ذات میں متعدد نشانیاں اور رحمت کے پہلو ہیں۔ چند یہ ہیں:

① جس طرح یحییٰ علیہ السلام کا خاص مشن: عیسیٰ علیہ السلام کی آمد کی خوش خبری سنانا تھا، اسی طرح عیسیٰ علیہ السلام کا خاص مشن: رسول اللہ ﷺ کی آمد کی خوش خبری سنانا تھا۔ اور رسول اللہ ﷺ خاتم النّبیین ہیں، یعنی آپؐ کی ذات میں نبوت کے تمام سلسلے جو آپ سے پہلے چل رہے تھے: جمع کردیئے جائیں گے۔ یہ بات لوگوں کے لئے حیرت کا سبب بنے گی کہ ایک ذات میں تمام سلسلے کیسے جمع ہوسکتے ہیں۔ اس لئے آپؐ سے پہلے متصل پیغمبر میں یہ حیرت انگیز کرشمہ دکھایا۔ تاکہ لوگ جان لیں کہ جب ولادت کا معروف سلسلہ ایک ذات میں جمع ہوسکتا ہے تو روحانی سلسلے بھی جمع ہوسکتے ہیں۔

② عیسیٰ علیہ السلام کا روح وجسد کے ساتھ آسمان پر اٹھایا جانا واقعۂ معراج کی نشانی ہے، معراج میں بھی آپؐ کو جسم کے ساتھ آسمانوں کی سیر کرائی گئی ہے۔

③ عیسیٰ علیہ السلام نبی ہیں، بلکہ خاتم انبیاء بنی اسرائیل ہیں، اور نبی امت کے لئے رحمت ہوتا ہے، اور آپ کو انجیل عطا فرمائی گئی ہے، اور اللہ کی کتاب بھی رحمت ہوتی ہے۔ یہ دونوں رحمتیں بنی اسرائیل کے ساتھ خاص ہیں۔

④ آپ مادرزاد اندھوں کو بینا، کوڑھیوں کو چنگا، اور مُردوں کو زندہ کرتے تھے۔ یہ سب معجزات آپ کے زمانہ والوں کے لئے رحمت ہیں۔

⑤ دجال اکبر کا فتنہ: انسانیت کے لئے ایک بڑا فتنہ ہے۔ اس کو عیسیٰ علیہ السلام کے ذریعہ نابود کرایا جائے گا جو آپ کی رحمت عامہ ہے، کیونکہ اس سے ساری انسانیت کا بھلا ہوگا۔

القصہ: اس کے بعد جیسا کہ سورۃ التحریم میں ہے: حضرت جبرئیل علیہ السلام نے حضرت مریم رضی اللہ عنہا کے گریبان میں پھونک ماری ـــــ پس اس کو لڑکے کا حمل رہ گیا ـــــ پھر جب وضع حمل کے آثار ظاہر ہوئے ـــــ تو وہ حمل کے ساتھ ـــــ یعنی حاملہ ہونے کی حالت میں ـــــ دور جگہ میں علحدہ چلی گئیں ـــــ شاید یہ وہی جگہ ہے جسے

اب بیت اللحم کہتے ہیں، یہ جگہ بیت المقدس سے آٹھ میل کے فاصلہ پر ہے، وہ پریشانی کی حالت میں چلتی ہوئی اتنی دور نکل گئیں۔ یہاں پہنچ کر درد بڑھ گیا ـــــ پس اس کو دردِزِہ کھجور کے ایک تنے کے پاس لایا ـــــ تاکہ وہ اسکے سہارے بیٹھ سکیں ـــــ اس وقت درد کی تکلیف، تنہائی و بے کسی، خوفِ بدنامی ورسوائی اور سامانِ ضرورت وراحت کے فقدان نے سخت بے چین کردیا ـــــ کہا اس نے: اے کاش! میں اس سے پہلے ہی مرگئی ہوتی، اور بھولی بسری ہوگئی ہوتی!

حضرت مریم رضی اللہ عنہا کھجور کے درخت کے نیچے جہاں بیٹھی تھیں: وہ جگہ کچھ بلند تھی ـــــ پس فرشتے نے اس کے پائیں سے اس کو پکارا کہ کچھ غم نہ کر! تیرے پروردگار نے تیرے پائیں میں چھوٹی نہر رواں کی ہے، اور تو اپنی طرف کھجور کے تنے کو ہلا، وہ تجھ پر پکی کھجوریں گرائے گا، پس (کھجوریں) کھا، اور (پانی) پی، اور (لڑکے سے) آنکھ ٹھنڈی کر ـــــ اتنے ہی سامان کی زچہ کو ضرورت ہوتی ہے۔ جس کا قدرت نے انتظام کردیا ـــــ رہا رسوائی کا خوف ـــــ تو اگر تو انسانوں میں سے کسی کو (اعتراض کرتا) دیکھے، تو کہہ: میں نے مہربان اللہ کے لئے (خاموش رہنے کے) روزے کی منت مانی ہے ـــــ ایسا روزہ اور ایسی منت گذشتہ امتوں میں جائز تھی ـــــ پس میں آج کسی انسان سے ہرگز بات نہیں کرسکتی ـــــ اور یہ سب کچھ بھی اشارہ سے کہیں گی، زبان سے نہیں بولیں گی۔ چنانچہ انھوں نے اسی وقت ایسے روزے کی منت مان لی، اور روزہ شروع کردیا ـــــ پس وہ لڑکے کو گود میں اٹھائے اپنی قوم کے پاس واپس آئیں ـــــ لوگ کنواری کے پاس بچہ دیکھ کر حیرت میں پڑ گئے ـــــ انھوں نے کہا: اری مریم! بخدا! تو نے غضب ڈھایا! اے ہارون کی بہن! تیرا باپ کوئی برا آدمی نہیں تھا، اور نہ تیری ماں کوئی آوارہ عورت تھی ـــــ پھر تو یہ کیا کر بیٹھی! ـــــ حضرت مریم رضی اللہ عنہا: حضرت ہارون علیہ السلام کی نسل سے تھیں۔ اور عربی میں خاندان کا فرد: ظاہر کرنے کے لئے أخ اور أخت کے الفاظ استعمال کئے جاتے ہیں، جیسے: ﴿وَاذْكُرْ أَخَاعَادٍ﴾ یعنی ہود علیہ السلام خاندانِ عاد سے ہیں، عاد ان کے مورثِ اعلیٰ ہیں۔ نیز ان کا حقیقی بھائی بھی ہارون نام کا ہوگا، کیونکہ صالحین کے نام پر نام رکھنے کا رواج ہمیشہ سے رہا ہے، جیسا کہ حدیث میں آیا ہے: ـــــ پس مریم نے لڑکے کی طرف اشارہ کیا۔ لوگوں نے کہا: ہم اس سے کیسے بات کریں جو ابھی پالنے میں بچہ ہے! ـــــ یعنی چوری اور سینہ زوری! کہتی ہے: بچہ سے پوچھو! بھلا گود کا بچہ کہیں بولا ہے!

لڑکے نے کہا: میں اللہ کا بندہ ہوں! ـــــ یعنی ابھی یہ گفتگو ہو ہی رہی تھی کہ حضرت مسیح علیہ السلام بول پڑے کہ میں اللہ کا بندہ ہوں: نہ اللہ ہوں نہ اللہ کا بیٹا! ـــــ اللہ نے مجھے کتاب (انجیل) عنایت فرمائی ہے، اور مجھے نبی بنایا ہے، اور مجھے بابرکت بنایا ہے جہاں بھی میں رہوں، اور مجھے جب تک زندہ رہوں: نماز اور زکوٰۃ کا تاکیدی حکم دیا ہے،

اور مجھے اپنی والدہ کے ساتھ حسن سلوک کرنے والا بنایا ہے، اور مجھے سرکش بد بخت نہیں بنایا، اور مجھ پر سلامتی ہے جس دن میں پیدا ہوا، اور جس دن میری وفات ہوگی، اور جس دن میں زندہ کرکے اٹھایا جاؤں گا! —— عیسیٰ علیہ السلام نے اپنی معجزاتی گفتگو میں ان باتوں کو جو آئندہ وجود پذیر ہونے والی ہیں: مثلاً نبوت وکتاب ملنے والی ہے: تحقّقِ وقوع کی طرف اشارہ کرنے کے لئے لفظ ماضی سے تعبیر کیا ہے یعنی ان باتوں کا ہونا ایسا یقینی ہے، جیسے ہوئی ہوئی بات یقینی ہوتی ہے۔ اور یہ عربی کا عام اسلوب ہے —— اور زکوٰۃ کا حکم اس وقت ہے، جب قابلِ زکوٰۃ مال موجود ہو، اور حضراتِ انبیاء علیہم الصلوٰۃ والسلام اندوختہ نہیں رکھتے: پس یہ حکم امت کی خاطر ہے، اور لوگوں کو سنانے کے لئے ہے —— عیسیٰ علیہ السلام کی گود کی گفتگو پوری ہوئی۔ آگے اللہ پاک ارشاد فرماتے ہیں: —— یہ مریم کے بیٹے عیسیٰ ہیں: بالکل برحق بات: جس میں لوگ شک کرتے ہیں —— یعنی عیسائی جس کا یقین نہیں کرتے۔ وہ ان کو عبدیت کے مقام سے اٹھا کر الوہیت کے مقام تک پہنچاتے ہیں، اور ان کو اللہ کا بیٹا قرار دیتے ہیں، حالانکہ —— اللہ کے شایانِ شان نہیں کہ وہ کوئی بھی اولاد بنائیں —— نہ بیٹا جیسا کہ عیسائیوں کا عقیدہ ہے، اور نہ بیٹیاں جیسا کہ مشرکوں کا خیال ہے —— ان کی ذات (اس عیب سے) پاک ہے! —— کیونکہ اولاد کی حاجت کمزور کو ہوتی ہے، اور اللہ تعالیٰ قادر مطلق ہیں —— جب وہ کوئی بات طے کرتے ہیں تو اس سے بس اتنا کہتے ہیں کہ ہوجا! تو وہ ہوجاتی ہے —— ایسی قادر ذات کو اولاد کی کیا حاجت ہوسکتی ہے!

اس کے بعد عیسیٰ علیہ السلام کی اس دعوت کا ذکر ہے، جو آپ نے زندگی بھر لوگوں کو دی، یعنی اپنی بندگی اور اللہ کی ربوبیت کی دعوت۔ یہی بات آپ کی گود کی گفتگو میں سب سے پہلے آپ کی زبان مبارک سے نکلی ہے۔ اس دعوت کا تذکرہ سورۂ آل عمران آیت ۵۱ اور سورۃ الزخرف آیت ۶۴ میں بھی ہے۔ فرمایا —— اور یقیناً اللہ تعالیٰ میرے رب ہیں، اور تمہارے رب ہیں، پس اس کی بندگی کرو، یہ سیدھا راستہ ہے —— لہٰذا اسی پر گامزن رہو —— مگر بعد میں آپ کی امت اس راہ سے ہٹ گئی، ارشاد پاک ہے: —— پس جماعتوں نے باہم اختلاف کیا —— یعنی نصاریٰ آگے چل کر بہتّر فرقوں میں بٹ گئے: کوئی حضرت مسیح کو خدا کا بیٹا کہنے لگا، کوئی ان کو تین خداؤں میں سے ایک قرار دینے لگا، کوئی کچھ اور عقیدہ گھڑ بیٹھا۔ حضرت مسیح علیہ السلام کی اصل تعلیم پر ایک بھی نہ رہا —— پس بڑی خرابی ہے ان لوگوں کے لئے جنھوں نے (عیسیٰ علیہ السلام کی عبدیت کا) انکار کیا، بڑے دن کے آنے سے! —— یعنی جب قیامت کا ہولناک دن آئے گا تو ان منکرین کی بری گت بنے گی! —— وہ کیسے کچھ شنوا، اور کیسے کچھ بینا ہونگے، جس دن وہ ہمارے پاس آئیں گے! —— یعنی قیامت کے دن سب ہوش ٹھکانے آجائیں گے —— مگر آج ظالم کھلی

گمراہی میں ہیں! ــــ یعنی آج جب کہ اصلاح حال کا موقعہ ہے: ظالم اندھے بہرے بنے ہوئے ہیں ــــ اور آپؐ ان کو پچھتاوے کے دن سے ڈرائیں، جبکہ معاملہ کا آخری فیصلہ کردیا جائے گا ــــ اوراس کے بعد اصلاح کی کوئی صورت نہ رہے گی ــــ اور وہ غفلت میں ہیں، اور وہ ایمان نہیں لاتے ہیں ــــ یعنی دنیا کے نشہ میں مخمور ہوکر آخرت سے غافل ہیں، ان کو آخرت کا یقین ہی نہیں آتا حالانکہ وہ بالیقین آنے والی ہے ــــ اور بیشک ہم ہی زمین کے اوران کے جوزمین پر ہیں: وارث ہونگے ــــ یعنی اللہ تعالیٰ ہی آخر میں ہر چیز کے مالک رہ جائیں گے، کوئی مجازی مالک بھی باقی نہ رہے گا ــــ اور وہ ہماری طرف لوٹائے جائیں گے ــــ پھر وہ پاداش عمل سے دوچار ہونگے۔

وَاذْكُرْ فِي الْكِتٰبِ اِبْرٰهِيْمَ ۥ اِنَّهٗ كَانَ صِدِّيْقًا نَّبِيًّا ﴿٤١﴾ اِذْ قَالَ لِاَبِيْهِ يٰٓاَبَتِ لِمَ تَعْبُدُ مَا لَا يَسْمَعُ وَلَا يُبْصِرُ وَلَا يُغْنِيْ عَنْكَ شَيْـًٔا ﴿٤٢﴾ يٰٓاَبَتِ اِنِّيْ قَدْ جَاۗءَنِيْ مِنَ الْعِلْمِ مَا لَمْ يَاْتِكَ فَاتَّبِعْنِيْٓ اَهْدِكَ صِرَاطًا سَوِيًّا ﴿٤٣﴾ يٰٓاَبَتِ لَا تَعْبُدِ الشَّيْطٰنَ ۭ اِنَّ الشَّيْطٰنَ كَانَ لِلرَّحْمٰنِ عَصِيًّا ﴿٤٤﴾ يٰٓاَبَتِ اِنِّىْٓ اَخَافُ اَنْ يَّمَسَّكَ عَذَابٌ مِّنَ الرَّحْمٰنِ فَتَكُوْنَ لِلشَّيْطٰنِ وَلِيًّا ﴿٤٥﴾ قَالَ اَرَاغِبٌ اَنْتَ عَنْ اٰلِهَتِيْ يٰٓاِبْرٰهِيْمُ ۚ لَىِٕنْ لَّمْ تَنْتَهِ لَاَرْجُمَنَّكَ وَاهْجُرْنِيْ مَلِيًّا ﴿٤٦﴾ قَالَ سَلٰمٌ عَلَيْكَ ۚ سَاَسْتَغْفِرُ لَكَ رَبِّيْ ۭ اِنَّهٗ كَانَ بِيْ حَفِيًّا ﴿٤٧﴾ وَاَعْتَزِلُكُمْ وَمَا تَدْعُوْنَ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ وَاَدْعُوْا رَبِّيْ ڮ عَسٰٓى اَلَّآ اَكُوْنَ بِدُعَاۗءِ رَبِّيْ شَقِيًّا ﴿٤٨﴾ فَلَمَّا اعْتَزَلَهُمْ وَمَا يَعْبُدُوْنَ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ ۙ وَهَبْنَا لَهٗٓ اِسْحٰقَ وَيَعْقُوْبَ ۭ وَكُلًّا جَعَلْنَا نَبِيًّا ﴿٤٩﴾ وَوَهَبْنَا لَهُمْ مِّنْ رَّحْمَتِنَا وَجَعَلْنَا لَهُمْ لِسَانَ صِدْقٍ عَلِيًّا ﴿٥٠﴾ ع

وَاذْكُرْ	اور ذکر کیجئے	صِدِّيْقًا [1]	بہت تصدیق کرنیوالے	يٰٓاَبَتِ [2]	اے میرے ابا!
فِي الْكِتٰبِ	کتاب میں	نَّبِيًّا	پیغمبر	لِمَ	کیوں
اِبْرٰهِيْمَ	ابراہیم کا	اِذْ قَالَ	جب کہا انھوں نے	تَعْبُدُ	عبادت کرتے ہیں آپ
اِنَّهٗ كَانَ	بیشک وہ تھے	لِاَبِيْهِ	اپنے باپ سے	مَا	اس (مورتی) کی جو

(۱) صدیق: مبالغہ کا صیغہ ہے۔ اوراس کے دو معنی ہیں: (۱) بہت تصدیق کرنے والا (۲) راستباز، بہت زیادہ سچ بولنے والا۔ (۲) أب: پرندا کے وقت ت زیادہ کرتے ہیں، اوروہ ی کا بدل ہوتی ہے۔

لَا يَسْمَعُ	نہیں سنتی ہے	كَانَ	ہے وہ	لَاَرْجُمَنَّكَ	تو ضرور سنگسار کروں
وَلَا يُبْصِرُ	اور نہیں دیکھتی ہے	لِلرَّحْمٰنِ	مہربان اللہ کا		گا میں تجھے
وَلَا يُغْنِيْ	اور نہیں کام آتی ہے	عَصِيًّا	نافرمان	وَاهْجُرْنِيْ	اور چھوڑ تو مجھے
عَنْكَ	آپ کے	يٰۤاَبَتِ	اے میرے ابا!	مَلِيًّا(۲)	عرصہ دراز کے لئے
شَيْـًٔا	کچھ بھی	اِنِّيْۤ	بیشک میں	قَالَ	کہا اس نے
يٰۤاَبَتِ	اے میرے ابا!	اَخَافُ	ڈرتا ہوں	سَلٰمٌ	سلامتی
اِنِّيْ	بیشک میں	اَنْ	اس سے کہ	عَلَيْكَ	تجھ پر
قَدْ	تحقیق	يَّمَسَّكَ(۱)	چھوئے آپ کو	سَاَسْتَغْفِرُ	اب بخشش چاہونگا میں
جَآءَنِيْ	آیا ہے میرے پاس	عَذَابٌ	عذاب	لَكَ	تیرے لئے
مِنَ الْعِلْمِ	علم میں سے	مِّنَ الرَّحْمٰنِ	مہربان اللہ کی طرف سے	رَبِّيْ	اپنے رب سے
مَا	جو	فَتَكُوْنَ	پس ہو جائیں آپ	اِنَّهٗ	بیشک وہ
لَمْ يَاْتِكَ	نہیں آیا آپکے پاس	لِلشَّيْطٰنِ	شیطان کے	كَانَ	ہے
فَاتَّبِعْنِيْۤ	پس پیروی کریں آپ	وَلِيًّا	ساتھی	بِيْ	مجھ پر
	میری	قَالَ	کہا اس نے	حَفِيًّا(۳)	بہت مہربان
اَهْدِكَ	دکھلاؤنگا میں آپ کو	اَ	کیا	وَاَعْتَزِلُكُمْ	اور جدا ہو جاؤنگا میں تم سے
صِرَاطًا	راہ	رَاغِبٌ	اعراض کرنے والا ہے	وَمَا	اور ان سے جن کو
سَوِيًّا	سیدھی	اَنْتَ	تو	تَدْعُوْنَ	تم پوجتے ہو
يٰۤاَبَتِ	اے میرے ابا!	عَنْ اٰلِهَتِيْ	میرے خداؤں سے	مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ	اللہ کو چھوڑ کر
لَا تَعْبُدِ	نہ پرستش کریں آپ	يٰۤاِبْرٰهِيْمُ	اے ابراہیم	وَاَدْعُوْا	اور بندگی کرونگا میں
الشَّيْطٰنَ	شیطان کی	لَئِنْ	بخدا! اگر	رَبِّيْ	اپنے رب کی
اِنَّ الشَّيْطٰنَ	بیشک شیطان	لَمْ تَنْتَهِ	باز نہ آیا تو	عَسٰۤى	ہوسکتا ہے

(۱) مَسَّ (ف) چھونا، ہاتھ لگانا۔ ك ضمیر مفعول ہے (۲) المَلِيّ (اسم) لمبا وقت، عرصہ دراز، مراد ہمیشہ کے لئے۔ (۳) الحَفِيّ (اسم) نہایت مہربان، شفیق ولطیف۔

اَلَّآ اَكُوْنَ [1]	کہ نہ ہوؤں میں	مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ	اللہ کو چھوڑ کر	وَوَهَبْنَا	اور بخشا ہم نے
بِدُعَآءِ	پکارنے سے	وَهَبْنَا	(تو) بخشا ہم نے	لَهُمْ	ان کو
رَبِّيْ	اپنے رب کے	لَهٗٓ	ان کو	مِّنْ رَّحْمَتِنَا	ہماری مہربانی سے
شَقِيًّا	نامراد	اِسْحٰقَ	اسحاق	وَجَعَلْنَا	اور بنائی ہم نے
فَلَمَّا	پس جب	وَيَعْقُوْبَ	اور یعقوب	لَهُمْ	ان کے لئے
اعْتَزَلَهُمْ	علحدہ ہو گئے وہ ان سے	وَكُلًّا	اور ہر ایک کو	لِسَانَ [2]	زبان
وَمَا	اور جن کی	جَعَلْنَا	بنایا ہم نے	صِدْقٍ	سچ کی
يَعْبُدُوْنَ	وہ عبادت کرتے ہیں	نَبِيًّا	پیغمبر	عَلِيًّا	بلند

عیسائیوں نے حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو اللہ کا بیٹا بنالیا تھا۔ ان کی تردید خود مسیح علیہ السلام کی دعوت سے کردی گئی۔ اور مشرکین نے فرشتوں کو اللہ کی بیٹیاں قرار دے دیا تھا۔ اور ان کی مورتیں بنا کر عبادت شروع کردی تھی۔ اب ان کی تردید ان کے جدامجد حضرت ابراہیم علیہ السلام کی دعوت سے کی جاتی ہے:

تیسرا واقعہ: —— اور آپ قرآن میں ابراہیم کا تذکرہ کریں، وہ یقیناً فوراً تصدیق کرنے والے پیغمبر تھے!

—— صدیق کے دو معنی ہیں:

۱- بہت تصدیق کرنے والا یعنی جس میں سچائی کو قبول کرنے کی اعلیٰ استعداد ہو، جو بھی بات اللہ کی طرف سے پہنچے فوراً اس کے دل میں اتر جائے۔ ذرا شک کی اورادنی توقف کی گنجائش نہ ہو۔ اور یہ نہایت عمدہ وصف ہے، اس سے بڑھ کر کوئی خوبی نہیں۔ حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کو اسی خوبی کی وجہ سے صدیق کا خطاب ملا ہے۔ یہ وصف ہر نبی میں ہوتا ہے، اور حضرت خلیل اللہ میں کامل و مکمل اور وافر مقدار میں تھا —— اور حضرت ابراہیم علیہ السلام کی اس خوبی کے ذکر میں مشرکین کو تنبیہ ہے کہ تم انہی ابراہیم صدیق کی اولاد ہو، تمہارے اندر بھی یہ وصف ہونا چاہئے۔ تمہیں بھی قرآن کی صاف سچی دعوت توحید قبول کرنے میں ذرا توقف نہیں کرنا چاہئے —— اور چونکہ صدیقیت کے لئے نبوت لازم نہیں، اس لئے وصفِ نبوت کی صراحت کی۔

۲- راستباز۔ بہت زیادہ سچ بولنے والا۔ وہ جس سے بکثرت صدق ظاہر ہو، وہ سچ بولنے کا ایسا عادی ہو کہ اس سے

(۱) أَلَّا: دو لفظ ہیں: أن مصدریہ اور لا نافیہ۔ نون کا لام میں ادغام کیا گیا ہے۔ (۲) لسانُ صدقٍ: سچ کی زبان۔ اور محاورہ میں معنی ہیں: ذکرِ خیر، نیک نامی، جیسے قدم صدق کے معنی ہیں: بلند رتبہ ۱۲

جھوٹ بن ہی نہ آئے۔ وہ ہمیشہ صاف سچی بات کہے، نہ توریہ کرے نہ مشتبہ بات کہے۔ یہ بھی بڑا قابل قدر وصف ہے۔ اور یہ خوبی کتنی مشکل ہے: اس کا اندازہ اس وقت ہوگا: جب ہم اپنی روز مرہ کی باتوں کا جائزہ لیں، ہم رات دن معلوم نہیں کیا کیا بولتے رہتے ہیں! یہ وصف بھی تمام نبیوں میں ہوتا ہے، اور خلیل اللہ میں وافر وکامل تھا۔ حدیث میں ہے کہ آپ نے زندگی میں تین ہی کذبات یعنی مشتبہ باتیں کہی ہیں، ورنہ صاف گوئی آپ کا شیوہ تھا۔

صدیق کے ان دونوں معنی میں چولی دامن کا ساتھ ہے، پہلے معنی کے لئے دوسرے معنی لازم ہیں۔ پس حضرت ابراہیم علیہ السلام دونوں معنی کے اعتبار سے صدیق تھے۔ اور اس خوبی کے بیان میں بھی مشرکین کو تنبیہ کی گئی ہے کہ تمہارے صاحب (رسول اللہ ﷺ) راستباز پیغمبر ہیں، وہ جو توحید کی دعوت پیش کررہے ہیں وہ واقعی سچی بات ہے، اس میں شک نہ کرو، فوراً قبول کرلو۔

حضرت ابراہیم علیہ السلام کا خاندان اور ماحول بت پرستی والا ماحول تھا۔ چنانچہ آپ نے نبوت ملنے کے بعد اپنے باپ آذر سے چار باتیں فرمائیں:

پہلی بات: ـــــ جب انھوں نے اپنے باپ سے کہا: اے میرے ابا! آپ کیوں ان بتوں کی عبادت کرتے ہیں جو نہ سنتے ہیں اور نہ دیکھتے ہیں، اور نہ وہ آپ کے کچھ کام آتے ہیں؟! ـــــ یعنی جو سنتے دیکھتے اور مشکلات میں کچھ کام آسکتے ہیں، مثلاً انبیاء اور اولیاء: جب ان کی عبادت جائز نہیں تو پتھروں کی بے جان مورتیوں کی عبادت کیونکر جائز ہوسکتی ہے، ان کو معبود بنانا تو محض بے عقلی کی بات ہے!

دوسری بات: ـــــ اے میرے ابا! میرے پاس وہ علم آیا ہے جو آپ کے پاس نہیں آیا ـــــ یعنی اللہ تعالیٰ نے مجھے نبوت اور وحی سے سرفراز فرمایا ہے ـــــ پس آپ میری پیروی کریں، میں آپ کو سیدھی راہ دکھاؤنگا ـــــ یعنی معبود برحق کی پہچان عقل کا کام نہیں، اس کے لئے وحی کی روشنی ضروری ہے۔ اور وہ مجھے حاصل ہے، پس آپ میری پیروی کریں، میں آپ لوگوں کو اللہ کی اور نجات کی راہ دکھاؤنگا۔

تیسری بات: ـــــ اے میرے ابا! آپ شیطان کی پرستش نہ کریں۔ شیطان یقیناً مہربان اللہ کا نافرمان ہے! ـــــ یعنی آپ لوگوں نے شیطان کے اغوا سے مورتیوں کی پرستش شروع کی ہے۔ مگر شیطان تو خود رب رحیم کا نافرمان بندہ ہے، وہ اوروں کو اللہ کا راستہ کیسے دکھا سکتا ہے؟ ـــــ لوگوں کو چاہئے کہ نبیوں کی راہ اپنائیں۔ وہ اللہ کے فرمانبردار بندے ہیں، وہ دوسروں کو بھی اسی راہ پر گامزن کرتے ہیں ـــــ اور صفتِ رحمٰن میں اس طرف اشارہ ہے کہ اللہ کی رحمت دیکھو اور شیطان کی سرکشی! اس کے ساتھ اللہ کا معاملہ رحمت کا ہے، اور اس کا برتاؤ دشمنی والا ہے!

چوتھی بات: ـــــ اے میرے ابا! مجھے ڈر ہے کہ آپ کو مہربان اللہ کی طرف سے عذاب آ پکڑے، پس آپ (ہمیشہ کے لئے) شیطان کے ساتھی ہو کر رہ جائیں ـــــ یعنی ہوسکتا ہے کہ شیطان کی پیروی کے نتیجہ میں آپ لوگوں کو دنیا ہی میں اللہ کا عذاب آ پکڑے، اور آپ لوگ آخرت میں ہمیشہ کے لئے شیطان کے ساتھی ہو کر رہ جائیں۔ پس ابھی سنبھلنے کا جو موقع ہے اس سے فائدہ اٹھالو ـــــ اور صفتِ رحمٰن میں اس طرف اشارہ ہے کہ اللہ تعالیٰ بندوں پر نہایت مہربان ہیں۔ وہ عذاب سے اسی وقت ہلاک کرتے ہیں، جب یہی شانِ کریمی کا تقاضا ہو۔

حضرت ابراہیم علیہ السلام کی باتوں سے دل سوزی صاف ظاہر ہے۔ مگر ان کے سنگ دل باپ نے کیا جواب دیا؟ ـــــ اس نے کہا: اے ابراہیم! کیا تو میرے خداؤں سے روگردانی کرنے والا ہے ـــــ جو ان کی برائی کرتا ہے؟ ـــــ بخدا! اگر تو (بتوں کی برائی سے) باز نہ آیا تو میں ضرور تجھے سنگسار کردوں گا، اور (اپنی خیر چاہتا ہے تو) مجھے عرصۂ دراز کے لئے چھوڑ دے ـــــ یعنی میں اپنے خداؤں کی برائی برداشت نہیں کرسکتا۔ تو نے اگر زبان نہ روکی تو مار مار کر تیرا بھرکس نکال دونگا۔ پس اس سے پہلے کہ میں تجھ پر ہاتھ اٹھاؤں: یہاں سے دفع ہوجا! کہیں اور جامر!

حضرت ابراہیم علیہ السلام پتھروں کے جواب میں بھی پھول برساتے ہیں ـــــ انھوں نے کہا: تو سلامت رہ! اب (بھی) میں اپنے رب سے تیرے لئے بخشش کی دعا کرونگا ـــــ اور ساتھ ہی ہجرت کا ارادہ بھی ظاہر کردیا ـــــ اور میں تم سے اور ان معبودوں سے جن کو تم اللہ کو چھوڑ کر پوجتے ہو جدا ہوجاؤں گا۔ اور (دنیا میں کہیں جا کر) میں اپنے رب کی بندگی کرونگا۔ مجھے پوری امید ہے کہ میں اپنے رب کو پکار کر نامراد نہیں رہونگا! ـــــ یعنی بے وطنی میں بھی وہ میری مدد فرمائے گا۔

پھر جب آپ نے تن بہ تقدیر ہجرت فرمائی تو اللہ تعالیٰ نے آپ کو رحمتوں سے نوازا ـــــ پس جب وہ ان لوگوں سے (قوم اور خاندان سے) اور ان معبودوں سے جن کو وہ لوگ اللہ کو چھوڑ کر پوجتے تھے: جدا ہوگئے تو ہم نے ان کو اسحاق اور یعقوب عطا فرمائے ـــــ یعنی جب ابراہیم علیہ السلام نے ہجرت کی، اور اپنوں سے دور ہوگئے تو اللہ تعالیٰ نے ان سے بہتر آل اولاد دی۔ اسحاق بیٹا اور یعقوب پوتا عنایت فرمایا ـــــ اور اسماعیل علیہ السلام کا تذکرہ اس لئے نہیں کیا کہ وہ آپ کے پاس نہیں رہے تھے، بچپن ہی میں جدا کردیئے گئے تھے ـــــ اور ہم نے دونوں کو پیغمبر بنایا۔ اور ہم نے سب کو اپنی مہربانی سے (حظّ وافر) عطا فرمایا، اور ہم نے سب کا ذکر خیر بلند کیا ـــــ ان کی نسل سے بنی اسرائیل وجود میں آئے۔ جن میں انبیاء مبعوث ہوئے، اور ان پر کتابیں نازل ہوئیں۔ جن سے رہتی دنیا تک ان کی نیک نامی کا ڈنکا بجتا رہے گا۔

فائدہ: حضرت ابراہیم علیہ السلام کا یہ واقعہ گویا نبی ﷺ اور مکہ کے مظلوم مسلمانوں کی داستان ہے۔ مسلمانوں کے رشتہ دار بھی اسی بات پر تُلے ہوئے تھے جو آزر کا ارادہ تھا۔ اور مسلمانوں نے بھی آخر تنگ آ کر وہی کیا جو ابراہیم علیہ السلام نے کیا۔ پہلے مکہ چھوڑ کر حبشہ چلے گئے، پھر مدینہ کی طرف ہجرت کی۔ اور ہجرت کے بعد اللہ کی رحمت نازل ہوئی۔ انصار: مہاجرین کے بھائی بن گئے، بلکہ بھائیوں سے بڑھ کر ثابت ہوئے۔

وَاذْكُرْ فِي الْكِتٰبِ مُوْسٰٓى ۡ اِنَّهٗ كَانَ مُخْلَصًا وَّكَانَ رَسُوْلًا نَّبِيًّا ﴿۵۱﴾ وَنَادَيْنٰهُ مِنْ جَانِبِ الطُّوْرِ الْاَيْمَنِ وَقَرَّبْنٰهُ نَجِيًّا ﴿۵۲﴾ وَوَهَبْنَا لَهٗ مِنْ رَّحْمَتِنَآ اَخَاهُ هٰرُوْنَ نَبِيًّا ﴿۵۳﴾ وَاذْكُرْ فِي الْكِتٰبِ اِسْمٰعِيْلَ ۡ اِنَّهٗ كَانَ صَادِقَ الْوَعْدِ وَكَانَ رَسُوْلًا نَّبِيًّا ﴿۵۴﴾ وَكَانَ يَاْمُرُ اَهْلَهٗ بِالصَّلٰوةِ وَالزَّكٰوةِ ۠ وَكَانَ عِنْدَ رَبِّهٖ مَرْضِيًّا ﴿۵۵﴾ وَاذْكُرْ فِي الْكِتٰبِ اِدْرِيْسَ ۡ اِنَّهٗ كَانَ صِدِّيْقًا نَّبِيًّا ﴿۵۶﴾ وَّرَفَعْنٰهُ مَكَانًا عَلِيًّا ﴿۵۷﴾ اُولٰٓئِكَ الَّذِيْنَ اَنْعَمَ اللّٰهُ عَلَيْهِمْ مِّنَ النَّبِيّٖنَ مِنْ ذُرِّيَّةِ اٰدَمَ ۤ وَمِمَّنْ حَمَلْنَا مَعَ نُوْحٍ ۡ وَّمِنْ ذُرِّيَّةِ اِبْرٰهِيْمَ وَاِسْرَآءِيْلَ ۡ وَمِمَّنْ هَدَيْنَا وَاجْتَبَيْنَا ۭ اِذَا تُتْلٰى عَلَيْهِمْ اٰيٰتُ الرَّحْمٰنِ خَرُّوْا سُجَّدًا وَّبُكِيًّا ﴿۵۸﴾ السجدۃ

وَاذْكُرْ	اور ذکر کیجئے	نَبِيًّا	نبی	وَوَهَبْنَا	اور ہم نے عطا کیا
فِي الْكِتٰبِ	کتاب میں	وَنَادَيْنٰهُ	اور ہم نے ان کو پکارا	لَهٗ	ان کو
مُوْسٰى	موسیٰ کا	مِنْ جَانِبِ	جانب سے	مِنْ رَّحْمَتِنَآ	اپنی مہربانی سے
اِنَّهٗ كَانَ	بیشک وہ تھے	الطُّوْرِ	طور کی	اَخَاهُ (۳)	ان کا بھائی
مُخْلَصًا	برگزیدہ	الْاَيْمَنِ (۱)	دائیں	هٰرُوْنَ	ہارون
وَّكَانَ	اور وہ تھے	وَقَرَّبْنٰهُ	اور ہم نے انکو نزدیک کیا	نَبِيًّا	نبی بنا کر
رَسُوْلًا	رسول	نَجِيًّا (۲)	سرگوشی کے لئے	وَاذْكُرْ	اور ذکر کیجئے

(۱) الأیمن: صفت جانب کی۔ (۲) نجیا: مفعول لہ اور حال دونوں ہو سکتے ہیں۔ (۳) أخاہ: مفعول بہ، ھارون: عطف بیان، اور نبیا: حال ہے۔

فِی الْکِتٰبِ	کتاب میں	فِی الْکِتٰبِ	کتاب میں	وَ مِمَّنْ	اوران میں سے جن کو
اِسْمٰعِیْلَ	اسماعیل کا	اِدْرِیْسَ	ادریس کا	حَمَلْنَا	سوار کیا ہم نے
اِنَّهٗ كَانَ	بیشک وہ تھے	اِنَّهٗ كَانَ	بیشک وہ تھے	مَعَ نُوْحٍ	نوح کے ساتھ
صَادِقَ	سچے	صِدِّیْقًا	نہایت تصدیق کرنیوالے	وَّمِنْ ذُرِّیَّةِ	اورنسل سے
الْوَعْدِ	وعدہ (کے)	نَّبِیًّا	نبی	اِبْرٰهِیْمَ	ابراہیم
وَكَانَ	اوروہ تھے	وَّرَفَعْنٰهُ	اورہم نے ان کو بلند کیا	وَ اِسْرَآءِیْلَ	اوریعقوب (کی)
رَسُوْلًا	رسول	مَكَانًا	جگہ میں	وَمِمَّنْ	اوران سے جن کو
نَّبِیًّا	نبی	عَلِیًّا	بلند	هَدَیْنَا	ہم نے راہ دکھائی
وَكَانَ یَاْمُرُ	اوروہ حکم دیا کرتے تھے	اُولٰٓئِكَ	یہ لوگ	وَ اجْتَبَیْنَا	اورہم نے برگزیدہ کیا
اَهْلَهٗ	اپنے گھروالوں کو	الَّذِیْنَ	جوکہ	اِذَا تُتْلٰى	جب پڑھی جاتی ہیں
بِالصَّلٰوةِ	نماز کا	اَنْعَمَ	انعام فرمایا	عَلَیْهِمْ	ان پر
وَ الزَّكٰوةِ	اورزکوۃ کا	اللّٰهُ	اللہ نے	اٰیٰتُ	آیتیں
وَكَانَ	اوروہ تھے	عَلَیْهِمْ	ان پر	الرَّحْمٰنِ	مہربان اللہ (کی)
عِنْدَ رَبِّهٖ	اپنے رب کے نزدیک	مِّنَ النَّبِیّٖنَ	نبیوں میں سے	خَرُّوْا	(تو) گر پڑتے ہیں وہ
مَرْضِیًّا (۱)	پسندیدہ	مِنْ ذُرِّیَّةِ	نسل سے	سُجَّدًا	سجدہ کرتے ہوئے
وَاذْكُرْ	اورذکر کیجئے	اٰدَمَ	آدم (کی)	وَّبُكِیًّا	اورروتے ہوئے

حضرت ابراہیم علیہ السلام نے دعا کی ہے: "الٰہی! میرا ذکر خیر آئندہ نسلوں میں باقی رکھ!" (الشعراء آیت ۸۴) اور گذشتہ آیت میں اللہ پاک کا ارشاد ہے کہ ہم نے ان کی خوب شہرت کی۔ اس شہرت میں حضرت موسیٰ علیہ السلام کا بھی حصہ ہے۔ اس لئے اب ان کا اور ان کے بھائی حضرت ہارون علیہما السلام کا ذکر کیا جاتا ہے ـــــ اور آپ قرآن میں موسیٰ کا تذکرہ کیجئے: بیشک وہ برگزیدہ تھے ـــــ اللہ تعالیٰ نے ان کو خاص اپنے کام کے لئے منتخب کیا تھا (طٰہٰ آیت ۴۱)

(۱) مرضیا (اسم مفعول) کی اصل مَرْضُوْوٌ ہے، تعلیل: واو طرف کلمہ میں واقع ہوا، اور اس سے پہلے والا حرف ساکن ہے، اس لئے اس کو ی سے بدلا۔ پھر واو اور ی جمع ہوئے جن میں پہلا ساکن ہے، پس اس کو بھی ی سے بدلا، اور ی کا ی میں ادغام کیا۔ اور ض کے ضمہ کو کسرہ سے بدلا۔

——— اور وہ رسول نبی تھے ——— رسول: فرشتہ بھی ہوتا ہے، سورۃ الحج آیت ۷۵ میں ہے: ’’اللہ تعالیٰ فرشتوں میں سے اور انسانوں میں سے رسولوں کو منتخب فرماتے ہیں‘‘ اور نبی: انسان ہی ہوتا ہے۔ اس لئے رسول کے بعد نبی بڑھایا ——— اور نبی کا درجہ رسول سے کم ہے۔ اور موسیٰ علیہ السلام اولو العزم پیغمبر ہیں، اس لئے ان کے رسول ہونے کی صراحت بھی ضروری تھی ——— اور ہم نے طور کی دائیں جانب سے ان کو صدا دی ——— دائیں جانب: موسیٰ علیہ السلام کے اعتبار سے ہے۔ آپ میدان میں جہاں قیام فرما تھے وہاں سے دائیں جانب طور واقع تھا۔ اور جغرافیائی اعتبار سے میدان کی مغربی جانب میں واقع تھا، جس کا تذکرہ سورۃ القصص آیت ۴۴ میں ہے ——— اور ہم نے سرگوشی کے لئے ان کو نزدیک کیا ——— یعنی ان سے بلا واسطہ کلام فرمایا، اسی لئے آپ کلیم اللہ کہلاتے ہیں ——— اور ہم نے اپنی مہربانی سے ان کو ان کے بھائی ہارون کو نبی بنا کر عطا فرمایا ——— یعنی حضرت ابراہیم علیہ السلام کی شہرت میں حضرت ہارون علیہ السلام کی بھی حصہ داری ہے، اور اسی طرح دیگر انبیاء بنی اسرائیل کی بھی۔ خاندانِ بنی اسرائیل میں ان حضرات کی سعی سے خلیل اللہ کا نام روشن ہوا، اور عرب قبائل میں حضرت اسماعیل علیہ السلام کی محنت سے، چنانچہ آگے اسماعیل علیہ السلام کا ذکر کیا جاتا ہے۔

ان حضرات کا تذکرہ پہلے کرنے کی وجہ وہ ہے جو پہلے بیان کی جا چکی ہے کہ اسحاق و یعقوب علیہما السلام تا حیات ابراہیم علیہ السلام کی نظروں کے سامنے رہے، اللہ تعالیٰ نے ان کو اپنے خلیل کی دل بستگی کا سامان بنایا، اس لئے جب ان کا تذکرہ کیا تو ان کی نسل کے عظیم المرتبت رسول حضرت موسیٰ علیہ السلام کا ذکر بھی ان کے ساتھ ہی کیا، اور حضرت ہارون کا بھی۔ اب دوسرے صاحب زادے حضرت اسماعیل علیہ السلام کا تذکرہ کیا جاتا ہے، جن کو بچپن ہی سے مکہ مکرمہ میں بسا دیا گیا تھا۔ ارشاد ہے ——— اور آپ قرآن میں اسماعیل کا تذکرہ کیجئے: وہ وعدوں کے سچے تھے ——— انھوں نے اللہ تعالیٰ سے یا بندوں سے جو بھی وعدہ کیا پورا کیا۔ انھوں نے ابا جان سے ذبح ہونے پر صبر کا وعدہ کیا تھا جسے سچا کر دکھایا ——— اس میں مشرکین کو تنبیہ کی گئی ہے کہ رسول اللہ ﷺ جو اسلام کی رفعت اور کفار کی نکبت کے وعدے فرما رہے ہیں: وہ پورے ہو کر رہیں گے، کیونکہ آپؐ اسی صادق الوعد کی نسل سے ہیں ——— اور وہ رسول نبی تھے! ——— یعنی بڑے مرتبہ والے پیغمبر تھے۔ آپ کا مرتبہ حضرت اسحاق علیہ السلام سے بھی بلند ہے، کیونکہ وہ صرف نبی تھے، اور آپ رسول بھی ہیں ——— اور وہ اپنے گھر والوں کو نماز اور زکوٰۃ کا حکم دیا کرتے تھے ——— اصلاح کا یہی طریقہ ہے کہ نزدیک کے لوگوں کی پہلے فکر کی جائے۔ سورۂ طٰہٰ آیت ۱۳۲ میں ہے: ’’اور اپنے گھر والوں کو نماز کا حکم دیں، اور خود بھی اس کے پابند رہیں‘‘ اور سورۃ التحریم آیت ۶ میں ہے: ’’اے ایمان والو! خود کو اور اپنے

گھر والوں کو جہنم کی آگ سے بچاؤ!'' اور سورۃ الشعراء آیت ۲۱۴ میں رسول اللہ ﷺ کو حکم دیا گیا ہے: ''اور آپؐ اپنے نزدیک کے کنبہ کو ڈرائیں'' ـــــ پس ہمیں بھی سب سے پہلے اپنی پھر اپنے متعلقین کی پھر دوسروں کی فکر کرنی چاہئے۔ خود کو بھول جانا، اور اپنوں کو پیچھے ڈال دینا: دعوت کا صحیح طریقہ نہیں۔ گھر والے اور خاندان کے لوگ قریب ہونے کی وجہ سے راہ نمائی کے اولین مستحق ہیں ـــــ اور اس میں مشرکین کو تنبیہ ہے کہ رسول اللہ ﷺ جو تمہاری فکر میں لگے ہوئے ہیں: تو یہ تمہارے جدامجد کا طریقہ ہے ـــــ اور وہ اپنے رب کے نزدیک پسندیدہ بندے تھے ـــــ اسی طرح رسول اللہ ﷺ بھی اللہ کے پسندیدہ بندے ہیں، پس ان کی مخالفت کر کے اللہ کی ناراضگی نہ خریدو!

آخر میں حضرت ادریس علیہ السلام کا تذکرہ ہے۔ آپ کا ذکر قرآن پاک میں صرف دو جگہ آیا ہے۔ یہاں اور سورۃ الانبیاء آیت ۸۵ میں۔ اور آپ کے زمانہ کے متعلق مؤرخین میں سخت اختلاف ہے۔ راجح یہ ہے کہ آپ حضرت آدم اور حضرت نوح علیہما السلام کے درمیانی زمانہ میں گذرے ہیں۔ اور روایات میں آیا ہے کہ آپ نے بھی مخالفین سے تنگ آکر مؤمنین کے ساتھ مصر کی طرف ہجرت کی تھی، اس کے بعد آپ کو تاریخ انسانی میں بلند مقام حاصل ہوا۔ (تفصیل کے لئے قصص القرآن ۱: ۹۴-۹۶ دیکھیں) یہاں آپ کا تذکرہ صدیقیت کی اہمیت ظاہر کرنے کے لئے کیا گیا ہے۔ اسی وصف کی وجہ سے ابراہیم علیہ السلام کو مقام رفیع ملا ہے، اور اسی خوبی کی وجہ سے ادریس علیہ السلام کو بلند مرتبہ حاصل ہوا ہے۔

ارشاد ہے ـــــ اور آپؐ قرآن میں ادریس کا تذکرہ کیجئے: وہ بہت تصدیق کرنے والے پیغمبر تھے، اور ہم نے ان کو بلند مرتبہ عطا فرمایا ہے ـــــ یعنی ان کو تاریخ انسانی میں امتیازی مقام حاصل ہے ـــــ اور روایات میں جو آیا ہے کہ ایک فرشتہ ان کو پروں میں چھپا کر آسمانوں میں لے گیا، اور وہ وہاں زندہ ہیں۔ یہ اسرائیلی خرافات ہیں، ابن کثیر رحمہ اللہ نے ان پر تنقید کی ہے ـــــ اس قصہ میں ایک بار پھر اشارہ ہے کہ نبی ﷺ اور مؤمنین کو وطن چھوڑنا پڑسکتا ہے، اور ہجرت کے بعد ان کے دین کو سربلندی حاصل ہوگی۔

جامع تبصرہ: ـــــ یہ منجملۂ انبیاء وہ لوگ ہیں جن پر اللہ نے انعام فرمایا: آدم کی نسل سے اور ان لوگوں کی نسل سے جن کو ہم نے نوح کے ساتھ کشتی میں سوار کیا۔ اور ابراہیم واسرائیل (یعقوب) کی نسل سے، اور ان لوگوں میں سے جن کو ہم نے راہ دکھائی اور برگزیدہ کیا: جب ان کے سامنے مہربان اللہ کی آیتیں پڑھی جاتی ہیں تو وہ سجدہ کرتے ہوئے اور روتے ہوئے گر جاتے ہیں ـــــ حضرت زکریا، حضرت یحیٰ، حضرت عیسیٰ، حضرت موسیٰ اور حضرت ہارون علیہم السلام: بنی اسرائیل (اولادِ یعقوب) میں سے ہیں۔ اور حضرت اسماعیل، حضرت اسحاق اور حضرت یعقوب علیہم السلام: اولادِ ابراہیم میں سے ہیں۔ اور حضرت ابراہیم علیہ السلام: اولادِ نوح علیہ السلام سے ہیں۔ اور حضرت ادریس علیہ السلام:

اولادِ آدم علیہ السلام سے ہیں۔

یہ سب حضرات معراج کمال پر پہنچنے کے باوجود شانِ عبدیت میں کامل تھے۔ اللہ کا کلام سن کر خشوع وخضوع کے ساتھ سجدہ میں گر پڑتے تھے، اور اللہ کو یاد کر کے روتے تھے۔ اسی لئے اس جگہ سجدہ کرنا واجب ہے، تاکہ ان مقربین کی مشابہت حاصل ہو۔

حدیث میں ہے کہ قرآن کی تلاوت کرو اور روؤ، اگر رونا نہ آئے تو رونے کی صورت بنالو

فَخَلَفَ مِنْۢ بَعْدِهِمْ خَلْفٌ اَضَاعُوا الصَّلٰوةَ وَ اتَّبَعُوا الشَّهَوٰتِ فَسَوْفَ يَلْقَوْنَ غَيًّا ﴿۵۹﴾ اِلَّا مَنْ تَابَ وَ اٰمَنَ وَعَمِلَ صَالِحًا فَاُولٰٓئِكَ يَدْخُلُوْنَ الْجَنَّةَ وَلَا يُظْلَمُوْنَ شَيْـًٔا ﴿۶۰﴾ جَنّٰتِ عَدْنِ ِۨ الَّتِيْ وَعَدَ الرَّحْمٰنُ عِبَادَهٗ بِالْغَيْبِ ؕ اِنَّهٗ كَانَ وَعْدُهٗ مَاْتِيًّا ﴿۶۱﴾ لَا يَسْمَعُوْنَ فِيْهَا لَغْوًا اِلَّا سَلٰمًا ؕ وَلَهُمْ رِزْقُهُمْ فِيْهَا بُكْرَةً وَّعَشِيًّا ﴿۶۲﴾ تِلْكَ الْجَنَّةُ الَّتِيْ نُوْرِثُ مِنْ عِبَادِنَا مَنْ كَانَ تَقِيًّا ﴿۶۳﴾ وَمَا نَتَنَزَّلُ اِلَّا بِاَمْرِ رَبِّكَ ۚ لَهٗ مَا بَيْنَ اَيْدِيْنَا وَمَا خَلْفَنَا وَمَا بَيْنَ ذٰلِكَ ۚ وَمَا كَانَ رَبُّكَ نَسِيًّا ﴿۶۴﴾ رَبُّ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ وَمَا بَيْنَهُمَا فَاعْبُدْهُ وَ اصْطَبِرْ لِعِبَادَتِهٖ ؕ هَلْ تَعْلَمُ لَهٗ سَمِيًّا ﴿۶۵﴾ ع ۴ / ۱۵

فَخَلَفَ	پس پیچھے آئے	فَسَوْفَ	پس عنقریب	وَعَمِلَ	اور کیا اس نے
مِنْۢ بَعْدِهِمْ	ان کے بعد	يَلْقَوْنَ	ملیں گے وہ	صَالِحًا	نیک عمل
خَلْفٌ (۱)	برے جانشین	غَيًّا (۲)	وبال سے	فَاُولٰٓئِكَ	پس وہ لوگ
اَضَاعُوا	جنھوں نے ضائع کی	اِلَّا	مگر	يَدْخُلُوْنَ	داخل ہونگے
الصَّلٰوةَ	نماز	مَنْ	جس نے	الْجَنَّةَ	جنت میں
وَ اتَّبَعُوا	اور پیروی کی	تَابَ	توبہ کی	وَلَا	اور نہیں
الشَّهَوٰتِ	خواہشات کی	وَ اٰمَنَ	اور ایمان لایا	يُظْلَمُوْنَ	ظلم کئے جائیں گے

(۱) خَلْف: لام کے جزم کے ساتھ: برا جانشیں۔ اور زبر کے ساتھ: اچھا جانشیں۔ (۲) الغیّ: اسم فعل: گمراہی، بدراہی۔ یہاں گمراہی کی سزا مراد ہے۔ سبب بول کر مسبب مراد لیا گیا ہے۔

شَيْـًٔا	ذرا بھی	فِيْهَا	ان میں	اَيْدِيْنَا	ہمارے ہاتھوں کے
جَنّٰتِ (۱)	جنتیں	بُكْرَةً	صبح	وَمَا	اور جو
عَدْنِ	ہمیشہ رہنے کی	وَّعَشِيًّا	اور شام	خَلْفَنَا	ہمارے پیچھے
الَّتِيْ	جن کا	تِلْكَ	وہ	وَمَا	اور جو
وَعَدَ	وعدہ کیا	الْجَنَّةُ	جنت	بَيْنَ	درمیان
الرَّحْمٰنُ	مہربان اللہ نے	الَّتِيْ	جو کہ	ذٰلِكَ	اس کے ہے
عِبَادَهٗ	اپنے بندوں سے	نُوْرِثُ (۴)	وارث بنائیں گے ہم	وَمَا	اور نہیں
بِالْغَيْبِ	بن دیکھے		(اس کا)	كَانَ	ہیں
اِنَّهٗ	بیشک وہ	مِنْ عِبَادِنَا	اپنے بندوں میں سے	رَبُّكَ	آپ کے رب
كَانَ	ہے	مَنْ كَانَ	اس کو جو تھا	نَسِيًّا (۵)	بھولنے والے
وَعْدُهٗ	اس کا وعدہ	تَقِيًّا	پرہیزگار	رَبُّ	پروردگار
مَاْتِيًّا (۲)	آنے والا	وَمَا	اور نہیں	السَّمٰوٰتِ	آسمانوں
لَا يَسْمَعُوْنَ	نہیں سنیں گے وہ	نَتَنَزَّلُ	اترتے ہم	وَالْاَرْضِ	اور زمین
فِيْهَا	ان میں	اِلَّا	مگر	وَمَا	اور اس کے جو
لَغْوًا	بکواس	بِاَمْرِ	حکم سے	بَيْنَهُمَا	دونوں کے درمیان ہے
اِلَّا (۳)	مگر	رَبِّكَ	آپ کے رب کے	فَاعْبُدْهُ	پس عبادت کر تو اس کی
سَلٰمًا	سلام	لَهٗ	ان کی ملک ہے	وَاصْطَبِرْ (۶)	اور قائم رہ تو
وَلَهُمْ	اور ان کے لئے	مَا	جو	لِعِبَادَتِهٖ	اس کی عبادت پر
رِزْقُهُمْ	ان کی روزی ہے	بَيْنَ	سامنے	هَلْ	کیا

(۱) جَنّٰت: جمع جنة کی، الجنة سے بدل ہے، اور حالتِ نصبی میں ہے۔ جمع مؤنث سالم پر فتح کی جگہ کسرہ آتا ہے۔ التی: موصول صلہ مل کر جنات کی صفت ہے، اور عائد محذوف ہے أی وعدها۔ اور بالغیب: محذوف سے متعلق ہو کر عائد کا حال ہے (۲) مأتیا اسم مفعول ہے، لیکن اسم فاعل کے معنی میں ہے، تحقق وقوع کے لئے اسم مفعول لایا گیا ہے، إتیانٌ: آسانی کے ساتھ آنا، بغیر رکاوٹ کے آنا مَأْتِيًّا کی اصل مَا تُوْيٌ ہے، واو کو ی سے بدلا، اور ت کو کسرہ دیا۔ (۳) استثناء منقطع ہے (۴) اسم موصول کی طرف لوٹنے والی ضمیر محذوف ہے۔ (۵) نَسِيًّا: بروزن فعيل: صفت مشبہ از نسیان: بھولنا، چھوڑنا (۶) اصطبر: فعل امر: قائم رہ، صبر کر از اصطبار: صبر کے ساتھ جمے رہنا۔

تَعۡلَمُ	جانتا ہے تو	لَهٗ	ان کے لئے	سَمِيًّا (۱)	کوئی ہم نام

اگلوں کے بعد اب پچھلوں کا حال دیکھیں: ـــــ پھر ان کے بعد بُرے جانشیں آئے، جنھوں نے نماز ضائع کردی، اور خواہشات کے پیچھے پڑ گئے، پس وہ عنقریب وبال سے دوچار ہونگے ـــــ یعنی نبیوں کے بعد ناہنجار پیدا ہوئے، جو دنیا کے مزوں اور خواہشات کے پیچھے پڑ گئے، اور نماز جیسی اہم عبادت کو چھوڑ بیٹھے ـــــ کچھ تو فرضیت کے منکر ہو گئے، اور دین ہی سے نکل گئے، اور کچھ مسلمان رہے، مگر نماز پڑھنی چھوڑ دی۔ اول اعتقادی کفر ہے اور ثانی عملی۔ حدیث میں ہے: ''جس نے جان کر نماز چھوڑی: اس نے یقیناً انکار کیا'' ـــــ سو وہ عنقریب دنیا و آخرت میں اپنے وبال سے دوچار ہونگے۔ آج امتِ مسلمہ کا جو حال ہے: وہ سب کے سامنے ہے۔ آدھے بھی نماز کے پابند نہیں، اور جو چاہتے ہیں کرتے ہیں، چنانچہ شامتِ اعمال ان پر چھا گئی! ـــــ مگر ابھی توبہ کا دروازہ بند نہیں۔ ارشاد ہے ـــــ مگر جس نے توبہ کی، اور ایمان لے آیا، اور اس نے نیک کام کئے: وہ لوگ جنت میں داخل ہونگے، اور وہ ذرّہ بھر ظلم نہیں کئے جائیں گے ـــــ یعنی گذشتہ گناہوں کی بنا پر ان کے اجر میں کچھ کمی نہیں کی جائے گی۔ توبہ کرنے والا ایسا ہوجاتا ہے جیسے گناہ کیا ہی نہیں۔ پس لوگو! توبہ کرو جنت آپ کے انتظار میں ہے!

وہ ہمیشہ رہنے کے باغات ہیں ـــــ یعنی وہ سدا آباد رہیں گے، اور جنتی وہاں سے کبھی نہیں نکالے جائیں گے ـــــ جن کا رحمان نے اپنے بندوں سے وعدہ کیا ہے، جن کو انھوں نے دیکھا نہیں ـــــ رسول اللہ ﷺ کی خبر پر اعتماد کر کے ایمان لائے ہیں، اور پُر امید ہیں ـــــ یہ وعدہ مہربان اللہ نے اپنے مخصوص بندوں سے کیا ہے یعنی مؤمنین کاملین سے ـــــ اور محض اپنے فضل سے کیا ہے۔ حدیث میں ہے: ''کسی کا عمل اس کو جنت میں نہیں لے جائے گا!'' پوچھا گیا: یارسول اللہ! آپ کا بھی! فرمایا: ''میرا بھی! مگر یہ کہ اللہ تعالیٰ اپنی مغفرت اور رحمت میں مجھ کو ڈھانپ لیں!'' (بخاری حدیث ۶۴۶۷) کیونکہ اعمالِ صالحہ دخولِ جنت کا محض ظاہری سبب ہیں، حقیقی سبب اللہ کی مہربانی ہے۔ مگر عالم اسباب میں ظاہری اسباب کو اختیار کرنا ضروری ہے۔ اس پر حقیقی سبب متفرع ہوتا ہے۔ جیسے روزی رساں اللہ تعالیٰ ہیں، مگر اسبابِ رزق کا اختیار کرنا فرض ہے ـــــ ان کا وعدہ ضرور پورا ہونے والا ہے ـــــ یعنی مؤمنین کو ضرور جنت ملے گی، وہ اطمینان رکھیں ـــــ وہ جنت میں فضول باتیں نہیں سنیں گے، ہاں ان کو سلام پہنچے گا! ـــــ یعنی جنت بیکار باتوں کی جگہ نہیں، جنتی ہر سانس کے ساتھ اللہ کا ذکر کریں گے، وہ نہ تو بیکار باتیں کریں گے نہ سنیں گے۔ البتہ جنت میں ہر طرف سے سلام کی آواز سنائی دے گی۔ جنتی ایک دوسرے کو سلام کریں گے، فرشتے بھی

(۱) سَمِيّ: صفتِ مشبہ: ہم نام، ہم صفت۔

ان کو سلام کریں گے۔ اور رب رحیم وکریم کا بھی سلام پہنچے گا، جو جنتیوں کے لئے بڑا اعزاز واکرام ہوگا ـــــ اور وہاں ان کو صبح وشام ان کی روزی ملے گی ـــــ یہ صبح وشام جنت کے صبح وشام ہیں، وہاں اگرچہ دنیا کی طرح سورج اور اس کا طلوع وغروب نہیں، مگر خاص قسم کے انوار کا توارد (آنا جانا) ہوگا، جن کے ذریعہ صبح وشام کی تعیین ہوگی۔ اور جنت میں جنتیوں کو جو روزی ملے گی: اس کی کیفیت اللہ تعالیٰ ہی بہتر جانتے ہیں ـــــ یہ وہ جنت ہے جس کا ہم اپنے بندوں میں سے ان کو وارث بنائیں گے جو پرہیزگار تھے ـــــ یعنی جنت جنتیوں کی آبائی میراث اور ان کا حق ہے، ان پر کوئی احسان نہیں ـــــ میراث: اسباب ملک میں سب سے کامل سبب ہے۔ اس میں نہ فسخ کا احتمال ہے نہ رد وابطال اور اقالہ کا۔ سبحان اللہ! بے پایاں کرم فرمایا، اور اس کو جنتیوں کا حق قرار دیا ـــــ البتہ یہ جنت ان لوگوں کو ملے گی جو اس کی قیمت ادا کریں گے۔ اور اس کی قیمت تقوی اور پرہیزگاری ہے۔ جو بندے گناہوں سے بچنے کا پورا اہتمام کرتے ہیں، جنت ان کا انتظار کر رہی ہے، مگر یہ سوغات اپنے وقت پر ملے گی۔ اللہ تعالیٰ نے ہر چیز کا اندازہ مقرر کر رکھا ہے۔ ارشاد ہے ـــــ اور ہم نہیں اترتے مگر آپؐ کے رب کے حکم سے، ان کے اختیار میں ہے جو کچھ ہمارے سامنے ہے، اور جو کچھ ہمارے پیچھے ہے، اور جو کچھ ان کے درمیان ہے، اور آپؐ کے رب بھولنے والے نہیں ـــــ اس آیت کا شانِ نزول یہ ہے کہ ایک مرتبہ حضرت جبرئیل علیہ السلام کئی روز تک تشریف نہ لائے۔ کفار نے کہنا شروع کیا: محمد کو اس کے رب نے چھوڑ دیا! اس سے نبی ﷺ رنجیدہ ہوئے۔ جب جبرئیل آئے تو آپؐ نے فرمایا: ''جتنا آپ آتے ہیں اس سے زیادہ کیوں نہیں آتے!'' اس پر یہ آیت نازل ہوئی (بخاری تفسیر حدیث ۴۷۳۱) اس آیت میں حضرت جبرئیل کی زبان سے جواب دیا گیا کہ ہم مامور بندے ہیں، حکم الٰہی کے بغیر نہیں آسکتے، ہمارا آنا جانا ان کے حکم کے تابع ہے۔ جب ان کی حکمت کا تقاضا ہوتا ہے: ہمیں اترنے کا حکم دیتے ہیں، ہر زمانہ، ہر مکان اور ہر حال کا علم انہی کو ہے، وہی ہر چیز کے مالک ہیں۔ اور ان کا ہر کام برمحل اور بروقت ہوتا ہے۔ پس میرے آنے میں تاخیر سے کوئی یہ خیال نہ کرے کہ اللہ نے اپنے حبیب کو چھوڑ دیا یا اس کو بھول گئے۔ بھول چوک اور نسیان کی ان کی بارگاہ تک رسائی نہیں ـــــ اور یہ آیت جنت کے تذکرہ کے ضمن میں اس لئے رکھی گئی ہے کہ جنت بھی مؤمن بندوں کو ضرور ملنے والی ہے مگر اس کا ایک وقت مقرر ہے، اور اللہ تعالیٰ بندوں کے تمام احوال سے واقف ہیں۔ جب ان کی حکمت کا تقاضا ہوگا: قیامت قائم ہوگی، اور اس کے بعد جنتی جنت میں داخل ہونگے، جنت ملنے میں تاخیر سے مؤمن بندے یہ خیال نہ کریں کہ اللہ تعالیٰ ان کو بھول گئے! ـــــ وہ آسمانوں اور زمین کے اور ان چیزوں کے پروردگار ہیں جو ان کے بیچ میں ہیں ـــــ ایسی ہستی کو اگر بھول پکڑے تو نظام کائنات کیسے چلے؟! ـــــ پس آپ اس کی بندگی کریں اور اس کی بندگی پر جمے رہیں، کیا

آپ کے علم میں ان کا کوئی ہم صفت ہے؟! ـــــ یہ بات مؤمن بندوں سے کہی گئی ہے ان کو جنت ضرور ملنے والی ہے، مگر اس کے لئے محنت درکار ہے، اور وہ محنت اللہ تعالیٰ کی بندگی ہے۔ بندوں کی بندگی کے وہی حقدار ہیں، وہی معبود برحق ہیں، دوسرا کوئی معبود نہیں نہ اس کو بندگی کا استحقاق پہنچتا ہے۔

وَيَقُوْلُ الْاِنْسَانُ ءَاِذَا مَا مِتُّ لَسَوْفَ اُخْرَجُ حَيًّا ﴿۶۶﴾ اَوَلَا يَذْكُرُ الْاِنْسَانُ اَنَّا خَلَقْنٰهُ مِنْ قَبْلُ وَلَمْ يَكُ شَيْئًا ﴿۶۷﴾ فَوَرَبِّكَ لَنَحْشُرَنَّهُمْ وَالشَّيٰطِيْنَ ثُمَّ لَنُحْضِرَنَّهُمْ حَوْلَ جَهَنَّمَ جِثِيًّا ﴿۶۸﴾ ثُمَّ لَنَنْزِعَنَّ مِنْ كُلِّ شِيْعَةٍ اَيُّهُمْ اَشَدُّ عَلَى الرَّحْمٰنِ عِتِيًّا ﴿۶۹﴾ ثُمَّ لَنَحْنُ اَعْلَمُ بِالَّذِيْنَ هُمْ اَوْلٰى بِهَا صِلِيًّا ﴿۷۰﴾ وَاِنْ مِّنْكُمْ اِلَّا وَارِدُهَا ۚ كَانَ عَلٰى رَبِّكَ حَتْمًا مَّقْضِيًّا ﴿۷۱﴾ ثُمَّ نُنَجِّي الَّذِيْنَ اتَّقَوْا وَّنَذَرُ الظّٰلِمِيْنَ فِيْهَا جِثِيًّا ﴿۷۲﴾

وَيَقُوْلُ	اور کہتا ہے	الْاِنْسَانُ	انسان	ثُمَّ	پھر
الْاِنْسَانُ	انسان	اَنَّا	کہ ہم نے	لَنُحْضِرَنَّهُمْ	ہم انکو ضرور حاضر کریں گے
ءَاِذَا مَا (۱)	کیا جب	خَلَقْنٰهُ	اس کو پیدا کیا	حَوْلَ	گرد
مِتُّ	میں مرجاؤنگا	مِنْ قَبْلُ	قبل ازیں	جَهَنَّمَ	جہنم (کے)
لَسَوْفَ (۲)	تو عنقریب	وَلَمْ يَكُ	اور وہ نہیں تھا	جِثِيًّا (۴)	گھٹنوں کے بل پڑے ہوئے
اُخْرَجُ	میں نکالا جاؤں گا	شَيْئًا	کوئی چیز	ثُمَّ	پھر
حَيًّا	زندہ کرکے	فَوَرَبِّكَ	پس تیرے رب کی قسم!	لَنَنْزِعَنَّ	ہم ضرور علحدہ کریں گے
اَوَلَا	کیا اور نہیں	لَنَحْشُرَنَّهُمْ	ہم انکو ضرور جمع کریں گے	مِنْ كُلِّ شِيْعَةٍ	ہر گروہ سے
يَذْكُرُ	یاد کرتا	وَالشَّيٰطِيْنَ (۳)	شیطان کے ساتھ	اَيُّهُمْ (۵)	اس کو جوان میں

(۱) ء إذا ما: ہمزہ استفہام انکاری۔ إذا: ظرفیہ یا شرطیہ۔ ما: زائدہ برائے تاکید۔ (۲) لسوف: جزاء پر لام زائد ہے۔ (۳) والشیاطین: مفعول معہ ہے، اور ضمیر منصوب هُمْ پر عطف بھی ہوسکتا ہے۔ (۴) جِثِيّ: جمع جَاثِيَة کی: گھٹنوں کے بل بیٹھا ہوا۔ اس کی اصل جُثُوْوٌ ہے۔ دوضموں کے بعد دوواووں کا اجتماع ثقیل تھا، اس لئے ث کو کسرہ دیا، تو پہلا واو ی ہوگیا، پھر دوسرے واو کو بھی ی کردیا، کیونکہ واو اور ی جمع ہوئے اور پہلا ساکن ہے، اس لئے واو کو ی سے بدل دیا، اور ادغام کیا، اور جیم کو بھی کسرہ دیدیا ـــــ جثیا: دونوں جگہ حال ہے۔ (۵) أيّ: اسم موصول بمعنی الذی، ضمہ پر مبنی ہے اور محلًا منصوب ہے، کیونکہ یہ لننزعن کا مفعول ←

أَشَدُّ	زیادہ ہے	بِهَا	جہنم کا	مَّقْضِيًّا	طے شدہ
عَلَى الرَّحْمٰنِ	مہربان اللہ کے سامنے	صِلِيًّا (۲)	داخل ہونے کے اعتبار سے	ثُمَّ	پھر
عِتِيًّا (۱)	سرکشی کے اعتبار سے	وَإِنْ (۳)	اور نہیں	نُنَجِّي	ہم نجات دیں گے
ثُمَّ	پھر	مِّنْكُمْ	تم میں سے کوئی	الَّذِيْنَ	ان کو جو
لَنَحْنُ	البتہ ہم	إِلَّا	مگر	اتَّقَوْا	ڈرتے ہیں
أَعْلَمُ	خوب جانتے ہیں	وَارِدُهَا	اس پر پہنچنے والا ہے	وَّنَذَرُ	اور چھوڑ دیں گے ہم
بِالَّذِيْنَ	ان کو جو	كَانَ	ہے (وہ)	الظّٰلِمِيْنَ	ظالموں کو
هُمْ	وہ	عَلٰى رَبِّكَ	تیرے رب پر	فِيْهَا	اس میں
أَوْلٰى	زیادہ حقدار ہے	حَتْمًا	لازم	جِثِيًّا	گھٹنوں کے بل پڑے ہوئے

منکرین آخرت کا استعجاب: ـــــ اور انسان کہتا ہے: کیا جب میں مرجاؤں گا، تو پھر زندہ کر کے نکالا جاؤں گا؟! ـــــ جب گذشتہ آیات میں آخرت اور جنت وجہنم کا ذکر آیا تو منکرین آخرت انکار وتعجب سے کہنے لگے: کیا جب ہم مرجائیں گے، گل سڑ کر ریزہ ریزہ ہوجائیں گے، اور مٹی میں مل کر مٹی ہوجائیں گے، تو ہم دوبارہ قبروں سے زندہ کر کے نکالے جائیں گے؟ یعنی یہ بات ناقابل فہم ہے! ـــــ یہ بات مشرکین کے سرغنوں نے کہی تھی: جیسے عاص بن وائل، ولید بن مغیرہ، ابوجہل اور امیہ بن خلف لعنہم اللہ! ـــــ بلکہ یہ آخری شخص تو قبرستان سے ایک بوسیدہ ہڈی لایا، اور اس کو چورا کر کے فضا میں اڑادیا، اور کہنے لگا: محمد کا یہ خیال ہے کہ جب ہماری یہ حالت ہوجائے گی ہمیں دوبارہ زندہ کیا جائے گا! یہ ہرگز ممکن نہیں!

جواب: ـــــ کیا انسان کو یہ بات یاد نہیں کہ ہم نے اس کو اس سے پہلے پیدا کیا ہے، جبکہ وہ کوئی چیز نہیں تھا! ـــــ یعنی یہ منکرین اپنی تخلیق پر غور کیوں نہیں کرتے؟! وہ پہلے معدوم محض تھے، اللہ تعالیٰ نے ان کو وجود بخشا، پردۂ عدم سے نکال کر وجود کے اسٹیج پر جلوہ گر کیا، کیا ایسی قادر ہستی موت کے بعد ان کو دوبارہ پیدا نہیں کر سکتی؟ ضرور کر سکتی ہے!

← ہے۔ أشد: ھو محذوف کی خبر ہے، اور جملہ صلہ ہے۔

(۱) عتیا: مصدر تمیز محول عن المبتدا ہے۔ عَتَا يَعْتُو عُتُوًّا: سرکشی کرنا، اکڑنا۔ عِتِيّ کی اصل عُتُوْوٌ ہے، اور اس میں جِثِيّ کی طرف تعلیل ہوئی ہے۔ (۲) صِلِيًّا: صَلِيَ يَصْلٰى کا مصدر، یا صَالٍ کی جمع ہے، جس کے معنی ہیں آگ میں داخل ہونا۔ اور یہ تمیز ہے، نسبت کا ابہام دور کرتی ہے۔ (۳) إن: نافیہ ہے۔

منکرین آخرت کا انجام: ــــــ پس تیرے رب کی قسم! ہم ضرور ان کو شیاطین کے ساتھ جمع کریں گے ــــــ یعنی جن شیاطین الانس والجن نے ان کو گمراہ کیا ہے: ان کو بھی ساتھ ہی لایا جائے گا ــــــ پھر ہم ان کو جہنم کے گرد گھٹنوں کے بل حاضر کریں گے ــــــ یعنی اس حال میں وہ جہنم پر لائے جائیں گے کہ ان میں کھڑے ہونے کی طاقت نہ ہوگی۔ اور مارے دہشت کے گھٹنوں پر گرے ہوئے ہونگے ــــــ پھر ہم ہر گروہ میں سے اس کو ضرور علحدہ کریں گے جو مہربان اللہ کے مقابلہ میں زیادہ سرکش تھا ــــــ یعنی جس نے اپنے ساتھ دوسروں کو بھی گمراہ کیا تھا، اس کو عام مجرموں سے علحدہ کرلیا جائے گا، اور اس کو پہلے جہنم میں جھونکا جائے گا ــــــ پھر ہم اس کو خوب جانتے ہیں جو جہنم میں جانے کا سب سے زیادہ حقدار ہے ــــــ اسی کو پہلے جہنم رسید کیا جائے گا۔

دوزخ پر گزر: ــــــ اور تم میں سے کوئی نہیں، مگر وہ جہنم پر پہنچنے والا ہے۔ یہ بات آپ کے پروردگار پر لازم ومقرر ہے۔ پھر ہم ان لوگوں کو نجات دیں گے جو اللہ سے ڈرتے تھے، اور ظالموں کو جہنم میں گھٹنوں کے بل چھوڑ دیں گے ــــــ یعنی اللہ تعالیٰ نے یہ بات طے کردی ہے کہ ہر انسان کو جہنم پر ضرور پہنچنا ہے۔ کیونکہ جنت میں جانے کا راستہ دوزخ کے اوپر سے ہے۔ پل صراط جہنم کی پشت پر بچھایا جائے گا، جس سے سب کو گذرنا ہوگا۔ پھر اللہ تعالیٰ متقیوں کو وہاں سے صحیح سلامت گزار دیں گے، اور کفار کو ہمیشہ کے لئے جہنم کا ایندھن بنادیں گے۔

اس آیت میں متقیوں کا یہ حال بیان کیا گیا ہے کہ اللہ تعالیٰ ان کو جہنم سے صحیح سلامت گزار دیں گے، ان کو کچھ گزند نہ پہنچے گا۔ اور گنہ گار مؤمنوں کا حال حدیث شریف میں بیان کیا گیا ہے۔ شفاعت کی متفق علیہ روایت میں ہے: ''پھر جہنم (کی پشت) پر پل صراط رکھا جائے گا جس سے کچھ مؤمن پلک جھپکتے گزر جائیں گے، کچھ بجلی کے کودنے کی طرح، کچھ ہوا کی طرح، کچھ پرندے کی طرح، کچھ تیز رفتار گھوڑے کی طرح، کچھ سواری کے اونٹ کی طرح۔ پھر کچھ مؤمن نجات پانے والے ہونگے، جو جہنم سے بالکل ہی محفوظ رہیں گے، اور کچھ زخمی ہوکر خلاصی پائیں گے، اور کچھ پارہ پارہ کرکے آگ میں دھکیلے جائیں گے۔ پھر جب تمام متقی مؤمن آگ سے نجات پاکر جنت میں پہنچ جائیں گے تو وہ اپنے ان بھائیوں کے لئے سفارش کریں گے جو جہنم میں رہ گئے ہیں۔ نیز انبیاء اور ملائکہ بھی شفاعت کریں گے، اور آخر میں ارحم الراحمین اپنے کرم سے سب گنہ گار مؤمنوں کو جہنم سے رہائی عطا فرمائیں گے (اور جہنم میں صرف کافر رہ جائیں گے، پھر جہنم کا منہ بند کردیا جائے گا) (مشکوۃ حدیث ۵۵۷۹ باب الحوض والشفاعة)

اور سب کو جہنم سے گزارنے کی حکمت قرآن وحدیث میں صراحۃً بیان نہیں کی گئی، نہ کوئی اشارہ آیا ہے۔ پس اس کا راز اللہ تعالیٰ بہتر جانتے ہیں۔ ویسے امام رازیؒ نے تفسیر کبیر میں اس کی چند حکمتیں بیان کی ہیں، خواہش منداس کو دیکھیں۔

وَاِذَا تُتْلٰى عَلَيْهِمْ اٰيٰتُنَا بَيِّنٰتٍ قَالَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا لِلَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا ۙ اَيُّ الْفَرِيْقَيْنِ خَيْرٌ مَّقَامًا وَّاَحْسَنُ نَدِيًّا ﴿۷۳﴾ وَكَمْ اَهْلَكْنَا قَبْلَهُمْ مِّنْ قَرْنٍ هُمْ اَحْسَنُ اَثَاثًا وَّرِءْيًا ﴿۷۴﴾ قُلْ مَنْ كَانَ فِي الضَّلٰلَةِ فَلْيَمْدُدْ لَهُ الرَّحْمٰنُ مَدًّا ۚ حَتّٰٓى اِذَا رَاَوْا مَا يُوْعَدُوْنَ اِمَّا الْعَذَابَ وَاِمَّا السَّاعَةَ ؕ فَسَيَعْلَمُوْنَ مَنْ هُوَ شَرٌّ مَّكَانًا وَّاَضْعَفُ جُنْدًا ﴿۷۵﴾ وَيَزِيْدُ اللّٰهُ الَّذِيْنَ اهْتَدَوْا هُدًى ؕ وَالْبٰقِيٰتُ الصّٰلِحٰتُ خَيْرٌ عِنْدَ رَبِّكَ ثَوَابًا وَّخَيْرٌ مَّرَدًّا ﴿۷۶﴾ اَفَرَءَيْتَ الَّذِيْ كَفَرَ بِاٰيٰتِنَا وَقَالَ لَاُوْتَيَنَّ مَالًا وَّوَلَدًا ﴿۷۷﴾ ؕ اَطَّلَعَ الْغَيْبَ اَمِ اتَّخَذَ عِنْدَ الرَّحْمٰنِ عَهْدًا ﴿۷۸﴾ ۙ كَلَّا ؕ سَنَكْتُبُ مَا يَقُوْلُ وَنَمُدُّ لَهُ مِنَ الْعَذَابِ مَدًّا ﴿۷۹﴾ ۙ وَّنَرِثُهُ مَا يَقُوْلُ وَيَاْتِيْنَا فَرْدًا ﴿۸۰﴾ وَاتَّخَذُوْا مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ اٰلِهَةً لِّيَكُوْنُوْا لَهُمْ عِزًّا ﴿۸۱﴾ ۙ كَلَّا ؕ سَيَكْفُرُوْنَ بِعِبَادَتِهِمْ وَيَكُوْنُوْنَ عَلَيْهِمْ ضِدًّا ﴿۸۲﴾ ع

وَاِذَا	اور جب	اٰمَنُوْٓا	ایمان لائے	قَبْلَهُمْ	ان سے پہلے
تُتْلٰى	پڑھی جاتی ہیں	اَيُّ	کون	مِّنْ قَرْنٍ	زمانے
عَلَيْهِمْ	ان پر	الْفَرِيْقَيْنِ	دو جماعتوں سے	هُمْ	وہ
اٰيٰتُنَا	ہماری آیتیں	خَيْرٌ	بہتر ہے	اَحْسَنُ	اچھے تھے
بَيِّنٰتٍ	واضح	مَّقَامًا	حالت کے اعتبار سے	اَثَاثًا	سامان
قَالَ	کہا	وَّاَحْسَنُ	اور اچھا ہے	وَّرِءْيًا (۳)	اور منظر کے اعتبار سے
الَّذِيْنَ	جنھوں نے	نَدِيًّا (۱)	محفل کے اعتبار سے	قُلْ	کہیں
كَفَرُوْا	انکار کیا	وَكَمْ (۲)	اور بہت سے	مَنْ	جو
لِلَّذِيْنَ	ان سے جو	اَهْلَكْنَا	ہم نے ہلاک کئے	كَانَ	ہے (وہ)

(۱) نَدِیّ: محفل جس میں لوگ جمع ہوکر باتیں یا مشورہ کریں۔ جمع: أَنْدَاء اور أَنْدِيَة۔ فعل: نَدَا يَنْدُوْ نَدْوًا: مجلس میں جمع ہونا۔

(۲) کم: خبریہ برائے تکثیر۔ یہ أهلكنا کا مفعول بہ ہے، چونکہ صدارتِ کلام کو چاہتا ہے، اس لئے مقدم لایا گیا ہے۔ اور من قرنٍ: کم کے ابہام کا بیان ہے۔ قرن سے مراد اہل زمانہ ہیں۔ اور جملہ هم أحسن: قرنٍ کی صفت ہے۔ (۳) رِءْيًا: نمود و منظر۔ رِؤْية، بروزن فِعْلَةٌ بمعنی مفعول، جیسے طِحْن: پسا ہوا۔

فِي الضَّلٰلَةِ	گمراہی میں	مَّكَانًا (۳)	حالت کے اعتبار سے	بِاٰيٰتِنَا	ہماری آیتوں کا
فَلْيَمْدُدْ (۱)	پس چاہئے کہ دراز کریں	وَّاَضْعَفُ	اور کمزور ہے	وَقَالَ	اور کہا اس نے
لَهُ	اس کے لئے	جُنْدًا	لشکر کے اعتبار سے	لَاُوْتَيَنَّ	ضرور دیا جاؤنگا میں
الرَّحْمٰنُ	مہربان اللہ	وَيَزِيْدُ	اور زیادہ کرتے ہیں	مَالًا	مال
مَدًّا	دراز کرنا	اللّٰهُ	اللہ تعالیٰ	وَّوَلَدًا	اور اولاد
حَتّٰى	یہاں تک کہ	الَّذِيْنَ	ان کی جو	اَطَّلَعَ (۶)	کیا جھانک لیا ہے اس نے
اِذَا	جب	اهْتَدَوْا	راہ یاب ہوئے	الْغَيْبَ	پس پردہ
رَاَوْا	دیکھیں گے وہ	هُدًى (۴)	ہدایت	اَمِ	یا
مَا	اس کو جو	وَالْبٰقِيٰتُ	اور باقی رہنے والے	اتَّخَذَ	بنالیا ہے اس نے
يُوْعَدُوْنَ	وعدہ کئے گئے ہیں وہ	الصّٰلِحٰتُ	نیک اعمال	عِنْدَ الرَّحْمٰنِ	مہربان اللہ کے پاس
اِمَّا (۲)	یا	خَيْرٌ	بہتر (ہیں)	عَهْدًا	کوئی پیمان
الْعَذَابَ	عذاب	عِنْدَ رَبِّكَ	آپ کے رب کے پاس	كَلَّا (۷)	ہرگز نہیں
وَاِمَّا	اور یا	ثَوَابًا	ثواب کے اعتبار سے	سَنَكْتُبُ	اب لکھ لیں گے ہم
السَّاعَةَ	قیامت	وَّخَيْرٌ	اور بہتر (ہیں)	مَا	اس کو جو
فَسَيَعْلَمُوْنَ	پس جلد جان لیں گے	مَّرَدًّا (۵)	انجام کے اعتبار سے	يَقُوْلُ	وہ کہتا ہے
مَنْ	(اس کو) جو	اَفَرَءَيْتَ	کیا پس آپ نے دیکھا	وَنَمُدُّ	اور دراز کریں گے ہم
هُوَ	وہ	الَّذِيْ	اس کو جس نے	لَهُ	اس کے لئے
شَرٌّ	برا (ہے)	كَفَرَ	انکار کیا	مِنَ الْعَذَابِ	عذاب سے

(۱) لِيَمْدُدْ: امر غائب صیغہ واحد مذکر، مصدر: مَدّ: دراز کرنا، یہاں فعل امر بمعنی مضارع ہے، مَدًّا: مفعول مطلق برائے تاکید، ترجمہ: چاہئے کہ اللہ تعالیٰ اس کو ڈھیل دیں خوب ڈھیل دینا۔ (۲) اِمَّا: ما کا بدل ہے۔ (۳) مکان اور مقام کے ایک معنی ہیں یعنی مرتبہ اور حالت (۴) ھدی: مفعول ثانی ہے، اور الذین اھتدوا: موصول صلہ مل کر مفعول اول ہیں۔ (۵) مَرَدّ: مصدر میمی یا اسم فعل: انجام، عاقبت۔ از رَدٌّ: لوٹانا (۶) أَطَّلَعَ: میں ہمزہ: استفہام کا ہے، اس لئے مفتوح ہے، اور ہمزۂ وصل حذف کیا گیا ہے، دراصل أَاطَّلَعَ تھا، مصدر اطلاع: اوپر سے جھانکنا، مطلع ہونا۔ (۷) كَلَّا: قرآن میں ۳۳ جگہ آیا ہے۔ یہ پہلی جگہ ہے۔ سیبویہ خلیل اور مبرد کے نزدیک: رَدَع یعنی روکنے کے لئے ہے، خواہ بطور زجر وتوبیخ ہو، یا بطور تربیت وادب نوازی۔

مَدًّا	دراز کرنا	وَاتَّخَذُوْا	اور بنائے انھوں نے	كَلَّا	ہر گز نہیں
وَّنَرِثُهٗ	اور وارث ہونگے ہم اسکے	مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ	اللہ کو چھوڑ کر	سَيَكْفُرُوْنَ	اب انکار کریں گے وہ
مَا(۱)	جو	اٰلِهَةً	معبود	بِعِبَادَتِهِمْ	ان کی عبادت کا
يَقُوْلُ	وہ کہتا ہے	لِّيَكُوْنُوْا	تاکہ ہویں وہ	وَيَكُوْنُوْنَ	اور ہونگے وہ
وَيَاْتِيْنَا	اور آئیگا وہ ہمارے پاس	لَهُمْ	ان کے لئے	عَلَيْهِمْ	ان کے
فَرْدًا	تن تنہا	عِزًّا (۲)	باعث عزت	ضِدًّا (۳)	مخالف

کفار کی چند غلط فہمیوں کا ازالہ: ان آیات میں کفار کی تین غلط فہمیوں کا ازالہ کیا گیا ہے:

پہلی غلط فہمی: مکہ کے سرداروں کو یہ غلط فہمی تھی کہ ان کا دنیا کا عیش ان کے برحق ہونے کی دلیل ہے۔ارشاد ہے ــــــ اور جب ان کے سامنے ہماری واضح آیتیں پڑھی جاتی ہیں، تو ان لوگوں نے جنھوں نے انکار کیا: ان لوگوں سے جو ایمان لائے: کہا: ''دو جماعتوں میں سے کون بہتر حالت میں ہے؟ اور کس کی محفل شاندار ہے؟ ــــــ یعنی ہماری حالت تمہاری حالت سے بہتر ہے، ہمارے مکانات عالیشان، ہمارا معیار زندگی بلند، اور ہماری محفلیں شاندار ہیں۔ ہمارا یہ ٹھاٹھ اس بات کی دلیل ہے کہ ہم حق پر ہیں، اور تمہاری پریشانی اور بے کسی صاف بتلا رہی ہے کہ اللہ کے یہاں تمہارا کوئی مقام نہیں ــــــ اللہ تعالیٰ اس غلط فہمی کا ازالہ فرماتے ہیں ــــــ اور ہم نے ان سے پہلے بہت سی قومیں ہلاک کیں، جو ساز وسامان اور منظر ونمود میں ان سے کہیں بہتر تھیں ــــــ پس اگر دنیا کا عیش برحق ہونے کی دلیل ہوتا تو سوچو یہ قومیں کیوں تباہ کی گئیں؟ جب ان قوموں نے انبیاء کے مقابلہ میں سرکشی کی، اور وہ کفر وعناد پر اتر آئے، تو اللہ تعالیٰ نے حرف غلط کی طرح ان کو صفحۂ ہستی سے مٹا دیا، اس سے یہ بات واضح ہے کہ دنیا کا ٹھاٹھ حق پر ہونے کی دلیل نہیں، بلکہ اس میں اور مصلحت ہے۔ اور وہ حکمتِ امہال ہے ــــــ آپ کہیں: ''جو گمراہی میں ہیں، پس چاہئے کہ مہربان اللہ اس کو خوب ڈھیل دیں ــــــ یعنی جو اپنی مرضی سے گمراہی کا راستہ اختیار کرتا ہے: اللہ تعالیٰ اس کو گمراہی میں آخری حد تک جانے دیتے ہیں، اور اس کی دنیا کی مرفّہ حالی اس کی گمراہی میں مددگار بن جاتی ہے ــــــ یہاں تک کہ جب وہ اس چیز کو دیکھ لیں: جس کا ان سے وعدہ کیا گیا ہے، خواہ عذابِ دنیا ہو یا قیامت: تو وہ جلد جان لیں گے کہ بدحال کون ہے؟ اور جتھا کس کا کمزور ہے؟ ــــــ یعنی وہ دن مؤمنین کی خوش حالی اور شان وشوکت کا

(۱) ما: ۂ سے بدل ہے، اور مفعول بہ ہے۔ (۲) عِزًّا: مصدر باب ضرب، اس کے اصل معنی قوت کے ہیں، جس سے اللہ کی صفت عزیز ہے۔ (۳) ضِدّ: مفرد بمعنی جمع ہے۔

دن ہوگا، اور اس دن کفار ذلیل وخوار ہونگے۔

رہی کفار کی مخالفت جس سے مؤمنین دوچار ہیں تو وہ ان کو اونچا اڑاتی ہے۔ ارشاد ہے ـــــــ اور اللہ تعالیٰ ان لوگوں کی ہدایت میں اضافہ کرتے ہیں جنھوں نے راہِ راست پالی ـــــــ یعنی اُن حالات سے مؤمنین کے ایمان میں پختگی پیدا ہوتی ہے ـــــــ اور ہمیشہ باقی رہنے والے اعمالِ صالحہ: آپ کے رب کے نزدیک ثواب کے اعتبار سے بہتر ہیں، اور ان کا انجام اچھا ہے! ـــــــ یعنی ان کا آخرت میں جو ثواب ملے گا: وہ اعمال سے بدرجہا بہتر ہوگا۔ اور مؤمنین کا اخروی انجام: کفار کے دنیا کے عیش سے کہیں بہتر ہوگا۔ پس مؤمنین حالات سے نہ گھبرائیں۔ یہ عارضی پریشانی ہے، جو چند روز میں ختم ہوجائے گی۔

دوسری غلط فہمی: مکہ کا ہر متکبر مالدار اس غلط فہمی میں مبتلا تھا کہ ہم آخرت میں بھی ـــ اگر وہ آئی ـــ خوش عیش ہونگے۔ ارشاد ہے ـــــــ کیا پس آپ نے اس شخص کو دیکھا: جس نے ہماری آیتوں کا انکار کیا، اور اس نے کہا: ''میں ضرور مال اور اولاد دیا جاؤنگا ـــــــ ان آیات کا شانِ نزول یہ ہے کہ حضرت خباب بن الارت رضی اللہ عنہ کا کچھ قرض عاص بن وائل پر نکلتا تھا، آپ نے مطالبہ کیا۔ اس نے کہا: اگر تو محمد (ﷺ) کا انکار کرے تو میں تیرا قرضہ ادا کروں۔ حضرت خبابؓ نے جواب دیا: اگر تو مر کر زندہ ہوتب بھی میں یہ کام نہیں کرسکتا! اس نے کہا: کیا میں مر کر پھر زندہ ہونگا؟ اگر ایسا ہوگا تو اس وقت بھی میرے پاس مال اور اولاد ہوگی، تیرا قرض اسی وقت چکاؤنگا! (بخاری حدیث ۴۷۳۵) اور یہ کسی ایک شخص کا خیال نہیں تھا، ہر خوش عیش متکبر اسی خبط میں مبتلا تھا ـــــــ اللہ تعالیٰ ان کی غلط فہمی کا ازالہ فرماتے ہیں ـــــــ کیا اس نے عالم غیب کو جھانک لیا ہے یا اس نے مہربان اللہ سے کوئی عہد و پیمان لے لیا ہے؟ ـــــــ یہی دو صورتیں ہیں جن میں یقین سے ایسا دعوی کیا جاسکتا ہے ـــــــ ہرگز نہیں! ـــــــ یعنی نہ تو اسے پس پردہ کی کچھ خبر ہے، نہ اس سے اللہ نے کوئی وعدہ کیا ہے، پھر وہ ایسی بات کیوں کہتا ہے؟ ـــــــ اب ہم اُس بات کو لکھ لیتے ہیں جو وہ کہتا ہے، اور ہم اس کے لئے عذاب کو خوب دراز کرتے ہیں ـــــــ یعنی اس کا یہ کلمۂ غرور بھی اس کے جرائم کے ریکارڈ میں شامل کرلیا جائے گا، اور اس کی اس کو خوب سزا دی جائے گی۔ اور جس مال اور اولاد پر وہ اِترا رہا ہے: وہ اس کے پاس چند روز کے لئے ہے، بالآخر وہ اس کے ہاتھ سے چھوٹ جانے والا ہے۔ ارشاد ہے ـــــــ اور ہم اس کے وارث ہونگے جو وہ کہتا ہے، اور وہ ہمارے پاس تن تنہا آئے گا ـــــــ نہ مال واسباب ساتھ آئے گا، نہ آل اولاد کچھ کام آئے گی، سب سے تہی دست ہوکر موت کے بعد ہماری بارگاہ میں حاضر ہوگا، پھر اس عارضی نعمت پر اترانے کا کیا حاصل!

تیسری غلط فہمی: مشرکین کو یہ بھی غلط فہمی تھی کہ ہمارے معبود آخرت میں ـــ اگر وہ آئی ـــ ہمارے کام آئیں گے۔

وہ آڑے وقت میں ہماری مدد کریں گے۔ ارشاد ہے ـــــ اور انھوں نے اللہ کو چھوڑ کر معبود بنائے ہیں، تاکہ وہ ان کے لئے مددگار بنیں ـــــ یعنی آخرت میں ان کے کام آئیں ـــــ ہرگز نہیں! ـــــ یہ ان کی نری غلط فہمی ہے ـــــ عنقریب وہ معبود ان کی عبادت کا انکار کریں گے ـــــ کہیں گے: نہ تم نے ہماری عبادت کی، نہ ہمیں تمہاری عبادت کی کچھ خبر تھی (سورۃ یونس آیات ۲۸و۲۹) ـــــ اور وہ ان کے مخالف بن جائیں گے ـــــ اور خود مطالبہ کریں گے کہ ان کے پجاریوں کو سخت سزا دی جائے۔

اَلَمْ تَرَ اَنَّآ اَرْسَلْنَا الشَّيٰطِيْنَ عَلَى الْكٰفِرِيْنَ تَؤُزُّهُمْ اَزًّا ﴿۸۳﴾ فَلَا تَعْجَلْ عَلَيْهِمْ ۭ اِنَّمَا نَعُدُّ لَهُمْ عَدًّا ﴿۸۴﴾ يَوْمَ نَحْشُرُ الْمُتَّقِيْنَ اِلَى الرَّحْمٰنِ وَفْدًا ﴿۸۵﴾ وَّنَسُوْقُ الْمُجْرِمِيْنَ اِلٰى جَهَنَّمَ وِرْدًا ﴿۸۶﴾ لَا يَمْلِكُوْنَ الشَّفَاعَةَ اِلَّا مَنِ اتَّخَذَ عِنْدَ الرَّحْمٰنِ عَهْدًا ﴿۸۷﴾

اَلَمْ تَرَ	کیا آپ نے دیکھا نہیں	اِنَّمَا	صرف	الْمُجْرِمِيْنَ	مجرموں کو
اَنَّآ	کہ ہم نے	نَعُدُّ	شمار کر رہے ہیں ہم	اِلٰى جَهَنَّمَ	دوزخ کی طرف
اَرْسَلْنَا	چھوڑ رکھا ہے	لَهُمْ	ان کے لئے	وِرْدًا (۳)	پیاسے
الشَّيٰطِيْنَ	شیاطین کو	عَدًّا	شمار کرنا	لَا يَمْلِكُوْنَ	نہیں مالک ہونگے وہ
عَلَى الْكٰفِرِيْنَ	کافروں پر	يَوْمَ نَحْشُرُ	جس دن جمع کریں گے ہم	الشَّفَاعَةَ	سفارش کے
تَؤُزُّهُمْ (۱)	ورغلاتے ہیں ان کو	الْمُتَّقِيْنَ	پرہیزگاروں کو	اِلَّا مَنِ	مگر جس نے
اَزًّا	خوب ورغلانا	اِلَى الرَّحْمٰنِ	مہربان اللہ کی طرف	اتَّخَذَ	بنایا
فَلَا تَعْجَلْ	پس نہ جلدی کریں آپ	وَفْدًا (۲)	وفود کی شکل میں	عِنْدَ الرَّحْمٰنِ	مہربان اللہ کے پاس
عَلَيْهِمْ	ان کے لئے	وَّنَسُوْقُ	اور ہانکیں گے ہم	عَهْدًا	پیمان

مؤمنین کو تسلی: ان آیات میں مؤمنین کو تسلی دی گئی ہے۔ اس مقام میں مؤمنین کے دل میں یہ خیال پیدا ہوسکتا ہے

(۱) أَزَّ يَؤُزُّ أَزًّا: فلانًا: ورغلانا، بھڑکانا، اکسانا۔ جملہ تؤزھم: شیاطین سے حال یا مستانفہ ہے۔ اور أَزًّا: مفعول مطلق برائے تاکید ہے۔ (۲) وَفْد: وافِد کی جمع ہے: صاحب اقتدار کے پاس کسی مقصد کے لئے جانے والا آدمی۔ ایسا شخص قوم کا نمائندہ اور معزز آدمی ہوتا ہے، اور حاکم بھی اس کو عزت کی نگاہ سے دیکھتا ہے، یہی اعزاز کا پہلو یہاں مراد ہے۔ چنانچہ مترجمین نے اس کا ترجمہ ''مہمان'' کیا ہے۔ (۳) الوِرْد: پانی پر آنے والی جماعت۔ چونکہ پانی پر پیاسے ہی پہنچتے ہیں، اس لئے ''پیاسے'' ترجمہ کیا گیا ہے۔

کہ کفار آخر سمجھتے کیوں نہیں؟ قرآنِ کریم کھلے کھلے دلائل پیش کررہا ہے، مگر کافر ایک نہیں سنتے۔ آخر وجہ کیا ہے۔ ارشاد ہے ـــــ کیا آپ نے دیکھا نہیں کہ ہم نے شیاطین کو کفار پر چھوڑ رکھا ہے، وہ ان کو ورغلانے میں پورا زور صرف کررہے ہیں ـــــ یعنی قرآنِ کریم کی باتیں اس لئے اثر انداز نہیں ہوتیں کہ شیاطین کفار کو گمراہی میں بڑھاتے ہیں، اور ان کو انگلیوں پر نچاتے ہیں، اور وہ ان کے جال میں ایسے پھنسے ہوئے ہیں کہ کسی طرح نکل نہیں پاتے۔

فائدہ: یہ دنیا آزمائش گاہ ہے۔ اور آدمی میں خیر وشر کی دونوں صلاحیتیں رکھی گئی ہیں۔ اور آدمی سے باہر بھی ہدایت وضلالت کے اسباب مہیا کئے گئے ہیں، اللہ کی کتابیں، نبیوں کی محنتیں اور فرشتوں کے الہامات اسبابِ ہدایت ہیں، اور شیاطین کی جماعت لوگوں کو گمراہ کرنے کے لئے چھوڑی گئی ہے، مگر انسان کو صحیح اور غلط کی تمیز بھی دی گئی ہے۔ چنانچہ بہت سے لوگ اسبابِ ہدایت سے متاثر ہوتے ہیں، اور ایمان لے آتے ہیں۔ اور بہت سوں کو شیاطین اعمالِ بد پر ابھارتے ہیں، ان کی خوبیاں ان کے دلوں میں بٹھاتے ہیں، اور خرابیوں کی طرف نظر نہیں جانے دیتے، چنانچہ وہ گمراہ ہوجاتے ہیں۔ وہ گوشِ حق نیوش سے قرآن کی بات سنتے ہی نہیں، پھر وہ اثر انداز کیسے ہو؟!

اس مقام میں دوسرا خیال مؤمنوں کے دلوں میں یہ پیدا ہوسکتا ہے کہ جب کفار کے لئے راہِ ہدایت مقدر نہیں تو ان کو برداشت کیوں کیا جارہا ہے؟ عذاب بھیج کر ان کا قصہ نمٹا کیوں نہیں دیا جاتا؟ ارشاد ہے ـــــ پس آپ ان کے لئے بیتاب نہ ہوں، ہم ان کی ایک ایک بات شمار کررہے ہیں ـــــ اور وقت کا انتظار کررہے ہیں۔ پس مسلمان صبر سے کام لیں، ان کے عذاب کے لئے جلدی نہ مچائیں، نہ ان کی تضحیک وتخویف سے دل گیر ہوں۔

اور ان کے عذاب کا مقررہ وقت: قیامت کا دن ہے ـــــ جس دن ہم متقیوں کو مہربان اللہ کی طرف وفود کی صورت میں جمع کریں گے ـــــ یعنی پورے اعزاز کے ساتھ ان کو جنت میں پہنچائیں گے ـــــ اور ہم مجرموں کو دوزخ کی طرف پیاسے ہانک کرلے جائیں گے ـــــ جس طرح پیاسے جانور ہانک کر گھاٹ پر لے جائے جاتے ہیں: مجرموں کو بھی دوزخ کی گھاٹ اتار دیا جائے گا ـــــ وہ سفارش کے مالک نہیں ہونگے ـــــ یعنی کوئی ان کے لئے سفارش کرنے والا نہیں ہوگا۔ وہ ہمیشہ جہنم میں سڑتے رہیں گے ـــــ مگر جس نے مہربان اللہ سے عہد وپیمان لیا ہے ـــــ وہ سفارش کا مالک ہوگا یعنی اس کے لئے سفارش کرنے والے ہونگے۔ یہ گنہ گار مؤمنین ہیں۔ ان کے لئے جنتی، ملائکہ اور انبیاء سفارش کریں گے۔ اور آخر میں ارحم الراحمین اپنے فضل وکرم سے ہر مؤمن کو جہنم سے رستگاری عطا فرمائیں گے۔ ان کا ایمان ایک عہد وپیمان ہے جو آخرت میں کام آئے گا۔

وَقَالُوا اتَّخَذَ الرَّحْمٰنُ وَلَدًا ﴿۸۸﴾ لَقَدْ جِئْتُمْ شَيْئًا إِدًّا ﴿۸۹﴾ تَكَادُ السَّمٰوٰتُ يَتَفَطَّرْنَ مِنْهُ

وَتَنْشَقُّ الْاَرْضُ وَتَخِرُّ الْجِبَالُ هَدًّا ﴿٩٠﴾ اَنْ دَعَوْا لِلرَّحْمٰنِ وَلَدًا ﴿٩١﴾ وَمَا يَنْۢبَغِيْ لِلرَّحْمٰنِ اَنْ يَّتَّخِذَ وَلَدًا ﴿٩٢﴾ اِنْ كُلُّ مَنْ فِي السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ اِلَّآ اٰتِي الرَّحْمٰنِ عَبْدًا ﴿٩٣﴾ لَقَدْ اَحْصٰىهُمْ وَعَدَّهُمْ عَدًّا ﴿٩٤﴾ وَكُلُّهُمْ اٰتِيْهِ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ فَرْدًا ﴿٩٥﴾

وَقَالُوا	اور کہا انھوں نے	الْجِبَالُ	پہاڑ	فِي السَّمٰوٰتِ	آسمانوں میں
اتَّخَذَ	اپنائی	هَدًّا (۵)	ٹوٹ کر	وَالْاَرْضِ	اور زمین (میں ہے)
الرَّحْمٰنُ	رحمٰن نے	اَنْ (۶)	(اس وجہ سے) کہ	اِلَّآ	مگر
وَلَدًا	اولاد	دَعَوْا	منسوب کی انھوں نے	اٰتِي	آنے والا ہے وہ
لَقَدْ	البتہ تحقیق	لِلرَّحْمٰنِ	رحمٰن کی طرف	الرَّحْمٰنِ	رحمٰن کے پاس
جِئْتُمْ	لائے تم	وَلَدًا	اولاد	عَبْدًا	غلام بن کر
شَيْئًا	چیز	وَمَا	اور نہیں	لَقَدْ	البتہ تحقیق
اِدًّا (۱)	سنگین	يَنْۢبَغِيْ	مناسب ہے	اَحْصٰىهُمْ	گھیر رکھا ہے ان کو
تَكَادُ	قریب ہیں	لِلرَّحْمٰنِ	رحمٰن کے لئے	وَعَدَّهُمْ	اور گن رکھا ہے ان کو
السَّمٰوٰتُ	آسمان	اَنْ	کہ	عَدًّا	گننا
يَتَفَطَّرْنَ (۲)	پھٹ پڑیں	يَّتَّخِذَ	اپنائیں وہ	وَكُلُّهُمْ	اور وہ سب
مِنْهُ	اس چیز سے	وَلَدًا	اولاد	اٰتِيْهِ	آنے والے ہیں ان
وَتَنْشَقُّ (۳)	اور شگاف پڑ جائے	اِنْ (۷)	نہیں		کے پاس
الْاَرْضُ	زمین میں	كُلُّ	ہر ایک	يَوْمَ الْقِيٰمَةِ	قیامت کے دن
وَتَخِرُّ (۴)	اور گر پڑیں	مَنْ	جو	فَرْدًا	تنہا

اللہ کی کوئی اولاد نہیں: اوپر اُن مشرکین کی تردید کی گئی ہے جو اللہ کے علاوہ معبود تجویز کرتے ہیں۔ کچھ لوگ اللہ

(۱) **الإدّ:** سنگین معاملہ، انتہائی برا کام۔ جمع **إدَادٌ**؛ **أَدَّ الْأَمْرُ فلانا أَدًّا:** معاملہ سنگین ہونا، مشکل میں مبتلا کر دینا۔ (۲) **تَفَطَّر:** پھٹنا، پارہ پارہ ہونا، دراڑیں پڑنا، جیسے **تفطَّرتْ قدمُه:** پیر پھٹ گئے۔ (۳) **انْشَقَّ:** شگاف پڑنا، پھٹنا، کریک ہونا۔ (۴) **خَرَّ البناءُ خَرًّا وخُرُوْرًا:** عمارت کا آواز کے ساتھ اوپر سے نیچے گرنا، ڈھہ پڑنا۔ (۵) **هَدَّ الحائطُ هَدًّا:** دیوار کا گرنا، یہ **تخر** کا مفعول مطلق ہے۔ (۶) **أن:** سے پہلے لام تعلیلیہ محذوف ہے۔ (۷) **إن:** نافیہ ہے، اور **إلَّا:** اثبات ہے، نفی اثبات سے حصر پیدا ہوا ہے۔

کے لئے اولاد تجویز کرتے ہیں، اور ان کو معبود کا درجہ دیتے ہیں۔ جیسے نصاریٰ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو اللہ کا بیٹا، اور تین خداؤں میں سے ایک خدا مانتے ہیں، اور مشرکینِ عرب فرشتوں کو اللہ کی بیٹیاں اور معبود قرار دیتے تھے۔ اب شرک کی اس خاص نوعیت کی تردید کی جارہی ہے۔ فرماتے ہیں ـــــ اور انھوں نے کہا: مہربان اللہ نے اولاد اپنائی! ـــــ عیسائی کہتے ہیں: اللہ نے خاص مصلحت سے عیسیٰ علیہ السلام کو بیٹا بنایا ہے۔ اور وہ مصلحت کفّارہ ہے۔ یعنی اللہ کا یہ بیٹا سولی پر چڑھ کر اور موت کا مزہ چکھ کر اپنے ماننے والوں کے گناہوں کا کفارہ بن گیا۔ اور مشرکین کا یہ گمان تھا کہ دنیا کا اتنا بڑا کارخانہ تنہا اللہ تعالیٰ کیسے چلا سکتے ہیں؟ انھوں نے فرشتوں کو بیٹیاں بنایا ہے، اور ان کو اختیارات تفویض کئے ہیں، ان کی معاونت سے اللہ تعالیٰ نظام عالم چلارہے ہیں، غرض یہ دونوں جماعتیں قائل ہیں کہ ہماری طرح اللہ کی بھی اولاد ہے۔ اس کی تردید کی جارہی ہے ـــــ بخدا! واقعہ یہ ہے کہ تم نے ایک سنگین بات گھڑلی ہے ـــــ یعنی ان فرقوں نے نہایت بیہودہ اور نازیبا بات اللہ کی طرف منسوب کی ہے ـــــ قریب ہیں آسمان کہ پھٹ پڑیں، اور زمین کریک ہوجائے، اور پہاڑ ڈھہ پڑیں: اس وجہ سے کہ انھوں نے مہربان اللہ کی طرف اولاد منسوب کی ـــــ یعنی یہ اتنی بھاری اور سنگین بات ہے کہ اگر اس کی وجہ سے آسمان وزمین تباہ ہوجائیں تو کچھ بعید نہیں۔ کیونکہ اولاد کی احتیاج کمزور کو ہوتی ہے، اور اللہ میں کسی طرح کی کمزوری ماننا ان پر کتنا بڑا اہتا لگانا ہے۔ ارشاد ہے ـــــ اور مہربان اللہ کے شایانِ شان نہیں کہ وہ اولاد بنائیں ـــــ وہ قادر مطلق ہستی ہیں، وہ ہر عیب سے پاک ہیں ـــــ آسمان اور زمین میں جو بھی ہے وہ مہربان اللہ کے پاس غلام بن کر حاضر ہونے والا ہے ـــــ یعنی ساری کائنات اللہ کی مخلوق ہے، سب غلام بن کر ان کے سامنے حاضر ہونگے، اگر ان کی کوئی اولاد ہوتی تو وہ غلام بن کر کیسے حاضر ہوتی، عبدیت اور ولدیت میں منافات ہے، بیٹا غلام نہیں ہوسکتا۔ یہ عیسائیوں پر رد ہے۔ آگے مشرکین کی تردید ہے ـــــ انھوں نے یقیناً سب کا احاطہ کررکھا ہے، اور ایک ایک کو گن رکھا ہے ـــــ پس ایسی قادر اور علیم وخبیر ہستی کو معاونین کی کیا ضرورت ہے! ـــــ آخر میں مشرکین کو مایوس کیا جارہا ہے کہ اگر تم نے اپنے معبودوں سے آس لگا رکھی ہے کہ وہ آخرت میں تمہارے کام آئیں گے، تو سنو: ـــــ اور وہ سب قیامت کے دن اللہ کے پاس تنہا حاضر ہونگے ـــــ ان کا کوئی معبود ان کے ساتھ نہیں ہوگا، جو ان کی مدد کرے، اس دن ساز وسامان، تعلقات، فرضی معبود اور بیٹے پوتے کچھ کام نہ آئیں گے۔ رحمان کی مہربانی ہی سے بیڑا پار ہوگا!

إِنَّ الَّذِينَ آمَنُوا وَعَمِلُوا الصَّالِحَاتِ سَيَجْعَلُ لَهُمُ الرَّحْمَٰنُ وُدًّا ﴿٩٦﴾ فَإِنَّمَا يَسَّرْنَاهُ بِلِسَانِكَ لِتُبَشِّرَ بِهِ الْمُتَّقِينَ وَتُنذِرَ بِهِ قَوْمًا لُّدًّا ﴿٩٧﴾ وَكَمْ أَهْلَكْنَا قَبْلَهُم مِّن قَرْنٍ هَلْ

تُحِسُّ مِنْهُمْ مِّنْ اَحَدٍ اَوْ تَسْمَعُ لَهُمْ رِكْزًا ﴿۹۸﴾

اِنَّ	بیشک	يَسَّرْنٰهُ	آسان کیا ہم نے اس کو	اَهْلَكْنَا	ہلاک کئے ہم نے
الَّذِيْنَ	جو لوگ	بِلِسَانِكَ	آپ کی زبان میں	قَبْلَهُمْ	ان سے پہلے
اٰمَنُوْا	ایمان لائے	لِتُبَشِّرَ	تا کہ خوشخبری دیں آپ	مِّنْ قَرْنٍ [۳]	زمانے
وَعَمِلُوا	اور کئے انھوں نے	بِهِ	اس کے ذریعہ	هَلْ	کیا
الصّٰلِحٰتِ	نیک کام	الْمُتَّقِيْنَ	متقیوں کو	تُحِسُّ [۴]	محسوس کرتے ہیں آپ
سَيَجْعَلُ	اب بنائیں گے	وَتُنْذِرَ	اور ڈرائیں آپ	مِنْهُمْ	ان میں سے
لَهُمُ	ان کے لئے	بِهٖ	اس کے ذریعہ	مِّنْ اَحَدٍ	کسی کو بھی
الرَّحْمٰنُ	مہربان اللہ	قَوْمًا	لوگوں کو	اَوْ تَسْمَعُ	یا سنتے ہیں آپ
وُدًّا [۱]	محبت	لُّدًّا [۲]	جھگڑالو	لَهُمْ	ان کی
فَاِنَّمَا	پس صرف	وَكَمْ	اور بہت سے	رِكْزًا [۵]	کوئی آہٹ؟

اب آخر میں دو باتیں بیان کر کے سورت ختم کی جارہی ہے:

پہلی بات: مؤمنین کو ایک خاص معاملہ میں تسلی دی جاتی ہے۔اس کی تفصیل یہ ہے کہ اسلام سے پہلے عرب قبائلی زندگی گزارتے تھے، وہ خاندان کی بنیاد پر ایک دوسرے کی مدد کرنے کے خوگر تھے، اور قبائل میں باہم نفرت وعداوت تھی، ہر قبیلہ دوسرے قبیلہ کے خون کا پیاسا تھا، پھر جب اسلام کا آغاز ہوا تو کوئی ایک پورا قبیلہ مسلمان نہیں ہوا تھا، مختلف قبائل کے لوگوں نے اسلام قبول کیا تھا، اور اسلام قبول کرنے کے بعد ان کا اپنے قبائل سے تعلق ختم ہو گیا تھا، اور مسلمان بے یار و مددگار رہ گئے تھے۔ پہلی آیت میں ان کو بشارت سنائی گئی ہے کہ یہ عارضی حالت ہے، جلد اللہ تعالیٰ اسلامی برادری وجود میں لانے والے ہیں، جس میں مودت ومحبت کی روح کارفرما ہوگی، پھر کوئی مسلمان بے یار ومددگار نہیں رہے گا۔ ارشاد ہے ——— **یقیناً جو لوگ ایمان لائے، اور انھوں نے نیک کام کئے: جلد مہربان اللہ ان کے لئے محبت گردانیں گے** ——— جس سے وہ بھائی بھائی ہوجائیں گے، اور قبائل کی طرح ایک دوسرے کے

(۱) الودّ: (واو پر تینوں حرکتیں) تعلق، دوستی، یہ مفعول ثانی ہے۔ (۲) لُدّ: أَلَدّ کی جمع: سخت جھگڑالو (۳) من: کم خبریہ کے ابہام کا بیان ہے۔ اور قرن سے اہل قرن مراد ہیں۔ (۴) أَحَسَّ إِحْسَاسًا: محسوس کرنا، حواس سے جاننا۔ هل: استفہام انکاری ہے، نفی کے معنی کو متضمن ہے، من أحد میں من: نفی کی تاکید کے لئے ہے۔ (۵) الرِكز: کھٹک، پیروں کی آہٹ، ہلکی آواز، جمع رُکوز۔

معاون بن جائیں گے ـــــــ اللہ کا یہ وعدہ جلد پورا ہوا، اور مسلمان ایک دوسرے پر جان چھڑکنے لگے، اور ہجرت کے بعد تو یہ دینی رشتہ خونی رشتہ سے قوی تر ہو گیا۔

فائدہ: آیت کا یہ مطلب: عبارۃ النص ہے (۱)، مگر آیت کے الفاظ عام ہیں، **لھم: بینھم** سے عام ہے۔ پس آیت کے عموم میں یہ بات بھی شامل ہے کہ دوسرے لوگوں اور دوسری مخلوقات کے دلوں میں بھی اللہ تعالیٰ مؤمنین صالحین کی محبت پیدا فرمائیں گے۔ متفق علیہ روایت ہے کہ جب اللہ تعالیٰ کسی بندے سے محبت کرتے ہیں تو جبرئیل علیہ السلام سے فرماتے ہیں: ''میں فلاں آدمی سے محبت کرتا ہوں، تم بھی ان سے محبت کرو'' جبرئیل آسمانوں میں اس کی منادی کرتے ہیں، اور سب آسمانوں والے اس سے محبت کرنے لگتے ہیں، پھر یہ محبوبیت زمین میں اتاری جاتی ہے۔ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ﴿إِنَّ الَّذِيْنَ آمَنُوْا وَعَمِلُوْا الصَّالِحَاتِ سَيَجْعَلُ لَهُمُ الرَّحْمٰنُ وُدًّا﴾ میں اسی محبت ومودت کا ذکر ہے۔ (درمنثور ۴: ۲۸۷)

دوسری بات: قرآن پاک نہایت آسان زبان وبیان میں نازل کیا گیا ہے تا کہ ہر شخص اس سے فائدہ اٹھائے۔ ارشاد ہے ـــــــ پس ہم نے قرآن کو آپؐ کی زبان (عربی) میں اس لئے آسان کیا کہ آپؐ اس سے متقیوں کو خوش خبری سنائیں، اور اس سے سخت جھگڑالو قوم (کفار مکہ) کو ڈرائیں ـــــــ یعنی قرآن آسان زبان میں کھول کھول کر پرہیزگاروں کو بشارات سناتا ہے، اور مشرکین مکہ کو نتائج اعمال سے خبردار کرتا ہے ـــــــ قرآن کو دو طرح سے آسان کیا گیا ہے: اول: عربی زبان میں نازل کیا گیا، جو قرآن کے مخاطبین اولین کی مادری زبان ہے۔ سورۂ یوسف میں ہے: ''ہم نے عربی میں قرآن اتارا تا کہ تم سمجھو'' ـــــــ دوم: دین کی بنیادی تعلیمات واضح انداز میں پیش کی گئی ہیں، سورۃ القمر میں ہے: ''ہم نے قرآن کو نصیحت پذیری کے لئے آسان کر دیا ہے، پس کیا ہے کوئی نصیحت حاصل کرنے والا؟!''

اب بھی اگر مکہ کے ضدی جھگڑالو سردار نہ مانیں تو سن لیں: ـــــــ اور ہم نے ان سے پہلے بہت سی قوموں کو ہلاک کیا: کیا آپ ان میں سے کسی کا احساس کرتے ہیں! یا ان کی کچھ آہٹ سنتے ہیں! ـــــــ یعنی پہلے کتنی ہی بد بخت قومیں پاداش کفر میں ہلاک کی جا چکی ہیں، جن کا نام ونشان تک باقی نہیں رہا ممکن ہے تمہیں بھی کوئی تباہ کن عذاب آگھیرے، اور چشم زدن میں تباہ کر دیئے جاؤ۔ پس آج جو سنبھلنے کا موقعہ ہے اس سے فائدہ اٹھالو!

(۱) عبارۃ النص: **مَا سِيْقَ لأجْله الكلام** کا نام ہے یعنی وہ مقصد جس کو لے کر بات کہی گئی ہے عبارۃ النص ہے۔ اور **لھم** سے جو عموم مفہوم ہوتا ہے وہ اشارۃ النص ہے ۱۲

بسم اللہ الرحمن الرحیم

سورۂ طٰہٰ

نمبرشمار ۲۰ نزول کا نمبر ۴۵ نزول کی نوعیت مکی آیات ۱۳۵ رکوع ۸

سورت کا نام اور زمانۂ نزول: اس سورت کا نام پہلی آیت سے ماخوذ ہے۔ طٰہٰ: طا اور ھا کا مجموعہ ہے، جو حروفِ ہجاء ہیں۔ان کی حقیقی مراد اللہ تعالیٰ ہی بہتر جانتے ہیں۔کچھ لوگ طٰہٰ کو رسول اللہ ﷺ کا نام بتاتے ہیں، اسی طرح یٰسٓ کو بھی آپ کا نام کہتے ہیں۔ یہ بے دلیل بات ہے —— یہ سورت بھی مکی ہے۔اور مکی دور کے وسط میں نازل ہوئی ہے۔نزول کا نمبر ۴۵ ہے۔سورۂ مریم کا نزول کا نمبر ۴۴ تھا۔یعنی یہ سورت سورۂ مریم کے بعد متصلاً نازل ہوئی ہے۔اور حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے قبولِ اسلام سے پہلے نازل ہو چکی تھی۔آپ کے اسلام قبول کرنے کا واقعہ ۶ نبوی کا ہے۔اسی سورت کو پڑھ کر آپ نے اسلام قبول کیا ہے۔اور حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ ”سورۂ کہف، مریم، طٰہٰ اور انبیاء میری قدیم کمائی ہیں اور میرا عمدہ مال ہیں“

سورت کے مضامین: اس سورت کا موضوع بھی توحید و رسالت اور آخرت ہے۔اور دلیلِ نبوت کے طور پر قرآن کریم کا تذکرہ آیا ہے۔سب سے پہلے نزول قرآن کا مقصد بیان کیا گیا ہے۔اور یہ بتایا ہے کہ قرآن کس ہستی کا نازل کیا ہوا ہے؟ پھر موسیٰ علیہ السلام کے واقعات تفصیل سے بیان کئے گئے ہیں۔اور واقعہ کے شروع ہی میں توحید و رسالت اور آخرت کا بیان ہے۔اور نماز کی تاکید کی گئی ہے۔پھر تفصیل سے واقعات کا تذکرہ شروع ہوا ہے۔ان واقعات سے چند سبق حاصل ہوتے ہیں:

پہلا سبق: ہر ملّتِ حقّہ کو ابتداء میں شدائد سے دوچار ہونا پڑتا ہے۔بنی اسرائیل کے ابتدائی حالات میں اس کی مثالیں موجود ہیں۔مگر یہ احوال دیر تک باقی نہیں رہتے۔نجات کا وقت بہر حال آتا ہے۔اور حیرت انگیز طریقہ پر نجات ملتی ہے۔جیسے بنی اسرائیل کے لئے سمندر میں خشک راستے نکال دیئے گئے۔اسی طرح مسلمانوں کے لئے بھی راستہ

ضرور نکلے گا، وہ موجودہ پریشانیوں سے جی نہ اٹھالیں۔ اس وقت حالات بڑے پُر آشوب تھے۔ مکہ والوں کی چیرہ دستیوں سے بچنے کے لئے مسلمان ۵ نبوی میں حبشہ کی طرف ہجرت کر چکے تھے۔ اور باقی ماندہ ظلم کی چکی میں پس رہے تھے، مگر وہ حالات سے گھبرائیں نہیں، ان کی نجات کا وقت آرہا ہے۔

دوسرا سبق: ایمان کا بیج جب دل میں جگہ پکڑ لیتا ہے تو آناً فاناً تناور درخت بن جاتا ہے۔ اور فوراً ہی برگ وبار نمودار ہوجاتے ہیں۔ جادوگردوں کے واقعہ میں اس کی مثال موجود ہے۔ جب انھوں نے ایمان قبول کرلیا تو پھر وہ کسی ترغیب وتخویف سے متأثر نہ ہوئے۔ ایمان اور اس کے تقاضوں پر جمے رہے۔ اسلام کی تاریخ بھی اس سلسلہ کے واقعات سے بھری پڑی ہے۔ حضرت حمزہ رضی اللہ عنہ کے ابتدائی حالات، جو حضرت عمر رضی اللہ عنہ سے صرف تین دن قبل مسلمان ہوئے ہیں، اور خود حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے ابتدائی حالات کا مطالعہ کریں تو اس کی روشن مثالیں مل جائیں گی۔

تیسرا سبق: مسلمانوں کی صفوں میں ہمیشہ منافق رہتے ہیں۔ معاشرہ کبھی اس ناسور سے پاک نہیں ہوسکتا۔ سامری کا واقعہ اس کی مثال ہے۔ اس نے منافقانہ ایمان قبول کیا تھا۔ اور جب وقت آیا تو اس نے اپنا چولا بدل دیا۔ اور بچھڑا بنا کر اس کا مجاور بن بیٹھا۔ اور خود بھی ڈوبا اور ساتھ ایک خلقت کو لے ڈوبا۔ پس مسلمانوں کو ہمیشہ آستین کے اِن سانپوں سے ہوشیار رہنا چاہئے۔

علاوہ ازیں متعدد ضمنی فوائد بیان ہوئے ہیں۔ پھر آخرت اور اس کے احوال کا بیان ہے۔ اور رسالتِ محمدی کی سب سے بڑی دلیل: قرآن کریم کا تذکرہ کیا گیا ہے۔ اور غیر مسلموں کے لئے قرآن کے مطالعہ کا طریقہ بیان کیا ہے۔ اور ان کو ایک انتباہ دیا ہے۔ پھر اس انتباہ کی تفصیل حضرت آدم علیہ السلام کے واقعہ سے کی ہے۔ اور آخر میں مسلمانوں کو فہمائش کی ہے کہ ابھی کفار سے لوہا لینے کا وقت نہیں آیا، پس ان کی باتوں پر صبر کریں۔ اور صبر کا حوصلہ پیدا کرنے کی مثبت ومنفی تدبیریں بیان کی ہیں اور ساتھ ہی نماز کی تاکید کی ہے۔ پھر منکرینِ رسالت کے ایک مطالبہ کا جواب دے کر سورتِ پاک ختم کی گئی ہے۔
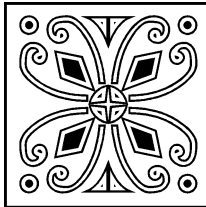
بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ

طٰهٰ ۝۱ مَآ اَنْزَلْنَا عَلَيْكَ الْقُرْاٰنَ لِتَشْقٰٓى ۝۲ اِلَّا تَذْكِرَةً لِّمَنْ يَّخْشٰى ۝۳ تَنْزِيْلًا مِّمَّنْ خَلَقَ الْاَرْضَ وَالسَّمٰوٰتِ الْعُلٰى ۝۴ اَلرَّحْمٰنُ عَلَى الْعَرْشِ اسْتَوٰى ۝۵ لَهٗ مَا فِي السَّمٰوٰتِ وَمَا فِي الْاَرْضِ وَمَا بَيْنَهُمَا وَمَا تَحْتَ الثَّرٰى ۝۶ وَاِنْ تَجْهَرْ بِالْقَوْلِ فَاِنَّهٗ يَعْلَمُ السِّرَّ وَاَخْفٰى ۝۷ اَللّٰهُ لَآ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ ۭ لَهُ الْاَسْمَاۗءُ الْحُسْنٰى ۝۸

طٰهٰ	طا،ھا	تَذْكِرَةً	یاددہانی	الْعُلٰى	اونچے
مَآ (۱)	نہیں	لِّمَنْ	اس کے لئے جو	اَلرَّحْمٰنُ (۴)	(وہ) مہربان اللہ (ہے)
اَنْزَلْنَا	اتارا ہم نے	يَّخْشٰى	ڈرتا ہے	عَلَى الْعَرْشِ	تختِ شاہی پر
عَلَيْكَ	آپ پر	تَنْزِيْلًا (۳)	بتدریج اتارنا	اسْتَوٰى (۵)	اس نے قرار پکڑا
الْقُرْاٰنَ	قرآن	مِّمَّنْ	اسکی جانب سے جس نے	لَهٗ	اس کی ملک ہے
لِتَشْقٰٓى (۲)	تاکہ آپ مشقت میں پڑیں	خَلَقَ	پیدا کی	مَا	جو کچھ
		الْاَرْضَ	زمین	فِي السَّمٰوٰتِ	آسمانوں میں ہے
اِلَّا	مگر	وَالسَّمٰوٰتِ	اور آسمان	وَمَا	اور جو کچھ

(۱) ما: نافیہ ہے، اور إلا: برائے اثبات آگے آرہا ہے، نفی اثبات کے ذریعہ حصر کیا گیا ہے أی ما أنزلنا القرآن إلا تذكرة: ہم نے قرآن صرف یاددہانی کے لئے اتارا ہے۔ پھر جب عَلَيكَ بڑھایا تو نبی ﷺ کی تسلی کے لئے لتشقى بڑھایا، اور اس طرح ایک نیا مضمون پیدا ہوگیا، اور تذکرۃ: کے ساتھ رعایت فاصلہ کے لئے اس کا متعلق لمن یخشٰی بڑھایا، تو ایک تیسرا مضمون پیدا ہوگیا۔ (۲) شَقِيَ يَشْقٰى (س) شَقَاءً فی کذا: مشقت میں پڑنا، سخت محنت کرنا، تکلیف اٹھانا۔ (۳) تنزیلا: فعلِ محذوف کا مفعول مطلق ہے أی نُزِّلَ تنزيلا: بتدریج اتارا گیا۔ اور چونکہ فعل محذوف: مجہول تھا، جس کا فاعل انجانا ہوتا ہے، اس لئے آگے فاعل کو جار مجرور کی شکل میں لایا گیا (۴) الرحمن: مبتدا محذوف ھو کی خبر ہے۔ اور علی العرش: استوی سے متعلق ہے، رعایتِ فاصلہ کی وجہ سے مقدم لایا گیا ہے، اور استوی: کی ضمیر الرحمٰن کی طرف لوٹتی ہے۔ (۵) استوی علی کذا: اوپر چڑھنا، بلند ہونا، جمنا، قرار پکڑنا۔

فِي الْاَرْضِ	زمین میں ہے	تَجْهَرْ	آپ پکار کر کہیں	اَللهُ[۴]	(وہ) اللہ (ہیں)
وَمَا	اور جو کچھ	بِالْقَوْلِ[۲]	بات	لَآ	نہیں
بَيْنَهُمَا	دونوں کے درمیان ہے	فَاِنَّهٗ	پس بیشک وہ	اِلٰهَ	کوئی معبود
وَمَا	اور جو کچھ	يَعْلَمُ	جانتے ہیں	اِلَّا هُوَ	مگر وہ
تَحْتَ	نیچے	السِّرَّ	چپکے سے کہی ہوئی بات	لَهُ	ان کے لئے (ہیں)
الثَّرٰى[۱]	نمناک مٹی کے ہے	وَاَخْفٰى[۳]	اور جو اس سے زیادہ	الْاَسْمَآءُ	نام
وَاِنْ	اور اگر		پوشیدہ ہے	الْحُسْنٰى	اچھے

نزولِ قرآن کا مقصد: گذشتہ سورت کا آخری مضمون یہ تھا کہ قرآن کریم نہایت آسان زبان و بیان میں اتارا گیا ہے، تا کہ ہر شخص اس سے استفادہ کر سکے، اب اسی مضمون سے اس سورت کا آغاز کیا جا رہا ہے، ارشاد ہے: ـــــ طا، ھا ـــــ یہ حروف مقطعات ہیں، جن کی مراد اللہ تعالیٰ ہی جانتے ہیں، آگے ارشاد ہے ـــــ ہم نے آپؐ پر قرآن اس لئے نہیں اتارا کہ آپؐ مشقت میں پڑیں، بلکہ اس شخص کی یاددہانی کے لئے اتارا ہے جو اللہ سے ڈرتا ہے ـــــ ان دو آیتوں میں تین باتیں بیان کی ہیں۔ ایک اصل مقصود ہے اور دو ضمناً بیان ہوئی ہیں: اول: قرآن نازل کرنے کی غرض یہ ہے کہ لوگ اس سے فائدہ اٹھائیں۔ ان کو عہدِ الست میں توحید ربوبیت کا جو سبق پڑھایا گیا ہے (الاعراف ۱۷۲) قرآن کریم ان کو وہ سبق یاد دلاتا ہے۔ دوم: قرآن کریم کے نازل کرنے کا یہ مقصد نہیں ہے کہ آپ ﷺ دعوت کے کام میں محنتِ شاقہ اور تکلیف شدیدہ اٹھائیں، اور جو نہ مانیں ان کے غم میں اپنی جان ہلاک کریں۔ آپؐ حسب استطاعت محنت کریں، اشقیاء اپنا وبال خود چکھیں گے۔ سوم: جن لوگوں کے دل نرم ہیں، اور وہ اللہ سے ڈرتے ہیں: وہی قرآن کے بیانات سے نصیحت حاصل کریں گے، اور ایمان لائیں گے، انہی کی تذکیر کے لئے یہ کتاب اتاری گئی ہے۔

قرآن کس ہستی کا نازل کیا ہوا ہے؟ ـــــ قرآن اس ہستی نے بتدریج اتارا ہے، جس نے زمین اور اونچے آسمان بنائے ہیں ـــــ یعنی جو ساری کائنات کے خالق ہیں ـــــ وہ مہربان اللہ ہیں ـــــ انھوں نے یہ

(۱) الثرى: نمناک مٹی، وہ گیلی مٹی جو زمین کی تہ میں ہے۔ اسم ہے۔ (۲) وإن تجهر بالقول کا معادل اور شرط کی جزا دونوں محذوف ہیں، اور معادل کا قرینہ شرط ہے اور جزاء کا قرینہ اگلا جملہ ہے أى: إن تجهر بالقول أو تخافت به: فإنهما سِيَّانِ یعنی خواہ آپ زور سے باتیں کہیں یا چپکے سے: اللہ کے لئے یکساں ہیں، کیونکہ الخ (۳) أخفى: اسم تفضیل ہے اور مفضل منہ محذوف ہے۔ (۴) اللّٰہ: مبتدا محذوف ھو کی خبر ہے۔

کائنات اس لئے پیدا کی ہے کہ لوگ ان کی رحمت کے حقدار بنیں (ہود آیت ۱۱۹) اور اچھے عمل کرکے جنت کے اونچے درجات حاصل کریں (الکہف آیت ۷، الملک آیت ۲) اللہ تعالیٰ نے یہ کائنات جہنم بھرنے کے لئے پیدا نہیں کی —— اس نے (کائنات پیدا کرنے کے بعد) تختِ شاہی پر قرار پکڑا —— یعنی وہی ہستی کائنات پر قابض ومتصرف ہے، اس نے کارخانۂ عالم دوسروں کو تفویض نہیں کیا، جیسا کہ مشرکین خیال کرتے ہیں —— اس کی ملک ہے جو کچھ آسمانوں میں، اور جو کچھ زمین میں، اور جو کچھ دونوں کے درمیان، اور جو کچھ نمناک مٹی کے نیچے ہے —— یعنی کائنات کا ذرّہ ذرّہ ان کی مِلک ہے، اور وہی ہر چیز کے مالک ہیں —— اور اگر آپ زور سے بات کہیں (یا چپکے سے: وہ دونوں کو جانتے ہیں) کیونکہ وہ چپکے سے کہی ہوئی بات کو جانتے ہیں، اور اس سے پوشیدہ بات کو بھی —— یعنی وہ دلوں کے خیالات سے بھی واقف ہیں، وہ علیم وخبیر ہیں —— (وہ ہستی) اللہ ہیں، ان کے سوا کوئی معبود نہیں —— یعنی الوہیت (خدا ہونا) انہی کا حق ہے، کوئی دوسرا اس وصف میں ان کا شریک وسہیم نہیں —— ان کے (اور بھی) اچھے اچھے نام ہیں —— وہ بے شمار صفات وکمالات کے مالک ہیں، قرآن اسی ذاتِ پاک نے اتارا ہے، اس لئے اس پر ایمان لانا، اور اس کی ہدایات کی پیروی کرنا فرض ہے۔

ان آیات میں اللہ تعالیٰ کی پانچ صفات بیان کی گئی ہیں۔ یعنی زمین وآسمان کا خالق ہونا، عالم پر قابض ومتصرف ہونا، کائنات کے ذرّہ ذرّہ کا مالک ہونا، ان کا علیم وخبیر ہونا، اور انہی کا معبود برحق ہونا یہ سب صفات واضح ہیں، البتہ ان کا عرش پر متمکن ہونا تفصیل طلب ہے:

اتنی بات تو واضح ہے کہ عرش پر قرار پکڑنے سے صرف عالم پر قابض ومتصرف ہونا ہی مراد نہیں، بلکہ اس کی حقیقت بھی مراد ہے: عرش کے معنی تختِ شاہی اور بلند مقام کے ہیں، اور نصوص سے یہ بات ثابت ہے کہ عرشِ الٰہی کے پائے ہیں، اور مقرب فرشتے اس کو اٹھائے ہوئے ہیں، اور وہ آسمانوں کے اوپر قبّہ کی طرح ہے، اس سے زیادہ اس کی حقیقت معلوم نہیں۔ اور استواء کے معنی برابر اور سیدھا ہونے، جمنے اور قرار پکڑنے کے ہیں۔ اور جب کوئی تختِ حکومت پر بیٹھتا ہے تو ملک کا نظم وانتظام کرتا ہے اور اقتدار ونفوذ وتصرف کا مالک ہوتا ہے۔

اب یہاں دو چیزیں ہیں: ایک: تختِ شاہی پر بیٹھنا۔ یہ مبدأ اور سبب ہے۔ دوسری: نفوذ واقتدار وتصرف کا مالک ہونا، یہ نتیجہ اور غایت ہے۔ اب اگر یہ صفت کسی انسان کے لئے ثابت کی جائے، تو مبدأ اور غایت دونوں مراد ہونگے، اور ہم مبدأ کی کیفیت کا ادراک بھی کرسکیں گے۔ مگر جب یہ صفت اللہ تعالیٰ کے لئے ثابت کی جائے تو غایت مراد ہوگی یعنی آسمانوں پر اور زمین پر اللہ تعالیٰ کو اقتدار اعلیٰ حاصل ہے، اور وہی کائنات میں متصرف ہیں۔ مشرکین کا جو خیال ہے

کہ اللہ نے بعض بندوں کو جزوی اختیار دیدیا ہے: قطعاً غلط خیال ہے۔ رہا مبدأ تو اس کے وجود کا اعتقاد رکھنا ضروری ہے، مگر اس کی کیفیت کو نہ سمجھ سکتے ہیں نہ سمجھا سکتے ہیں، پس اس کو اللہ تعالیٰ کے علم کے حوالے کرنا ضروری ہے۔ (رحمۃ اللہ الواسعہ شرح حجۃ اللہ البالغہ ۱:۶۳۶)

ملحوظہ: یہ صفت اسی سیاق میں قرآن کریم میں سات جگہ آئی ہے (الاعراف ۵۴، یونس ۳، الرعد ۲، طٰہٰ ۵، الفرقان ۵۹، السجدہ ۴، اور الحدید ۴) سب جگہ یہی بات بیان کی گئی ہے کہ اللہ تعالیٰ نے کائنات پیدا کر کے دوسروں کے حوالے نہیں کر دی کہ وہ جو چاہیں تصرف کریں، بلکہ وہ خود تختِ سلطنت پر جلوہ افروز ہیں، اور سارے جہاں کا انتظام وہی کر رہے ہیں، دوسرا کوئی انتظام میں دخیل نہیں، پس وہی معبود برحق ہیں۔

قرآن کریم رحمت ونور ہے۔ حسبِ استطاعت اس کی اشاعت وتلاوت کرنا آخری درجہ کی سعادت ہے!

وَهَلْ أَتَاكَ حَدِيثُ مُوسَىٰ ۝٩ إِذْ رَأَىٰ نَارًا فَقَالَ لِأَهْلِهِ امْكُثُوا إِنِّي آنَسْتُ نَارًا لَّعَلِّي آتِيكُم مِّنْهَا بِقَبَسٍ أَوْ أَجِدُ عَلَى النَّارِ هُدًى ۝١٠ فَلَمَّا أَتَاهَا نُودِيَ يَا مُوسَىٰ ۝١١ إِنِّي أَنَا رَبُّكَ فَاخْلَعْ نَعْلَيْكَ ۖ إِنَّكَ بِالْوَادِ الْمُقَدَّسِ طُوًى ۝١٢ وَأَنَا اخْتَرْتُكَ فَاسْتَمِعْ لِمَا يُوحَىٰ ۝١٣ إِنَّنِي أَنَا اللَّهُ لَا إِلَٰهَ إِلَّا أَنَا فَاعْبُدْنِي وَأَقِمِ الصَّلَاةَ لِذِكْرِي ۝١٤ إِنَّ السَّاعَةَ آتِيَةٌ أَكَادُ أُخْفِيهَا لِتُجْزَىٰ كُلُّ نَفْسٍ بِمَا تَسْعَىٰ ۝١٥ فَلَا يَصُدَّنَّكَ عَنْهَا مَن لَّا يُؤْمِنُ بِهَا وَاتَّبَعَ هَوَاهُ فَتَرْدَىٰ ۝١٦

وَهَلْ	اور کیا	نَارًا	آگ	نَارًا	آگ
أَتَاكَ	پہنچی آپ کو	فَقَالَ	پس کہا	لَّعَلِّي	شاید میں
حَدِيثُ	بات	لِأَهْلِهِ	اپنے گھر والوں سے	آتِيكُم	لاؤں تمہارے پاس
مُوسَىٰ	موسیٰ (کی)	امْكُثُوا	ٹھہرو	مِّنْهَا	اس سے
إِذْ	جب	إِنِّي	بیشک میں نے	بِقَبَسٍ [2]	کوئی شعلہ
رَأَىٰ	دیکھی انھوں نے	آنَسْتُ [1]	محسوس کی ہے	أَوْ	یا

(۱) آنس الشیئَ: محسوس کرنا، دیکھنا (۲) القَبَس: آگ کا شعلہ، انگارہ۔

اَجِدُ	پاؤں میں	وَاَنَا	اور میں نے	اٰتِيَةٌ	آنے والی ہے
عَلَى النَّارِ	آگ پر	اخْتَرْتُكَ	آپ کو منتخب کیا	اَكَادُ (۱)	قریب ہوں میں
هُدًى	راہ نمائی	فَاسْتَمِعْ	پس آپ غور سے سنیں	اُخْفِيْهَا	(کہ) پوشیدہ رکھوں اسکو
فَلَمَّآ	پس جب	لِمَا	اس کو جو	لِتُجْزٰى	تاکہ بدلہ دیا جائے
اَتٰىهَا	پہنچے وہ اس پر	يُوْحٰى	وحی کی جارہی ہے	كُلُّ	ہر
نُوْدِيَ	آواز دیئے گئے	اِنَّنِيْٓ	بیشک میں	نَفْسٍ	شخص
يٰمُوْسٰى	اے موسیٰ!	اَنَا	میں (ہی)	بِمَا	اس کا جو
اِنِّيْٓ	بیشک میں	اللّٰهُ	اللہ (ہوں)	تَسْعٰى	کیا اس نے
اَنَا	میں (ہی)	لَآ اِلٰهَ	نہیں کوئی معبود	فَلَا يَصُدَّنَّكَ	پس ہرگز نہ روکے آپ کو
رَبُّكَ	آپ کا رب ہوں	اِلَّآ	مگر	عَنْهَا	قیامت سے
فَاخْلَعْ	پس اتار دیں آپ	اَنَا	میں	مَنْ	جو
نَعْلَيْكَ	اپنے چپل	فَاعْبُدْنِيْ	پس میری عبادت کریں	لَّا يُؤْمِنُ	ایمان نہیں رکھتا
اِنَّكَ	بیشک آپ	وَاَقِمِ	اور اہتمام کریں	بِهَا	اس پر
بِالْوَادِ	میدان میں	الصَّلٰوةَ	نماز (کا)	وَاتَّبَعَ	اور پیروی کی اس نے
الْمُقَدَّسِ	پاک	لِذِكْرِيْ	میری یاد کے لئے	هَوٰىهُ	اپنی خواہش کی
طُوًى	طوی (ہیں)	اِنَّ السَّاعَةَ	بیشک قیامت	فَتَرْدٰى (۲)	پس تو تباہ ہو

توحید ورسالت اور آخرت کا بیان، اور نماز کی تاکید ـــــ اب حضرت موسیٰ علیہ السلام کا واقعہ بیان کیا جاتا ہے۔ اس واقعہ کے ضمن میں اسلام کے بنیادی عقائد: توحید ورسالت اور معاد کا بیان ہے۔ اور ساتھ ہی اسلام کی اہم

---

(۱) أکاد: فعل مقارب۔ أکاد أخفیھا: جملہ معترضہ ہے، الساعة کی صفت نہیں (روح ۱۵:۱۱۳) لتجزی: آتیة سے متعلق ہے، اور آتیة کی غرض وغایت ہے۔ کاد: کلام مثبت میں فعل کی نفی کرتا ہے یعنی یہ بتلاتا ہے کہ بعد میں آنے والا فعل واقع نہیں ہوا یعنی اللہ تعالیٰ نے قیامت کو چھپایا نہیں، بلکہ اس کی خبر دیدی ہے (تفصیل کے لئے دیکھیں سورۂ بنی اسرائیل آیت ۷۳ کا حاشیہ) (۲) رَدِی (س) ردًی: ہلاک ہونا، کھڈ یا غار میں گرنا۔ فتردی: جواب نہی ہے، اور واتبع کا لایؤمن پر عطف ہے، اور من لایؤمن: فلایصدنك کا فاعل ہے۔

ترین عبادت: نماز کے اہتمام کا حکم ہے۔ توحید و آخرت کے مضمون کی موسیٰ علیہ السلام کی طرف وحی کی گئی ہے، اور یہ وحی اس وقت کی گئی ہے جب آپ کو نبوت سے سرفراز کیا ہے، اس طرح تینوں عقائد کی صراحت ہوگئی۔ ارشاد ہے: ——— اور کیا آپ کو موسیٰ کا واقعہ پہنچا ہے؟ ——— سوال کا مقصد سامعین کو متوجہ کرنا ہے کہ وہ بات غور سے سنیں ——— موسیٰ علیہ السلام جب مصر سے بھاگ کر مدین پہنچے ہیں تو وہاں آپ نے نکاح کر لیا تھا۔ وہاں کئی سال مقیم رہنے کے بعد آپ مع اہل و عیال مصر کی طرف مراجعت فرما ہوئے۔ سردی کا زمانہ تھا، اور اتفاق سے راستہ بھول گئے۔ اچانک دور پہاڑ پر آگ نظر آئی۔ اس زمانہ کا دستور تھا کہ پہاڑی علاقہ میں جہاں مسافر بھٹک جایا کرتے ہیں: کسی اونچے پہاڑ پر رات میں آگ روشن کر دیا کرتے تھے، تاکہ بھولا بھٹکا مسافر وہاں پہنچ جائے۔ پھر کہیں آگ پر کوئی آدمی بھی ہوتا تھا، جس کے پاس فوری امداد کے لئے کھانا پانی وغیرہ ہوتا تھا۔ اور کہیں کوئی آدمی نہیں ہوتا تھا چنانچہ ——— جب انھوں نے آگ دیکھی تو اپنے گھر والوں سے کہا: ”ٹھہرو! میں نے بالیقین آگ دیکھی ہے۔ شاید میں اس میں سے تمہارے لئے کوئی شعلہ لاؤں یا آگ پر راہ نمائی پاؤں!“ ——— یعنی اگر وہاں کوئی نہ ہوا تو میں تھوڑی آگ لے آؤنگا، اور کوئی ہوا تو راستہ بھی معلوم کر آؤنگا ——— پھر جب وہ آگ پر پہنچے تو پکارے گئے: ”اے موسیٰ! بیشک میں ہی آپ کا پروردگار ہوں“ ——— یعنی وہ آگ نہیں تھی، اللہ کا جلوہ تھا، اور آگ کا حجاب تھا۔ وہاں موسیٰ علیہ السلام نے اللہ کا کلام بلا واسطہ سنا۔ چنانچہ آپ ”کلیم اللہ“ کہلائے۔

سوال: نبی ﷺ نے بھی معراج میں اللہ کا کلام بلا واسطہ سنا ہے، پھر آپ ﷺ کو کلیم اللہ کیوں نہیں کہا جاتا؟

جواب: یہ واقعہ اِس دنیا کا نہیں ہے، آسمانوں کے اوپر کا ہے، اس لئے آپؐ کو کلیم اللہ نہیں کہا جاتا۔ اِس عالَم میں براہِ راست اللہ کا کلام سننا موسیٰ علیہ السلام کی خصوصیت ہے اس لئے آپ ہی کو کلیم اللہ کہا جاتا ہے۔

متبرک جگہ کا ادب: اس موقع پر سب سے پہلی بات اللہ پاک نے یہ ارشاد فرمائی ——— پس آپ اپنے چپل اتار دیں، آپ یقیناً طُویٰ نامی پاک میدان میں ہیں ——— یہ میدان یا تو پہلے سے متبرک تھا یا اب ہوگیا، بہر حال متبرک جگہ میں جوتے اتار دینا ادب کا تقاضا ہے۔

مسئلہ: جوتے اگر پاک ہوں تو خفین کی طرح اُن میں نماز پڑھنا درست ہے۔ رسول اللہ ﷺ اور صحابہ کرام رضی اللہ عنہم سے پاک جوتے پہن کر نماز پڑھنا صحیح روایات سے ثابت ہے۔ مگر کسی روایت میں یہ صراحت نہیں کہ یہ عمل مسجد میں ہوتا تھا، سفر میں یا میدانِ جہاد کا یہ عمل ہوسکتا ہے، واللہ اعلم۔

رسالت سے سرفرازی: پھر ارشاد فرمایا: ——— اور میں نے آپ کو (نبوت کے لئے) منتخب کیا ہے، پس آپ

وہ باتیں غور سے سنیں جو وحی کی جارہی ہیں ـــــ کلام الٰہی سننے کا یہی ادب ہے کہ اسکو بغور سنا جائے، اعضاء پُرسکون ہوں، کوئی عضو کسی شغل میں لگا ہوا نہ ہو، اور کلام سمجھنے کی طرف دھیان ہو۔

توحید الوہیت وعبادت: پھر سب سے اہم مسئلہ کی وحی فرمائی ـــــ بیشک میں ہی اللہ ہوں، میرے سوا کوئی معبود نہیں ـــــ یہ توحید الوہیت ہے ـــــ پس آپ میری بندگی کریں ـــــ کسی اور کی بندگی نہ کریں، یہ توحید عبادت ہے۔

نماز کی تاکید: پھر فرمایا ـــــ اور آپ میری یاد کے لئے نماز کا اہتمام کریں ـــــ اس میں نماز کی تاکید کے ساتھ اس کا مقصد بھی واضح کیا ہے، اور وہ اللہ پاک کی یاد ہے، یہی نماز کا سب سے بڑا فائدہ ہے (سورۃ العنکبوت آیت ۴۵) ـــــ دنیا غفلت کی جگہ ہے، یہاں آدمی بار بار اللہ تعالیٰ کو بھولتا ہے، چنانچہ رات دن میں متفرق اوقات میں پانچ نمازیں فرض کی گئیں، تاکہ بندے نمازوں کے ذریعہ اللہ کو یاد رکھیں ـــــ نیز نماز کی روح ذکر اللہ ہے۔ نماز شروع سے آخر تک ذکر ہے۔ دل اور زبان ہی ذکر میں مشغول نہیں ہوتے، بلکہ دوسرے اعضاء بھی بندگی ظاہر کرتے ہیں۔ باادب کھڑا رہنا، جھکنا اور سجدہ ریز ہونا: عملی اذکار ہیں۔ پس جو شخص نماز سے غافل ہے وہ خدا کی یاد سے غافل ہے۔ اور جو دل اللہ کی یاد سے خالی ہوتا ہے: شیطان اس پر قبضہ جمالیتا ہے۔

قیامت آنے والی ہے: پھر فرمایا: ـــــ بیشک قیامت آنے والی ہے، قریب ہوں میں کہ اس کو پوشیدہ رکھوں، تاکہ ہر شخص کو اس کام کا بدلہ دیا جائے جو اس نے کیا ـــــ یعنی قیامت اس لئے آئے گی کہ ہر شخص نے دنیا میں جو اچھا برا کام کیا ہے، آخرت میں وہ اس کا بدلہ پائے۔ یہ توحید کے بعد عقیدۂ آخرت کی تعلیم ہے۔

اور درمیان میں یہ بات بیان فرمائی کہ چاہئے تو یہ تھا کہ لوگوں کو قیامت کی بھنک بھی نہ پڑنے دی جاتی، صحیح جانچ اور کھرا امتحان اسی صورت میں ہوتا ہے۔ مگر اللہ نے بندوں پر کرم فرمایا: اور ان کو بتلادیا کہ قیامت بالیقین آنے والی ہے، تاکہ لوگ اس کے لئے تیاری کرلیں ـــــ پس آپ کو اس سے وہ شخص ہرگز نہ روکے جو اس پر ایمان نہیں رکھتا، اور اس نے اپنی خواہش کی پیروی کی ہے: پس (اس کے ساتھ) آپ بھی ہلاک ہوں! ـــــ یعنی آپ منکر قیامت کی صحبت سے بچیں، وہ خود تو ڈوبا ہے: آپ کو بھی لے ڈوبے گا! حضرت موسیٰ علیہ السلام سے یہ بات ان کی امت کی تعلیم کے لئے کہی گئی ہے۔ پس آدمی کو چاہئے کہ سچوں کا ساتھی بنے۔ نیک آدمی کی صحبت رنگ لاتی ہے، اور برے کی صحبت بھی۔

> قیامت اور موت کا وقت اس لئے مخفی رکھا گیا ہے کہ لوگ عمل سے غافل نہ ہوں، مسلسل محنت میں لگے رہیں۔

وَمَا تِلْكَ بِيَمِينِكَ يٰمُوسٰى ﴿١٧﴾ قَالَ هِيَ عَصَايَ ۚ أَتَوَكَّؤُا عَلَيْهَا وَأَهُشُّ بِهَا عَلٰى غَنَمِي وَلِيَ فِيهَا مَآرِبُ أُخْرٰى ﴿١٨﴾ قَالَ أَلْقِهَا يٰمُوسٰى ﴿١٩﴾ فَأَلْقٰهَا فَإِذَا هِيَ حَيَّةٌ تَسْعٰى ﴿٢٠﴾ قَالَ خُذْهَا وَلَا تَخَفْ ٚ سَنُعِيدُهَا سِيرَتَهَا الْأُولٰى ﴿٢١﴾ وَاضْمُمْ يَدَكَ إِلٰى جَنَاحِكَ تَخْرُجْ بَيْضَآءَ مِنْ غَيْرِ سُوٓءٍ اٰيَةً أُخْرٰى ﴿٢٢﴾ لِنُرِيَكَ مِنْ اٰيٰتِنَا الْكُبْرٰى ﴿٢٣﴾ اِذْهَبْ إِلٰى فِرْعَوْنَ إِنَّهُ طَغٰى ﴿٢٤﴾

وَمَا	اور کیا (ہے)	بِهَا	اس کے ذریعہ	فَإِذَا	پس اچانک
تِلْكَ (۱)	یہ	عَلٰى غَنَمِي	اپنی بکریوں پر	هِيَ	وہ
بِيَمِينِكَ	آپ کے دائیں ہاتھ میں	وَلِيَ	اور میرے لئے	حَيَّةٌ	سانپ (ہے)
يٰمُوسٰى	اے موسیٰ؟	فِيهَا	اس میں	تَسْعٰى (۵)	دوڑتا ہوا
قَالَ	کہا	مَآرِبُ (۴)	حاجتیں ہیں	قَالَ خُذْهَا	فرمایا: پکڑلو اس کو
هِيَ	وہ	أُخْرٰى	دوسری (اور بھی)	وَلَا تَخَفْ	اور ڈرو نہیں
عَصَايَ	میری لاٹھی ہے	قَالَ	فرمایا	سَنُعِيدُهَا	عنقریب لوٹائیں گے
أَتَوَكَّؤُا (۲)	ٹیک لگاتا ہوں میں	أَلْقِهَا	نیچے ڈال دو اس کو		ہم اس کو
عَلَيْهَا	اس پر	يٰمُوسٰى	اے موسیٰ	سِيرَتَهَا	اس کی حالت پر
وَأَهُشُّ (۳)	اور پتے جھاڑتا ہوں میں	فَأَلْقٰهَا	پس نیچے ڈال دیا اس کو	الْأُولٰى	پہلی (سابقہ)

(۱) تلك: اسم اشارہ بعید بمعنی قریب ہے۔ عربی میں کسی چیز کی اہمیت ظاہر کرنے کے لئے: قریب کے لئے اسم اشارہ بعید لاتے ہیں، جیسے ذلك الكتاب لاريب فيه: اور مشار الیہ ''عصا'' ہے جو مؤنث سماعی ہے (۲) أتوكؤا: فعل مضارع: صیغہ واحد متکلم۔ آخر کا واو: واوِ جمع کے مشابہ تھا اس لئے قرآنی رسم الخط میں اس کے بعد الف لکھا گیا ہے۔ عام عربی رسم الخط میں أتوكأ لکھا جائے گا۔ تَوَكَّأَ على الشيئ: ٹیک لگانا، سہارا لینا۔ (۳) أهش: فعل مضارع: صیغہ واحد متکلم۔ هَشَّ (ن) هَشًّا الشجرةَ: درخت پر لاٹھی مار کر پتے جھاڑنا (۴) مآرب: مأربة (راء پر تینوں حرکتیں) کی جمع ہے، جس کے معنی ہیں: حاجت، مقصد، ضرورت۔ اور جمع کے ساتھ مفرد جیسا معاملہ کرتے ہوئے صفت أخرى (واحد مؤنث) لائی گئی ہے۔ قاعدے سے صفت أُخَر (جمع مؤنث) آنی چاہئے۔ اسی طرح من آياتنا الكبرى میں آیات (جمع) کے ساتھ مفرد جیسا معاملہ کیا گیا ہے، اور الكبرى (واحد مؤنث) صفت لائی گئی ہے۔ (۵) جملہ تسعى: حية کی صفت ہے۔

وَاضْمُمْ	اور ملالو	مِنْ غَيْرِ	بغیر	مِنْ اٰيٰتِنَا	ہماری نشانیوں میں سے
يَدَكَ	اپنا ہاتھ	سُوْٓءٍ	کسی عیب کے	الْكُبْرٰى	بڑی
اِلٰى جَنَاحِكَ (۱)	اپنی بغل سے	اٰيَةً (۲)	نشانی	اِذْهَبْ	جایئے
تَخْرُجْ	نکلے گا	اُخْرٰى	دوسری	اِلٰى فِرْعَوْنَ	فرعون کی طرف
بَيْضَآءَ	روشن	لِنُرِيَكَ	تاکہ دکھائیں ہم آپکو	اِنَّهٗ طَغٰى	بیشک اس نے سرکشی کی ہے

معجزاتِ موسوی: اللہ تعالیٰ انبیاء علیہم الصلوٰۃ والسلام کو سندِ نبوت کے طور پر معجزات عنایت فرماتے ہیں۔ موسیٰ علیہ السلام کو نو نشانیاں دی گئی تھیں، جن کا تذکرہ سورہ بنی اسرائیل آیت ۱۰۱ میں گذر چکا ہے۔ یہاں ان میں سے دو بڑے معجزات ذکر کئے گئے ہیں:

ا۔ عصاء کا معجزہ: اللہ تعالیٰ نے موسیٰ علیہ السلام سے دریافت کیا ـــــ اور اے موسیٰ! آپ کے دائیں ہاتھ میں کیا ہے؟ ـــــ یہ سوال اس لئے کیا گیا تھا کہ موسیٰ علیہ السلام اپنی لاٹھی کی حقیقت اور اس کے منافع کو خوب مستحضر کرلیں، تاکہ جب معجزہ ظاہر ہو تو یہ خیال نہ آئے کہ شاید غلطی سے ہاتھ میں لاٹھی نہ لائے ہوں کچھ اور لے آئے ہوں۔ موسیٰ علیہ السلام نے ـــــ عرض کیا: یہ میری لاٹھی ہے، میں اس پر ٹیک لگاتا ہوں، اور میں اس کے ذریعہ اپنی بکریوں پر پتے جھاڑتا ہوں، اور میرے اس سے اور بھی کئی کام نکلتے ہیں ـــــ محبت کا تقاضا یہ ہے کہ جب محبوب مہربان ہوکر متوجہ ہو تو بات دراز کی جائے، اور محبوب کی توجہ سے زیادہ سے زیادہ فائدہ اٹھایا جائے۔ چنانچہ موسیٰ علیہ السلام نے تفصیلی جواب دیا، اور لاٹھی کے منافع بیان کئے ورنہ اتنا جواب بھی کافی تھا کہ ''یہ لاٹھی ہے'' ـــــ اور ادب کا یہ بھی تقاضا ہے کہ کلام بہت طویل نہ کیا جائے۔ چنانچہ آخر میں اختصار کردیا کہ میں اس سے اور بھی کام لیتا ہوں، اور ان کی تفصیل بیان نہ کی، تاکہ کلام کی درازی محبوب کے ملال کا باعث نہ بن جائے۔ اللہ تعالیٰ نے ـــــ فرمایا: اے موسیٰ! اس کو نیچے ڈال دو، چنانچہ آپ نے اس کو نیچے ڈال دیا، پس اچانک وہ دوڑتا ہوا سانپ بن گئی! ـــــ اس سانپ کو یہاں ''دوڑتا ہوا'' کہا گیا ہے۔ یعنی وہ بالقوہ سریع السیر تھا، بالفعل دوڑنا مراد نہیں۔ اور سورۃ النمل آیت ۱۰ میں ﴿ كَاَنَّهَا جَآنٌّ ﴾: گویا پتلا سانپ کہا گیا ہے۔ اور سورۃ الاعراف آیت ۱۰۷ میں، اور سورۃ الشعراء آیت ۳۲ میں ﴿ ثُعْبَانٌ مُّبِيْنٌ ﴾ بڑا

(۱) جناح کے معنی بغل کے بھی آتے ہیں (معجم وسیط) اور تخرج: جوابِ امر ہونے کی وجہ سے مجزوم ہے، اور بیضاء: ضمیر فاعل سے حال ہے۔ اور من غیر: تخرج سے متعلق ہے (۲) آیة أخرى: فعل أَرَيْنَاكَ (ہم نے آپ کو دکھلائی) مقدر کا مفعول بہ ہے، جس کی تفسیر بعد والا لنريك کر رہا ہے۔ اور لنريك: فعل محذوف: فعلنا ما فعلنا کا مفعول لہ ہے۔

اژدہا کہا گیا ہے۔ ان میں تطبیق یہ ہے کہ وہ سانپ بڑا اژدہا تھا، مگر سرعتِ سیر اور تیز رفتاری میں چھوٹے سانپ کی طرح تھا، اس لئے جانّ کے ساتھ کأنھا بڑھایا ـــــ فرمایا: اس کو پکڑلو، اور ڈرو نہیں! ابھی ہم اس کو اس کی پہلی حالت کی طرف پھیر دیتے ہیں ـــــ یعنی وہ ہاتھ میں لیتے ہی لاٹھی بن جائے گا۔

۲ــ یدِ بیضاء (روشن ہاتھ): اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا: ـــــ اور آپ اپنا ہاتھ اپنے بغل میں دبالیں: وہ بے عیب روشن ہوکر نکلے گا ـــــ یعنی جب بغل میں دبا کر ہاتھ نکالیں گے تو وہ آفتاب کی طرح چمکنے لگے گا۔ اور سفیدی برص وغیرہ کی نہ ہوگی، جو عیب (بیماری) سمجھی جاتی ہے ـــــ (دکھلائی ہم نے آپ کو) ـــــ دوسری نشانی ـــــ یعنی یہ بات صرف زبانی نہیں بتائی، بلکہ پہلے معجزہ کی طرح اللہ تعالیٰ نے عملی طور پر ریہرسل کرادی، تاکہ موقع پر خوف زدہ نہ ہوں ـــــ تاکہ ہم آپ کو اپنی بعض بڑی نشانیاں دکھلائیں ـــــ اس میں اشارہ ہے کہ اللہ تعالیٰ موسیٰ علیہ السلام کو اور بھی معجزات عنایت فرمائیں گے، سرِ دست یہ دو معجزات عطا فرمائے گئے۔

کارِ نبوت: ـــــ آپ فرعون کے پاس جائیں، اس نے یقیناً سر ابھارا ہے ـــــ یعنی ان دو عظیم معجزات کے ساتھ سرکش فرعون کے پاس دعوتِ ایمان لے کر جائیں ـــــ موسیٰ علیہ السلام کی بعثت درحقیقت بنی اسرائیل کی طرف ہوئی تھی، فرعون کو دعوت دینے کا حکم ضمناً تھا، کیونکہ اس کے ظلم واستبداد سے بنی اسرائیل کو چھڑانا بھی آپ کی بعثت کے مقاصد میں شامل تھا۔

قَالَ رَبِّ اشْرَحْ لِيْ صَدْرِيْ ﴿۲۵﴾ وَيَسِّرْ لِيْٓ اَمْرِيْ ﴿۲۶﴾ وَاحْلُلْ عُقْدَةً مِّنْ لِّسَانِيْ ﴿۲۷﴾ يَفْقَهُوْا قَوْلِيْ ﴿۲۸﴾ وَاجْعَلْ لِّيْ وَزِيْرًا مِّنْ اَهْلِيْ ﴿۲۹﴾ هٰرُوْنَ اَخِي ﴿۳۰﴾ اشْدُدْ بِهٖٓ اَزْرِيْ ﴿۳۱﴾ وَاَشْرِكْهُ فِيْٓ اَمْرِيْ ﴿۳۲﴾ كَيْ نُسَبِّحَكَ كَثِيْرًا ﴿۳۳﴾ وَّنَذْكُرَكَ كَثِيْرًا ﴿۳۴﴾ اِنَّكَ كُنْتَ بِنَا بَصِيْرًا ﴿۳۵﴾ قَالَ قَدْ اُوْتِيْتَ سُؤْلَكَ يٰمُوْسٰى ﴿۳۶﴾

قَالَ	عرض کیا	صَدْرِيْ	میرا سینہ	وَاحْلُلْ	اور کھول دیجئے
رَبِّ	اے میرے رب	وَيَسِّرْ	اور آسان فرمایئے	عُقْدَةً	گرہ
اشْرَحْ	کشادہ فرمایئے	لِيْٓ	میرے لئے	مِّنْ لِّسَانِيْ	میری زبان کی
لِيْ	میرے لئے	اَمْرِيْ	میرا کام	يَفْقَهُوْا (۱)	(تاکہ) سمجھیں وہ

(۱) یفقھوا جواب ہے فعلِ امر احلل کا، اور مجزوم ہے، نونِ اعرابی گر گیا ہے۔ اور واو کے بعد الف: قرآنی رسم الخط کے مطابق لکھا گیا ہے۔

قَوْلِیْ	میری بات	اَزْرِیْ (۲)	میری پیٹھ	اِنَّکَ	بیشک آپ
وَاجْعَلْ	اور بنایئے	وَاَشْرِکْهُ	اور شریک کیجئے اس کو	كُنْتَ	ہیں آپ
لِّیْ	میرے لئے	فِیْۤ اَمْرِیْ	میرے کام میں	بِنَا (۳)	ہم کو
وَزِیْرًا	ایک مددگار	كَیْ	تاکہ	بَصِیْرًا	خوب دیکھنے والے
مِّنْ اَهْلِیْ	میرے گھر سے	نُسَبِّحَكَ	پاکی بیان کریں ہم	قَالَ	فرمایا
هٰرُوْنَ (۱)	(یعنی) ہارون		آپ کی	قَدْ	تحقیق
اَخِی	میرا بھائی	كَثِیْرًا	بہت زیادہ	اُوْتِیْتَ	دیئے گئے آپ
اشْدُدْ	مضبوط کیجئے	وَّنَذْكُرَكَ	اور یاد کریں ہم آپ کو	سُؤْلَكَ (۴)	اپنی درخواست
بِهٖۤ	اس کے ذریعہ	كَثِیْرًا	بہت زیادہ	یٰمُوْسٰی	اے موسیٰ

موسیٰ علیہ السلام کی دعائیں اور ان کی قبولیت: جب موسیٰ علیہ السلام کو نبوت سے سرفراز کیا گیا، اور حکم دیا گیا کہ وہ فرعون کے پاس جائیں، اور اس کو ایمان کی دعوت دیں، تو آپ نے دو دعائیں فرمائیں:

پہلی دعا: ـــــ عرض کیا: پروردگار! میرے لئے میرا سینہ کھول دیجئے، اور میرے لئے میرا کام آسان فرمایئے ـــــ نبی کو دنیا کی اصلاح کا کام کرنا ہوتا ہے۔ اس کو بڑی سختیاں جھیلنی پڑتی ہیں۔ اور موسیٰ علیہ السلام کو تو فرعون کے پاس جانا تھا۔ جو خدا بنا ہوا تھا۔ اور جابر وظالم بھی تھا۔ اس لئے آپ نے مہم سرانجام دینے کے لئے دعا فرمائی کہ الٰہی! مجھے حوصلہ عطا فرما، میرا دل کھول دے، اور میرا کام آسان فرما، تاکہ میں دعوت کا کام بخوبی انجام دے سکوں۔ ناموافق باتیں پیش آنے پر ہمت نہ ہاروں۔ فریضۂ رسالت کی ادائیگی میں دشواریاں پیش آنے پر گھبرا نہ جاؤں۔ اور فرعون کے جاہ وجلال اور دبدبہ کے سامنے دب نہ جاؤں ـــــ اور ''میرے لئے'': دو مرتبہ اس لئے لائے ہیں کہ اس کام میں سراسر فائدہ موسیٰ علیہ السلام کا تھا۔ اللہ تعالیٰ کا کچھ فائدہ نہیں تھا۔ اللہ تعالیٰ کے کام اغراض ومقاصد کے مرہونِ منت نہیں ہوتے۔ البتہ ان میں حکمتیں ضرور ہوتی ہیں ـــــ اور میری زبان کی گرہ کھول دیجئے، تاکہ وہ میری بات سمجھیں ـــــ کہتے ہیں کہ موسیٰ علیہ السلام کی زبان میں لکنت تھی۔ بعض کہتے ہیں: پیدائشی تھی، اور بعض کہتے ہیں: لڑکپن میں زبان جل گئی تھی۔ اور اس کا قصہ تفاسیر میں یہ بیان کیا گیا ہے کہ لڑکپن میں کھیلتے ہوئے فرعون کو

(۱) ھارون: وزیراً کا عطفِ بیان ہے (۲) الأَزْر: طاقت، مجازاً پیٹھ۔ شَدَّ أَزْرَہ: مضبوط کرنا، تقویت پہنچانا۔ (۳) بِنَا: بصیراً سے متعلق ہے، رعایتِ فاصلہ کی وجہ سے مقدم کیا گیا ہے۔ (۴) السُّؤْل اور السُّوْل: سوال، درخواست، فرمائش۔

لکڑی ماردی تھی، یا اس کی ڈاڑھی کھینچ لی تھی۔ اس نے موسیٰ علیہ السلام کو قتل کرنے کا ارادہ کیا۔ اس کی بیوی حضرت آسیہ رضی اللہ عنہا نے کہا کہ نادان بچہ ہے، نادانی میں یہ حرکت کی ہے۔ یقین نہ آئے تو امتحان کرلیا جائے۔ امتحان کے لئے انگارہ اور یاقوت لایا گیا۔ آپ نے انگارہ منہ میں ڈال لیا، جس سے زبان جل گئی اور لکنت پیدا ہوگئی۔

مگر یہ واقعہ مرفوع روایت میں وارد نہیں ہوا[1]، حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے مروی ہے۔ اس لئے احتمال ہے کہ یہ اسرائیلی واقعہ ہو، اور آیت کی تفسیر اس پر موقوف نہیں۔ زبان کی گرہ یعنی بستگی عام لفظ ہے۔ ممکن ہے شاہی دربار میں آدمی پر جو ہیبت طاری ہوتی ہے، اور زبان بند ہوجاتی ہے، اور آدمی صاف صاف بات نہیں کہہ سکتا: وہ بستگی مراد ہو۔ اور قرآنِ پاک سے یہ بات ثابت ہے کہ موسیٰ علیہ السلام کو وہ فصاحت اور طلاقتِ لسانی حاصل نہیں تھی جو ہارون علیہ السلام کو حاصل تھی۔ اور کارِ تبلیغ کی انجام دہی کے لئے اس کی بہر حال ضرورت ہوتی ہے، اس لئے آپ نے یہ دعا فرمائی۔

فائدہ: یہ دعا بہت اہم ہے۔ جو لوگ عوام سے خطاب کرتے ہیں، اور ان کی اصلاح کے فکر مند رہتے ہیں، ان کو یہ دعا حرزِ جان بنانی چاہئے۔ مجھے میرے استاذ حضرت مولانا مفتی محمد اکبر صاحب پالن پوری قدس سرہٗ نے بچپن میں یہ دعا تلقین کی تھی۔ اور اس میں ﴿ رَبِّ زِدْنِیْ عِلْمًا ﴾ کا اضافہ کیا تھا۔ چنانچہ پچاس سال سے یہ دعا میرا معمول ہے۔ پس جب تقریر یا کوئی اہم مضمون بیان کرنا ہو تو یہ دعا ضرور کرنی چاہئے۔ اور اُمری کہتے وقت مقصد کا تصور کرنا چاہئے۔ ان شاء اللہ کامیابی ہوگی۔

دوسری دعا: —— اور میرے لئے میرے کنبے میں سے ایک مددگار تجویز فرمایئے، یعنی میرے بھائی ہارون کے ذریعہ میری پیٹھ مضبوط کیجئے، اور ان کو میرے کام میں شریک کیجئے —— یہ دعا کارِ نبوت کو انجام دینے کے لئے اسباب کی فراہمی سے متعلق ہے۔ وزیر کے معنی مددگار کے ہیں۔ بادشاہ کا وزیر بھی اس کا مددگار رہتا ہے، اس لئے اس کو وزیر کہتے ہیں —— کسی کام یا تحریک کے چلانے کے لئے حسبِ منشاء اعوان وانصار مل جائیں تو سب کام آسان ہوجاتے ہیں۔ حدیث میں ہے کہ ”جب اللہ تعالیٰ کسی کو کوئی امارت سپرد فرماتے ہیں، اور چاہتے ہیں کہ وہ اچھے کام کرے، تو اس کو نیک وزیر عنایت فرماتے ہیں، جو اس کی مدد کرتا ہے۔ اگر وہ کوئی ضروری کام بھول جاتا ہے تو وزیر یاد دلاتا ہے، اور جس کام کا وہ ارادہ کرتا ہے، وزیر اس میں اس کی مدد کرتا ہے“۔ (رواہ النسائی)

(۱) نسائی رحمہ اللہ نے السنن الکبری (۳۹۶:۶ کتاب التفسیر) میں مرفوع روایت بیان کی ہے، مگر صحیح رائے مزّی رحمہ اللہ کی ہے کہ یہ روایت موقوف ہے۔

حضرت موسیٰ علیہ السلام نے دعا میں یہ بات بھی عرض کی ہے کہ وہ مددگار میرے خاندان اور اقارب میں سے ہو، کیونکہ خاندان کے آدمی کے اخلاق وآداب دیکھے بھالے ہوتے ہیں۔ اور باہم الفت ومناسبت ہوتی ہے، جس سے کام میں مدد ملتی ہے ـــــ مگر یہ بات اس وقت ہے جب اس میں کام کی صلاحیت بھی ہو، محض اقرباء پروری کا جذبہ کارفرما نہ ہو، ورنہ کام چوپٹ ہوجائے گا۔

فائدہ: حضرت ہارون علیہ السلام: حضرت موسیٰ علیہ السلام سے تین چار سال بڑے تھے۔ اور وفات بھی پہلے ہوئی ہے۔ جس وقت طور پر موسیٰ علیہ السلام یہ دعا کررہے تھے: وہ مصر میں تھے۔ وحی کے ذریعہ ان کو نبوت کی اطلاع دی گئی، اور ہدایت کی گئی کہ موسیٰ علیہ السلام مصر آرہے ہیں، وہ ان کا استقبال کریں۔

دعا کے آخر میں موسیٰ علیہ السلام نے عرض کیا: ـــــ تاکہ ہم آپ کی خوب پاکی بیان کریں، اور آپ کا بہت زیادہ ذکر کریں ـــــ یعنی ہم دونوں مل کر دعوت وتبلیغ کا فریضہ انجام دیں۔ آپ کی قدّوسیت کا ڈنکا بجائیں، اور آپ کی تعریف کے گیت گائیں۔ مشہور مقولہ ہے: ''ایک سے دو بھلے'' تنہا کام اتنی عمدگی سے سرانجام نہیں پاتا جتنا دو یا چند مل کر انجام دیتے ہیں ـــــ بیشک آپ ہمارے احوال سے بخوبی واقف ہیں ـــــ یعنی آپ جانتے ہیں کہ میں جو دعا مانگ رہا ہوں، اس کا قبول کرنا کہاں تک ہمارے لئے مفید ہے ـــــ اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا: اے موسیٰ! بیشک آپ کی مانگ آپ کو دیدی گئی ـــــ یعنی آپ کی دعا نہ صرف قبول کی گئی، بلکہ آپ نے جو کچھ مانگا وہ عطا بھی فرمادیا گیا۔ آپ کی مانگ پوری کردی گئی۔

فائدہ (۱): دعا کی قبولیت اور مانگ پوری کرنے کے درمیان فرق ہے۔ اللہ تعالیٰ مؤمن بندے کی ہر نیک دعا قبول فرماتے ہیں۔ کوئی دعا رائیگاں نہیں جاتی۔ ارشاد پاک ہے: ﴿أُجِيْبُ دَعْوَةَ الدَّاعِ إِذَا دَعَانِ﴾ ترجمہ: میں دعا کرنے والے کی دعا قبول کرتا ہوں جبکہ وہ دعا کرتا ہے (البقرہ آیت ۱۸۶) پھر بندے نے جو کچھ مانگا ہے: اگر بندے کی اس میں مصلحت ہوتی ہے تو وہ چیز عنایت فرمائی جاتی ہے، ورنہ اس کی دعا کو عبادت قرار دے کر نامۂ اعمال میں لکھ لیا جاتا ہے۔ یہاں یہ ارشاد فرمایا ہے کہ آپ کی مانگی ہوئی سب چیزیں آپ کو دیدی گئیں۔ یہ قبولیتِ دعا کا اعلیٰ درجہ ہے۔

فائدہ (۲): نیک ساتھی ذکر وعبادت میں مددگار ہوتے ہیں۔ ذکر وتسبیح میں سازگار ماحول اور اللہ والے ساتھیوں کا بڑا دخل ہوتا ہے۔ جس کے ساتھی اللہ والے نہ ہوں وہ اتنی عبادت نہیں کرسکتا جتنی وہ کرسکتا ہے جس کا ماحول اللہ والوں کا اور ساتھی ذاکر شاغل ہوں۔

جو شخص ذکر اللہ میں مشغول رہنا چاہے: اس کو سازگار ماحول تلاش کرنا چاہئے!

وَلَقَدْ مَنَنَّا عَلَيْكَ مَرَّةً اُخْرٰٓى ﴿٣٧﴾ اِذْ اَوْحَيْنَآ اِلٰٓى اُمِّكَ مَا يُوْحٰٓى ﴿٣٨﴾ اَنِ اقْذِفِيْهِ فِي التَّابُوْتِ فَاقْذِفِيْهِ فِي الْيَمِّ فَلْيُلْقِهِ الْيَمُّ بِالسَّاحِلِ يَأْخُذْهُ عَدُوٌّ لِّيْ وَ عَدُوٌّ لَّهٗ ؕ وَاَلْقَيْتُ عَلَيْكَ مَحَبَّةً مِّنِّيْ ۚ وَلِتُصْنَعَ عَلٰى عَيْنِيْ ﴿٣٩﴾ اِذْ تَمْشِيْٓ اُخْتُكَ فَتَقُوْلُ هَلْ اَدُلُّكُمْ عَلٰى مَنْ يَّكْفُلُهٗ ؕ فَرَجَعْنٰكَ اِلٰٓى اُمِّكَ كَيْ تَقَرَّ عَيْنُهَا وَلَا تَحْزَنَ ۚ وَقَتَلْتَ نَفْسًا فَنَجَّيْنٰكَ مِنَ الْغَمِّ وَفَتَنّٰكَ فُتُوْنًا ۚ فَلَبِثْتَ سِنِيْنَ فِيْٓ اَهْلِ مَدْيَنَ ۙ ثُمَّ جِئْتَ عَلٰى قَدَرٍ يّٰمُوْسٰى ﴿٤٠﴾

وَلَقَدْ	اور البتہ تحقیق	فِي التَّابُوْتِ	صندوق میں	لَهٗ	اس کا
مَنَنَّا (١)	احسان کیا ہم نے	فَاقْذِفِيْهِ	پس ڈال دے اس کو	وَاَلْقَيْتُ	اور ڈالی میں نے
عَلَيْكَ	تم پر	فِي الْيَمِّ	دریا میں	عَلَيْكَ	تم پر
مَرَّةً اُخْرٰٓى	ایک بار اور	فَلْيُلْقِهِ (٥)	پس چاہئے کہ ڈالے	مَحَبَّةً (٧)	محبت
اِذْ	جب		اس کو	مِّنِّيْ (٨)	اپنی طرف سے
اَوْحَيْنَآ	وحی کی ہم نے	الْيَمُّ	دریا	وَلِتُصْنَعَ (٩)	اور تا کہ پرورش کئے
اِلٰٓى اُمِّكَ	آپ کی ماں کی طرف	بِالسَّاحِلِ	کنارے پر		جاؤ تم
مَا	جو	يَأْخُذْهُ (٦)	اٹھائے گا اس کو	عَلٰى عَيْنِيْ	میری آنکھ کے سامنے
يُوْحٰٓى (٢)	وحی کی گئی	عَدُوٌّ	دشمن	اِذْ	جب
اَنِ (٣)	کہ	لِّيْ	میرا	تَمْشِيْٓ	چلنے لگی
اقْذِفِيْهِ (٤)	ڈال دے اس کو	وَعَدُوٌّ	اور دشمن	اُخْتُكَ	تمہاری بہن

(۱) مننا: ماضی معروف، جمع متکلم، مصدر مَنٌّ، باب نصر: احسان وانعام کرنا۔ (۲) یوحی: مضارع مجہول، جملہ ما کا صلہ، پھر أوحینا کا مفعول بہ۔ (۳) أن: مفسِّرہ: مایوحی کی تفسیر (۴) اقذ فی: فعل امر، صیغہ واحد مؤنث حاضر، مصدر قَذْفٌ: ڈالنا، پھینکنا (۵) لِيُلْقِ: امر غائب، صیغہ واحد مذکر۔ یہ دریا کو حکم ہے۔ (٦) یأخذہ: جواب امر ہے، اس لئے مجزوم ہے۔ (۷) محبة: مصدر میمی: کسی چیز کو اچھا سمجھتے ہوئے چاہنا۔ (۸) منی: اضافت تشریف کے لئے ہے یعنی محبتِ خاص۔ (۹) تُصنع: مضارع مجہول، صیغہ واحد مذکر حاضر، مصدر صَنْعٌ: تیار کرنا، پرورش کرنا۔

فَتَقُوْلُ	پس کہنے لگی	تَقَرَّ	ٹھنڈی رہے	فُتُوْنًا (۴)	خوب آزمانا		
هَلْ	کیا	عَيْنُهَا	اس کی آنکھ	فَلَبِثْتَ	پس ٹھیرے تم		
اَدُلُّكُمْ	بتاؤں میں آپ لوگوں کو	وَلَا تَحْزَنَ (۲)	اور نہ غمگین ہو وہ	سِنِيْنَ	کئی سال		
عَلٰى مَنْ	وہ شخص جو	وَقَتَلْتَ	اور مار ڈالا تم نے	فِيْٓ اَهْلِ مَدْيَنَ	مدین والوں میں		
يَّكْفُلُهٗ	پالے پوسے اس کو؟	نَفْسًا	ایک شخص کو	ثُمَّ	پھر		
فَرَجَعْنٰكَ (۱)	پس لوٹایا ہم نے تم کو	فَنَجَّيْنٰكَ	پس نجات دی ہم نے تمکو	جِئْتَ	آئے تم		
اِلٰٓى اُمِّكَ	تمہاری ماں کی طرف	مِنَ الْغَمِّ	غم سے	عَلٰى قَدَرٍ (۵)	اندازے کے مطابق		
كَيْ	تا کہ	وَفَتَنّٰكَ (۳)	اور آزمایا ہم نے تم کو	يّٰمُوْسٰى	اے موسیٰ!		

طور پر ہم کلامی کا سلسلہ جاری ہے۔ گذشتہ آیات میں موسیٰ علیہ السلام کی دعا اور اس کی قبولیت کا ذکر تھا۔ اب ارشاد پاک ہے: ـــــ اور بخدا واقعہ یہ ہے کہ ہم نے آپ پر ایک بار اور بھی احسان کیا ہے ـــــ یعنی پہلے بھی ہم ایک مرتبہ آپ پر بے طلب بڑا احسان کر چکے ہیں۔ پھر اب ایک مناسب چیز مانگنے پر کیوں نہ عنایت فرمائیں گے! ـــــ اور وہ پہلا موقعہ موسیٰ علیہ السلام کی ولادت کا وقت تھا۔ جب نجومیوں اور کاہنوں نے فرعون سے کہا تھا کہ بنی اسرائیل میں ایک بچہ پیدا ہوگا، جس کے ہاتھ سے تیری حکومت جائے گی۔ فرعون نے اس اندیشہ سے حکم دیا کہ جو بھی لڑکا بنی اسرائیل میں پیدا ہو: ذبح کر دیا جائے۔ ایسے پر آشوب زمانہ میں موسیٰ علیہ السلام کی ولادت ہوئی۔ ان کی والدہ سخت پریشان ہوئیں۔ ان کے سر پر ہر وقت خطرہ منڈلا رہا تھا۔ تین ماہ تک تو کسی طرح بچے کو پولس کی نگاہ سے اوجھل رکھا۔ مگر آگے صورتِ حال سنگین نظر آئی، اس نازک گھڑی میں اللہ تعالیٰ نے موسیٰ علیہ السلام کی ماں کے دل میں ڈالا کہ وہ ایک کشتی نما صندوق بنائیں، اور اس میں بچے کو رکھ کر دریائے نیل کے حوالے کر دیں، آگے جو ہونا ہو سو ہو۔ ارشاد ہے: ـــــ جب ہم نے آپ کی ماں کی طرف وہ حکم بھیجا جو بھیجا کہ تم اس (نومولود بچے) کو صندوق میں ڈالو، پھر اس کو دریا میں ڈالو ـــــ پھر دریا کو حکم دیا ـــــ پس چاہئے کہ دریا اس کو کنارے پر ڈالے ـــــ پھر

(۱) رَجَعَ رَجْعًا: لازم ومتعدی: دونوں طرح آتا ہے۔ یہاں متعدی ہے (۲) لاتحزن: فعل مضارع منفی، صیغہ واحد مؤنث غائب (۳) لغت میں فَتَنَ کے معنی ہیں: سونے کو آگ میں تپا کر کھرا کھوٹا معلوم کرنا۔ قرآن میں لفظ فتنہ اور اس کے مشتقات مختلف معانی میں آئے ہیں۔ یہاں آزمائش کے معنی ہیں (۴) فتونا: مصدر اور مفعول مطلق برائے تاکید ہے۔ (۵) قَدَر اور قَدْر: اندازہ، تقدیر ازلی فیصلہ اور مقررہ وقت۔

انجام کیا ہوگا؟ ـــــ اٹھائیگا اس کو میرا دشمن اور اس کا دشمن ـــــ یعنی فرعون اس کو اٹھائے گا۔ اور چونکہ دونوں کی دشمنی مختلف تھی، اللہ کی دشمنی: اللہ کا انکار تھی۔ اور نومولود بچے کی دشمنی: اس کے قتل کے درپے ہونا تھی: اس لئے عَدُوٌّ مکرر لایا گیا ـــــ موسیٰ علیہ السلام کی ماں نے وہی کیا جو اللہ نے ان کے دل میں ڈالا تھا۔ مگر دل سخت بے چین تھا۔ انھوں نے موسیٰ علیہ السلام کی بڑی بہن سے کہا: تو دریا کے کنارے کنارے دیکھتی جا، صندوق کا کیا حشر ہوتا ہے؟ ـــــ صندوق بہتا ہوا دریا کی اس شاخ میں داخل ہوا جو فرعون کے محل میں جارہی تھی۔ وہاں فرعون کے خاندان کی کسی عورت نے صندوق پانی سے نکال لیا۔ اس کا خیال تھا کہ اس میں مال ہوگا۔ اس نے صندوق رانی کے سامنے پیش کیا۔ جب کھولا گیا تو اس میں پھول سا بچہ تھا۔ اور اس کی صورت ایسی موہنی تھی کہ جو دیکھتا اس کو پیار آتا۔ ارشاد پاک ہے: ـــــ اور میں نے آپ پر اپنی طرف سے محبت ڈالی ـــــ اپنی طرف سے یعنی خاص محبت۔ ہر بچہ پیارا ہوتا ہے، اگرچہ جانور کا بچہ ہو۔ مگر موسیٰ علیہ السلام کی شان ہی نرالی تھی، وہ محبتِ خاص کا اثر تھی ـــــ جب رانی نے بچہ فرعون کے سامنے پیش کیا تو اس کو پیار کئے بنا نہ بن پڑی۔ ظاہر تھا کہ یہ اسرائیلی بچہ تھا۔ ماں نے اپنی آنکھوں کے سامنے قتل ہونا گوارہ نہ کیا، اس لئے دریا کی موجوں کے حوالے کردیا۔ رانی نے عرض کیا: ''کیسا پیارا بچہ ہے۔ ہم کیوں نہ اس کو پالیں۔ ہماری اولاد نہیں ہے، اگر آگے بھی نہ ہوئی تو ہم اسی کو بیٹا بنالیں گے۔ اور بیٹا بن جانے کے بعد اس کے ہاتھ سے حکومت کے زوال کا خطرہ خود بخود ٹل جائے گا۔ اور اگر ہماری اولاد ہوگئی تو بھی یہ بچہ ہمیں نفع پہنچائے گا۔ جب ہمارے گھر میں پلے گا تو ہمارا رنگ اس پر چڑھے گا، اور اس سے نفع ہی پہنچے گا'' ـــــ فرعون نے بادلِ ناخواستہ اس کی بات منظور کرلی، اور قتل سے دست بردار ہوگیا۔ دوسرے بچے تو پھر بھی قتل ہوتے رہے۔ مگر جس بچے کو بچانا منظور تھا: وہ بچالیا گیا۔ حق تعالیٰ کی عجیب قدرت کا ظہور ہوا۔ ارشاد پاک ہے: ـــــ اور تاکہ آپ کی ہماری آنکھ کے سامنے پرورش کی جائے ـــــ سچ ہے: ''جسے خدا رکھے اسے کون چکھے!'' پولس کی نظر اب اس بچے تک کیسے پہنچ سکتی ہے! اب یہ بچہ انتظامِ خداوندی میں آگیا ہے۔ اب اس کا کوئی بال بیکا نہیں کرسکتا۔

اور وہ بات جو پہلے ہی اللہ تعالیٰ نے موسیٰ علیہ السلام کی ماں کے دل میں ڈالی تھی کہ وہ بےفکر بچے کو دریا کی موجوں کے حوالے کردیں، بچہ بہرحال ان کی طرف لوٹایا جائے گا، یہ بات اس طرح پوری ہوئی کہ جب بچے کو پالنے کی فرعون نے اجازت دیدی تو انّا (دودھ پلانے والی عورت) کی تلاش شروع ہوئی۔ اُدھر مشیتِ ایزدی نے یہ انتظام کردیا کہ بچہ کسی عورت کا دودھ نہیں پیتا تھا۔ بہت سی انائیں آئیں اور گئیں، مگر کامیابی نہ ہوئی۔ اس طرح اللہ تعالیٰ نے کافر عورتوں کے دودھ سے آپ کو بچالیا۔ موسیٰ علیہ السلام کی بہن جو تاک میں لگی ہوئی تھی اور شاہی محل کے دروازے پر کھڑی تھی،

بولی کہ میں ایک عورت کو لاسکتی ہوں۔ مجھے امید ہے کہ وہ کسی طرح دودھ پلا کر بچے کو پال سکے گی۔ حکم ہوا بلاؤ، وہ اپنی ماں کو لے آئیں، چھاتی سے لگاتے ہی بچہ نے دودھ پینا شروع کر دیا۔ محل میں بڑی خوشیاں منائی جانے لگیں۔ موسیٰ علیہ السلام کی والدہ نے کہا: میں یہاں نہیں رہ سکتی، میرے اور بھی بچے ہیں۔ پس اجازت دو کہ اس بچہ کو اپنے گھر لے جاؤں، اور پوری حفاظت سے اس کی پرورش کروں۔ اجازت مل گئی، اور وہ فرعون کی طرف سے بطور دایہ بچے کی پرورش پر مامور ہوگئیں۔ اور بچے کو اپنے گھر لے آئیں۔ اس طرح موسیٰ علیہ السلام کی پرورش شاہانہ اعزاز و اکرام کے ساتھ شروع ہوگئی۔ ارشاد پاک ہے: —— جب آپ کی بہن چلنے لگی، پس کہنے لگی: ''کیا میں آپ لوگوں کو ایسی عورت بتاؤں جو اس کو پالے پوسے؟ پس ہم نے آپ کو آپ کی ماں کی طرف لوٹا دیا، تاکہ ان کی آنکھ ٹھنڈی رہے، اور وہ غم نہ کھائے —— یعنی ہر وقت آپ ان کی نگاہوں کے سامنے رہیں۔ پل بھر کے لئے اوجھل نہ ہوں۔ اگر آپ محل میں رہتے، اور وقت پر جا کر آپ کی والدہ آپ کو دودھ پلا آتیں، تو دوسرے وقت مغموم اور بے چین رہتیں، اس لئے قدرت نے ایسا انتظام کر دیا کہ ہر بے کلی دور ہوگئی۔

پھر ایک اور واقعہ بطور تمہید و امتنان ذکر کیا جاتا ہے۔ ارشاد ہے: —— اور آپ نے ایک شخص کو مار ڈالا، پس ہم نے آپ کو اس غم سے نجات بخشی، اور ہم نے آپ کو خوب آزمایا پس ٹھیرے آپ سالوں مدین والوں میں، پھر آئے آپ ازلی فیصلہ کے مطابق اے موسیٰ! —— یعنی جب موسیٰ علیہ السلام جوان ہوئے تو آپ کے ہاتھ سے ایک قبطی مارا گیا۔ جس کا واقعہ تفصیل سے سورۂ قصص میں آئے گا۔ موسیٰ علیہ السلام کو اس قتل سے بڑی فکر لاحق ہوئی۔ اللہ تعالیٰ نے آپ کو اس پریشانی سے اس طرح بچایا کہ آپ نے مدین کی طرف ہجرت کی، اور فرعون کی قلم رو سے نکل گئے۔ وہاں آپ ایک نیک بندے کے گھر پہنچ گئے۔ اور عرصہ تک وہاں مقیم رہے، ان کی بکریاں چرائیں اور ان کی بیٹی سے نکاح کیا۔ اس طرح اللہ تعالیٰ نے خوب آزما کر ان کو کارِ نبوت کے لئے تیار کیا —— شاہی محلوں اور ناز و نعم میں پلنے والے بہت کم باکمال ہوتے ہیں۔ خاص طور پر عوامی اصلاح کا کام جن لوگوں کے سپرد کیا جاتا ہے: ان سے بکریاں ضرور چروائی جاتی ہیں —— پھر جب مدین سے آپ اہل و عیال کے ساتھ مصر کی طرف چلے تو راستہ بھول کر تقدیرِ الٰہی سے کوہِ طور پر آگ لینے کے لئے پہنچے، اور اللہ تعالیٰ کی ہم کلامی سے مشرف ہوئے۔

فائدہ: وحی کے لغوی معنی ہیں: چپکے سے اشارہ کرنا، جس کو صرف مخاطب سمجھے، اور کوئی اس پر مطلع نہ ہو۔ پھر وحی کی متعدد صورتیں ہیں: ایک: کوئی بات فطرت میں شامل کر دینا۔ جیسے اللہ تعالیٰ نے شہد کی مکھیوں کی فطرت میں یہ بات رکھ دی ہے کہ وہ پہاڑوں میں، درختوں میں اور عمارتوں میں چھتے بنائے، پھر ہر قسم کے پھلوں اور پھولوں کو چوسے اور شہد تیار

کرے (سورۃ النحل آیت ۶۸) دوسری صورت: یہ ہے کہ فرشتہ ظاہر ہو، اور اللہ کی طرف سے کوئی پیغام پہنچائے۔ جیسے حضرت مریم رضی اللہ عنہا کے سامنے فرشتہ ظاہر ہوا، اور حکم خداوندی پہنچایا۔ تیسری صورت: یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ بلاواسطہ کوئی خیر کی بات دل میں ڈالیں۔ اسی کو "الہام" کہتے ہیں۔ چوتھی صورت: انبیائے کرام کی طرف بھیجی جانے والی وحی ہے۔ پھر اس کی بھی متعدد صورتیں ہیں —— حضرت موسیٰ علیہ السلام کی والدہ کی طرف جو وحی بھیجی گئی تھی: اس کی کیا صورت تھی؟ وہ وحی نبوت تو یقیناً نہیں تھی، کیونکہ کوئی عورت کبھی نبی نہیں بنائی گئی۔ اور فطری وحی بھی نہیں تھی۔ باقی دو صورتوں میں سے کونسی صورت تھی اس کا قطعی فیصلہ مشکل ہے۔ ممکن ہے فرشتہ ظاہر ہوا ہو، اور پیامِ خداوندی پہنچا گیا ہو، اور ممکن ہے اللہ تعالیٰ نے بات دل میں ڈالی ہو۔ قرآنی اشاروں سے یہ آخری صورت راجح معلوم ہوتی ہے۔ کیونکہ بچے کو دریا کے حوالے کرنے کے بعد موسیٰ علیہ السلام کی والدہ سخت بے چین ہوگئی تھیں۔ اگر فرشتہ نے ظاہر ہوکر بات کہی ہوتی تو اس بے چینی کے کوئی معنی نہیں تھے۔ مؤمن کو اللہ کے وعدوں پر یقین ہوتا ہے۔ ہاں محض الہام ہوا اور وجدان سے بات جانی گئی ہو تو بے چینی معقول ہے۔ واللہ اعلم۔

وَاصْطَنَعْتُكَ لِنَفْسِيْ ﴿۴۱﴾ اِذْهَبْ اَنْتَ وَاَخُوْكَ بِاٰيٰتِيْ وَلَا تَنِيَا فِيْ ذِكْرِيْ ﴿۴۲﴾ اِذْهَبَآ اِلٰى فِرْعَوْنَ اِنَّهٗ طَغٰى ﴿۴۳﴾ فَقُوْلَا لَهٗ قَوْلًا لَّيِّنًا لَّعَلَّهٗ يَتَذَكَّرُ اَوْ يَخْشٰى ﴿۴۴﴾ قَالَا رَبَّنَآ اِنَّنَا نَخَافُ اَنْ يَّفْرُطَ عَلَيْنَآ اَوْ اَنْ يَّطْغٰى ﴿۴۵﴾ قَالَ لَا تَخَافَآ اِنَّنِيْ مَعَكُمَآ اَسْمَعُ وَاَرٰى ﴿۴۶﴾ فَاْتِيٰهُ فَقُوْلَآ اِنَّا رَسُوْلَا رَبِّكَ فَاَرْسِلْ مَعَنَا بَنِيْٓ اِسْرَآءِيْلَ ۙ وَلَا تُعَذِّبْهُمْ ۭ قَدْ جِئْنٰكَ بِاٰيَةٍ مِّنْ رَّبِّكَ ۭ وَالسَّلٰمُ عَلٰي مَنِ اتَّبَعَ الْهُدٰى ﴿۴۷﴾ اِنَّا قَدْ اُوْحِيَ اِلَيْنَآ اَنَّ الْعَذَابَ عَلٰي مَنْ كَذَّبَ وَتَوَلّٰى ﴿۴۸﴾

وَاصْطَنَعْتُكَ(۱)	اور بنایا میں نے تم کو	اَنْتَ	آپ	وَلَا تَنِيَا(۲)	اور سستی نہ کرو دونوں
لِنَفْسِيْ	اپنے لئے	وَاَخُوْكَ	اور آپ کا بھائی	فِيْ ذِكْرِيْ	میری یاد میں
اِذْهَبْ	جایئے	بِاٰيٰتِيْ	میری نشانیوں کے ساتھ	اِذْهَبَآ	جاؤ دونوں

(۱) اِصْطِنَاع: باب افتعال: کسی چیز کو بہت عمدہ اور درست بنانا۔ (۲) لَاتَنِيَا: فعل نہی، صیغہ تثنیہ مذکر حاضر: وَنَى يَنِيْ وَنْيًا: سستی کرنا۔

اِلٰی فِرْعَوْنَ	فرعون کی طرف	اَوْ	یا	قَدْ	تحقیق
اِنَّهٗ	بیشک اس نے	اَنْ	یہ کہ	جِئْنٰكَ	آئے ہیں ہم تیرے پاس
طَغٰی [۱]	سرکشی کی ہے	يَّطْغٰی	حد سے بڑھے وہ	بِاٰيَةٍ	بڑی نشانی کے ساتھ
فَقُوْلَا	پس کہو دونوں	قَالَ	فرمایا	مِّنْ رَّبِّكَ	تیرے پروردگار کی
لَهٗ	اس سے	لَا تَخَافَا	نہ ڈرو دونوں		طرف سے
قَوْلًا	بات	اِنَّنِیْ	بیشک میں	وَالسَّلٰمُ	اور سلامتی
لَّيِّنًا	نرم	مَعَكُمَا	تم دونوں کیساتھ ہوں	عَلٰى مَنِ	اس پر ہو جو
لَّعَلَّهٗ	شاید وہ	اَسْمَعُ	سنتا ہوں	اتَّبَعَ	پیروی کرے
يَتَذَكَّرُ	نصیحت پذیر ہو	وَاَرٰی	اور دیکھتا ہوں	الْهُدٰی	سیدھی راہ کی
اَوْ	یا	فَاْتِيٰهُ	پس جاؤ تم دونوں اس	اِنَّا	بیشک ہم
يَخْشٰی	ڈرے		کے پاس	قَدْ	تحقیق
قَالَا	عرض کیا دونوں نے	فَقُوْلَآ	پس کہو دونوں	اُوْحِيَ	وحی کی گئی ہے
رَبَّنَآ	(اے) ہمارے پروردگار!	اِنَّا رَسُوْلَا	بیشک ہم دونوں رسول ہیں	اِلَيْنَآ	ہماری طرف
اِنَّنَا	بیشک ہم	رَبِّكَ	تیرے پروردگار کے	اَنَّ	کہ
نَخَافُ	ڈرتے ہیں	فَاَرْسِلْ	سو بھیج تو	الْعَذَابَ	عذاب
اَنْ	(اس سے) کہ	مَعَنَا	ہمارے ساتھ	عَلٰى مَنْ	اس پر ہے جس نے
يَّفْرُطَ [۲]	جلدی کرے وہ	بَنِیْٓ اِسْرَآءِيْلَ	بنی اسرائیل کو	كَذَّبَ	جھٹلایا
عَلَيْنَآ	ہم پر	وَلَا تُعَذِّبْهُمْ	اور مت تکلیف پہنچا انکو	وَتَوَلّٰی	اور روگردانی کی

گذشتہ آیات میں تمہید بیان کرنے کے بعد ارشاد ہے ـــــ اور میں نے آپ کو خاص اپنے (کام کے) لئے بنایا ہے ـــــ یعنی نبوت کے لئے تیار کیا ہے ـــــ جایئے آپ اور آپ کے بھائی (ہارون) میری نشانیوں (عصا اور ید بیضاء) کے ساتھ، اور دونوں میری یاد میں سستی نہ کرنا ـــــ موسیٰ علیہ السلام نے اپنی دعا میں عرض کیا تھا: ''تاکہ ہم آپ کی خوب پاکی بیان کریں، اور آپ کا بکثرت ذکر کریں'' یہی بات ان کو یاد دلائی گئی ہے کہ تمام احوال و اوقات میں عموماً،

(۱) طَغَى يَطْغٰى طُغْيَانًا: حد مقبول سے بڑھنا، ظلم و زیادتی کرنا۔ سرکشی کرنا۔ (۲) فَرَطَ (ن) فَرْطًا: جلدی کرنا (سزا دینے میں)

اور دعوت وتبلیغ کے وقت خصوصاً: مجھے بکثرت یاد کرنا۔ کیونکہ اہل ایمان کی کامیابی اللہ کی یاد میں پوشیدہ ہے۔ اور دعوت وتبلیغ میں برکت اللہ کی یاد ہی سے ہوتی ہے آگے ارشاد ہے: ـــــ تم دونوں فرعون کے پاس جاؤ، اس نے یقیناً سرکشی کی ہے ـــــ ظلم پر کمر باندھ رکھی ہے، بنی اسرائیل پر قہر ڈھا رہا ہے۔ اور بندہ ہوتے ہوئے خدا بنا بیٹھا ہے ـــــ پس تم دونوں اس سے نرم بات کہنا، شاید وہ نصیحت قبول کرے ـــــ اور ایمان لے آئے ـــــ یا ڈرے ـــــ اور ظلم سے باز آجائے ـــــ دعوت وتبلیغ کا اہم اصول یہ ہے کہ مخاطب خواہ کتنا ہی سرکش ہو، یا غلط عقائد اور فاسد اعمال کا مرتکب ہو: اصلاح وہدایت کا فریضہ انجام دینے والے پر لازم ہے کہ وہ اس کے ساتھ نرم رویہ اختیار کرے، اور نرمی سے بات کرے۔ اس کا فائدہ یہ ہوتا ہے کہ وہ بات قبول کرتا ہے، یا کچھ نہ کچھ غور وفکر پر مجبور ہوتا ہے۔

دونوں نے عرض کیا: اے ہمارے پروردگار! ہم اس بات سے ڈرتے ہیں کہ وہ ہم پر بھبک پڑے ـــــ یعنی مشتعل ہوجائے، اور ہماری بات نہ سنے ـــــ یا وہ حد سے نکل جائے ـــــ یعنی ہم پر ہاتھ اٹھادے ـــــ فرمایا: ''تم دونوں مت ڈرو، میں یقیناً تمہارے ساتھ ہوں: سن رہا ہوں اور دیکھ رہا ہوں!'' ـــــ اس معیت (ساتھ ہونے) کی حقیقت اللہ تعالیٰ ہی بہتر جانتے ہیں۔ انسان اس کا پوری طرح ادراک نہیں کرسکتا۔ البتہ مدعیٰ یعنی نصرت وامداد واضح بات ہے۔

فائدہ: خوف کی چیزوں سے طبعی خوف: انبیاء علیہم السلام کی سنت ہے۔ جو اللہ کے وعدوں پر پورا یقین ہونے کے باوجود ہوتا ہے۔ غزوۂ بدر میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی بے کلی اسی وجہ سے تھی۔ اور غزوۂ احزاب میں خندق کی تیاری اسی سبب سے تھی۔ غرض طبعی خوف: جو انبیاء میں بشریت کے تقاضے سے ہوتا ہے: وہ اللہ کے وعدوں پر یقین کے منافی نہیں۔

آگے ارشاد ہے: ـــــ تم دونوں اس کے پاس جاؤ، اور کہو: ''ہم یقیناً تیرے رب کے رسول ہیں'' ـــــ تیرے پروردگار نے ہمیں تیری طرف بھیجا ہے، تاکہ تو اُن پر ایمان لائے اور اُن کا حق پہچانے ـــــ پس تو ہمارے ساتھ بنی اسرائیل کو بھیج دے ـــــ تاکہ ہم ان کو ان کے وطن کنعان لے جائیں ـــــ اور تو ان کو سزا مت دے ـــــ ان کو قید میں رکھنا اور ان سے بیگار لینا، اور ان کے لڑکوں کو قتل کرنا: وہ سزائیں تھیں جن سے رستگاری کا مطالبہ کیا گیا تھا۔ مطالبہ یہ تھا کہ بنی اسرائیل کو ان کے وطن کنعان واپس جانے کی اجازت دیدے، تاکہ وہ آزادانہ اللہ کی عبادت کریں۔

حضرت موسیٰ اور حضرت ہارون علیہما السلام اللہ کی ہدایت کے مطابق فرعون کے پاس پہنچے اور اس سے تین باتیں کہیں:

پہلی بات: ـــــ ہم یقیناً تیرے پاس تیرے پروردگار کی طرف سے نشانی لے کر آئے ہیں ـــــ یعنی ہمارا

دعوی رسالت بے دلیل نہیں۔ جس طرح حکومت کا ہر نمائندہ اپنے ساتھ اپنی سندات رکھتا ہے، ہم بھی اپنی صداقت پر خدائی نشانی لے کر آئے ہیں۔ ان کا اشارہ ان دو معجزات (عصا اور ید بیضاء) کی طرف تھا جو اللہ تعالیٰ نے موسیٰ علیہ السلام کو منصبِ رسالت کے ساتھ ہی عنایت فرمائے تھے۔

دوسری بات: ـــــ اور اس پر سلامتی ہو جو سیدھی راہ کی پیروی کرے ـــــ یعنی جو اللہ کے رسول کی بات مان کر سیدھی راہ چلے: اس کے لئے دونوں جہاں میں سلامتی ہے ـــــ یہ صاحب سلامت کی۔ جب بادشاہ کے دربار میں گئے تو اس کو سلام کرنا ضروری تھا۔ سو کیا اور اس طرح کیا کہ نہ سانپ بچے نہ لاٹھی ٹوٹے! کیونکہ سلامتی کی دعا ایک عظیم تحفہ ہے۔ خاص طور پر نبی کی طرف سے، جس کا کافر ہرگز مستحق نہیں۔ مگر مجبوری تھی اس لئے سلام کا وہ طریقہ اختیار کیا جس میں اسلام کی شرط تھی۔ پس اگر فرعون ہدایت قبول کرلے تو اس پر ہزاروں سلام! ورنہ محروم!

تیسری بات: ـــــ ہماری طرف بالیقین یہ وحی کی گئی ہے کہ عذاب اس شخص پر ہے جس نے جھٹلایا اور روگردانی کی ـــــ یہ نرم بات کہنے کا جو حکم ملا تھا اس کی تعمیل ہے۔ آپ نے براہ راست فرعون کو گمراہ نہ کہا، نہ یہ کہا کہ تجھے عذاب ہوگا۔ بلکہ ایک قاعدہ کلیہ بیان کیا کہ قانونِ خداوندی یہ ہے کہ جو تکذیب و اعراض کرے گا: اس کے لئے عذاب یقینی ہے۔ پس فرعون اپنا انجام خود سوچ لے۔

اللہ کا دین دارین کی بہتری کا ضامن ہے، پس لوگ اس کی قدر کریں

قَالَ فَمَنْ رَّبُّكُمَا يٰمُوْسٰى ﴿۴۹﴾ قَالَ رَبُّنَا الَّذِيْٓ اَعْطٰى كُلَّ شَيْءٍ خَلْقَهٗ ثُمَّ هَدٰى ﴿۵۰﴾ قَالَ فَمَا بَالُ الْقُرُوْنِ الْاُوْلٰى ﴿۵۱﴾ قَالَ عِلْمُهَا عِنْدَ رَبِّيْ فِيْ كِتٰبٍ ۚ لَا يَضِلُّ رَبِّيْ وَلَا يَنْسَى ﴿۵۲﴾ الَّذِيْ جَعَلَ لَكُمُ الْاَرْضَ مَهْدًا وَّسَلَكَ لَكُمْ فِيْهَا سُبُلًا وَّاَنْزَلَ مِنَ السَّمَآءِ مَآءً ۭ فَاَخْرَجْنَا بِهٖٓ اَزْوَاجًا مِّنْ نَّبَاتٍ شَتّٰى ﴿۵۳﴾ كُلُوْا وَارْعَوْا اَنْعَامَكُمْ ۭ اِنَّ فِيْ ذٰلِكَ لَاٰيٰتٍ لِّاُولِي النُّهٰى ﴿۵۴﴾ۧ مِنْهَا خَلَقْنٰكُمْ وَفِيْهَا نُعِيْدُكُمْ وَمِنْهَا نُخْرِجُكُمْ تَارَةً اُخْرٰى ﴿۵۵﴾

ع ۲۰ | ۱۱

قَالَ	کہا فرعون نے	يٰمُوْسٰى	اے موسیٰ؟	الَّذِيْٓ	جس نے
فَمَنْ	پس کون ہے	قَالَ	کہا موسیٰ نے	اَعْطٰى	عطا فرمائی
رَّبُّكُمَا	تم دونوں کا رب	رَبُّنَا	ہمارا رب:	كُلَّ شَيْءٍ	ہر چیز کو

خَلْقَهٗ (۱)	اس کی بناوٹ	الَّذِیْٓ (۲)	(وہ) جس نے	مِّنْ نَّبَاتٍ	سبزے کی
ثُمَّ	پھر	جَعَلَ	بنایا	شَتّٰى	مختلف
هَدٰى	راہ دکھائی	لَكُمُ	تمہارے لئے	كُلُوْا	کھاؤ تم
قَالَ	کہا فرعون نے	الْاَرْضَ	زمین کو	وَارْعَوْا (۴)	اور چراؤ تم
فَمَا	پس کیا	مَهْدًا	بچھونا	اَنْعَامَكُمْ	اپنے مواشی کو
بَالُ	حال ہے	وَّسَلَكَ	اور چلائے	اِنَّ فِیْ ذٰلِكَ	بیشک اُس میں
الْقُرُوْنِ	صدیوں	لَكُمْ	تمہارے لئے	لَاٰيٰتٍ	البتہ نشانیاں ہیں
الْاُوْلٰى	گذشتہ (کا)	فِیْهَا	اس میں	لِّاُولِی النُّهٰى (۵)	عقل والوں کے لئے
قَالَ	کہا موسیٰ نے	سُبُلًا	راستے	مِنْهَا	اس (زمین) سے
عِلْمُهَا	ان کا علم	وَّاَنْزَلَ	اور اتارا	خَلَقْنٰكُمْ	ہم نے تم کو پیدا کیا
عِنْدَ رَبِّیْ	میرے رب کے پاس ہیں	مِنَ السَّمَآءِ	آسمان سے	وَفِیْهَا	اور اس میں
فِیْ كِتٰبٍ	ایک نوشتہ میں	مَآءً	پانی	نُعِیْدُكُمْ	ہم تم کو لوٹائیں گے
لَا يَضِلُّ	نہیں بچلتا	فَاَخْرَجْنَا	پس نکالی ہم نے	وَمِنْهَا	اور اس سے
رَبِّیْ	میرا رب	بِهٖٓ	اس کے ذریعہ	نُخْرِجُكُمْ	ہم تم کو نکالیں گے
وَلَا يَنْسَى	اور نہیں بھولتا	اَزْوَاجًا (۳)	اقسام	تَارَةً اُخْرٰى	ایک بار اور

جب موسیٰ اور ہارون علیہما السلام فرعون کے پاس پہنچے، اور مذکورہ تین باتیں اس سے کہیں تو ——— فرعون نے کہا: تم دونوں کا پروردگار کون ہے، اے موسیٰ؟ ——— جس پر ایمان لانے کی تم مجھے دعوت دے رہے ہو، اور روگردانی کی صورت میں جس کے عذاب سے تم مجھے ڈرا رہے ہو ——— موسیٰ نے جواب دیا: ہمارا پروردگار وہ ہے جس نے ہر چیز کو اس کی بناوٹ دی، پھر اس کو راہ دکھائی ——— یعنی پہلے ہر چیز کو وجود بخشا اور اس کی صورت بنائی، پھر ہر چیز کے بقاء

(۱) خَلْق: بناوٹ، ساخت، صورت۔ اصل معنی: صحیح اندازہ ٹھہرانا۔ باب نصر کا مصدر ہے۔ (۲) الذی: مبتدا محذوف ھو کی خبر ہے (۳) أزواج: زوج کی جمع ہے: جوڑا، قرین، قسم۔ حیوانات میں نر و مادہ کو زوجین کہتے ہیں، اور غیر حیوانات میں قرین و مماثل کو زوج کہتے ہیں۔ یہاں انواع و اقسام مراد ہیں۔ (۴) اِرْعَوْا: فعل امر، صیغہ جمع مذکر حاضر، مصدر رَعْیٌ: چرانا۔ (۵) النُّھی: النُّھْیَةُ کی جمع: بری باتوں سے روکنے والی عقل۔

کا سامان کیا۔ اور ہر مخلوق کو اس سامان کے استعمال کی راہ سجھائی۔ اس کی تفصیل آگے آرہی ہے ـــــ غور کریں! ولادت کے ساتھ ہی ماں کی چھاتی سے دودھ کی دو نہریں کون جاری کرتا ہے؟ پھر چھاتی سے دودھ چوسنے اور اس کو نگلنے کا ہنر بچہ کو کون سکھاتا ہے؟ نیز بچے کو رونا کس نے سکھایا ہے، جس سے وہ اپنی ہر ضرورت پوری کرتا ہے؟ یہ سب پروردگارِ عالم کی کرشمہ سازی ہے۔ جو اس کے وجود و وحدانیت کی محکم دلیل ہے۔

مگر فرعون کو ماننا کب تھا۔ اسے تو موسیٰ علیہ السلام کو لاجواب کرنا تھا۔ اور اپنے ریوڑ کو سنبھالنا تھا۔ چنانچہ اس نے ایک اور سوال کیا ـــــ اس نے کہا: ''پس گذشتہ قرنوں کا کیا حال ہے؟'' ـــــ یعنی وہ لوگ ناجی ہیں یا ناری؟ یہ ایک ایسا سوال تھا کہ اگر اس کا مبنی بر حقیقت جواب دیا جاتا فرعون لوگوں کو بھڑکا تا کہ دیکھو! یہ تمہارے باپ دادوں کو گمراہ بتلا رہا ہے۔ موسیٰ علیہ السلام اس کی چال سمجھ گئے، اور ایسا جواب دیا کہ اس کا منصوبہ خاک میں مل گیا ـــــ موسیٰ نے جواب دیا: ''ان کا علم میرے پروردگار کے پاس ایک نوشتہ (لوح محفوظ یا نامۂ اعمال) میں ہے: میرا پروردگار نہ بچلتا ہے، نہ بھولتا ہے'' ـــــ یعنی مجھے ان لوگوں کا حال معلوم نہیں۔ البتہ یہ بات یقینی ہے کہ میرا پروردگار ان کے احوال سے پوری طرح باخبر ہے۔ اور صرف باخبر ہی نہیں، وہ سارے احوال ایک نوشتہ میں لکھ بھی رکھے ہیں۔ پس ان کے ساتھ وہی معاملہ کیا جائے گا جس کے وہ مستحق ہیں۔ وہاں نہ غلطی کا احتمال ہے نہ بھول کا امکان! میرے اور آپ کے لئے بس اتنا جاننا کافی ہے۔

موسیٰ علیہ السلام نے پہلے سوال کے جواب میں مختصر مگر جامع بات کہی تھی کہ ہمارا پروردگار وہ ہے جس نے ہر چیز کی صورت بنائی، پھر اس کو زندگی کی راہ دکھائی۔ اب پروردگارِ عالم اس کی کچھ تفصیل بیان فرماتے ہیں کہ رب وہ ہے ـــــ جس نے تمہارے لئے زمین کو فرش بنایا ـــــ جس پر تم آرام کرتے ہو، زمین ایسی ٹھوس اور ہموار چیز ہے جس پر تم چل سکتے ہو، بیٹھ سکتے ہو، لیٹ سکتے ہو، کوئی کُھردری یا پلپلی چیز نہیں جس پر بیٹھنا، چلنا قدم رکھنا ناممکن ہو ـــــ اور تمہارے لئے اس میں راہیں نکالیں ـــــ خشکی اور تری میں، فضاؤں اور پہاڑوں میں آمد و رفت کی راہیں بنائیں، تاکہ تم ایک جگہ سے چل کر دوسری جگہ پہنچ سکو، اور زمین کی سب نعمتوں سے فائدہ اٹھا سکو ـــــ اور آسمان سے پانی برسایا، پس اس کے ذریعہ مختلف قسم کی نباتات اُگائیں ـــــ سبزیاں، غلّے اور پھول پھل پیدا کئے۔ اور نباتات کی بے شمار قسمیں پیدا کیں، جن کا احاطہ کوئی انسان نہیں کرسکتا ـــــ کھاؤ اور اپنے مویشی چراؤ ـــــ یعنی نباتات کی یہ مختلف قسمیں انسان اور اس کے پالتو جانوروں کے لئے ہیں۔ ان سے بلاواسطہ اور بالواسطہ انسان فائدہ اٹھاتا ہے۔ مواشی ان کو کھا کر پلتے بڑھتے ہیں جن سے انسان متمتع ہوتا ہے ـــــ اُس میں یقیناً عقل

والوں کے لئے نشانیاں ہیں ـــــ یعنی اللہ کی ربوبیت کی واضح علامات ہیں۔انسان کو عدم سے وجود میں لانا، پھر اس کی بقاء وترقی کا سامان کرنا، زمین کو قابل رہائش بنانا، اس میں راہیں نکالنا، آسمان سے پانی برسانا، اس سے پھل پھول اور گھاس پیدا کرنا: اللہ تعالیٰ کے سوا کس کا کام ہے؟ کسی کی ان میں سے کسی چیز میں حصہ داری نہیں۔پس معمولی عقل رکھنے والا آدمی بھی سمجھ سکتا ہے کہ وہی عبادت واطاعت کے لائق ہیں۔اور اس سے بڑا کوئی ظلم نہیں کہ اس کو چھوڑ کر دوسروں کی چوکھٹوں پر جبّہ سائی کی جائے۔

غافل انسان یہ خیال کرتا ہے کہ اسے بارگاہِ خداوندی میں حاضر نہیں ہونا۔حالانکہ حاضر ہونا ہے اور ضرور ہونا ہے۔ارشاد پاک ہے: ـــــ ہم نے تم کو زمین سے پیدا کیا ـــــ انسانوں کے باپ آدم علیہ السلام مٹی سے پیدا کئے گئے، پھر ان کی اولاد نطفہ سے پیدا کی۔نطفہ خون سے بنتا ہے۔خون غذاؤں سے پیدا ہوتا ہے، اور غذائیں جن سے آدمی کا بدن پرورش پاتا ہے: مٹی سے نکلتی ہیں۔اس طرح ہر انسان مٹی سے پیدا کیا گیا ہے۔سورۃ المؤمنون آیت ۱۲ میں ارشاد پاک ہے: ﴿وَلَقَدْ خَلَقْنَا الإِنْسَانَ مِنْ سُلَالَةٍ مِنْ طِيْنٍ﴾ واقعہ یہ ہے کہ ہم نے انسان کو مٹی کے سَت (جوہر) سے پیدا کیا ـــــ اور ہم تم کو اس میں لوٹائیں گے ـــــ موت کے بعد انسان بہر صورت مٹی میں ملایا جاتا ہے۔خواہ دفن کیا جائے، خواہ جلایا جائے، خواہ کوئی جانور اس کو کھا جائے، جلد یا بدیر مٹی میں مل جاتا ہے ـــــ اور ہم تم کو اس سے دوبارہ نکالیں گے ـــــ یعنی قیامت کے دن اُن اجزاء کو جو مٹی میں موجود ہیں جمع کر کے از سر نو زندہ کر دیں گے۔ پھر سب کو میدانِ حشر میں جمع کیا جائے گا۔اور اللہ تعالیٰ کے روبرو پیش کیا جائے گا۔اور تم سے تمہارے اعمال کی باز پرس ہوگی، پس تمہیں ایسے کام نہ کرنے چاہئیں جس کی تمہیں سزا بھگتنی پڑے۔

یہ آیت منکرین قیامت کے شبہ کا جواب بھی ہے۔دوسری زندگی کا انکار کرنے والے کہتے ہیں کہ جب ہم مٹی میں رَل مل جائیں گے تو کیسے دوبارہ زندہ ہونگے؟ جواب یہ ہے کہ پہلے بھی تو تم مٹی میں ملے ہوئے تھے، پھر کیسے زندہ ہوگئے؟ پس جس طرح پہلی مرتبہ اللہ تعالیٰ نے تم کو مٹی سے پیدا کیا، اسی طرح مرنے کے بعد اور مٹی میں مل جانے کے بعد پھر زندہ کر دیں گے۔

فائدہ: مسند احمد (۵:۲۵۴) اور مستدرک حاکم (۲:۳۷۹ کتاب التفسیر) میں حضرت ابوامامہ رضی اللہ عنہ سے ضعیف روایت میں مروی ہے کہ جب رسول اللہ ﷺ کی صاحبزادی حضرت ام کلثوم رضی اللہ عنہا کی میت قبر میں رکھی گئی تو رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ﴿مِنْهَا خَلَقْنَاكُم، وَفِيْهَانُعِيْدُكُمْ، وَمِنْهَانُخْرِجُكُمْ تَارَةً أُخْرٰى﴾ اور ابن ماجہ میں حدیث (نمبر ۱۵۶۵) ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے ایک جنازہ پڑھایا، پھر میت کی قبر پر آئے، اور سر کی جانب سے اس پر تین

مٹھیاں مٹی ڈالی۔اس حدیثوں کی تعمیل میں میت کو قبر میں اتارتے وقت یا مٹی ڈالتے وقت یہ آیت پڑھنے کا معمول ہے۔

جولوگ قیامت کے دن زندہ ہونے کا انکار کرتے ہیں وہ سوچیں کہ پہلی مرتبہ وہ کیسے زندہ ہوئے ہیں؟

وَلَقَدْ اَرَيْنٰهُ اٰيٰتِنَا كُلَّهَا فَكَذَّبَ وَاَبٰى ﴿۵۶﴾ قَالَ اَجِئْتَنَا لِتُخْرِجَنَا مِنْ اَرْضِنَا بِسِحْرِكَ يٰمُوْسٰى ﴿۵۷﴾ فَلَنَاْتِيَنَّكَ بِسِحْرٍ مِّثْلِهٖ فَاجْعَلْ بَيْنَنَا وَبَيْنَكَ مَوْعِدًا لَّا نُخْلِفُهٗ نَحْنُ وَلَآ اَنْتَ مَكَانًا سُوًى ﴿۵۸﴾ قَالَ مَوْعِدُكُمْ يَوْمُ الزِّيْنَةِ وَاَنْ يُّحْشَرَ النَّاسُ ضُحًى ﴿۵۹﴾

وَلَقَدْ	اور البتہ تحقیق	مِنْ اَرْضِنَا	ہماری زمین سے	وَ بَيْنَكَ	اور اپنے درمیان
اَرَيْنٰهُ (۱)	دکھائی ہم نے اس کو	بِسِحْرِكَ	اپنے جادو کے ذریعہ	مَوْعِدًا (۳)	ایک وعدہ
اٰيٰتِنَا	ہماری نشانیاں	يٰمُوْسٰى	اے موسیٰ؟	لَّا نُخْلِفُهٗ	نہ خلاف کریں
كُلَّهَا	سب ہی	فَلَنَاْتِيَنَّكَ	پس البتہ لاتے ہیں ہم		ہم اس کا
فَكَذَّبَ	پس جھٹلایا اس نے		تیرے پاس	نَحْنُ (۴)	(نہ) ہم
وَاَبٰى	اور انکار کیا	بِسِحْرٍ	جادو	وَلَآ اَنْتَ	اور نہ تو
قَالَ	کہا اس نے	مِّثْلِهٖ (۲)	اس کے مانند	مَكَانًا (۵)	کوئی جگہ
اَجِئْتَنَا	کیا آیا ہے تو ہمارے پاس	فَاجْعَلْ	پس مقرر کر	سُوًى (۶)	ہموار (درمیانی)
لِتُخْرِجَنَا	تا کہ نکالے تو ہم کو	بَيْنَنَا	ہمارے درمیان	قَالَ	کہا موسیٰ نے

(۱) أَرَيْنَا: إِرَاءَةٌ (باب افعال) سے فعل ماضی، صیغہ جمع متکلم...... ہٗ: مفعولِ اول...... آیاتنا: مفعول ثانی...... کلّھا: مفعول ثانی کی صفت۔(۲) مثله کی ضمیر بسحرك کی طرف عائد ہے یعنی تیرے جادو کے مانند۔(۳) موعداً: مصدر میمی: وعدہ...... جملہ لا نخلفه: اس کی صفت۔(۴) نحن: ضمیر فصل، تا کہ عطف صحیح ہو۔(۵) مکانا: فعل مقدر کا مفعول بہ، أی عِدْ مکانا سُوی (۶) سُوًی: دراصل مصدر ہے، یہاں صفت واقع ہے: وہ جگہ جس کے طرفین برابر ہوں یعنی ہموار یا درمیانی۔

مَوْعِدُكُمْ (۱)	تمہارا وعدے کا وقت	وَاَنْ (۲)	اور یہ کہ	النَّاسُ	لوگ
يَوْمُ الزِّيْنَةِ	جشن کا دن ہے	يُّحْشَرَ	جمع کئے جائیں	ضُحًى (۳)	دن چڑھے

جب فرعون کو اس کے سوالات کے جوابات سے راہِ راست نہ ملی، تو اس نے معجزات (نشانیوں) کا مطالبہ کیا۔ کہنے لگا: ''اگر تو کوئی نشانی لایا ہے، تو اسے دکھا، اگر تو سچا ہے'' (اعراف ۱۰۶) پس حضرت موسیٰ علیہ السلام نے فرعون کے سامنے اپنی لاٹھی ڈالی، جس نے اژدھے کی شکل اختیار کر لی وہ حقیقۃً اژدھا تھا، نظر کا دھوکہ نہیں تھا۔ پھر موسیٰ علیہ السلام نے اپنا ہاتھ گریبان میں داخل کیا، اور بغل کے نیچے دبا کر نکالا تو وہ روشن تارہ تھا۔ مگر یہ معجزات دیکھ کر بھی نہ فرعون ایمان لایا نہ اس کے درباری۔ سب تکذیب وانکار پر مصر رہے۔ ارشاد پاک ہے: ـــــ اور بخدا واقعہ یہ ہے کہ ہم نے فرعون کو ہماری سبھی نشانیاں دکھلائیں، پس اس نے جھٹلایا اور انکار کیا ـــــ آیات کے مفہوم میں معجزات اور دلائل دونوں شامل ہیں۔ موسیٰ علیہ السلام کے جوابات جو توحید الوہیت وربوبیت کے واضح دلائل ہیں: وہ بھی نشانیاں ہیں۔ مگر حسّی اور معنوی کوئی بھی نشانی کارگر نہ ہوئی ـــــ اس نے کہا: ''کیا تو ہمارے پاس اس لئے آیا ہے کہ ہم کو ہمارے ملک سے اپنے جادو کے زور سے نکال دے، اے موسیٰ؟!'' ـــــ یعنی ہم خوب سمجھ گئے کہ تو ہم کو اپنے کرشموں سے سرزمینِ مصر سے بے دخل کرنا چاہتا ہے۔ مگر تیرا یہ خواب شرمندۂ تعبیر نہ ہوگا ـــــ پس ہم (بھی) تیرے مقابلہ میں ویسا ہی جادو لائیں گے ـــــ یعنی تیرا علاج یہی ہے کہ جادو ہی کے ذریعہ تجھ کو شکست دی جائے ـــــ پس تو ہمارے اور اپنے درمیان کوئی وعدہ مقرر کر ـــــ یعنی مقابلہ کا دن طے کر ـــــ جس کی نہ ہم خلاف ورزی کریں نہ تو ـــــ یعنی مقابلہ کے دن کی تعیین کا تجھے اختیار دیا جاتا ہے۔ سوچ کر ایسا دن مقرر کر جو ہم دونوں کے لئے قابل قبول ہو۔ اور کسی کے لئے بہانہ جوئی کا موقعہ نہ ہو ـــــ ایسی جگہ (مقرر کر) جو ہموار ہو ـــــ تاکہ تماشابیں بے تکلف مقابلہ کا مشاہدہ کر سکیں، یا ـــــ ایسی جگہ مقرر کر جو درمیانی ہو ـــــ یعنی وہ جگہ دونوں فریقوں سے نصف نصف مسافت پر واقع ہو، تاکہ ہر ایک کو وہاں پہنچنے میں سہولت ہو ـــــ موسیٰ نے کہا: ''تمہارا وعدے کا وقت جشن کا دن ہے، اور یہ کہ لوگ دن چڑھے جمع کئے جائیں'' ـــــ یعنی قومی جشن کا دن: ایک ایسا دن ہے جس میں سب کو فرصت ہوتی ہے، کوئی بہانہ نہیں بنا سکتا۔ اور چاشت کا وقت خوب موزون ہے۔ سب لوگ نہا دھو کر اس وقت تیار ہو جاتے ہیں۔ اور خوب روشنی پھیل جاتی ہے۔ پس دن کے اجالے میں یہ کام ہونا چاہئے تاکہ دیکھنے والے بکثرت ہوں۔ اور روز روشن میں ہر کوئی مقابلہ دیکھ سکے۔

(۱) موعد: ظرف زمان: وعدے کا وقت۔ (۲) أن کا عطف الزينة پر یا يوم پر ہے۔ (۳) ضحى: مفعول فیہ ہے۔

فائدہ: فریقین میں سے ہر ایک پر امید تھا کہ جیت اسی کی ہوگی۔ چنانچہ فرعون نے زمان ومکان کی تعیین کا پورا اختیار موسیٰ علیہ السلام کو دیدیا، تا کہ جب موسیٰ علیہ السلام خود دن اور جگہ طے کریں تو ان کے لئے کوئی راہِ فرار باقی نہ رہے —— اور موسیٰ علیہ السلام کو بھی حسب وعدۂ الٰہی اپنی کامیابی کا پورا یقین تھا۔ چنانچہ آپ نے ایسا دن اور ایسا وقت تجویز کیا کہ فرعون مشغولی کا بہانہ نہ کر سکے۔ نہ لوگوں کے لئے کوئی عذر ہو۔ اور لوگ بڑی تعداد میں جمع ہوں اور بچشم خود مقابلہ دیکھیں، تا کہ جب وہ منتشر ہوں تو بات دور دور تک پھیل جائے۔

معجزات کا فائدہ وہ شخص اٹھاتا ہے جو بینا آنکھ، شنوا کان اور روشن دل رکھتا ہے

فَتَوَلّٰى فِرْعَوْنُ فَجَمَعَ كَيْدَهٗ ثُمَّ اَتٰى ﴿۶۰﴾ قَالَ لَهُمْ مُّوْسٰى وَيْلَكُمْ لَا تَفْتَرُوْا عَلَى اللّٰهِ كَذِبًا فَيُسْحِتَكُمْ بِعَذَابٍ ۚ وَقَدْ خَابَ مَنِ افْتَرٰى ﴿۶۱﴾ فَتَنَازَعُوْٓا اَمْرَهُمْ بَيْنَهُمْ وَاَسَرُّوا النَّجْوٰى ﴿۶۲﴾ قَالُوْٓا اِنْ هٰذٰنِ لَسٰحِرٰنِ يُرِيْدٰنِ اَنْ يُّخْرِجٰكُمْ مِّنْ اَرْضِكُمْ بِسِحْرِهِمَا وَيَذْهَبَا بِطَرِيْقَتِكُمُ الْمُثْلٰى ﴿۶۳﴾ فَاَجْمِعُوْا كَيْدَكُمْ ثُمَّ ائْتُوْا صَفًّا ۚ وَقَدْ اَفْلَحَ الْيَوْمَ مَنِ اسْتَعْلٰى ﴿۶۴﴾ قَالُوْا يٰمُوْسٰٓى اِمَّآ اَنْ تُلْقِيَ وَاِمَّآ اَنْ نَّكُوْنَ اَوَّلَ مَنْ اَلْقٰى ﴿۶۵﴾ قَالَ بَلْ اَلْقُوْا ۚ فَاِذَا حِبَالُهُمْ وَعِصِيُّهُمْ يُخَيَّلُ اِلَيْهِ مِنْ سِحْرِهِمْ اَنَّهَا تَسْعٰى ﴿۶۶﴾

فَتَوَلّٰى	پس لوٹا	ثُمَّ	پھر	مُّوْسٰى	موسیٰ نے
فِرْعَوْنُ	فرعون	اَتٰى	آیا وہ	وَيْلَكُمْ (۲)	ناس ہو تمہارا!
فَجَمَعَ	پس جمع کی اس نے	قَالَ	کہا	لَا تَفْتَرُوْا	نہ گھڑو تم
كَيْدَهٗ (۱)	اپنی تدبیر	لَهُمْ	جادوگروں سے	عَلَى اللّٰهِ	اللہ تعالیٰ پر

(۱) کَید: خفیہ تدبیر، داؤں۔ اس لفظ کا استعمال تعریف اور برائی: دونوں موقعوں کے لئے ہوتا ہے۔ اور اکثر محل ذم میں ہوتا ہے۔ کاد یکید کیدًا فلاناً: دھوکہ دینا، چال چلنا۔ (۲) وَیْل: ہلاکت، تباہی۔ ویلك اور ویحك کا استعمال محاورے میں ناراضگی اور ہلکی سرزنش کے لئے ہوتا ہے۔

كَذِبًا	جھوٹ	يُرِيْدٰنِ	چاہتے ہیں دونوں	مَنِ	جو
فَيُسْحِتَكُمْ [1]	پس نابود کردے وہ تمکو	اَنْ	کہ	اسْتَعْلٰى [5]	غالب ہوا
بِعَذَابٍ	کسی سزا سے	يُّخْرِجٰكُمْ	نکال دیں تم کو	قَالُوْا	کہا جادوگروں نے
وَقَدْ	اور تحقیق	مِّنْ اَرْضِكُمْ	تمہاری زمین سے	يٰمُوْسٰى	اے موسیٰ
خَابَ	ناکام ہوا	بِسِحْرِهِمَا	اپنے جادو کے ذریعہ	اِمَّا [6]	یا
مَنِ	جس نے	وَيَذْهَبَا	اور لے جائیں دونوں	اَنْ	یہ کہ
افْتَرٰى	جھوٹ باندھا	بِطَرِيْقَتِكُمُ	تمہارے طریق کو	تُلْقِيَ	ڈالے تو
فَتَنَازَعُوْٓا	پس مختلف ہوئے وہ	الْمُثْلٰى [3]	جو عمدہ ہے	وَاِمَّآ	اور یا
اَمْرَهُمْ	اپنے معاملہ میں	فَاَجْمِعُوْا	پس جمع کرو تم	اَنْ	یہ کہ
بَيْنَهُمْ	باہم	كَيْدَكُمْ	اپنی تدبیر	نَّكُوْنَ	ہوں ہم
وَاَسَرُّوا	اور چپکے سے کی انھوں نے	ثُمَّ	پھر	اَوَّلَ	پہلے
النَّجْوٰى	سرگوشی	ائْتُوْا	آؤ تم	مَنْ	جس نے
قَالُوْٓا	کہا فرعونیوں نے	صَفًّا [4]	صف بستہ ہوکر	اَلْقٰى	ڈالا
اِنْ [2]	بیشک	وَقَدْ	اور تحقیق	قَالَ	کہا موسیٰ نے
هٰذٰنِ	یہ دونوں	اَفْلَحَ	کامیاب ہوا	بَلْ	بلکہ
لَسٰحِرٰنِ	البتہ جادوگر ہیں	الْيَوْمَ	آج	اَلْقُوْا	ڈالو تم

(۱) إِسْحَات (باب افعال) ہلاک کرنا، تباہ کرنا۔ سَحَتَ (ف) جڑ سے اکھاڑ دینا۔(۲)إن: مخففہ من المثقلہ : درحقیقت إِنَّ حرف مشبہ بالفعل ہے۔اور **هذان**: اس کا اسم، اور **لساحران**: خبر ہے۔قاعدہ سے إنَّ کا اسم **هذَيْن** آنا چاہئے۔مگر قرآن کریم میں تین جگہ مشہور قواعد کے خلاف ہے۔ایک: یہاں، دوم: المائدہ آیت ۶۹ میں **والصابئون**۔سوم: النساء آیت ۱۶۲ میں **والمقيمين الصلاة**۔اِن مقامات کے بارے میں حضرت شاہ ولی اللہ صاحب محدث دہلوی رحمہ اللہ نے الفوز الکبیر میں ایک تحقیق لکھی ہے کہ ''مشہور تعبیرات ومحاورات کی مخالفت کرنا بھی ایک تعبیر اور محاورہ ہے'' مشہور ہے: **أغلاطُ العوام فصيحة** یعنی عوامی غلطی فصاحت میں داخل ہے۔تفصیل کے لئے **الخير الكثير شرح الفوز الكبير** ص:۴۸۲ ملاحظہ فرمائیں۔(۳)**المثلى**: اسم تفضیل، واحد مؤنث، **الأمثل**: واحد مذکر: برگزیدہ، وہ طریقہ جو فضیلت سے مشابہت رکھتا ہو۔(۴)**صفا**: ضمیر فاعل سے حال ہے (۵)**استعلاء**: غلبہ چاہنا، بلندی چاہنا۔(۶) **إما**: مختلف معانی کے لئے آتا ہے۔یہاں برائے تخییر ہے۔

فَاِذَا	پس اچانک	يُخَيَّلُ (۲)	خیال میں آنے لگیں	اَنَّهَا	کہ
حِبَالُهُمْ	ان کی رسّیاں	اِلَيْهِ	موسیٰ کے	تَسْعٰى	وہ دوڑ رہی ہیں
وَ عِصِيُّهُمْ (۱)	اوران کی لاٹھیاں	مِنْ سِحْرِهِمْ	ان کے جادو کی وجہ سے	۞	۞

جب حضرت موسیٰ علیہ السلام اور فرعون کے درمیان جشن کا دن طے پا گیا ـــــ تو فرعون (دربار سے) لوٹا، پس اس نے اپنی تدبیر جمع کی ـــــ یعنی اپنی تدبیر میں لگ گیا، اور اپنی قلم رو میں حکم بھیج دیا کہ جو بھی مشہور اور ماہر جادوگر ہو، اس کو پایۂ تخت میں بھیج دیا جائے۔ مصر اس زمانہ میں چین اور ہندوستان کی طرح جادو کا بڑا مرکز تھا۔ ایک سے ایک ماہر جادوگر موجود تھا۔ جب فرعون نے جادوگروں کی فوج اکٹھی کرلی تو ـــــ پھر وہ آیا ـــــ یعنی میدانِ مقابلہ میں شاہی کرّوفر کے ساتھ بذاتِ خود آیا، اور تخت پر براجمان ہوا۔ درباری بھی حسبِ مراتب قرینے سے بیٹھ گئے۔ اور لاکھوں انسان حق و باطل کے معرکہ کا نظارہ کرنے کے لئے جمع ہو گئے ـــــ ایک طرف جادو گروں کا ٹولہ اپنے ساز و سامان سے لیس کھڑا ہے۔ دوسری طرف حضرت موسیٰ و ہارون علیہما السلام اللہ کے سہارے کھڑے ہیں۔ فرعون ساحروں کی حوصلہ افزائی کر رہا ہے، وعدہ کر رہا ہے کہ اگر تم نے موسیٰ کو شکست دیدی تو نہال کر دیئے جاؤ گے، بلکہ مقربین میں شامل کر لئے جاؤ گے۔ جادوگر بھی خوش ہیں، اور امید باندھے ہوئے ہیں ـــــ

اس وقت حضرت موسیٰ علیہ السلام نے حقِ تبلیغ ادا فرماتے ہوئے جادوگروں کو مخاطب بنایا ـــــ موسیٰ نے ان سے کہا: ''اے کم بختی مارو! اللہ پر جھوٹا الزام نہ لگاؤ پس وہ تمہیں کسی سزا سے پیس کر رکھ دے'' ـــــ یعنی تمہاری حالت پر سخت افسوس ہے۔ تم کیا کر رہے ہو؟ تم ہم کو جادوگر کہہ کر اللہ پر افتراء کر رہے ہو۔ دیکھو اپنے ہاتھوں ہلاکت میں نہ پڑو ـــــ اور بالیقین وہ شخص ناکام ہوا جس نے جھوٹ باندھا ـــــ یعنی افتراء کرنے والوں کا انجام کبھی اچھا نہیں ہوتا۔ بلکہ اندیشہ ہے کہ ایسے لوگوں پر کوئی آسمانی آفت آپڑے جو ان کو بیخ وبُن سے اکھاڑ دے۔

موسیٰ علیہ السلام کی تنبیہ سے جادوگروں کی جماعت میں کھلبلی پڑ گئی ـــــ پس وہ باہم اپنے معاملہ میں مختلف ہو گئے۔ اور چپکے سے انھوں نے سرگوشی کی ـــــ کہ اس شخص کو کیا سمجھا جائے؟ اس کی باتیں جادوگروں جیسی معلوم نہیں ہوتیں۔ یہ تو اللہ ہی کی طرف سے معلوم ہوتی ہیں۔ اس لئے بعض نے کہا کہ ان کا مقابلہ مناسب نہیں، کہیں ہم عذاب کے شکار نہ ہو جائیں، اور بعض بضدر ہے کہ مقابلہ ضرور کیا جائے۔

درباریوں نے جب جادوگروں کا یہ حال دیکھا تو ـــــ انھوں نے کہا: ''یہ دونوں یقیناً جادوگر ہیں۔ دونوں چاہتے

(۱) عِصِیّ: عَصَا کی جمع (۲) يُخَيَّلُ: مضارع مجہول، صیغہ واحد مذکر غائب: محسوس ہونا، خیال میں ڈالا جانا، مصدر تَخْيِيْل۔

ہیں کہ اپنے جادو کے ذریعہ تم کو تمہارے ملک سے نکال دیں، اور تمہارے نہایت عمدہ طریقہ کو ختم کردیں، پس تم اپنی تدبیر اکٹھا کرو، پھر پرا باندھ کر سامنے آؤ۔ آج جو بھی غالب آجائے گا وہی کامیاب ثابت ہوگا'' ـــــــ یعنی موقع کی اہمیت کو سمجھو۔ ذرا شک نہ کرو، یہ دونوں بالیقین جادوگر ہیں۔ اور ان کی چال بڑی خطرناک ہے۔ دونوں کا پلان یہ ہے کہ اپنے جادو کے زور سے تم کو تمہارے وطن سے نکال دیں۔ اور تمہارا یہ طور وطریق جو سب سے افضل و بہتر ہے اس کو مٹادیں، اور اپنا دین ومذہب پھیلائیں۔ پس وقت کو ہاتھ سے نہ دو، پوری ہمت وقوت سے سب مل کر مقابلہ کرو، اور صف بستہ ہوکر سامنے آؤ، تاکہ مقابل پر رعب پڑے۔ اور یکبارگی ایسا متفقہ حملہ کرو کہ پہلے ہی وار میں دونوں کے قدم اکھڑ جائیں۔ آج کا معرکہ فیصلہ کن ہے۔ آج کی کامیابی دائمی ہے۔ آج جو غالب آئے گا، ہمیشہ کے لئے اس کا سرا اونچا رہے گا۔

درباریوں کی یہ تقریر سن کر جادوگروں کے پھسلتے قدم جم گئے، بلکہ وہ مقابلہ کرنے پر مجبور ہوگئے۔ چنانچہ ـــــــ انھوں نے کہا: ''اے موسیٰ! یا تو تم ڈالو، یا ہم پہل کرنے والے بنیں'' ـــــــ یعنی بتاؤ پہلا وار کس کا ہوگا۔ پہل تم کروگے یا ہم کریں؟ ـــــــ موسیٰ نے کہا: ''بلکہ تم ڈالو!'' ـــــــ یعنی پہلے تم اپنے حوصلے نکال لو، اور اپنے کرتب دکھالو، تاکہ باطل کی زور آزمائی کے بعد حق کا غلبہ پوری طرح نمایاں ہو۔ چنانچہ جادوگروں نے اپنی رسّیاں، بان اور لاٹھیاں زمین پر ڈالیں، جو سانپوں کی شکل میں دوڑتی نظر آنے لگیں۔ ارشاد ہے ـــــــ پس یکا یک ان کی رسّیاں اور لاٹھیاں، ان کے جادو کی وجہ سے موسیٰ کے خیال میں آنے لگیں کہ وہ دوڑ رہی ہیں ـــــــ یعنی نظر بندی کی وجہ سے موسیٰ علیہ السلام کو وہ رسیاں اور لاٹھیاں سانپوں کی شکل میں دوڑتی نظر آنے لگیں۔ مگر واقع میں ایسا نہ تھا۔

فائدہ: جادو چیزوں میں اثر انداز ہوتا ہے۔ حق تعالیٰ نے اپنی حکمتِ بالغہ اور مصلحتِ کاملہ سے اس میں مضر اثرات رکھے ہیں۔ جادو تندرست کو بیمار کرتا ہے، بلکہ موت کی بھی نوبت آسکتی ہے۔ تر چیز خشک ہوجاتی ہے۔ صحیح چیز بگڑ جاتی ہے۔ سورۃ البقرہ آیت ۱۰۲ میں ارشاد پاک ہے: ﴿وَمَا هُمْ بِضَارِّيْنَ بِهِ مِنْ أَحَدٍ إِلَّا بِإِذْنِ اللّٰهِ﴾ یعنی جادوگر جادو کے ذریعہ کسی کو بھی ضرر نہیں پہنچا سکتے، مگر بہ اذنِ الٰہی (ضرر پہنچا سکتے ہیں) ـــــــ مگر جادو سے انقلابِ ماہیت نہیں ہوتا۔ انسان گھوڑا بن جائے یا گدھا انسان بن جائے یا ڈھیلا کبوتر بن جائے ایسا نہیں ہوسکتا۔ اللہ تعالیٰ نے سحر میں یہ تاثیر نہیں رکھی۔ البتہ نظر بندی اور شعبدہ بازی سے ایسا نظر آسکتا ہے۔ مگر وہ محض نظر کا فریب ہوتا ہے۔ حقیقت اس کی کچھ بھی نہیں ہوتی۔

احقاقِ حق کی غرض سے کچھ دیر کے لئے باطل کو ظہور کا موقعہ دیا جاسکتا ہے۔ اور مناظروں میں ایسا کرنا ہی پڑتا ہے

فَاَوْجَسَ فِیْ نَفْسِهٖ خِیْفَةً مُّوْسٰی ۝٦٧ قُلْنَا لَا تَخَفْ اِنَّكَ اَنْتَ الْاَعْلٰی ۝٦٨ وَاَلْقِ مَا فِیْ یَمِیْنِكَ تَلْقَفْ مَا صَنَعُوْا ؕ اِنَّمَا صَنَعُوْا كَیْدُ سٰحِرٍ ؕ وَلَا یُفْلِحُ السَّاحِرُ حَیْثُ اَتٰی ۝٦٩ فَاُلْقِیَ السَّحَرَةُ سُجَّدًا قَالُوْۤا اٰمَنَّا بِرَبِّ هٰرُوْنَ وَمُوْسٰی ۝٧٠ قَالَ اٰمَنْتُمْ لَهٗ قَبْلَ اَنْ اٰذَنَ لَكُمْ ؕ اِنَّهٗ لَكَبِیْرُكُمُ الَّذِیْ عَلَّمَكُمُ السِّحْرَ ۚ فَلَاُقَطِّعَنَّ اَیْدِیَكُمْ وَاَرْجُلَكُمْ مِّنْ خِلَافٍ وَّلَاُصَلِّبَنَّكُمْ فِیْ جُذُوْعِ النَّخْلِ ؗ وَلَتَعْلَمُنَّ اَیُّنَاۤ اَشَدُّ عَذَابًا وَّاَبْقٰی ۝٧١ قَالُوْا لَنْ نُّؤْثِرَكَ عَلٰی مَا جَآءَنَا مِنَ الْبَیِّنٰتِ وَالَّذِیْ فَطَرَنَا فَاقْضِ مَاۤ اَنْتَ قَاضٍ ؕ اِنَّمَا تَقْضِیْ هٰذِهِ الْحَیٰوةَ الدُّنْیَا ۝٧٢ اِنَّاۤ اٰمَنَّا بِرَبِّنَا لِیَغْفِرَ لَنَا خَطٰیٰنَا وَمَاۤ اَكْرَهْتَنَا عَلَیْهِ مِنَ السِّحْرِ ؕ وَاللّٰهُ خَیْرٌ وَّاَبْقٰی ۝٧٣

فَاَوْجَسَ (١)	پس محسوس کیا	اَنْتَ (٢)	ہی	مَا	اس کو جو
فِیْ نَفْسِهٖ	اپنے دل میں	الْاَعْلٰی	سربلند ہیں	صَنَعُوْا	بنایا ہے انھوں نے
خِیْفَةً	کچھ خوف	وَاَلْقِ	اور ڈال دیں آپ	اِنَّمَا (٤)	بیشک جو
مُّوْسٰی	موسیٰ نے	مَا	جو	صَنَعُوْا	بنایا انھوں نے
قُلْنَا	کہا ہم نے	فِیْ یَمِیْنِكَ	آپ کے دائیں ہاتھ	كَیْدُ	مکر ہے
لَا تَخَفْ	نہ ڈریں آپ		میں ہے	سٰحِرٍ	جادوگر کا
اِنَّكَ	بیشک آپ	تَلْقَفْ (٣)	نگل لے گا وہ	وَلَا یُفْلِحُ	اور نہیں کامیاب ہوتا

(١) أَوْجَسَ إيجاسًا: دل میں خوف پیدا ہونا، گھبراہٹ ہونا۔ وَجَسَ (س): دل میں کوئی خیال آنے سے یا کان میں آواز پڑنے سے ڈر جانا...... خيفة: مصدر خاف يخاف: خوف، ڈر...... موسى: فاعل ہے۔ رعایت فاصلہ کی وجہ سے مؤخر آیا ہے...... خيفة کی تنوین تقلیل کے لئے ہے۔ (٢) أنت: کاف کی تاکید کے لئے ہے، اس لئے حصر پیدا ہوا ہے۔ (٣) تلقف: جواب امر ہے۔ لَقِفَ (س) لَقْفًا: نگل جانا۔ کسی چیز کو پھرتی سے لے لینا، اور جھٹ سے اتار لینا، خواہ منہ سے نگل جائے، یا ہاتھ سے لے لے۔ مضارع کا صیغہ واحد مؤنث غائب، فاعل ضمیر هي جو عصا کی طرف عائد ہے۔ عصا: مؤنث سماعی ہے...... ماصنعوا: موصول صلہ مل کر مفعول بہ ہے (٤) إنما: کلمۂ حصر نہیں ہے۔ بلکہ إنَّ حرف مشبہ بالفعل ہے، اور ما موصولہ یا موصوفہ یا مصدریہ ہے۔ ترجمہ موصولہ کا کیا ہے۔ صنعوا: اس کا صلہ ہے۔ پھر دونوں مل کر إنَّ کا اسم ہیں۔ اور كيد ساحر: مرکب اضافی خبر ہے...... إنما اور ←

السّٰحِرُ	جادوگر	اٰذَنَ	اجازت دوں میں	اَيُّنَآ (٧)	(کہ) ہم میں سے کون
حَيْثُ (١)	جس جگہ	لَكُمْ	تم کو	اَشَدُّ	زیادہ سخت ہے
اَتٰى	آتا ہے وہ	اِنَّهٗ	بیشک وہ	عَذَابًا	سزا کے اعتبار سے
فَاُلْقِيَ (٢)	پس ڈال دیئے گئے	لَكَبِيْرُكُمُ	البتہ تمہارا وہ بڑا ہے	وَّاَبْقٰى	اور دیرپا ہے
السَّحَرَةُ	جادوگر	الَّذِيْ	جس نے	قَالُوْا	کہا جادوگروں نے
سُجَّدًا	سجدہ میں	عَلَّمَكُمُ	سکھلایا ہے تم کو	لَنْ	ہرگز نہیں
قَالُوْٓا	کہا انھوں نے	السِّحْرَ	جادو	نُّؤْثِرَكَ	ترجیح دیں گے ہم تجھے
اٰمَنَّا	ایمان لائے ہم	فَلَاُقَطِّعَنَّ (٤)	پس ضرور کاٹوں گا میں	عَلٰى مَا	اس پر جو
بِرَبِّ	پروردگار پر	اَيْدِيَكُمْ	تمہارے ہاتھ	جَآءَنَا	پہنچا ہمیں
هٰرُوْنَ	ہارون	وَاَرْجُلَكُمْ	اور تمہارے پاؤں	مِنَ الْبَيِّنٰتِ	واضح دلائل میں سے
وَمُوْسٰى	اور موسیٰ کے	مِّنْ خِلَافٍ (٥)	مخالف جانب سے	وَالَّذِيْ (٨)	(اور اس پر) جس نے
قَالَ	کہا فرعون نے	وَّلَاُوصَلِّبَنَّكُمْ (٦)	اور ضرور سولی دوں گا	فَطَرَنَا	ہمیں پیدا کیا
اٰمَنْتُمْ	ایمان لے آئے تم		میں تم کو	فَاقْضِ (٩)	پس فیصلہ کر تو
لَهٗ	اس پر	فِيْ جُذُوْعِ	تنوں میں	مَآ	جو کچھ
قَبْلَ (٣)	پہلے	النَّخْلِ	کھجور کے	اَنْتَ	تو
اَنْ	(اس سے) کہ	وَلَتَعْلَمُنَّ	اور ضرور جان لو گے تم	قَاضٍ	فیصلہ کرنے والا ہے

← **أنما**: جو کلمہ حصر ہیں، ان میں إنَّ اور أنَّ: حرف مشبہ بالفعل اور ما کافہ ہوتا ہے جو دونوں کو عمل سے روک دیتا ہے۔

(۱) **حيث**: جہاں، جس جگہ۔ ظرف مکان مبنی برضمہ ہے۔ مکانِ مبہم کے لئے آتا ہے اور جملہ مابعد سے اس کی تشریح ہوتی ہے۔ (۲) **أُلقي**: إلقاء سے ماضی مجہول، صیغہ واحد مذکر غائب...... **السحرة**: الساحر کی جمع: نائب فاعل...... **سُجَّدًا**: حال (۳) **قبل**: ظرف زمان بمعنی بغیر (۴) **لَأُقَطِّعَنَّ**: میں ضرور کاٹوں گا، **تقطيع** (ٹکڑے ٹکڑے کرنا) سے فعل مضارع بالام تاکید ونون تاکید۔ (۵) **خِلَاف**: برخلاف، باب مفاعلہ کا مصدر۔ (٦) **لَأُوصَلِّبَنَّكُمْ**: میں ضرور تم کو سولی پر چڑھاؤں گا۔ **تَصْلِيْب** سے فعل مضارع بالام تاکید ونون تاکید، صیغہ واحد متکلم...... قرآنی رسم الخط میں اس لفظ میں یہاں اور سورۂ شعراء (آیت ۴۹) میں الف کے بعد واو زائد لکھا جاتا ہے، مگر پڑھا نہیں جاتا۔ (۷) **أَيُّنَا**: مرکب اضافی مبتدا، **أشد** خبر۔ (۸) **والذی** کا عطف **ماجاء نا** پر ہے (۹) **اِقْضِ**: تو کر گذر، تو فیصلہ کر۔ **قضاء**: معاملہ فیصل کرنا، خواہ بذریعہ قول ہو یا فعل...... **قاض**: اسم فاعل۔

اِنَّمَا	بس	بِرَبِّنَا	ہمارے پروردگار پر	عَلَيْهِ	اس پر
تَقْضِيْ	فیصلہ کرے گا تو	لِيَغْفِرَ	تا کہ بخشے وہ	مِنَ السِّحْرِ	جادو سے
هٰذِهِ	اس	لَنَا	ہمارے لئے	وَاللّٰهُ	اور اللہ تعالیٰ
الْحَيٰوةَ الدُّنْيَا	دنیوی زندگی کا	خَطٰيٰنَا	ہماری خطاؤں کو	خَيْرٌ	بہتر
اِنَّآ	بیشک ہم	وَمَآ (۱)	اور اس کو جو	وَّ اَبْقٰى	اور دیر پا ہیں
اٰمَنَّا	ایمان لائے ہیں	اَكْرَهْتَنَا	مجبور کیا تو نے ہمیں	۞	۞

جب موسیٰ علیہ السلام نے دیکھا کہ ساحروں کی رسّیاں سانپ بن کر میدان میں رینگنے لگیں ہیں ـــــــ تو موسیٰ نے اپنے دل میں کچھ خوف محسوس کیا ـــــــ دل میں یہ اندیشہ آیا کہ جادوگروں نے بھی سانپ بنالئے، اور میری لاٹھی بھی بہر حال سانپ بنے گی، پس دیکھنے والے برابر کا مقابلہ سمجھیں گے، اور حق کا غلبہ نہ ہوگا ـــــــ یہ اندیشہ کچھ زیادہ نہ تھا، بس ذرا سا ہی تھا، مگر اللہ تعالیٰ نے موسیٰ علیہ السلام کو بتاکید اطمینان دلایا ـــــــ ہم نے کہا: ''آپ نہ ڈریں، یقیناً آپ ہی سربلند رہیں گے'' ـــــــ فتح آپ ہی کی ہوگی ﴿ إِنَّكَ أَنْتَ الْأَعْلٰى ﴾ میں چار طرح سے تاکید ہے۔ایک حرف إِنَّ تاکید کے لئے ہے، دوسرے: ضمیر مخاطب مکرر لائی گئی ہے۔سوم: أعلی پر الف لام تعریف کا داخل کیا گیا ہے۔ چہارم: خود لفظ أعلی: عُلُوّ سے ماخوذ ہے، جس میں سربلندی کا مفہوم ہے۔ آگے ارشاد ہے ـــــــ ''اور آپ اس (لاٹھی) کو ڈال دیں جو آپ کے دائیں ہاتھ میں ہے، وہ اس (سب) کو نگل جائے گی، جو انھوں نے بنایا ہے'' ـــــــ جب موسیٰ علیہ السلام نے لاٹھی ڈالی تو اس نے اژدھا بن کر ساحروں کے تمام سوانگ (شعبدوں) کو نگل لیا۔اور تھوڑی دیر میں میدان صاف ہوگیا، اور ساحر اپنے سحر میں ناکام ہوئے، کیونکہ ـــــــ ''انھوں نے جو کچھ بنایا ہے وہ یقیناً جادو کا مکر ہے'' ـــــــ دھوکے کی ٹٹّی ہے، نظر بندی اور سوانگ ہے۔حق کے مقابلہ میں اس کی بساط ہی کیا ہے؟ ـــــــ ''اور جادوگر کہیں جائے کامیاب نہیں ہوتا'' ـــــــ یعنی جادو کے ڈھکوسلے چاہے کہیں ہوں، اور کسی حد تک پہنچ جائیں، حق کے مقابلہ میں کامیاب نہیں ہوتے، نہ جادوگر کبھی فلاح پاسکتا ہے۔اس لئے جادو سیکھنا اور کرنا حرام ہے۔ اور حدیث میں جادوگر کو قتل کرنے کا حکم ہے۔

جادوگروں نے جو اپنے فن کے ماہر تھے، جب عصا کا کرشمہ دیکھا تو حقیقتِ حال سمجھ گئے۔اور ان کو یقین آ گیا کہ موسیٰ علیہ السلام کا کام جادو ہرگز نہیں، بلکہ خدائی معجزہ ہے۔چنانچہ وہ فوراً رب العالمین پر ایمان لے آئے۔ارشاد

(۱) وما کا عطف خطایانا پر ہے۔

ہے: ـــــ پس جادوگر سجدے میں ڈال دیئے گئے ـــــ یعنی بہ توفیقِ الٰہی وہ ایمان سے سرفراز ہوئے۔ اور اپنا ایمان وانقیاد ظاہر کرنے کے لئے وہ سجدہ ریز ہوئے ـــــ انھوں نے کہا: ''ہم موسیٰ وہارون کے پروردگار پر ایمان لائے'' ـــــ اس طرح فرعون کا سارا کھیل بکھر گیا۔ موسیٰ علیہ السلام کو شکست دینے کی جو آخری صورت تھی وہ بھی ہاتھ سے گئی۔ اور اندیشہ لاحق ہوگیا کہ کہیں مصری عوام ہاتھ سے نہ جائیں۔ اور موسیٰ علیہ السلام اپنے مقصد میں کامیاب نہ ہوجائیں۔ چنانچہ ـــــ فرعون نے کہا: ''تم اس پر ایمان لے آئے، اس سے پہلے کہ میں تمہیں اجازت دوں؟'' ـــــ یعنی تم میری رعایا ہو، میدانِ مقابلہ میں میرے نمائندے ہو، پھر مجھ سے پوچھے بغیر کیوں ایمان لائے؟ ـــــ ''وہ یقیناً تمہارا بڑا ہے، جس نے تم کو جادو سکھایا ہے'' ـــــ اور یہ مقابلہ بازی تمہاری ملی بھگت ہے۔ اب میں تمہیں عبرتناک سزا دونگا، تاکہ آئندہ کسی کو ایسی غداری کی ہمت نہ ہو ـــــ ''پس میں ضرور تم کو کھجور کے تنوں میں سولی دونگا'' ـــــ تاکہ دنیا تمہارا تماشا دیکھے ـــــ ''اور تم ضرور جان لوگے کہ ہم میں سے کون زیادہ سخت سزا دینے والا اور دیرپا ہے!'' ـــــ یعنی میری سزا سخت اور میری حکومت دیرپا ہے، یا موسیٰ اور ہارون کے پروردگار کی سزا سخت اور اس کی حکومت دیرپا ہے: یہ بات ابھی تمہیں معلوم ہوجائے گی، جب میری سزا کا مزہ چکھوگے! ـــــ جادوگروں نے کہا: ''ہم ہرگز تجھے ترجیح نہیں دیں گے اُن واضح دلائل پر جو ہمیں پہنچے، اور نہ اس ذات پر جس نے ہمیں پیدا کیا'' ـــــ ''واضح دلائل'' سے مراد موسیٰ علیہ السلام کی نصیحت اور معجزات ہیں۔ ساحروں نے کہا کہ ہم ایسے صاف دلائل کو تیری خاطر نظر انداز نہیں کرسکتے، نہ اپنے خالق کی خوشنودی کے مقابلہ میں تیری کچھ پرواہ کرسکتے ہیں ـــــ ''پس تو جو کچھ تجھے کرنا ہے کرگزر۔ تو بس اس دنیوی زندگی ہی کو ختم کرسکتا ہے'' ـــــ سو کچھ مضائقہ نہیں۔ ہم آخرت کو اختیار کرچکے ہیں، ہم کو اب یہاں کے رنج وراحت کی فکر نہیں ـــــ ''بیشک ہم ایمان لائے ہمارے پروردگار پر، تاکہ وہ ہمارے لئے ہماری خطاؤں کو اور اس جادو کے عمل کو بخش دے جس پر تو نے ہمیں مجبور کیا ہے'' ـــــ یعنی اب تمنا صرف یہ ہے کہ ایمان کی برکت سے ہمارا رب ہمارے تمام گناہوں کو معاف کردے، اور خاص طور پر اس گناہ کو بخش دے جو تیرے خوف سے مجبور ہوکر کرنا پڑا ہے یعنی جادو سے موسیٰ علیہ السلام کا مقابلہ کرنا ـــــ جادوگر موسیٰ علیہ السلام کے مقابلہ پر ازخود اپنی مرضی سے نہیں آئے تھے، بلکہ فرعون کے حکم اور حکومت کے دباؤ سے آئے تھے۔ یہی فرعون کا ان کو مجبور کرنا تھا ـــــ آخر میں اُن مؤمنین کاملین نے، جو ابھی تھوڑی دیر پہلے جادوگر تھے، فرعون کی آخری بات کا جواب دیا۔ اور نہلے پہ دَہلا رکھا۔ انھوں نے کہا: ـــــ اور اللہ تعالیٰ بہتر اور دیرپا ہیں! ـــــ یعنی جو انعام واکرام تو ہمارا کرتا اس سے کہیں بہتر اجر اللہ کے یہاں ملے گا۔ اور

وہی سدا باقی رہنے والے ہیں۔ تو کیا اور تیری حکومت کیا، چہ پدّی اور چہ پدّی کا شوربا!

> سچا ایمان جب کسی کو نصیب ہوتا ہے، چاہے ایک لمحہ کے لئے ہو، تو وہ ایسی روحانی قوت پیدا کر دیتا ہے کہ زبردست سے زبردست طاقت بھی اس کو مرعوب نہیں کر سکتی

اِنَّهٗ مَنْ يَّاْتِ رَبَّهٗ مُجْرِمًا فَاِنَّ لَهٗ جَهَنَّمَ ۭ لَا يَمُوْتُ فِيْهَا وَلَا يَحْيٰى ﴿۷۴﴾ وَمَنْ يَّاْتِهٖ مُؤْمِنًا قَدْ عَمِلَ الصّٰلِحٰتِ فَاُولٰٓئِكَ لَهُمُ الدَّرَجٰتُ الْعُلٰى ﴿۷۵﴾ جَنّٰتُ عَدْنٍ تَجْرِيْ مِنْ تَحْتِهَا الْاَنْهٰرُ خٰلِدِيْنَ فِيْهَا ۭ وَذٰلِكَ جَزٰۗؤُا مَنْ تَزَكّٰى ﴿۷۶﴾

اِنَّهٗ (۱)	بیشک شان یہ ہے کہ	وَمَنْ	اور جو شخص	عَدْنٍ	ہمیشہ رہنے کے
مَنْ	جو شخص	يَّاْتِهٖ	حاضر ہوا اس کے پاس	تَجْرِيْ (۳)	بہتی ہیں
يَّاْتِ	حاضر ہوا	مُؤْمِنًا	مؤمن ہو کر	مِنْ تَحْتِهَا	ان کے نیچے سے
رَبَّهٗ	اپنے رب کے پاس	قَدْ	تحقیق	الْاَنْهٰرُ	نہریں
مُجْرِمًا	مجرم ہو کر	عَمِلَ	کئے ہیں اس نے	خٰلِدِيْنَ (۴)	ہمیشہ رہیں گے وہ
فَاِنَّ	پس بیشک	الصّٰلِحٰتِ	نیک کام	فِيْهَا	ان میں
لَهٗ	اس کے لئے	فَاُولٰٓئِكَ	پس وہ لوگ	وَذٰلِكَ	اور وہ
جَهَنَّمَ	دوزخ ہے	لَهُمُ	ان کے لئے	جَزٰۗؤُا	بدلہ ہے
لَا يَمُوْتُ	نہ مرے گا وہ	الدَّرَجٰتُ	درجے ہیں	مَنْ	اس کا جو
فِيْهَا	اس میں	الْعُلٰى	بہت بلند	تَزَكّٰى	ستھرا ہوا
وَلَا يَحْيٰى	اور نہ جئے گا	جَنّٰتُ (۲)	باغات	❁	❁

فرعون نے ایمان لانے والے جادوگروں کو جو دھمکی دی تھی، اس میں آخر میں دو باتیں کہی تھیں: ایک: یہ کہ تمہیں ابھی پتہ چل جائے گا کہ میرا عذاب سخت ہے یا موسیٰ کے رب کا؟ دوسری: یہ کہ تم ابھی یہ بات جان لو گے کہ میں اور میری

(۱) اِنَّ: حرف مشبہ بالفعل، ضمیر شان اس کا اسم، اور دونوں مَنْ موصولہ جو متضمن معنی شرط ہیں، اپنے صلہ کے ساتھ خبر (۲) جنّاتُ: الدرجات العلی سے بدل ہے۔ (۳) تجری: جنات کا حال ہے۔ (۴) خالدین: لھم کی ضمیر کا حال ہے۔

حکومت دیرپا ہیں یا موسیٰ کا پروردگار اور اس کی حکومت؟ ـــــ ایمان قبول کرنے والے جادوگروں نے صرف دوسری بات کا جواب دیا تھا کہ ''اللہ تعالیٰ ہی بہتر اور دیرپا (سدا باقی رہنے والے) ہیں''۔ پہلی بات کا جواب انہوں نے نہیں دیا تھا۔ وہ بات قابلِ اعتناء نہیں تھی، اور دوسری بات کے جواب سے اس کا جواب بھی خود بخود نکل آتا تھا۔

اب اللہ پاک اِن آیات میں اُس پہلی بات کا مفصل جواب دیتے ہیں۔ اور چونکہ قرآن پاک کا اسلوبِ بیان یہ ہے کہ جب وہ مؤمنین وکافرین میں سے کسی ایک کا انجام بیان کرتا ہے، تو دوسرے کا تذکرہ ضرور کرتا ہے۔ چنانچہ ارشاد ہے ـــــ بالیقین صورتِ حال یہ ہے کہ جو شخص اپنے پروردگار کے پاس مجرم بن کر حاضر ہوگا، اس کے لئے یقیناً دوزخ ہے، جس میں نہ وہ مرے گا اور نہ جئے گا! ـــــ مجرم یہاں مؤمن کے مقابلہ میں آیا ہے، اس لئے اس سے مراد مشرک وکافر ہے۔ ایسے مجرموں کا ٹھکانا بہت برا ہے، اور وہ ابدی جہنم ہے۔ جس سے چھٹکارے کی کوئی صورت نہیں۔ دنیا کی تکلیفیں خواہ کتنی ہی سخت ہوں، موت آکر سب کا خاتمہ کردیتی ہے، مگر کفار کو دوزخ میں موت نہیں آئے گی، جو تکالیف کا خاتمہ کردے۔ اور وہاں جینا بھی جینے کی طرح کا نہ ہوگا۔ وہاں کی زندگی ایسی ہوگی کہ موت اس سے ہزار درجہ بہتر! پس اللہ کی سزا کا فرعون کی سزا سے کیا مقابلہ!

آگے مجرمین کے مقابلہ میں اطاعت شعار مؤمنین کا انجام بیان فرماتے ہیں ـــــ اور جو شخص اُن کے پاس مؤمن ہوکر حاضر ہوگا، جس نے واقعۃً نیک کام کئے ہیں، تو ان لوگوں کے لئے بلند درجات ہیں۔ یعنی ہمیشہ رہنے کے باغات ہیں، جن کے نیچے نہریں بہ رہی ہونگی۔ وہ لوگ ان میں ہمیشہ رہیں گے، اور یہ اس شخص کا بدلہ ہے جو ستھرا ہوا ـــــ یعنی جن مؤمنین نے مثبت ومنفی پہلوؤں سے ایمان کے تقاضے پورے کئے ہیں۔ نیک کاموں پر کاربند رہے ہیں، اور پاکیزہ زندگی بسر کی ہے، یعنی کفر ومعصیت سے کنارہ کش رہے ہیں، اور فاسد عقائد اور بداعمالیوں سے بچے رہے ہیں، وہی کامل مؤمن ہیں، اور نجاتِ اوّلی انہیں کا نصیب ہے ـــــ رہے کلمہ گو صاحب کبائر: تو ان کی بھی نجات ضرور ہوگی۔ اللہ تعالیٰ ان کا ایمان ضائع نہیں کریں گے۔ ارشاد پاک ہے: ﴿وَمَا كَانَ اللّٰهُ لِيُضِيْعَ اِيْمَانَكُمْ﴾ یعنی اللہ تعالیٰ ایسے نہیں کہ تمہارے ایمان کو ضائع کردیں (سورۃ البقرہ آیت ۱۴۳) اہل السنہ والجماعۃ کا یہی مذہب ہے کہ ایماندار کی نجات ضرور ہوگی۔ خواہ وہ کتنا ہی بڑا خطا کار اور سیاہ کار ہو۔ البتہ نجات اوّلی کے لئے ارکانِ خمسہ کی ادائیگی اور کبیرہ گناہوں سے بچنا ضروری ہے۔

جو مؤمن موت کے ساتھ ہی جنت کا امیدوار ہے: اس کو فرائض سے غافل، اور کبائر میں ملوث نہیں ہونا چاہئے

وَلَقَدْ اَوْحَيْنَآ اِلٰى مُوْسٰٓى ۥ اَنْ اَسْرِ بِعِبَادِيْ فَاضْرِبْ لَهُمْ طَرِيْقًا فِي الْبَحْرِ يَبَسًا ۙ لَّا تَخٰفُ دَرَكًا وَّلَا تَخْشٰى ﴿۷۷﴾ فَاَتْبَعَهُمْ فِرْعَوْنُ بِجُنُوْدِهٖ فَغَشِيَهُمْ مِّنَ الْيَمِّ مَا غَشِيَهُمْ ﴿۷۸﴾ وَاَضَلَّ فِرْعَوْنُ قَوْمَهٗ وَمَا هَدٰى ﴿۷۹﴾

وَلَقَدْ	اور البتہ تحقیق	فِي الْبَحْرِ	سمندر میں	مِّنَ الْيَمِّ	دریا سے
اَوْحَيْنَآ	وحی بھیجی ہم نے	يَبَسًا (۳)	خشک	مَا (۶)	جو
اِلٰى مُوْسٰٓى	موسیٰ کی طرف	لَّا تَخٰفُ (۴)	نہ ڈریں آپ	غَشِيَهُمْ	چھا گیا ان پر
اَنْ (۱)	کہ	دَرَكًا	پالئے جانے سے	وَاَضَلَّ	اور گمراہ کیا
اَسْرِ	رات کو لے چلیں	وَّلَا تَخْشٰى (۵)	اور نہ ڈریں (ڈوبنے سے)	فِرْعَوْنُ	فرعون نے
بِعِبَادِيْ	میرے بندوں کو	فَاَتْبَعَهُمْ	پس پیچھا کیا ان کا	قَوْمَهٗ	اپنی قوم کو
فَاضْرِبْ (۲)	پس ماریں (بنائیں)	فِرْعَوْنُ	فرعون نے	وَمَا	اور نہیں
لَهُمْ	ان کے لئے	بِجُنُوْدِهٖ	اپنے لشکر کے ساتھ	هَدٰى	راہ دکھائی
طَرِيْقًا	راستہ	فَغَشِيَهُمْ	پس چھا گیا ان پر		

بنی اسرائیل کی رہائی اور فرعون کی تباہی: حضرت موسیٰ علیہ السلام نے سالہا سال تک مختلف معجزات دکھلا کر، فرعون اور اس کے درباریوں پر حجت تام کردی، مگر فرعون کسی طرح دعوتِ حق قبول کرنے کے لئے، اور بنی اسرائیل کو غلامی سے آزاد کرنے کے لئے تیار نہ ہوا، تو موسیٰ علیہ السلام کو اللہ کا حکم پہنچا —— اور بخدا! واقعہ یہ ہے کہ ہم نے موسیٰ کی طرف وحی بھیجی کہ میرے بندوں (بنی اسرائیل) کو رات میں لے چلیں، پس لاٹھی مار کر ان کے لئے سمندر میں ایسا خشک راستہ بنالیں کہ نہ تو پکڑے جانے کا خوف ہو، اور نہ ڈوبنے کا ڈر! —— یہ دونوں حکم ایک ساتھ نہیں آئے تھے۔ پہلے صرف یہ حکم آیا تھا کہ موسیٰ علیہ السلام بنی اسرائیل کو لے کر رات کے وقت شہر سے نکل جائیں۔ اور یہ بتادیا تھا کہ

---

(۱) أن: مفسِّرہ ہے، کیونکہ أوحینا بمعنی قلنا ہے۔(۲) فاضرب: میں مجاز عقلی ہے یعنی غیر مالہ کی طرف اسناد ہے۔ أصله: فاضرب البحر، لیصیر لهم طریقا فیه یبسا (۳) یبسا: طریقا کی پہلی صفت ہے۔(۴) جملہ لاتخاف: طریقاً کی دوسری صفت ہے۔(۵) خوف وخشیت: ہم معنی ہیں۔ البتہ خشیت ابلغ ہے، اور اس کا مفعول غرقا محذوف ہے۔(۶) ما غشیهم: موصول صلہ مل کر پہلے غشیهم کا فاعل ہیں۔ اور ابہام: تہویل کے لئے ہے۔

فرعون پیچھا کرے گا (سورۃ الشعراء آیت ۵۲) چنانچہ موسیٰ علیہ السلام تیاری کر کے حسب حکم رات کے وقت بنی اسرائیل کو لے کر چل دیئے ـــــ پروگرام یہ تھا کہ جس راہ سے موسیٰ علیہ السلام مدین آئے گئے ہیں، اسی راہ سے بنی اسرائیل کو لے کر فرعون کی مملکت کی حدود سے نکل جائیں گے۔ اور معاملہ مخفی رکھنے کے لئے مشتہر کیا گیا کہ وہ کسی تقریب کے لئے شہر سے باہر جا رہے ہیں۔ اور کسی کو شبہ نہ ہو اس لئے مصریوں سے زیورات مستعار لے لئے ـــــ مگر ہوا یہ کہ موسیٰ علیہ السلام راستہ بھول کر دوسری راہ پر پڑ گئے۔ اُدھر پرچہ نویسوں نے فرعون کو اطلاع دی کہ یہ لوگ تقریب منانے نہیں نکلے ہیں کیونکہ یہ بھاگے جا رہے ہیں۔ چنانچہ فرعون نے ہر طرف ہرکارے دوڑا دیئے۔ اور ایک بڑا لشکر جمع کر لیا، اور تعاقب شروع کر دیا ـــــ اِدھر اچانک بنی اسرائیل کے سامنے بحر قلزم آ گیا۔ اور پیچھے فرعون کا لشکر نظر آنے لگا۔ تو دوسرا حکم آیا کہ موسیٰ علیہ السلام سمندر میں عصا ماریں۔ خشک راستے نکل آئیں گے۔ جن سے بنی اسرائیل بے خوف ہو کر پار ہو جائیں گے۔ ارشاد ہے ـــــ پس فرعون نے اپنے لشکر کے ساتھ ان کا پیچھا کیا، پس ان پر چھا گیا دریا کے پانی سے جو چھا گیا! ـــــ یعنی پھر کچھ نہ پوچھو کہ سمندر کی موجوں نے کس طرح ان کو اپنی آغوش میں لے لیا، اور سب کو ہمیشہ کے لئے موت کی نیند سلا دیا! ـــــ جب موسیٰ علیہ السلام نے سمندر پر اپنا عصا مارا تو پانی پھٹ کر دونوں جانب دو پہاڑوں کی طرح کھڑا ہو گیا۔ اور درمیان میں راہیں نکل آئیں۔ تمام بنی اسرائیل ان راہوں سے پار ہو گئے۔ پھر جب فرعون قریب پہنچا، اور دیکھا کہ بنی اسرائیل صحیح سلامت دوسرے کنارے پر پہنچ گئے ہیں۔ اور پانی بدستور کھڑا ہے، تو فرعون مع لشکران راہوں پر سمندر میں اتر لیا۔ جب وہ منجدھار میں پہنچے، تو پانی بحکم الٰہی اپنی اصلی حالت پر آ گیا، اور سب لقمۂ اجل بن گئے ـــــ اور فرعون نے اپنی قوم کو گمراہ کیا، اور ان کو سیدھا راستہ نہیں دکھایا! ـــــ یہ مضمون کا تتمہ ہے، اور آدھا مضمون ہے۔ دوسرا آدھا مضمون فہم سامع پر اعتماد کر کے چھوڑ دیا گیا ہے۔ اور وہ یہ ہے کہ موسیٰ علیہ السلام نے اپنی قوم کو پار لگایا، اور سیدھا راستہ دکھایا ـــــ یعنی دونوں راہنماؤں میں موازنہ کرو۔ ایک راہ نما: حضرت موسیٰ علیہ السلام ہیں۔ انھوں نے اپنی قوم کو دنیا و آخرت میں نجات کا راستہ دکھایا۔ اللہ تعالیٰ نے ان کی برکت سے سمندر میں خشک راستے بنا دیئے اور منزلِ مقصود سے لگا دیا۔ دوسرا راہ نما: فرعون ہے۔ اس کا دعوی تھا کہ وہ اپنی قوم کو سیدھا راستہ دکھا رہا ہے (سورۃ المؤمن آیت ۲۹) مگر دنیا میں بھی وہ سب کو لے ڈوبا، اور آخرت میں بھی سب کو جہنم رسید کرے گا۔ (سورہ ہود آیت ۹۸)

يٰبَنِيْٓ اِسْرَاۗءِيْلَ قَدْ اَنْجَيْنٰكُمْ مِّنْ عَدُوِّكُمْ وَوٰعَدْنٰكُمْ جَانِبَ الطُّوْرِ الْاَيْمَنَ وَنَزَّلْنَا عَلَيْكُمُ الْمَنَّ وَالسَّلْوٰى ۝ كُلُوْا مِنْ طَيِّبٰتِ مَا رَزَقْنٰكُمْ وَلَا تَطْغَوْا

فِيهِ فَيَحِلَّ عَلَيْكُمْ غَضَبِي ۚ وَمَن يَحْلِلْ عَلَيْهِ غَضَبِي فَقَدْ هَوَىٰ ﴿٨١﴾ وَإِنِّي لَغَفَّارٌ لِّمَن تَابَ وَآمَنَ وَعَمِلَ صَالِحًا ثُمَّ اهْتَدَىٰ ﴿٨٢﴾

لفظ	ترجمہ	لفظ	ترجمہ	لفظ	ترجمہ
يٰبَنِيٓ	اے اولاد	كُلُوا	کھاؤ تم	غَضَبِي	میرا غصہ
إِسْرَآءِيلَ	یعقوبؑ کی	مِن طَيِّبٰتِ	ستھری چیزوں سے	فَقَدْ	تو یقیناً
قَدْ	تحقیق	مَا	جو	هَوَىٰ (۴)	گراوہ
أَنجَيْنٰكُم	نجات دی ہم نے تم کو	رَزَقْنٰكُمْ	روزی دی ہم نے تم کو	وَإِنِّي	اور بیشک میں
مِّنْ عَدُوِّكُمْ	تمہارے دشمن سے	وَلَا تَطْغَوْا	اور نہ حد سے بڑھو تم	لَغَفَّارٌ	البتہ بخشنے والا ہوں
وَوٰعَدْنٰكُمْ	اور وعدہ کیا ہم نے تم سے	فِيهِ	اس میں	لِّمَن	اس کو جس نے
جَانِبَ الطُّورِ	طور کی جانب کا	فَيَحِلَّ (۳)	پس اتر پڑا	تَابَ	توبہ کی
الْأَيْمَنَ (۱)	دائیں	عَلَيْكُمْ	تم پر	وَآمَنَ	اور ایمان لایا
وَنَزَّلْنَا	اور اتارا ہم نے	غَضَبِي	میرا غصہ	وَعَمِلَ	اور کئے اس نے
عَلَيْكُمُ	تم پر	وَمَن	اور جو شخص	صَالِحًا	نیک کام
الْمَنَّ	شبنمی گوند	يَحْلِلْ	اتر پڑے	ثُمَّ	پھر
وَالسَّلْوٰى (۲)	اور بٹیریں	عَلَيْهِ	اس پر	اهْتَدَىٰ	استوار رہا

اب حق تعالیٰ بنی اسرائیل کو نصیحت فرماتے ہیں۔اوران کواپنے انعامات یاددلاتے ہیں:

پہلا انعام: —— فرعون سے نجات دی —— اے یعقوب کی اولاد! واقعہ یہ ہے کہ ہم نے تم کو تمہارے دشمن (فرعون) سے نجات دی —— یعنی کیا یہ تھوڑی بات ہے کہ ایسے سخت جابر وقاہر دشمن کے ہاتھوں سے تم کو نجات دی، اور اس کو کیسے عبرتناک طریقے سے تمہاری آنکھوں کے سامنے ہلاک کیا؟!

دوسرا انعام: —— تورات عنایت فرمائی —— اور ہم نے تم سے طور کی دائیں جانب کا وعدہ کیا —— فرعون سے نجات اور دریا سے پار ہونے کے بعد اللہ تعالیٰ نے موسیٰ علیہ السلام سے، اوران کے توسط سے تمام

(۱) الأیمن: جانب کی صفت ہے، جومضاف ہے (۲) السلوی: سَلْوَاةٌ کی جمع: لَوَا، بٹیر، ایک قسم کا چھوٹا پرندہ جو اکثر جھاڑیوں میں رہتا ہے۔ (۳) حَلَّ يَحِلُّ حُلُوْلاً: اترنا، نازل ہونا۔ (۴) هَوٰى يَهْوِىْ هُوِيًّا: اوپر سے نیچے گر پڑنا۔

بنی اسرائیل سے وعدہ فرمایا کہ وہ مصر سے شام کو جاتے ہوئے کوہِ طور کا جو حصہ داہنے ہاتھ پڑتا ہے، وہاں پہنچیں تا کہ اللہ تعالیٰ ان کو اپنی مقدس کتاب تورات عنایت فرمائیں۔

تیسرا انعام: ـــــ من وسلوی نازل فرمایا ـــــ اور ہم نے تم پر شبنمی گوند اور لوائیں (بیڑیں) اتاریں ـــــ تِیْہ کے لق ودق میدان میں تمہارے کھانے کے لئے من وسلوی اتارا۔ یہ واقعہ اس وقت کا ہے جب بنی اسرائیل دریا عبور کر کے آگے بڑھے، اور ان کو مقدس شہر میں داخل ہونے کا حکم ملا، تو انھوں نے بزدلی دکھائی، اور حکم کی خلاف ورزی کی۔ اس کی سزا یہ ملی کہ اسی وادی میں جس کو وادیٔ تِیْہ کہتے ہیں سرگرداں کر دیا گیا۔ وہاں انھوں نے موسیٰ علیہ السلام سے کھان پان کا مطالبہ کیا۔ موسیٰ علیہ السلام نے بارگاہِ خداوندی میں دعا کی، حکم ملا کہ اپنا عصا زمین پر مارو، تعمیل حکم کرتے ہی بارہ سوت اُبل پڑے۔ اور جب صبح ہوئی تو بنی اسرائیل نے دیکھا کہ درختوں کے پتوں اور گھاس پر شبنم کی طرح آسمان سے کوئی چیز برس کر جم گئی ہے۔ کھائی تو نہایت شیریں حلوے کے مانند تھی۔ یہ ''من'' تھا۔ اور دن میں تیز ہوا چلی۔ اور لوائیں (بٹیروں) کے غول کے غول آ کر زمین پر بیٹھ گئے۔ بنی اسرائیل نے بآسانی ان کو پکڑ لیا، اور بھون کر کھانے لگے۔ یہ ''سلوی'' (بٹیر، لوا) تھیں، جو تیتر کی قسم کے چھوٹے سے پرندے ہیں جو اکثر جھاڑیوں میں رہتے ہیں ـــــ کھاؤ ان ستھری چیزوں سے جو ہم نے تم کو بطور روزی دی ہیں۔ اور اس میں حد سے نہ بڑھو، پس اتر پڑے تم پر میرا غصہ، اور جس پر میرا غصہ اتر پڑا وہ یقیناً پستی میں گرا! ـــــ بنی اسرائیل کو مذکورہ دونوں نعمتیں روزانہ بغیر زحمت وتکلیف کے حاصل ہوتی تھیں۔ ان سے کہا گیا کہ اللہ تعالیٰ نے جو حلال وطیب چیزیں عنایت فرمائی ہیں، انہیں شوق سے استعمال کرو، لیکن حد سے نہ بڑھو۔ بنی اسرائیل کے لئے حد یہ مقرر کی گئی تھی کہ وہ اپنی ضرورت کے بقدر لیں، دوسرے دن کے لئے ذخیرہ نہ کریں۔ کیونکہ ان کو روزانہ یہ نعمت ملتی رہے گی۔ اور ان کو یہ تنبیہ بھی کر دی گئی تھی کہ اگر وہ حد سے تجاوز کریں گے تو اپنا ہی نقصان کریں گے۔ نعمتوں سے محروم ہو جائیں گے، اور اللہ کا غصہ ان پر اتر پڑے گا۔ اور جس پر اللہ کا غصہ اترتا ہے وہ بالکل گیا گذرا ہو جاتا ہے۔ جیسا گوسالہ پوجنے والوں کا حال آگے آ رہا ہے۔

فائدہ: اللہ کے رزق کے معاملہ میں حد سے گذرنے کی بہت سی شکلیں ہیں۔ مثلاً: نعمت کی ناشکری کرنا۔ فضول خرچی کرنا، فانی نعمت پر اِترانا، حقوقِ واجبہ ادا نہ کرنا۔ معاصی میں دولت خرچ کرنا، مال کو طغیان وعصیان کا ذریعہ بنانا۔ اور ممنوع ذخیرہ اندوزی کرنا وغیرہ وغیرہ۔

آگے مغضوبین کے بالمقابل مغفورین کا تذکرہ ہے ـــــ اور میں بالیقین اس شخص کو بخشنے والا ہوں جس نے توبہ کی اور نیک کام کیا، پھر وہ استوار رہا! ـــــ یعنی خواہ کوئی کتنا ہی بڑا مجرم ہو، اگر سچے دل سے توبہ کر لے، اور زندگی کا

ورق پلٹ دے، ایمان وعمل صالح کا راستہ اختیار کرلے، اور اس پر موت تک مضبوط رہے، تو اللہ کے یہاں فضل ورحمت اور بخشش ومغفرت کی کمی نہیں۔

وَمَآ اَعْجَلَكَ عَنْ قَوْمِكَ يٰمُوْسٰى ۞ قَالَ هُمْ اُولَاۗءِ عَلٰٓى اَثَرِيْ وَعَجِلْتُ اِلَيْكَ رَبِّ لِتَرْضٰى ۞ قَالَ فَاِنَّا قَدْ فَتَنَّا قَوْمَكَ مِنْۢ بَعْدِكَ وَاَضَلَّهُمُ السَّامِرِيُّ ۞ فَرَجَعَ مُوْسٰٓى اِلٰى قَوْمِهٖ غَضْبَانَ اَسِفًا ۥ قَالَ يٰقَوْمِ اَلَمْ يَعِدْكُمْ رَبُّكُمْ وَعْدًا حَسَنًا ۥ اَفَطَالَ عَلَيْكُمُ الْعَهْدُ اَمْ اَرَدْتُّمْ اَنْ يَّحِلَّ عَلَيْكُمْ غَضَبٌ مِّنْ رَّبِّكُمْ فَاَخْلَفْتُمْ مَّوْعِدِيْ ۞ قَالُوْا مَآ اَخْلَفْنَا مَوْعِدَكَ بِمَلْكِنَا وَلٰكِنَّا حُمِّلْنَآ اَوْزَارًا مِّنْ زِيْنَةِ الْقَوْمِ فَقَذَفْنٰهَا فَكَذٰلِكَ اَلْقَى السَّامِرِيُّ ۞ فَاَخْرَجَ لَهُمْ عِجْلًا جَسَدًا لَّهٗ خُوَارٌ فَقَالُوْا هٰذَآ اِلٰهُكُمْ وَاِلٰهُ مُوْسٰى ۥ فَنَسِيَ ۞ اَفَلَا يَرَوْنَ اَلَّا يَرْجِعُ اِلَيْهِمْ قَوْلًا ۥ وَّلَا يَمْلِكُ لَهُمْ ضَرًّا وَّلَا نَفْعًا ۞

وَمَآ	اور کیا چیز	عَلٰٓى اَثَرِيْ	میرے پیچھے پیچھے	قَدْ	تحقیق
اَعْجَلَكَ (۱)	جلدی لائی آپ کو	وَعَجِلْتُ (۱)	اور جلدی آیا میں	فَتَنَّا	آزمایا
عَنْ قَوْمِكَ	اپنی قوم سے	اِلَيْكَ	آپ کے پاس	قَوْمَكَ	آپ کی قوم کو
يٰمُوْسٰى	اے موسیٰ؟	رَبِّ	اے میرے رب	مِنْۢ بَعْدِكَ	آپ کے بعد
قَالَ	عرض کیا	لِتَرْضٰى	تاکہ آپ خوش ہوں	وَاَضَلَّهُمُ	اور گمراہ کیا ان کو
هُمْ (۲)	وہ	قَالَ	فرمایا	السَّامِرِيُّ	سامری نے
اُولَاۗءِ	یہی ہیں	فَاِنَّا	پس بیشک ہم نے	فَرَجَعَ	پس لوٹے

(۱) عَجِلَ (س) عَجَلاً إليه: جلدی آنا، کسی کے پاس دوڑ کر آنا۔ أَعْجَلَ فلاناً: کسی سے جلدی کرانا، عجلت کرنے پر اکسانا۔
(۲) هم: مبتدا۔ أولاء: بدل۔ علی أثری: خبر یا أولاء: پہلی خبر اور علی أثری: دوسری خبر...... أولاء: اسم اشارہ جمع برائے قریب، اس پر ہ بڑھا کر هؤلاء اکثر مستعمل ہے...... الأَثَر: نشان، جمع: آثار، فی أثرہ: پیچھے، بعد، علی أثرہ: فوراً بعد، پیچھے پیچھے۔

مُوْسٰٓى	موسیٰ	غَضَبٌ	غصہ	عِجْلًا	ایک بچھڑا
اِلٰى قَوْمِهٖ	اپنی قوم کی طرف	مِّنْ رَّبِّكُمْ	تمہارے رب کا	جَسَدًا	دھڑ
غَضْبَانَ (۱)	غضبناک	فَاَخْلَفْتُمْ (۳)	پس خلاف کیا تم نے	لَّهٗ	جس کے لئے
اَسِفًا (۱)	افسوس کرتے ہوئے	مَّوْعِدِىْ	میرے وعدے کا؟	خُوَارٌ (۷)	بیل کی آواز ہے
قَالَ	کہا انھوں نے	قَالُوْا	جواب دیا انھوں نے	فَقَالُوْا	پس کہا انھوں نے
يٰقَوْمِ	اے میری قوم	مَآ	نہیں	هٰذَآ	یہ
اَلَمْ	کیا نہیں	اَخْلَفْنَا (۳)	خلاف کیا ہم نے	اِلٰهُكُمْ	تمہارا معبود ہے
يَعِدْكُمْ	وعدہ کیا تم سے	مَوْعِدَكَ (۴)	آپ کے وعدے کا	وَاِلٰهُ	اور معبود ہے
رَبُّكُمْ	تمہارے رب نے	بِمَلْكِنَا (۵)	ہمارے اختیار سے	مُوْسٰى	موسیٰ کا
وَعْدًا (۲)	وعدہ	وَلٰكِنَّا	مگر	فَنَسِىَ	پس وہ بھول گیا
حَسَنًا	بہترین؟	حُمِّلْنَآ	لادے گئے ہم	اَفَلَا يَرَوْنَ	کیا پس نہیں دیکھتے وہ
اَ	کیا	اَوْزَارًا (۶)	بوجھ	اَلَّا (۸)	کہ نہیں
فَطَالَ	تو دراز ہوا	مِّنْ زِيْنَةِ	زیورات کا	يَرْجِعُ	لوٹاتا وہ
عَلَيْكُمُ	تم پر	الْقَوْمِ	قوم کے	اِلَيْهِمْ	ان کی طرف
الْعَهْدُ	پیمان	فَقَذَفْنٰهَا	پس ڈالدیا ہم نے اسکو	قَوْلًا	کسی بات کو
اَمْ	یا	فَكَذٰلِكَ	پس اسی طرح	وَّلَا يَمْلِكُ	اور نہیں مالک ہے وہ
اَرَدْتُّمْ	چاہا تم نے	اَلْقَى	ڈال دیا	لَهُمْ	ان کے لئے
اَنْ	کہ	السَّامِرِىُّ	سامری نے	ضَرًّا	کسی ضرر کا
يَّحِلَّ	اترے	فَاَخْرَجَ	پس نکالا اس نے	وَّلَا	اور نہ
عَلَيْكُمْ	تم پر	لَهُمْ	ان کے لئے	نَفْعًا	کسی نفع کا

(۱) غضبان اورأسفا: حال ہیں۔(۲)وعداً حسنا: مفعول مطلق ہے۔(۳) أخلف وعدَه وبوعده: وعدہ خلافی کرنا۔
(۴)المَوْعِد: مصدر: وعدہ۔(۵)المَلْك: حاصل مصدر: قدرت واختیار، مصدر: مالک ہونا۔(۶) أوزار: وِزْرٌ کی جمع: بوجھ۔
(۷) خُوار: گائے، بیل، بکری اور ہرن کی آواز۔(۸) ألَّا: دولفظ ہیں: أن: ناصبہ اور لا نافیہ۔

گوسالہ پرستی کا واقعہ: گذشتہ آیات میں تین باتیں آئی ہیں: (۱) اللہ تعالیٰ نے بنی اسرائیل کو حکم دیا تھا کہ وہ کوہِ طور پر پہنچیں ان کو تورات عنایت فرمائی جائے گی۔(۲) جس پر اللہ کا غضب اترتا ہے وہ پستی میں گرتا ہے (۳) پھر جو سچی توبہ کرتا ہے: اللہ تعالیٰ اس کو معاف کردیتے ہیں ـــــ گوسالہ پرستی کے واقعہ میں تینوں باتیں پائی جاتی ہیں۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام قوم کو حضرت ہارون علیہ السلام کے حوالے کرکے جلدی طور پر پہنچ گئے۔اور حکم یہ دے گئے کہ سب طور پر پہنچیں۔مگر قوم نے پیچھے گوسالہ پرستی شروع کردی، اور طور پر نہیں پہنچی تو ان پر اللہ کا غضب نازل ہوا۔اور حکم دیا گیا کہ بعض بعض کو قتل کریں۔جب انھوں نے سچے دل سے توبہ کی، اور اللہ کے حکم پر عمل کیا تو اللہ نے سب کو معاف کردیا۔سورۃ البقرہ آیت ۵۴ میں اس کی تفصیل گذر چکی ہے۔

فرعون سے نجات اور دریا سے پار ہونے کے بعد اللہ تعالیٰ نے حضرت موسیٰ علیہ السلام سے اور ان کے واسطے سے تمام بنی اسرائیل سے یہ وعدہ فرمایا تھا کہ وہ کوہِ طور کی داہنی جانب چلے آئیں، تاکہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کو تورات عطا کی جائے، اور بنی اسرائیل خود بھی ان کے شرفِ ہم کلامی کا مشاہدہ کریں (معارف القرآن) ـــــ قوم کی تعداد مفسرین کے بیان کے مطابق چھ لاکھ تھی۔اتنا بڑا قافلہ تیزی سے سفر نہیں کرسکتا، اور موسیٰ علیہ السلام بارگاہِ خداوندی میں حاضری کے لئے بے تاب تھے۔چنانچہ آپ نے بنی اسرائیل کو حضرت ہارون علیہ السلام کے حوالے کیا۔تاکہ وہ بسہولت سفر کرتے ہوئے قوم کو لے کر طور پر پہنچیں۔اور آپ بعجلت طور کی طرف روانہ ہوگئے۔وہاں پہنچنے پر تیس دن روزہ رکھنے کا حکم ملا، پھر اس میں دس دن کا اضافہ کیا گیا۔جس کی تفصیل سورۃ الاعراف آیت ۱۴۲ میں گذر چکی ہے۔جب چلّہ پورا ہوا تو موسیٰ علیہ السلام مکالمۂ الٰہی سے مشرف ہوئے۔اور تورات سے ہم کنار ہوئے۔

اس کے بعد اللہ تعالیٰ نے قوم کے حال سے موسیٰ علیہ السلام کو واقف کرنے کے لئے سوال کیا: ـــــ اور کیا چیز آپ کو اپنی قوم سے جلدی لائی، اے موسیٰ؟ ـــــ یعنی ہم نے آپ کو حکم دیا تھا کہ قوم کو لے کر طور پر آئیں، آپ نے ایسی جلدی کیوں کی کہ قوم کو پیچھے چھوڑ آئے؟ ـــــ عرض کیا: ''وہ لوگ یہی تو ہیں میرے پیچھے پیچھے، اور میں آپ کے پاس جلدی آیا تاکہ آپ خوش ہوں، اے پروردگار!'' ـــــ یعنی الٰہی! آپ کی خوشنودی کے لئے جلدی حاضر ہوگیا ہوں، اور قوم بھی کچھ زیادہ دور نہیں۔یہ میرے پیچھے پیچھے چلی آرہی ہے ـــــ ارشاد فرمایا: پس واقعہ یہ ہے کہ ہم نے آپ کے بعد آپ کی قوم کو آزمایا، اور ان کو سامری نے گمراہ کردیا ـــــ فتنہ کے معنی ہیں: سونے چاندی کو جانچنے کے لئے کہ کھرے ہیں یا کھوٹے: آگ میں تپانا۔اللہ تعالیٰ بندوں کی برابر آزمائش کرتے رہتے ہیں۔کبھی مال واولاد سے، کبھی آلاؤں بلاؤں سے اور کبھی مختلف احوال سے۔چنانچہ اللہ تعالیٰ نے بنی اسرائیل کو بھی آزمایا،

سامری نے سوانگ بھرا، اور ایک انبوہ کو لے ڈوبا۔ اللہ تعالیٰ نے موسیٰ علیہ السلام کو بتلایا کہ تم تو اِدھر آئے، اور ہم نے تمہاری قوم کو ایک سخت آزمائش میں ڈال دیا۔ جس کا سبب عالم اسباب میں سامری بنا۔ اس کے اغواء سے بنی اسرائیل نے بچھڑے کی پوجا شروع کردی ـــــ سامری کے احوال مجہول ہیں۔ اس کا نام بھی موسیٰ بتایا جاتا ہے۔ پھر بعض کہتے ہیں کہ وہ اسرائیلی تھا، اور بعض کے نزدیک قبطی تھا۔ بہر حال جمہور کی رائے یہ ہے کہ یہ شخص منافق تھا، اور منافقین کی طرح فریب اور چالبازی سے مسلمانوں کو گمراہ کرنے کی فکر میں رہتا تھا۔

حضرت موسیٰ علیہ السلام قوم کا حال معلوم ہونے کے بعد تورات کی تختیاں لے کر لوٹے۔ ارشاد پاک ہے: ـــــ پس موسیٰ اپنی قوم کی طرف غضبناک افسوس کرتے ہوئے لوٹے ـــــ اور غیرتِ دینی سے ایسا ہونا ہی چاہئے تھا۔ پھر قوم سے مخاطب ہوکر ـــــ کہا: ''اے میری قوم! کیا تم سے تمہارے پروردگار نے بہترین وعدہ نہیں کیا تھا؟'' ـــــ جو یقیناً پورا ہونے والا تھا کہ وہ تم کو تورات وشریعت عطا فرمائیں گے ـــــ ''پس کیا تم پر مدتِ پیمان دراز ہوگئی؟'' ـــــ یعنی مجھے طور پر گئے ہوئے کل ایک چلّہ تو ہوا ہے، پس کیا تم انتظار کرتے کرتے تھک گئے ـــــ ''یا تم نے چاہا کہ تم پر تمہارے رب کا غضب نازل ہو، پس تم نے مجھ سے وعدہ خلافی کی؟'' ـــــ اور میرے پیچھے طور پر نہ آئے ـــــ یقیناً انھوں نے جان بوجھ کر یہ حرکت کی تھی۔ اور دینِ توحید پر قائم نہ رہ کر خدا کا غضب مول لیا تھا۔

ان لوگوں نے جواب دیا: ''ہم نے اپنے اختیار سے آپ سے وعدہ خلافی نہیں کی'' ـــــ بلکہ کچھ قدرتی عوامل ایسے پیش آئے کہ ہم سفر جاری نہ رکھ سکے۔ اور وہ عوامل یہ ہیں ـــــ ''مگر ہم قوم (مصریوں) کے زیور کا بوجھ اٹھوائے گئے تھے'' ـــــ یعنی مصر سے نکلتے وقت بڑوں کے حکم سے ہم وہ زیورات ساتھ لائے تھے۔ اور ہماری سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ ان کا کیا کریں؟ پھر باہمی مشورہ سے طے پایا کہ ان کو دفن کردیا جائے ـــــ پس ہم نے اس بوجھ کو (گھڑے میں) ڈال دیا، پس اسی طرح سامری نے (بھی جو بوجھ اس کے پاس تھا) ڈال دیا ـــــ اور اس طرح ہم نے اس بلا سے چھٹکارا پالیا۔ پھر سامری نے چپکے سے وہ زیورات نکال لئے اور ان کو پگھلا کر بچھڑا ڈھال لیا۔ ارشاد ہے ـــــ پس سامری نے ان کے لئے ایک بچھڑا نکالا، ایک دھڑ جس کے لئے بیل کی آواز تھی ـــــ یعنی وہ صرف قالب تھا، جو گائے بیل کی طرح بولتا تھا۔ سامری نے اس کی ساخت اور اس میں سوراخ ایسے رکھے تھے کہ جب ہوا اس میں سے گھس کر نکلتی تھی تو وہ رانبھتا تھا۔ جب سامری نے یہ سوانگ بھرا ـــــ تو لوگوں نے کہا: ''یہ تمہارا معبود ہے اور (یہی) موسیٰ کا (بھی) معبود ہے، پس وہ بھول گئے'' ـــــ اور طور پر خدا کی تلاش میں چلے گئے ـــــ اللہ تعالیٰ ان گمراہوں کا رد فرماتے ہیں ـــــ پس کیا وہ نہیں دیکھتے کہ وہ نہ تو ان کی بات کا جواب دیتا ہے،

اور نہ ان کے لئے کسی نقصان کا مالک ہے، نہ کسی نفع کا! ـــــــ یعنی ان اندھوں کی سمجھ میں اتنی موٹی بات بھی نہیں آئی کہ یہ مورت نہ تو کسی سے بات کر سکتی ہے نہ کسی کے نفع ونقصان کی مالک ہے پھر وہ معبود کیسے ہوسکتی ہے؟!

فائدہ: سامری نے جو بچھڑا بنایا تھا وہ زندہ نہیں ہوا تھا۔ صرف کالبد (ڈھانچہ) تھا۔ اسی لئے عِجْلاً کے بعد جَسَدًا لایا گیا ہے۔ اور مستدرک حاکم (۳۸۰:۲) میں حضرت علی رضی اللہ عنہ سے جو تفسیر مروی ہے، اس میں ہے: فَوَضَعَ علیه المَبَارِدَ، فَبَرَدَهُ بِهَا یعنی موسیٰ علیہ السلام نے اس کو ریتیوں (سوہنوں) سے ریت کر ریزہ ریزہ کر دیا۔ اگر زندہ ہوتا تو ذبح کر کے بوٹی بوٹی کیا جاتا ـــــــ البتہ وہ بچھڑا رانبھتا تھا، یعنی گائے بیل جیسی آواز نکالتا تھا۔ بس اتنا کرشمہ لوگوں کے فتنہ کے لئے کافی تھا۔ شیخ سعدی رحمہ اللہ نے بوستان میں سومنات کے ایک بت کا تذکرہ کیا ہے، جو دعا کے لئے ہاتھ اٹھاتا تھا۔ چنانچہ ایک دنیا اس کے پیچھے پاگل تھی۔ حالانکہ اس کی حقیقت یہ تھی کہ تہہ خانے میں سے ایک شخص رسّی کھینچتا تھا جس سے اس بت کے ہاتھ اٹھتے تھے۔ اور ابھی چند سال پہلے افواہ پھیلائی گئی کہ گنپتی دودھ پیتی ہے، تو اس کا ساری دنیا میں شور مچ گیا ـــــــ بلکہ اگر بچھڑا زندہ ہو جاتا تو عجوبہ نہ رہتا۔ زندہ بچھڑے دنیا میں بہت ہیں! ـــــــ اور سامری نے یہ سَوانگ اس لئے بھرا تھا کہ اس سے پہلے بنی اسرائیل موسیٰ علیہ السلام سے ''محسوس معبود'' کا مطالبہ کر چکے تھے۔ جس پر موسیٰ علیہ السلام نے ان کو ڈانٹ پلائی تھی (سورۃ المائدہ آیت ۱۳۸) سامری نے اس ذہنیت سے فائدہ اٹھایا تھا۔

وَلَقَدْ قَالَ لَهُمْ هٰرُوْنُ مِنْ قَبْلُ يٰقَوْمِ اِنَّمَا فُتِنْتُمْ بِهٖ ۚ وَاِنَّ رَبَّكُمُ الرَّحْمٰنُ فَاتَّبِعُوْنِيْ وَاَطِيْعُوْٓا اَمْرِيْ ۝۹۰ قَالُوْا لَنْ نَّبْرَحَ عَلَيْهِ عٰكِفِيْنَ حَتّٰى يَرْجِعَ اِلَيْنَا مُوْسٰى ۝۹۱ قَالَ يٰهٰرُوْنُ مَا مَنَعَكَ اِذْ رَاَيْتَهُمْ ضَلُّوْٓا ۝۹۲ اَلَّا تَتَّبِعَنِ ۭ اَفَعَصَيْتَ اَمْرِيْ ۝۹۳ قَالَ يَبْنَؤُمَّ لَا تَاْخُذْ بِلِحْيَتِيْ وَلَا بِرَاْسِيْ ۚ اِنِّيْ خَشِيْتُ اَنْ تَقُوْلَ فَرَّقْتَ بَيْنَ بَنِيْٓ اِسْرَاۗءِيْلَ وَلَمْ تَرْقُبْ قَوْلِيْ ۝۹۴

وَلَقَدْ	اور البتہ تحقیق	لَهُمْ	ان سے	مِنْ قَبْلُ[1]	پہلے سے
قَالَ	کہا	هٰرُوْنُ	ہارون نے	يٰقَوْمِ	اے میری قوم!

(۱) قبلُ: مبنی ہے۔ اس کا مضاف الیہ منوی ہے۔ أی من قبلِ رجوعِ موسیٰ إلیهم۔

اِنَّمَا	بس	يَرْجِعَ	لوٹیں	اَمْرِيْ	میرے حکم کی؟
فُتِنْتُمْ	آزمائے گئے تم	اِلَيْنَا	ہماری طرف	قَالَ	کہا ہارون نے
بِهٖ (۱)	اس کے ذریعہ	مُوْسٰى	موسیٰ	يَبْنَؤُمَّ (۶)	اے میرے ماں جائے!
وَاِنَّ	اور بیشک	قَالَ	کہا موسیٰ نے	لَا تَاْخُذْ	نہ پکڑیں آپ
رَبَّكُمُ	تمہارا رب	يٰهٰرُوْنُ	اے ہارون	بِلِحْيَتِيْ	میری ڈاڑھی
الرَّحْمٰنُ	رحمان ہے	مَا	کس چیز نے	وَلَا بِرَاْسِيْ	اور نہ میرا سر
فَاتَّبِعُوْنِيْ	پس پیروی کرو تم میری	مَنَعَكَ	روکا تجھے	اِنِّيْ	بیشک مجھے
وَاَطِيْعُوْٓا	اور اطاعت کرو تم	اِذْ	جب	خَشِيْتُ	اندیشہ ہوا
اَمْرِيْ	میرے حکم کی	رَاَيْتَهُمْ	دیکھا تو نے ان کو	اَنْ تَقُوْلَ	کہ آپ کہیں گے
قَالُوْا	جواب دیا انھوں نے	ضَلُّوْٓا	گمراہ ہو گئے ہیں وہ	فَرَّقْتَ	جدائی کر دی تو نے
لَنْ نَّبْرَحَ (۲)	برابر رہیں گے ہم	اَلَّا (۴)	کہ نہ	بَيْنَ	درمیان
عَلَيْهِ	اس پر	تَتَّبِعَنِ (۵)	پیچھے آیا تو میرے	بَنِيْٓ اِسْرَآءِيْلَ	بنی اسرائیل کے
عٰكِفِيْنَ (۳)	جمے بیٹھے	اَ	کیا	وَلَمْ تَرْقُبْ (۷)	اور نظر نہ رکھی تو نے
حَتّٰى	یہاں تک کہ	فَعَصَيْتَ	پس نافرمانی کی تو نے	قَوْلِيْ	میری بات پر

موسیٰ علیہ السلام نے قوم سے باز پرس کی تھی کہ تم نے میرے ساتھ وعدہ خلافی کیوں کی؟ قوم نے جواب دیا تھا کہ ہم نے اپنے اختیار سے وعدہ خلافی نہیں کی ہے۔ کچھ عوامل ایسے پیش آئے کہ ہم چاہنے کے باوجود سفر جاری نہ رکھ سکے، اور وعدہ خلافی ہو گئی۔ اور وہ اسباب سامری کا سوانگ بھرنا، کچھ لوگوں کا گمراہ ہو جانا اور ان کا آگے بڑھنے سے انکار کرنا تھے۔ اگرچہ ان کو حضرت ہارون علیہ السلام نے ہر چند سمجھایا تھا مگر وہ ٹس سے مس نہیں ہوئے تھے۔ ارشاد ہے:

(۱) به: أي بالعجل (۲) بَرِحَ (س) بَرَحًا: الگ ہونا، ہٹنا۔ لن نبرح: ہرگز نہیں ہٹیں گے ہم یعنی برابر رہیں گے ہم۔
(۳) عاکفین: ضمیر متکلم سے حال ہے۔ اور علیه اس کا ظرف مقدم ہے۔ عکف (ن) عکوفا: کسی جگہ ٹھہرنا، قیام کرنا۔
(۴) ألّا: أنْ ناصبہ اور لا نافیہ ہیں۔ اور لا بمعنی منع (نفی) ہے، فصل کی وجہ سے مکرر نفی لائی گئی ہے۔ (۵) تتبعن میں تتبع: فعل مضارع منصوب، صیغہ واحد مذکر حاضر ہے۔ اور ن وقایہ کا، اور آخر میں ی ضمیر واحد متکلم محذوف ہے، ن کا کسرہ اس کی علامت ہے
(۶) یبنؤمَّ: یا ابن أُمِّيْ ہے۔ قرآنی رسم الخط میں سب کو ملا کر لکھا جاتا ہے۔ (۷) رَقَبہ (ن) رَقْبًا: نظر رکھنا، خیال رکھنا۔

——اور البتہ واقعہ یہ ہے کہ ان سے ہارون نے پہلے ہی کہا تھا: ''اے میری قوم! تمہیں بچھڑے کے ذریعہ بس آزمایا گیا ہے، اور تمہارا پروردگار بالیقین نہایت مہربان ہستی ہے'' ——یعنی جس بچھڑے پر تم مفتون ہو رہے ہو، وہ خدا نہیں۔ یہ ایک فتنہ ہے، جس کے ذریعہ تمہاری آزمائش کی جارہی ہے۔ تمہارا پروردگار رحمان (نہایت مہربان ہستی) ہے، جو تمہاری اتنی بڑی غلطی پر بھی چشم پوشی کررہا ہے، اور زندگی کی نعمت سے نوازے ہوئے ہے ——پس تم میری پیروی کرو، اور میرے حکم کی اطاعت کرو ——اور میرے ساتھ کوہِ طور پر چلو، جہاں پہنچنے کا موسیٰ علیہ السلام حکم دے گئے ہیں ——ان لوگوں نے جواب دیا: ''ہم برابر اس پر جمے بیٹھے رہیں گے یہاں تک کہ ہمارے پاس موسیٰ لوٹ آئیں'' ——یعنی اب ہم آگے سفر جاری نہیں رکھ سکتے۔ اِسی خدا کو لئے بیٹھے رہیں گے۔ اور موسیٰ جو خدا کی تلاش میں طور پر گئے ہیں: وہ بھی تھک ہار کر یہیں آئیں گے۔ غرض ایک جماعت نے آگے بڑھنے سے انکار کردیا، پس حضرت ہارون علیہ السلام اور باقی مؤمنین بھی مجبور ہوگئے، اور کوہِ طور کی طرف پیش قدمی رک گئی، یہ وجہ ہوئی وعدہ خلافی کی!

حضرت موسیٰ علیہ السلام جب بنی اسرائیل کی باز پرس سے فارغ ہوئے تو حضرت ہارون علیہ السلام کی طرف متوجہ ہوئے۔ اور انتہائی غیظ وغضب میں ان کی ڈاڑھی اور سر کے بال پکڑ لئے، اور —— کہا: ''اے ہارون! جب تو نے دیکھا کہ یہ لوگ گمراہ ہوگئے ہیں تو کس چیز نے تجھ کو میرے پیچھے آنے سے روکا؟ کیا تو نے (بھی) میرے حکم کی خلاف ورزی کی؟!'' ——یعنی مرنے دیتا ان گمراہوں کو، تجھے چاہئے تھا کہ اہل ایمان کو لے کر طور پر پہنچتا، کیا تو نے بھی میرے حکم کو پس پشت ڈال دیا؟ ——ہارون نے جواب دیا: اے میرے ماں جایے![1] میری ڈاڑھی اور میرا سر نہ پکڑیے، مجھے واقعی یہ اندیشہ ہوا کہ آپ کہیں گے: ''تو نے بنی اسرائیل میں تفریق ڈال دی، اور میری بات پر نظر نہ رکھی!'' ——موسیٰ علیہ السلام طور پر جاتے ہوئے ہارون علیہ السلام سے کہہ گئے تھے کہ ''قوم میں میری جانشینی کرنا، اور اصلاح کرتے رہنا'' (الاعراف آیت ۱۴۲) حضرت ہارون علیہ السلام نے عرض کیا: بھائی جان! میں نے اصلاح کا مطلب یہ سمجھا تھا کہ بنی اسرائیل میں تفرقہ نہ پیدا ہونے دوں، ممکن ہے آپ کی واپسی پر یہ لوگ سنبھل جائیں۔ اگر میں مؤمنین کو لے کر طور پر آجاتا تو یہ لوگ ہاتھ سے جاتے۔

فائدہ: حضرت ہارون علیہ السلام اگرچہ عمر میں حضرت موسیٰ علیہ السلام سے چند سال بڑے تھے، مگر مقام ومرتبہ موسیٰ علیہ السلام کا بلند تھا۔ اور بزرگی بعقل است نہ بہ سال: بڑائی عقل سے ہے نہ کہ عمر سے۔ چنانچہ موسیٰ علیہ السلام نے بڑے بھائی جیسا معاملہ کیا، اور ہارون علیہ السلام نے چھوٹے بھائی جیسا ادب ملحوظ رکھا۔

(۱) ماں جایے: حقیقی بھائی کو کہتے ہیں۔ اور ماں کا تذکرہ رحم ومہربانی طلب کرنے کے لئے ہے۔

فائدہ: غصہ اگر دنیوی معاملات میں ہوتو برا ہے، اور اگر دین کے لئے ہوتو وہ اچھی صفت ہے۔ نبی ﷺ کو بھی جب کسی دینی امر کی خلاف ورزی کی جاتی سخت غصہ آتا تھا، رخسار سرخ ہوجاتے تھے۔ موسیٰ علیہ السلام کا غصہ بھی غیرتِ دینی کی وجہ سے تھا، اس لئے محمود تھا۔

ڈاڑھی کی شرعی مقدار ایک مشت ہے۔ تمام انبیاء علیہم السلام کی ڈاڑھیاں اتنی ہی ہوتی تھیں

قَالَ فَمَا خَطْبُكَ يٰسَامِرِيُّ ﴿٩٥﴾ قَالَ بَصُرْتُ بِمَا لَمْ يَبْصُرُوْا بِهٖ فَقَبَضْتُ قَبْضَةً مِّنْ اَثَرِ الرَّسُوْلِ فَنَبَذْتُهَا وَكَذٰلِكَ سَوَّلَتْ لِيْ نَفْسِيْ ﴿٩٦﴾ قَالَ فَاذْهَبْ فَاِنَّ لَكَ فِي الْحَيٰوةِ اَنْ تَقُوْلَ لَا مِسَاسَ ۪ وَاِنَّ لَكَ مَوْعِدًا لَّنْ تُخْلَفَهٗ ۚ وَانْظُرْ اِلٰٓى اِلٰهِكَ الَّذِيْ ظَلْتَ عَلَيْهِ عَاكِفًا ۭ لَنُحَرِّقَنَّهٗ ثُمَّ لَنَنْسِفَنَّهٗ فِي الْيَمِّ نَسْفًا ﴿٩٧﴾ اِنَّمَآ اِلٰهُكُمُ اللّٰهُ الَّذِيْ لَآ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ ۭ وَسِعَ كُلَّ شَيْءٍ عِلْمًا ﴿٩٨﴾

قَالَ	کہا موسیٰ نے	لَمْ يَبْصُرُوْا	نہیں جانا انھوں نے	وَكَذٰلِكَ	اور ایسا ہی
فَمَا	پس کیا ہے	بِهٖ	اس کو	سَوَّلَتْ (٦)	مزین کیا
خَطْبُكَ	تیرا معاملہ	فَقَبَضْتُ	پس بھرلی میں نے	لِيْ	میرے لئے
يٰسَامِرِيُّ	اے سامری؟	قَبْضَةً (٣)	مٹھی	نَفْسِيْ	میرے نفس نے
قَالَ	کہا اس نے	مِّنْ اَثَرِ	نشان سے	قَالَ	کہا
بَصُرْتُ (١)	جانا میں نے	الرَّسُوْلِ (٤)	رسول کے	فَاذْهَبْ (٧)	پس جاتو
بِمَا (٢)	جس کو	فَنَبَذْتُهَا (٥)	پس پھینک دیا میں نے اسکو	فَاِنَّ	پس بیشک

(١) بَصُرَ (ک) بَصْرًا و بَصَارَة به: جاننا، دیکھنا۔ یہاں پہلے معنی ہیں۔ (٢) بما اور بہ میں ب صلہ کی ہے۔ (٣) قبضةً: مفعول مطلق تقلیل کے لئے ہے یعنی بس ذراسی مٹھی میں نے بھری تھی یعنی بس برائے نام ایمان لایا تھا (٤) رسول سے مراد موسیٰ علیہ السلام ہیں۔ اور سیدھا خطاب یا تو موسیٰ علیہ السلام سے ڈر کر نہیں کیا، یا وہ آپ کا رسولِ خدا ہونا جانتا تھا مگر مانتا نہیں تھا، جیسے سورۃ النمل (آیت ۱۴) میں ہے: ''ان لوگوں نے ظلم وتکبر کی راہ سے معجزات کا انکار کردیا، حالانکہ ان کے دلوں نے ان کا یقین کرلیا تھا'' (٥) نَبَذَ: پھینک دینا، ڈال دینا۔ (٦) سَوَّلَ تَسْوِيْلًا: برائی کو اچھی شکل میں پیش کرنا، اور اس پر اکسانا (٧) اِذْهَبْ: أی من بین الناس.

لَكَ	تیرے لئے	وَانْظُرْ	اور دیکھ تو	فِي الْيَمِّ	دریا میں
فِي الْحَيٰوةِ	زندگی میں	اِلٰٓى اِلٰهِكَ	اپنے معبود کی طرف	نَسْفًا	بکھیرنا
اَنْ	(یہ ہے) کہ	الَّذِيْ	جو کہ	اِنَّمَآ	بس
تَقُوْلَ	کہے تو	ظَلْتَ	ہو گیا ہے تو	اِلٰهُكُمُ	تمہارا معبود
لَا مِسَاسَ (۱)	مت چھونا	عَلَيْهِ	اس پر	اللّٰهُ	اللہ ہے
وَاِنَّ	اور بیشک	عَاكِفًا	گھٹنے ٹیکنے والا	الَّذِيْ	وہ جو
لَكَ	تیرے لئے	لَنُحَرِّقَنَّهٗ (۳)	ضرور جلا دیں گے ہم	لَآ اِلٰهَ	نہیں کوئی معبود
مَوْعِدًا	ایک وعدہ ہے		اس کو	اِلَّا هُوَ	مگر وہی
لَنْ	ہرگز نہیں	ثُمَّ	پھر	وَسِعَ	گھیرنے والا ہے
تُخْلَفَهٗ (۲)	پیچھے ہٹایا جائے گا تو	لَنَنْسِفَنَّهٗ (۴)	ضرور بکھیر دیں گے ہم	كُلَّ شَيْءٍ	ہر چیز کو
	اس سے		اس کو	عِلْمًا (۵)	علم کے اعتبار سے

اب حضرت موسیٰ علیہ السلام: حضرت ہارون علیہ السلام کی صفائی سے مطمئن ہو کر اصل مجرم سامری کی طرف متوجہ ہوتے ہیں ــــ پوچھا: پس تیرا کیا معاملہ ہے، اے سامری؟ ــــ یعنی تو نے یہ کیا حرکت کر ڈالی؟ اور تجھے یہ کیا سوجھی؟ ــــ اس نے جواب دیا: "میں نے وہ بات جانی جس کو بنی اسرائیل نہیں جانتے تھے" ــــ یعنی میں ایک صنعت (ٹیکنیک) جانتا تھا جس سے بنی اسرائیل واقف نہیں تھے۔ میں نے اسی فنی مہارت سے یہ عجیب وغریب بچھڑا بنایا، جس کے راز کو بنی اسرائیل نہ پاسکے ــــ پس میں نے رسول کے نشانِ قدم سے ایک مٹھی بھری ــــ یعنی میں نے برائے نام آپ کی پیروی کی تھی، پورے دل سے آپ کا اتباع نہیں کیا تھا ــــ پس میں نے اس کو پھینک دیا ــــ یعنی میں اوپن ہو گیا۔ نفاق کا لبادہ میں نے اتار پھینکا، اور بچھڑے کا مجاور بن گیا ــــ اور مجھے میرے نفس نے ایسی ہی پٹی پڑھائی ــــ یعنی میرے جی کو یہی بات بھلی لگی، اور میں

(۱) مساس: مصدر بابِ مفاعلہ: نہ کوئی تجھے چھوئے نہ تو کسی کو چھوئے، باہم چھونا ہی نہ ہو۔ (۲) تُخْلَفَه: فعل مضارع مجہول، صیغہ واحد مذکر حاضر، از باب افعال، ہٗ کا مرجع موعداً۔ إخلاف: پیچھے ہٹانا۔ جملہ لن تخلفه: موعداً کی صفت ہے۔ (۳) نُحَرِّقَنَّ: مضارع بالام ونون تاکید، صیغہ جمع متکلم۔ تحریق: خوب جلانا۔ (۴) نَنْسِفَنَّ: مضارع جمع متکلم، بالام ونون تاکید از نَسْف (ض) بکھیر دینا...... نسفًا: مفعول مطلق برائے تاکید۔ (۵) علماً: تمیز محول عن الفاعل، جو درحقیقت فاعل ہے۔

نفس کی چال میں آ گیا۔ خود بھی ڈوبا اور دوسروں کو بھی لے ڈوبا۔

موسیٰ نے کہا: ”پس دور ہو جا!“ —— یعنی لوگوں سے دور رہ —— حضرت موسیٰ علیہ السلام نے سامری کے لئے یہ سزا تجویز کی کہ سب لوگ اس سے مقاطعہ کریں، کوئی اس کے پاس نہ جاوے، اور نہ وہ کسی سے ملے —— اسلام نے بھی مرتد عورت کے لئے یہی سزا تجویز کی ہے کہ اس کو نظر بند کر دیا جائے، نہ وہ کسی سے ملے، نہ کوئی اور عورت یا مرد اس سے ملے، تا کہ اس کا فتنہ نہ بڑھے —— اور شروع اسلام میں بدکار عورت کے لئے بھی یہی سزا تجویز کی گئی تھی (سورۃ النساء آیت ۱۵) —— اور غزوۂ تبوک سے بغیر عذر پیچھے رہ جانے والے تین صحابہ کے لئے بھی یہی سزا تجویز کی گئی تھی (سورۃ التوبہ آیت ۱۱۸) —— پس تیرے لئے اس زندگی میں یہ بات ہے کہ کہے تو: ”مت چھونا!“ —— یعنی مجھے ہاتھ مت لگانا —— کہتے ہیں کہ موسیٰ علیہ السلام کی بددعا سے اس میں یہ کیفیت پیدا ہوگئی تھی کہ اگر وہ کسی کو ہاتھ لگاتا، یا کوئی اس کو ہاتھ لگاتا، تو دونوں کو بخار چڑھ جاتا۔ چنانچہ وہ بخار کے ڈر سے سب سے الگ رہتا، اور وحشی جانوروں کی طرح زندگی گذارتا۔ اور جب کسی کو قریب آتا دیکھتا تو چلاتا: ”مجھے مت چھونا؟“ —— یہ مقاطعہ (بائیکاٹ) کی سزا کے ساتھ پولیس کا پہرہ بھی بٹھا دیا کہ کوئی اس کی خلاف ورزی کر ہی نہ سکے۔

اور بیشک تیرے لئے (آخرت میں) ایک وعدہ ہے، جس سے تو ہرگز پیچھے نہیں ہٹایا جائے گا —— یعنی تجھے تیرے اس جرم کی پوری سزا آخرت میں ملے گی۔ تو ضرور اس تک پہنچ کر رہے گا۔ اس سے پیچھے نہیں رہ سکتا۔

اور تو اپنے اس معبود کو دیکھ، جس کا تو مجاور بنا ہوا ہے۔ ہم ضرور اس کو جلا کر راکھ کا ڈھیر کر دیں گے، پھر ہم ضرور اس کو دریا میں ذرہ ذرہ کر کے بکھیر دیں گے —— یعنی تیری سزا تو وہ تھی جو اوپر بیان ہوئی۔ اب تیرے جھوٹے معبود کی بھی قلعی کھولے دیتا ہوں۔ جس بچھڑے کو تو نے معبود بنایا ہے، اور جس کا تو مجاور بنا ہوا ہے۔ اس کو ابھی تیری آنکھوں کے سامنے توڑ پھوڑ کر اور جلا کر راکھ کر دونگا، پھر راکھ کو دریا میں بہا دوں گا۔ تا کہ اس کے پجاری جان لیں کہ وہ دوسروں کو تو کیا نفع پہنچا سکتا، خود اپنے وجود کی بھی حفاظت نہ کر سکا —— تمہارے معبود تو بس اللہ تعالیٰ ہیں۔ جن کے علاوہ کوئی معبود نہیں۔ ان کا علم ہر چیز کو محیط ہے! —— یعنی سچا معبود تو بس اللہ تعالیٰ ہے۔ اس کے علاوہ کسی کی بندگی عقلاً ونقلاً وفطرۃً روا نہیں۔ اس کا علم لامحدود اور ذرہ ذرہ کو محیط ہے۔

فائدہ: سامری کے مذکورہ جواب کی تفسیر عام طور پر یہ کی جاتی ہے کہ اس نے حضرت جبرئیل علیہ السلام کو گھوڑے پر سوار دیکھا تھا۔ بنی اسرائیل نے ان کو نہیں دیکھا تھا۔ اس وقت سامری نے رسول یعنی جبرئیل علیہ السلام کے نشانِ قدم کی مٹی اٹھالی تھی، اور محفوظ رکھی تھی۔ اس کو بچھڑے کے قالب میں ڈالا تو وہ زندہ ہو گیا اور بولنے لگا —— مگر اس

تفسیر کے سلسلہ میں کوئی مرفوع روایت موجود نہیں۔ البتہ حضرت علی اور حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما کی تفاسیر ہیں۔ مگر ان روایات کو نہ تو امام بخاری رحمہ اللہ نے کتاب التفسیر میں لیا ہے، نہ امام ترمذی رحمہ اللہ نے۔ صرف حاکم نے مستدرک میں حضرت علی رضی اللہ عنہ کی ایک روایت لی ہے، جس میں ہلکا سا اشارہ ہے۔ باقی تمام روایات تیسرے درجہ کی کتابوں میں ہیں۔ اس لئے میں نے ان روایات پر تفسیر کا مدار نہیں رکھا۔ کیونکہ عِجلاً کے بعد جَسَدًا لانے سے یہ بات واضح ہوجاتی ہے کہ وہ بچھڑا زندہ نہیں ہوا تھا۔ صرف دھڑ تھا، جو رانبھتا تھا۔ پھر خاکِ حیات کا کیا فائدہ؟ واللہ اعلم بالصواب۔

مظاہر پرستی والا ذہن کچا ذہن ہے، حقیقت پسندی والا ذہن ہی مثالی ذہن ہے

كَذٰلِكَ نَقُصُّ عَلَيْكَ مِنْ اَنْبَآءِ مَا قَدْ سَبَقَ ۚ وَقَدْ اٰتَيْنٰكَ مِنْ لَّدُنَّا ذِكْرًا ﴿۹۹﴾ مَنْ اَعْرَضَ عَنْهُ فَاِنَّهٗ يَحْمِلُ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ وِزْرًا ﴿۱۰۰﴾ خٰلِدِيْنَ فِيْهِ ۭ وَسَآءَ لَهُمْ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ حِمْلًا ﴿۱۰۱﴾ يَّوْمَ يُنْفَخُ فِي الصُّوْرِ وَنَحْشُرُ الْمُجْرِمِيْنَ يَوْمَىِٕذٍ زُرْقًا ﴿۱۰۲﴾ يَّتَخَافَتُوْنَ بَيْنَهُمْ اِنْ لَّبِثْتُمْ اِلَّا عَشْرًا ﴿۱۰۳﴾ نَحْنُ اَعْلَمُ بِمَا يَقُوْلُوْنَ اِذْ يَقُوْلُ اَمْثَلُهُمْ طَرِيْقَةً اِنْ لَّبِثْتُمْ اِلَّا يَوْمًا ﴿۱۰۴﴾

ع ۵ / ۱۴

كَذٰلِكَ	اسی طرح	مِنْ لَّدُنَّا	اپنے پاس سے	وِزْرًا	بھاری بوجھ
نَقُصُّ	بیان کرتے ہیں ہم	ذِكْرًا	نصیحت نامہ	خٰلِدِيْنَ	ہمیشہ رہنے والے ہیں وہ
عَلَيْكَ	آپ کے سامنے	مَنْ	جو شخص	فِيْهِ	اس بوجھ میں
مِنْ اَنْبَآءِ (۱)	خبروں میں سے	اَعْرَضَ	روگردانی کرے گا	وَسَآءَ	اور برا ہے وہ
مَا قَدْ	ان کی جو تحقیق	عَنْهُ	اس سے	لَهُمْ	ان کے لئے
سَبَقَ	پہلے گذر چکی ہیں	فَاِنَّهٗ	پس بیشک وہ	يَوْمَ الْقِيٰمَةِ	قیامت کے دن
وَقَدْ	اور تحقیق	يَحْمِلُ	اٹھائے گا	حِمْلًا	بوجھ کے اعتبار سے
اٰتَيْنٰكَ	دیا ہم نے آپ کو	يَوْمَ الْقِيٰمَةِ	قیامت کے دن	يَّوْمَ	جس دن

(۱) من: تبعیضیہ، أنباء: مضاف، ماقد سبق: موصول صلہ مل کر مضاف الیہ، پھر جار مجرور: نقص: سے متعلق۔

يُنْفَخُ	پھونکا جائے گا	بَيْنَهُمْ	آپس میں	يَقُوْلُوْنَ	کہتے ہیں وہ
فِي الصُّوْرِ	صور میں	اِنْ	نہیں	اِذْ يَقُوْلُ	جب کہے گا
وَنَحْشُرُ	اور جمع کریں گے ہم	لَّبِثْتُمْ	ٹھہرے تم	اَمْثَلُهُمْ	ان کا بہتر
الْمُجْرِمِيْنَ	مجرموں کو	اِلَّا	مگر	طَرِيْقَةً	راہ کے اعتبار سے
يَوْمَئِذٍ	اس دن	عَشْرًا	دس دن	اِنْ	نہیں
زُرْقًا (۱)	نیلی آنکھوں والے	نَحْنُ	ہم	لَّبِثْتُمْ	ٹھہرے تم
يَّتَخَافَتُوْنَ	چپکے چپکے باتیں کرتے	اَعْلَمُ	خوب جانتے ہیں	اِلَّا	مگر
	ہونگے وہ	بِمَا	اس کو جو	يَوْمًا	ایک دن

اس سورت کا موضوع توحید، رسالت اور آخرت کا بیان ہے۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام کے واقعہ میں توحید کا بیان تھا۔ اب رسالتِ محمدی اور آخرت کا تذکرہ شروع ہوتا ہے اور دلیل نبوت میں قرآن کریم کا ذکر کیا جاتا ہے۔ ارشاد ہے کہ جس طرح ہم نے موسیٰ علیہ السلام کا واقعہ بیان کیا ہے —— اسی طرح ہم آپ کے سامنے گذشتہ واقعات کی کچھ باتیں بیان کرتے ہیں —— یعنی موسیٰ علیہ السلام کی حیاتِ مبارکہ کے جو واقعات ابھی بیان ہوئے، وہ اللہ تعالیٰ کے نازل فرمائے ہوئے ہیں۔ نبی ﷺ نے وہ واقعات اپنی طرف سے بیان نہیں کئے۔ پس اس بیان سے رسالتِ محمدی کا بھی اثبات ہوگیا۔ ان واقعات کا اظہار ایک امّی شخص کی زبان سے خود رسالت کی بہت بڑی دلیل ہے —— اور ہم نے آپ کو اپنے پاس سے ایک نصیحت نامہ دیا ہے —— یعنی قرآن کریم دیا ہے جو عبرت آموز واقعات اور قیمتی نصائح پر مشتمل ہے۔ حدیث شریف میں ہے کہ کتاب اللہ میں تم سے پہلی امتوں کے (سبق آموز) واقعات ہیں۔ اور بعد میں پیش آنے والے احوال کی اطلاعات ہیں۔ اور تمہارے درمیان جو مسائل پیدا ہوتے ہیں: قرآن میں ان کا فیصلہ موجود ہے۔ قرآن قولِ فیصل ہے۔ وہ فضول بات اور یا وہ گوئی نہیں۔ پس —— جو لوگ اس سے روگردانی کریں گے وہ قیامت کے دن بڑا بوجھ اٹھائیں گے، جس میں وہ ہمیشہ رہیں گے۔ اور وہ قیامت کے دن ان کے لئے بُرا بوجھ ہوگا —— یعنی جب ثابت ہوا کہ قرآن پاک اللہ تعالیٰ کی کتاب ہے، پس جو اس کی تکذیب کرے گا، قیامت کے دن وہ اپنے اعراض کا بھاری بوجھ (گناہ) اٹھائے گا۔ اور وہ اس بوجھ کے

(۱) زُرْقًا: صفت مشبہ، زَرْقَاء کی جمع، کبود چشم، کرنجا۔ آنکھوں کا نیلا ہونا عربوں کو نہایت ناپسند تھا، کیونکہ رومی جو عربوں کے دشمن تھے کبود چشم ہوتے تھے۔

تلے ہمیشہ دبا رہے گا، اس کی کبھی نجات نہ ہوگی۔ اور کفر وانکار کرنے والے جان لیں کہ اس بوجھ کا اٹھانا کوئی ہنسی کھیل نہیں۔ جب اٹھائیں گے تو پتہ چل جائے گا کہ وہ کیسا برا اور سخت بوجھ ہے! ـــــ جس دن صور پھونکا جائے گا اور ہم (میدانِ حشر میں) ان کو کبود چشم جمع کریں گے پس وہ آپس میں چپکے چپکے باتیں کریں گے کہ "تم بس دس ہی روز ٹھہرے ہو!" ہم خوب جانتے ہیں ان باتوں کو جو وہ کہہ رہے ہیں، جب ان میں سے سب سے زیادہ صائب الرائے کہے گا کہ "بس تم ایک ہی دن ٹھہرے ہو!" ـــــ یہ قیامت کے دن کی ہولناکی کا بیان ہے ـــــ صور: سینگ کی شکل کی کوئی چیز ہے۔ جس دن حضرت اسرافیل علیہ السلام اس میں پھونک ماریں گے، تو اس کا اثر یہ ہوگا کہ سب مردے زندہ ہو جائیں گے۔ پھر سب کو میدانِ حشر میں جمع کیا جائے گا۔ اس وقت منکرین حق کرنجے ہونگے۔ ان کی آنکھیں نیلی آسمانی رنگ کی ہونگی یعنی وہ قبیح بدشکل ہونگے ـــــ وہ دن ایسا ہولناک ہوگا کہ کفار باہم سرگوشیاں کریں گے کہ دنیا کی یا قبر کی زندگی بس ہفتہ عشرہ کی تھی۔ یعنی بڑی جلدی ختم ہوگئی ـــــ اللہ تعالیٰ ارشاد فرماتے ہیں کہ ہمیں ان کی سب باتوں کا علم ہے، ان کا چپکے سے کہنا ہم سے نہیں چھپتا۔ وہ صحیح سوچ رہے ہیں۔ قیامت کے دن دنیا کے سب مزے اور لمبی چوڑی امیدیں بھولی بسری ہو جائیں گی، اور آخرت کی طویل زندگی کے سامنے پچھلی زندگی بس ذرا سی معلوم ہوگی ـــــ بلکہ جو ان میں زیادہ عقل مند ہوگا وہ کہے گا: "ارے دس دن کہاں رہے؟ صرف ایک ہی دن رہنا ہوا ہے!" یہ شخص اچھی راہ والا اس لئے ہے کہ اس نے آخرت کا دنیا کی زندگی سے تناسب: دوسروں سے بہتر سمجھا ہے۔

وَيَسْـَٔلُوْنَكَ عَنِ الْجِبَالِ فَقُلْ يَنْسِفُهَا رَبِّيْ نَسْفًا ﴿۱۰۵﴾ فَيَذَرُهَا قَاعًا صَفْصَفًا ﴿۱۰۶﴾ لَّا تَرٰى فِيْهَا عِوَجًا وَّلَآ اَمْتًا ﴿۱۰۷﴾ يَوْمَئِذٍ يَّتَّبِعُوْنَ الدَّاعِيَ لَا عِوَجَ لَهٗ ۚ وَخَشَعَتِ الْاَصْوَاتُ لِلرَّحْمٰنِ فَلَا تَسْمَعُ اِلَّا هَمْسًا ﴿۱۰۸﴾ يَوْمَئِذٍ لَّا تَنْفَعُ الشَّفَاعَةُ اِلَّا مَنْ اَذِنَ لَهُ الرَّحْمٰنُ وَرَضِيَ لَهٗ قَوْلًا ﴿۱۰۹﴾ يَعْلَمُ مَا بَيْنَ اَيْدِيْهِمْ وَمَا خَلْفَهُمْ وَلَا يُحِيْطُوْنَ بِهٖ عِلْمًا ﴿۱۱۰﴾ وَعَنَتِ الْوُجُوْهُ لِلْحَيِّ الْقَيُّوْمِ ۭ وَقَدْ خَابَ مَنْ حَمَلَ ظُلْمًا ﴿۱۱۱﴾ وَمَنْ يَّعْمَلْ مِنَ الصّٰلِحٰتِ وَهُوَ مُؤْمِنٌ فَلَا يَخٰفُ ظُلْمًا وَّلَا هَضْمًا ﴿۱۱۲﴾

وَيَسْـَٔلُوْنَكَ	اور لوگ پوچھتے ہیں آپ سے	عَنِ الْجِبَالِ	پہاڑوں کے بارے میں	فَقُلْ	پس کہہ دیں آپ

یَنۡسِفُهَا (۱)	اُڑادے گا ان کو	لِلرَّحۡمٰنِ	رحمان کے لئے	خَلۡفَهُمۡ	ان کے پیچھے ہے
رَبِّیۡ	میراپروردگار	فَلَا تَسۡمَعُ	پس نہیں سنے گا تو	وَلَا	اور نہیں
نَسۡفًا	اڑانا	اِلَّا	مگر	یُحِیۡطُوۡنَ	احاطہ کرتے وہ
فَیَذَرُهَا (۲)	پس چھوڑ دیگا زمین کو	هَمۡسًا	پیروں کی چاپ	بِهٖ	اس کا
قَاعًا (۳)	میدان	یَوۡمَئِذٍ	اس دن	عِلۡمًا	علم کے اعتبار سے
صَفۡصَفًا (۴)	ہموار	لَّا تَنۡفَعُ	نہیں کام آئے گی	وَعَنَتِ (۶)	اور جھک جائیں گے
لَّا تَرٰی	نہیں دیکھے گا تو	الشَّفَاعَةُ	سفارش	الۡوُجُوۡهُ	تمام چہرے
فِیۡهَا	اس میں	اِلَّا	مگر	لِلۡحَیِّ	زندہ ہستی کے لئے
عِوَجًا	کوئی ناہمواری	مَنۡ	اس شخص کے لئے	الۡقَیُّوۡمِ	مخلوق کو تھامنے والی
وَّلَا	اور نہ	اَذِنَ	(کہ) اجازت دیں	وَقَدۡ	اور تحقیق
اَمۡتًا (۵)	کوئی بلندی	لَهُ	اس کے لئے	خَابَ	نامراد ہوا
یَوۡمَئِذٍ	اس دن	الرَّحۡمٰنُ	رحمان	مَنۡ	جس نے
یَّتَّبِعُوۡنَ	پیروی کریں گے لوگ	وَرَضِیَ	اور پسند کریں	حَمَلَ	اٹھایا
الدَّاعِیَ	بلانے والے کی	لَهٗ	اس کے لئے	ظُلۡمًا	ظلم (شرک)
لَا	نہیں (ہوگی)	قَوۡلًا	بات (سفارش)	وَمَنۡ	اور جو شخص
عِوَجَ	کوئی کجی	یَعۡلَمُ	جانتے ہیں وہ	یَّعۡمَلۡ	کرے
لَهٗ	اس (مدعو) کے لئے	مَا	جو کچھ	مِنَ الصّٰلِحٰتِ	نیک کاموں سے
وَ خَشَعَتِ	اور دب جائیں گی	بَیۡنَ اَیۡدِیۡهِمۡ	ان کے آگے ہے	وَهُوَ	درانحالیکہ وہ
الۡاَصۡوَاتُ	تمام آوازیں	وَمَا	اور جو کچھ	مُؤۡمِنٌ	ایماندار ہو

(۱) نَسَفَ (ض) الشیئَ: ہوا میں اڑنا، بکھیرنا۔ نسفًا: مصدر مفعول مطلق برائے تاکید ہے۔ (۲) وَذِرَ یَذَرُ (باب سمع) چھوڑنا۔ اس فعل کے صرف مضارع اور امر مستعمل ہیں۔ ذَرْ: چھوڑ۔ ماضی مستعمل نہیں۔ اس کے لئے تَرَكَ آتا ہے۔ (۳) القاع: پہاڑوں اور ٹیلوں کے درمیان ہموار میدان، جمع: قِیْعَان اور أَقْوَاع (۴) الصَّفْصَف: سپاٹ ہموار زمین۔ (۵) الأَمْت: بلند جگہ، چھوٹے ٹیلے۔ (۶) عَنَا یَعْنُوْ عُنُوًّا: جھکنا، تسلیم کرنا۔

فَلَا	پس نہیں	ظُلْمًا	ظلم (زیادتی) سے	هَضْمًا [۱]	کمی سے
يَخٰفُ	ڈرے گا وہ	وَّلَا	اور نہ	۞	۞

توحید کے بیان کے بعد گذشتہ آیات میں رسالتِ محمدی کا بیان شروع ہوا تھا۔ اور دلیلِ نبوت میں قرآن کریم کا تذکرہ کیا تھا۔ ساتھ ہی آخرت میں قرآن سے روگردانی کا وبال سنایا تھا۔ اس طرح آخرت کا ذکر بھی آ گیا تھا۔ اب اِن آیات میں قیامت اور اس کے احوال کا بیان ہے۔ پھر قرآن کریم کا تذکرہ آئے گا ——— جب قیامت کا ذکر آیا تو منکرین ہنسی مذاق کے طور پر کہنے لگے: اِن بڑے بڑے پہاڑوں کا کیا ہوگا؟ کیا یہ سب ٹوٹ پھوٹ کر ختم ہو جائیں گے؟ یہ کیسے ممکن ہے؟ خیال رہے کہ عرب کی سرزمین پہاڑوں سے بھری پڑی ہے۔ اللہ تعالیٰ اس کا جواب ارشاد فرماتے ہیں: ——— اور لوگ آپؐ سے پہاڑوں کے بارے میں پوچھتے ہیں؟ پس آپ کہہ دیں کہ ان کو میرا پروردگار توڑ پھوڑ کر ہوا میں اڑا دے گا ——— سورۃ الواقعہ (آیت ۵و۶) میں ہے: ''اور پہاڑ بالکل ریزہ ریزہ ہو جائیں گے، پھر وہ پراگندہ غبار ہو جائیں گے'' ——— پس زمین کو ہموار میدان بنا کر رکھ دے گا، آپ اس میں نہ کوئی ناہمواری دیکھیں گے نہ کوئی بلندی! ——— یعنی اللہ تعالیٰ کی قدرتِ کاملہ کے سامنے پہاڑوں کی کیا حیثیت ہے؟! سب نیست ونابود ہو جائیں گے۔ دُھنی ہوئی روئی کے گالوں کی طرح ہوا میں اڑ جائیں گے۔ اور زمین بالکل سپاٹ ہو جائے گی ——— اس دن لوگ بلانے والے کی پیروی کریں گے، اس (مدعو) کے لئے ذرا کجی نہیں ہوگی ——— جدھر فرشتہ بلائے گا لوگ سیدھے تیر کی طرح دوڑے جائیں گے۔ کسی میں مجال نہ ہوگی کہ اس کے حکم سے سرتابی کرے۔ نہ کسی کا ٹیڑھا پن اس کے سامنے چل سکے گا ——— پس کاش لوگ آج بھی اللہ کے داعی رسول اللہ ﷺ کی آواز پر لبیک کہتے، اور ان کی طرف لپکتے۔ مگر یہاں لوگ اپنی بدبختی سے کج روی اختیار کرتے ہیں۔ اور ٹیڑھی چال چلتے ہیں۔ وہ اپنا انجام سوچ لیں۔

قیامت کے دن کی ہولناکی: ——— اور تمام آوازیں نہایت مہربان اللہ کے سامنے دب جائیں گی، پس آپ پیروں کی چاپ کے سوا کچھ نہ سنیں گے ——— یعنی قیامت کے دن خوف ودہشت سے سب کی گھگّی بندھ جائے گی۔ پیروں کی آہٹ کے علاوہ کوئی آواز سنائی نہ دے گی۔ اگر کوئی کچھ کہے گا بھی تو اس قدر آہستہ بولے گا کہ جیسے کانا پھوسی کرتے ہیں ——— اس دن سفارش کام نہیں آئے گی، مگر جس کے لئے نہایت مہربان اللہ (سفارش کی) اجازت دیدیں، اور اس کے لئے بات کو پسند کریں ——— قیامت کے دن شفاعت کی اجازت صرف مؤمنین کے

(۱) هَضَمَ حَقَّه: حق تلفی کرنا۔ کسی کا حق کم کرنا۔

حق میں ملے گی۔ کافر ومشرک کے لئے کوئی شفاعت نہ ہو سکے گی۔ مؤمن اگرچہ فاسق وفاجر ہو اس کے لئے کسی نہ کسی وقت شفاعت کا دروازہ کھلے گا۔ اور شفاعت صرف وہی کرے گا جس کو اجازت ملے گی۔ اجازت کے بغیر کوئی لب کشائی نہیں کر سکے گا۔ گویا شفاعت صرف ظاہری اور رسمی کارروائی ہوگی، حقیقت میں اللہ تعالیٰ ہی کا حکم ہوگا۔ پس جو لوگ بتوں کی، فرشتوں کی، نبیوں اور ولیوں کی شفاعت پر تکیہ کئے ہوئے ہیں، اور ایمان وعمل سے غافل ہیں، وہ قانونِ شفاعت کو اچھی طرح سمجھ لیں اور غفلت سے بیدار ہو جائیں ـــــ اللہ تعالیٰ جانتے ہیں جو کچھ بندوں کے سامنے ہے، اور جو کچھ ان کے پیچھے ہے، اور لوگ اللہ تعالیٰ کو احاطۂ علمی میں نہیں لا سکتے ـــــ یعنی اللہ تعالیٰ کا علم بندوں کے تمام احوال کو محیط ہے۔ لوگوں کے احوال کا کوئی ذرہ اللہ کے علم سے باہر نہیں۔ وہ اپنے علم کامل سے جانتے ہیں کہ کون شفاعت کا مستحق ہے کون نہیں؟ کس کے لئے اجازت دینی مناسب ہے کس کے لئے نہیں؟ ـــــ اور مخلوق نہ تو اللہ تعالیٰ کی ذات کا احاطہ کر سکتی ہے نہ صفات کا۔ نہ ان کی ساری معلومات کو جان سکتی ہے، کیونکہ ان کی معلومات بے انتہا ہیں۔ پس آج کون جان سکتا ہے کہ کس کے لئے شفاعت کی اجازت ملے گی اور کس کے لئے نہیں ملے گی؟ ـــــ اور تمام چہرے سدا زندہ رہنے والی مخلوق کو سنبھالنے والی ذات کے سامنے جھک جائیں گے ـــــ یعنی اس دن سرکش ومتکبر کا غرور کافور ہو جائے گا۔ سب اکڑفوں خاک میں مل جائے گی۔ اور حی وقیوم کے سامنے ان کے سر جھکے ہوئے ہونگے۔ کسی کو سر اٹھانے کی تاب نہ ہوگی۔

قیامت کے دن لوگوں کا انجام ـــــ اور یقیناً وہ شخص نامراد ہوا جس نے ظلم اٹھایا ـــــ یعنی جو دنیا سے ظلم وشرک کی گٹھڑی اٹھا کر آخرت میں پہنچا اس کا بیڑا غرق ہوا۔ قیامت کے دن ان ظالموں کا حال نہ پوچھو کیسا خراب ہوگا! ـــــ اور جو شخص نیک کام کرے درانحالیکہ وہ مؤمن ہے تو وہ نہ زیادتی سے ڈرے گا نہ کمی سے! ـــــ یعنی مؤمن صالح کو اس دن کامل ثواب ملے گا۔ اس پر نہ تو کوئی ناکردہ گناہ چپکایا جائے گا، نہ اس کی نیکی کے ثواب میں کمی کی جائے گی۔ ہاں نیکی کا ثواب دس گنا یا زیادہ ضرور بڑھایا جائے گا۔ مگر یہ ظلم نہیں فضل ہوگا۔

وَكَذٰلِكَ اَنْزَلْنٰهُ قُرْاٰنًا عَرَبِيًّا وَّصَرَّفْنَا فِيْهِ مِنَ الْوَعِيْدِ لَعَلَّهُمْ يَتَّقُوْنَ اَوْ يُحْدِثُ لَهُمْ ذِكْرًا ﴿۱۱۳﴾ فَتَعٰلَى اللّٰهُ الْمَلِكُ الْحَقُّ ۚ وَلَا تَعْجَلْ بِالْقُرْاٰنِ مِنْ قَبْلِ اَنْ يُّقْضٰٓى اِلَيْكَ وَحْيُهٗ ۫ وَقُلْ رَّبِّ زِدْنِيْ عِلْمًا ﴿۱۱۴﴾ وَلَقَدْ عَهِدْنَآ اِلٰٓى اٰدَمَ مِنْ قَبْلُ فَنَسِيَ وَلَمْ نَجِدْ لَهٗ عَزْمًا ﴿۱۱۵﴾ ع

ع ۶ ۱۱ ۱۵

وَكَذٰلِكَ (1)	اور اُسی طرح	ذِكْرًا	یاد	وَقُلْ	اور کہیں آپ
اَنْزَلْنٰهُ	اتارا ہم نے قرآن کو	فَتَعٰلَى (5)	پس بہت عالی شان ہیں	رَبِّ	اے میرے پروردگار!
قُرْاٰنًا (2)	پڑھنے کی کتاب	اللّٰهُ	اللہ تعالیٰ	زِدْنِيْ	بڑھایئے مجھے
عَرَبِيًّا (3)	نہایت واضح	الْمَلِكُ	بادشاہ	عِلْمًا	علم میں
وَّصَرَّفْنَا (4)	اور پھیر پھیر کر بیان	الْحَقُّ	برحق	وَلَقَدْ	اور البتہ تحقیق
	کئے ہم نے	وَلَا	اور نہ	عَهِدْنَآ (7)	پیمان باندھا ہم نے
فِيْهِ	اس میں	تَعْجَلْ (6)	جلدیں کریں آپ	اِلٰٓى اٰدَمَ	آدمؑ سے
مِنَ الْوَعِيْدِ	انتباہات	بِالْقُرْاٰنِ	قرآن کے ساتھ	مِنْ قَبْلُ	قبل ازیں
لَعَلَّهُمْ	شاید وہ	مِنْ قَبْلِ	اس سے پہلے	فَنَسِيَ	پس وہ بھول گئے
يَتَّقُوْنَ	بچیں	اَنْ	کہ	وَلَمْ	اور نہیں
اَوْ	یا	يُّقْضٰٓى	پوری کردی جائے	نَجِدْ	پائی ہم نے
يُحْدِثُ	پیدا کرے قرآن	اِلَيْكَ	آپ کی طرف	لَهٗ	ان کے لئے
لَهُمْ	ان کے لئے	وَحْيُهٗ	اس کی وحی	عَزْمًا	پختگی

اب پھر گذشتہ سے پیوستہ مضمون کی طرف روئے سخن ہے۔ موسیٰ علیہ السلام کا واقعہ تفصیل سے بیان کرنے کے بعد رسالتِ محمدی کا تذکرہ شروع ہوا تھا۔ اور دلیلِ نبوت کے طور پر قرآن کریم کو پیش کیا تھا۔ پھر آخرت میں قرآن سے روگردانی کا وبال سنایا تھا، یوں آخرت اور قیامت کا ذکر چل پڑا تھا۔ اب پھر رسالتِ محمدی کی دلیل: قرآن کریم کا تذکرہ شروع کیا جاتا ہے۔ ارشاد ہے ــــــ اور اُسی طرح ہم نے قرآن کو نہایت واضح پڑھنے کی کتاب بنا کر نازل کیا ہے۔ اور ہم نے اس میں طرح طرح سے انتباہات دیئے ہیں ــــــ یعنی جس طرح ہم نے موسیٰ علیہ السلام کی زندگی

(۱) **كذلك** کا عطف پہلے **كذلك** پر ہے۔ (۲) **قرآن:** مصدر باب فتح۔ جس کے معنی ہیں: پڑھنا، کسی کتاب کے الفاظ میں غور کرنا۔ یہاں مراد پڑھنے کی کتاب ہے۔ (۳) عربی کے معنی ہیں: فصیح، صاف اور واضح کلام: **العربی: الفصیح البین من الکلام** (مفردات راغب) (۴) **صَرَّف تصریفا:** پھیر پھیر کر بیان کرنا، پلٹ پلٹ کر بیان کرنا۔ (۵) **تَعَالی:** فعل ماضی، صیغہ واحد مذکر غائب: برتر و بلند ہونا۔ اور باب تفاعل مبالغہ کے لئے ہے۔ (۶) **عَجِل** (س) **بالشیئ:** کسی چیز کے بارے میں جلد بازی کرنا۔ (۷) **عَهِدَ إليه:** عہد و پیمان باندھنا۔ کسی بات کی نہایت تاکید کرنا۔

کے کچھ واقعات وحی کے ذریعہ سنائے ہیں، اُسی طرح یہ پورا قرآن ہم نے نہایت واضح پڑھنے کی کتاب کی صورت میں نازل کیا ہے۔ اور اس میں پھیر پھیر کر انتباہات ذکر کئے ہیں، یعنی بنیادی مسائل: توحید، رسالت اور آخرت کو مختلف انداز سے بار بار بیان کیا ہے۔ اس لئے کہ قرآن ''مثانی'' ہے۔ یعنی مواعظ وقصص کو مختلف پیرایوں میں دُہرایا گیا ہے، تاکہ وہ اچھی طرح ذہن نشین ہوجائیں ——— تاکہ لوگ (کفر وشرک اور معاصی سے) بچیں ——— یعنی ایمان لائیں اور اپنی زندگی سنواریں ——— یا (کم ازکم) قرآن ان کی یاد تازہ کرے ——— یعنی ان کے لئے لمحہ فکریہ پیدا کرے۔ اور جب یاد تازہ ہوجائے گی تو ممکن ہے وہ انجام کو سوچیں۔ اور یہ سوچ بڑھتے بڑھتے ان کو ہدایت کی راہ پر گامزن کردے ——— پس برحق بادشاہ اللہ تعالیٰ عالی شان ہیں ——— یہ قرآن نازل کرنے کی دلیل ہے۔ دنیا کے بادشاہ اور حکومتیں جو محض مجازی حاکم ہیں اور ان کی شان برائے نام ہے: اپنی رعایا کی فکر کرتے ہیں۔ ان کے لئے دستور بناتے ہیں۔ ان کی بھلائی کی تدبیریں سوچتے ہیں۔ پس اللہ تعالیٰ جو برحق بادشاہ ہیں اور جو بڑے عالی شان ہیں: وہ یہ کام کیسے نہیں کریں گے؟! ان کی شانِ عالی سے یہ بات بہت ہی بعید ہے کہ وہ اپنی اشرف مخلوق انسان کو بس یونہی چھوڑ دیں اور اس کی دینی اور روحانی ضرورت کا انتظام نہ کریں ——— اُسی روحانی ضرورت کی تکمیل کے لئے اللہ تعالیٰ نے یہ عظیم الشان کتاب نازل کی ہے۔ یہ پڑھنے کی کتاب ہے، صرف سن لینے کی بات نہیں، سنی ہوئی بات ذہن سے نکل بھی جاتی ہے۔ اور کتاب کو بار بار پڑھا جاسکتا ہے، اور اس کا حکم یاد رکھا جاسکتا ہے ——— پھر وہ کوئی پیچیدہ کتاب نہیں۔ نہایت صاف واضح کتاب ہے۔ ہر شخص خواہ عربی ہو یا عجمی، شہری ہو یا دیہاتی، مرد ہو یا عورت، پڑھا لکھا ہو یا اَن پڑھ: اس کتاب سے فائدہ اٹھاسکتا ہے اور ایمان کی منزل تک پہنچ سکتا ہے۔

قرآن کے مطالعہ کا طریقہ: ——— اور آپ قرآن کے بارے میں جلدی نہ کریں، اس سے پہلے کہ آپ کی طرف اس کی وحی مکمل کردی جائے، اور آپ دعا کریں: ''اے میرے پروردگار! میرے علم میں اضافہ فرما! ——— یعنی جو غیر مسلم قرآن کریم کا مطالعہ کرے اس کے لئے خاص ہدایت یہ ہے کہ وہ قرآن کے بارے میں فیصلہ کرنے میں جلدی نہ کرے، پہلے اطمینان سے پورے قرآن کا مطالعہ کرلے۔ اس لئے کہ قرآن کریم مثانی ہے۔ پس ممکن ہے کہ کوئی مضمون ایک جگہ سمجھ میں نہ آئے پس جب وہ مضمون دوسری جگہ آئے گا تو بات واضح ہوجائے گی۔ البتہ یہ دعا کرتا رہے کہ الٰہی! میری راہ نمائی فرما، میرے علم میں اضافہ فرما اور مجھے ہدایت سے ہم کنار فرما۔ اگر اس طرح قرآن کریم کا مطالعہ کیا جائے گا تو ذہن کے دریچے کھلیں گے۔ اور اللہ تعالیٰ نے چاہا تو وہ منزل مقصود تک پہنچے گا۔

ایک انتباہ: اس کے بعد قرآن کا مطالعہ کرنے والے کو ایک انتباہ دیا جاتا ہے۔ ارشاد ہے ——— اور البتہ واقعہ یہ

ہے کہ ہم نے قبل ازیں آدم سے ایک پیمان باندھا تھا، پس وہ بھول گئے، اور ہم نے ان میں پختگی نہ پائی ـــــ اللہ تعالیٰ نے آدم علیہ السلام سے جو عہد و پیمان کیا تھا، اس کا تذکرہ اگلی آیات میں آرہا ہے۔ اُس واقعہ کو یاد دلانے سے مقصود یہ ہے کہ قرآن پاک کا مطالعہ کرنے والا مطالعہ کے طریقہ کو بھول نہ جائے۔ وہ قرآن کا مطالعہ پورا کرنے سے پہلے کوئی منفی فیصلہ نہ کرلے۔ اگر وہ ایسا کرے گا تو اپنا ہی نقصان کرے گا۔ اور بھول کا احتمال اس لئے ہے کہ وہ آدم زاد ہے۔ اور آدم علیہ السلام سے ذہول ہو چکا ہے۔ انھوں نے اللہ کی تاکید بھول کر ممنوع درخت کھالیا تھا۔ اور اولاد میں باپ کا اثر ضرور آتا ہے۔ چنانچہ انسان کی فطرت میں بھی کسی مصلحت سے بھول کا مادہ رکھا گیا ہے۔ اس لئے انسان میں ارادہ کی پختگی نہیں۔ پس مطالعہ کرنے والے کو مذکورہ نصیحت یاد رکھنی چاہئے۔

آیت کا شانِ نزول: حدیث میں ہے کہ ابتدائے وحی میں جب جبرئیل علیہ السلام وحی سناتے تو رسول اللہ ﷺ بھی ان کے ساتھ پڑھتے تاکہ یاد سے نکل نہ جائے۔ مگر اس سے آپ پر دُوہرا بوجھ پڑتا تھا، چنانچہ سورۃ قیامہ میں اور یہاں آپ ﷺ کو جبرئیل کے ساتھ پڑھنے سے روکا گیا۔ تفصیل سورۂ قیامہ میں آئے گی ـــــ یہاں سمجھنے کی بات یہ ہے کہ شانِ نزول ایک مستقل واقعہ ہوتا ہے، پھر نازل شدہ آیات کو لوح محفوظ کی ترتیب کے مطابق جہاں رکھا جاتا ہے، وہاں مناسبت دوسری ہوتی ہے۔

جو بندے دل لگا کر قرآن پڑھتے ہیں، ان کے لئے ہدایت کا راستہ ضرور کھلتا ہے

وَ اِذْ قُلْنَا لِلْمَلٰٓئِكَةِ اسْجُدُوْا لِاٰدَمَ فَسَجَدُوْٓا اِلَّآ اِبْلِيْسَ ؕ اَبٰى ﴿۱۱۶﴾ فَقُلْنَا يٰٓاٰدَمُ اِنَّ هٰذَا عَدُوٌّ لَّكَ وَلِزَوْجِكَ فَلَا يُخْرِجَنَّكُمَا مِنَ الْجَنَّةِ فَتَشْقٰى ﴿۱۱۷﴾ اِنَّ لَكَ اَلَّا تَجُوْعَ فِيْهَا وَلَا تَعْرٰى ﴿۱۱۸﴾ وَ اَنَّكَ لَا تَظْمَؤُا فِيْهَا وَلَا تَضْحٰى ﴿۱۱۹﴾ فَوَسْوَسَ اِلَيْهِ الشَّيْطٰنُ قَالَ يٰٓاٰدَمُ هَلْ اَدُلُّكَ عَلٰى شَجَرَةِ الْخُلْدِ وَمُلْكٍ لَّا يَبْلٰى ﴿۱۲۰﴾ فَاَكَلَا مِنْهَا فَبَدَتْ لَهُمَا سَوْاٰتُهُمَا وَطَفِقَا يَخْصِفٰنِ عَلَيْهِمَا مِنْ وَّرَقِ الْجَنَّةِ ۫ وَعَصٰٓى اٰدَمُ رَبَّهٗ فَغَوٰى ﴿۱۲۱﴾ ثُمَّ اجْتَبٰهُ رَبُّهٗ فَتَابَ عَلَيْهِ وَهَدٰى ﴿۱۲۲﴾ قَالَ اهْبِطَا مِنْهَا جَمِيْعًۢا بَعْضُكُمْ لِبَعْضٍ عَدُوٌّ ۚ فَاِمَّا يَاْتِيَنَّكُمْ مِّنِّيْ هُدًى ۙ فَمَنِ

اتَّبَعَ هُدَايَ فَلَا يَضِلُّ وَلَا يَشْقٰى ﴿۱۲۳﴾ وَمَنْ اَعْرَضَ عَنْ ذِكْرِيْ فَاِنَّ لَهٗ مَعِيْشَةً ضَنْكًا وَّنَحْشُرُهٗ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ اَعْمٰى ﴿۱۲۴﴾ قَالَ رَبِّ لِمَ حَشَرْتَنِيْٓ اَعْمٰى وَقَدْ كُنْتُ بَصِيْرًا ﴿۱۲۵﴾ قَالَ كَذٰلِكَ اَتَتْكَ اٰيٰتُنَا فَنَسِيْتَهَا ۚ وَكَذٰلِكَ الْيَوْمَ تُنْسٰى ﴿۱۲۶﴾

وَاِذْ (۱)	اور (یاد کرو) جب	وَلِزَوْجِكَ	اور آپ کی بیوی کا	فِيْهَا	جنت میں
قُلْنَا	کہا ہم نے	فَلَا	پس نہ	وَلَا تَضْحٰى (۸)	اور نہ دھوپ میں تپتے ہیں
لِلْمَلٰٓئِكَةِ	فرشتوں سے	يُخْرِجَنَّكُمَا (۲)	نکال دے وہ تم دونوں کو		
اسْجُدُوْا	سجدہ کرو	مِنَ الْجَنَّةِ	جنت سے	فَوَسْوَسَ (۹)	پس وسوسہ ڈالا
لِاٰدَمَ	آدم کو	فَتَشْقٰى (۳)	پس مشقت میں	اِلَيْهِ	ان کی طرف
فَسَجَدُوْٓا	پس سجدہ کیا انھوں نے		پڑ جائیں آپ	الشَّيْطٰنُ	شیطان نے
اِلَّآ	مگر	اِنَّ	بیشک	قَالَ	کہا اس نے
اِبْلِيْسَ	ابلیس نے	لَكَ	حاصل ہے آپ کو	يٰٓاٰدَمُ	اے آدم
اَبٰى	انکار کیا	اَلَّا (۴)	یہ بات کہ نہ	هَلْ	کیا
فَقُلْنَا	پس کہا ہم نے	تَجُوْعَ (۵)	بھوکے ہوتے ہیں آپ	اَدُلُّكَ	آگاہ کروں میں آپ کو
يٰٓاٰدَمُ	اے آدم	فِيْهَا	جنت میں	عَلٰى شَجَرَةِ	درخت پر
اِنَّ هٰذَا	بیشک یہ	وَلَا تَعْرٰى (۶)	اور نہ ننگے ہوتے ہیں آپ	الْخُلْدِ	ہیشگی کے
عَدُوٌّ	دشمن ہے	وَاَنَّكَ	اور یہ بات کہ آپ	وَمُلْكٍ	اور بادشاہت (پر)
لَّكَ	آپ کا	لَا تَظْمَؤُا (۷)	نہ پیاسے ہوتے ہیں	لَّا يَبْلٰى (۱۰)	جو پرانی نہ ہو؟

(۱) إذ کا عامل اذکر محذوف ہے۔(۲) لا يُخْرِجَنَّ: فعل نہی، صیغہ واحد مذکر غائب، بانون تاکید، کما ضمیر تثنیہ مفعول، إخراج: نکالنا (۳) شَقِيَ يَشْقٰى (س) شَقَاءٌ: محنت ومشقت میں پڑنا، تکلیف اٹھانا۔(۴) أَلَّا: أن اور لا ہے (۵) جَاعَ يَجُوْعُ (ن) جَوْعاً: بھوکا ہونا۔ بھوک لگنا۔(۶) عَرِيَ يَعْرٰى (س) عُرْيًا من ثيابه: ننگا ہونا، برہنہ ہونا۔(۷) ظَمِئَ يَظْمَأُ (س) ظَمَأً: سخت پیاس لگنا۔(۸) ضَحِيَ يَضْحٰى (س) ضَحْوًا: دھوپ کی گرمی لگنا۔(۹) وسوس إليه: دل میں برا خیال ڈالنا، برائی پر اکسانا، ورغلانا، ایسی بات سمجھانا جو شر کا باعث ہو۔(۱۰) بَلِيَ يَبْلٰى (س) الثوب بَلًى: کپڑے کا بوسیدہ ہونا

فَاَكَلَا	پس کھایا دونوں نے	وَهَدٰى	اور راہ دکھائی	عَنْ ذِكْرِيْ	میری نصیحت سے
مِنْهَا	درخت سے	قَالَ	فرمایا	فَاِنَّ	پس بیشک
فَبَدَتْ	پس ظاہر ہو گیا	اهْبِطَا	اترو دونوں	لَهٗ	اس کے لئے
لَهُمَا	دونوں کے لئے	مِنْهَا	جنت سے	مَعِيْشَةً	گذران ہے
سَوْاٰتُهُمَا (۱)	دونوں کا ننگاپا	جَمِيْعًا	سارے ہی	ضَنْكًا (۷)	تنگی کا
وَطَفِقَا (۲)	اور لگے دونوں	بَعْضُكُمْ	تمہارا بعض	وَّنَحْشُرُهٗ	اور جمع کریں گے ہم
يَخْصِفٰنِ (۳)	چپکانے	لِبَعْضٍ	بعض کے لئے		اس کو
عَلَيْهِمَا	اپنے اوپر	عَدُوٌّ	دشمن ہے	يَوْمَ الْقِيٰمَةِ	قیامت کے دن
مِنْ وَّرَقِ	پتوں سے	فَاِمَّا (۶)	پس اگر	اَعْمٰى	اندھا
الْجَنَّةِ	جنت کے	يَاْتِيَنَّكُمْ	پہنچے تم کو	قَالَ	کہا اس نے
وَعَصٰٓى	اور قصور کیا	مِّنِّيْ	میری طرف سے	رَبِّ	اے میرے رب!
اٰدَمُ	آدم نے	هُدًى	راہ نمائی	لِمَ	کیوں
رَبَّهٗ	اپنے رب کا	فَمَنِ	پس جس نے	حَشَرْتَنِيْٓ	جمع کیا آپ نے مجھے
فَغَوٰى (۴)	پس غلط راستہ پر پڑ گئے	اتَّبَعَ	پیروی کی	اَعْمٰى	اندھا
ثُمَّ	پھر	هُدَايَ	میری راہ نمائی کی	وَقَدْ كُنْتُ	حالانکہ تحقیق تھا میں
اجْتَبٰهُ (۵)	چن لیا ان کو	فَلَا يَضِلُّ	پس نہ گمراہ ہوگا وہ	بَصِيْرًا	بینا؟
رَبُّهٗ	ان کے رب نے	وَلَا يَشْقٰى	اور نہ مشقت میں پڑیگا	قَالَ	فرمایا
فَتَابَ	پس توجہ فرمائی	وَمَنْ	اور جس نے	كَذٰلِكَ	اسی طرح
عَلَيْهِ	ان پر	اَعْرَضَ	روگردانی کی	اَتَتْكَ	پہنچی تجھے

(۱) السَّوْأَة: شرمگاہ (۲) طَفِقَ (س) يفعل كذا: کرنے لگنا یا کرتا رہنا۔ (۳) خَصَفَ (ض) الورق على بدنه: ننگے کا بدن پر پتے چپکانا (۴) غَوىٰ يَغْوِىْ غَوَايَةً: غلط راستہ پر پڑ جانا۔ جیسے سورۃ النجم (آیت ۲) میں ہے: ﴿مَاضَلَّ صَاحِبُكُمْ وَمَا غَوىٰ﴾ یعنی تمہارے ساتھی (نبی ﷺ) نہ راہ (حق) سے بھٹکے اور نہ غلط راستہ پر پڑے۔ (۵) اجتبى يجتبى اجتباء: چن لینا، اختیار کرنا (۶) إمَّا: حرفِ شرط ہے۔ اور إنْ اور ما سے مرکب ہے۔ (۷) ضَنَكَ يَضْنُكُ (ن) ضَنْكًا: تنگی پیدا کرنا، بدحال ہونا۔

اٰيٰتُنَا	ہماری آیتیں	وَكَذٰلِكَ (۱)	اور اسی طرح	تُنْسٰى	تو بھلا دیا گیا
فَنَسِيْتَهَا	پس بھول گیا تو ان کو	الْيَوْمَ	آج	۞	۞

گذشتہ آیت میں یہ بات بیان کی گئی ہے کہ اللہ تعالیٰ نے آدم علیہ السلام سے ایک عہد و پیان کیا تھا۔ جس کو وہ مزاج کی ناپختگی کی وجہ سے بھول گئے۔ اور ان سے عہد کی خلاف ورزی ہوگئی۔ اب اُس واقعہ کی تفصیل بیان کی جاتی ہے۔ ارشاد ہے ـــــ اور (یاد کرو) جب ہم نے فرشتوں کو حکم دیا کہ آدم کو سجدہ کرو، تو انھوں نے سجدہ کیا، مگر ابلیس نے انکار کیا ـــــ سورۃ البقرۃ (آیت ۳۰) میں یہ بات گذر چکی ہے کہ آدم علیہ السلام کو اللہ تعالیٰ نے زمین میں اپنی خلافت کے لئے پیدا کیا ہے۔ چنانچہ آدم علیہ السلام کو پیدا کرنے کے بعد اللہ تعالیٰ کو منظور ہوا کہ اس وقت میں موجود تمام مخلوقات سے آدم علیہ السلام کے سامنے کوئی ایسی تعظیم کرائی جائے جس سے تمام مخلوقات کو یہ معلوم ہو جائے کہ آدم علیہ السلام سب سے افضل ہیں، تا کہ وہ کارِ خلافت انجام دے سکیں۔ چنانچہ سب مخلوق کو سجدہ کرنے کا حکم ہوا۔ سورۃ الکہف (آیت ۵۰) میں ہے: ﴿ كَانَ مِنَ الْجِنِّ فَفَسَقَ عَنْ أَمْرِ رَبِّهِ﴾ یعنی ابلیس جنات میں سے تھا، پس اس نے اپنے رب کے حکم سے عدول کیا۔ اس آیت سے معلوم ہوا کہ ابلیس کو بھی سجدہ کرنے کا حکم تھا۔ اور جگہ جگہ صرف فرشتوں کا تذکرہ اس لئے کیا جاتا ہے کہ اس وقت وہی سب سے افضل تھے۔ اور جب افضل کو کوئی حکم دیا جاتا ہے تو وہ حکم مفضول کے لئے بھی ہوتا ہے۔ جیسے بادشاہ: وزیر اعظم کو کسی کی تعظیم کا حکم دے تو وہ حکم سب درباریوں کے لئے ہوتا ہے۔ غرض سب نے سجدہ کیا، مگر ابلیس نے انکار کیا۔ اس نے سجدہ کرنے میں اپنی ذلت محسوس کی، بولا: کہاں میں اور کہاں آدم! کیا میری پیشانی آدم کے سامنے جھکے گی! میں اس سے بدرجہا بہتر ہوں۔ اور کوئی بلند ہستی کسی پست ہستی کو سجدہ کر سکتی ہے؟ مگر اس جاہل نے یہ نہ سمجھا کہ بڑا وہ ہے جسے اللہ بڑا بنائے، نہ وہ جو خود بڑا بنے ـــــ پس ہم نے کہا: ”اے آدم! یہ یقیناً آپ کا اور آپ کی بیوی کا دشمن ہے“ ـــــ کیونکہ اسے تم دونوں کی وجہ سے مردود ہونا پڑا ہے ـــــ ”پس وہ نہ نکال دے تم دونوں کو جنت سے، پس آپ تکلیف میں پڑ جائیں ـــــ یعنی کہیں ایسا نہ ہو کہ اس کے کہنے میں آ کر کوئی ایسا کام کر بیٹھو کہ جنت سے ہاتھ دھونے پڑیں۔ اور دنیا میں پہنچ کر تکلیف سہنی پڑے ـــــ آپ کو بالیقین یہ بات حاصل ہے کہ آپ جنت میں نہ تو بھوکے ہوتے ہیں اور نہ ننگے۔ اور یہ بات بھی کہ آپ جنت میں نہ پیاسے ہوتے ہیں اور نہ دھوپ میں تپتے ہیں ـــــ یہی انسان کی بڑی ضرورتیں ہیں۔ کھانا، پینا، پہننا اور رہنے کے لئے ایسا مکان جس کے ذریعہ دھوپ بارش سے حفاظت ہو جائے۔ یہ سب سہولتیں آپ کو جنت میں حاصل ہیں۔ اگر شیطان نے آپ کو یہاں سے

(۱) یہ پہلے كذلك کی تکرار ہے۔ فصل کی وجہ سے دوبارہ لایا گیا ہے۔ یعنی كذلك کا مدخول درحقیقت یہی ہے۔

نکلوادیا تو دنیا میں پہنچ کر یہ سب تکالیف جھیلنی ہونگی۔

شیطان کی فریب دہی: ـــــ پس شیطان نے آدمؑ کے دل میں وسوسہ ڈالا، اس نے کہا: ''اے آدم! کیا میں آپ کو ایسا درخت بتاؤں جس کے کھانے سے کبھی موت نہ آئے، اور لازوال بادشاہت ملے؟'' ـــــ پھر وہی درخت بتایا جس کے قریب جانے سے بھی اللہ تعالیٰ نے منع کیا تھا۔ کہنے لگا اس کے پھل میں یہ تاثیر ہے کہ جو اس کو کھائے گا امر ہوجائے گا، اور اللہ کے پاس ہمیشہ رہے گا۔ اور اس نے قسم کھا کر اپنی ہمدردی کا یقین دلایا ـــــ پس دونوں نے اس درخت کو کھالیا ـــــ یعنی جنت کی زندگی اور قربِ حق کی حرص میں انھوں نے یہ اقدام کرلیا، اللہ تعالیٰ کا عہد بھول گئے اور دونوں سے یہ لغزش ہوگئی ـــــ پس ان کے لئے ان کا ننگا پا ظاہر ہوگیا ـــــ یعنی جنت کا لباس اتر گیا ـــــ اور دونوں اپنے اوپر جنت کے پتے چپکانے لگے ـــــ انھوں نے جس درخت کا پھل کھایا تھا اس کی تاثیر یہ تھی کہ کھانے والا جنت کی نعمتوں سے محروم ہوجائے۔ چنانچہ جنت کا لباس بدن سے اتر گیا۔ اور شیطان اپنے مقصد میں کامیاب ہوگیا۔ اب کون اندازہ کرسکتا ہے کہ اس وقت دونوں کے اضطراب کا کیا حال ہوگا۔ ستر پوشی کے لئے کوئی چیز موجود نہ تھی، اس لئے وہ اپنے اوپر جنت کے درختوں کے پتے چپکانے لگے ـــــ اس سے یہ بات ظاہر ہوتی ہے کہ ستر پوشی انسان کی فطرت ہے۔ آج جو قومیں برہنہ یا نیم برہنہ رہنے میں کوئی عار محسوس نہیں کرتیں ان کی فطرت مسخ ہوچکی ہے۔

توبہ کی توفیق: ـــــ اور آدمؑ نے اپنے پروردگار کا قصور کیا، سو وہ غلط راستہ پر پڑ گیا! ـــــ یعنی آدم علیہ السلام نے اللہ کے حکم کی خلاف ورزی کی، یہ آپ سے قصور ہوگیا۔ شیطان نے فریب دے کر آپ کو اطاعت کے بلند مقام سے عصیان کی پستی میں گرادیا۔ اور آپ غلط راستہ پر چل پڑے اور جنت کی نعمتوں اور مقامِ رضا سے محروم ہوگئے ـــــ پھر ان کو ان کے پروردگار نے چُن لیا، اور ان کی طرف توجہ فرمائی، اور ان کو (توبہ کی) راہ دکھائی ـــــ یعنی وہ اپنی اس کوتاہی کی وجہ سے مردود نہیں ہوئے، بلکہ ان کا مقام اور بلند ہوگیا۔ اللہ تعالیٰ نے ان کو برگزیدہ کیا۔ اللہ کی رحمتِ کاملہ ان کی طرف متوجہ ہوئی۔ اور انھوں نے اپنے رب سے چند کلمات سیکھ لئے، جن کے ذریعہ دونوں میاں بیوی نے معافی مانگی جو بارگاہِ عالی میں قبول ہوئی۔

زلت و معصیت میں فرق: اگر کوئی غلطی اچھی نیت سے ہوجائے تو وہ زلت (لغزش) کہلاتی ہے۔ زلت: انبیاء علیہم السلام سے ممکن ہے۔ آدم علیہ السلام سے قُربِ حق کی حرص میں کوتاہی سرزد ہوگئی تھی۔ آدم علیہ السلام سے بڑھ کر مقامِ قربِ حق (جنت) میں قیام کا حریص اور کون ہوسکتا ہے۔ جب شیطان نے جھوٹی قسم کھا کر ہمدردی جتلائی تو آپ

تصور ہی نہیں کر سکتے تھے کہ جھوٹی قسم کھا کر کوئی اللہ کے نام کی بے وقعتی بھی کر سکتا ہے، جھٹ آپ اس کے کہنے میں آ گئے اور اس کے مشورے کو رضاءِ حق ہی کی راہ کا ایک مشورہ سمجھ بیٹھے۔ اور آپ سے قصور ہو گیا ـــــ اور اگر ڈھٹائی سے کوئی برائی کی جائے تو وہ معصیت (نافرمانی) کہلاتی ہے۔ جیسے شیطان نے خود ستائی کی وجہ سے سجدہ کرنے سے انکار کیا۔ یہ معصیت ہے۔ معصیت انبیاء علیہم السلام سے ناممکن ہے۔ کیونکہ وہ معصوم ہوتے ہیں۔ یعنی اللہ تعالیٰ نافرمانی سے ان کی حفاظت فرماتے ہیں۔ اگر انبیاء سے بھی یہ بات ممکن ہو تو اللہ کی حفاظت پر حرف آئے گا۔

اور زلت و معصیت میں فرق: اس طرح ظاہر ہوتا ہے کہ نادانستہ گناہ (زلت) میں فوراً ہی توبہ کی توفیق مل جاتی ہے۔ اللہ تعالیٰ دستگیری فرماتے ہیں اور بندے کو اس ورطہ سے نکال دیتے ہیں۔ اور معصیت میں یا تو زندگی بھر توبہ کی توفیق نہیں ملتی، یا عرصہ بعد قسمت سے یہ سعادت نصیب ہوتی ہے ـــــ عربی میں زلت و معصیت کے لئے ایک ہی طرح کے الفاظ ہیں، لہٰذا عصیان و غوایت کے الفاظ سے دھوکہ نہ کھایا جائے۔

زمین پر اترنے کا حکم: ـــــ اللہ تعالیٰ نے حکم دیا: ''دونوں ہی جنت سے اترو، تم ایک دوسرے کے دشمن رہو گے'' ـــــ یعنی توبہ تو آدم علیہ السلام کی قبول ہو گئی، مگر اس درخت کے کھانے کا اثر بہر حال ظاہر ہوا۔ اب آدم علیہ السلام کے لئے جنت میں قیام کا کوئی جواز نہ رہا۔ چنانچہ آدم علیہ السلام اور شیطان ملعون: دونوں کو زمین پر اترنے کا حکم ملا۔ اور ساتھ ہی یہ بھی بتلا دیا کہ ابلیس کا خطرہ ٹل نہیں گیا۔ تم دونوں کی ذریت میں دشمنی برابر قائم رہے گی۔ شیاطین ہمیشہ بنی آدم کو گمراہ کرنے کی کوشش میں لگے رہیں گے۔ پس انسان کو اپنے اس ازلی دشمن سے ہمیشہ چوکنا رہنا چاہئے۔

فائدہ: یہاں سے یہ بات ظاہر ہوئی کہ غلطیوں کے اثرات بھی لازمی طور پر ظاہر ہوتے ہیں۔ جیسے کوئی نادانستہ اپنی گاڑی کسی پر چڑھا دے تو وہ ضرور مر جائے گا، یا کوئی بچہ کسی کے گلے پر چھری پھیر دے تو بچہ گو معصوم ہے مگر مذبوح مر جائے گا۔ اسی طرح اگر کوئی ماہواری کے زمانہ میں بیوی کو طلاق دیدے، تو گو یہ گناہ کا کام ہے، مگر طلاق واقع ہو جائے گی۔ یہی حکم مذاق میں طلاق دینے کا ہے۔ اور یہی حکم ایک ساتھ تین طلاقیں دینے کا ہے ـــــ کچھ لوگوں کو اس سلسلہ میں حضرت رُکانہ رضی اللہ عنہ کے واقعہ سے دھوکہ لگا ہے۔ انھوں نے لفظ البتۃ سے طلاق دی تھی۔ اور یہ ایسا لفظ ہے جس میں ایک طلاق کا بھی احتمال ہے اور تین کا بھی۔ پھر جب انھوں نے حلفیہ بیان دیا کہ ان کی نیت ایک ہی کی تھی تو نبی ﷺ نے اس کو ایک طلاق قرار دیا۔ پس اس روایت کا غلط مطلب بیان کر کے لوگوں کو دھوکہ نہ دیا جائے۔

زمین پر اترنے کے بعد کے احوال: ـــــ پس اگر تمہیں میری طرف سے ہدایت پہنچے: تو جو میری ہدایت کی پیروی کرے گا: وہ نہ گمراہ ہو گا اور نہ تکالیف جھیلے گا! ـــــ یعنی تمہارے زمین پر اترنے کے بعد میں وحی بھیجونگا، اور

احکام نازل کرونگا، پس جو ان کی تعمیل کرے گا، وہ مدتِ حیات پوری کرنے کے بعد سیدھا اپنے اصلی وطن جنت میں چلا آئے گا۔ راستہ نہیں بھولے گا ــــــ یہ آدم علیہ السلام کو اور ان کے واسطہ سے ان کی ذریت کو تسلی دی کہ جنت چھوڑنے کا غم نہ کھاؤ۔ یہ مفارقت (جدائی) عارضی ہے۔ بہت جلد تم اپنے وطن میں لوٹ آؤ گے ــــــ اور جب تک دنیا میں رہو گے کسی خاص پریشانی سے سابقہ نہیں پڑے گا۔ اگر کوئی غریب ونادر بھی ہوگا تو دل کا بادشاہ ہوگا۔ اس کو اطمینانِ قلبی حاصل ہوگا ــــــ یہ ارشاد دل کے ایک وسوسہ کا جواب بھی ہے۔ کسی کے دل میں خیال پیدا ہوسکتا ہے کہ ٹھیک ہے ہم دنیا کی زندگی پوری کر کے اپنے اصلی وطن کی طرف لوٹ آئیں گے، مگر جب تک دنیا میں رہیں گے پاپڑ بیلنے پڑیں گے۔ دنیا کی تکالیف سے دوچار ہونا پڑے گا۔ طرح طرح کی پریشانیوں میں گھرے رہیں گے؟! اللہ پاک نے بنی آدم کو اطمینان دلایا کہ یہ تکالیف سرسری اور عارضی ہونگی۔ دل تک ان کا گذر نہ ہوگا، مگر شرط یہ ہے کہ وہ اللہ تعالیٰ کی ہدایات پر عمل کرے، اس کو اطمینان کی دولت حاصل رہے گی ــــــ اور جو شخص میری نصیحت سے روگردانی کرے گا، اس کے لئے یقیناً تنگ گذران ہوگا، اور ہم قیامت کے دن اس کو اندھا اٹھائیں گے ــــــ یعنی جو شخص میرا نازل کیا ہوا دین قبول نہیں کرے گا، اور میری بھیجی ہوئی نصیحت اور خیر خواہی والے احکام سے سرتابی کرے گا، اس کی دنیوی زندگی مکدر ہوگی۔ دیکھنے میں اس کے پاس بہت کچھ مال ودولت اور سامانِ عیش وعشرت ہوگا، مگر اس کا دل پریشانیوں کا پٹارا ہوگا۔ وہ ساری عمر مال وجاہ کی حرص اور ننانوے کے پھیر میں پھنسا رہے گا۔ اور موت اور زوالِ دنیا کا خطرہ ہمیشہ سوہانِ روح بنا رہے گا۔ کیونکہ حقیقی اطمینان یادِ الٰہی کے بغیر حاصل نہیں ہوسکتا ــــــ اور وہ آخرت میں آنکھوں سے اندھا اٹھایا جائے گا۔ اس کو اپنے وطن کا راستہ نظر نہیں آئے گا۔ وہ بس بھٹکتا ہی پھرے گا، اور منزلِ مقصود تک نہیں پہنچے گا! ــــــ وہ کہے گا: ”اے میرے پروردگار! آپ نے مجھے اندھا کیوں اٹھایا، میں تو (دنیا میں) بینا تھا؟“ ــــــ اللہ تعالیٰ فرمائیں گے: ”اسی طرح تجھے (دنیا میں) ہماری آیتیں پہنچی تھیں، پس تو ان کو بھول گیا تھا، اور اُسی طرح تو آج بھلا دیا گیا!“ ــــــ یعنی جب وہ آنکھوں سے اندھا کر کے میدانِ محشر کی طرف لایا جائے گا تو وہ تعجب سے پوچھے گا کہ آخر مجھ سے کیا قصور ہوا جو میری آنکھیں چھین لی گئیں؟ اس سے کہا جائے گا: یہ تیری جسمانی بے بصری تیری روحانی بے بصیرتی کا عکس ہے۔ تیرے پاس دنیا میں ہمارے احکام انبیاء اور علماء کے ذریعہ پہنچے تھے، جس کے ساتھ واضح اور روشن دلائل بھی تھے، مگر تو باوجود بصیرت وبصارت کے ان کی طرف سے اندھا بنا رہا تھا پس اب آخرت میں تو اپنی منزلِ مقصود کیسے پا سکتا ہے، تجھے اب ہمیشہ کے لئے عذاب میں پڑا رہنا ہے۔ تجھے کبھی جنت کی شکل دیکھنی نصیب نہ ہوگی ــــ یہ ابتدائے حشر کا حال ہے۔ پھر آنکھیں کھول دی جائیں گی، تاکہ وہ دوزخ وغیرہ احوالِ محشر کا معائنہ کرے ــــــ ”تو بھلا دیا

گیا'، یعنی ہم نے اپنی رحمت سے تجھے محروم کردیا۔ اور نور دیدہ چھین لیا۔

آخرت: دنیا کا عکس ہے، جو یہاں اندھا بنا ہوا ہے وہ آخرت میں اندھا اٹھایا جائے گا، بلکہ اندھے سے بھی بدتر!

وَكَذٰلِكَ نَجْزِيْ مَنْ اَسْرَفَ وَلَمْ يُؤْمِنْ بِاٰيٰتِ رَبِّهٖ ۭ وَلَعَذَابُ الْاٰخِرَةِ اَشَدُّ وَاَبْقٰى ﴿١٢٧﴾ اَفَلَمْ يَهْدِ لَهُمْ كَمْ اَهْلَكْنَا قَبْلَهُمْ مِّنَ الْقُرُوْنِ يَمْشُوْنَ فِيْ مَسٰكِنِهِمْ ۭ اِنَّ فِيْ ذٰلِكَ لَاٰيٰتٍ لِّاُولِي النُّهٰى ﴿١٢٨﴾ وَلَوْلَا كَلِمَةٌ سَبَقَتْ مِنْ رَّبِّكَ لَكَانَ لِزَامًا وَّاَجَلٌ مُّسَمًّى ﴿١٢٩﴾

ع ۱۳ ۱۶

وَكَذٰلِكَ	اور اسی طرح	اَفَلَمْ	پس کیا نہیں	لَاٰيٰتٍ	البتہ نشانیاں ہیں		
نَجْزِيْ	بدلہ دیتے ہیں ہم	يَهْدِ (1)	راہ دکھائی	لِّاُولِي النُّهٰى	اہل فہم کے لئے		
مَنْ اَسْرَفَ	اس کو جو حد سے نکلا	لَهُمْ	ان کو	وَلَوْلَا	اور اگر نہ ہوتی		
وَلَمْ يُؤْمِنْ	اور ایمان نہیں لایا	كَمْ	کتنی	كَلِمَةٌ	ایک بات		
بِاٰيٰتِ	آیتوں پر	اَهْلَكْنَا	ہلاک کیں ہم نے	سَبَقَتْ	پہلے سے فرمائی ہوئی		
رَبِّهٖ	اپنے رب کی	قَبْلَهُمْ	ان سے پہلے	مِنْ رَّبِّكَ	تیرے رب کی طرف سے		
وَلَعَذَابُ	اور البتہ عذاب	مِّنَ الْقُرُوْنِ	صدیوں میں سے	لَكَانَ	(تو) البتہ ہوتا		
الْاٰخِرَةِ	آخرت کا	يَمْشُوْنَ (2)	چلتے ہیں وہ	لِزَامًا (3)	(عذاب) لازمی		
اَشَدُّ	زیادہ سخت	فِيْ مَسٰكِنِهِمْ	انکی رہنے کی جگہوں میں	وَّ اَجَلٌ (4)	اور ایک میعاد		
وَاَبْقٰى	اور دیرپا ہے	اِنَّ فِيْ ذٰلِكَ	بیشک اس میں	مُّسَمًّى	مقررہ		

اب روئے سخن قرآن کریم کے معاصر منکروں اور کافروں کی طرف ہے۔ ارشاد ہے ——— اور اسی طرح ہم اس شخص کو بدلہ دیتے ہیں جو حد سے نکل جاتا ہے۔ اور اپنے پروردگار کی آیتوں پر ایمان نہیں لاتا ——— یعنی مذکورہ قانون

(۱) يَهْدِ: کا فاعل جملہ كم أهلكنا ہے۔ (۲) يمشون: جملہ حالیہ ہے۔ (۳) لِزَام: یا تو صیغہ صفت ہے یا باب مفاعلہ کا مصدر: چمٹ جانے والا، ہمیشہ ساتھ رہنے والا۔ (۴) أجل کا كلمة پر عطف ہے۔ رعایت فاصلہ کی وجہ سے مؤخر لایا گیا ہے۔

ایک عام قانون ہے۔ ہر حد عبودیت سے نکل جانے والے کو، اور اللہ کے دین کا انکار کرنے والے کو دنیا میں یہی سزا ملتی ہے۔اس کا جینا مکدر اور زندگی تنگ ہو جاتی ہے ——— اور آخرت کی سزا یقیناً زیادہ سخت اور دیرپا ہے! ——— آخرت کی سزا نہایت سخت اس لئے ہے کہ اس سے آگے سختی کا کوئی تصور ہی نہیں کیا جا سکتا۔ اور وہ دیرپا اس لئے ہے کہ وہ کبھی ختم نہ ہونے والی سزا ہے۔ پس اس سے بڑی کوئی حماقت نہیں کہ دنیا کی معمولی تکلیفوں سے بچنے کا اہتمام کیا جائے، مگر آخرت کے عذاب سے بچنے کی کوئی فکر نہ کی جائے ——— پس کیا ان کو اس بات نے راہ نہیں دکھائی کہ ہم نے کتنی ہی صدیاں ان سے پہلے ہلاک کر دی ہیں۔ جن کی رہنے کی جگہوں میں یہ لوگ چلتے پھرتے ہیں۔ بیشک اس میں اہلِ فہم کے لئے نشانیاں ہیں ——— یعنی کیا کافروں کی آنکھیں اس سے نہیں کھلتیں کہ ان سے پہلے کتنی ہی سرکش قومیں صفحہ ہستی سے مٹائی جا چکی ہیں۔ وہ ان کی تباہی اور بربادی کی داستانیں سن چکے ہیں۔ اور ان کے کھنڈرات پر اپنے اسفار میں گذرتے رہتے ہیں۔ تو کیا وہ انکے انجام سے عبرت حاصل نہیں کرتے؟! اگر کسی میں عقل وفہم کا جوہر موجود ہو تو وہ ان گذشتہ اقوام کی تباہی سے سمجھ سکتا ہے کہ مذہبی اور ایمانی زندگی ہی برحق ہے، اور شرک و بے دینی کی زندگی ناحق اور تباہ کن ہے۔

اس جگہ اگر کسی کے دل میں خیال پیدا ہو کہ جب کفار کا وطیرہ غلط ہے، اور قرآن کا انکار اللہ سے بغاوت ہے تو ان سرکشوں کو تباہ و برباد کیوں نہیں کیا جاتا؟ اس کا جواب ارشاد فرماتے ہیں ——— اور اگر آپ کے پروردگار کی طرف سے پہلے سے ایک بات نہ ہو چکی ہوتی، اور ایک میعاد مقرر نہ ہوتی تو ان پر عذاب لازمی طور پر آ جاتا ——— یعنی ان کے کفر وشرک اور بے دینی کا تقاضا تو یہی تھا کہ ان پر عذاب فی الفور آ جاتا، مگر کچھ دوسری حکمتوں اور مصلحتوں سے اس کے لئے ایک خاص وقت مقرر ہو چکا ہے، اس لئے اس وقتِ موعود سے پہلے عذاب نہیں آئے گا۔ پس مؤمنین عذاب میں تاخیر دیکھ کر کوئی خلجان دل میں نہ لائیں ——— اور وہ بات جو پروردگار کی طرف سے پہلے سے ہو چکی ہے: اس سے مراد یا تو یہ ہے کہ حق تعالیٰ کی رحمت غضب پر سابق ہے۔ اسی لئے مجرم کو دیر تک اصلاح کا موقع ملتا ہے۔ اور جب تک پوری طرح اتمام حجت نہیں ہو جاتا عذاب نہیں آتا ——— یا وہ بات مراد ہے جو سورۃ الانفال (آیت ۳۳) میں بیان کی گئی ہے کہ: ''اللہ تعالیٰ ایسا کرنے والے نہیں کہ انہیں اس حال میں عذاب دیں کہ نبی ﷺ ان میں موجود ہوں'' چونکہ آپ رحمۃ للعالمین ہیں، اس لئے آپ کی برکت سے وہ عذاب سے بچے ہوئے ہیں ——— اور میعاد متعین سے یا تو موت مراد ہے یعنی زندگی میں تو تباہ کن عذاب نہیں آئے گا۔ مگر جونہی ان کا پیمانۂ حیات لبریز ہو جائے گا، اور موت کی دہلیز پر پہنچیں گے، عذاب میں پکڑ لئے جائیں گے ——— یا ہجرت کے بعد کے معرکے مراد ہیں۔ چنانچہ جب بدر میں مسلمانوں سے مڈبھیڑ ہوئی تو انھوں نے عذاب کا کچھ مزہ چکھا۔ اور آخرت میں عذاب عظیم کا مزہ چکھنا ابھی باقی ہے۔

فَاصْبِرْ عَلٰى مَا يَقُوْلُوْنَ وَسَبِّحْ بِحَمْدِ رَبِّكَ قَبْلَ طُلُوْعِ الشَّمْسِ وَقَبْلَ غُرُوْبِهَا وَمِنْ اٰنَآئِ الَّيْلِ فَسَبِّحْ وَاَطْرَافَ النَّهَارِ لَعَلَّكَ تَرْضٰى ﴿۱۳۰﴾ وَلَا تَمُدَّنَّ عَيْنَيْكَ اِلٰى مَا مَتَّعْنَا بِهٖٓ اَزْوَاجًا مِّنْهُمْ زَهْرَةَ الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا ۵ۙ لِنَفْتِنَهُمْ فِيْهِ ؕ وَرِزْقُ رَبِّكَ خَيْرٌ وَّاَبْقٰى ﴿۱۳۱﴾ وَاْمُرْ اَهْلَكَ بِالصَّلٰوةِ وَاصْطَبِرْ عَلَيْهَا ؕ لَا نَسْـَٔلُكَ رِزْقًا ؕ نَحْنُ نَرْزُقُكَ ؕ وَالْعَاقِبَةُ لِلتَّقْوٰى ﴿۱۳۲﴾

فَاصْبِرْ	پس صبر کیجئے آپ	غُرُوْبِهَا	ڈوبنے سے سورج کے	اِلٰى مَا	اس چیز کی طرف جو
عَلٰى مَا	ان باتوں پر جو	وَمِنْ اٰنَآئِ (۱)	اور گھڑیوں میں	مَتَّعْنَا	فائدہ پہنچایا ہم نے
يَقُوْلُوْنَ	کہتے ہیں وہ	الَّيْلِ	رات کے	بِهٖٓ	اس کے ذریعہ
وَسَبِّحْ	اور پاکی بیان کیجئے	فَسَبِّحْ	پس پاکی بیان کیجئے	اَزْوَاجًا (۳)	اصناف کو
بِحَمْدِ	حمد کے ساتھ	وَاَطْرَافَ (۲)	اور حصوں میں	مِّنْهُمْ	ان میں سے
رَبِّكَ	اپنے رب کی	النَّهَارِ	دن کے	زَهْرَةَ (۴)	رونق
قَبْلَ	پہلے	لَعَلَّكَ	تاکہ آپ	الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا	دنیوی زندگی کی
طُلُوْعِ	نکلنے سے	تَرْضٰى	خوش ہوں	لِنَفْتِنَهُمْ (۵)	تاکہ آزمائیں ہم ان کو
الشَّمْسِ	سورج کے	وَلَا تَمُدَّنَّ	اور ہرگز لمبی نہ کریں آپ	فِيْهِ	اس چیز میں
وَقَبْلَ	اور پہلے	عَيْنَيْكَ	اپنی دونوں آنکھیں	وَرِزْقُ	اور روزی

(۱) الآنَاء: أَنٰی (بروزن عصا) کی جمع ہے: گھڑیاں، اوقات، أَنٰی یَأْنِیْ أَنْیًا: قریب ہونا، وقت آجانا...... ومن آناءِ اللیل: فَسَبِّحْ کا مفعول مقدم ہے، جیسے: إِیَّایَ فَارْهَبُوْنِ (البقرة ۴۰) (۲) أَطْرَاف: طَرْف کی جمع ہے: کسی چیز کا حصہ، اس کے معنی جانب اور کنارے کے بھی ہیں۔ یہاں حصہ کے معنی ہیں...... یہ من آناءِ اللیل کے محل پر معطوف ہے۔ (۳) أَزْوَاج: زَوْج کی جمع ہے: جوڑے، اقران، ہم مثل چیزیں، یہاں اقسام وانواع اور اصناف مراد ہیں...... أزواجاً: مَتَّعْنا کا مفعول بہ ہے۔ (۴) زَهْرَة: رونق، تازگی، زینت، بہار، کلی جب کھلتی ہے تو زَهْرَة کہلاتی ہے، دنیا کی بہار اور زینت کو بھی اسی مناسبت سے زَهْرة کہتے ہیں...... زَهْرَة کا عامل محذوف ہے، جس پر مَتَّعْنا دلالت کرتا ہے أی جعلنا لهم زهرةً، یا مَتَّعْنا کا مفعول ثانی ہے، کیونکہ مَتَّعْنَا: أَعْطَیْنَا کے معنی کو متضمن ہے۔ (۵) لنفتنهم: مَتَّعْنا سے متعلق ہے۔

رَبِّكَ	تیرے رب کی	بِالصَّلٰوةِ	نماز کا	نَحْنُ	ہم
خَيْرٌ	بہتر ہے	وَاصْطَبِرْ[1]	اور پابندی کریں آپ	نَرْزُقُكَ	روزی دیتے ہیں آپ کو
وَّ اَبْقٰى	اور دیرپا	عَلَيْهَا	اس کی	وَالْعَاقِبَةُ[2]	اور (اچھا) انجام
وَاْمُرْ	اور حکم دیں آپ	لَا نَسْـَٔلُكَ	نہیں مانگتے ہم آپ سے	لِلتَّقْوٰى[3]	پرہیزگاری کے لئے
اَهْلَكَ	اپنے گھر والوں کو	رِزْقًا	روزی		ہے

مکی دور میں مسلمانوں کو کافروں سے بہت کچھ سننا پڑتا تھا۔ اِن آیاتِ پاک میں ان دل آزار باتوں پر صبر کرنے کا حکم ہے۔ اور صبر کی ہمت پیدا کرنے کا طریقہ بیان کیا ہے۔ ارشاد ہے: —— پس آپ صبر کیجئے ان باتوں پر جو وہ چھانٹتے ہیں —— ان کی باتیں یقیناً اشتعال انگیز اور صبر آزما ہیں۔ مگر ابھی ان سے لوہا لینے کا وقت نہیں آیا، لہٰذا آپ صبر کا دامن تھامے رہیں —— اور آپ اپنے پروردگار کی خوبی کے ساتھ پاکی بیان کریں، سورج نکلنے سے پہلے، اور سورج ڈوبنے سے پہلے، اور رات کی گھڑیوں میں بھی پاکی بیان کریں، اور دن کے حصوں میں، تاکہ آپ خوش رہیں! —— یہ دل آزار باتوں پر صبر کا حوصلہ پیدا کرنے کا مثبت طریقہ ہے۔ دل فگار باتوں سے متاثر نہ ہونے کا طریقہ عبادت میں مشغولی ہے۔ تجربہ شاہد ہے کہ یہ نسخہ سو علاجوں کا ایک علاج ہے۔ انتقام کی فکر میں پڑنے والا، خواہ کتنا ہی قوی ہو، بسا اوقات انتقام لینے پر قادر نہیں ہوتا۔ اور انتقام کی فکر مستقل سوہانِ روح بنی رہتی ہے۔ اور جب انسان کی توجہ اللہ تعالیٰ کی طرف ہو جاتی ہے۔ اور وہ یہ سوچتا ہے کہ مشیتِ خداوندی کے بغیر نہ کوئی نفع پہنچا سکتا ہے نہ نقصان، اور اللہ کے کاموں میں حکمت ہوتی ہے، تو غیظ وغضب کی آگ خود بخود ٹھنڈی پڑ جاتی ہے —— اور یہ بات ضروریاتِ دین میں سے ہے کہ جبروت میں کچھ ایسے مخصوص اوقات ہیں جن میں زمین میں روحانیت پھیلتی ہے۔ یعنی عنایاتِ ربانی زمین کی طرف متوجہ ہوتی ہیں۔ اور ان اوقات میں عالم بالا سے رحمتوں اور برکتوں کا فیضان ہوتا ہے۔ وہ اوقات چار ہیں: سورج نکلنے اور سورج ڈوبنے سے کچھ پہلے روحانیت پھیلتی ہے۔ اور زوال کے وقت یعنی جب سورج سر پے آ کر ڈھل جاتا ہے اس وقت بھی روحانیت پھیلتی ہے۔ اور آدھی رات سے سحر تک بھی نہایت قوی روحانیت پھیلتی ہے۔ پس عبادتوں کے لئے ان مقدس اوقات سے بہتر اور عمدہ کوئی وقت نہیں۔ ان اوقات میں معمولی محنت بھی نتیجہ خیز ثابت ہوتی ہے۔ پھر سورج نکلنے سے پہلے جو روحانیت پھیلتی ہے وہ اشراق وچاشت تک باقی رہتی ہے۔ اور سورج ڈوبنے سے پہلے جو روحانیت پھیلتی ہے وہ غروب کے بعد بھی کچھ

---

(۱) اصْطِبَار: باب افتعال کی ت کو ط سے بدلا ہے: قائم رہنا، ڈٹے رہنا، مجرد: صَبْرٌ: ہمت سے کام لینا اور نہ گھبرانا (۲) العاقبة کا اَلْ عوضی ہے، مضاف کے عوض میں آیا ہے۔ أی حُسْنُ العاقبة۔ (۳) للتقوی میں مجاز بالحذف ہے أی لأهل التقوی۔

وقت تک باقی رہتی ہے۔اس لئے لوگوں کے اعذار کا لحاظ کر کے ان اوقات میں فرض اور نفل نمازیں مقرر کی گئیں ہیں [1]

—— غرض انہیں چار اوقات میں تسبیح وتحمید کا حکم دیا تا کہ مسلمان خوش رہیں۔اوران کے دلوں کو اطمینان نصیب ہو

——اور آپ ہرگز اپنی آنکھیں اس بہار کی طرف نہ پساریں جس کے ذریعہ ہم نے لوگوں کی مختلف انواع کو فائدہ پہنچایا ہے۔(وہ) دنیوی زندگی کی بہار (ہے) تا کہ اس میں ہم ان کی آزمائش کریں۔اور آپ کے پروردگار کی روزی بہتر اور دیرپا ہے —— یہ صبر کا حوصلہ پیدا کرنے کا منفی طریقہ ہے۔یعنی وہ کام نہ کیا جائے جو دل کو بے قرار کرے۔کفار کی خوشحالی پر رال ٹپکانے سے دل کی بے قراری بڑھتی ہے۔اوراس سے نظر ہٹالی جائے تو دل کو قرار آتا ہے۔چنانچہ ارشادفرمایا کہ آپ کفار کی خوش حالی کی طرف آنکھ اٹھا کر بھی نہ دیکھیں۔ان کی زندگی کی یہ تازگی اور شادابی عارضی ہے،صرف دنیوی زندگی کی بہار ہے۔اس کے ذریعہ ان کی آزمائش کی جارہی ہے۔ایسی زوال پذیر نعمت رال ٹپکانے کی چیز نہیں۔اللہ پاک نے جو کچھ آپ کو دیا ہے وہی آپ کے لئے بہتر ہے،اور آخرت میں اسی کا اجر دیرپا ہے۔

فائدہ: آج بھی کچھ مسلمانوں کو کفار وفجار کی عیش وعشرت اور دولت وحشمت بھلی معلوم ہوتی ہے۔وہ سوچتے ہیں کہ جب یہ لوگ اللہ کے نزدیک مبغوض وذلیل ہیں،تو ان کے پاس یہ نعمتیں کیوں ہیں؟ اور اطاعت شعار مسلمان غربت وافلاس کا شکار کیوں ہیں؟ ان کو اس آیت میں سمجھایا ہے کہ یہ محض چند روزہ بہار ہے،جس کے ذریعہ ان کا امتحان مقصود ہے۔اور جو عظیم الشان نعمت اللہ تعالیٰ نے مسلمانوں کو عطا فرمائی ہے،یعنی ایمان اور عملِ صالح پر استواری،پھر آخرت میں اس پر ملنے والے اعلیٰ مراتب: اِن کے سامنے ان فانی اور حقیر ساز وسامان کی حقیقت ہی کیا ہے؟ مسلمانوں کے حصہ میں جو دولت آئی ہے،وہ ان کی دولتوں سے کہیں بڑھ کر ہے۔دنیا میں بھی بہتر ہے۔کیونکہ قناعت کے ساتھ تھوڑا: حرص کے ساتھ بہت مال سے بہتر ہے۔اور آخرت میں بھی وہی دیرپا ہے۔کیونکہ قیامت کے روز وہی تھوڑا سامان سرخ روئی کا ذریعہ بنے گا۔پس دنیا کی حقیر متاع سے اس کا موازنہ نہ کیا جائے،بلکہ آخرت کی لازوال نعمتوں سے اس کا مقابلہ کیا جائے —— پھر یہ بھی تو سوچو سب کفار وفجار کو یہ شادابی حاصل نہیں۔بہت سے ان میں نانِ شبینہ کے محتاج ہیں۔صرف کچھ لوگ خوش حال ہیں۔پس مسلمانوں میں بھی اللہ کے فضل سے بہت سے نیک بندے خوش حال ہیں۔معلوم ہوا کہ دنیا کی دولت اللہ تعالیٰ کے نزدیک مقبولیت کی علامت نہیں۔یہ تو امتحان کا سامان اور خطرہ کی چیز ہے۔اس کی فتنہ سامانی سے اللہ تعالیٰ ہر مسلمان کی حفاظت فرمائیں (آمین)

آخر میں تسبیح وتحمید کے مجموعے اور عبادت کے اعلیٰ فرد: نماز کی پابندی کا حکم دیا جاتا تھا،اور ساتھ ہی گھر کی اصلاح کا بھی امر فرمایا جاتا ہے۔ارشاد ہے: ——اور آپ اپنے گھر والوں کو نماز کا حکم دیں۔اور خود بھی نماز کے پابند رہیں

(۱) یہ مضمون تفصیل سے رحمۃ اللہ الواسعہ جلد دوم صفحہ ۱۷۸-۱۸۴ میں پڑھیں۔

—— جو شخص نمازیں پابندی سے پڑھتا ہے وہ دوسرے فرائض بھی ضرور ادا کرتا ہے۔ اور جو نماز کو ضائع کرتا ہے اس کو دوسرے ارکان کی کیا فکر ہو سکتی ہے؟! پس ہر مسلمان کو چاہئے کہ خود بھی نماز کی پابندی کرے، اور اپنے گھر والوں کو بھی سنبھالے —— اور گھر والوں کو نماز کے لئے کہنے کا حکم پہلے: اس کی طرف توجہ مبذول کرانے کے لئے دیا ہے۔ لوگ اس میں غفلت برتتے ہیں۔ خود تو نماز پڑھتے ہیں، مگر بال بچوں سے نہیں کہتے۔ حالانکہ جس طرح خود کو جہنم سے بچانا ضروری ہے، اہل وعیال کو بھی بچانا ضروری ہے۔ سورۃ التحریم (آیت ۶) میں اس کا صریح حکم موجود ہے۔ اور حدیث شریف میں ہے کہ ''جب بچہ سات سال کا ہو جائے تو اس کو نماز سکھاؤ، اور جب دس سال کا ہو جائے تو اس سے مار کر نماز پڑھاؤ'' —— علاوہ ازیں خود اپنی نماز کی پابندی کے لئے بھی ضروری ہے کہ آپ کا ماحول، آپ کے اہل وعیال اور متعلقین نماز کے پابند ہوں۔ ماحول اگر بے نمازیوں کا ہوگا تو طبعی طور پر انسان خود بھی کوتاہی کا شکار ہو جائے گا۔

اور جو لوگ کاروبار کی یا ملازمت کی مشغولی کا عذر پیش کرتے ہیں ان سے فرمایا: —— ہم آپ سے معاش نہیں چاہتے، معاش تو ہم خود آپ کے لئے مہیا کرتے ہیں —— یعنی جس طرح آقا غلاموں سے روزی کمواتا ہے اللہ تعالیٰ بندوں سے یہ بات نہیں چاہتے۔ بلکہ بندوں سے مطلوب عبادت ہے۔ سورۃ الذاریات (آیات ۵۶-۵۸) میں ارشاد ہے: ''میں نے جنات اور انسانوں کو اسی لئے پیدا کیا ہے کہ وہ میری عبادت کریں۔ میں ان سے رزق رسانی نہیں چاہتا، نہ یہ چاہتا ہوں کہ وہ مجھے کھلائیں، اللہ تعالیٰ ہی سب کو روزی پہنچانے والے ہیں جو نہایت قوت والے ہیں'' —— پس اگر فرض نماز اور کسبِ معاش میں تعارض ہو جائے تو نماز مقدم ہوگی۔ کسب معاش بھی فرض ہے، مگر وہ ثانوی درجہ کا فرض ہے۔ حدیث میں ہے: كَسْبُ الْحَلَالِ فَرِيْضَةٌ بَعْدَ الْفَرِيْضَةِ یعنی حلال روزی کمانا اول نمبر کے فرض کے بعد کا فرض ہے[1] —— اور اچھا انجام پرہیزگاری کے لئے ہے —— پس انسان کو چاہئے کہ پرہیزگاری اختیار کرے۔ پھر دیکھے اللہ تعالیٰ کس طرح اس کی مدد کرتے ہیں!

فائدہ: جو مسلمان غیر مسلموں کے یہاں ملازمت کرتے ہیں، وہ یہ عذر پیش کرتے ہیں کہ ہمارا مالک (بوس) نماز کی اجازت نہیں دیتا۔ اس سلسلہ میں جاننا چاہئے کہ مسلمان بھی ایک غلطی کرتے ہیں۔ وہ نماز کی اجازت چاہتے ہیں، اور نماز میں جو وقت خرچ ہوتا ہے اس کی تنخواہ بھی چاہتے ہیں، یعنی وہ چاہتے ہیں کہ وہ وقت ڈیوٹی میں شمار کیا جائے۔ بھلا یہ بات کیسے ممکن ہے؟ نماز آپ اپنے لئے پڑھتے ہیں، بوس کے لئے نہیں پڑھتے۔ پس اگر مسلمان ملازم پوری دیانت داری سے کام کرے، اور اپنے نماز کے وقت کی تنخواہ نہ لے، یا اتنی دیر زائد کام کرے تو کوئی شریف غیر مسلم نماز سے نہیں روک سکتا۔ اور اگر روکے تو ملکِ خدا تنگ نیست، پائے گدا لنگ نیست! دوسری متبادل ملازمت تلاش کی جائے۔

(۱) رواہ الطبرانی والبیهقی فی الشعب وغیرهما (کشف الخفاء ۲: ۱۴۴)

وَ قَالُوْا لَوْ لَا يَأْتِيْنَا بِاٰيَةٍ مِّنْ رَّبِّهٖ اَوَلَمْ تَاْتِهِمْ بَيِّنَةُ مَا فِي الصُّحُفِ الْاُوْلٰى ﴿۱۳۳﴾ وَلَوْ اَنَّآ اَهْلَكْنٰهُمْ بِعَذَابٍ مِّنْ قَبْلِهٖ لَقَالُوْا رَبَّنَا لَوْلَآ اَرْسَلْتَ اِلَيْنَا رَسُوْلًا فَنَتَّبِعَ اٰيٰتِكَ مِنْ قَبْلِ اَنْ نَّذِلَّ وَ نَخْزٰى ﴿۱۳۴﴾ قُلْ كُلٌّ مُّتَرَبِّصٌ فَتَرَبَّصُوْا ۚ فَسَتَعْلَمُوْنَ مَنْ اَصْحٰبُ الصِّرَاطِ السَّوِيِّ وَمَنِ اهْتَدٰى ﴿۱۳۵﴾ ع

وَ قَالُوْا	اور انھوں نے کہا	اَنَّآ	بیشک ہم	اَنْ (۴)	کہ
لَوْ لَا	کیوں نہیں	اَهْلَكْنٰهُمْ	ہلاک کرتے ان کو	نَّذِلَّ	ذلیل ہوتے ہم
يَأْتِيْنَا	لاتا وہ ہمارے پاس	بِعَذَابٍ	کسی عذاب سے	وَ نَخْزٰى	اور رسوا ہوتے ہم
بِاٰيَةٍ	کوئی نشانی	مِّنْ قَبْلِهٖ (۳)	اُس کے پہلے سے	قُلْ	کہہ دیں
مِّنْ رَّبِّهٖ	اپنے رب کے پاس سے	لَقَالُوْا	تو کہتے وہ	كُلٌّ	ہر ایک
اَوَ (۱)	کیا اور	رَبَّنَا	اے ہمارے رب	مُّتَرَبِّصٌ	انتظار کرنے والا ہے
لَمْ	نہیں	لَوْلَآ	کیوں نہیں	فَتَرَبَّصُوْا	پس انتظار کرو تم
تَاْتِهِمْ	آئی ان کے پاس	اَرْسَلْتَ	بھیجا آپ نے	فَسَتَعْلَمُوْنَ	پس ابھی جان لوگے تم
بَيِّنَةُ (۲)	واضح دلیل	اِلَيْنَا	ہماری طرف	مَنْ	کون
مَا	اس کی جو	رَسُوْلًا	کوئی رسول	اَصْحٰبُ الصِّرَاطِ	راستہ والا ہے
فِي الصُّحُفِ	کتابوں میں سے	فَنَتَّبِعَ	پس پیروی کرتے ہم	السَّوِيِّ	سیدھا
الْاُوْلٰى	اگلی	اٰيٰتِكَ	آپ کی آیتوں کی	وَمَنِ	اور کس نے
وَلَوْ	اور اگر	مِنْ قَبْلِ	پہلے سے	اهْتَدٰى	راہ پائی

سورت کا موضوع قرآن کی صداقت کا بیان بھی ہے۔ اسی سے سورت کا آغاز ہوا ہے۔ پھر موسیٰ علیہ السلام اور بنی

(۱) ہمزہ: استفہام انکاری کے لئے ہے، اور واو: جملہ مقدرہ پر عطف کے لئے ہے، أی ألم یأتهم سائر الآیات، ولم یأتهم خاصةً بینةُ ما فی الصحف الأولی؟ (۲) بینة: واضح دلیل یعنی قرآن کریم۔ بینة: مابعد کی طرف مضاف ہے، پھر لم تأت کا فاعل ہے۔ (۳) من قبله: کی ضمیر بینة کی طرف لوٹتی ہے، کیونکہ اس سے مراد قرآن ہے، اس لئے ضمیر مذکر لائی گئی ہے۔ (۴) أنْ: مصدریہ ہے جو اپنے مدخول کو مصدری معنی میں کرتا ہے۔

اسرائیل کے واقعات بیان کئے گئے ہیں، جو قرآن کے منزّل من اللہ ہونے کی دلیل ہیں۔ان واقعات کے بعد قرآن کی حقانیت کا بیان شروع ہوا تھا اب اسی تذکرہ پر سورت ختم کی جارہی ہے ـــــ نیز قرآن کریم اور رسول اللہ ﷺ کے خلاف کفار جو باتیں چھانٹتے تھے انکی ایک بات کا جواب دینا بھی ضروری ہے ـــــ اور ان لوگوں نے کہا: ''وہ ہمارے پاس کیوں کوئی نشانی اپنے پروردگار کے پاس سے نہیں لایا؟'' ـــــ یعنی ہم جن نشانیوں کا مطالبہ کررہے ہیں، ان میں سے کوئی نشانی یہ حاملِ قرآن کیوں نہیں دکھاتا؟ ان کو جواب دیا جارہا ہے: ـــــ کیا انکے پاس پہلی کتابوں کی واضح دلیل نہیں آئی؟! ـــــ یعنی یہ سب سے بڑی نشانی: عظیم الشان قرآن انکے پاس نہیں آیا، جس کی خبر اگلی کتابوں میں دی گئی ہے؟! سورۃ العنکبوت (آیت ۵۱) میں ارشاد پاک ہے: ''کیا ان لوگوں کیلئے یہ بات کافی نہیں کہ ہم نے آپؐ پر یہ کتاب نازل فرمائی ہے، جو برابر انکو سنائی جارہی ہے؟!'' حقیقت یہ ہے کہ قرآن کریم بذاتِ خود رسول اللہ ﷺ کا سب سے بڑا معجزہ ہے۔وہ ایسا معجزہ ہے جو رہتی دنیا تک باقی رہنے والا ہے۔اگر لوگ اللہ کے اس کلام میں غور کریں تو کسی دوسری نشانی کی ضرورت ہی نہ رہے! مگر افسوس! لوگ اسکی طرف سے کان بند کئے ہوئے ہیں، اور دوسری نشانیوں کا مطالبہ کرتے ہیں۔

طُرفہ تماشا: ـــــ اور اگر ہم ان کو کسی عذاب سے ہلاک کرتے، اس (قرآن) کے آنے سے پہلے تو وہ کہتے: ''اے ہمارے پروردگار! آپ نے ہمارے پاس کوئی رسول کیوں نہ بھیجا کہ ہم ذلیل وخوار ہونے سے پہلے آپ کی آیتوں کی پیروی کرتے؟'' ـــــ یعنی قرآن اور رسول آیا تو وہ کہا، اور اگر ہم رسول نہ بھیجتے، اور اس پر قرآن نازل نہ کرتے، اور ان کے کفر وشرک کی سزا میں دَھر گھسیٹتے تو یہ قیامت کے دن بہانہ بناتے، اور کہتے: ''الٰہی! آپ نے سزا دینے سے پہلے ہمارے پاس کوئی رسول اور کوئی کتاب کیوں نہ بھیجی کہ ہمیں آج ذلت ورسوائی کا سامنا نہ کرنا پڑتا۔آپ کتاب بھیجتے، پھر دیکھتے کہ ہم کیسے اس کی طرف لپکتے اور آپ کے احکام کی پیروی کرتے'' ـــــ آپ کہہ دیں: ''سب ہی انتظار کررہے ہیں، سو تم بھی انتظار کرو، پس عنقریب تمہیں معلوم ہوجائے گا کہ کون سیدھی راہ چلنے والا ہے، اور کون راہ یاب ہوا'' ـــــ یعنی ہم بھی انتظار کرتے ہیں تم بھی انتظار کرو، اور دیکھو پردۂ غیب سے کیا ظاہر ہوتا ہے۔ جلد ہی یہ حقیقت آشکارا ہوجائے گی کہ کس جماعت کا راستہ سیدھا ہے اور کون حق پر ہے ـــــ یہ حقیقت موت کے بعد اور آخرت میں تو ظاہر ہوگی ہی، ہجرت کے بعد جب دونوں فریقوں میں معرکہ آرائی شروع ہوئی، تو آٹھ سال کی قلیل مدت میں دنیا نے دیکھ لیا کہ کس کا بول بالا ہوا، اور کون سرخ رو ہوا۔مکہ مکرمہ کفار کے قبضہ سے نکل گیا، اور مسلمانوں کے پاک ہاتھوں میں آگیا۔کفار کا جھنڈا سرنگوں ہوا، اور اسلام کا جھنڈا سارے عرب پر لہرانے لگا۔

جو میل کچیل تھا وہ پھینک دیا گیا، اور جو چیز لوگوں کے لئے کار آمد تھی وہ دنیا میں باقی رہی!

بسم اللہ الرحمن الرحیم

سورۃ الانبیاء

نمبر شمار ۲۱ نزول کا نمبر ۷۳ نزول کی نوعیت مکی آیات ۱۱۲ رکوع ۷

سورت کا نام اور زمانۂ نزول: اس سورت میں سولہ نبیوں کا تذکرہ ہے، اس لئے اس کا نام ”سورۃ الانبیاء“ تجویز کیا گیا ہے۔ یہ سورت بھی مکی ہے۔ اور مکی دور کے تقریباً آخر میں نازل ہوئی ہے۔ نزول کا نمبر ۷۳ ہے۔ مکی سورتیں کل ۸۵ ہیں۔ یعنی یہ سورت بھی مکہ کے پر آشوب دور میں نازل ہوئی ہے۔ جبکہ مسلمان ظلم کی چکی میں پس رہے تھے۔ اور ہجرتِ مدینہ کا زمانہ قریب آ گیا تھا۔ چنانچہ سورت کے آخر میں کفار سے کہا گیا ہے کہ ”میں تمہیں صاف صاف دوٹوک خبردار کر چکا“ اب تم مخالفت کی پاداش کا انتظار کرو۔

سورت کے مضامین: اس سورت کا پسِ منظر وہ کش مکش ہے جو نبی ﷺ اور کفار مکہ کے درمیان بپا تھی۔ وہ لوگ دعوئے توحید و رسالت اور عقیدۂ آخرت پر شکوک و شبہات وارد کرتے تھے، آپ ﷺ کے خلاف چالیں چلتے تھے، اور مسلمانوں پر ظلم و ستم کے پہاڑ ڈھاتے تھے۔ چنانچہ سورت کا آغاز آخرت بیزاری پر انتباہ سے کیا گیا ہے۔ کیونکہ وہی سب خرابیوں کی جڑ ہے۔ پھر قرآن کے خلاف کفار کے پروپیگنڈہ کا تذکرہ کیا گیا ہے۔ اور رسول کے انسان ہونے پر ان کے اعتراض کا جواب دیا گیا ہے۔ اور ان کو سمجھایا گیا ہے کہ قرآن جادو منتر نہیں، بلکہ نصیحت نامہ ہے۔ پھر آگاہ کیا ہے کہ جو قومیں انبیاء سے برسرِ پیکار ہوتی ہیں، اور حق کا انکار کرتی ہیں ان کو تباہ کیا جاتا ہے۔ کیونکہ یہ کارخانہ بامقصد بنایا گیا ہے، محض کھیل نہیں!

پھر شرک کا ابطال ہے۔ اور ہر قسم کے معبودوں کا بطلان واضح کیا گیا ہے۔ اور یہ بیان ہے کہ اگر آسمانوں اور زمین میں اللہ تعالیٰ کے سوا کوئی معبود ہوتا تو کائنات سرے سے موجود ہی نہ ہوتی۔ پس نہ اللہ کے برابر کوئی معبود ہو سکتا

ہے، نہ ان سے کم تر۔ اور فرشتے اللہ کے معزز بندے ہیں، وہ اللہ کی اولاد نہیں۔ اس کے بعد توحید کا بیان اور قدرتِ خداوندی کی نشانیوں کا تذکرہ ہے۔

پھر رسالتِ محمدی کا بیان اور شماتتِ اعداء کا جواب دیا ہے۔ اور منکرین رسالت کے مطالبۂ عذاب کا تذکرہ کرکے ان کو اخروی انجام سنایا ہے۔ اور دلیلِ نبوت: قرآن کریم کا تذکرہ کیا ہے کہ یہ بابرکت اور کثیر المنفعت کتاب ہے، اور اس سے پہلے اس کی نظیر تورات شریف موجود ہے، جو موسیٰ وہارون علیہما السلام کو عنایت فرمائی گئی تھی۔

پھر حضرت ابراہیم علیہ السلام کا واقعہ بیان کیا ہے، جس کے ضمن میں بتوں کی خدائی کا ابطال ہے۔ اور آخر میں حضرت ابراہیم علیہ السلام کی ہجرت کا ذکر ہے۔ جس میں نبی ﷺ اور مسلمانوں کے لئے ایک اشارہ ہے۔ اور اسی نقطۂ نظر سے لوط اور نوح علیہما السلام کا ذکر کیا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے ان دونوں کو بھی قوم کی طرف سے لاحق بے چینی سے نجات بخشی تھی۔ پھر داؤد وسلیمان علیہما السلام کے ظاہری کمالات: حکومت وسطوت کا ذکر ہے، اس میں اشارہ ہے کہ ہجرت کے بعد نبی ﷺ کو بھی حکومت وسطوت ملے گی۔ پھر چار انبیاء: ایوب واسماعیل وادریس وذو الکفل علیہم السلام کا مختصر تذکرہ ہے۔ جس کا مقصد مسلمانوں کو صبر کی تلقین کرنا ہے۔ اس کے بعد یونس علیہ السلام کا تذکرہ ہے۔ جس میں نبی ﷺ کے لئے ہجرت کے حکم کے انتظار کا اشارہ ہے۔ اور آخر میں زکریا اور عیسیٰ علیہما السلام کا تذکرہ ہے۔ جس کے ذریعہ اللہ تعالیٰ کی قدرت کاملہ بیان کی گئی ہے کہ وہ مخالف حالات میں بھی جو چاہیں کر سکتے ہیں، پس مسلمانوں کو مایوس نہیں ہونا چاہئے۔

پھر عقیدۂ آخرت اور کفار ومؤمنین کی مجازات کا بیان ہے۔ جس کے ضمن میں کئی اہم باتیں بیان کی ہیں۔ مثلاً جنت کی زمین کے وارث نیک مؤمنین ہونگے اور نبی ﷺ کی بعثت رحمت عامّہ ہے، جس کو کفار زحمت ومصیبت سمجھ رہے ہیں۔ اور آخر میں دوٹوک اعلان کیا ہے کہ دین کا لب لباب خالص توحید ہے جو اس کو قبول کرے گا سرخ رو ہوگا، اور جو اس سے منہ پھیرے گا تباہ ہوگا۔
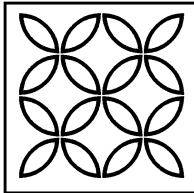
آیاتها ۱۱۲ (۲۱) سُوْرَةُ الْاَنْبِيَاءِ مَكِّيَّةٌ (۷۳) رکوعاتها ۷

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ

اِقْتَرَبَ لِلنَّاسِ حِسَابُهُمْ وَهُمْ فِیْ غَفْلَةٍ مُّعْرِضُوْنَ ۝۱ مَا يَاْتِيْهِمْ مِّنْ ذِكْرٍ مِّنْ رَّبِّهِمْ مُّحْدَثٍ اِلَّا اسْتَمَعُوْهُ وَهُمْ يَلْعَبُوْنَ ۝۲ لَاهِيَةً قُلُوْبُهُمْ ۭ وَاَسَرُّوا النَّجْوَى ۤ الَّذِيْنَ ظَلَمُوْا ۤ هَلْ هٰذَاۤ اِلَّا بَشَرٌ مِّثْلُكُمْ ۚ اَفَتَاْتُوْنَ السِّحْرَ وَاَنْتُمْ تُبْصِرُوْنَ ۝۳ قٰلَ رَبِّيْ يَعْلَمُ الْقَوْلَ فِی السَّمَاۤءِ وَالْاَرْضِ ۡ وَهُوَ السَّمِيْعُ الْعَلِيْمُ ۝۴ بَلْ قَالُوْۤا اَضْغَاثُ اَحْلَامٍۭ بَلِ افْتَرٰىهُ بَلْ هُوَ شَاعِرٌ ۚ ۤ فَلْيَاْتِنَا بِاٰيَةٍ كَمَاۤ اُرْسِلَ الْاَوَّلُوْنَ ۝۵ مَاۤ اٰمَنَتْ قَبْلَهُمْ مِّنْ قَرْيَةٍ اَهْلَكْنٰهَا ۚ اَفَهُمْ يُؤْمِنُوْنَ ۝۶ وَمَاۤ اَرْسَلْنَا قَبْلَكَ اِلَّا رِجَالًا نُّوْحِیْۤ اِلَيْهِمْ فَسْـَٔلُوْۤا اَهْلَ الذِّكْرِ اِنْ كُنْتُمْ لَا تَعْلَمُوْنَ ۝۷ وَمَا جَعَلْنٰهُمْ جَسَدًا لَّا يَاْكُلُوْنَ الطَّعَامَ وَمَا كَانُوْا خٰلِدِيْنَ ۝۸ ثُمَّ صَدَقْنٰهُمُ الْوَعْدَ فَاَنْجَيْنٰهُمْ وَمَنْ نَّشَاۤءُ وَاَهْلَكْنَا الْمُسْرِفِيْنَ ۝۹

بِسْمِ	نام سے	وَهُمْ	اور وہ	مُّحْدَثٍ (۳)	نئی (تازہ)
اللّٰهِ	اللہ کے	فِیْ غَفْلَةٍ (۱)	غفلت میں ہیں	اِلَّا	مگر
الرَّحْمٰنِ	نہایت مہربان	مُّعْرِضُوْنَ	منہ موڑنے والے	اسْتَمَعُوْهُ	سنتے ہیں وہ اس کو
الرَّحِيْمِ	بڑے رحم والے	مَا	نہیں	وَهُمْ	درانحالیکہ وہ
اِقْتَرَبَ	قریب آگیا	يَاْتِيْهِمْ	پہنچتی ان کو	يَلْعَبُوْنَ	کھیلتے ہیں
لِلنَّاسِ	لوگوں کے لئے	مِّنْ ذِكْرٍ (۲)	کوئی نصیحت	لَاهِيَةً (۴)	غفلت میں ہیں
حِسَابُهُمْ	ان کا حساب	مِّنْ رَّبِّهِمْ	انکے رب کی طرف سے	قُلُوْبُهُمْ	ان کے دل

(۱) فی غفلة: پہلی خبر ہے، اور معرضون: دوسری خبر ہے۔ (۲) من ذکر: مایأتی کا فاعل ہے۔ (۳) محدث: ذکر کی صفت ہے۔ (۴) لاهية: اسم فاعل، واحد مؤنث: غافل، لہو میں پڑا ہوا، بے رُخی اختیار کیا ہوا۔ لَهَا يَلْهُو (ن) لَهْوًا: کھیل کرنا۔ اور ←

وَاَسَرُّوا	اور چپکے چپکے کی	الْقَوْلَ	بات کو	بِاٰيَةٍ	کوئی نشانی
النَّجْوَى	سرگوشی	فِي السَّمَآءِ	آسمان میں	كَمَآ	جس طرح
الَّذِيْنَ (۱)	جنھوں نے	وَالْاَرْضِ	اور زمین (میں)	اُرْسِلَ	بھیجے گئے
ظَلَمُوْا	ظلم کیا	وَهُوَ	اور وہ	الْاَوَّلُوْنَ	پہلے لوگ
هَلْ (۲)	نہیں ہے	السَّمِيْعُ	خوب سننے والا	مَآ	نہیں
هٰذَآ	یہ شخص	الْعَلِيْمُ	سب کچھ جاننے والا ہے	اٰمَنَتْ	ایمان لائی
اِلَّا	مگر	بَلْ	بلکہ	قَبْلَهُمْ	ان سے پہلے
بَشَرٌ	ایک انسان	قَالُوْٓا	کہا انھوں نے	مِّنْ قَرْيَةٍ (۴)	کوئی بستی
مِّثْلُكُمْ	تم جیسا	اَضْغَاثُ (۳)	گٹھر ہیں	اَهْلَكْنٰهَا (۵)	جس کو ہلاک کیا ہم نے
اَفَتَاْتُوْنَ	کیا تو آتے ہو تم	اَحْلَامٍ	خوابوں کے	اَفَهُمْ	کیا تو وہ
السِّحْرَ	جادو کے پاس	بَلِ	بلکہ	يُؤْمِنُوْنَ	ایمان لائیں گے؟
وَاَنْتُمْ	درانحالیکہ تم	افْتَرٰىهُ	گھڑ لیا ہے اس نے اسکو	وَمَآ	اور نہیں
تُبْصِرُوْنَ	دیکھتے بھالتے ہو؟	بَلْ	بلکہ	اَرْسَلْنَا	بھیجا ہم نے
قٰلَ	کہا پیغمبر نے	هُوَ شَاعِرٌ	وہ شاعر ہے	قَبْلَكَ	آپ سے پہلے
رَبِّيْ	میرا پروردگار	فَلْيَاْتِنَا	پس چاہئے کہ لائے	اِلَّا	مگر
يَعْلَمُ	جانتا ہے		وہ ہمارے پاس	رِجَالًا	آدمیوں کو

← **لاهية:** یا تو **استمعوه** کی ضمیر فاعل سے حال ہے، جیسا کہ **وهم يلعبون** اس سے حال ہے، پس یہ حالِ مترادفہ ہوگا۔ یا **يلعبون** کی ضمیر فاعل سے حال ہے، پس یہ حال متداخلہ ہوگا......اور **قلوبُهم: لاهيةً** کا فاعل ہے۔

(۱) **الذين ظلموا: أسروا** کی ضمیر فاعل سے بدل ہے، یا یہ خود فاعل ہے، اور **أسروا** کا واو صرف جمعیت پر دلالت کرتا ہے۔ جیسے **أكلوني البراغيث**: مجھے پسّوؤں نے کاٹ کھایا۔(۲) **هل**: نفی کے لئے ہے۔ کیونکہ آگے **إلا** اثبات کے لئے آرہا ہے۔ اور نفی اثبات مل کر حصر پیدا کرتے ہیں، جیسے **لا إله إلا الله**: معبود صرف اللہ تعالیٰ ہیں۔(۳) **أضغاث: ضِغْث** کی جمع ہے، جس کے معنی ہیں: سینکوں کا مٹھا یا لکڑیوں کا گٹھر......اور **أحلام: حِلْم** کی جمع ہے، جس کے معنی ہیں: خواب...... چونکہ سینکوں کے مٹھے اور لکڑیوں کے گٹھر میں بری بھلی ہر طرح کی سینکیں اور لکڑیاں ہوتی ہیں، اس لئے پریشان خوابوں کو **اَضغاث أحلام** کہتے ہیں۔
(۴) **من قرية**: میں مِنْ زائدہ ہے، عموم کی تاکید کے لئے لایا گیا ہے۔(۵) جملہ **أهلكناها: قرية** کی صفت ہے۔

نُوْحِيْٓ	وحی کرتے ہیں ہم	جَعَلْنٰهُمْ	بنایا ہم نے ان کو	صَدَقْنٰهُمُ	سچا کیا ہم نے ان سے
اِلَيْهِمْ	ان کی طرف	جَسَدًا	ایسے جسم	الْوَعْدَ	وعدہ
فَسْـَٔلُوْٓا	پس پوچھو تم	لَّا يَاْكُلُوْنَ [۱]	جو نہ کھاتے ہوں	فَاَنْجَيْنٰهُمْ	پس نجات دی ہم نے
اَهْلَ الذِّكْرِ	آسمانی کتاب والوں سے	الطَّعَامَ	کھانا		ان کو
اِنْ	اگر	وَمَا	اور نہیں	وَمَنْ	اور جس کو
كُنْتُمْ	ہو تم	كَانُوْا	تھے وہ	نَّشَآءُ	چاہا ہم نے
لَا تَعْلَمُوْنَ	نہیں جانتے	خٰلِدِيْنَ	ہمیشہ رہنے والے	وَ اَهْلَكْنَا	اور ہلاک کیا ہم نے
وَمَآ	اور نہیں	ثُمَّ	پھر	الْمُسْرِفِيْنَ	حد سے نکلنے والوں کو

اللہ تعالیٰ کے نام سے شروع کرتا ہوں جو نہایت مہربان بڑے رحم والے ہیں

گذشتہ سورت قرآن کی حقانیت اور رسول کی صداقت کے بیان پر ختم ہوئی تھی۔ اب یہ سورت انہی مضامین سے شروع ہو رہی ہے۔ اور ابتداء میں ایک انتباہ ہے۔ ایک ایسی بات سے خبر دار کیا گیا ہے جو سب خرابیوں کی جڑ ہے۔ یعنی آخرت بیزاری۔ ارشاد ہے —— قریب آ پہنچا لوگوں کے لئے ان کا حساب اور وہ غفلت میں منہ موڑے ہوئے ہیں —— یعنی حساب و کتاب اور مجازات کی گھڑی سر پہ کھڑی ہے۔ اور لوگ ہیں کہ سخت غفلت میں پڑے ہوئے ہیں، قرآن پاک کی نصیحتوں سے منہ موڑے ہوئے ہیں۔ ایک کان سے سن کر دوسرے کان سے اڑا دیتے ہیں۔ یہ آخرت فراموشی انکار قرآن کا اصل سبب ہے —— حساب و کتاب کا اصل وقت تو قیامت کا دن ہے۔ مگر اس کا سلسلہ موت کے ساتھ ہی شروع ہو جاتا ہے۔ اور قیامت بھی نزدیک آ چکی ہے۔ جو چیز آنے والی ہے وہ آنے والی ہے۔ اور موت تو سر پہ منڈلا رہی ہے۔ پھر یہ غفلت کیوں؟ —— نہیں پہنچتی ان کو ان کے پروردگار کی طرف سے کوئی تازہ نصیحت، مگر وہ اس کو سنتے ہیں کھیلتے ہوئے، غفلت میں پڑے ہوئے ہیں ان کے دل —— یعنی جب بھی کوئی نئی وحی نازل ہوتی ہے، اور آیاتُ اللہ سنا کر ان کو چونکایا جاتا ہے تو وہ اس کو ہنسی کرتے ہوئے سنتے ہیں۔ سنجیدگی سے نہیں لیتے۔ اور نہایت لاپروائی سے اس کو ٹلا دیتے ہیں۔ کیونکہ ان کے دل اس نصیحت کی طرف سے غفلت میں پڑے ہوئے ہیں —— آخرت سے غفلت دو طرح کی ہوتی ہے: ایک: سادہ غفلت، دوسری: اعراض و انکار کے ساتھ ملی ہوئی غفلت۔ پہلی غفلت مؤمن میں بھی ہوتی ہے۔ دنیا چونکہ ہر وقت انسان کے سامنے ہے، اور آخرت

(۱) جملہ لایأکلون: جسداً کی صفت ہے۔

آنکھوں سے اوجھل۔ اس لئے اکثر و بیشتر آدمی پر دنیا ہی کی فکر غالب رہتی ہے۔ مگر جب وقت گذر جاتا ہے، اور موت سامنے آکھڑی ہوتی ہے، تو کفِ افسوس ملتا رہ جاتا ہے ——— اور اعراض کے ساتھ غفلت کافر اور نام نہاد مسلمان ہی میں ہوتی ہے۔ اس کا چونکہ آخرت پر یقین نہیں ہوتا یا آخرت کا صحیح تصور اس کے ذہن میں نہیں ہوتا، اس لئے وہ آخرت کا تذکرہ برائے نام سنتا ہے، اور ہنسی میں اڑا دیتا ہے۔

اور صرف اتنا ہی نہیں کہ وہ قرآن کی نصیحت نہیں سنتے، بلکہ چاہتے ہیں کہ اور بھی کوئی نہ سنے۔ چنانچہ جب مکہ کے عام لوگوں پر قرآن کی دعوت کا اثر شروع ہوا، اور ان میں آخرت کی فکر پیدا ہوئی، اور وہ قرآن کی آواز کی طرف لپکے، تو مکہ کے سرغنوں نے خفیہ میٹنگ کی، جس میں یہ بات زیرِ غور آئی کہ قرآن کی دعوت کی راہ میں اڑچن کیسے کھڑی کی جائے؟ ظالموں نے طے کیا کہ نبی ﷺ کے خلاف پروپیگنڈہ شروع کیا جائے۔ اور ان کے سامنے ایک مطالبہ رکھا جائے۔ اللہ پاک علیم وخبیر سب سے پہلے اس راز داری کا پردہ فاش کرتے ہیں، اور یہ غلط فہمی دور کرتے ہیں کہ اللہ پاک سے کوئی بات مخفی نہیں ہوسکتی۔ پھر ان کی باتوں میں سے جو معقول بات کہی جاسکتی ہے اس کا جواب دیتے ہیں۔ اور ان کا مطالبہ پورا نہ کرنے کی وجہ بیان فرماتے ہیں۔ ارشاد ہے: ——— اور ظالموں نے چپکے چپکے سرگوشی کی یہ شخص بس تم ہی جیسا ایک انسان ہے، پس کیا تم جادو کے پاس جاؤ گے درانحالیکہ تم دیکھتے بھالتے ہو؟! ——— یعنی اُن سرکشوں نے طے کیا کہ لوگوں کو سمجھایا جائے کہ یہ شخص ہم ہی جیسا ایک انسان ہے، کھاتا ہے، پیتا ہے، بازاروں میں چلتا پھرتا ہے، بیوی بچے رکھتا ہے، نہ فرشتہ ہے نہ دیوتا نہ اوتار، نہ کوئی ظاہری امتیاز رکھتا ہے۔ اس میں کونسی نئی بات ہے کہ ہم اس کا دین اختیار کریں، اور اس کی راہ پر چلیں؟ اور اس کی بات (قرآن کریم) میں جو تاثیر ہے، اس کے بارے میں کہا جائے کہ وہ ''جادو منتر'' ہے، پس کیا تم سوجھ بوجھ رکھتے ہوئے اس کو سننے جاؤ گے، اور اس کی باتوں میں پھنسو گے؟! تمہیں اس سے کوسوں دور رہنا چاہئے ——— کفار کی ان باتوں میں صرف اتنی بات معقول کہی جاسکتی ہے کہ ''یہ شخص بس تم ہی جیسا ایک انسان ہے'' چنانچہ اس کا جواب آگے آرہا ہے۔ باقی قرآن کریم کو ''جادو منتر'' کہنا: تو اس کا بودا پن عرب کا بچہ بچہ جانتا تھا ——— ابھی ان کی خفیہ مجلس کی باتیں پوری نہیں ہوئیں، درمیان میں اللہ پاک یہ بات صاف کر دیتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ پر کوئی ادنی بات مخفی نہیں [1] ارشاد ہے: ——— پیغمبر نے کہا: ''میرا پروردگار جانتا ہے بات کو، خواہ آسمان میں ہو یا زمین میں، اور وہ خوب سننے والا، سب کچھ جاننے والا ہے!'' ——— یعنی تم کتنے ہی چھپا کر مشورے کرو، اللہ تعالیٰ کو سب خبر ہے۔ وہ آسمانوں اور

(۱) قرآن کا اسلوب یہ ہے کہ وہ اصل بات کے بیان میں ذرا تاخیر نہیں کرتا، چاہے اس کے لئے سلسلہ کلام روک دینا پڑے ۱۲

زمین کی ہر بات کو جانتے ہیں، پھر تمہارے راز اُن سے کیسے پوشیدہ ہو سکتے ہیں؟ ـــــــ (ان ظالموں کی باتیں) بلکہ انھوں نے کہا: پریشان خوابوں کا پشتارہ ہے، بلکہ: اس کو اس نے خود گھڑلیا ہے بلکہ: وہ شاعر ہے ـــــــ یعنی کسی بات پر قرار نہیں، کوئی کچھ کہتا ہے کوئی کچھ۔ کوئی تجویز رکھتا ہے کہ قرآن کو اس شخص کے پریشان خوابوں کا مجموعہ کہا جائے۔ کوئی کہتا ہے کہ یہ پروپیگنڈہ کیا جائے کہ یہ خود اس کا اپنا کلام ہے، جسے اس نے اللہ کے نام لگا دیا ہے۔ کوئی اس کو شاعر باور کرانا چاہتا ہے یعنی اس نے شاعروں کی طرح تخیل کی بلند پروازی سے کچھ مضامین مؤثر اور مسجع عبارت میں پیش کر دیئے ہیں ـــــــ (اگر واقعی وہ سچا ہے) پس چاہئے کہ لائے وہ ہمارے پاس کوئی نشانی، جس طرح پہلے انبیاء بھیجے گئے ہیں ـــــــ یعنی اگر واقعی قرآن خدا کا کلام ہے، اور وہ شخص اللہ تعالیٰ کا بھیجا ہوا ہے، تو چاہئے کہ وہ کوئی ایسا کھلا ہوا معجزہ دکھائے، جیسا پہلے پیغمبروں نے دکھایا ہے۔ جیسے موسیٰ علیہ السلام فرعون کی طرف بھیجے گئے تو عصا اور ید بیضاء کا معجزہ دے کر بھیجے گئے۔ صالح علیہ السلام نے قوم کے مطالبہ پر اونٹنی کا معجزہ دکھایا، اِس نبی کو بھی چاہئے کہ وہ ہمارے فرمائشی معجزات دکھائے ـــــــ قرآن کریم سب سے پہلے ان کے اس مطالبہ کا جواب دیتا ہے ـــــــ ان سے پہلے ایسی کوئی بستی ایمان نہیں لائی جس کو ہم نے ہلاک کیا، پس کیا وہ ایمان لے آئیں گے؟! ـــــــ یعنی پچھلی قوموں کو فرمائشی نشان دکھلائے گئے، مگر وہ انہیں دیکھ کر بھی ایمان نہیں لائے، اور ہلاک کئے گئے۔ تو کیا ان مشرکین کو بھی ان کے فرمائشی معجزات دکھا دیئے جائیں تو وہ مان لیں گے؟ ہرگز نہیں مانیں گے۔ پس لامحالہ سنت الٰہی کے موافق تباہ کئے جائیں گے۔ جبکہ ان کی بالکلیہ تباہی مقدر نہیں۔ حکمتِ الٰہی میں ان کا بقاء مقصود ہے۔ وہی آگے چل کر ایمان لانے والے ہیں۔ اور اس رسول کے دست و بازو بننے والے ہیں، اس لئے ان کے فرمائشی معجزات نہیں دکھائے جا رہے ـــــــ ان کے فرمائشی معجزات کیا تھے؟ ان کا تذکرہ سورہ بنی اسرائیل آیات ۹۰ تا ۹۳ میں گذر چکا ہے۔ وہاں دیکھ لیا جائے۔

اب کفار کی پہلی بات کا جواب دیا جاتا ہے کہ وہ شخص بس تم ہی جیسا ایک انسان ہے باقی باتوں کا بوداپن ظاہر ہے اس لئے ان کا جواب نہیں دیا گیا۔ ارشاد ہے ـــــــ اور ہم نے آپؐ سے پہلے مردوں ہی کو بھیجا ہے جن کی طرف ہم وحی کرتے ہیں ـــــــ یعنی پہلے بھی جو رسول مبعوث کئے گئے وہ انسان ہی تھے، فرشتے اور دیوتا نہیں تھے۔ اور دوسرے انسانوں سے ان کا امتیاز یہ تھا کہ ان کے پاس وحی آتی تھی ـــــــ پس آسمانی کتابیں رکھنے والوں سے پوچھ لو اگر تم نہ جانتے ہو ـــــــ یعنی یہود و نصاریٰ تمہارے درمیان موجود ہیں۔ مکہ مکرمہ میں عیسائی تھے اور مدینہ میں یہودی۔ پس اگر تم اتنی موٹی بات بھی نہیں جانتے تو اُن سے پوچھ لو کہ پہلے زمانوں میں جو انبیاء تشریف لائے وہ

انسان تھے یا فرشتے؟ ـــــ اور ہم نے ان کے ایسے اجسام نہیں بنائے تھے کہ وہ کھانا نہ کھاتے ہوں اور نہ وہ ہمیشہ رہنے والے تھے ـــــ یعنی وہ فرشتے اور دیوتا نہیں تھے، نہ وہ عمر جاودانی لے کر آئے تھے۔ وہ سب انبیاء عام انسانوں کی طرح کھاتے پیتے اور اپنی جسمانی ضروریات رکھتے تھے۔ وہ خدا نہیں تھے کہ کبھی ان کو موت اور فنا نہ آئے، پھر تمہیں اس آخری رسول پر تعجب کیوں ہے؟ ـــــ پھر ہم نے ان سے کیا ہوا وعدہ سچا کر دکھایا، پس ہم نے ان کو اور جس کو چاہا نجات دی، اور حد سے نکلنے والوں کو ہلاک کیا ـــــ یعنی ان کا پہلا امتیاز تو وہ تھا جو ابھی گذرا کہ وہ اللہ کی طرف سے مخلوق کی اصلاح کے لئے مقرر کئے جاتے ہیں۔ اور اللہ تعالیٰ ان کی طرف وحی بھیجتے ہیں۔ اور ان کا دوسرا امتیاز یہ ہے کہ مخالفین کے مقابلہ میں ان کی مدد کی جاتی ہے۔ ہمیشہ نبیوں سے کئے گئے وعدے اللہ نے سچے کر دکھائے ہیں۔ ان کو مؤمنین کے ساتھ محفوظ رکھا ہے۔ اور حد سے تجاوز کرنے والوں کو جو اُن سے ٹکرائے تباہ و برباد کیا ہے۔ پس کیا اس میں تمہارے لئے سبق نہیں؟! (جواب کا سلسلہ ابھی جاری ہے)

جو کفار رسول کا مرتبہ گھٹاتے ہیں، اور اس کو صرف اپنے جیسا انسان تصور کرتے ہیں، اور جو لوگ رسول کا مرتبہ بڑھاتے ہیں، اور اس کو اللہ کا بیٹا یا عالم الغیب مالک تصرف مانتے ہیں وہ سب غلط ہیں۔ صحیح عقیدہ وہ ہے جو کلمۂ شہادت میں ہے کہ حضرت محمد مصطفیٰ ﷺ اللہ کے بندے اور رسول ہیں۔

لَقَدْ اَنْزَلْنَآ اِلَيْكُمْ كِتٰبًا فِيْهِ ذِكْرُكُمْ ۭ اَفَلَا تَعْقِلُوْنَ ۝۱۰ۧ وَكَمْ قَصَمْنَا مِنْ قَرْيَةٍ كَانَتْ ظَالِمَةً وَّاَنْشَاْنَا بَعْدَهَا قَوْمًا اٰخَرِيْنَ ۝۱۱ فَلَمَّآ اَحَسُّوْا بَاْسَنَآ اِذَا هُمْ مِّنْهَا يَرْكُضُوْنَ ۝۱۲ۭ لَا تَرْكُضُوْا وَارْجِعُوْٓا اِلٰى مَآ اُتْرِفْتُمْ فِيْهِ وَمَسٰكِنِكُمْ لَعَلَّكُمْ تُسْـَٔلُوْنَ ۝۱۳ قَالُوْا يٰوَيْلَنَآ اِنَّا كُنَّا ظٰلِمِيْنَ ۝۱۴ فَمَا زَالَتْ تِّلْكَ دَعْوٰىهُمْ حَتّٰى جَعَلْنٰهُمْ حَصِيْدًا خٰمِدِيْنَ ۝۱۵ ع۱

لَقَدْ	اور البتہ تحقیق	كِتٰبًا	ایک کتاب	اَفَلَا	کیا پس نہیں
اَنْزَلْنَا	اتاری ہم نے	فِيْهِ	جس میں	تَعْقِلُوْنَ	سمجھتے ہو تم؟
اِلَيْكُمْ	تمہاری طرف	ذِكْرُكُمْ	تمہاری نصیحت ہے	وَكَمْ	اور کتنی ہی

قَصَمْنَا [1]	پیس ڈالی ہم نے	مِّنْهَا	ان بستیوں سے	يٰوَيْلَنَآ	ہائے کم بختی ہماری!
مِنْ قَرْيَةٍ	بستیاں	يَرْكُضُوْنَ [2]	ایڑ کرنے لگے	اِنَّا	بیشک ہم
كَانَتْ	تھیں وہ	لَا تَرْكُضُوْا	ایڑ مت کرو	كُنَّا	تھے ہم
ظَالِمَةً	ظالم	وَارْجِعُوْٓا	اور لوٹ جاؤ	ظٰلِمِيْنَ	ظلم کرنے والے
وَّاَنْشَاْنَا	اور پیدا کی ہم نے	اِلٰى مَآ	اس چیز کی طرف	فَمَا زَالَتْ	پس برابر رہی
بَعْدَهَا	ان کے بعد	اُتْرِفْتُمْ [3]	اتراتے تھے تم	تِّلْكَ	وہ
قَوْمًا اٰخَرِيْنَ	دوسری قوم	فِيْهِ	اس میں	دَعْوٰىهُمْ	ان کی پکار
فَلَمَّآ	پس جب	وَمَسٰكِنِكُمْ [4]	اور اپنے گھروں کی طرف	حَتّٰى	یہاں تک کہ
اَحَسُّوْا	آہٹ پائی انھوں نے	لَعَلَّكُمْ	شاید تم	جَعَلْنٰهُمْ	کر دیا ہم نے ان کو
بَاْسَنَآ	ہمارے عذاب کی	تُسْـَٔلُوْنَ	پوچھے جاؤ	حَصِيْدًا [5]	کٹی ہوئی کھیتی
اِذَا هُمْ	(تو) اچانک وہ	قَالُوْا	کہا انھوں نے	خٰمِدِيْنَ [6]	بجھی ہوئی آگ

کفار نے قرآنِ پاک کو جادو منتر بتایا تھا۔ اب اس کا جواب دیا جارہا ہے کہ یہ جادو منتر نہیں ہے، بلکہ تمہارے لئے ''نصیحت نامہ'' ہے۔ اگر تم اس کی نصیحت پر کان نہیں دَھروگے تو صفحۂ ہستی سے مٹادیئے جاؤگے۔ ارشاد ہے:

——— اور البتہ واقعہ یہ ہے کہ ہم نے تمہاری طرف ایک ایسی کتاب اتاری ہے، جس میں تمہارے لئے نصیحت ہے، پس کیا تم سمجھتے نہیں ہو؟ ——— یعنی قرآنِ پاک تمہاری خیر خواہی کے لئے اتارا گیا ہے، جس کو تم جادو منتر بتاتے ہو۔ کیا تمہاری عقل ماری گئی ہے! ایسی سراسر مفید کتاب کو اس طرح ٹھکراتے ہو؟ اگر تمہارا یہی وطیرہ رہا تو سنو

———اور کتنی ہی بستیاں ہم نے پیس ڈالیں، جن کے باشندے ظالم تھے، اور ان کے بعد ہم نے دوسری قوم پیدا کردی ——— یعنی ان اقوام کے نیست و نابود ہونے سے اللہ کی زمین اجڑ نہیں گئی، وہ گئے تو دوسرے ان کی جگہ

(۱) قَصَمَ (ن) قصماً الشیئَ: توڑنا، ہلاک کرنا۔ (۲) رَكَضَ (ن) رَكْضًا الدابةَ: دوڑانے کے لئے جانور کو ایڑ لگانا، پیر مار کر دوڑانا۔ (۳) أَتْرَفَ النعمةُ فلانا: آسودگی کا کسی کو مغرور بنادینا۔ (۴) مساکنکم کا عطف ما پر ہے۔ (۵) حَصِيْدٌ بروزن فعیل بمعنی مفعول، صفت مشبہ ہے۔ از حَصَاد: کھیتی کاٹنا، جڑ سے اکھاڑنا ترکیب میں جعل کا مفعول ثانی ہے۔ (۶) خامدین: بجھنے والے اسم فاعل از خُمُوْدٌ: ترکیب میں حصیداً کے ساتھ مل کر جعل کا مفعول ثانی ہے۔ مفعول ثانی میں دو تشبیہیں مجتمع ہیں۔

بسادیئے گئے ــــــ پس جب ان کو ہمارے عذاب کی بھنک پڑی تو وہ اچانک ان بستیوں سے سرپٹ بھاگنے لگے ــــــ تا کہ کسی طرح عذاب سے بچ جائیں۔مگر ندائے غیبی آئی کہ ــــــ سرپٹ مت بھاگو، اور اس سامانِ عیش کی طرف پلٹو، جن پر تم اِتراتے تھے، اور اپنے گھروں کی طرف، شاید تم پوچھے جاؤ ــــــ یعنی کوئی حال دریافت کرے، ہمدردی کا اظہار کرے، اور خیر خبر پوچھے ــــــ مگر وہاں تو ہو کا عالم تھا، نہ وہ سامان رہا تھا نہ مکان، نہ کسی ہمدرد کا نام ونشان! ــــــ انھوں نے کہا: ’’ہائے ہماری شامت! بیشک ہم ظلم کرنے والے تھے ــــــ یعنی جب عذاب آنکھوں سے دیکھ لیا تب اپنے جرموں کا اعتراف کیا ــــــ پس برابر ان کی یہی پکار رہی یہاں تک کہ ہم نے ان کو کٹی ہوئی کھیتی بجھی ہوئی آگ بنادیا ــــــ بدکار قومیں اسی طرح نزولِ عذاب کے وقت پچھتاتی ہیں۔اپنے جرم کا اعتراف کرتی ہیں۔اور واویلا مچاتی ہیں۔مگر آخر وقت کی آہ وبُکاء کچھ کام نہیں آتی۔سب فنا کی گھاٹ اتار دی جاتی ہیں۔اور ان کا انجام اس کھیتی جیسا ہو کر رہ جاتا ہے جس کو کاٹ کر ڈھیر کر دیا گیا ہو، یا اس آگ جیسا ہو جاتا ہے جو بجھ کر راکھ ہوگئی ہو۔اب نہ خود ہیں نہ ہے مکان باقی، نام کو بھی نہیں نشان باقی!

فائدہ: فيه ذكركم کی تفسیر حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے یہ مروی ہے کہ ذکر بمعنی تذکرہ ہے۔یعنی قرآن عربوں کے مجد وشرف کی بڑی دستاویز ہے۔چونکہ یہ کتاب ان کی زبان میں ان کے ایک فرد پر نازل ہوئی ہے، اس لئے ان کو اس کتاب کے ذریعہ دائمی شہرت حاصل ہوگئی ہے۔اس تفسیر کے سلسلہ میں روح المعانی میں صراحت ہے کہ یہ لفظ ذکر کے مجازی معنی ہیں۔

مال ودولت اور زور وقوت کا نشہ اس وقت ہرن ہو جاتا ہے، جب عذاب کا کوڑا برسنا شروع ہوتا ہے

وَمَا خَلَقْنَا السَّمَآءَ وَالْاَرْضَ وَمَا بَيْنَهُمَا لٰعِبِيْنَ ﴿١٦﴾ لَوْ اَرَدْنَآ اَنْ نَّتَّخِذَ لَهْوًا لَّاتَّخَذْنٰهُ مِنْ لَّدُنَّآ ۖ اِنْ كُنَّا فٰعِلِيْنَ ﴿١٧﴾ بَلْ نَقْذِفُ بِالْحَقِّ عَلَى الْبَاطِلِ فَيَدْمَغُهٗ فَاِذَا هُوَ زَاهِقٌ ۚ وَلَكُمُ الْوَيْلُ مِمَّا تَصِفُوْنَ ﴿١٨﴾

وَمَا	اور نہیں	وَالْاَرْضَ	اور زمین کو	لٰعِبِيْنَ	کھیلتے ہوئے
خَلَقْنَا	پیدا کیا ہم نے	وَمَا	اور اس کو جو	لَوْ	اگر
السَّمَآءَ	آسمان	بَيْنَهُمَا	دونوں کے درمیان ہے	اَرَدْنَآ	چاہتے ہم

اَنْ	کہ	فٰعِلِيْنَ	کرنے والے	فَاِذَا	پس اچانک
نَتَّخِذَ	بنائیں ہم	بَلْ	بلکہ	هُوَ	وہ
لَهْوًا[1]	کوئی تفریحی مشغلہ	نَقْذِفُ[2]	پھینک مارتے ہیں ہم	زَاهِقٌ[4]	ناپید ہوجاتا ہے
لَّاتَّخَذْنٰهُ	(تو) البتہ بناتے ہم	بِالْحَقِّ	حق کو	وَلَكُمُ	اور تمہارے لئے
	اس کو	عَلَى الْبَاطِلِ	باطل پر	الْوَيْلُ	بڑی خرابی ہے
مِنْ لَّدُنَّآ	خاص اپنے پاس سے	فَيَدْمَغُهٗ[3]	پس بھیجا نکال دیتا ہے	مِمَّا	ان باتوں سے جو
اِنْ كُنَّا	اگر ہوتے ہم		وہ اس کا	تَصِفُوْنَ[5]	تم بیان کرتے ہو

گذشتہ آیات میں یہ بات بیان کی گئی ہے کہ جو قومیں نبیوں سے برسرِ پیکار ہوتی ہیں، حق تعالیٰ کا انکار کرتی ہیں اور حد سے تجاوز کر جاتی ہیں، ان کو صفحۂ ہستی سے مٹا دیا جاتا ہے۔ اب اس کی وجہ بیان کی جاتی ہے کہ ایسا کیوں کیا جاتا ہے؟ اس کی وجہ یہ بیان کی ہے کہ یہ کارخانۂ ہستی کوئی کھیل تماشا نہیں۔ بلکہ ایک بامقصد زندگی ہے۔ پس جو لوگ مقصدِ حیات کو پورا نہیں کرتے اور حق سے ٹکراتے ہیں، ان کو زندگی کے اسٹیج سے ہٹا دیا جاتا ہے۔ ارشاد ہے: ـــــ اور ہم نے آسمان وزمین اور ان کے درمیان کی چیزوں کو کھیلتے ہوئے پیدا نہیں کیا ـــــ یعنی یہ کائنات کچھ بچوں کا کھیل نہیں ہے جس کا مقصد تفریح کے علاوہ کچھ نہیں ہوتا۔ بلکہ اس کی تخلیق سے بے شمار حکمتیں اور مخلوق کی بے حساب مصلحتیں وابستہ ہیں ـــــ اگر ہم کوئی تفریحی مشغلہ بنانا چاہتے تو یقیناً ہم خاص اپنے پاس سے اس کو بناتے، اگر ہمیں ایسا کرنا ہوتا ـــــ یعنی اگر ایسے لہو ولعب کے کام بالفرض ہماری شان کے لائق ہوتے، اور ہم ایسا کرنا بھی چاہتے تو ہم اپنی صفاتِ کمالیہ کے مشاہدہ کو اس کا ذریعہ بناتے۔ جو لوگ باکمال ہوتے ہیں، مثلاً بہت بڑے شاعر ہوتے ہیں۔ بہت بڑے سیاست کار ہوتے ہیں، مضمون نگار ہوتے ہیں، حساب دان ہوتے ہیں، سائنس دان ہوتے ہیں، یا کوئی اور کمال رکھتے ہیں، جب وہ دل بہلانا چاہتے ہیں، تو اپنے ہی کمالات میں کھو جاتے ہیں، اور ان میں مگن رہتے ہیں۔ خارجی مشغلہ اختیار نہیں کرتے۔ پس اللہ تعالیٰ کو بھی کوئی تفریحی مشغلہ بنانا ہوتا تو ان کی صفاتِ کمالیہ کافی

(۱) لہو: وہ کام ہے جس کا کوئی مقصد نہ ہو، وقت گذاری کا مشغلہ، بہلاوا، سامانِ تفریح۔ اور لعب: وہ کام ہے جس کا کوئی صحیح مقصد نہ ہو، کھیل تماشا۔ (۲) قَذَفَ (ض) بالشیئ قَذْفًا: کوئی چیز زور سے پھینکنا۔ (۳) دَمَغَ (ف) فلانا دَمْغًا: ایسی چوٹ لگانا جس کا زخم دماغ تک پہنچ جائے، بھیجا نکال دینا۔ (۴) زَهَقَ (ف) الباطلُ زَهْقًا: ناپید وفنا ہونا۔ (۵) وَصَفَ (ض) الشیئ وَصْفًا: کسی چیز کی اچھی یا بری حالت بیان کرنا۔

تھیں، وہ کائنات کو اس کا ذریعہ نہ بناتے —— بلکہ ہم حق کو باطل پر دے مارتے ہیں، پس وہ اس کا بھیجا نکال دیتا ہے۔ پس اچانک وہ ناپید ہو جاتا ہے —— یعنی یہ کائنات حق و باطل کی رَزْم گاہ ہے۔ یہاں جب باطل سر ابھارتا ہے تو اللہ تعالیٰ نبیوں اور کتابوں کے ذریعہ حق نازل فرماتے ہیں۔ اور اس کو باطل سے ٹکراتے ہیں، وہ باطل کا سر کچل دیتا ہے۔ پس وہ یکدم نابود ہو جاتا ہے، اور حق کا بول بالا ہو جاتا ہے —— اور تمہارے لئے بڑی خرابی ہے ان باتوں کی وجہ سے جو تم بیان کرتے ہو —— کوئی کہتا ہے: یہ کائنات محض تماشا گاہ اور ایشور کی لیلا (عیش ونشاط کی محفل اور کھیل تماشا) ہے۔ حق تعالیٰ کا مقصود اس سے بجز تماشا دیکھنے اور دکھانے کے کچھ نہیں۔ کوئی سرے سے اس کا منکر ہے کہ اس کائنات کے پیچھے کوئی طاقت کارفرما ہے۔ وہ کائنات کو خود کار کارخانہ قرار دیتا ہے۔ اور کوئی عاجز خدا مانتا ہے، اور اس کے لئے مددگار تجویز کرتا ہے اور ان کی پوجا کرتا ہے۔ یہ سب مہمل باتیں رنگ لانے والی ہیں، حق و باطل کی معرکہ آرائی شروع ہو چکی ہے۔ اب باطل کے پاؤں زیادہ دیر تک جمنے نہیں پائیں گے۔ وہ جلد رفو چکر ہوگا۔ ماضی میں بھی جب ایسی صورت پیدا آئی ہے تو اللہ تعالیٰ نے باطل کے سرغنوں کو نابود اور ان کی بستیوں کو برباد کیا ہے۔ سوائے دانش والو! عبرت حاصل کرو!۔

> محفلِ کائنات میں باطل اچھل کود مچاتا رہتا ہے، مگر جب حق اس سے برسرِ پیکار ہوتا ہے تو وہ باطل کا سر کچل دیتا ہے۔

وَلَهٗ مَنْ فِي السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ وَمَنْ عِنْدَهٗ لَا يَسْتَكْبِرُوْنَ عَنْ عِبَادَتِهٖ وَلَا يَسْتَحْسِرُوْنَ ﴿١٩﴾ يُسَبِّحُوْنَ الَّيْلَ وَالنَّهَارَ لَا يَفْتُرُوْنَ ﴿٢٠﴾ اَمِ اتَّخَذُوْٓا اٰلِهَةً مِّنَ الْاَرْضِ هُمْ يُنْشِرُوْنَ ﴿٢١﴾ لَوْ كَانَ فِيْهِمَآ اٰلِهَةٌ اِلَّا اللّٰهُ لَفَسَدَتَا ۚ فَسُبْحٰنَ اللّٰهِ رَبِّ الْعَرْشِ عَمَّا يَصِفُوْنَ ﴿٢٢﴾ لَا يُسْـَٔلُ عَمَّا يَفْعَلُ وَهُمْ يُسْـَٔلُوْنَ ﴿٢٣﴾

وَلَهٗ	اور اس کے لئے ہے	فِي السَّمٰوٰتِ	آسمانوں میں	وَمَنْ	اور جو (فرشتے)
مَنْ	جو کوئی	وَالْاَرْضِ	اور زمین (میں ہے)	عِنْدَهٗ	اس کے پاس ہیں

لَا يَسْتَكْبِرُوْنَ	وہ عار نہیں کرتے	مِّنَ الْاَرْضِ	زمین سے	اللّٰهِ	اللہ تعالیٰ
عَنْ عِبَادَتِهٖ	اس کی عبادت سے	هُمْ	وہ	رَبِّ	پروردگار
وَلَا يَسْتَحْسِرُوْنَ (۱)	اور نہ وہ تھکتے ہیں	يُنْشِرُوْنَ (۳)	زندہ کرتے ہیں	الْعَرْشِ	تختِ شاہی کا
يُسَبِّحُوْنَ	پاکی بیان کرتے ہیں وہ	لَوْ كَانَ	اگر ہوتے	عَمَّا	ان باتوں سے جو
الَّيْلَ	رات	فِيْهِمَا	دونوں میں	يَصِفُوْنَ	بیان کرتے ہیں وہ
وَالنَّهَارَ	اور دن	اٰلِهَةٌ	معبود	لَا يُسْئَلُ	نہیں پوچھا جاتا وہ
لَا يَفْتُرُوْنَ (۲)	سست نہیں پڑتے وہ	اِلَّا (۴)	سوائے	عَمَّا	ان کاموں سے جو
اَمِ	کیا	اللّٰهُ	اللہ کے	يَفْعَلُ	کرتا ہے وہ
اتَّخَذُوْٓا	بنائے انھوں نے	لَفَسَدَتَا	تو درہم برہم ہوجاتے دونوں	وَهُمْ	اور وہ
اٰلِهَةً	معبود	فَسُبْحٰنَ	پس پاک ہے	يُسْئَلُوْنَ	پوچھے جاتے ہیں

گذشتہ آیت میں ارشاد فرمایا ہے کہ مشرکین کے لئے ان باتوں کی وجہ سے جو وہ بیان کرتے ہیں بڑی خرابی اور کم بختی ہے۔ یعنی وہ جو اللہ تعالیٰ کے ساتھ شریک ٹھہراتے ہیں: وہ ان کی تباہی کا پیش خیمہ ہے۔ اب ان آیات میں ان کے اِشراک کا ابطال ہے ـــــ مشرکین اللہ کے ساتھ دو طرح کے شریک ٹھہراتے ہیں: آسمانی اور زمینی۔ ان کے آسمانی معبود فرشتے ہیں، جن کو وہ دیوی دیوتا کہتے ہیں۔ ان کے بارے میں مشرکین کا عقیدہ یہ ہے کہ وہ اللہ کے بیٹے بیٹیاں اور مقرب ہیں، ان کی سفارش ضرور قبول ہوگی، اس لئے اگر بندگی کرکے ان کو خوش کرلیا جائے تو بیڑا پار ہوجائے گا۔ دوسرے زمینی خدا جن میں سے بعض کے بارے میں ان کا عقیدہ یہ ہے کہ وہ اوتار ہیں، یعنی اللہ تعالیٰ بذاتِ خود روپ دَھار کر ان کی شکل میں دنیا میں آئے ہیں۔ یا وہ اللہ تعالیٰ کے مقرب بندے (انبیاء واولیاء) ہیں، جن کی بندگی اللہ کی نزدیکی کا ذریعہ ہے، یا وہ نفع وضرر کے مالک ہیں جیسے گائے اور گنگا، اور سانپ اور شیر، اس لئے جلبِ منفعت اور دفعِ مضرت کے لئے ان کی پوجا ضروری ہے ـــــ ان آیات میں پوری قوت کے ساتھ ہر قسم کے شرک کی تردید کی گئی ہے۔ ارشاد ہے: ـــــ اور اللہ کے لئے ہے جو کوئی آسمانوں اور زمین میں ہے ـــــ یعنی آسمانوں کے بندے ہوں یا زمین کے: سب اللہ تعالیٰ کی ملک ہیں۔ سب کے مالک بلاشرکت اللہ تعالیٰ ہیں۔ اور

(۱) اسْتَحْسَرَ: تھکنا اور اکتا جانا۔ (۲) فَتَرَ (ن) فُتُوْرًا: سست پڑ جانا۔ (۳) أَنْشَرَ اللّٰهُ الموتی: اللہ کا مُردوں کو زندہ کرکے اٹھانا۔ (۴) إلا بمعنی غیر ہے۔

مملوک کہیں مالک کے ساجھے دار ہوسکتے ہیں؟ ہرگز نہیں ـــــ اور جو (فرشتے) اس کے پاس ہیں، وہ نہ اس کی عبادت سے عار کرتے ہیں، اور نہ وہ تھکتے ہیں، وہ رات دن پاکی بیان کرتے ہیں، سست نہیں پڑتے ـــــ یہ مشرکین کے آسمانی معبودوں کا حال ہے۔ فرشتے باوجود مقربِ بارگاہ ہونے کے اللہ کی عبادت میں عار محسوس نہیں کرتے، بلکہ اپنے پروردگار کی بندگی کو فخر سمجھتے ہیں۔ وظائفِ عبودیت کے ادا کرنے میں کبھی سستی یا کاہلی کو راہ نہیں دیتے۔ شب وروز اس کی تسبیح اور یاد میں لگے رہتے ہیں نہ تھکتے ہیں نہ اکتاتے ہیں۔ بلکہ تسبیح وذکر ہی ان کی غذا ہے۔ جس طرح ہم ہر وقت سانس لیتے ہیں اور پلکیں جھپکاتے ہیں، اور دوسرے کام بھی کرتے رہتے ہیں، یہی حال فرشتوں کا بھی سمجھو، وہ ہر حال میں تسبیح وذکر میں مشغول رہتے ہیں، خواہ وہ کسی کام پر مامور ہوں، کسی خدمت کو بجالا رہے ہوں، لمحہ کے لئے بھی اللہ کی یاد سے غافل نہیں ہوتے، ایسے بندے بھلا معبود کیسے ہوسکتے ہیں، عابد ومعبود میں منافات ہے، ایک ذات میں دونوں باتیں جمع نہیں ہوسکتیں ـــــ کیا انھوں نے زمین سے معبود بنائے ہیں جو زندہ کرتے ہیں؟! ـــــ یہ مشرکین کے زمینی معبودوں کا ذکر ہے۔ یعنی کیا زمین میں کچھ ایسی ہستیاں ہیں جن کو معبود ٹھہرایا جاسکتا ہے؟ معبود ہونے کے لئے مارنے جلانے پر قدرت ضروری ہے، پس کیا ان میں جلانے کی قدرت ہے؟ جب اللہ تعالیٰ ان کے پجاریوں کو عذاب سے ہلاک کردیں گے: تو کیا وہ ان کو پھر زندہ کرسکتے ہیں؟ ہرگز نہیں! وہ اس کا اختیار نہیں رکھتے۔ اوران کے پجاری بھی ان کے بارے میں یہ عقیدہ نہیں رکھتے، پھر وہ خدائی میں ساجھی کیسے ہوگئے؟ ـــــ اور سنو! جس طرح وہ دوبارہ زندہ کرنے پر قدرت نہیں رکھتے، پہلی مرتبہ پیدا کرنے پر بھی قادر نہیں ہیں۔ کیونکہ ـــــ اگر آسمان وزمین میں اللہ کے سوا معبود ہوتے تو دونوں درہم برہم ہوجاتے ـــــ یعنی دونوں سرے سے موجود ہی نہ ہوتے۔ کیونکہ خدا وہ ہوتا ہے جس میں کسی طرح کی کمی نہ ہو۔ پس جب آسمان وزمین کی تخلیق کی نوبت آئے گی تو ہر خدا کی تاثیر ان پر کامل پڑے گی۔ اور خدا کی تاثیر وجود کا فیضان ہے۔ اور ہر مخلوق اپنی استعداد کے مطابق کامل تاثیر قبول کرے گی۔ پس جو جو وجود آسمان وزمین میں سرایت کریں گے وہ سب کامل ہونگے، ان میں سے کوئی ناقص نہ ہوگا۔ اور ہر مخلوق اپنی استعداد کے موافق پورا پورا اثر قبول کرے گی۔ یعنی گز بھر میں گز بھر، اور بالشت بھر میں بالشت بھر وجود داخل ہوگا۔ اور سب جانتے ہیں کہ ایک سیر کے برتن میں ایک سیر ہی اناج وغیرہ سما سکتا ہے، دو سیر یا کئی سیر ہرگز نہیں سما سکتے۔ اور ایک جوتی میں اس کے بقدر ایک ہی پیر سما سکتا ہے، اور ایک شروانی میں ایک ہی بدن اور ایک نیام میں ایک ہی تلوار داخل ہوسکتی ہے۔ دو یا چند کی گنجائش ہرگز نہیں ہوتی۔ اور اگر زبردستی ان میں دو یا چند کو ٹھونسنے لگیں تو برتن وغیرہ ٹوٹ پھوٹ کر برابر ہوجائیں گے۔ اسی طرح اگر دو یا چند خدا ہوتے تو نہ آسمان وزمین وجود پذیر ہوتے، نہ

دوسری مخلوقات۔ سب پہلے ہی مرحلہ میں درہم برہم ہوجاتے۔ حالانکہ آسمان وزمین اور ساری کائنات جلوہ نما ہے۔ اور سب کی آنکھوں کے سامنے موجود ہے۔ پس معلوم ہوا کہ مشرکین کے خودساختہ زمینی خداؤں کا پہلی بار پیدا کرنے میں بھی کوئی دخل نہیں۔ اور جو نہ پہلی بار پیدا کرنے والا ہو نہ دوسری بار پیدا کرسکے وہ خدا کیسے ہوسکتا ہے؟[1]

——پس پاک ہیں عرش کے پروردگار اللہ تعالیٰ ان باتوں سے جو وہ لوگ بیان کرتے ہیں، ان سے نہیں پوچھا جاتا اُن کاموں کے بارے میں جو وہ کرتے ہیں، اور وہ پوچھے جاتے ہیں! ——عرش مخلوقات میں سب سے اعظم واشرف ہے۔ پس جو اس کا بھی مالک اور پروردگار ہے اس کی عظمت کا کیا ٹھکانا؟ اور رب العرش میں اس طرف بھی اشارہ ہے کہ پوری کائنات کا کنٹرول ان کے ہاتھ میں ہے۔ اس میں کسی کی حصہ داری نہیں۔ تخت کا مالک ہونا کنایہ ہے نظام کے مالک ہونے سے۔

غرض اللہ تعالیٰ مشرکین کے ہر طرح کے شرک سے پاک ہیں۔ اور عرش کا مالک قادر مطلق اور مختار کل بھی ہے۔ اس کی قدرت ومشیت کو روکنا تو کجا، کوئی اس سے پوچھ بھی نہیں سکتا کہ آپ نے فلاں کام کیوں کیا، یا اس طرح کیوں کیا؟ ہاں اس کو پوری طرح حق ہے کہ اپنی ہر مخلوق سے مؤاخذہ کرے اور بازپرس کرے۔ اس سے بھی ثابت ہوا کہ وہ مخلوقات خدا نہیں، ورنہ ان سے بازپرس کیسے ممکن ہوتی؟!

اللہ تعالیٰ ہی خالقِ کون ومکاں ہیں، وہی کائنات کے پروردگار، منتظم اور حاکم ہیں۔ اور وہی عرش (تختِ حکومت) کے مالک ہیں۔ نہ آسمانوں میں ان کی برابر کا کوئی ہے نہ زمین میں!

اَمِ اتَّخَذُوْا مِنْ دُوْنِهٖٓ اٰلِهَةً ؕ قُلْ هَاتُوْا بُرْهَانَكُمْ ۚ هٰذَا ذِكْرُ مَنْ مَّعِیَ وَذِكْرُ مَنْ قَبْلِیْ ؕ بَلْ اَكْثَرُهُمْ لَا یَعْلَمُوْنَ ۙ الْحَقَّ فَهُمْ مُّعْرِضُوْنَ ﴿۲۴﴾ وَمَآ اَرْسَلْنَا مِنْ قَبْلِكَ مِنْ رَّسُوْلٍ اِلَّا نُوْحِیْٓ اِلَیْهِ اَنَّهٗ لَآ اِلٰهَ اِلَّآ اَنَا فَاعْبُدُوْنِ ﴿۲۵﴾ وَقَالُوا اتَّخَذَ الرَّحْمٰنُ وَلَدًا سُبْحٰنَهٗ ؕ بَلْ عِبَادٌ مُّكْرَمُوْنَ ﴿۲۶﴾ لَا یَسْبِقُوْنَهٗ بِالْقَوْلِ وَهُمْ بِاَمْرِهٖ

(۱) آیت کا یہ مطلب حضرت اقدس مولانا محمد قاسم صاحب نانوتوی قدس سرہ نے تقریر دل پذیر (صفحہ ۱۶) میں لکھا ہے۔ اور فیھما اس کا قرینہ ہے کیونکہ فیھما ظرفیت کے لئے تو ہو نہیں سکتا۔ لامحالہ تاثیر کے لئے ماننا ہوگا۔ اور برہانِ تمانع کی صورت میں علیھما یا لھما ہونا چاہئے۔ جو استعلاء اور تملیک پر دلالت کرے۔ برہان تمانع کا ذکر سورۃ بنی اسرائیل (آیت ۴۲) اور سورۃ المؤمنون (آیت ۹۱) میں ہے ۱۲

يَعْمَلُوْنَ ﴿۲۷﴾ يَعْلَمُ مَا بَيْنَ اَيْدِيْهِمْ وَمَا خَلْفَهُمْ وَلَا يَشْفَعُوْنَ اِلَّا لِمَنِ
ارْتَضٰى وَهُمْ مِّنْ خَشْيَتِهٖ مُشْفِقُوْنَ ﴿۲۸﴾ وَمَنْ يَّقُلْ مِنْهُمْ اِنِّيْٓ اِلٰهٌ مِّنْ
دُوْنِهٖ فَذٰلِكَ نَجْزِيْهِ جَهَنَّمَ كَذٰلِكَ نَجْزِي الظّٰلِمِيْنَ ﴿۲۹﴾

ع ۲ / ۱۹

اَمِ	یا	وَمَآ	اورنہیں	عِبَادٌ	بندے ہیں
اتَّخَذُوْا	بنائے انھوں نے	اَرْسَلْنَا	بھیجا ہم نے	مُّكْرَمُوْنَ	معزز
مِنْ دُوْنِهٖٓ	ان سے ورے	مِنْ قَبْلِكَ	آپؐ سے پہلے	لَا يَسْبِقُوْنَهٗ	نہیں آگے بڑھتے وہ
اٰلِهَةً	معبود	مِنْ رَّسُوْلٍ	کوئی رسول		اس سے
قُلْ	کہیں	اِلَّا	مگر	بِالْقَوْلِ	بات میں
هَاتُوْا	لاؤ تم	نُوْحِيْٓ	وحی کرتے ہیں ہم	وَهُمْ	اور وہ
بُرْهَانَكُمْ	اپنی دلیل	اِلَيْهِ	اس کی طرف	بِاَمْرِهٖ	اس کے حکم کے موافق
هٰذَا	یہ	اَنَّهٗ	کہ شان یہ ہے:	يَعْمَلُوْنَ	کام کرتے ہیں
ذِكْرُ	آسمانی کتاب ہے	لَآ	نہیں	يَعْلَمُ	جانتے ہیں وہ
مَنْ	ان کی جو	اِلٰهَ	کوئی معبود	مَا	جو کچھ
مَّعِيَ	میرے ساتھ ہیں	اِلَّآ	مگر	بَيْنَ اَيْدِيْهِمْ	ان کے سامنے ہے
وَذِكْرُ	اور آسمانی کتاب ہے	اَنَا	میں	وَمَا	اور جو کچھ
مَنْ قَبْلِيْ	انکی جو مجھ سے پہلے ہیں	فَاعْبُدُوْنِ	پس میری عبادت کرو	خَلْفَهُمْ	ان کے پیچھے ہے
بَلْ	بلکہ	وَقَالُوا	اور کہا انھوں نے	وَلَا	اور نہیں
اَكْثَرُهُمْ	ان کے بیشتر	اتَّخَذَ	اختیار کی	يَشْفَعُوْنَ	سفارش کرتے وہ
لَا يَعْلَمُوْنَ	نہیں جانتے	الرَّحْمٰنُ	نہایت مہربان نے	اِلَّا	مگر
الْحَقَّ	حق بات کو	وَلَدًا	اولاد	لِمَنِ	اس کے لئے جس سے
فَهُمْ	پس وہ	سُبْحٰنَهٗ	اس کی ذات پاک ہے	ارْتَضٰى	خوش ہوں وہ
مُّعْرِضُوْنَ	منہ موڑنے والے ہیں	بَلْ	بلکہ	وَهُمْ	اور وہ

مِّنْ خَشْيَتِهٖ	ان کے ڈر سے	اِنِّيْٓ	بیشک میں	جَهَنَّمَ	جہنم کی
مُشْفِقُوْنَ	سہمے ہوئے ہیں	اِلٰهٌ	معبود ہوں	كَذٰلِكَ	اسی طرح
وَ مَنْ	اور جو	مِّنْ دُوْنِهٖ	اس سے وَرے	نَجْزِي	سزا دیتے ہیں ہم
يَّقُلْ	کہے	فَذٰلِكَ	پس وہ شخص	الظّٰلِمِيْنَ	ظالموں کو
مِنْهُمْ	ان میں سے	نَجْزِيْهِ	سزا دیں گے ہم اس کو	۞	۞

گذشتہ آیات میں یہ بات واضح کی گئی ہے کہ نہ آسمانوں میں اللہ کی برابر کا کوئی ہے نہ زمین میں۔ اللہ تعالیٰ ہی خالقِ کون ومکان اور مالکِ کل ہیں۔ یہاں اگر مشرکین کہیں کہ ہمارے معبود اللہ کے برابر کے خدا نہیں ہیں، ان سے کم تر ہیں، مگر وہ مقرب بارگاہ ہیں، اس لئے وہ اپنے عابدوں کی سفارش کریں گے۔ اِن آیات میں ان کے اس زعم کا ابطال ہے۔ ارشاد ہے ــــــ یا انہوں نے اللہ سے کم درجے میں معبود بنائے ہیں؟ کہیں: ''اپنی دلیل لاؤ، یہ اُن لوگوں کی آسمانی کتاب ہے جو میرے ساتھ ہیں، اور ان لوگوں کی آسمانی کتابیں ہیں جو مجھ سے پہلے گذرے'' ــــــ یعنی تمہاری یہ بات دلیلِ نقلی کی محتاج ہے۔ عقل کے ڈھکوسلے یہاں کام نہیں دیں گے۔ پس تم جو خدا کے نیچے چھوٹے چھوٹے خدا بطور نائبین اور ماتحت حکام کے ٹھہراتے ہو اس کی سند چاہئے۔ بے سند بات کیسے مانی جاسکتی ہے؟! اگر سند ہو تو پیش کرو۔ یہ اللہ تعالیٰ کی آخری کتاب قرآنِ کریم موجود ہے، اس میں سے کوئی دلیل پیش کرو، اور یہ گذشتہ انبیاء کی کتابیں تورات وانجیل وغیرہ موجود ہیں، ان میں سے کوئی سند لاؤ۔ اُن کتابوں میں اگرچہ بے شمار تحریفات ہوگئی ہیں، مگر توحید کا اعلان اور شرک کا ردصاف موجود ہے ــــــ بلکہ ان میں سے بیشتر حق بات کو نہیں جانتے، اس لئے وہ منہ موڑے ہوئے ہیں ــــــ یعنی یہ جاہل سند کیا پیش کریں گے، ان کا عقیدہ محض بے دلیل ہے۔ دراصل بات یہ ہے کہ یہ حق بات کو جانتے ہی نہیں، بس اپنی عقلِ نارسا کے پیچھے اندھے بنے ہوئے ہیں۔ اس لئے قرآن کریم اور کتبِ سماویہ کی دعوت سے منہ موڑے ہوئے ہیں۔

خیر! تمہارے پاس تو کوئی دلیلِ نقلی نہیں۔ اب اللہ پاک کی دلیلِ نقلی سنو ــــــ اور ہم نے آپؐ سے پہلے جو بھی رسول بھیجا ہے، اس کی طرف ہم نے یہ وحی کی ہے کہ میرے سوا کوئی معبود نہیں، پس میری عبادت کرو ــــــ اور اس میں کسی کو شریک نہ کرو۔ یہی تمام انبیاء ورسل کا اجماعی عقیدہ ہے۔ سب کی طرف اللہ تعالیٰ نے یہی وحی بھیجی ہے۔ کسی پیغمبر نے کبھی ایک حرف اس کے خلاف نہیں کہا۔ سب ہمیشہ یہی تلقین کرتے آئے ہیں کہ معبود صرف اللہ تعالیٰ ہیں، ان کے سوا کسی کی بندگی نہیں!

رہی مشرکین کی یہ بات کہ ہمارے معبود (فرشتے) اللہ کی اولاد ہیں، اس لئے مقرب بارگاہ ہیں، اور ہماری سفارش کریں گے، تو ان کی یہ بات بھی سراسر خلافِ واقعہ ہے۔ ارشاد ہے ـــــ اور انہوں نے کہا کہ نہایت مہربان اللہ نے اولاد اختیار کی ہے ـــــ یعنی فرشتوں کو اللہ تعالیٰ نے اپنی مہربانی سے اولاد بنایا ہے، اور اختیارات سونپے ہیں ـــــ اس کی ذات (اولاد وغیرہ عیوب سے) پاک ہے! بلکہ وہ معزز بندے ہیں۔ بات میں وہ اس سے پیش قدمی نہیں کرتے، اور وہ اس کے حکم کے موافق عمل کرتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ جانتے ہیں جو کچھ ان کے سامنے ہے، اور جو کچھ ان کے پیچھے ہے، اور وہ سفارش نہیں کرتے مگر اس کے لئے جس کے لئے اللہ تعالیٰ کی مرضی ہو، اور وہ اللہ کے ڈر سے سہمے رہتے ہیں ـــــ یعنی توبہ توبہ! خدائے برتر وقدوس کو اولاد سے کیا واسطہ! جن ہستیوں کو تم اس کی اولاد قرار دے رہے ہو، وہ سب اس کے بندے ہیں، البتہ معزز اور ذی رتبہ ہیں۔ اور باوجود انتہائی معزز ومقرب ہونے کے ان کے ادب وطاعت کا یہ حال ہے کہ جب تک اللہ کی مرضی اور اجازت نہ پائیں، ان کے سامنے لب کشائی نہیں کرتے۔ اور جو کام ان کے سپرد کیا جاتا ہے چوں وچرا کئے بغیر اس کی تعمیل کرتے ہیں۔ حق تعالیٰ کو ان کے تمام ظاہری اور باطنی احوال کا علم ہے۔ ان کی کوئی حرکت اور ان کا کوئی قول وفعل اس سے پوشیدہ نہیں۔ اور اس کی مرضی جانے بغیر کسی کے لئے سفارش بھی نہیں کرسکتے۔ وہ ہر وقت اللہ کے ڈر سے سہمے رہتے ہیں۔ پھر ان کو خدا کیسے کہا جاسکتا ہے؟ اور ان کی عبادت سے کیا فائدہ؟! ـــــ اور جو ان میں سے کہے: ”بیشک میں اللہ سے کم درجہ کا معبود ہوں!“ تو ہم اس کو جہنم کی سزا دیں گے، ہم اسی طرح ظالموں کو سزا دیتے ہیں! ـــــ یعنی ملائکہ سے معصیت کا صدور ناممکن ہے، مگر بفرضِ محال اگر ان میں سے کوئی اپنی نسبت ایسی بیہودہ بات کہہ گذرے تو وہ دوزخ کی سزا پائے گا۔ حد سے گذرنے والے ظالموں کی یہی سزا ہے۔ غرض فرشتے بھی باوجود اپنے قُربِ خاص کے اللہ تعالیٰ کی پکڑ سے باہر نہیں ہیں۔ ایسے عاجز بندے خدا کیسے ہوسکتے ہیں؟ اور وہ خدا کی مرضی کے بغیر کسی کے لئے سفارش کیسے کرسکتے ہیں؟!

لوگوں میں دیوتا پرستی کے نام سے جو شرک چلا ہوا ہے، وہ حقیقت میں ملائکہ پرستی ہے!

أَوَلَمْ يَرَ الَّذِينَ كَفَرُوا أَنَّ السَّمَاوَاتِ وَالْأَرْضَ كَانَتَا رَتْقًا فَفَتَقْنَاهُمَا ۖ وَجَعَلْنَا مِنَ الْمَاءِ كُلَّ شَيْءٍ حَيٍّ ۖ أَفَلَا يُؤْمِنُونَ ﴿٣٠﴾ وَجَعَلْنَا فِي الْأَرْضِ رَوَاسِيَ أَن تَمِيدَ بِهِمْ وَجَعَلْنَا فِيهَا فِجَاجًا سُبُلًا لَّعَلَّهُمْ يَهْتَدُونَ ﴿٣١﴾ وَجَعَلْنَا

السَّمَآءَ سَقْفًا مَّحْفُوْظًا ۚ وَّهُمْ عَنْ اٰيٰتِهَا مُعْرِضُوْنَ ﴿۳۲﴾ وَهُوَ الَّذِيْ خَلَقَ الَّيْلَ وَالنَّهَارَ وَالشَّمْسَ وَالْقَمَرَ ؕ كُلٌّ فِيْ فَلَكٍ يَّسْبَحُوْنَ ﴿۳۳﴾

اَوَلَمْ يَرَ	اور کیا نہیں دیکھا	يُؤْمِنُوْنَ	ایمان لاتے وہ	سَقْفًا	چھت
الَّذِيْنَ	جنھوں نے	وَجَعَلْنَا	اور بنائے ہم نے	مَّحْفُوْظًا	محفوظ
كَفَرُوْٓا	انکار کیا	فِي الْاَرْضِ	زمین میں	وَّهُمْ	اور وہ
اَنَّ	کہ	رَوَاسِيَ (۳)	بھاری بوجھ	عَنْ اٰيٰتِهَا (۷)	اس کی نشانیوں سے
السَّمٰوٰتِ	آسمان	اَنْ (۴)	کہیں ایسا نہ ہو کہ	مُعْرِضُوْنَ	منہ موڑنے والے ہیں
وَالْاَرْضَ	اور زمین	تَمِيْدَ (۵)	جھک جائے وہ	وَهُوَ	اور وہ
كَانَتَا	تھے دونوں	بِهِمْ	ان کے ساتھ	الَّذِيْ	جس نے
رَتْقًا (۱)	منہ بند	وَجَعَلْنَا	اور بنائے ہم نے	خَلَقَ	پیدا کیا
فَفَتَقْنٰهُمَا (۲)	پس کھول دیا ہم نے	فِيْهَا	اس میں	الَّيْلَ	رات
	دونوں کو	فِجَاجًا (۶)	کشادہ	وَالنَّهَارَ	اور دن
وَجَعَلْنَا	اور بنائی ہم نے	سُبُلًا	راستے	وَالشَّمْسَ	اور سورج
مِنَ الْمَآءِ	پانی سے	لَعَلَّهُمْ	تا کہ وہ	وَالْقَمَرَ	اور چاند کو
كُلَّ شَيْءٍ	ہر چیز	يَهْتَدُوْنَ	راہ پائیں	كُلٌّ	سب
حَيٍّ	جاندار	وَجَعَلْنَا	اور بنایا ہم نے	فِيْ فَلَكٍ (۸)	ایک دائرے میں
اَفَلَا	کیا پس نہیں	السَّمَآءَ	آسمان کو	يَّسْبَحُوْنَ	تیر رہے ہیں

گذشتہ آیات میں آپ نے ہر طرح کے شرک کا ابطال پڑھ لیا۔ اب اس کے مقابل توحید اور قدرت کی نشانیوں

---

(۱) رَتْقًا: مصدر بابِ نصر، مبالغۃً حمل کیا گیا ہے اس لئے تثنیہ نہیں لایا گیا۔ (۲) فَتَقَ (ن) الشیئَ فَتْقًا: پھاڑنا۔ (۳) رَوَاسِي: رَاسِيَةٌ کی جمع: بھاری بوجھ یعنی پہاڑ اور ٹیلے۔ (۴) أَنْ: أی کراهة أن تتحرك وتضطرب بهم (روح) (۵) مَادَ (ض) مَيْدًا: کسی بڑی چیز کا ہلنا، حرکت کرنا، جھکنا۔ (۶) اَلْفِجَاج: الفَجُّ کی جمع: طویل کشادہ راستہ۔ (۷) ضمیر ها: السماء کی طرف راجع ہے۔ کیونکہ وہ بمعنی السماوات ہے۔ (۸) الفلك: اجرام سماوی کے گھومنے کی مدار، دائرہ۔

کا تذکرہ پڑھیں، اور دیکھیں کتابِ کائنات میں کتنی عظیم الشان نشانیاں موجود ہیں جو خدا کے وجود اور اس کے وحدہ لاشریک لہ ہونے پر دلالت کرتی ہیں۔ ارشاد ہے: ـــــ اور کیا ان لوگوں نے جنھوں نے انکار کیا نہیں دیکھا کہ زمین و آسمان دونوں منہ بند تھے، پھر ہم نے دونوں کو کھول دیا؟ ـــــ آسمان و زمین پہلے باہم جڑے ہوئے تھے۔ دونوں کا مادّہ باہم پیوستہ تھا۔ اللہ تعالیٰ نے جب دونوں کو جدا کیا: اس وقت دونوں کا منہ بند تھا، آسمان پانی نہیں برساتا تھا اور زمین سے گھاس نہیں اگتی تھی۔ اللہ تعالیٰ نے اپنی قدرت سے دونوں کے منہ کھول دیئے۔ چنانچہ آسمان سے پانی برسنے لگا، اور زمین سے روئیدگی شروع ہوئی۔ اگر آسمان و زمین پہلی ہی حالت پر ہوتے تو اس اجڑی زمین پر کون بستا؟ اللہ تعالیٰ نے کرم فرمایا اور اپنی قدرتِ کاملہ سے دونوں میں قابلیت پیدا کی، آسمان ہُون برسانے لگا، زمین سبزہ اگانے لگی، اس طرح زمین قابل رہائش بن گئی ـــــ اور ہم نے پانی سے ہر جاندار مخلوق بنائی ـــــ جان: صرف جانوروں ہی میں نہیں ہوتی، پودے بھی کسی درجہ میں جاندار ہیں۔ جونہی آسمان سے پانی برسنے لگا زمین میں جان پڑگئی۔ نباتات کی روئیدگی شروع ہوگئی، اور حیوانات پانی سے پیدا ہونے لگے۔ ہر جاندار کی تخلیق بلاواسطہ یا بالواسطہ پانی سے ہوئی ہے۔ سب کو اللہ تعالیٰ نے عناصر اربعہ سے پیدا کیا ہے، جن میں پانی کا عنصر شامل ہے۔ اسی کی برکت سے یہ جہانِ رنگ و بو آباد ہوا، اور ہر طرف زندگی کی چہل پہل نظر آنے لگی! خدا کی صناعی اور رزّاقی نے اسی کے ذریعہ ہر جاندار کی ضرورت پوری کی ـــــ پس کیا وہ ایمان نہیں لائیں گے؟ ـــــ کیا منکرینِ حق کو قدرت کی یہ نشانیاں نظر نہیں آتیں؟ ایسے کھلے نشانات اور محکم انتظامات کو دیکھ کر انہیں ایمان لے آنا چاہئے۔ کیا خدا کے وجود اور اس کی وحدانیت پر اس سے بھی واضح کوئی دلیل ہوسکتی ہے؟ اگر اب بھی ان کی آنکھ نہ کھلے اور ہوش نہ آئے تو آخر کب آئے گا؟! ـــــ اور ہم نے زمین میں (پہاڑوں کے) بھاری بوجھ رکھ دیئے، کہیں ایسا نہ ہو کہ وہ ان کو لے کر ایک طرف کو جھکنے لگے! ـــــ یعنی یہ اونچے فلک بوس پہاڑ اور مٹی کے تودے زمین کا توازن برقرار رکھنے کے لئے پیدا کئے گئے ہیں۔ ایک طرف دریاؤں کی گہرائیاں ہیں، دوسری طرف اگر یہ پہاڑ نہ ہوتے تو زمین ڈانواڈول رہتی۔ ہمیشہ جھکولے کھاتی اور زلزلوں سے دوچار رہتی، پھر اس پر زندگی کیسے ممکن ہوتی۔ آج بھی کبھی زلزلے کا ادنی سا جھٹکا آجاتا ہے تو کلیجہ منہ کو آتا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے کرم فرمایا، زمین کے سکون کا سامان فرمایا اور لوگوں کو زندگی کا چین نصیب ہوا ـــــ اور ہم نے اس میں کشادہ راستے بنائے تاکہ لوگ راہ پائیں ـــــ عرب کی ساری زمین پہاڑوں سے اٹی پٹی ہے۔ ہر طرف دیو پیکر پہاڑ کھڑے ہیں۔ اگر ان کے درمیان اللہ تعالیٰ کشادہ راستے نہ بناتے تو انسان منزلِ مقصود تک کیسے پہنچتا؟ پہاڑوں پر چڑھنا اور دوسری طرف اترنا، ان کے پیروں کی جان نکال دیتا۔ اللہ تعالیٰ کا یہ بہت

بڑا احسان ہے کہ انھوں نے پہاڑوں کے درمیان نہایت کشادہ سڑکیں بنادیں، تاکہ انسان سہولت کے ساتھ منزلیں طے کرتا ہوا منزلِ مقصود تک پہنچے ــــــ اور ہم نے آسمان کو محفوظ چھت بنایا ــــــ جو نہ گرتی ہے نہ ٹوٹتی پھوٹتی ہے، نہ اس کا پلاستر جھڑتا ہے۔ ہر طرح کی شکست و ریخت اور نقصان سے محفوظ ہے ــــــ آسمان کی عدیم المثال بلندی دیکھو اور اس کے محیر العقول احاطے پر نظر ڈالو، اِن دونوں باتوں کے لحاظ سے جو اس کو بہترین صفاتی نام دیا جاسکتا ہے وہ ''چھت'' ہی کا ہوسکتا ہے ــــــ آسمان کی ماہیت وحقیقت جو کچھ بھی ہو، بہر حال وہ اللہ کی حُسنِ صنعت کا بہترین نمونہ ہے۔ ہر عیب اور ہر نقص سے پاک ہے، کیا ایسی عظیم مخلوق کے خالق پر ایمان لانے میں دیر کرنے کی گنجائش ہے؟! ــــــ اور وہ اس (آسمان) کی نشانیوں سے منہ موڑنے والے ہیں ــــــ یعنی ناہنجار کفار وفجار اتنی کھلی ہوئی عظمتِ خداوندی کی نشانی سے بھی اعراض کئے ہوئے ہیں۔ اس کی بڑائی اور یکتائی کے قائل نہیں ــــــ اور وہی ہیں جنھوں نے شب و روز اور شمس وقمر بنائے، سب اپنے اپنے دائرے میں پیر رہے ہیں ــــــ یہ آسمانی نشانیوں کی کچھ تفصیل ہے۔ اللہ تعالیٰ نے یہ بلند آسمان بنا کر اس میں چاند سورج اور دوسرے بے شمار ستارے اور سیارے پیدا کئے ہیں۔ اور ان کی گردش کے لئے ایک قانون مقرر کیا ہے۔ سب اس کی سختی سے پیروی کئے ہوئے ہیں۔ اور اپنی اپنی مداروں میں پیر رہے ہیں۔ نہ کوئی راہ سے بے راہ ہوتا ہے، نہ تھکتا اور تھمتا ہے۔ سب ایک اشارے پر ناچ رہے ہیں ــــــ اور اسی شمس وقمر کی گردش کے نتیجہ میں ماہ وسال اور دنوں کا نظام وجود میں آیا ہے۔ جس کے سہارے انسان زندگی کے سانس لے رہا ہے۔ غور کرو! اگر رات ہی رات ہوتی تو کائنات ٹھٹر کر رہ جاتی۔ اور دن کی تمازت ہی ہمہ وقت رہتی تو کائنات جھلس کر رہ جاتی۔ اللہ تعالیٰ نے اپنی قدرت وحکمت سے شب و روز بنائے۔ جب رات ہر چیز کو ٹھنڈا کر دیتی ہے تو دن کی گرمی اس کو گرما دیتی ہے ــــــ یہ سارا کارخانہ ایک ہستی کا پیدا کیا ہوا ہے۔ کوئی دوسرا اس میں ساجھے دار نہیں۔ اور مشرکین کو بھی یہ بات تسلیم ہے کہ اجرام سماوی اور علویات میں ان کے خداؤں کی حصہ داری نہیں۔ پھر عبادت وبندگی میں حصہ داری کہاں سے نکل آئی؟ کس قدر غلط راہ ہے جس پر وہ چل پڑے ہیں؟!

کائنات میں ہر سو خدا کی یکتائی کی نشانیاں پھیلی ہوئی ہیں، ان کو دیکھو جو نگاہِ حقیقت بیں ہو!

وَمَا جَعَلْنَا لِبَشَرٍ مِّنْ قَبْلِكَ الْخُلْدَ ۭ اَفَا۟ىِٕنْ مِّتَّ فَهُمُ الْخٰلِدُوْنَ ﴿۳۴﴾ كُلُّ نَفْسٍ ذَاۗىِٕقَةُ الْمَوْتِ ۭ وَنَبْلُوْكُمْ بِالشَّرِّ وَالْخَيْرِ فِتْنَةً ۭ وَاِلَيْنَا تُرْجَعُوْنَ ﴿۳۵﴾ وَاِذَا رَاٰكَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْٓا اِنْ يَّتَّخِذُوْنَكَ اِلَّا هُزُوًا ۭ اَهٰذَا الَّذِيْ يَذْكُرُ

اٰلِهَتَكُمْ ۚ وَهُمْ بِذِكْرِ الرَّحْمٰنِ هُمْ كٰفِرُوْنَ ﴿۳۶﴾

وَمَا	اور نہیں	الْمَوْتِ	موت کو	يَتَّخِذُوْنَكَ	بناتے وہ آپ کو
جَعَلْنَا	بنایا ہم نے	وَنَبْلُوْكُمْ	اور آزماتے ہیں ہم تم کو	اِلَّا	مگر
لِبَشَرٍ	کسی انسان کے لئے	بِالشَّرِّ	برائی	هُزُوًا	ہنسی
مِّنْ قَبْلِكَ	آپؐ سے پہلے	وَالْخَيْرِ	اور بھلائی سے	اَهٰذَا	کیا یہ (ہے)
الْخُلْدَ	ہمیشہ رہنا	فِتْنَةً (۱)	خوب آزمانا	الَّذِيْ	جو
اَفَا۟ئِنْ	کیا پس اگر	وَاِلَيْنَا	اور ہماری طرف	يَذْكُرُ	ذکر کرتا ہے
مِّتَّ	مرجائیں آپؐ	تُرْجَعُوْنَ	لوٹو گے تم	اٰلِهَتَكُمْ	تمہارے معبودوں کا؟
فَهُمُ	تو وہ	وَاِذَا	اور جب	وَهُمْ	اور وہ
الْخٰلِدُوْنَ	ہمیشہ رہنے والے ہیں؟	رَاٰكَ	دیکھتے ہیں آپؐ کو	بِذِكْرِ	ذکر کا
كُلُّ	ہر	الَّذِيْنَ	وہ جنھوں نے	الرَّحْمٰنِ	رحمان کے
نَفْسٍ	جاندار	كَفَرُوْٓا	انکار کیا	هُمْ	وہ
ذَآئِقَةُ	چکھنے والا ہے	اِنْ (۲)	نہیں	كٰفِرُوْنَ	انکار کرنے والے

توحید اور دلائلِ قدرت بیان کرنے کے بعد اب روئے سخن رسالتِ محمدی کی طرف ہے۔ اور اِن آیات میں شماتتِ اعداء یعنی دشمنانِ رسول کے خوشیاں منانے کا جواب ہے۔ کفارِ مکہ حضور ﷺ کی باتیں سن کر کہتے تھے کہ یہ شور ہنگامہ صرف چند روز ہے۔ اور اِس شخص کے دَم سے قائم ہے۔ جب یہ مر کر ٹھنڈا ہو جائے گا تو سب کو چین آ جائے گا۔ اللہ پاک اس کا جواب ارشاد فرماتے ہیں: ـــــ اور ہم نے آپؐ سے پہلے کسی انسان کے لئے ''ہمیشہ رہنا'' نہیں گردانا، کیا پس اگر آپ مر جائیں گے تو وہ ہمیشہ رہنے والے ہیں؟ ـــــ یعنی اگر مشرکین کی غرض یہ ہے کہ موت آنا نبوت کے منافی ہے تو اس کا جواب یہ ہے کہ گذشتہ انبیاء و مرسلین میں سے کون ایسا ہے جس پر موت طاری نہیں ہوئی۔ پھر اگر اس پیغمبر کو بھی موت آ جائے تو اس میں تعجب کی کیا بات ہے۔ آپ ﷺ کچھ غیر فانی بنا کر نہیں

(۱) فتنةً: نبلو کم کا مفعولِ مطلق (من غیر لفظہ) برائے تاکید ہے۔ (۲) إِنْ: نافیہ ہے، اور جملہ جواب شرط ہے، اور إذا کی شرط کے جواب میں ف آنی ضروری نہیں (روح)

بھیجے گئے۔کوئی انسان خواہ مدارجِ قرب میں کتنی بھی ترقی کرلے: وہ غیر فانی نہیں ہوسکتا۔مشرکین کا یہ خیال کہ فلاں فلاں بندے ترقی کرکے دیوتا بن گئے: محض غلط خیال ہے ـــــ اور اگر اُس بات کا مقصد صرف اپنا دل ٹھنڈا کرنا ہے تو یہ خوشی کا کیا موقع ہے،اگر آپ ﷺ کو موت آگئی تو کیا تم نہیں مروگے؟

اگر بُمرد عدو جائے شادمانی نیست ❁ کہ زندگانئ ما نیز جاودانی نیست

(اگر دشمن مرگیا تو خوشی کا کوئی موقع نہیں ❁ کیونکہ ہماری زندگی بھی ہمیشہ رہنے والی نہیں)

جب آگے پیچھے سب کو مرنا ہے تو پیغمبر کی وفات پر بغلیں کیوں بجا رہے ہو ـــــ ہر جاندار کو موت کا مزہ چکھنا ہے! ـــــ یعنی کون ہے جس کو موت کا مزہ نہیں چکھنا۔سب کو اس راستہ سے گذرنا ہے۔پھر یہ کافر آپ ﷺ کی وفات کا خیال کرکے خوش کیوں ہورہے ہیں ـــــ اور ہم تمہیں بھلے برے حالات سے خوب آزماتے ہیں ـــــ یعنی یہ دنیا کی زندگی عارضی اور امتحان کے لئے ہے۔انسان جب تک زندہ ہے برابر اس کا امتحان ہورہا ہے۔یہ دیکھا جاتا ہے کہ اِس زندگی میں کون ایمان وطاعت کی طرف مائل رہتا ہے۔اور کون کفر ومعصیت کی طرف جھک پڑتا ہے۔اور شر سے مراد: انسان کے مخالفِ طبع حالات ہیں، جیسے غریبی وغیرہ۔اور خیر سے مراد: انسان کے موافق طبع حالات ہیں، جیسے تندرستی اور خوشحالی وغیرہ۔بہرحال یہاں امتحان ہی امتحان ہے ـــــ اور تم ہماری طرف پھر کر آجاؤگے ـــــ یعنی ہر انسان کو اللہ کے حضور میں پہنچ کر اپنے اعمال کی جواب دہی کرنی ہے۔کسی کے لئے مَفَر (بھاگنے کی جگہ) نہیں۔اور وہاں ہر ایک کو اس کے اعمال کا بدلہ دیا جائے گا ـــــ مگر انجام سے بالکل بے فکر ہوکر کفار پیغمبر ﷺ کی ہنسی اڑاتے ہیں اور آپؐ کے ساتھ تمسخر کرتے ہیں۔ارشاد ہے: ـــــ اور جب وہ لوگ جنھوں نے (حق کا) انکار کیا آپ کو دیکھتے ہیں تو آپ کا ٹھٹھا کرتے ہیں۔(کہتے ہیں کہ) کیا یہ ہے جو تمہارے معبودوں کا تذکرہ کرتا ہے؟! ـــــ یعنی کیا یہی شخص تمہارے معبودوں کی برائی کرتا ہے،ان کی پھبتی اڑاتا ہے،اور ان کی بے وقعتی ظاہر کرتا ہے۔کہاں یہ جوتیاں چٹخانے والا انسان اور کہاں ہمارے دیوتا! ـــــ اللہ پاک جواب ارشاد فرماتے ہیں: ـــــ اور وہ مہربان اللہ کے تذکرے کا انکار کرتے ہیں ـــــ یعنی استہزاء کے مستحق اگر ہیں تو وہ لوگ ہیں جو نہایت مہربان اللہ کے تذکرے کا انکار کرتے ہیں۔اس کے نام سے چڑتے ہیں۔ہمارا پیغمبر اگر ان کے معبودوں کا پول کھولتا ہے تو وہ ایک بے حقیقت چیز کی حقیقت کھولتا ہے۔اور وہ ایک ایسی ہستی کا انکار کرتے ہیں جس سے بڑی کوئی حقیقت نہیں۔یہ تو اللہ تعالیٰ نہایت مہربان ہیں جو وہ گرفت سے بچے ہوئے ہیں، ورنہ وہ اس لائق ہیں کہ فوراً ان کی گردن ناپ دی جائے۔

فائدہ: اور یہ جو فرمایا کہ ہر نفس موت کا مزہ چکھنے والا ہے: اس میں اشارہ ہے کہ موت کی تکلیف ہر شخص کو محسوس ہوتی ہے۔ مزہ چکھنے کا محاورہ ایسی ہی جگہ میں استعمال ہوتا ہے۔ روح کا جیسا اتصال بدن کے ساتھ ہے اس کا تقاضا ہے کہ روح نکلتے وقت تکلیف کا احساس ضرور ہو۔ یہ ایک طبعی امر ہے۔ نبی ﷺ کو بھی بوقت وفات شدید تکلیف کا ہونا روایات میں مصرح ہے۔ پس یہ حالت ایمان کے منافی نہیں۔ بلکہ علامتِ ایمان ہے۔ حدیث میں ہے کہ مؤمن پیشانی کے پسینے سے مرتا ہے، اس کا مطلب یہ بھی بیان کیا گیا ہے کہ مؤمن کو بوقت موت شدید تکلیف ہوتی ہے۔ پس یہ گھبرانے کی بات نہیں۔

آج بھی کتنے ہی بدنصیب کافر ایسے ہیں جو شریعتِ اسلامی کے احکام و مسائل کو سنجیدگی سے نہیں سنتے، بلکہ تمسخر کرتے ہیں۔ وہ ذرا اپنے گھر کا جائزہ لیں، ان کے پاس دھرا کیا ہے؟!

خُلِقَ الْاِنْسَانُ مِنْ عَجَلٍ ؕ سَاُورِيْكُمْ اٰيٰتِيْ فَلَا تَسْتَعْجِلُوْنِ ﴿۳۷﴾ وَيَقُوْلُوْنَ مَتٰى هٰذَا الْوَعْدُ اِنْ كُنْتُمْ صٰدِقِيْنَ ﴿۳۸﴾ لَوْ يَعْلَمُ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا حِيْنَ لَا يَكُفُّوْنَ عَنْ وُّجُوْهِهِمُ النَّارَ وَلَا عَنْ ظُهُوْرِهِمْ وَلَا هُمْ يُنْصَرُوْنَ ﴿۳۹﴾ بَلْ تَاْتِيْهِمْ بَغْتَةً فَتَبْهَتُهُمْ فَلَا يَسْتَطِيْعُوْنَ رَدَّهَا وَلَا هُمْ يُنْظَرُوْنَ ﴿۴۰﴾ وَلَقَدِ اسْتُهْزِئَ بِرُسُلٍ مِّنْ قَبْلِكَ فَحَاقَ بِالَّذِيْنَ سَخِرُوْا مِنْهُمْ مَّا كَانُوْا بِهٖ يَسْتَهْزِءُوْنَ ﴿۴۱﴾ ع

خُلِقَ	پیدا کیا گیا	تَسْتَعْجِلُوْنِ	جلدی مچاؤ تم میرے	اِنْ كُنْتُمْ	اگر ہو تم
الْاِنْسَانُ	انسان		سامنے	صٰدِقِيْنَ	سچے؟
مِنْ عَجَلٍ (۱)	جلدبازی سے	وَيَقُوْلُوْنَ	اور کہتے ہیں وہ	لَوْ يَعْلَمُ (۲)	کاش جان لیتے
سَاُورِيْكُمْ	اب دکھاؤں گا میں تم کو	مَتٰى	کب (آئے گا)	الَّذِيْنَ	وہ جنھوں نے
اٰيٰتِيْ	اپنی نشانیاں	هٰذَا	یہ	كَفَرُوْا	انکار کیا
فَلَا	پس نہ	الْوَعْدُ	وعدہ	حِيْنَ (۳)	اس وقت کو جب

(۱) عَجَل: باب سمع کا مصدر ہے، جلد بازی، شتابی کرنا، وقت سے پہلے کسی چیز کا قصد کرنا۔ (۲) لو تمنّی کے لئے ہے اور جواب محذوف ہے یعنی تو شتابی نہ کرتے۔ (۳) حین: یعلم کا مفعول فیہ ہے۔

لَا يَكُفُّوْنَ	نہ روک سکیں گے وہ	بَغْتَةً	یکا یک	بِرُسُلٍ	رسولوں کے ساتھ
عَنْ وُّجُوْهِهِمُ	اپنے چہروں سے	فَتَبْهَتُهُمْ (۱)	پس حیرت میں ڈال	مِّنْ قَبْلِكَ	آپ سے پہلے
النَّارَ	آگ کو		دے گی ان کو	فَحَاقَ (۲)	پس گھیر لیا
وَلَا	اور نہ	فَلَا	پس نہیں	بِالَّذِيْنَ	ان کو جنھوں نے
عَنْ ظُهُوْرِهِمْ	اپنی پیٹھوں سے	يَسْتَطِيْعُوْنَ	طاقت رکھیں گے وہ	سَخِرُوْا	تمسخر کیا
وَلَا	اور نہ	رَدَّهَا	اس کو پھیرنے کی	مِنْهُمْ	ان میں سے
هُمْ	وہ	وَلَا هُمْ	اور نہ وہ	مَّا (۳)	اس عذاب نے جس کا
يُنْصَرُوْنَ	مدد کئے جائیں گے	يُنْظَرُوْنَ	مہلت دیئے جائیں گے	كَانُوْا	تھے وہ
بَلْ	بلکہ	وَلَقَدِ	اور البتہ تحقیق	بِهٖ	اس کا
تَأْتِيْهِمْ	پہنچے گی آگ ان کو	اسْتُهْزِئَ	تمسخر کیا گیا	يَسْتَهْزِءُوْنَ	ٹھٹھا کرتے

ابھی گذشتہ سلسلۂ بیان جاری ہے۔ رسالت پر منکرین کے اعتراضات کے جوابات دیئے جا رہے ہیں۔ منکرینِ رسالت کا حال یہ تھا کہ جب وہ رسول اللہ ﷺ کی زبانِ مبارک سے قرآن کریم میں کفر کی دنیوی اور اخروی سزا کا بیان سنتے تو اس کا مذاق اڑاتے، اور کہتے: ''اے اللہ! اگر یہ قرآن آپ کی طرف سے ہے تو آپ ہم پر آسمان سے پتھر برسائیے، یا ہم پر کوئی اور دردناک عذاب ڈال دیجئے!'' (انفال آیت ۳۲) وہ یہ بھی مطالبہ کرتے تھے کہ ہماری سزا کے آنے میں دیر کیوں ہو رہی ہے؟ اللہ تعالیٰ ہم ظالموں کی گرفت فی الفور کیوں نہیں کرتے؟ دراصل بات یہ ہے کہ ان کو رسول کی خبروں کا یقین ہی نہیں، اس لئے وہ تخول کرتے ہیں۔ اللہ پاک جواب ارشاد فرماتے ہیں: —— انسان جلد بازی سے پیدا کیا گیا ہے —— یعنی جلد بازی اس کے خمیر میں داخل ہے۔ عجلت پسندی اس کے اجزائے عنصری میں شامل ہے —— عجلت کرنے کے معنی ہیں: کسی چیز کو اس کے وقت سے پہلے طلب کرنا۔ اور یہ بات شریعت کی نظر میں مذموم ہے۔ قرآن کریم میں دوسری جگہ بھی اس کو انسانی کمزوری کے طور پر ذکر کیا گیا ہے۔ ارشاد ہے: ﴿وَكَانَ الْإِنْسَانُ عَجُوْلًا﴾ یعنی انسان بڑا جلد باز واقع ہوا ہے (بنی اسرائیل آیت ۱۱) اور ابھی سورہ طٰہ میں یہ بات گذر چکی ہے کہ جب موسیٰ علیہ السلام کوہِ طور پر اپنی قوم سے آگے بڑھ کر حق تعالیٰ کی بارگاہ میں حاضر ہوئے تھے تو

(۱) بَهَتَه (ف) بَهْتًا: حیرت میں ڈالنا، چونکا دینا، بدحواس کرنا (۲) حَاق به الشیئُ (ض) گھیرنا، احاطہ کرنا۔ (۳) ما کانوا: حاق کا فاعل ہے۔

عجلت کرنے پر عتاب نازل ہوا تھا ـــــ البتہ مُسارعت فی الخیر مطلوب ہے۔ وہ جلد بازی کے مفہوم میں داخل نہیں۔ کیونکہ وہ وقت سے پہلے کسی چیز کی طلب نہیں۔ بلکہ بروقت تکثیر خیرات وحسنات کی کوشش ہے ـــــ بہر حال انسان کی طبیعت میں جس طرح کچھ دوسری کمزوریاں رکھ دی گئی ہیں: یہ ایک کمزوری عجلت پسندی بھی رکھی گئی ہے۔ اور جو چیز طبیعت وجبلّت میں داخل ہوتی ہے اس کو عرب اسی عنوان سے ذکر کرتے ہیں۔ اردو میں بھی غُصیل کو''غصہ کا پتلا'' کہتے ہیں۔ اور حدیث شریف میں ہے کہ''عورتوں سے حسن سلوک کرنے کی میں آپ لوگوں کو وصیت کرتا ہوں، پس میری اس وصیت پر عمل کرو، کیونکہ عورتیں پسلی سے پیدا کی گئی ہیں!'' یعنی جس طرح پسلی کی ساخت میں کچھ کجی ہے جو کسی طرح بھی دور نہیں ہوسکتی، نسوانی فطرت میں بھی کچھ کجی ہے۔ پس ان کی خُردہ گیری نہ کرو، معمولی باتوں پر گرفت نہ کرو، بلکہ ان کی بے عنوانیاں نظر انداز کرو ـــــ غرض کفار اپنی جلد بازی کی فطرت سے مجبور ہوکر دنیوی عذاب کا مطالبہ کرتے تھے۔ پس وہ سن لیں ـــــ ابھی میں تمھیں اپنی نشانیاں دکھلاؤنگا، پس میرے سامنے جلدی مت مچاؤ ـــــ یعنی تھوڑا صبر کرو، عنقریب میں اپنے قہر وانتقام کی نشانیاں تم کو دکھلاؤنگا ـــــ چنانچہ ہجرت کے فوراً بعد غزوۂ بدر میں اللہ تعالیٰ نے کفار کو آنکھوں سے دکھادیا کہ باطل کس طرح سرنگوں ہوا۔ ان کے سورما کس طرح کام آئے۔ اور اسلام کی حقانیت کس طرح برملا ظاہر ہوئی۔

اخروی عذاب کا مطالبہ اور اس کا جواب: ـــــ اور وہ کہتے ہیں:''یہ وعدہ کب پورا ہوگا، اگر تم سچے ہو؟'' ـــــ مشرکین کا یہ سوال بھی تمسخر کے طور پر تھا۔ یعنی تم کہتے رہتے ہو کہ قیامت آئے گی، اور سب کافر دوزخ میں جلیں گے۔ یہ وعدہ آخر کب پورا ہوگا۔ اگر تم سچے ہو تو قیامت اور جہنم کو لے کیوں نہیں آتے؟ دیر کیوں کر رہے ہو؟ جواب ارشاد فرماتے ہیں: ـــــ کاش وہ لوگ جان لیتے جنھوں نے انکار کیا اس وقت کو جب وہ آگ کو نہ روک سکیں گے اپنے چہروں سے، اور نہ اپنی پیٹھوں سے، اور نہ وہ مدد کئے جائیں گے۔ بلکہ وہ آگ ان کو یکا یک پہنچے گی، پس وہ ان کو حیرت میں ڈال دے گی، پس وہ اس کو نہ تو پھیرنے کی طاقت رکھیں گے، اور نہ وہ مہلت دیئے جائیں گے! ـــــ یعنی اگر منکرین یہ بات بخوبی جان لیتے کہ جب دوزخ کی آگ ان کو ہر طرف سے گھیرے گی، اور ان کو بچاؤ کا یا مدد کا کسی طرف سے بھی کوئی ادنی سہارا نہ ملے گا: تو آج وہ اس طرح بڑھ بڑھ کر اس عذاب کا مطالبہ نہ کرتے۔ وہ جان لیں کہ وہ عذاب بالیقین آنے والا ہے۔ اور بالکل دفعۃً نازل ہوگا۔ اس وقت یہ کفار ہکّے بکّے رہ جائیں گے۔ اور ان سے کچھ بن نہ پڑے گی، نہ مہلت دی جائے گی۔ اس وقت ان کو پتہ چل جائے گا کہ وہ کس چیز کی ہنسی اڑاتے تھے! ـــــ اور مثال مطلوب ہے تو سنو ـــــ اور البتہ واقعہ یہ ہے کہ آپؐ سے پہلے بھی رسولوں کے ساتھ ٹھٹھا کیا گیا،

پس ان لوگوں کو جنھوں نے تمسخر کیا، اُس عذاب نے گھیر لیا جس کا وہ تمسخر کیا کرتے تھے! —— یہ دنیوی عذاب کی مثال ہے۔ انبیائے کرام علیہم السلام کی پوری تاریخ، منکرین و معاندین کی تباہی و بربادی کی داستانوں سے بھری پڑی ہے۔ اور یہ دنیوی عذاب آخرت کے عذاب کا پیش خیمہ ہے۔ پس دیکھو جو دیدۂ عبرت نگاہ ہو!

آج جب عبرت لینے کا وقت ہے دیکھنا مفید ہے، کل جب مجرمین سزا سے دوچار ہونگے، دیکھنا کچھ مفید نہ ہوگا!

قُلْ مَنْ يَّكْلَؤُكُمْ بِالَّيْلِ وَ النَّهَارِ مِنَ الرَّحْمٰنِ ؕ بَلْ هُمْ عَنْ ذِكْرِ رَبِّهِمْ مُّعْرِضُوْنَ ﴿۴۲﴾ اَمْ لَهُمْ اٰلِهَةٌ تَمْنَعُهُمْ مِّنْ دُوْنِنَا ؕ لَا يَسْتَطِيْعُوْنَ نَصْرَ اَنْفُسِهِمْ وَلَا هُمْ مِّنَّا يُصْحَبُوْنَ ﴿۴۳﴾ بَلْ مَتَّعْنَا هٰۤؤُلَآءِ وَاٰبَآءَهُمْ حَتّٰى طَالَ عَلَيْهِمُ الْعُمُرُ ؕ اَفَلَا يَرَوْنَ اَنَّا نَاْتِي الْاَرْضَ نَنْقُصُهَا مِنْ اَطْرَافِهَا ؕ اَفَهُمُ الْغٰلِبُوْنَ ﴿۴۴﴾ قُلْ اِنَّمَاۤ اُنْذِرُكُمْ بِالْوَحْيِ ۖ وَلَا يَسْمَعُ الصُّمُّ الدُّعَآءَ اِذَا مَا يُنْذَرُوْنَ ﴿۴۵﴾ وَلَئِنْ مَّسَّتْهُمْ نَفْحَةٌ مِّنْ عَذَابِ رَبِّكَ لَيَقُوْلُنَّ يٰوَيْلَنَاۤ اِنَّا كُنَّا ظٰلِمِيْنَ ﴿۴۶﴾

قُلْ	پوچھیں	بَلْ	بلکہ	اٰلِهَةٌ	معبود ہیں
مَنْ	کون	هُمْ	وہ	تَمْنَعُهُمْ	جو ان کو بچائیں
يَّكْلَؤُكُمْ (۱)	حفاظت کرتا ہے تمہاری	عَنْ ذِكْرِ	نصیحت سے	مِّنْ دُوْنِنَا	ہمارے ورے؟
بِالَّيْلِ	رات میں	رَبِّهِمْ	اپنے رب کی	لَا يَسْتَطِيْعُوْنَ	نہیں طاقت رکھتے وہ
وَالنَّهَارِ	اور دن (میں)	مُّعْرِضُوْنَ	منہ موڑنے والے ہیں	نَصْرَ	مدد کرنے کی
مِنَ الرَّحْمٰنِ	رحمان (کے عذاب)	اَمْ	کیا	اَنْفُسِهِمْ	ان کی ذاتوں کی
	سے؟	لَهُمْ (۲)	ان کے لئے	وَلَا هُمْ	اور نہ وہ

(۱) كَلَأَ الله فلانا: اللہ کا کسی کی حفاظت کرنا، باب فتح۔ (۲) لهم: خبر مقدم ہے، آلهة: مبتدا مؤخر، تمنعهم: مبتدا کی صفت، من دوننا: دوسری صفت ہے۔

مِّنَّا	ہماری طرف سے	نَأْتِي	آتے ہیں	اِذَا مَا	جبکہ
يُصْحَبُوْنَ (۱)	ساتھ دیئے جائیں گے	الْاَرْضَ	زمین کو	يُنْذَرُوْنَ	وہ ڈرائے جاتے ہیں
بَلْ	بلکہ	نَنْقُصُهَا	پس گھٹاتے ہیں ہم	وَلَئِنْ	اور بخدا اگر
مَتَّعْنَا (۲)	سامان دیا ہم نے	مِنْ اَطْرَافِهَا	اس کے کناروں کو	مَّسَّتْهُمْ	چھولے ان کو
هٰٓؤُلَآءِ	ان لوگوں کو	اَفَهُمُ	کیا پس وہ	نَفْحَةٌ	ایک جھونکا
وَاٰبَآءَهُمْ	اور انکے باپ دادوں کو	الْغٰلِبُوْنَ	غالب آنے والے ہیں؟	مِّنْ عَذَابِ	عذاب سے
حَتّٰى	یہاں تک کہ	قُلْ	کہہ دیں	رَبِّكَ	آپ کے رب کے
طَالَ	لمبی ہوگئی	اِنَّمَآ	بس	لَيَقُوْلُنَّ	تو ضرور کہیں گے وہ
عَلَيْهِمُ	ان پر	اُنْذِرُكُمْ	ڈراتا ہوں میں تم کو	يٰوَيْلَنَآ	ہائے ہماری شامت!
الْعُمُرُ	زندگانی	بِالْوَحْيِ	وحی کے ذریعہ	اِنَّا	بیشک ہم
اَفَلَا	کیا پس نہیں	وَلَا يَسْمَعُ	اور نہیں سنتا	كُنَّا	تھے ہم
يَرَوْنَ	دیکھتے وہ	الصُّمُّ	بہرہ	ظٰلِمِيْنَ	ظلم کرنے والے
اَنَّا	کہ ہم	الدُّعَآءَ	بلانے کو	۞	۞

ابھی سابقہ سلسلۂ بیان جاری ہے۔ان آیات میں کفار کے دنیوی عذاب کا ذکر ہے۔ارشاد ہے: ـــــ آپ پوچھیں: ''تمہاری کون حفاظت کرتا ہے رات اور دن میں رحمان سے؟'' ـــــ یعنی ان منکرین سے دریافت کیجئے کہ اگر خدائے رحمان تمہیں گرفت میں لینا چاہیں، رات کے کسی حصہ میں یا دن کے کسی حصہ میں تو کون اتنی مجال رکھتا ہے جو تمہیں بچالے؟ پھر تم دنیا کے عذاب سے کیوں مطمئن ہوگئے؟ یہ محض ان کی مہربانی ہے کہ تم عذاب سے بچے ہوئے ہو، ورنہ ان کے غصہ کی پکڑ میں کسی بھی وقت آسکتے ہو ـــــ بلکہ وہ اپنے پروردگار کی نصیحت سے منہ موڑنے والے ہیں ـــــ یعنی اللہ کی پکڑ سے مطمئن تو کوئی نہیں ہوسکتا۔ بات دراصل یہ ہے کہ ان کو اللہ کی خبروں پر اور ان کی دھمکیوں پر یقین ہی نہیں آتا۔وہ ان کی نصیحت سے اعراض کرنے والے ہیں۔تو ـــــ کیا ان کے لئے ہم سے وَرے ایسے معبود ہیں جو ان کو (ہمارے عذاب سے) بچالیں؟ ـــــ یعنی کیا وہ اپنے ان

(۱) صَحِبَه (س) صُحْبَةً: ساتھ ہونا، ساتھ لگنا۔ (۲) مَتَّعَ اللّٰهُ بكذا: مدت تک فائدہ پہنچانا، عرصۂ دراز تک لطف اندوز ہونے کا موقع دینا۔

معبودوں پر تکیہ کئے ہوئے ہیں جو خدا سے اِدھر انھوں نے گھڑ لئے ہیں کہ اگر اللہ کا عذاب آیا تو یہ ہمیں بچالیں گے؟ سنو ـــــ وہ ان کی مدد کرنے کی طاقت نہیں رکھتے، اور نہ وہ (معبود) ہماری طرف سے ساتھ دیئے جائیں گے ـــــ یعنی نہ تو وہ معبود بذاتِ خود اتنی طاقت رکھتے ہیں کہ اللہ کے عذاب کو ٹلا دیں نہ ہماری مدد لے کر اس کو ہٹا سکتے ہیں۔ کیونکہ ہم اس معاملہ میں ان کی مدد ہرگز نہیں کریں گے۔ اگرچہ وہ نیک بندے ہوں ـــــ بلکہ ہم نے ان کو اور ان کے باپ دادوں کو سامانِ عیش دیا، یہاں تک کہ ان پر عرصہ بیت گیا ـــــ اور ان کے دل پتھر ہوگئے۔ جس کی وجہ سے کوئی نصیحت کوئی فہمائش کارگر نہیں ہوتی ـــــ طولِ مدت سے قساوت قلب پیدا ہوتی ہے۔ سورۃ الحدید (آیت ۱۶) میں اہلِ کتاب کا حال بیان کیا گیا ہے کہ ''ان پر ایک لمبا زمانہ گذر گیا تو ان کے دل سخت ہوگئے'' آج مسلمانوں کا بھی یہی حال ہے۔ ان کی اکثریت علم وعمل سے فاغل ہے۔ یہاں مشرکین کا یہی حال بیان کیا گیا ہے کہ ہم نے ان کو سامانِ عیش دیا۔ وہ عیش وتنعّم اور آسائش والی زندگی میں ایسے مگن ہوئے کہ پروردگار کی یاد سے غافل ہوگئے۔ اور ان کے دلوں پر غفلت کی پرتیں چڑھ گئیں: چنانچہ جب ان کو اللہ کی طرف سے کوئی نصیحت کی جاتی ہے تو وہ منہ پھیر لیتے ہیں اور کہتے ہیں کہ یہ کہاں کی باتیں شروع کردیں؟! ـــــ پس کیا وہ دیکھتے نہیں کہ ہم زمین کے اطراف کو گھٹاتے چلے جارہے ہیں؟ پس کیا وہ غالب آنے والے ہیں؟! ـــــ یعنی اسلام اپنی خاموش تبلیغ کے ذریعہ مسلسل پھیل رہا ہے۔ مکہ کی بہت سی اہم شخصیتیں مسلمان ہوچکی ہیں۔ اطرافِ مکہ کے قبائل بھی اسلام کے دائرے میں چلے آرہے ہیں۔ اسی طرح مخالفین اسلام کی زمین دن بدن سکڑتی جارہی ہے۔ کیا اس میں اُن کو اپنی شامت نظر نہیں آتی؟ کیا اب بھی وہ اس خام خیالی میں مبتلا ہیں کہ ''ہم ہی غالب رہیں گے؟!'' (یہی مضمون سورۃ الرعد آیت ۴۱ بھی میں گذرا ہے) ـــــ آپؐ کہیں: ''میں صرف وحی کے ذریعہ تم کو ڈراتا ہوں'' ـــــ یعنی عذاب لانا میرے اختیار میں نہیں ـــــ اور بہرہ پکار کو نہیں سنتا جب وہ ڈرایا جاتا ہے ـــــ یعنی دل کے بہرے اگر میری پکار نہ سنیں تو اس میں میرا کیا قصور ہے؟ وہ خود اپنے بہرے پن کا خمیازہ بھگتیں گے ـــــ اس میں اشارہ ہے کہ نبی کا کام صرف راستہ دکھانا ہے۔ راستہ دیکھنا لوگوں کا کام ہے۔ اگر لوگ آنکھیں موند لیں، اور راستہ دیکھنے کی کوشش نہ کریں تو راہ نما کیا خاک راستہ دکھا سکتا ہے؟ ـــــ اور آخری بات سن لو ـــــ اور بخدا! اگر ان کو آپ کے پروردگار کے عذاب کا ایک جھونکا پہنچ جائے تو وہ ضرور کہیں گے: ''ہائے ہماری شامت! ہم یقیناً ظلم کرنے والے تھے'' ـــــ یعنی پورا عذاب تو الگ رہا، اگر اس کا ایک جھٹکا ہی لگ جائے تو آنکھیں کھل جائیں، ہوش درست ہوجائیں، اور وہ اعتراف کرنے پر مجبور ہوجائیں کہ بیشک ہم بڑے

بھاری مجرم تھے جوایسی کم بختی آئی!

انسان اللہ کے عذاب کا معمولی جھٹکا بھی برداشت نہیں کرسکتا۔مگر غفلت کا یہ حال ہے کہ اسبابِ عذاب ڈھیروں جمع کئے چلا جارہا ہے

وَنَضَعُ الْمَوَازِيْنَ الْقِسْطَ لِيَوْمِ الْقِيٰمَةِ فَلَا تُظْلَمُ نَفْسٌ شَيْئًا ؕ وَاِنْ كَانَ مِثْقَالَ حَبَّةٍ مِّنْ خَرْدَلٍ اَتَيْنَا بِهَا ؕ وَكَفٰى بِنَا حٰسِبِيْنَ ﴿۴۷﴾ وَلَقَدْ اٰتَيْنَا مُوْسٰى وَهٰرُوْنَ الْفُرْقَانَ وَضِيَآءً وَّذِكْرًا لِّلْمُتَّقِيْنَ ﴿۴۸﴾ الَّذِيْنَ يَخْشَوْنَ رَبَّهُمْ بِالْغَيْبِ وَهُمْ مِّنَ السَّاعَةِ مُشْفِقُوْنَ ﴿۴۹﴾ وَهٰذَا ذِكْرٌ مُّبٰرَكٌ اَنْزَلْنٰهُ ؕ اَفَاَنْتُمْ لَهٗ مُنْكِرُوْنَ ﴿۵۰﴾

وَنَضَعُ	اور رکھیں گے ہم	مِثْقَالَ	برابر	مُوْسٰى	موسیٰ
الْمَوَازِيْنَ (۱)	ترازویں	حَبَّةٍ	دانے	وَهٰرُوْنَ	اور ہارون کو
الْقِسْطَ (۲)	انصاف کی	مِّنْ خَرْدَلٍ	رائے کے	الْفُرْقَانَ (۵)	فیصلہ کُن کتاب
لِيَوْمِ	دن میں	اَتَيْنَا	(تو) حاضر کریں گے ہم	وَضِيَآءً	اور روشنی
الْقِيٰمَةِ	قیامت کے	بِهَا	اس (دانے) کو	وَّذِكْرًا	اور نصیحت
فَلَا تُظْلَمُ	پس نہیں حق مارا جائیگا	وَكَفٰى	اور کافی ہیں	لِّلْمُتَّقِيْنَ	پرہیزگاروں کے لئے
نَفْسٌ	کسی شخص کا	بِنَا (۳)	ہم	الَّذِيْنَ (۶)	جو
شَيْئًا	ذرا بھی	حٰسِبِيْنَ (۴)	حساب لینے والے	يَخْشَوْنَ	ڈرتے ہیں
وَاِنْ	اور اگر	وَلَقَدْ	اور البتہ تحقیق	رَبَّهُمْ	اپنے رب سے
كَانَ	ہو (عمل)	اٰتَيْنَا	عطا فرمائی ہم نے	بِالْغَيْبِ (۷)	بن دیکھے

(۱) الموازین: المیزان کی جمع: ترازو (۲) قَسَط (ض) قِسْطًا: انصاف کرنا، اور قَسَطَ (ض) قَسْطًا: ناانصافی کرنا، حق سے انحراف کرنا۔ یہاں پہلا مصدر ہے، اور مبالغۃً صفت بنایا گیا ہے، اس لئے صفت جمع نہیں لائی گئی (۳) بنا: فاعل ہے، اور کفی کے فاعل پر باء زائد آتی ہے (۴) حسبین: حال یا تمیز ہے (۵) الفُرقان: مصدر بھی ہے اور صیغہ صفت بھی، حق کو باطل سے جدا کرنا، اور حق کو باطل سے جدا کرنے والی چیز، قضیے چکانے والی کتاب (۶) الذین: متقین کی صفت یا بدل یا بیان ہے (۷) بالغیب: یخشون کے مفعول ربھم کا حال ہے

وَهُمْ	اور وہ	وَهٰذَا ذِكْرٌ	اور یہ نصیحت ہے	اَفَاَنْتُمْ	کیا پس تم
مِّنَ السَّاعَةِ	قیامت سے	مُّبٰرَكٌ (۱)	بابرکت	لَهٗ	اس کا
مُشْفِقُوْنَ	ڈرنے والے ہیں	اَنْزَلْنٰهُ (۲)	اتارا ہے ہم نے اس کو	مُنْكِرُوْنَ	انکار کرنے والے ہو؟

ابھی سابقہ سلسلۂ بیان جاری ہے۔ کفارِ مکہ جو رسول اللہ ﷺ اور قرآن کریم کا انکار کرتے تھے، ان کو ان کا اخروی انجام سنایا جارہا ہے۔ اور بات عمومی صورت میں پیش کی ہے۔ ارشاد ہے: ــــــ اور ہم قیامت کے دن انصاف کی ترازویں قائم کریں گے ــــــ اور تمام مخلوقات کے اعمال کا وزن کریں گے ــــــ یعنی معاملہ دنیا کے عذاب پر ختم نہیں جائے گا، بلکہ اصل سزا آخرت میں ملے گی، اور انصاف کے ساتھ ملے گی، تول کانٹے سے ملے گی ــــــ پس کسی کا ذرا بھی حق نہیں مارا جائے گا ــــــ یعنی غایتِ انصاف کے ساتھ تول ہوگا۔ کسی کو اس کی بدعملی کی واجبی سزا سے زیادہ سزا نہیں دی جائے گی۔ ہاں کسی مؤمن کا گناہ معاف کردیا جائے یا اس کے ثواب میں اضافہ کردیا جائے تو وہ فضل ہوگا ظلم نہیں ہوگا ــــــ اور اگر عمل رائی کے دانے کے برابر ہوگا تو ہم اسے بھی حاضر کریں گے ــــــ یعنی کوئی معمولی سے معمولی عمل بھی اِدھر اُدھر ضائع نہ ہوگا۔ خواہ نیکی یا برائی ذرہ بھر ہو انسان اس کو دیکھ لے گا ــــــ اور حساب کرنے کو ہم کافی ہیں! ــــــ اس آخری ارشاد میں تین باتیں ایک ساتھ بیان کی گئی ہیں: (۱) ترازو میں تولے بغیر بھی اللہ تعالیٰ حساب کرسکتے ہیں۔ تولنا محض لوگوں کے اطمینان کے لئے ہوگا۔ (۲) معمولی سے معمولی عمل بھی تول کے وقت حاضر کیا جائے گا۔ کیونکہ تولنے والے علیم وخبیر ہیں۔ ان کے علم سے مخلوق کے عمل کا ایک ذرہ بھی پوشیدہ نہیں۔ (۳) بعض مشرک قومیں (جیسے اہل مصر) دنیا والوں کے حساب وکتاب کے لئے ایک الگ دیوتا مانتے تھے، وہ محض ان کا توہم تھا۔ اللہ تعالیٰ اکیلے ہی حساب لینے کے لئے کافی ہیں، ان کو کسی مددگار کی حاجت نہیں۔

فائدہ: موازین کا جمع لانا غالباً اس وجہ سے ہے کہ قیامت کے دن متعدد میزانیں ہونگی۔ مثلاً ہر امت کے لئے الگ میزان ہوگی۔ یا اعمال کی نوعیتوں کے اعتبار سے مختلف میزانیں ہونگی۔ مثلاً نماز کے لئے میزان، روزوں کے لئے میزان۔ جیسے دنیا میں سونا چاندی تولنے کی میزان الگ ہوتی ہے، غلہ اور سوختہ تولنے کی الگ۔ بھاری اجسام کے وزن کرنے کا کانٹا الگ ہوتا ہے، بادپیما الگ نوعیت کا آلہ ہوتا ہے، اور حرارت کا اندازہ کرنے والا آلہ مختلف قسم کا ہوتا ہے ــــــ اور یہ بھی ممکن ہے کہ صیغۂ جمع اظہارِ عظمت کے لئے لایا گیا ہو، کیونکہ وہ ایک ہی میزان بہت سی میزانوں کا کام کرے گی۔ مستدرک حاکم میں بروایت حضرت سلمان رضی اللہ عنہ مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا

(۱) مبارك: پہلی صفت ذکر: خبر کی۔ (۲) أنزلناه: دوسری صفت یا دوسری خبر۔

:"قیامت کے روز جو میزان وزنِ اعمال کے لئے رکھی جائے گی: وہ اتنی بڑی اور وسیع ہوگی کہ اس میں آسمان وزمین کو تولنا چاہیں تو وہ بھی اس میں سما جائیں"۔ (تفسیر مظہری ۲۰۰:٦)

مگر بات درحقیقت اہم یہ نہیں ہے کہ میزانیں کتنی ہونگی اور کیسی ہونگی؟ بلکہ اہم باتیں دو ہیں:

پہلی بات: ہمارا ہر عمل تُلنے والا ہے۔ کوئی اچھا یا برا عمل غائب نہیں رہے گا۔ پس ہمیں ہر برائی سے خواہ وہ کتنی ہی چھوٹی کیوں نہ ہو، بچنا چاہئے۔ کیونکہ معمولی چنگاری بھی گھر پھونکنے کے لئے کافی ہے۔ اور ہر نیکی کا کام خواہ وہ کتنا ہی چھوٹا کیوں نہ ہو، ضرور کرنا چاہئے۔ کیونکہ قطرہ قطرہ مل کر سمندر بن جاتا ہے۔ اللہ تعالیٰ ہمیں دونوں باتوں کی توفیق عطا فرمائیں (آمین)

دوسری بات: جب اعمال تُلیں گے تو نفسی نفسی کا عالم ہوگا۔ حاکم اور بیہقی نے حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا سے روایت کیا ہے کہ انھوں نے نبی ﷺ سے دریافت کیا: یارسول اللہ! کیا قیامت کے روز آپؐ اپنے اہل وعیال کو یاد رکھیں گے؟ آپ ﷺ نے فرمایا: "تین مقام میں کوئی کسی کو یاد نہ کرے گا۔ ایک: جب میزانِ عدل کے سامنے وزنِ اعمال کے لئے حاضر کیا جائے گا۔ جب تک نتیجہ معلوم نہ ہو جائے کہ نیکیوں کا پلہ بھاری رہا یا ہلکا کوئی کسی کو یاد نہ کرے گا۔ دوسرا: جب اعمال نامے اڑائے جائیں گے۔ جب تک یہ متعین نہ ہو جائے کہ نامۂ اعمال داہنے ہاتھ میں آیا یا بائیں ہاتھ میں کوئی کسی کو یاد نہ کرے گا۔ تیسرا: جب لوگ پل صراط پر سے گذریں گے، جب تک پار نہ ہو جائیں کوئی کسی کو یاد نہ کرے گا" (مظہری) پس آج موقعہ ہے۔ کل کی ہم تیاری کرسکتے ہیں۔ غفلت میں زندگی نہیں گذارنی چاہئے۔ گیا وقت پھر ہاتھ آتا نہیں!

آخر میں آنحضرت ﷺ کی نبوت کی نشانی: قرآن کریم کا تذکرہ کرنا ہے۔ مگر اس کی تمہید میں موسیٰ علیہ السلام کی کتاب تورات کا تذکرہ کیا جاتا ہے۔ کیونکہ مشرکین اس سے بخوبی واقف تھے، اس لئے وہ مثال کا کام دے گی۔ ارشاد ہے —— اور البتہ واقعہ یہ ہے کہ ہم نے موسیٰ وہارون (علیہما السلام) کو فیصلہ کن کتاب اور روشنی اور نصیحت عطا فرمائی اُن پرہیزگاروں کے لئے جو اپنے پروردگار سے بن دیکھے ڈرتے ہیں، اور وہ قیامت سے (بھی) ڈرنے والے ہیں —— تورات شریف اللہ تعالیٰ کی عظیم الشان کتاب تھی۔ حق وباطل کے معاملات میں فیصلہ کن، جہالت وغفلت کی تاریکیوں میں روشنی، اور اللہ تعالیٰ سے ڈرنے والے بندوں کے لئے نصیحت تھی —— اللہ سے ڈرنے والے بندوں کے دو وصف بیان کئے گئے ہیں: ایک: اللہ تعالیٰ کو انھوں نے دیکھا نہیں، پھر بھی وہ اس سے ڈرتے ہیں۔ یہی درحقیقت کمالِ ایمان ہے۔ دوسرا: وہ قیامت کے دن سے بھی خائف رہتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ کی کتاب سے

نفع یاب ہونے کا راز اسی دل کی کھٹک میں پوشیدہ ہے۔ جو لوگ حساب سے ڈرتے ہیں وہی اللہ تعالیٰ کی نصیحت سے منتفع ہوتے ہیں،

آخر میں قرآنِ پاک کا ذکر ہے۔ جس کی تمہید کے طور پر تورات کا ذکر کیا تھا۔ ارشاد ہے: ـــــ اور یہ بابرکت نصیحت ہے جس کو ہم نے اتارا ہے، پس کیا تم اس کا انکار کرنے والے ہو؟! ـــــ یعنی تورات کی طرح یہ قرآن پاک بھی ایک نصیحت نامہ ہے۔ اور بابرکت کتاب ہے یعنی عظیم النفع، کثیر الخیر اور جلیل القدر ہے، تورات سے بھی واضح اور روشن ہے۔ ہدایت وضلالت کے قضیے چکانے والی ہے، پس کیا تم ایسی کتاب کا انکار کرتے ہو؟ تعجب ہے تمہاری عقلوں پر! تم ہماری نازل کی ہوئی کتاب کا انکار کرتے ہو، حالانکہ اس کے انکار کی گنجائش نہیں۔

وَلَقَدْ اٰتَيْنَآ اِبْرٰهِيْمَ رُشْدَهٗ مِنْ قَبْلُ وَكُنَّا بِهٖ عٰلِمِيْنَ ﴿۵۱﴾ اِذْ قَالَ لِاَبِيْهِ وَقَوْمِهٖ مَا هٰذِهِ التَّمَاثِيْلُ الَّتِيْٓ اَنْتُمْ لَهَا عٰكِفُوْنَ ﴿۵۲﴾ قَالُوْا وَجَدْنَآ اٰبَآءَنَا لَهَا عٰبِدِيْنَ ﴿۵۳﴾ قَالَ لَقَدْ كُنْتُمْ اَنْتُمْ وَاٰبَآؤُكُمْ فِيْ ضَلٰلٍ مُّبِيْنٍ ﴿۵۴﴾ قَالُوْٓا اَجِئْتَنَا بِالْحَقِّ اَمْ اَنْتَ مِنَ اللّٰعِبِيْنَ ﴿۵۵﴾ قَالَ بَلْ رَّبُّكُمْ رَبُّ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ الَّذِيْ فَطَرَهُنَّ ۖ وَاَنَا عَلٰي ذٰلِكُمْ مِّنَ الشّٰهِدِيْنَ ﴿۵۶﴾ وَتَاللّٰهِ لَاَكِيْدَنَّ اَصْنَامَكُمْ بَعْدَ اَنْ تُوَلُّوْا مُدْبِرِيْنَ ﴿۵۷﴾ فَجَعَلَهُمْ جُذٰذًا اِلَّا كَبِيْرًا لَّهُمْ لَعَلَّهُمْ اِلَيْهِ يَرْجِعُوْنَ ﴿۵۸﴾ قَالُوْا مَنْ فَعَلَ هٰذَا بِاٰلِهَتِنَآ اِنَّهٗ لَمِنَ الظّٰلِمِيْنَ ﴿۵۹﴾ قَالُوْا سَمِعْنَا فَتًى يَّذْكُرُهُمْ يُقَالُ لَهٗٓ اِبْرٰهِيْمُ ﴿۶۰﴾ قَالُوْا فَاْتُوْا بِهٖ عَلٰٓي اَعْيُنِ النَّاسِ لَعَلَّهُمْ يَشْهَدُوْنَ ﴿۶۱﴾

وَلَقَدْ	اور البتہ تحقیق	مِنْ قَبْلُ	قبل ازیں	اِذْ	جب
اٰتَيْنَآ	عطا فرمائی ہم نے	وَكُنَّا	اور تھے ہم	قَالَ	کہا اس نے
اِبْرٰهِيْمَ	ابراہیم کو	بِهٖ	ان کو	لِاَبِيْهِ	اپنے باپ سے
رُشْدَهٗ (۱)	ان کی سمجھ داری	عٰلِمِيْنَ	خوب جاننے والے	وَقَوْمِهٖ	اور اپنی قوم سے

(۱) رُشد: باب نصر کا مصدر ہے: ہوشیاری، سمجھ داری، خوش فہمی۔

لفظ	ترجمہ	لفظ	ترجمہ	لفظ	ترجمہ
مَا	کیا (ہیں)	جِئۡتَنَا	لایا تو ہمارے پاس	اَصۡنَامَكُمۡ	تمہارے بتوں کیساتھ
هٰذِهِ	یہ	بِالۡحَقِّ (۳)	سچی بات	بَعۡدَ اَنۡ (۵)	اس کے بعد کہ
التَّمَاثِيۡلُ (۱)	مورتیں	اَمۡ	یا	تُوَلُّوۡا	پلٹو تم
الَّتِيۡۤ	جو	اَنۡتَ	تو	مُدۡبِرِيۡنَ	پیٹھ پھیر کر
اَنۡتُمۡ لَهَا	تم ان پر	مِنَ اللّٰعِبِيۡنَ	کھیلنے والوں میں سے	فَجَعَلَهُمۡ	پس کر دیا اس نے ان کو
عٰكِفُوۡنَ	جمے بیٹھے ہو؟		ہے؟	جُذٰذًا (۶)	ٹکڑے ٹکڑے
قَالُوۡا	کہا انھوں نے	قَالَ	کہا اس نے	اِلَّا	مگر
وَجَدۡنَاۤ	پایا ہم نے	بَلۡ	بلکہ	كَبِيۡرًا	بڑے کو
اٰبَآءَنَا	اپنے بڑوں کو	رَّبُّكُمۡ	تمہارا رب	لَّهُمۡ	ان کے
لَهَا	ان کی	رَبُّ	رب (ہے)	لَعَلَّهُمۡ	تا کہ وہ
عٰبِدِيۡنَ	عبادت کرتے	السَّمٰوٰتِ	آسمانوں	اِلَيۡهِ	اس کی طرف
قَالَ	کہا اس نے	وَالۡاَرۡضِ	اور زمین کا	يَرۡجِعُوۡنَ	رجوع کریں
لَقَدۡ	البتہ تحقیق	الَّذِىۡ (۴)	جس نے	قَالُوۡا	کہا انھوں نے
كُنۡتُمۡ	تھے تم	فَطَرَهُنَّ	پیدا کیا ان کو	مَنۡ	کس نے
اَنۡتُمۡ (۲)	تم	وَاَنَا	اور میں	فَعَلَ هٰذَا	کیا یہ
وَاٰبَآؤُكُمۡ	اور تمہارے بڑے	عَلٰى ذٰلِكُمۡ	ان باتوں پر	بِاٰلِهَتِنَاۤ	ہمارے معبودوں کیساتھ
فِىۡ ضَلٰلٍ	گمراہی میں	مِّنَ	گواہی دینے والوں	اِنَّهٗ	بیشک وہ
مُّبِيۡنٍ	صریح	الشّٰهِدِيۡنَ	سے ہوں	لَمِنَ الظّٰلِمِيۡنَ	البتہ ظالموں میں سے ہے
قَالُوۡۤا	کہا انھوں نے	وَتَاللّٰهِ	اور خدا کی قسم	قَالُوۡا	کہا انھوں نے
اَ	کیا	لَاَكِيۡدَنَّ	میں ضرور چال چلونگا	سَمِعۡنَا	سنا ہم نے

(۱) تماثیل: تِمۡثَال کی جمع ہے: صورتیں، مورتیں، تصویریں۔(۲) أنتم: ضمیر فصل ہے جو ضمیر مرفوع متصل پر عطف کی تصحیح کے لئے لائی گئی ہے۔(۳) ب: صلہ کی ہے، جاء به: لانا۔(۴) الذی: صفت ہے رب کی۔(۵) بعد: مابعد کی طرف مضاف ہے۔
(۶) جُذَاذ: بروزن فُعَال بمعنی مفعول، جَذٌّ سے مشتق ہے: کاٹنا، توڑنا۔ جذاذ: ریزہ ریزہ، ٹکڑے ٹکڑے۔

فَتًى	ایک نوجوان کو	اِبْرٰهِيْمُ	ابراہیم	عَلٰٓى اَعْيُنِ	آنکھوں کے سامنے
يَّذْكُرُهُمْ	تذکرہ کرتا ہے ان کا	قَالُوْا	کہا انھوں نے	النَّاسِ	لوگوں کی
يُقَالُ	کہا جاتا ہے	فَاْتُوْا	پس لاؤ تم	لَعَلَّهُمْ	تاکہ وہ
لَهٗٓ	اس کو	بِهٖ	اس کو	يَشْهَدُوْنَ	گواہی دیں

رسالت کے بیان کے بعد اب توحید کا بیان شروع ہوتا ہے۔اور کفار مکہ کو ان کے جد امجد حضرت ابراہیم خلیل اللہ کا وہ واقعہ سنایا جاتا ہے جس سے بتوں کی خدائی باطل ہوتی ہے یہ واقعہ خاص طور پر اس لئے بھی سنایا گیا ہے کہ ممکن ہے نبی ﷺ کو بھی ابراہیم علیہ السلام کی طرح وطن چھوڑنا پڑے ـــــــ حضرت ابراہیم علیہ السلام کی قوم بت پرست بھی تھی اور ستارہ پرست بھی۔ان کا اپنا گھرانا بت پرستی میں مبتلا تھا۔ان کا باپ آزر بت تراش بھی تھا،اور مندر کا مَہنت بھی۔ چنانچہ آپ نے قوم کو کواکب کی بے وقعتی ایک خاص انداز سے سمجھائی تھی، جس کا تذکرہ سورۃ الانعام (آیات ۷۴ تا ۸۳) میں گذر چکا ہے۔اور اِن آیات میں اُس خاص طریقہ کا ذکر ہے جو آپ نے بتوں کے شرک کے ابطال کے لئے اختیار کیا تھا۔ارشاد ہے ـــــــ اور البتہ واقعہ یہ ہے کہ ہم نے ابراہیم کو قبل ازیں ان کی سمجھ داری عطا فرمائی ـــــــ یعنی حضرت محمد ﷺ اور حضرت موسیٰ وہارون علیہما السلام سے پہلے اللہ تعالیٰ نے حضرت ابراہیم علیہ السلام کو نبوت سے سرفراز فرمایا۔نبوت کو یہاں لفظ ''رُشد'' (خوش فہمی، سمجھداری) سے تعبیر کیا ہے۔یعنی اللہ تعالیٰ نے ان کو حق کی بصیرت عطا فرمائی۔اس تعبیر میں ان کی اعلی قابلیت کی طرف اشارہ ہے، جو اولوالعزم (بڑے درجے کے) انبیاء کی شان ہوتی ہے ـــــــ اور ہم ان کو خوب جاننے والے تھے ـــــــ کہ ان میں کیسی صلاحیتیں ہیں ـــــــ نبوت بیشک وہبی ہے، مگر صلاحیتوں پر مبنی ہے۔بس یونہی کسی کو نبوت کا تاج نہیں پہنا دیا جاتا۔ بلکہ جس میں نبوت کی صلاحیت پائی جاتی ہے اسی کو یہ مقام تفویض کیا جاتا ہے۔حضرت ابراہیم علیہ السلام میں اس منصب کی وافر صلاحیت موجود تھی، اس لئے آپ کو نبوت سے سرفراز کیا گیا۔

واقعہ کا آغاز: (یاد کرو) جب آپ نے اپنے باپ اور اپنی قوم (یعنی قبیلہ کے لوگوں) سے پوچھا: ''اِن مجسموں کی کیا حقیقت ہے جن پر تم جمے بیٹھے ہو؟!'' ـــــــ یعنی یہ تو پتھر کی خود تراشیدہ مورتیں ہیں، وہ معبود کس طرح بن گئیں؟!

انھوں نے جواب دیا: ''ہم نے اپنے بڑوں کو اِن کی عبادت کرتے ہوئے پایا ہے!'' ـــــــ یعنی ہمارے پاس ان کے معبود ہونے کی کوئی دلیل اس کے سوا نہیں کہ اوپر سے باپ دادا انہی کی پوجا کرتے چلے آرہے ہیں ـــــــ جاہلوں کا بڑا سہارا یہی تقلید آباء ہوتا ہے!

آپ نے کہا: ''البتہ واقعہ یہ ہے کہ تم اور تمہارے بڑے صریح گمراہی میں ہو'' ـــــــ یعنی یہ بھی کوئی دلیل ہوئی؟! اس سے تو یہ ثابت ہوا کہ تمہاری طرح تمہارے باپ دادا بھی کھلی گمراہی میں مبتلا تھے۔ اور تم بے وقوف بنے ان کی کورانہ تقلید کرکے تباہ ہو رہے ہو۔

انھوں نے کہا: ''کیا تم ہمارے ساتھ سنجیدگی سے گفتگو کر رہے ہو یا کھلاڑیاں کر رہے ہو؟'' ـــــــ یعنی کیا سچ مچ تمہارا یہ خیال اور عقیدہ ہے یا محض ہنسی اور دل لگی کر رہے ہو؟ ـــــ ابراہیم علیہ السلام کی قوم توحید سے نا آشنا تھی۔ اس کو یہ آواز بالکل ہی اجنبی معلوم ہوئی۔ وہ لوگ یہی سمجھے کہ ابراہیم دل لگی کر رہے ہیں۔ ورنہ سنجیدگی سے معبودوں کے بارے میں ایسی بات بھلا کون زبان سے نکال سکتا ہے!

آپ نے کہا: ''بلکہ تمہارا رب: آسمانوں اور زمین کا پروردگار ہے، جس نے ان کو پیدا کیا ہے۔ اور میں اِن باتوں پر گواہوں میں سے ہوں'' ـــــــ یعنی یہ بت تمہارے معبود ہرگز نہیں۔ تمہارے معبود تو آسمانوں اور زمین کے خالق و مالک اور پروردگار ہیں۔ میرا یہی اعتقاد ہے۔ اور میں پوری بصیرت سے اس کی شہادت دیتا ہوں۔ اور اس پر دلیل بھی رکھتا ہوں ـــــ معبود کو رب (پروردگار) سے اس لئے تعبیر کیا ہے کہ معبودیت کے لئے ربوبیت لازم ہے۔ جو پروردگار اور پالنہار نہیں: وہ معبود کیسے ہوسکتا ہے! ـــــ ''اور خدا کی قسم! میں ضرور تمہارے بتوں کے ساتھ چال چلونگا جب تم پیٹھ پھیر کر چلے جاؤ گے'' ـــــ یعنی جب کبھی تم غیر حاضر ہوگے: دیکھنا میں تمہاری ان مورتیوں کی کیسی گت بناتا ہوں ـــــ یہ بات ابھی غیر واضح تھی، اور اُن کے قبیلہ کے لوگ اشارہ بھی نہ پا سکے۔ چنانچہ بات آئی گئی ہوگئی۔

پھر جب لوگ شہر سے باہر کسی میلے میں گئے ـــــ تو آپ نے ان کو ٹکڑے ٹکڑے کردیا۔ مگر ان کے بڑے کو (چھوڑ دیا) تاکہ وہ ان کی طرف رجوع کریں ـــــ یعنی مندر میں پہنچ کر سب مورتیوں کو لولا لنگڑا کردیا، مگر بڑے بت کو چھوڑ دیا۔ اور کلہاڑی اس کی گردن میں لٹکادی۔ تاکہ جب لوگ واپس آکر یہ منظر دیکھیں تو سابقہ گفتگو کی بنا پر ان کا خیال ابراہیم علیہ السلام کی طرف جائے، اور وہ آپ کی طرف رجوع کریں، تاکہ آپ کو پوری قوم کو دعوت دینے کا اور بتوں کی بے حیثیتی واضح کرنے کا سنہرا موقعہ مل جائے ـــــ پھر جب لوگ میلے سے واپس لوٹے، اور مندر میں پوجا پاٹ کرنے کے لئے پہنچے تو وہاں کا منظر دیکھ کر دنگ رہ گئے ـــــ انھوں نے کہا: ''کس نے ہمارے معبودوں کے ساتھ یہ حرکت کی ہے؟ یقیناً وہ ظالموں میں سے ہے!'' ـــــ یعنی ہمارے معبودوں کے ساتھ یہ گستاخی اور بے ادبی! جس نے بھی یہ کام کیا ہے: بڑا ہی ظالم اور شریر ہے!

جن لوگوں نے حضرت ابراہیم علیہ السلام کی سابقہ گفتگو سنی تھی، ان کا خیال فوراً آپ کی طرف گیا۔ اور ـــــ

انھوں نے کہا: ''ہم نے ایک نوجوان کو ان کا تذکرہ کرتے ہوئے سنا ہے، جس کو ابراہیم کہا جاتا ہے'' ـــــ یعنی ہونہ ہو یہ حرکت اسی کی ہے۔ اس نے بتوں کے ساتھ چال چلنے کی بات کہی تھی۔ یہ اس کی وہی چال معلوم ہوتی ہے۔

انھوں نے کہا: ''پس اس کو لوگوں کے سامنے لاؤ، تاکہ وہ گواہی دیں'' ـــــ یعنی اس کو عوام کے روبرو بلاؤ، اس سے تحقیقِ حال کریں۔ اگر وہ اعتراف کرے تو لوگ بادشاہ کے سامنے گواہی دیں۔ اور اس کو قرار واقعی سزا دلوائیں۔ ابراہیم علیہ السلام مندر کے مہنت کے بیٹے تھے۔ ان کو سزا دلوانے کے لئے مضبوط گواہیوں کی اور رائے عامہ ہموار کرنے کی ضرورت تھی (واقعہ جاری ہے)

جس کی پشت مضبوط ہوتی ہے وہ بڑے سے بڑا اقدام کرسکتا ہے

قَالُوْٓا ءَاَنْتَ فَعَلْتَ هٰذَا بِاٰلِهَتِنَا يٰٓاِبْرٰهِيْمُ ﴿۶۲﴾ قَالَ بَلْ فَعَلَهٗ ۖ كَبِيْرُهُمْ هٰذَا فَسْئَلُوْهُمْ اِنْ كَانُوْا يَنْطِقُوْنَ ﴿۶۳﴾ فَرَجَعُوْٓا اِلٰٓى اَنْفُسِهِمْ فَقَالُوْٓا اِنَّكُمْ اَنْتُمُ الظّٰلِمُوْنَ ﴿۶۴﴾ ثُمَّ نُكِسُوْا عَلٰى رُءُوْسِهِمْ ۚ لَقَدْ عَلِمْتَ مَا هٰٓؤُلَآءِ يَنْطِقُوْنَ ﴿۶۵﴾ قَالَ اَفَتَعْبُدُوْنَ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ مَا لَا يَنْفَعُكُمْ شَيْـًٔا وَّلَا يَضُرُّكُمْ ﴿۶۶﴾ اُفٍّ لَّكُمْ وَلِمَا تَعْبُدُوْنَ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ ۭ اَفَلَا تَعْقِلُوْنَ ﴿۶۷﴾ قَالُوْا حَرِّقُوْهُ وَانْصُرُوْٓا اٰلِهَتَكُمْ اِنْ كُنْتُمْ فٰعِلِيْنَ ﴿۶۸﴾ قُلْنَا يٰنَارُ كُوْنِيْ بَرْدًا وَّسَلٰمًا عَلٰٓى اِبْرٰهِيْمَ ﴿۶۹﴾ وَاَرَادُوْا بِهٖ كَيْدًا فَجَعَلْنٰهُمُ الْاَخْسَرِيْنَ ﴿۷۰﴾

قَالُوْٓا	کہا انھوں نے	بِاٰلِهَتِنَا	ہمارے معبودوں کیساتھ	فَعَلَهٗ (۱)	کیا اس کو (کسی کرنے
ءَاَنْتَ	کیا تو نے	يٰٓاِبْرٰهِيْمُ	اے ابراہیم؟		والے نے)
فَعَلْتَ	کیا	قَالَ	کہا اس نے	كَبِيْرُهُمْ	ان کا بڑا
هٰذَا	یہ	بَلْ	بلکہ	هٰذَا	یہ (ہے)

(۱) فَعَلَهٗ پر اگر وقف کیا جائے تو فاعل محذوف ہوگا۔ أی فَعَلَهٗ فَاعِلٌ: کسی کرنے والے نے یہ کیا ہے، اور کبیرهم هذا: مبتدا خبر ہونگے۔ اور اگر آگے سے ملایا جائے تو کبیرهم هذا: فاعل ہوگا، یعنی ان کے اس بڑے نے یہ حرکت کی ہے۔ یہ دونوں احتمال ہیں۔ اور یہی اس کلام میں توریہ ہے۔

فَسْئَلُوْهُمْ (۱)	پس پوچھو ان سے	يَنْطِقُوْنَ	بولتے	حَرِّقُوْهُ	جلا ڈالو اس کو
اِنْ	اگر	قَالَ	کہا اس نے	وَانْصُرُوْٓا	اور مدد کرو
كَانُوْا	ہوں وہ	اَفَتَعْبُدُوْنَ	کیا پس پوجتے ہو تم	اٰلِهَتَكُمْ	اپنے معبودوں کی
يَنْطِقُوْنَ	بولتے	مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ	اللہ تعالیٰ سے وَرے	اِنْ	اگر
فَرَجَعُوْٓا	پس لوٹے وہ	مَا	(اس کو) جو	كُنْتُمْ	ہو تم
اِلٰٓى اَنْفُسِهِمْ	اپنے نفسوں کی طرف	لَا يَنْفَعُكُمْ	نہیں نفع پہنچاتا تم کو	فٰعِلِيْنَ	کرنے والے
فَقَالُوْٓا	پس کہا انھوں نے	شَيْئًا	کچھ بھی	قُلْنَا	کہا ہم نے
اِنَّكُمْ	بیشک تم	وَّلَا	اور نہیں	يٰنَارُ	اے آگ
اَنْتُمُ	ہی	يَضُرُّكُمْ	نقصان پہنچاتا تم کو	كُوْنِيْ	ہو جا تو
الظّٰلِمُوْنَ	ظلم کرنے والے ہو	اُفٍّ	تُف (ہے)	بَرْدًا	ٹھنڈی
ثُمَّ	پھر	لَّكُمْ	تم پر	وَّسَلٰمًا	اور سلامتی
نُكِسُوْا (۲)	اوندھے ہوئے وہ	وَلِمَا	اور ان پر جن کو	عَلٰٓى اِبْرٰهِيْمَ	ابراہیم پر
عَلٰى رُءُوْسِهِمْ	اپنے سروں پر	تَعْبُدُوْنَ	تم پوجتے ہو	وَاَرَادُوْا	اور چاہا انھوں نے
لَقَدْ	البتہ تحقیق	مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ	اللہ تعالیٰ سے وَرے	بِهٖ	اس کے ساتھ
عَلِمْتَ	جانا تو نے	اَفَلَا	کیا پس نہیں	كَيْدًا	بڑا مکر
مَا	نہیں (ہیں)	تَعْقِلُوْنَ	سمجھتے ہو تم؟	فَجَعَلْنٰهُمُ	پس کر دیا ہم نے ان کو
هٰٓؤُلَآءِ	یہ	قَالُوْا	کہا انھوں نے	الْاَخْسَرِيْنَ	ناکام ہونے والے

گذشتہ سے پیوستہ: حضرت ابراہیم علیہ السلام کو عوام کے روبرو لایا گیا ـــــ انھوں نے پوچھا: ''کیا تم ہی نے ہمارے معبودوں کے ساتھ یہ کیا ہے؟'' ـــــ یعنی کیا یہ نازیبا حرکت تمہاری تو نہیں؟ انھوں نے قطعیت کے ساتھ الزام نہیں لگایا، ورنہ کہتے: ''تم نے ہمارے معبودوں کے ساتھ یہ حرکت کیوں کی؟'' ان لوگوں نے احتمال کے درجہ میں پوچھا تھا۔

آپ نے جواب دیا: ''بلکہ کیا اس کو، ان کا بڑا یہ، پس ان سے پوچھو اگر وہ بولتے ہوں!'' ـــــ یہ آپ نے

(۱) هم کا مرجع شکستہ بت ہیں۔ (۲) نَكَسَ الشيئَ (ن) نَكْسًا: اوندھا کرنا۔ نَكَسَ رأسَه: شرمندگی سے سر جھکانا۔

ذو معنی جواب دیا ہے۔اس کا ایک مطلب تو یہ نکلتا ہے کہ یہ حرکت میں نے نہیں کی۔ یہ کام ان کے اس گرو نے کیا ہے۔پس ان ٹوٹے پھوٹوں سے معلوم کرلو،خود بتادیں گے کہ یہ حرکت اس بڑے بت نے کی ہے۔دوسرا مطلب یہ نکلتا ہے کہ اس سوال کو چھوڑو،جس نے بھی کیا ہے ٹھیک کیا ہے۔ان کا یہ بڑا کلہاڑا لئے کھڑا ہے۔انہیں سے پوچھ لو کہ تمہاری یہ گت کس نے بنائی؟ ـــــ اس طرح کا ذو معنی کلام توریہ کہلاتا ہے۔توریہ کے معنی ہیں:بات اس طرح کہنا کہ حقیقت مخفی رہے۔آپ نے بھی کذب بیان سے بچتے ہوئے مقصد کو چھپایا ہے۔جیسے سفرِ ہجرت میں نبی ﷺ کا گذر ایک قبیلہ پر ہوا۔وہ قبیلہ انعام کی لالچ میں آپؐ کی تلاش میں تھا۔ان میں سے ایک شخص حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کو پہچانتا تھا۔اس نے دریافت کیا:ابوبکر!تمہارے ساتھ یہ کون ہے؟ آپؓ نے جواب دیا: رَجُلٌ يَّهْدِيْنِيْ السَّبِيْلَ: ایک شخص ہے جو مجھے راستہ دکھاتا ہے۔وہ شخص یہ سمجھا کہ یہ ابوبکر کا گائیڈ ہے۔جبکہ آپؓ کی مراد یہ تھی کہ یہ ہمارے نبی ہیں ـــــ اسی طرح ایک ایسی مجلس میں جس میں شیعہ سنی جمع تھے،کسی نے امام ابن جوزی سے پوچھا:ابوبکر افضل ہیں یا علی؟ آپ نے جواب دیا: أَفْضَلُ الصَّحَابَةِ مَنْ كَانَ بِنْتُهُ فِيْ بَيْتِهِ: صحابہ میں سب سے افضل وہ ہیں جن کی بیٹی ان کے گھر میں تھی۔سنّی اس کا مطلب یہ سمجھے کہ حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ افضل ہیں۔کیونکہ آپ کی بیٹی حضرت عائشہؓ آنحضور ﷺ کے گھر میں تھیں۔اور شیعہ یہ سمجھے کہ حضرت علی رضی اللہ عنہ افضل ہیں۔کیونکہ آپ ﷺ کی بیٹی حضرت فاطمہؓ حضرت علیؓ کے گھر میں تھیں ـــــ غرض اس طرح کا ذو معنی کلام اصطلاح میں توریہ کہلاتا ہے،جھوٹ نہیں کہلاتا۔

ابراہیم علیہ السلام کے اس گول مول جواب نے لوگوں کے لئے لمحۂ فکریہ پیدا کیا ـــــ پس وہ لوگ اپنے جی میں سوچنے لگے،پھر انھوں نے (اپنے دل میں) کہا:''بیشک تم ہی ناحق پر ہو!'' ـــــ یعنی سوچنے کے بعد دل میں تو قائل ہوگئے کہ بیشک غلطی پر ہم ہی ہیں،جو ان بے زبان پتھروں کو پوجتے ہیں۔مگر بات بھی بنانی تھی چنانچہ ـــــ پھر انھوں نے شرمندگی سے سر جھکا لئے ـــــ حضرت ابراہیم علیہ السلام سے آنکھیں ملانے کی ان میں ہمت نہ رہی،اور سرنگوں ہوکر کہا: ـــــ ابراہیم!تم جانتے ہو کہ یہ کچھ بولتے نہیں! ـــــ یعنی ہمیں کیوں شرمندہ کرتے ہو۔جان بوجھ کر ایسی ناممکن بات کا مطالبہ کرتے ہو۔پتھر بھی کہیں بولے ہیں؟! ـــــ یہی وہ اعتراف تھا جو ابراہیم علیہ السلام ان سے کرانا چاہتے تھے۔

آپ نے کہا:''تو کیا تم اللہ تعالیٰ سے کم درجہ میں ایسے بتوں کو پوجتے ہو جو نہ تمہیں نفع پہنچا سکتے ہیں نہ نقصان؟ تُف ہے تم پر اور ان پر جن کو تم اللہ تعالیٰ سے وَرے پوجتے ہو! کیا تمہارے اندر سمجھ نہیں؟!'' ـــــ یعنی پھر تمہیں

ڈوب مرنا چاہئے۔ جو مورتیاں ایک لفظ نہیں بول سکتیں، آڑے وقت کام نہیں آسکتیں، نہ کسی کے بھلے برے کا اختیار رکھتی ہیں، ان کو خدائی کا درجہ دینا محض بے عقلی نہیں تو اور کیا ہے؟!

حضرت ابراہیم علیہ السلام کی اس دوٹوک گفتگو سے لوگوں نے جان لیا کہ بتوں کو آپ ہی نے توڑا ہے۔ چنانچہ آپ کا مقدمہ بادشاہِ وقت نمرود کے سامنے لے جایا گیا۔ پہلے تو خود نمرود سے آپ کا مناظرہ ہوا۔ جس کا تذکرہ سورۃ البقرۃ (آیت ۲۵۸) میں گذر چکا ہے۔ آپ نے اس کو لاجواب کردیا۔ مگر وہ غیظ وغضب سے بھر گیا۔ اور بادشاہ سے رعایا تک سب نے متفقہ فیصلہ کرلیا کہ دیوتاؤں کی توہین اور باپ دادا کے دین کی مخالفت میں ابراہیم کو دہکتی آگ میں جلادینا چاہئے، چنانچہ —— انھوں نے کہا: ''اس کو جلادو اور اپنے معبودوں کی مدد کرو، اگر تمہیں کچھ کرنا ہے!'' —— یعنی ابراہیم کو عبرتناک سزادو۔ معمولی سزادے کر چھوڑ نہ دو۔ تاکہ آئندہ کوئی ایسی جرأت نہ کرے۔ اور اگر تم ایسا نہ کرسکے تو تم نے کچھ بھی نہ کیا۔

مشورہ کے مطابق حضرت ابراہیم علیہ السلام کو آگ میں جلانے کی تیاری شروع ہوئی۔ نمرود کے حکم سے سوختہ جمع کیا گیا۔ اور لکڑیوں کا انبار لگادیا گیا، پھر کئی دن تک اس کو دہکایا گیا۔ آخر ظالموں نے نہایت بے رحمی کے ساتھ حضرت ابراہیم علیہ السلام کو بھڑکتی آگ کی نذر کردیا —— ہم نے کہا: ''اے آگ! ابراہیم کے لئے ٹھنڈی اور بے گزند ہوجا!'' —— یعنی آگ کو اللہ تعالیٰ کا تکوینی حکم پہنچا کہ ٹھنڈی پڑجا، مگر اس قدر ٹھنڈی نہ ہوجا کہ برودت سے ابراہیم کو تکلیف پہنچے۔ معتدل ٹھنڈی ہو جو جسم وجان کو خوشگوار معلوم ہو۔

آگ کا حضرت ابراہیم علیہ السلام کے لئے ٹھنڈا ہونا ایک معجزہ تھا۔ اور معجزہ کی حقیقت یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ اپنی عام عادت کے خلاف سبب اور مسبب کے درمیان جدائی کردیتے ہیں، پس سبب پر مسبب مرتب نہیں ہوتا —— اور یہ واقعہ کوئی انوکھا واقعہ نہیں۔ روز ایسے واقعات رونما ہوتے رہتے ہیں۔ کسی گھر میں آگ لگتی ہے۔ سب جل کر بھسم ہوجاتے ہیں، اور ایک بچہ صحیح سالم نکل آتا ہے۔ اکسیڈنٹ ہوتے ہیں، سب کا چورا بن جاتا ہے، مگر ایک شخص صحیح سلامت بچ جاتا ہے۔ یہ نظام قدرت کی کرشمہ سازی ہے۔ جس کو خدا سلامت رکھے اسے کوئی نہیں مارسکتا۔ اور ایسی صورت میں عقل حیران رہ جاتی ہے کہ ایسا کیسے ہوگیا؟ —— جب اس طرح کا معاملہ انبیاء اور ان کے مخالفین کے درمیان پیش آتا ہے تو معجزہ کہلاتا ہے۔ اور اولیاء اور ان کے مخالفین کے درمیان پیش آتا ہے تو کرامت کہلاتا ہے۔ مروی ہے کہ حضرت ابومسلم خولانی رحمہ اللہ کو اسود عنسی نے اپنی نبوت کے انکار کی سزا میں دہکتی آگ میں ڈالا تھا مگر آگ نے آپ کو کچھ ضرر نہیں پہنچایا تھا (تہذیب التہذیب ۱۲: ۲۳۶)

اور انھوں نے آپ کے ساتھ بڑی چال چلنی چاہی، پس ہم نے ان کو ناکام کردیا ــــــ یعنی ان کا مقصود: ہلاکتِ ابراہیم تو حاصل نہ ہوا، الٹی ابراہیم علیہ السلام کی حقانیت روز روشن کی طرح واضح ہوگئی:

آج بھی ہو جو براہیم کا ایمان پیدا ❁ آگ کرسکتی ہے اندازِ گلستاں پیدا

وَنَجَّيْنٰهُ وَلُوْطًا اِلَى الْاَرْضِ الَّتِيْ بٰرَكْنَا فِيْهَا لِلْعٰلَمِيْنَ ﴿۷۱﴾ وَوَهَبْنَا لَهٗٓ اِسْحٰقَ ۭ وَيَعْقُوْبَ نَافِلَةً ۭ وَكُلًّا جَعَلْنَا صٰلِحِيْنَ ﴿۷۲﴾ وَجَعَلْنٰهُمْ اَىِٕمَّةً يَّهْدُوْنَ بِاَمْرِنَا وَاَوْحَيْنَآ اِلَيْهِمْ فِعْلَ الْخَيْرٰتِ وَاِقَامَ الصَّلٰوةِ وَاِيْتَاۗءَ الزَّكٰوةِ ۚ وَكَانُوْا لَنَا عٰبِدِيْنَ ﴿۷۳﴾ۙ وَلُوْطًا اٰتَيْنٰهُ حُكْمًا وَّعِلْمًا وَّنَجَّيْنٰهُ مِنَ الْقَرْيَةِ الَّتِيْ كَانَتْ تَّعْمَلُ الْخَبٰۗىِٕثَ ۭ اِنَّهُمْ كَانُوْا قَوْمَ سَوْءٍ فٰسِقِيْنَ ﴿۷۴﴾ۙ وَاَدْخَلْنٰهُ فِيْ رَحْمَتِنَا ۭ اِنَّهٗ مِنَ الصّٰلِحِيْنَ ﴿۷۵﴾ۧ

وَنَجَّيْنٰهُ	اور نجات بخشی ہم نے	لَهٗٓ	اس کو	يَّهْدُوْنَ	راہ دکھلاتے ہیں وہ
	اس کو	اِسْحٰقَ	اسحاقؑ	بِاَمْرِنَا	ہمارے حکم سے
وَلُوْطًا	اور لوطؑ کو	وَيَعْقُوْبَ	اور یعقوبؑ	وَاَوْحَيْنَآ	اور وحی بھیجی ہم نے
اِلَى الْاَرْضِ	اس زمین کی طرف	نَافِلَةً (۱)	مزید	اِلَيْهِمْ	ان کی طرف
الَّتِيْ	جو کہ	وَكُلًّا (۲)	اور سب کو	فِعْلَ	کرنے کی
بٰرَكْنَا	برکت فرمائی ہم نے	جَعَلْنَا	بنایا ہم نے	الْخَيْرٰتِ	نیک کام
فِيْهَا	اس میں	صٰلِحِيْنَ	نیک	وَاِقَامَ الصَّلٰوةِ	اور نماز کا اہتمام کرنے کی
لِلْعٰلَمِيْنَ	جہاں والوں کے لئے	وَجَعَلْنٰهُمْ	اور بنایا ہم نے ان کو	وَاِيْتَاۗءَ	اور ادا کرنے کی
وَوَهَبْنَا	اور عطا کیا ہم نے	اَىِٕمَّةً	پیشوا	الزَّكٰوةِ	زکات

(۱) نافلة: مزید، عطیہ: مصدر ہے، جیسے عاقبة، عافية وغیرہ۔ اور ترکیب میں وهبنا کا مفعول مطلق ہے۔ (۲) كلًّا: جعلنا کا مفعول مقدم ہے۔

وَكَانُوْا	اور تھے وہ	وَ نَجَّيْنٰهُ	اور نجات دی ہم نے اسکو	قَوْمَ	لوگ
لَنَا	ہمارے لئے	مِنَ الْقَرْيَةِ	اس بستی سے	سَوْءٍ	برے
عٰبِدِيْنَ	عبادت کرنے والے	الَّتِيْ	جو	فٰسِقِيْنَ	بدکار
وَ لُوْطًا[1]	اور لوطؑ کو	كَانَتْ تَّعْمَلُ	کیا کرتی تھی	وَاَدْخَلْنٰهُ	اور داخل کیا ہم نے اسکو
اٰتَيْنٰهُ	دی ہم نے اس کو	الْخَبٰٓئِثَ	گندے کام	فِيْ رَحْمَتِنَا	ہماری مہربانی میں
حُكْمًا	دانش مندی	اِنَّهُمْ	بیشک وہ	اِنَّهٗ	بیشک وہ
وَّعِلْمًا	اور علم	كَانُوْا	تھے	مِنَ الصّٰلِحِيْنَ	نیکوں میں سے تھا

حضرت ابراہیم علیہ السلام نے اپنے باپ آزر کو سمجھالیا۔قوم کو حق کی روشنی دکھادی،نمرود پر حجت تام کردی۔مگر کسی نے بھی رشد وہدایت قبول نہ کی،تو آپ نے ہجرت (ترکِ وطن) کا فیصلہ کرلیا۔تا کہ دوسری جگہ جا کر پیغامِ حق سنا سکیں۔چنانچہ آپ نے اہلیہ محترمہ حضرت سارۃ رضی اللہ عنہا اور بھتیجے حضرت لوط علیہ السلام کے ساتھ ہجرت کی۔اور مختلف مقامات پر ٹھہرتے ہوئے آخر میں فلسطین پہنچ گئے۔اور باقی زندگی وہیں گذاری۔ارشاد ہے: ـــــ اور ہم نے ان کو اور لوط کو اس سرزمین کی طرف نجات بخشی،جس میں ہم نے دنیا جہاں والوں کے لئے برکت فرمائی ہے ـــــ مراد ارضِ فلسطین ہے۔جو ملک شام کا حصہ ہے۔وہاں کی آب وہوا خوشگوار اور صحت بخش ہے۔اور زمین سرسبز وشاداب ہے ـــــ اور ہم نے ان کو اسحاق عطا فرمایا اور یعقوب مزید! ـــــ یعنی انھوں نے صرف بیٹا مانگا تھا ہم نے پوتا بھی دیا ـــــ اور ہم نے سب کو نیک بنایا ـــــ یعنی حضرات ابراہیم،لوط،اسحاق اور یعقوب علیہم السلام سب اعلی درجہ کے نیک بندے تھے۔کیونکہ سب انبیاء تھے۔اور انبیاء سے بڑھ کر نیک کون ہوسکتا ہے؟ ـــــ اس تصریح کی ضرورت اس لئے پڑی کہ اہلِ کتاب نے اپنی کتاب میں ان مقدس حضرات پر گندے گندے الزامات لگا رکھے ہیں۔قرآن کریم ان سب سے ان حضرات کی براءت ظاہر کرتا ہے ـــــ اور ہم نے ان کو پیشوا بنایا جو ہمارے حکم سے راہ دکھاتے تھے ـــــ یعنی وہ اعلی درجہ کے صالح انسان ہونے کے ساتھ اعلی درجہ کے مصلح بھی تھے۔لوگوں کی دینی راہ نمائی ان کی زندگی کا مشن تھا ـــــ اور ہم نے ان کی طرف نیک کام کرنے کی اور نماز کا اہتمام کرنے کی اور زکات ادا کرنے کی وحی بھیجی ـــــ تا کہ وہ یہ احکام اپنی امت کو پہنچائیں۔اور ان میں سے جو احکام ان سے بھی متعلق ہیں اُن پر خود بھی عمل کریں ـــــ اور وہ ہماری ہی عبادت کرنے والے تھے ـــــ یعنی

(۱) لوطاً: فعل محذوف کی وجہ سے منصوب ہے،جس کی تفسیر آئندہ کرتا ہے۔

وہ بس ہماری ہی عبادت کرتے تھے۔شب وروز اسی میں لگے رہتے تھے۔یہی انبیاء اور مؤمنین کی شان ہوتی ہے۔وہ اللہ کی عبادت سے کبھی غافل نہیں ہوتے، نہ کسی کو اللہ کی بندگی میں حصہ دار بناتے ہیں۔

لوط علیہ السلام کا ذکر: لوط علیہ السلام کے تذکرہ میں بھی وہی نجات کا پہلو ملحوظ ہے۔اللہ تعالیٰ نے ان کو گندے لوگوں کے نرغے سے نکالا تھا۔اسی طرح اللہ تعالیٰ نبی ﷺ کو اور مسلمانوں کو مکہ کے چیرہ دستوں کے ظلم وستم سے نجات بخشیں گے۔ارشاد ہے: ـــــ **اور ہم نے لوطؑ کو حکمت اور علم عطا فرمایا** ـــــ حکمت کے معنی ہیں: دانشمندی۔یعنی چیزوں کی حقیقت معلوم کرنے کی صلاحیت،حق بات کو دریافت کرنے کی قابلیت۔اور علم کے معنی ہیں: جاننا یعنی جہالت کے بعد کسی کے بتانے سے پہچاننا۔پس حکمت: فطری صلاحیت اور خداداد قابلیت کا نام ہے[1] اور علم سے مراد: علم نبوت ہے۔اللہ تعالیٰ نے حضرت لوط علیہ السلام کو دانشمندی یعنی فطری صلاحیت بھی عطا فرمائی تھی اور علم نبوت بھی۔تمام انبیاء علیہم السلام فطری صلاحیتوں میں بھی اعلیٰ درجہ پر فائز ہوتے ہیں۔اور وحی سے بھی ان کو علم دیا جاتا ہے ـــــ **اور ہم نے ان کو اس بستی سے نجات دی جو نہایت گندے کام کیا کرتی تھی،وہ لوگ یقیناً برے بدکار تھے** ـــــ حضرت لوط علیہ السلام سَدُوم اور عَمُورہ کی طرف مبعوث کئے گئے تھے۔یہ بستیاں اردن کی اس جانب میں واقع تھیں جہاں اب بحرمیّت یا بحر لوط ہے۔یہ مقام شروع میں سمندر نہیں تھا۔بلکہ قوم لوط پر جب عذاب آیا،اور اس سرزمین کا تختہ اُلٹ دیا گیا،تب یہ زمین تقریباً چار سو میٹر سطح سمندر سے نیچے چلی گئی۔اور پانی ابھر آیا ـــــ یہاں کے باشندے فواحش میں مبتلا تھے۔دنیا کی کوئی برائی ایسی نہ تھی جو ان میں موجود نہ ہو۔حضرت حسن بصری رحمہ اللہ سے مرسل روایت ہے کہ اس قوم میں علاوہ ان کی مشہور خباثت کے شراب خوری،گانا بجانا،ڈاڑھی کٹانا،مونچھیں بڑھانا، کبوتر بازی،ڈھیلے پھینکنا،سیٹی بجانا،اور ریشمی لباس پہننے کا رواج تھا(روح) ـــــ لوط علیہ السلام نے ان کو ہر طرح سمجھایا،مگر ان پر مطلق اثر نہ ہوا،وہ اپنی بداخلاقیوں اور بداعمالیوں پر بدستور قائم رہے،آخر اللہ تعالیٰ کے عذاب کا وقت آگیا۔فرشتے ان بستیوں کو تلپٹ کرنے کے لئے آپہنچے۔ان کے اشارے پر حضرت لوط علیہ السلام اپنے خاندان سمیت ـــــ علاوہ کافر بیوی کے ـــــ بستی سے نکل گئے۔جب آخر شب ہوئی تو اول ایک خوفناک آواز نے سدوم والوں کو تہ وبالا کردیا۔پھر پوری آبادی کا تختہ الٹ دیا گیا۔اور وہ لوگ حرفِ غلط کی طرح صفحۂ ہستی سے مٹادیئے گئے۔ان کا نام ونشان تک باقی نہ رہا ـــــ **اور ہم نے لوطؑ کو اپنی مہربانی میں داخل کیا۔بیشک وہ نیک لوگوں میں**

---

(۱) سورۃ لقمان (آیت ۱۲) میں ہے: ہم نے لقمان کو حکمت (دانش مندی) عطا فرمائی۔یعنی فطری صلاحیت بخشی۔کیونکہ حضرت لقمان نبی نہیں تھے ۱۲

سے تھے! ـــــــ یہود نے حضرت لوط علیہ السلام پر حرام کاری، شہوت پرستی اور شراب خوری کے الزامات لگائے ہیں، تورات تک میں ان کی زندگی کو شرمناک جرائم سے داغدار دکھایا ہے۔ اس لئے قرآن کریم نے صراحت کی کہ جب ہم نے ان کی قوم پر عذاب بھیجا تو لوط علیہ السلام کو اور ان کے خاندان کو اپنی مہربانی اور رحمت کی چادر میں ڈھانپ لیا۔ کیونکہ وہ نیکوکاروں میں سے تھے۔ اور ایسے حضرات عذاب سے بچالئے جاتے ہیں۔

بائبل نے حضرت لوط علیہ السلام پر وہ گھناؤنے الزام لگائے ہیں کہ قلم لکھنے سے تھراتا ہے۔
قرآن پاک نے ان کی زندگی کو بے داغ بتایا

وَ نُوۡحًا اِذۡ نَادٰی مِنۡ قَبۡلُ فَاسۡتَجَبۡنَا لَهٗ فَنَجَّيۡنٰهُ وَ اَهۡلَهٗ مِنَ الۡكَرۡبِ الۡعَظِيۡمِ ﴿۷۶﴾ وَ نَصَرۡنٰهُ مِنَ الۡقَوۡمِ الَّذِيۡنَ كَذَّبُوۡا بِاٰيٰتِنَا ؕ اِنَّهُمۡ كَانُوۡا قَوۡمَ سَوۡءٍ فَاَغۡرَقۡنٰهُمۡ اَجۡمَعِيۡنَ ﴿۷۷﴾

وَ نُوۡحًا [1]	اور (ذکر کیجئے) نوحؑ کا	وَ اَهۡلَهٗ	اور اسکے گھر والوں کو	بِاٰيٰتِنَا	ہماری آیتوں کو
اِذۡ	جب	مِنَ الۡكَرۡبِ	بے چینی سے	اِنَّهُمۡ	بیشک وہ
نَادٰی	پکارا اس نے	الۡعَظِيۡمِ	بہت بڑی	كَانُوۡا	تھے
مِنۡ قَبۡلُ	قبل ازیں	وَ نَصَرۡنٰهُ [2]	اور ہم نے ان کی مدد کی	قَوۡمَ سَوۡءٍ	برے لوگ
فَاسۡتَجَبۡنَا	پس دعا قبول کی ہم نے	مِنَ الۡقَوۡمِ [3]	ایسے لوگوں کے خلاف	فَاَغۡرَقۡنٰهُمۡ	پس غرق کر دیا ہم نے
لَهٗ	اس کے لئے	الَّذِيۡنَ	جنھوں نے		ان کو
فَنَجَّيۡنٰهُ	پس نجات بخشی ہم نے اسکو	كَذَّبُوۡا	جھٹلایا	اَجۡمَعِيۡنَ	سبھی کو

نوح علیہ السلام کا ذکر: ـــــــ اور (آپؐ) نوحؑ کا (تذکرہ کیجئے) ـــــــ نوح علیہ السلام انسانوں کے دوسرے دادا ہیں۔ سب سے پہلے انہی کو رسالت سے نوازا گیا ہے۔ آپ کی بعثت ایسی قوم کی طرف ہوئی تھی جو توحید اور مذہبی روشنی سے یکسر نا آشنا تھی۔ نوح علیہ السلام نے قوم کو اللہ کی طرف دعوت دی۔ لیکن قوم نے ایک نہ سنی، چند

(۱) نوحاً کا ناصب اذکر محذوف ہے۔ (۲) نَصَرَ کا صلہ جب مِن آتا ہے تو اس کے معنی نجات دینے اور بدلہ لینے کے ہوتے ہیں۔ (۳) من بمعنی علی ہے۔

ضعیف اور بے سہارا لوگوں کے علاوہ کوئی ایمان نہ لایا۔ بلکہ رؤساء نے تکذیب وتحقیر کا اور اذیت رسانی کا کوئی ایسا حربہ نہ چھوڑا جسے استعمال نہ کیا ہو۔ جب آپ قوم کے ایمان سے قطعی مایوس ہو گئے، اور انتہائی زِچ ہو گئے تو دعاء کے لئے ہاتھ اٹھائے کہ ''خدایا! میں مجبور ہو گیا ہوں، آپ میری مدد فرمائیں!'' (القمر آیت ۱۰) چنانچہ اللہ کی رحمت متوجہ ہوئی، اور قوم پر عذاب پانی کی شکل میں نمودار ہوا۔ اللہ تعالیٰ نے پہلے ہی نوح علیہ السلام کو حکم دیا تھا کہ وہ کشتی بنالیں، تا کہ اللہ تعالیٰ اسبابِ ظاہری کے اعتبار سے اس کے ذریعہ نوح علیہ السلام اور ان کے متعلقین کو ڈوبنے سے بچالیں۔

ارشاد ہے ——— جب انھوں نے اس سے پہلے ——— یعنی ابراہیم اور لوط علیہما السلام سے بھی پہلے ——— پکارا، تو ہم نے ان کے (فائدہ کے) لئے دعا قبول کی، پس ہم نے ان کو اور ان کے متعلقین کو سخت بے چینی سے نجات بخشی ——— یہ سخت بے چینی اور پریشانی قوم کی مخالفت سے لاحق تھی، ویسی ہی جیسی نبی ﷺ کو اور مسلمانوں کو مکہ والوں کی ستم ظریفی سے لاحق تھی ——— اور ہم نے ان کی ایسے لوگوں کے مقابلہ میں مدد کی جنھوں نے ہماری آیتوں کو جھٹلایا ——— جس طرح مکہ والے جھٹلا رہے ہیں ——— وہ یقیناً برے لوگ تھے ——— یہی حال مکہ والوں کا بھی تھا ——— پس ہم نے ان سب ہی کو غرق کر دیا ——— پس مکہ والے بھی اپنا انجام سوچ لیں۔

ظلم کی چکّی ہمیشہ نہیں چلتی، ایک دن آتا ہے کہ اللہ تعالیٰ مظلوموں کی مدد کرتے ہیں، اور ان کو ظالموں کے نرغے سے نکالتے ہیں۔

وَدَاوٗدَ وَسُلَيْمٰنَ اِذْ يَحْكُمٰنِ فِي الْحَرْثِ اِذْ نَفَشَتْ فِيْهِ غَنَمُ الْقَوْمِ ۚ وَكُنَّا لِحُكْمِهِمْ شٰهِدِيْنَ ﴿٧٨﴾ فَفَهَّمْنٰهَا سُلَيْمٰنَ ۚ وَكُلًّا اٰتَيْنَا حُكْمًا وَّعِلْمًا ۫ وَّسَخَّرْنَا مَعَ دَاوٗدَ الْجِبَالَ يُسَبِّحْنَ وَالطَّيْرَ ۭ وَكُنَّا فٰعِلِيْنَ ﴿٧٩﴾ وَعَلَّمْنٰهُ صَنْعَةَ لَبُوْسٍ لَّكُمْ لِتُحْصِنَكُمْ مِّنْۢ بَاْسِكُمْ ۚ فَهَلْ اَنْتُمْ شٰكِرُوْنَ ﴿٨٠﴾ وَلِسُلَيْمٰنَ الرِّيْحَ عَاصِفَةً تَجْرِيْ بِاَمْرِهٖٓ اِلَى الْاَرْضِ الَّتِيْ بٰرَكْنَا فِيْهَا ۭ وَكُنَّا بِكُلِّ شَيْءٍ عٰلِمِيْنَ ﴿٨١﴾ وَمِنَ الشَّيٰطِيْنِ مَنْ يَّغُوْصُوْنَ لَهٗ وَيَعْمَلُوْنَ عَمَلًا دُوْنَ ذٰلِكَ ۚ وَكُنَّا لَهُمْ حٰفِظِيْنَ ﴿٨٢﴾

وَدَاوٗدَ[1]	اور (ذکر کیجئے) داؤد کا	وَسُلَيْمٰنَ	اور سلیمان کا	اِذْ	جب

(۱) داؤد کا ناصب اذکر محذوف ہے۔

يَحْكُمٰنِ	فیصلہ کررہے ہیں دونوں	الْجِبَالَ	پہاڑوں کو	بِاَمْرِهٖٓ	ان کے حکم سے
فِی الْحَرْثِ	کھیت کے بارے میں	يُسَبِّحْنَ (۲)	تسبیح کرتے ہیں وہ	اِلَى الْاَرْضِ	اس زمین کی طرف
اِذْ	جب	وَالطَّيْرَ (۳)	اور پرندوں کو	الَّتِیْ	جو کہ
نَفَشَتْ (۱)	رات کے وقت جا پڑیں	وَكُنَّا	اور تھے ہم	بٰرَكْنَا	برکت فرمائی ہم نے
فِيْهِ	اس میں	فٰعِلِيْنَ	کرنے والے	فِيْهَا	اس میں
غَنَمُ	بکریاں	وَعَلَّمْنٰهُ	اور سکھلائی ہم نے انکو	وَكُنَّا	اور تھے ہم
الْقَوْمِ	لوگوں کی	صَنْعَةَ	کاریگری	بِكُلِّ شَیْءٍ	ہر چیز کو
وَكُنَّا	اور تھے ہم	لَبُوْسٍ (۴)	لباس کی	عٰلِمِيْنَ	جاننے والے
لِحُكْمِهِمْ	ان کے فیصلہ کو	لَّكُمْ	تمہارے فائدہ کیلئے	وَمِنَ (۸)	اور (تابع کیا) شیاطین
شٰهِدِيْنَ	دیکھنے والے	لِتُحْصِنَكُمْ	تاکہ بچائے وہ کاریگری	الشَّيٰطِيْنِ	سے
فَفَهَّمْنٰهَا	پس سمجھ دی ہم نے		تم کو	مَنْ	(ان کو) جو
	فیصلہ کی	مِّنْۢ بَاْسِكُمْ	تمہاری جنگ سے	يَّغُوْصُوْنَ	غوطہ لگاتے ہیں
سُلَيْمٰنَ	سلیمان کو	فَهَلْ اَنْتُمْ	پس کیا تم	لَهٗ	ان کے فائدہ کے لئے
وَكُلًّا	اور ہر ایک کو	شٰكِرُوْنَ	شکر بجالانے والے ہو؟	وَيَعْمَلُوْنَ	اور کرتے ہیں وہ
اٰتَيْنَا	عطا فرمائی ہم نے	وَلِسُلَيْمٰنَ (۵)	اور (تابع کیا) سلیمان	عَمَلًا	کام
حُكْمًا	دانش مندی		کے لئے	دُوْنَ ذٰلِكَ	اس سے کم تر
وَّعِلْمًا	اور علم (نبوت)	الرِّيْحَ	ہوا کو	وَكُنَّا	اور تھے ہم
وَّسَخَّرْنَا	اور تابع کیا ہم نے	عَاصِفَةً (۶)	زور سے چلنے والی	لَهُمْ	ان کی
مَعَ دَاوٗدَ	داؤد کے ساتھ	تَجْرِیْ (۷)	چلتی ہے وہ	حٰفِظِيْنَ	حفاظت کرنے والے

(۱) نَفَشَ (ن) الْقُطْنُ: روئی کا دھنکنے سے بکھرنا۔ نَفَشَتِ الْماشيةُ فی المَرْعٰی: مویشیوں کا رات کو چراگاہ میں گھوم کر گھاس چرنا (۲) جملہ يُسَبِّحْنَ: الجبال کا حال ہے (۳) الطیر کا الجبال پر عطف ہے (۴) اللَّبُوْس: اللباس (۵) لسلیمن کا عطف مع داؤد پر ہے (۶) عاصفة: الریح کا حال ہے۔ عَصَفَت (ض) الریحُ: ہوا کا تیز چلنا، آندھی طوفان آنا۔ (۷) جملہ تجری: یا تو دوسرا حال ہے، یا پہلے حال سے بدل ہے۔ (۸) من الشیطین سے پہلے سَخَّرْنَا له پوشیدہ ہے، اور من تبعیضیہ ہے۔

داؤد وسلیمان علیہما السلام کا ذکر: اب ایسے دونبیوں کا اوران کے ظاہری کمالات کا تذکرہ کیا جاتا ہے جس میں اشارہ ہے کہ ہجرت کے بعد اللہ تعالیٰ اپنے اس پیغمبر کو بھی حکومت وسطوت عنایت فرمائیں گے۔ نبوت وخلافت میں منافات نہیں۔ سب سے پہلے انسان اور سب سے پہلے نبی حضرت آدم علیہ السلام کو خلافت سے بھی سرفراز کیا جاچکا ہے۔ بعد میں بھی جن انبیاء کے لئے حالات سازگار ہوئے: وہ خلیفہ بنائے گئے۔ جیسے داؤد وسلیمان علیہما السلام۔

ارشاد ہے: ـــــ اور (آپؐ) داؤد وسلیمان (علیہما السلام) کا (تذکرہ کیجئے) ـــــ داؤد علیہ السلام: مشہور جلیل القدر رسول ہیں۔ ان پر زبور نازل ہوئی ہے۔ آپ ابراہیم علیہ السلام اور یعقوب علیہ السلام کی ذریت سے ہیں۔ حق تعالیٰ نے آپ کو دو عظیم نعمتوں سے سرفراز کیا تھا: ایک: نبی ہونا۔ دوسری: صاحبِ تاج وتخت ہونا۔ قرآن کریم (سورۂ ص آیت ۲۶) میں آپ کو ''خلیفہ'' کہا گیا ہے۔ اور یہ لقب آدم علیہ السلام کے بعد آپ ہی کے لئے استعمال کیا گیا ہے۔

اور سلیمان علیہ السلام بھی جلیل القدر پیغمبر ہیں۔ حضرت داؤد علیہ السلام کے فرزند ارجمند تھے۔ ان کی وفات کے بعد ان کے جانشین ہوئے ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے آپ کے لئے بھی نبوت وحکومت کو جمع فرمایا تھا۔ اور ایسی بادشاہت عطا فرمائی تھی جو اگلوں پچھلوں میں سے کسی کو نصیب نہیں ہوئی۔ جن وانس، چرند وپرند اور ہوا تک آپ کے لئے مسخر کئے گئے تھے۔ آپ جانوروں کی بولیاں بھی جانتے تھے۔ چیونٹی تک کی بات سمجھ لیتے تھے۔ اور فصلِ خصومات میں اصابتِ رائے کا ملکہ بچپن ہی سے آپ کو عطا ہوا تھا۔ صحیح بخاری میں حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ دو عورتیں: جن کے ساتھ ان کے دو بیٹے تھے، بھیڑیا ان میں سے ایک کو لے اڑا۔ ہر ایک دوسری سے کہنے لگی: ''تیرا بچہ لے گیا!'' دونوں داؤد علیہ السلام کے پاس فیصلہ کے لئے پہنچیں۔ آپ نے بڑی کے حق میں فیصلہ کیا۔ پھر وہ حضرت سلیمان علیہ السلام کے پاس آئیں۔ آپ نے فرمایا: ''چھری لاؤ میں یہ لڑکا کاٹ کر دونوں کو دیدوں!'' چھوٹی بولی: ''خدارا ایسا نہ کیجئے۔ یہ اسی کا بچہ ہے!'' چنانچہ آپ نے چھوٹی کے حق میں فیصلہ فرمایا (بخاری حدیث ۳۴۲۷ کتاب الانبیاء، تذکرہ سلیمان علیہ السلام)

اِن آیات میں اللہ تعالیٰ نے داؤد وسلیمان علیہما السلام کے احوال میں سے پانچ باتیں ذکر کی ہیں، جو ان کے حاکم، صاحبِ اقتدار اور بڑے صاحبِ کمال ہونے پر دلالت کرتی ہیں۔

پہلی بات: ـــــ (یاد کرو) جب وہ کھیت کے بارے میں فیصلہ کررہے تھے۔ جب رات کے وقت اس میں ایک قوم کی بکریاں جا پڑی تھیں۔ اور ہم ان کے فیصلہ کو دیکھنے والے تھے۔ پس ہم نے سلیمان کو فیصلہ کی سمجھ دی، اور ہر ایک کو ہم نے دانش مندی اور علم عطا فرمایا ـــــ واقعہ اس طرح پیش آیا تھا کہ کچھ لوگوں کی بکریاں رات کے وقت

ایک شخص کے کھیت میں جا گھسیں، اور کھیت بالکل صاف کر دیا۔ اتفاق سے کھیت کا نقصان بکریوں کی لاگت کے برابر تھا۔ مقدمہ داؤد علیہ السلام کے پاس پہنچا، آپ نے فیصلہ کیا کہ کھیت کے ضمان میں سب بکریاں کھیت والے کو دیدی جائیں۔ یہ فیصلہ اصول کے مطابق تھا۔ جب دونوں عدالت سے نکلے تو حضرت سلیمان علیہ السلام سے ملاقات ہوئی۔ آپ نے صورتِ حال دریافت کی، انھوں نے واقعہ اور حضرت داؤد علیہ السلام کا فیصلہ بتایا۔ حضرت سلیمان نے فرمایا: ''اگر تم چاہو تو میں اس سے بہتر فیصلہ کروں؟'' دونوں رضامند ہو گئے۔ آپ نے فیصلہ کیا کہ بکریاں کھیت والے کے حوالے کر دی جائیں، وہ ان کی خدمت کرے اور دودھ اور اُون سے فائدہ اٹھائے۔ اور کھیت بکری والوں کے حوالے کیا جائے۔ وہ اس کی پرداخت کریں۔ اور جب کھیت سابقہ حالت پر آجائے تو کھیت: کھیت والے کو لوٹا دیا جائے، اور بکریاں: بکری والوں کو۔ چونکہ یہ فیصلہ فریقین کے حق میں مفید تھا، اس لئے دونوں فریق اس پر رضامند ہو گئے۔ یہ باہمی مصالحت کی صورت تھی۔

اس واقعہ سے تین باتیں ہر شخص معلوم کر سکتا ہے: ایک: یہ کہ دونوں حضرات صاحبِ اقتدار تھے۔ کیونکہ فیصلے حکام ہی کیا کرتے ہیں۔ دوسری: یہ کہ خداداد صلاحیت میں لوگوں کے درجات متفاوت ہوتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے دونوں حضرات کو حکمت عطا فرمائی تھی، مگر سلیمان علیہ السلام کا پایہ بڑھا ہوا تھا۔ ''ہم نے سلیمان کو فیصلہ کی سمجھ دی'': کا یہی مطلب ہے۔ چنانچہ حضرت سلیمان علیہ السلام کی حکومت کی شان ہی نرالی تھی۔ تیسری: یہ کہ فطری صلاحیت کی کمی نقص بالکل نہیں۔ ''ہم نے ہر ایک کو دانشمندی اور علم عطا فرمایا'' سے اسی بات کی طرف اشارہ کیا گیا ہے۔ حکمت سے مراد فطری استعداد ہے، اور علم سے مراد علم نبوت ہے۔ پس کوئی داؤد علیہ السلام کی شان میں کسی کمی کا خیال دل میں نہ لائے۔ دونوں ہی فرزانے اور جلیل القدر پیغمبر تھے۔

دوسری بات: —— اور ہم نے داؤدؑ کے ساتھ پہاڑوں اور پرندوں کو حکم دے رکھا تھا جو تسبیح کرتے تھے، اور ہم ہی کرنے والے تھے —— یہ آپ کے ظاہری کمالات میں سے ایک کمال تھا۔ اللہ تعالیٰ نے آپ کو سریلی آواز عنایت فرمائی تھی۔ آپ بے انتہا خوش آواز تھے۔ لحنِ داؤدی آج بھی مشہور ہے۔ اس پر پیغمبرانہ تاثیر الگ تھی۔ چنانچہ حالت یہ ہوتی تھی کہ جب آپ حمد و تسبیح شروع کرتے تو چرند و پرند اور شجر و حجر آپ کے ہم آواز ہو کر ذکر میں مشغول ہو جاتے تھے۔ ایسا اللہ تعالیٰ کی تسخیر سے ہوتا تھا۔ ''ہم ہی کرنے والے تھے'' کا یہی مطلب ہے۔

فائدہ: تلاوت میں حُسنِ صوت اور اچھا لہجہ مطلوب ہے۔ قرآن کو سنوار کر تجوید سے پڑھنا پسندیدہ ہے۔ صحابہ میں حضرت ابو موسیٰ اشعری رضی اللہ عنہ بہت خوش آواز تھے۔ ایک بار قرآن پڑھ رہے تھے۔ رسول اللہ ﷺ کا ان

کے پاس سے گذر ہوا، آپؐ ٹھہر گئے اور ان کا قرآن سننے لگے۔ صبح آپؐ نے فرمایا: ''اے ابوموسیٰ! تم داؤد علیہ السلام کے راگوں میں سے ایک راگ دیئے گئے ہو'' (بخاری حدیث نمبر ۵۰۴۸) حضرت ابوموسیٰ نے عرض کیا: اگر مجھے معلوم ہوتا کہ آپؐ میرا قرآن سن رہے ہیں تو میں اور سنوار کر پڑھتا (ابن کثیر)

تیسری بات: —— اور ہم نے ان کو تمہارے لئے ایک ملبوس کی صنعت سکھلائی، تاکہ وہ تم کو دشمن کی زد سے بچائے، پس کیا تم شکر بجالاؤ گے؟ —— ملبوس سے مراد آہنی زِرہ ہے۔ جو جنگ میں حفاظت کے لئے پہنی جاتی ہے۔ اللہ تعالیٰ نے داؤد علیہ السلام کے لئے لوہے کو موم کر دیا تھا۔ وہ اس کو موڑ کر نہایت ہلکی اور مضبوط زِرہیں تیار کرتے تھے۔ سوچو یہ صنعت انسانوں کے لئے کس قدر مفید تھی۔ پس کیا لوگ اس کا شکر بجالائیں گے؟!

فائدہ: یہ صنعت داؤد علیہ السلام کے ساتھ دنیا سے رخصت نہیں ہوگئی۔ دنیا میں باقی رہی۔ لوگ اس کو برابر ترقی دیتے رہے۔ یہاں تک کہ آج فنونِ حرب کہیں سے کہیں پہنچ گئے۔ یہ سب اللہ تعالیٰ کے سکھلانے سے ہے۔ پس لوگوں کو اللہ تعالیٰ کی اس عظیم نعمت کا شکر گزار ہونا چاہئے۔ اور شکر گزاری میں یہ بات بھی داخل ہے کہ فنونِ حرب اور ہتھیاروں کو حرام اور لغو مقاصد کے لئے استعمال نہ کیا جائے۔ بندوق بہت کار آمد آلہ ہے، مگر کوئی اس کو اپنے بھائی پر چلانے لگے تو یہ نعمت کا کفران ہے —— نیز اس آیت سے یہ بات بھی ظاہر ہوئی کہ زِرہ سازی وغیرہ اسبابِ جہاد کی تیاری انبیاء کی سنت ہے۔ سورۃ الانفال (آیت ۶۰) میں اس کی فراہمی کا حکم دیا گیا ہے۔ افسوس! آج مسلمان نبیوں کی اس سنت سے بیگانہ اور غیروں کے دست نگر ہوگئے! یہ مسلمانوں کے حق میں ہرگز نیک فال نہیں۔

چوتھی بات: —— اور ہم نے سلیمانؑ کے لئے زور سے چلنے والی ہوا کو مسخر کیا، جو ان کے حکم سے اس سرزمین کی طرف چلتی تھی جس میں ہم نے برکت فرمائی ہے، اور ہم ہر چیز کو جاننے والے ہیں! —— برکت والی سرزمین سے مراد ارض شام یعنی بیت المقدس ہے۔ یہ حضرت سلیمان علیہ السلام کی جائے قیام تھی۔ جب آپ کہیں باہر جاتے تو وطن کی طرف ہوا کے ذریعہ واپس آتے۔ اسی طرح سورۃ صٓ (آیت ۳۶) میں صراحت ہے کہ آپ جہاں جانا چاہتے: ہوا لے جاتی۔ اللہ تعالیٰ نے ہوا کو آپ کے لئے مسخر کیا تھا۔ وہ زور سے چلتی اور آپ کے تخت کو اٹھا کر فضا میں لے جاتی، پھر نرم پڑ جاتی اور منزلِ مقصود تک پہنچا دیتی۔ آج ہوائی جہاز کے دور میں اس کو سمجھنا نہایت آسان ہے۔ اور یہ ارشاد کہ: ''ہم ہر چیز کو جاننے والے ہیں'' اس کا مطلب یہ ہے کہ کس کمال سے کس کو سرفراز کیا جائے۔ یہ بات اللہ بخوبی جانتے ہیں۔ جب سے دنیا قائم ہے ہوائی جہاز کی صنعت اللہ تعالیٰ نے لوگوں کو نہیں سکھلائی تھی، اب آخر زمانہ میں جا کر یہ کمال سکھلایا، اس کی مصلحت وہی بہتر جانتے ہیں۔

پانچویں بات: ـــــ اور ہم نے شیاطین کو (سلیمان کے لئے مسخر کیا) جو ان کے لئے سمندر میں غوطے لگاتے تھے، اور اس سے کم درجہ کے کام بھی کرتے تھے، اور ہم ان کی حفاظت کرنے والے تھے ـــــ شیطان کے معنی ہیں سرکش۔ خواہ انسان ہو یا جن۔ مگر اس آیت میں شیاطین سے مراد جنات ہیں۔ سورۂ سبا (آیت ۱۲) میں اس کی صراحت ہے۔ سلیمان علیہ السلام شیاطین سے سمندر میں غوطے لگواتے تھے، تاکہ وہ اس میں سے موتی مونگے نکالیں۔ اور دوسرے کام بھی کرواتے تھے۔ مثلاً بڑی بڑی عمارتیں بنانا، حوض جتنے بڑے لگن بنانا، اور اتنی بڑی دیگیں تیار کرانا جو ایک ہی جگہ جمی رہیں (سورہ سبا آیت ۱۳) اللہ تعالیٰ نے اپنی قدرت کاملہ سے جنات کو سلیمان علیہ السلام کے تابع کر دیا تھا۔ وہ جو چاہتے ان سے بیگار لیتے تھے۔ آج جو کام مشینری سے لئے جاتے ہیں: سلیمان علیہ السلام وہ کام شیاطین سے لیتے تھے۔ اور وہ کوئی ضرر آپ کو نہیں پہنچا سکتے تھے، کیونکہ ان پر کنٹرول اللہ کا تھا۔ ورنہ آدمی کی کیا بساط ہے کہ وہ ایسی مخلوق کو اپنے قبضہ میں کرلے، اور زنجیروں میں جکڑ کر رکھ چھوڑے؟!

یہود پر خدا کی مار! انھوں نے ان دونوں نبیوں کی سیرت بگاڑ رکھی ہے۔ داؤد علیہ السلام کی شان میں اُوْرِیا کی بیوی کو ہتھیانے کا واقعہ گھڑ رکھا ہے، اور سلیمان علیہ السلام کی نرالی حکومت کو جادو کا کرشمہ بتاتے ہیں، اور انگوٹھی کا قصہ گھڑ رکھا ہے۔

وَ اَیُّوْبَ اِذْ نَادٰی رَبَّهٗۤ اَنِّیْ مَسَّنِیَ الضُّرُّ وَ اَنْتَ اَرْحَمُ الرّٰحِمِیْنَ ﴿۸۳﴾ فَاسْتَجَبْنَا لَهٗ فَكَشَفْنَا مَا بِهٖ مِنْ ضُرٍّ وَّاٰتَیْنٰهُ اَهْلَهٗ وَمِثْلَهُمْ مَّعَهُمْ رَحْمَةً مِّنْ عِنْدِنَا وَ ذِكْرٰی لِلْعٰبِدِیْنَ ﴿۸۴﴾ وَاِسْمٰعِیْلَ وَ اِدْرِیْسَ وَ ذَا الْكِفْلِ ؕ كُلٌّ مِّنَ الصّٰبِرِیْنَ ﴿۸۵﴾ وَ اَدْخَلْنٰهُمْ فِیْ رَحْمَتِنَا ؕ اِنَّهُمْ مِّنَ الصّٰلِحِیْنَ ﴿۸۶﴾

وَ اَیُّوْبَ(۱)	اور ایوب کا	رَبَّهٗۤ	اپنے رب کو	الضُّرُّ	تکلیف نے
اِذْ	جب	اَنِّیْ	کہ مجھے	وَ اَنْتَ	اور آپ
نَادٰی	انھوں نے پکارا	مَسَّنِیَ	چھویا ہے	اَرْحَمُ	بڑی مہربانی کرنے والے ہیں

(۱) أیوب اور إسمعیل کا ناصب اذکر محذوف ہے۔

الرّٰحِمِيْنَ	سب مہربانوں میں	وَمِثْلَهُمْ	اوران کے مانند	وَاِدْرِيْسَ	اورادریس کا
فَاسْتَجَبْنَا	پس دعا قبول کی ہم نے	مَّعَهُمْ	ان کے ساتھ	وَذَا الْكِفْلِ (۳)	اورذوالکفل کا
لَهٗ	ان کے لئے	رَحْمَةً (۲)	مہربانی کے لئے	كُلٌّ	سب
فَكَشَفْنَا	پس دورکردی ہم نے	مِّنْ عِنْدِنَا	ہمارے پاس سے	مِّنَ الصّٰبِرِيْنَ	صبر کرنے والوں سے ہیں
مَا بِهٖ	جوتھی ان کو	وَذِكْرٰى (۲)	اورنصیحت کے لئے	وَاَدْخَلْنٰهُمْ	اورداخل کیا ہم نے انکو
مِنْ ضُرٍّ (۱)	تکلیف	لِلْعٰبِدِيْنَ	عبادت کرنے والوں	فِيْ رَحْمَتِنَا	اپنی رحمت میں
وَّاٰتَيْنٰهُ	اوردیا ہم نے ان کو		کے لئے	اِنَّهُمْ	بیشک وہ
اَهْلَهٗ	ان کا کنبہ	وَاِسْمٰعِيْلَ	اوراسماعیل کا	مِّنَ الصّٰلِحِيْنَ	نیکوکاروں میں سے ہیں

حضرت ایوب علیہ السلام کا تذکرہ: اس تذکرہ کا مقصد مسلمانوں کو صبر کی تلقین کرنا ہے۔ ان کو سمجھایا گیا ہے کہ وہ مکہ کے جانگداز حالات میں جی نہ چھوڑیں۔ ہمت باندھے رہیں۔ حالات ضرور بدلیں گے۔ تنگی کے بعد آسانی آئے گی۔ پریشانیاں خواہ ذاتی نوعیت کی ہوں یا دعوتی: آدمی کو کبھی بے صبر نہیں ہونا چاہئے۔ ہمت مرداں مددِ خدا!

——— اور (آپؐ) ایوبؑ کا (تذکرہ کیجئے) ——— ایوب علیہ السلام برگزیدہ نبی تھے۔ ان کا صبر وشکر مشہور ہے۔ آپ حضرت اسحاق علیہ السلام کے بڑے صاحبزادے عیسو (عیص) کی نسل سے ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے آپ کو ہر طرح سے آسودہ کیا تھا۔ کھیت، مواشی، نوکر چاکر، نیک اولاد، اور فرمانبردار بیوی عطا فرمائی تھی۔ لیکن مشیتِ خداوندی کہ آزمائش آئی۔ کھیت جل گئے، مویشی مرگئے، اولاد ساری ایک ساتھ دب کر مرگئی، دوست ناآشنا ہوگئے، بدن میں آبلے پڑگئے، بس ایک بیوی رفیقۂ حیات رہ گئی۔ آپ جیسے نعمت میں شاکر تھے بلاء میں بھی صابر رہے۔ لیکن جب تکالیف حد سے بڑھ گئیں تو آپ نے دعا کی ——— جب انھوں نے اپنے پروردگار کو پکارا کہ مجھے تکلیف نے چھولیا ہے، اور آپ ارحم الراحمین ہیں! ——— دعا کا انداز کتنا پیارا ہے۔ نہایت مختصر اور ہلکے انداز میں تکلیف کا ذکر کیا، اور بس یہ کہہ کر رہ گئے کہ ''الٰہی! آپ سب مہربانوں سے بڑے مہربان ہیں!'' نہ کوئی شکوہ شکایت نہ کوئی مطالبہ، مرضیِ مولیٰ از ہمہ اولیٰ! جیسے کوئی فاقہ مست کسی کریم النفس سے کہے: ''میں بھوکا ہوں اور آپ فیاض ہیں!'' تو اس میں سب

(۱) مِن: بیانیہ ما کا بیان ہے، اس لئے اس کا ترجمہ نہیں کیا گیا (۲) رحمة اور ذکری: مفعول لہٗ ہیں (۳) ذوالکفل: حصہ دار، ذو: والا کِفْل: حصہ، یہ اسم ہے مصدر نہیں، مصدر کاف کے زبر کے ساتھ آتا ہے۔ آپ نے حضرت اَلْیَسَع علیہ السلام کی جو اسرائیلی نبی ہیں زندگی میں قائم مقامی کی تھی، اس لئے آپ کا یہ لقب ہوگیا تھا، جسے ذوالنون (مچھلی والے) یونس علیہ السلام کا لقب ہوگیا ہے۔

کچھ آ گیا، ہمیں اس سے دعا کا ادب سیکھنا چاہئے ــــــ پس ہم نے ان کی دعا قبول کی، اوران کو جو تکلیف تھی وہ دور کردی، اور ہم نے ان کو ان کا کنبہ اور اتنے ہی اور اس کے ساتھ عطا فرمائے، ہماری طرف سے مہربانی اور عبادت گزاروں کی نصیحت کے لئے! ــــــ یعنی جب انھوں نے اللہ تعالیٰ کو پکارا تو اللہ تعالیٰ کی رحمت متوجہ ہوئی۔ اُن کو حکم دیا گیا کہ زمین پر پیر ماریں، نہانے اور پینے کے لئے ٹھنڈا چشمہ پھوٹ پڑا۔ جس سے سب بیماریاں دور ہوگئیں، اور اللہ تعالیٰ نے فوت شدہ اولاد سے دُوگنی اولاد دیدی۔ مال بھی بے حساب مل گیا۔ بخاری شریف میں روایت ہے کہ آپ نہار ہے تھے، اچانک سونے کی ٹڈیاں برسنے لگیں۔ آپ ان کو کپڑے میں جمع کرنے لگے۔ ندا آئی کہ کیا ہم نے آپ کو غنی نہیں کیا؟ آپ نے عرض کیا: بیشک! مگر میں آپ کی برکت سے کیسے بے نیاز ہوسکتا ہوں! (بخاری حدیث نمبر ۳۳۹۱) ایوب علیہ السلام پر یہ سب مہربانیاں عبادت گزار بندوں کے لئے نصیحت ہیں۔ اگر وہ بھی امتحان میں اسی طرح ثابت قدم رہیں تو رحمتِ خداوندی ضرور ان کی دستگیری کرے گی۔

حضرت ایوب علیہ السلام صبر وشکر کے پیکر تھے، اوران کی زندگی نیک بندوں کے لئے نمونہ ہے

تین اور نبیوں کا تذکرہ: اس تذکرہ کا مقصد بھی مسلمانوں کو صبر کی تلقین کرنا ہے ــــــ اور (آپؐ) اسماعیل وادریس وذوالکفل کا (تذکرہ کیجئے) ــــــ حضرت اسماعیل علیہ السلام نبی اور رسول ہیں۔ آپ حضرت ابراہیم علیہ السلام کے بڑے صاحبزادے ہیں۔ آپ کی والدہ ماجدہ حضرت ہاجرہ رضی اللہ عنہا ہیں۔ جب آپ شیر خوار تھے حضرت ابراہیم علیہ السلام آپ کو اور آپ کی والدہ صاحبہ کو بحکم الٰہی ایک بے آب وگیاہ سرزمین میں بسا گئے تھے۔ اسی وادی (مکہ مکرمہ) میں آپ پلے بڑھے اور یہیں والد صاحب کے ساتھ مل کر کعبہ شریف تعمیر کیا۔ عرب کے اکثر قبائل آپ کی اولاد ہیں۔ غرض آپ بچپن ہی سے صبر آزما مراحل سے گذرے ہیں ــــــ اور ادریس علیہ السلام بھی جلیل القدر پیغمبر ہیں۔ قرآن میں آپ کا تذکرہ دوجگہ آیا ہے۔ یہاں اور سورۂ مریم میں۔ آپ کے نام ونسب اور زمانے کے بارے میں مؤرخین میں اختلاف ہے۔ امام بخاری رحمہ اللہ نے سند کی کمزوری کی طرف اشارہ کرتے ہوئے حضرت ابن مسعود اور حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما کا یہ قول نقل کیا ہے کہ حضرت الیاس علیہ السلام ہی کا نام ادریس ہے (بخاری کتاب الانبیاء باب۴) اگر یہ بات صحیح ہے تو آپ اسرائیلی پیغمبر ہیں۔ آپ کی قوم بَعل کی پرستار تھی۔ اور آپ الیسع پیغمبر کے چچازاد بھائی تھے ــــــ حضرت ذوالکفل علیہ السلام کا تذکرہ قرآن کریم میں دوجگہ انبیاء کے زمرہ میں آیا ہے۔ یہاں اور سورۂ صٓ میں۔ آپ بھی اسرائیلی پیغمبر اور حضرت اَلْیَسَعْ علیہ السلام کے جانشین تھے۔ مشہور مفسر حضرت مجاہد رحمہ اللہ بیان

فرماتے ہیں کہ جب اسرائیلی نبی حضرت الیسع علیہ السلام بوڑھے ہوگئے تو آپ نے چاہا کہ کسی کو قائم مقام کریں۔ انھوں نے بنی اسرائیل کا اجتماع کر کے اپنا ارادہ ظاہر کیا، اور فرمایا کہ میں ایسے شخص کو خلیفہ بنانا چاہتا ہوں جو تین باتوں کا عہد کرے: دن بھر روزہ رکھے، رات کو اللہ کی یاد میں مشغول رہے اور کبھی غصہ نہ لائے۔ حضرت ذوالکفل علیہ السلام نے ان باتوں کا عہد کیا اور وہ خلیفہ بنادیئے گئے (قصص القرآن ۲:۲۲۶) ـــــ ان تینوں حضرات کے بارے میں ارشاد ہے ـــــ سب صبر کرنے والے ہیں۔ اور ہم نے ان کو اپنی رحمت میں داخل کیا، وہ یقیناً نیکوکاروں میں سے ہیں ـــــ پس مسلمانوں کو بھی مکہ کے موجودہ حالات میں یہی دو باتیں پیشِ نظر رکھنی چاہئیں: ایک: صبر وشکر، دوسری: صلاح وتقوی۔ اگر یہ دو باتیں ان کو حاصل رہیں تو اللہ تعالیٰ ان کو بھی اپنی رحمت میں داخل کریں گے۔ اور کافروں کے نرغے سے نکالیں گے ـــــ الحمدللہ! صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم نے ان نصیحتوں کو حرزِ جان بنایا۔ ان کو حضرت ایوب علیہ السلام کی طرح جسمانی اذیتیں برداشت کرنی پڑیں، حضرت اسماعیل علیہ السلام کی طرح بے وطن ہونا پڑا، اور حضرت ادریس وذوالکفل علیہما السلام کی طرح دشمنوں کے طعن وتشنیع کا نشانہ بننا پڑا، مگر وہ ہر حال میں ثابت قدم رہے۔ چنانچہ وقت آیا کہ رحمتِ خداوندی نے ان کو اپنی آغوش میں لے لیا۔

اللہ کی رحمت ونصرت نیکوکار صابروں کے شاملِ حال ضرور ہوتی ہے، جبکہ وہ ہتھیلی پر سرسوں جمانا نہ چاہیں!

وَذَا النُّوْنِ اِذْ ذَّهَبَ مُغَاضِبًا فَظَنَّ اَنْ لَّنْ نَّقْدِرَ عَلَيْهِ فَنَادٰى فِي الظُّلُمٰتِ اَنْ لَّآ اِلٰهَ اِلَّآ اَنْتَ سُبْحٰنَكَ ۖ اِنِّيْ كُنْتُ مِنَ الظّٰلِمِيْنَ ﴿۸۷﴾ فَاسْتَجَبْنَا لَهٗ ۙ وَنَجَّيْنٰهُ مِنَ الْغَمِّ ۭ وَكَذٰلِكَ نُـْۨجِي الْمُؤْمِنِيْنَ ﴿۸۸﴾

وَذَا النُّوْنِ(۱)	اور مچھلی والے کا	مُغَاضِبًا(۲)	خفا ہو کر	لَّنْ نَّقْدِرَ(۳)	ہرگز دارو گیر نہ کریں
اِذْ	جب	فَظَنَّ	پس گمان کیا انھوں نے		گے ہم
ذَّهَبَ	چل دیئے وہ	اَنْ	کہ	عَلَيْهِ	ان پر

(۱) النُّون: مچھلی، ذوالنون: مچھلی والا، حضرت یونس علیہ السلام کا لقب ہے۔ (۲) مُغَاضِب: اسم فاعل، از مُغَاضَبَة: مصدر باب مفاعلہ، غَاضَبَ فلاناً: کسی سے ناراض ہو کر الگ ہو جانا، ترکِ تعلق کرنا۔ (۳) نَقْدِرَ: باب ضرب کے مصدر قَدْر سے ←

فَنَادٰى	پس پکارا انھوں نے	سُبْحٰنَكَ	پاک ہیں آپ	وَنَجَّيْنٰهُ	اور نجات دی ہم نے انکو
فِى الظُّلُمٰتِ	اندھیروں میں	اِنِّىْ كُنْتُ	بیشک تھا میں	مِنَ الْغَمِّ	گھٹن سے
اَنْ	کہ	مِنَ الظّٰلِمِيْنَ	قصورواروں میں سے	وَكَذٰلِكَ	اور اسی طرح
لَآ اِلٰهَ	کوئی معبود نہیں	فَاسْتَجَبْنَا	پس دعا قبول کی ہم نے	نُـنْجِى	نجات دیتے ہیں ہم
اِلَّآ اَنْتَ	مگر آپ	لَهٗ	ان کے لئے	الْمُؤْمِنِيْنَ	ایمان والوں کو

حضرت یونس علیہ السلام کا تذکرہ: اس تذکرہ سے مقصود نبی ﷺ کو ایک خاص قسم کے صبر کا حکم کرنا ہے کہ آپؐ ہجرت کے سلسلہ میں جلدی نہ کریں، حکم الٰہی کا انتظار کریں۔ یہی بات سورۃ القلم (آیت ۴۸) میں صراحۃً کہی گئی ہے۔ ارشاد ہے: ﴿ فَاصْبِرْ لِحُكْمِ رَبِّكَ وَلَا تَكُنْ كَصَاحِبِ الْحُوْتِ ﴾ یعنی آپ اپنے پروردگار کے حکم کے لئے صبر کیجئے، اور مچھلی والے پیغمبر کی طرح نہ ہوجایئے۔ ارشاد ہے —— اور (آپؐ) مچھلی والے کا (تذکرہ کیجئے) —— مچھلی والے یعنی حضرت یونس علیہ السلام بھی اسرائیلی پیغمبر ہیں۔ اہلِ نینوی کی طرف مبعوث کئے گئے تھے جو فرات کے کنارے پر رہے۔ آپ عرصہ تک ان کو توحید کی دعوت دیتے رہے، مگر انھوں نے مطلق نہ سنا۔ جب ان کا تمرد بڑھ گیا تو ان سے وعدہ کیا گیا کہ تین دن کے بعد عذاب آئے گا۔ حضرت یونس علیہ السلام نے خیال کیا کہ اب یہاں میرا کام نہیں رہا، چنانچہ وہ وحی کا انتظار کئے بغیر چل دیئے۔ ارشاد ہے: —— جب وہ قوم سے خفا ہوکر چل دیئے، پس انھوں نے خیال کیا کہ ہم ہرگز ان پر داروگیر نہ کریں گے —— یعنی ان کے خیال میں قوم کو چھوڑ کر چل دینا حکم خداوندی کے خلاف نہ تھا۔ کیونکہ جب بھی کسی قوم پر عذاب آتا ہے تو نبی اور مؤمنین کو وہاں سے نکال لیا جاتا ہے۔ اور ان کی قوم کو عذاب کی خبر دی جاچکی تھی، پس ان کا نکل جانا روا ہے، مگر حقیقت میں یہ بات منشأ خداوندی کے خلاف تھی، کیونکہ تقدیر الٰہی میں اس قوم سے عذاب ٹل جانے والا تھا۔ اور اس قوم کو راہ نمائی کے لئے یونس علیہ السلام کی ضرورت تھی۔ چنانچہ آپ کو ابتلاء پیش آیا۔ آپ بستی سے نکل کر دریا کے کنارے پہنچے۔ ایک کشتی کو مسافروں سے بھرا ہوا تیار پایا۔ آپ سوار ہوئے اور کشتی نے لنگر اٹھایا۔ منجدھار میں پہنچ کر کشتی ڈگمگانے لگی۔ کشتی والے اپنے عقیدہ کے مطابق کہنے لگے: ''ایسا معلوم ہوتا ہے کہ کشتی میں کوئی غلام اپنے آقا سے بھاگا ہوا ہے، جب تک اس کو کشتی سے جدا نہ کیا جائے گا نجات مشکل ہے'' یونس علیہ السلام فوراً سمجھ گئے کہ وہ غلام وہی ہیں جو آقا سے بھاگے ہیں۔ انھوں نے پیش

← مشتق ہے، قدرت سے مشتق نہیں، کیونکہ اللہ کو عاجز تصور کرنا شانِ نبوت کے خلاف ہے۔ راغب نے بھی قدر علیہ کے معنی تنگی کرنا کئے ہیں۔

کش کی کہ مجھے دریا میں ڈال دو، مگر ملاح اور کشتی والے آپ کی نیکی کی وجہ سے اس کے لئے تیار نہ ہوئے، اور قرعہ اندازی کی ٹھہری۔ تین بار قرعہ ڈالا گیا، ہر بار آپ ہی کا نام نکلا، تو مجبور ہو کر لوگوں نے یونس علیہ السلام کو دریا کے حوالے کیا، اور آگے چل دیئے۔ ادھر اللہ تعالیٰ نے ایک بڑی مچھلی کو حکم دیا، اس نے آپ کو نگل لیا ——— پس انھوں نے تاریکیوں میں پکارا کہ آپ کے سوا کوئی معبود نہیں، آپ پاک ہیں، بیشک میں قصور واروں میں سے تھا ——— مچھلی کو حکم تھا کہ وہ یونس علیہ السلام کا لقمہ نہ بنائے، صرف نگل جائے، چنانچہ وہ آپ کو صحیح سالم نگل گئی۔ آپ نے دریا کی گہرائی، مچھلی کے پیٹ اور رات کی تاریکی: تین اندھیروں میں اللہ تعالیٰ سے دعا کی، اور اپنی کوتاہی کا اعتراف کیا کہ بیشک میں نے جلدی کی، آپ کے حکم کا انتظار نہ کیا اور قوم کو چھوڑ کر چل دیا، میں یقیناً قصور وار ہوں، مگر خدایا آپ ہی معبود ہیں، آپ کے دَر کو چھوڑ کر کہاں جاؤں۔ آپ ہر عیب اور ہر کمی سے پاک ہیں۔ اور میں بندہ ہوں خطا کا پتلا! خدایا! میری خطا معاف فرما! ——— پس ہم نے ان کی دعا قبول کی، اور ان کو بے چینی سے نجات بخشی، اور اسی طرح ہم ایمان والوں کو نجات دیتے ہیں ——— مچھلی کو حکم ہوا اس نے ساحل پر آپ کو اُگل دیا۔ مچھلی کے پیٹ کی گرمی سے آپ کے بدن کی کھال اتر گئی تھی، اور جسم ایسا ہو گیا تھا جیسا پرندے کے نئے نکلے ہوئے بچہ کا ہوتا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے فوراً ایک پتے دار پودا اُگایا جس نے آپ کو ڈھانپ لیا۔ مکھی مچھروں کی تکلیف سے آپ محفوظ ہو گئے۔ جب صحت مند ہوئے تو قوم کی طرف واپس جانے کا حکم ملا۔ قوم کا عذاب ٹل گیا تھا۔ سورۂ یونس (آیت ۹۸) میں اس کا واقعہ گذر چکا ہے۔ وہ لوگ اپنے نبی کی تلاش میں تھے کہ آپ پہنچ گئے اور ان کی راہ نمائی کا فریضہ انجام دینا شروع کر دیا۔

آخر میں اللہ تعالیٰ ارشاد فرماتے ہیں کہ یہ عنایت یونس علیہ السلام کے ساتھ خاص نہیں۔ جو بھی ایماندار بندہ اس طرح اللہ تعالیٰ کو پکارے گا اللہ تعالیٰ اس کو بلاؤں سے نجات دیں گے۔

﴿ لَاإِلٰهَ إِلَّا أَنْتَ سُبْحَانَكَ إِنِّيْ كُنْتُ مِنَ الظَّالِمِيْنَ ﴾ بابرکت آیت ہے۔ حدیث میں ہے کہ جو مسلمان کسی معاملہ میں اس آیت کے ذریعہ دعا کرے گا: اللہ تعالیٰ اس کی دعا قبول فرمائیں گے۔ (ترمذی)

وَزَكَرِيَّآ إِذْ نَادٰى رَبَّهٗ رَبِّ لَا تَذَرْنِيْ فَرْدًا وَّأَنْتَ خَيْرُ الْوٰرِثِيْنَ ﴿٨٩﴾ فَاسْتَجَبْنَا لَهٗ ۡ وَوَهَبْنَا لَهٗ يَحْيٰى وَأَصْلَحْنَا لَهٗ زَوْجَهٗ ۭ إِنَّهُمْ كَانُوْا يُسٰرِعُوْنَ فِي الْخَيْرٰتِ وَيَدْعُوْنَنَا رَغَبًا وَّرَهَبًا ۭ وَكَانُوْا لَنَا خٰشِعِيْنَ ﴿٩٠﴾ وَالَّتِيْٓ أَحْصَنَتْ

فَرْجَهَا فَنَفَخْنَا فِيْهَا مِنْ رُّوْحِنَا وَجَعَلْنٰهَا وَابْنَهَآ اٰيَةً لِّلْعٰلَمِيْنَ ﴿۹۱﴾ اِنَّ هٰذِهٖٓ اُمَّتُكُمْ اُمَّةً وَّاحِدَةً ۖ وَّاَنَا رَبُّكُمْ فَاعْبُدُوْنِ ﴿۹۲﴾ وَتَقَطَّعُوْٓا اَمْرَهُمْ بَيْنَهُمْ ۭ كُلٌّ اِلَيْنَا رٰجِعُوْنَ ﴿۹۳﴾

وَ زَكَرِيَّآ(۱)	اورزکریا کا	لَهٗ	ان کے لئے	فِيْهَا	اس عورت میں
اِذْ	جب	زَوْجَهٗ	ان کی بیوی کو	مِنْ رُّوْحِنَا	ہماری خاص روح سے
نَادٰى	پکاراانھوں نے	اِنَّهُمْ	بیشک وہ	وَجَعَلْنٰهَا	اور بنایا ہم نے اس کو
رَبَّهٗ	اپنے رب کو	كَانُوْا	تھے	وَابْنَهَآ	اوراس کے بیٹے کو
رَبِّ	اے میرے رب!	يُسٰرِعُوْنَ(۳)	دوڑتے	اٰيَةً	بڑی نشانی
لَا تَذَرْنِيْ	مت رکھیو مجھے	فِي الْخَيْرٰتِ	نیک کاموں میں	لِّلْعٰلَمِيْنَ	جہانوں کے لئے
فَرْدًا	تنہا	وَيَدْعُوْنَنَا	اور پکارتے ہمیں	اِنَّ هٰذِهٖٓ	بیشک یہ
وَّاَنْتَ	اورآپ	رَغَبًا(۴)	امید	اُمَّتُكُمْ	تمہاراطریقہ ہے
خَيْرُ	بہترین ہیں	وَّرَهَبًا(۴)	اورڈر سے	اُمَّةً(۵)	طریقہ
الْوٰرِثِيْنَ	سب وارثوں میں	وَكَانُوْا	اور تھے وہ	وَّاحِدَةً	ایک
فَاسْتَجَبْنَا	پس دعا قبول کی ہم نے	لَنَا	ہمارے سامنے	وَّاَنَا	اور میں
لَهٗ	ان کے لئے	خٰشِعِيْنَ	دب کر رہنے والے	رَبُّكُمْ	تمہارارب ہوں
وَوَهَبْنَا	اورعطا فرمایا ہم نے	وَالَّتِيْٓ(۱)	اوراس عورت کا جس نے	فَاعْبُدُوْنِ	پس عبادت کرو میری
لَهٗ	ان کو	اَحْصَنَتْ	بچایا	وَتَقَطَّعُوْٓا(۶)	اور بانٹ لیا انھوں نے
يَحْيٰى	یحیٰ	فَرْجَهَا	اپنے ناموس کو	اَمْرَهُمْ	اپنے معاملہ کو
وَاَصْلَحْنَا(۲)	اور سنوار دیا ہم نے	فَنَفَخْنَا	پس پھونکی ہم نے	بَيْنَهُمْ	آپس میں

(۱)زکریا اور التی کا ناصب اذکر محذوف ہے (۲)أَصْلَحَ الشيئَ: ٹھیک کرنا، اصلاح کرنا (۳) سَارَعَ إلى كذا: جلدی کرنا، لپکنا (۴) رغبا ورهبا: دونوں مصدر ہیں، مبالغۃً محمول ہیں، اور حال ہیں۔(۵) أمة: طریقہ، مذہب، مشرب۔ أمة واحدة: حال ہے أمتكم سے۔(۶) تقطَّعَ: لازم ہے، مگر جَعَلَ کے معنی کو متضمن ہے، اس لئے مفعول کی طرف بلاواسطہ متعدی کیا گیا ہے (روح)

كُلٌّ	سب	اِلَيۡنَا	ہماری طرف	رٰجِعُوۡنَ	لوٹنے والے ہیں

حضرت ایوب علیہ السلام اور دیگر انبیاء کے تذکرہ سے مسلمانوں کو ہمت دلائی تھی۔ پھر یونس علیہ السلام کے تذکرہ سے نبی ﷺ کو منتظرِ حکم رہنے کا اشارہ کیا تھا۔ اب آخر میں زکریا، یحییٰ اور عیسیٰ علیہم السلام اور مریم رضی اللہ عنہا کا تذکرہ کیا جاتا ہے۔ اس تذکرہ کا مقصد اللہ تعالیٰ کی قدرتِ کاملہ کا بیان ہے۔ حالات خواہ کیسے ہی خراب ہوں: اللہ تعالیٰ ان کو سنوارنے پر پوری طرح قدرت رکھتے ہیں۔ زکریا علیہ السلام کی اہلیہ بانجھ تھیں، اللہ تعالیٰ نے ان کو قابل اولاد بنا دیا۔ اسی طرح کبھی محیر العقول کرشمہ بھی دکھاتے ہیں۔ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی ولادت اس کی مثال ہے۔ پھر انبیاء کا تذکرہ اس بات پر ختم کیا ہے کہ ان سب پیغمبروں کا جو دین تھا وہی دین یہ آخری پیغمبر پیش کر رہے ہیں، کوئی نئی بات نہیں کہہ رہے۔ پھر قبول کرنے میں پس و پیش کیوں ہے؟

زکریا علیہ السلام کا تذکرہ: —— اور (آپؐ) زکریا کا (تذکرہ کیجئے) —— زکریا علیہ السلام بھی اسرائیلی نبی ہیں۔ اور حضرت سلیمان علیہ السلام کی اولاد سے ہیں۔ اپنی روزی کے لئے نجّاری کا پیشہ کرتے تھے۔ اور بنی اسرائیل کی رشد و ہدایت کا فریضہ انجام دیتے تھے۔ آپ ہی نے اپنی سالی کی لڑکی حضرت مریمؑ کی کفالت کی تھی۔ آپ کی کوئی اولاد نہیں تھی۔ جب آپ نے حضرت مریم کے حجرہ میں غیر موسمی پھل دیکھے تو ناوقت اولاد کی خواہش پیدا ہوئی —— جب انھوں نے اپنے پروردگار کو پکارا: ''اے میرے ربّ! مجھے لاوارث نہ چھوڑیئے! اور آپ سب سے بہترین وارث ہیں!'' —— یعنی حقیقی وارث تو آپ ہی ہیں، مگر مجھے ظاہری وارث بھی عطا فرمائیں جو میرے بعد دین کی خدمت کرے —— پس ہم نے ان کی دعا قبول کی، اور ہم نے ان کو یحییٰ عطا فرمایا، اور ہم نے ان کے لئے ان کی بیوی کو سنوار دیا —— یعنی ان کی بانجھ بیوی کو ولادت کے قابل بنا دیا۔ عادتِ الٰہی یہ جاری ہے کہ جو چیزیں عموماً جن اسباب سے پیدا ہوتی ہیں انہیں کو سنوار دیا جاتا ہے۔ اگرچہ وہ بلا اسباب بھی پیدا کرنے پر قادر ہیں، جیسا کہ عیسیٰ علیہ السلام کے تذکرہ میں آرہا ہے —— بیشک وہ نیک کاموں کی طرف لپکتے تھے، اور ہمیں شوق وخوف سے پکارتے تھے، اور ہمارے سامنے دب کر رہتے تھے —— یعنی یہ سب انبیاء جن کا اوپر تذکرہ کیا گیا یا زکریا علیہ السلام کا پورا گھرانہ ایمانی اوصاف کا حامل تھا۔ ایمانی اوصاف تین ہیں:

پہلا وصف: —— بھلائی کے کاموں کی طرف پیش قدمی کرنا —— نیک بندوں کا یہ وصف قرآن میں اور جگہ بھی آیا ہے[1] ان کو جب نیکی کے کاموں کی طرف بلایا جاتا ہے تو وہ دوڑ کر دوسروں سے آگے نکل جانے کی

(۱) جیسے سورۃ آل عمران آیت ۱۱۴، اور سورۃ المؤمنون آیت ۶۱

کوشش کرتے ہیں۔ نیک کام کا کوئی موقع ہاتھ سے نہیں جانے دیتے۔ کیونکہ انسان کے حالات یکساں نہیں رہتے۔ پس فرزانہ وہ ہے جو فرصت کو غنیمت سمجھے۔ حدیث میں ہے کہ پانچ حالتوں کو پانچ حالتوں سے پہلے غنیمت جانو: جوانی کو بڑھاپے سے پہلے، تندرستی کو بیماری سے پہلے، خوش حالی کو تنگدستی سے پہلے، فراغت کو مشغولیت سے پہلے، اور زندگی کو موت سے پہلے (رواہ الترمذی) پس جس کو جوانی کی قوت ملی ہے وہ بڑھاپے کی کمزوری آنے سے پہلے اس سے فائدہ اٹھالے، جس کو تندرستی کی نعمت ملی ہے وہ بیماری کی مجبوری آنے سے پہلے اس سے کام لے لے، جس کو خوش حالی نصیب ہوئی ہے وہ تنگ دستی سے پہلے اس کو غنیمت جانے، جسے فرصت ہاتھ آئی ہے وہ مشغولیت سے پہلے اس کی قدر کرلے، اور زندگی کے بعد موت یقینی ہے، پس زندگی کا کوئی لمحہ ضائع نہ کرے۔ اللہ تعالیٰ ہم سب کو زندگی سے پورا پورا فائدہ اٹھانے کی توفیق عطا فرمائیں۔ (آمین)

دوسرا وصف: —— **امید وبیم سے بندگی کرنا** —— ایمان: خوف ورجاء کی درمیانی کیفیت کا نام ہے۔ مؤمن: اللہ کی رحمت کا امیدوار بھی ہوتا ہے، اور اپنی کوتاہیوں سے خائف بھی رہتا ہے۔ نیک کاموں سے آس بھی بندھتی ہے، اور ان کی عدم قبولیت کا کھٹکا بھی لگا رہتا ہے۔ گناہوں سے خائف بھی ہوتا ہے، اور مغفرت کی امید بھی رکھتا ہے۔ صرف خوف ناامیدی پیدا کرتا ہے۔ اور اللہ کی رحمت سے ناامیدی کفر ہے۔ اور صرف امید بے فکری پیدا کرتی ہے آدمی عمل سے غافل ہوجاتا ہے، اور رحمتِ خداوندی پر تکیہ کرلیتا ہے۔ پس مناسب حال دونوں باتوں کا اجتماع ہے۔ اور بعض متصوفین کا یہ کہنا ہے کہ جو کوئی اللہ تعالیٰ کو توقع یا ڈر سے پکارے وہ اصلی مُحِب نہیں۔ یہ بات غلط ہے انبیاء سے بڑھ کر اللہ کا محبّ کون ہوسکتا ہے؟!

تیسرا وصف: —— **اللہ تعالیٰ کے سامنے دب کر رہنا** —— اللہ تعالیٰ کے حضور میں عاجزی، نیازمندی، فروتنی اور انکساری ظاہر کرنا اصل بندگی ہے۔ جب مؤمن کو اللہ کی یاد آتی ہے، اور وہ اللہ کے معاملات میں اچھی طرح غور وفکر کرتا ہے تو اس کی روح بیدار ہوتی ہے، اور اس کا میلان عالم قدس کی طرف ہوجاتا ہے، حواس منکسر ہوجاتے ہیں، اور نفس ناطقہ حیرت زدہ اور درماندہ ہوکر رہ جاتا ہے۔ یہی کیفیت خشوع واخبات کہلاتی ہے۔ جیسے ایک عام آدمی جب دربارشاہی میں پہنچتا ہے، اور بادشاہ کا جاہ وجلال دیکھتا ہے تو اس پر مرعوبیت طاری ہوجاتی ہے، اور وہ خود کو بالکل عاجز سمجھنے لگتا ہے۔ اسی کیفیت کا نام اخبات ہے جو بندے میں وصفِ محمود ہے۔

عیسیٰ علیہ السلام کا تذکرہ: —— اور (آپؐ) اس خاتون کا (تذکرہ کیجئے) جس نے اپنے ناموس کی حفاظت کی (نکاح سے بھی اور ناجائز سے بھی) —— یہ معزز عورت مریم رضی اللہ عنہا ہیں۔ آپ کے والد کا نام

عمران ہے۔ انہی کے نام پر سورۃ آل عمران ہے۔ آپ ولیّہ (نیک خاتون) تھیں۔ بچپن ہی میں اللہ کی طرف سے آپ کے پاس پھل آتے تھے۔ آپ نے کبھی نکاح نہیں کیا، اس لئے مریم عذراء (کنواری) کے لقب سے مشہور ہوئیں۔ یہود پر خدا کی مار! انھوں نے آپ پر گندے الزامات لگائے ہیں، قرآن نے اس کی صفائی کی ہے۔ آپ کے بطن سے حضرت عیسیٰ علیہ السلام پیدا ہوئے۔ ارشاد ہے: —— پس ہم نے اس خاتون میں اپنی روح پھونکی، اور ہم نے اس کو اور اس کے بیٹے کو دنیا جہاں کے لئے نشانی بنایا —— اللہ تعالیٰ کی قدرت کاملہ کی بھی، اور نبوت کے مختلف سلسلوں کو خاتم النّبیین ﷺ میں مجتمع کرنے کی بھی —— آپ کا معاملہ اللہ تعالیٰ کی قدرت کاملہ کی نشانی اس طرح ہے کہ توالد وتناسل کا سلسلہ مرد وزن سے قائم ہے۔ مگر اللہ تعالیٰ قادر ہیں کہ ایک سے بچہ پیدا کریں۔ بلکہ دونوں کے بغیر بھی انسان کو پیدا کر سکتے ہیں۔ آخر آدم علیہ السلام کو ماں باپ کے بغیر پیدا کیا ہی ہے —— اور نبوت کے سلسلوں کو جمع کرنے کی تفصیل یہ ہے کہ خاتم النّبیین ﷺ سے پہلے دنیا میں نبوت کے مختلف سلسلے جاری تھے۔ کوئی قوم ایسی نہیں ہوئی جس میں اللہ نے نذیر نہ بھیجا ہو۔ پھر جب اس سلسلہ کی تکمیل کا وقت آیا، تو تمام سلسلوں کو حضرت محمد مصطفیٰ ﷺ میں جمع کر دیا، اور آپ کو تمام سلسلوں کا خاتم گردانا گیا۔

مگر یہ اجتماع چونکہ ایک معنوی چیز تھی، جس کو تسلیم کرنے میں شاید کوئی توقف کرے، اس لئے آپ کی تشریف آوری سے چھ سو سال پہلے اللہ تعالیٰ نے یہ کرشمہ دکھایا کہ توالد وتناسل کا سلسلہ جو مرد وزن سے قائم تھا، ایک میں سمیٹ دیا، اور صرف عورت سے عیسیٰ علیہ السلام کو پیدا کیا۔ یہ ایک محسوس معاملہ تھا۔ اور اس کا اجتماع معنویات کے اجتماع سے بعید تر تھا۔ مگر اللہ کی قدرت نے لوگوں کو یہ کرشمہ دکھایا، تاکہ جب ختم نبوت کا اعلان کیا جائے تو لوگ اس کے تسلیم کرنے میں پس وپیش نہ کریں —— اسی طرح عیسیٰ علیہ السلام کا زندہ آسمان پر اٹھایا جانا معراج نبوی کی تمہید تھا۔ جب عیسیٰ علیہ السلام زندہ آسمان پر جا سکتے ہیں، اور قیامت سے پہلے نازل ہونگے، تو نبی ﷺ معراج میں آسمانوں کے اوپر جا کر واپس کیوں نہیں آسکتے؟! —— غرض عیسیٰ علیہ السلام کی ذات میں دو نشانیاں ہیں۔ دنیا جہاں والے ان سے وہ دو باتیں سمجھ سکتے ہیں جو نبی ﷺ کو پیش آنے والی ہیں۔

اور ''اپنی روح'' کا مطلب معزز ومحترم روح ہے۔ اضافت تشریف کے لئے ہے یعنی مخصوص روح۔ قرآن کریم میں یہی تعبیر آدم علیہ السلام کی روح کے لئے بھی آئی ہے۔ سورۃ الحجر (آیت ۲۹) میں ہے: ﴿وَنَفَخْتُ فِيْهِ مِنْ رُّوْحِيْ﴾ یعنی جب میں اس (پتلے) میں اپنی مخصوص روح پھونکوں۔ پس اس تعبیر سے کسی کو غلط فہمی نہ ہو کہ عیسیٰ علیہ السلام کی روح کچھ انسانی ارواح سے مختلف چیز تھی۔ جیسا کہ عیسائیوں کو دھوکہ لگا ہے —— اور حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی

ولادت کی تفصیل سورۂ مریم کے دوسرے رکوع میں گذر چکی ہے۔ جب حضرت مریم رضی اللہ عنہا ماہواری کے غسل سے فارغ ہوکر کپڑے پہن چکیں تو حضرت جبرئیل علیہ السلام ظاہر ہوئے۔ اور انھوں نے گریبان میں پھونک ماری جس سے حمل ٹھہر گیا، اور حضرت عیسیٰ علیہ السلام پیدا ہوئے ـــــ اور حدیث میں ہے کہ رحم مادر میں ہر بچہ کے جسم میں روح فرشتہ ہی پھونکتا ہے۔ پس جبرئیل علیہ السلام کا روح پھونکنا صرف بایں معنی امتیاز ہے کہ وہ جسم تیار ہونے سے پہلے پھونکی گئی تھی۔ باقی نفس روح کے پھونکنے میں سبھی انسانوں کا معاملہ یکساں ہے۔

اب انبیاء علیہم السلام کا تذکرہ ختم کیا جاتا ہے۔ آخر میں عام خطاب ہے جس میں کفار مکہ بھی داخل ہیں۔ ارشاد ہے: ـــــ بیشک یہ تمہاری جماعت ہے: جماعتِ واحدۃ، اور میں تمہارا پروردگار ہوں، پس میری عبادت کرو ـــــ یعنی اوپر جن انبیاء کا تذکرہ آیا ہے وہ سب ایک جماعت ہیں۔ سب کا دین ایک ہے۔ اور سب اصول میں متحد ہیں۔ وہی دین یہ آخری پیغمبر پیش کررہے ہیں۔ اس دین کی بنیادی تعلیم توحید ہے۔ جس میں کسی نبی کا اختلاف نہیں رہا، اور جس پر قائم رہنا سب پر واجب ہے۔ پس سب کو چاہئے کہ میری عبادت کریں، اور شرک کو یک لخت چھوڑ دیں۔

اور اگر کسی کے دل میں خیال آئے کہ جب سب نبیوں کا دین ایک ہے تو ان کی امتیں آپس میں مختلف کیوں ہیں؟ اس کی وجہ ارشاد فرماتے ہیں: ـــــ اور انھوں نے اپنے معاملہ کو آپس میں ٹکڑے ٹکڑے کرلیا ـــــ یعنی یہ اختلافات بعد کے لوگوں نے پیدا کئے ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے تو اصولی طور پر سب کو ایک ہی دین دیا تھا۔ لوگوں نے آپس میں پھوٹ ڈال لی ـــــ سب ہماری طرف لوٹنے والے ہیں ـــــ اس وقت عملی فیصلہ ہوجائے گا۔ اور دودھ پانی سے الگ ہوجائے گا۔

کل جب حقائق سے پردہ اٹھے گا دیکھنا کچھ مفید نہ ہوگا، آج عقل سے کام لے کر حق وباطل کو پہچانا جائے تو ہی مفید ہے۔

فَمَنْ يَّعْمَلْ مِنَ الصّٰلِحٰتِ وَهُوَ مُؤْمِنٌ فَلَا كُفْرَانَ لِسَعْيِهٖ ۚ وَاِنَّا لَهٗ كٰتِبُوْنَ ﴿۹۴﴾ وَحَرٰمٌ عَلٰى قَرْيَةٍ اَهْلَكْنٰهَآ اَنَّهُمْ لَا يَرْجِعُوْنَ ﴿۹۵﴾ حَتّٰٓى اِذَا فُتِحَتْ يَاْجُوْجُ وَ مَاْجُوْجُ وَهُمْ مِّنْ كُلِّ حَدَبٍ يَّنْسِلُوْنَ ﴿۹۶﴾ وَاقْتَرَبَ الْوَعْدُ الْحَقُّ فَاِذَا هِيَ شَاخِصَةٌ اَبْصَارُ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا ۭ يٰوَيْلَنَا قَدْ كُنَّا فِيْ غَفْلَةٍ مِّنْ هٰذَا

بَلْ كُنَّا ظٰلِمِيْنَ ﴿۹۷﴾ اِنَّكُمْ وَمَا تَعْبُدُوْنَ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ حَصَبُ جَهَنَّمَ ؕ اَنْتُمْ لَهَا وٰرِدُوْنَ ﴿۹۸﴾ لَوْ كَانَ هٰۤؤُلَآءِ اٰلِهَةً مَّا وَرَدُوْهَا ؕ وَكُلٌّ فِيْهَا خٰلِدُوْنَ ﴿۹۹﴾ لَهُمْ فِيْهَا زَفِيْرٌ وَّهُمْ فِيْهَا لَا يَسْمَعُوْنَ ﴿۱۰۰﴾

فَمَنْ	پس جو شخص	لَا يَرْجِعُوْنَ	نہیں لوٹیں گے	شَاخِصَةٌ (۸)	(کہ) اٹھنے والی ہونگی
يَّعْمَلْ	کرے گا	حَتّٰٓى	یہاں تک کہ	اَبْصَارُ	نگاہیں
مِنَ الصّٰلِحٰتِ	نیک کاموں سے	اِذَا	جب	الَّذِيْنَ	ان کی جنھوں نے
وَهُوَ	درانحالیکہ وہ	فُتِحَتْ	کھولے جائیں گے	كَفَرُوْا	انکار کیا
مُؤْمِنٌ	ایمان والا ہو	يَاْجُوْجُ	یاجوج	يٰوَيْلَنَا	اے ہماری شامت!
فَلَا كُفْرَانَ (۱)	تو نہیں ناشکری ہے	وَمَاْجُوْجُ	اور ماجوج	قَدْ كُنَّا	تحقیق تھے ہم
لِسَعْيِهٖ	اس کے عمل کے لئے	وَهُمْ	اور وہ	فِىْ غَفْلَةٍ	بے خبری میں
وَاِنَّا	اور بیشک ہم	مِّنْ كُلِّ حَدَبٍ (۵)	ہر بلندی سے	مِّنْ هٰذَا	اس سے
لَهٗ (۲)	اس کو	يَّنْسِلُوْنَ (۶)	پھسل رہے ہونگے	بَلْ	بلکہ
كٰتِبُوْنَ	لکھنے والے ہیں	وَاقْتَرَبَ	اور نزدیک آ گیا	كُنَّا	تھے ہم
وَحَرٰمٌ (۳)	اور حرام ہے	الْوَعْدُ	وعدہ	ظٰلِمِيْنَ	ظلم کرنے والے
عَلٰى قَرْيَةٍ	اس بستی پر	الْحَقُّ	برحق	اِنَّكُمْ	بیشک تم
اَهْلَكْنٰهَآ	جس کو ہلاک کیا ہم نے	فَاِذَا	پس اچانک	وَمَا	اور جن کو
اَنَّهُمْ (۴)	کہ وہ لوگ	هِىَ (۷)	قصہ یہ ہوگا	تَعْبُدُوْنَ	پوجتے ہو تم

(۱) كُفران: مصدر: ناشکری، ناقدری۔ (۲) له کا مرجع عمل ہے، جو يعمل سے مفہوم ہوتا ہے، اور من بھی مرجع ہوسکتا ہے، اس صورت میں لام برائے انتفاع ہوگا۔ (۳) حَرَام: مبتدا ہے، اور خبر جملہ أنهم لايرجعون ہے (۴) جملہ أنهم لايرجعون: خبر ہے، اور مبتدا کا مفہوم (نفی) جملۂ خبریہ میں شامل کیا گیا ہے۔ (۵) الحَدَب: بلند زمین، ڈھلان، کوبڑ۔ حَدِبَتِ (س) الأرضُ: زمین کے کچھ حصہ کا ابھرا ہوا ہونا۔ (۶) نَسَلَ (ض) نَسْلاً الماشي: چلنے والے کا تیز رفتار ہونا۔ (۷) هي: ضمیر قصہ ہے، اس کا مرجع کچھ نہیں، اور مبتدا ہے، اور جملہ شاخصة خبر ہے...... شاخصة: خبر مقدم اور أبصار: مبتدا مؤخر ہے، اور أبصار: مابعد کی طرف مضاف ہے، پھر جملہ هي کی خبر ہے۔ (۸) شَخَصَ (ف) بَصَرُہ: نگاہ کا اٹھنا، دور تک دیکھنا۔

مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ	اللہ سے وَرے	كَانَ	ہوتے	خٰلِدُوْنَ	ہمیشہ رہنے والے ہیں
حَصَبُ [۱]	ایندھن ہیں	هٰٓؤُلَآءِ	یہ	لَهُمْ	ان کے لئے
جَهَنَّمَ	جہنم کا	اٰلِهَةً	معبود	فِيْهَا	اس میں
اَنْتُمْ	تم	مَّا	(تو) نہ	زَفِيْرٌ [۲]	چلاّنا ہے
لَهَا	اس میں	وَرَدُوْهَا	پہنچتے وہ اس میں	وَّهُمْ	اور وہ
وٰرِدُوْنَ	پہنچنے والے ہو	وَكُلٌّ	اور سب	فِيْهَا	اس میں
لَوْ	اگر	فِيْهَا	اس میں	لَا يَسْمَعُوْنَ	نہیں سنیں گے

توحید ورسالت کے بیان سے فارغ ہوکر اب آخرت کا بیان شروع کیا جاتا ہے۔ کیونکہ ابھی فرمایا تھا کہ انبیاء علیہم السلام کی ملت کا انکار کرنے والے اور اس کا تیا پانچا کرنے والے جب ہماری طرف لوٹ کر آئیں گے: اس وقت عملی فیصلہ کردیا جائے گا۔ رہا علمی فیصلہ تو وہ ابھی کیا جارہا ہے۔ ارشاد ہے: —— پس جو شخص نیک کام کرے، اور وہ ایماندار ہو، تو اس کے عمل کی ناشکری نہیں کی جائے گی، اور ہم بالیقین اس کو لکھنے والے ہیں —— یہ ان بندوں کا بیان ہے جو نبیوں کی ملت پر استوار اور ان کے دین پر عمل پیرا رہے۔ ان کی محنت اکارت نہ جائے گی، ان کے عمل کا پھل ان کو ضرور ملے گا۔ کوئی ادنی سے ادنی عمل بھی ضائع نہ ہوگا۔ کیونکہ ان کی ہر نیکی نامۂ اعمال میں ثبت کردی گئی ہے۔ عمل کے مشکور ہونے کا یہی مطلب ہے —— اور آیت پاک سے یہ بھی معلوم ہوا کہ ہر نیک عمل کی قبولیت کے لئے ایمان شرط ہے۔ ایمان کے بغیر نیک عمل، گری بغیر کی بادام اور دانے بغیر کی مونگ پھلی ہے۔ جس کی کوئی قیمت نہیں —— اور اعمال لکھنے والے درحقیقت فرشتے ہیں۔ مگر چونکہ وہ اللہ کے حکم سے لکھتے ہیں: اِس لئے ان کے فعل کو اللہ تعالیٰ نے اپنی طرف منسوب کیا ہے —— اور آخرت میں نجاتِ اوّلی کے لئے ایمان کے ساتھ عمل بھی ضروری ہے۔ آج مسلمان دھوکے میں پڑے ہوئے ہیں۔ وہ ایمان کو نجات کے لئے کافی سمجھے ہوئے ہیں۔ یہ ان کی بھول ہے۔ جب وقت ہاتھ سے نکل جائے گا: ہوش آئے گا۔ مگر اس وقت کیا فائدہ ہوگا جب چڑیا کھیت کھا چکی ہوگی —— اور مؤمن کی طرح ہر کافر کا عمل بھی ریکارڈ کیا جارہا ہے۔ اس کے عمل کا بھی کوئی ذرّہ ضائع نہیں ہورہا۔ اور وقت آنے پر اس کا بھگتان کردیا جائے گا —— یہ آیت اخروی جزاء وسزا کی تمہید ہے۔

(۱) الحَصَب: سوختہ، جلانے کی لکڑیاں، ایندھن جو آگ میں ڈالا جائے۔ (۲) الزفیر: شور، چلاّنا۔ زَفَرَ (ض) زَفْرًا وَزَفِيْرًا: لمبا سانس لے کر باہر نکالنا۔ زَفَرَ الحِمَارُ: گدھے کا ڈھینچو ڈھینچو کرنا۔ اس کا مقابل شہیق ہے یعنی لمبا سانس اندر کھینچنا۔

اور ہر اس بستی پر حرام ہے جس کو ہم نے ہلاک کیا: وہ یقیناً نہیں لوٹیں گے ــــ یہ مجازات کے بیان سے پہلے نصیحت ہے کہ ایمان وعمل کے لئے یہی زندگی ہے۔ موت کے بعد نہ ایمان معتبر ہے، نہ عمل کا وقت ہے۔ جب دنیا کی زندگی ختم ہوجائے گی تو پھر قیامت تک اس دنیا کی طرف لوٹنا ممکن نہیں۔ قیامت کے دن ضرور لوٹنا ہے، مگر وہ ایمان وعمل کے لئے نہیں ہوگا بلکہ اس کے بدلہ کے لئے ہوگا۔ پس نبیوں کا دین ٹھکرانے والے اور اس کو پسِ پشت ڈالنے والے ہوش میں آجائیں۔ آج موقع ہے اس کو ہاتھ سے نہ کھوئیں ــــ اور اس آیت میں ہلاک کی ہوئی بستیوں کے تعلق سے جو بات فرمائی ہے وہ عام ہے۔ ہر مرنے والے کا یہی حکم ہے۔ کسی کی واپسی ممکن نہیں ــــ رہا خواب میں ارواح کا آنا تو وہ ممکن ہے کیونکہ خواب کی دنیا ہی دوسری ہے۔ اور مخصوص دنوں میں روحوں کے گھروں میں آنے کی روایات صحیح نہیں۔ پس اس عقیدہ کی بنیاد پر جو اعمال کئے جاتے ہیں وہ جائز نہیں ــــ اور بیداری میں جو بعض ارواح کے آنے اور بولنے کے واقعات سنے جاتے ہیں: وہ ہمزاد ہوتے ہیں، مُردوں کی روحیں نہیں ہوتیں۔ ہم زاد کے معنی ہیں: ساتھ پیدا شدہ۔ اور ہم زاد سے مراد وہ شیطان ہے جو ہر انسان کے ساتھ ہمیشہ لگا رہتا ہے۔ جس کو سورۂ قٓ میں ''قرین'' کہا گیا ہے۔ وہ شیطان آدمی کے ساتھ نہیں مرتا۔ اور جب آدمی پر قبر میں عذاب شروع ہوتا ہے تو ہمزاد بھی اس سے متأثر ہوتا ہے۔ اور مردے کی زبان بولنے لگتا ہے کہ ہائے میں مرگیا، جل گیا، میں نے یہ کیا وہ کیا!

اور مرنے والوں کا دنیا کی طرف لوٹنا جس خاص وقت تک ممتنع ہے وہ قیامت کا دن ہے۔ جب قیامت برپا ہوگی تو سب مُردے از سرِ نو زندہ ہوکر اس دنیا کی طرف لوٹ آئیں گے۔ اور اس وقتِ موعود کے قُرب کی ایک خاص علامت ہے۔ اور وہ یاجوج وماجوج کا خروج ہے۔ ارشاد ہے: ــــ (مُردوں کا لوٹنا ممنوع ہے) یہاں تک کہ جب یاجوج وماجوج کھول دیئے جائیں گے، اور وہ ہر بلندی سے پھسلتے آئیں گے، اور برحق وعدہ نزدیک آلگے گا، تو اچانک یہ واقعہ رونما ہوگا کہ جن لوگوں نے انکار کیا ہے ان کی آنکھیں پھٹی کی پھٹی رہ جائیں گی! ــــ یعنی نفخ صور سے پہلے قیامت کی نشانیوں میں سے ایک نشانی یہ پیش آئے گی کہ یاجوج وماجوج کھول دیئے جائیں گے۔ اور ان کے تمام قبیلے ایک ساتھ امنڈ پڑیں گے۔ اور دنیا میں غارت گری شروع کردیں گے۔ اور اپنی مقامی بلندیوں سے یا فضاءِ آسمانی سے تیزی کے ساتھ اترتے ہوئے زمین میں پھیل جائیں گے۔ اس واقعہ کے رونما ہونے کے بعد جلد ہی صور پھونکا جائے گا۔ اور اللہ کا سچا وعدہ یعنی قیامت اچانک آجائے گی۔ اور سب مُردے زندہ ہوجائیں گے۔ اس دن منکرین ہکّے بکّے رہ جائیں گے۔ اور کفِ افسوس ملتے ہوئے کہیں گے: ــــ ہائے ہماری شامت! ہم اس سے یقیناً بے خبر تھے، بلکہ ہم ظلم کرنے والے تھے ــــ یعنی پہلے تو کہیں گے کہ ہم اس سے غافل تھے، پھر خود ہی اقرار

کریں گے کہ غفلت کیسی؟ غفلت تو جب ہوتی کہ ہمیں کسی نے خبردار نہ کیا ہوتا۔ سچی بات یہ ہے کہ ہم سرتا سر قصووار ہیں۔ ہمیں اللہ کے رسولوں نے چوکنا کیا، مگر ہم غفلت سے بیدار نہ ہوئے ـــــ اور پہلے سورۃ الکہف (آیات ۹۴ تا۹۹) کی تفسیر میں یہ بات بیان کی جا چکی ہے کہ یاجوج وماجوج عام انسانوں کی طرح آدم علیہ السلام کی اولاد ہیں۔ اور حضرت نوح علیہ السلام کی ذریت میں سے ہیں۔ وہ کوئی عجوبۂ روزگار مخلوق نہیں۔ اور علماء کی ایک رائے یہ ہے کہ یاجوج وماجوج منگولیا (تاتار) کے وہ وحشی قبائل ہیں جو یورپ، امریکہ اور روس کی اقوام کے منبع ومنشا ہیں ـــــ اوران کا خروج علاماتِ قیامت میں سے ہے۔ اور آیت میں فتح (کھولنے) سے مراد ان کا عروج ہے۔ دیوار کا ٹوٹنا اوراس سے نکلنا مراد نہیں۔ کیونکہ اس آیت میں دیوار کا کوئی تذکرہ نہیں۔ یہ بات علامہ انور شاہ کشمیری قدس سرہ نے عقیدۃ الاسلام (ص:۲۰۱) میں بیان کی ہے۔ واللہ اعلم بالصواب۔

اس تمہید کے بعد اب کفار کا انجام بیان کیا جاتا ہے: ـــــ تم اور جن کو تم اللہ سے وَرے پوجتے ہو، یقیناً جہنم کا ایندھن ہو۔ تم اس میں وارد ہونے والے ہو۔ اگر یہ معبود ہوتے تو اس میں وارد نہ ہوتے، اور سب اس میں ہمیشہ رہنے والے ہو۔ ان کے لئے جہنم میں چلّانا ہے اور وہ اس میں (کان پڑی) نہیں سنیں گے ـــــ کفار مکہ سے خطاب ہے کہ تمہاری سزا ابدی جہنم ہے، تم کو اور تمہارے اصنام کو جہنم میں جھوکا جائے گا۔ تمہیں اس میں پہنچ کر ہمیشہ رہنا ہے ـــــ اور مورتیوں کو جہنم میں اس لئے ڈالا جائے گا کہ پجاریوں کی حسرت بڑھے، اور وہ جان لیں کہ یہ ہمارے جھوٹے سہارے تھے۔ اگر یہ واقعی معبود ہوتے تو یہاں کیوں ہوتے؟ وہ آج خود کو نہ بچا سکے وہ ہماری کیا مدد کر سکتے ہیں؟! ـــــ اور جہنم میں دوزخیوں کی چیخ وپکار کا یہ عالم ہوگا کہ ان کو کان پڑی آواز سنائی نہ دے گی۔ اور وہ ہمیشہ اس سزا میں گرفتار رہیں گے۔ (رَبَّنَا قِنَا عَذَابَ النَّارِ: الٰہی! جہنم کے عذاب سے ہماری حفاظت فرما!)

قیامت کے دن منکرین کی شامت آئے گی، اس دن نہ کوئی مدد پہنچے گی، نہ کفِ افسوس ملنا کام آئے گا۔

اِنَّ الَّذِيْنَ سَبَقَتْ لَهُمْ مِّنَّا الْحُسْنٰٓى ۙ اُولٰٓئِكَ عَنْهَا مُبْعَدُوْنَ ﴿۱۰۱﴾ لَا يَسْمَعُوْنَ حَسِيْسَهَا ۚ وَهُمْ فِيْ مَا اشْتَهَتْ اَنْفُسُهُمْ خٰلِدُوْنَ ﴿۱۰۲﴾ لَا يَحْزُنُهُمُ الْفَزَعُ الْاَكْبَرُ وَتَتَلَقّٰىهُمُ الْمَلٰٓئِكَةُ ۭ هٰذَا يَوْمُكُمُ الَّذِيْ كُنْتُمْ تُوْعَدُوْنَ ﴿۱۰۳﴾ يَوْمَ

نَطْوِي السَّمَآءَ كَطَيِّ السِّجِلِّ لِلْكُتُبِ ۭ كَمَا بَدَاْنَآ اَوَّلَ خَلْقٍ نُّعِيْدُهٗ ۭ وَعْدًا عَلَيْنَا ۭ اِنَّا كُنَّا فٰعِلِيْنَ ۝۱۰۴ وَلَقَدْ كَتَبْنَا فِي الزَّبُوْرِ مِنْۢ بَعْدِ الذِّكْرِ اَنَّ الْاَرْضَ يَرِثُهَا عِبَادِيَ الصّٰلِحُوْنَ ۝۱۰۵ اِنَّ فِيْ هٰذَا لَبَلٰغًا لِّقَوْمٍ عٰبِدِيْنَ ۝۱۰۶ وَمَآ اَرْسَلْنٰكَ اِلَّا رَحْمَةً لِّلْعٰلَمِيْنَ ۝۱۰۷

اِنَّ	بیشک	لَا يَحْزُنُهُمُ	غمگین نہیں کرے گی انکو	كَمَا	جس طرح
الَّذِيْنَ	جولوگ	الْفَزَعُ	گھبراہٹ	بَدَاْنَا	شروع کیا ہم نے
سَبَقَتْ	پہلے ہوچکی	الْاَكْبَرُ	بہت بڑی	اَوَّلَ	پہلی بار
لَهُمْ	ان کے لئے	وَتَتَلَقّٰهُمُ	اور استقبال کریں گے انکا	خَلْقٍ	پیدائش کو
مِّنَّا	ہماری طرف سے	الْمَلٰٓئِكَةُ	فرشتے	نُّعِيْدُهٗ	لوٹائیں گے ہم اس کو
الْحُسْنٰٓى	خوبی	هٰذَا	یہ	وَعْدًا	وعدہ ہے
اُولٰٓئِكَ	وہ لوگ	يَوْمُكُمُ	تمہارا وہ دن ہے	عَلَيْنَا	ہمارے ذمے
عَنْهَا	جہنم سے	الَّذِيْ	جس کا	اِنَّا كُنَّا	بیشک ہم ہیں
مُبْعَدُوْنَ	دور کیے ہوئے ہیں	كُنْتُمْ	تھے تم	فٰعِلِيْنَ	کرنے والے
لَا يَسْمَعُوْنَ	نہیں سنیں گے وہ	تُوْعَدُوْنَ	وعدہ کیے گئے	وَلَقَدْ	اور البتہ تحقیق
حَسِيْسَهَا[1]	اس کی آہٹ	يَوْمَ[3]	جس دن	كَتَبْنَا	لکھا ہم نے
وَهُمْ	اور وہ	نَطْوِي	لپیٹیں گے ہم	فِي الزَّبُوْرِ	زبور میں
فِيْ مَا[2]	اس میں جس کو	السَّمَآءَ	آسمان کو	مِنْۢ بَعْدِ الذِّكْرِ	نصیحت کے بعد
اشْتَهَتْ	چاہیں گے	كَطَيِّ	لپیٹنے کی طرح	اَنَّ	کہ
اَنْفُسُهُمْ	ان کے جی	السِّجِلِّ[4]	طومار کے	الْاَرْضَ	زمین
خٰلِدُوْنَ	ہمیشہ رہنے والے ہیں	لِلْكُتُبِ	نوشتوں کو	يَرِثُهَا	وارث ہونگے اس کے

(۱) الحَسِیْس: ہلکی آواز، حَسَّ (ن) الشیئَ حَسًّا و حَسِیْسًا: محسوس کرنا۔ (۲) فی ما: خٰلِدُوْنَ سے متعلق ہے۔ (۳) یومَ یا تو لایحزنھم کا ظرف ہے یا اذکر محذوف کا مفعول ہے۔ اور حاصل دونوں کا ایک ہے۔ (۴) سِجِلٌّ: صحیفہ، طومار، فائل۔

عِبَادِیَ	میرے بندے	لَبَلٰغًا[1]	البتہ پیغام ہے	اَرْسَلْنٰكَ	بھیجا ہم نے آپ کو
الصّٰلِحُوْنَ	نیک	لِّقَوْمٍ	لوگوں کے لئے	اِلَّا	مگر
اِنَّ	بیشک	عٰبِدِیْنَ	عبادت کرنے والے	رَحْمَةً	مہربانی
فِیْ هٰذَا	اس میں	وَمَآ	اور نہیں	لِّلْعٰلَمِیْنَ	جہانوں کے لئے

کفار کا انجام بیان کرنے کے بعد اب مؤمنین کا انجام بیان فرماتے ہیں۔ ضمناً کفار کی ایک بات کا جواب بھی نکل آئے گا۔ جب یہ آیت نازل ہوئی کہ کفار اور جن کو وہ اللہ سے کم درجہ میں پوجتے ہیں: سب جہنم کا ایندھن بننے والے ہیں، تو کفار پر یہ بات شاق گذری۔ وہ کہنے لگے کہ اس میں تو ہمارے معبودوں کی سخت توہین کی گئی ہے۔ وہ لوگ اپنے شاعر اِبْنُ الزِّبَعْرٰی[2] کے پاس پہنچے اور اس سے یہ بات ذکر کی، اس نے کہا: اگر میں وہاں ہوتا تو اس کا جواب دیتا۔ ان لوگوں نے پوچھا: آپ کیا جواب دیتے؟ اس نے کہا: میں کہتا کہ نصاریٰ عیسیٰ علیہ السلام کی، یہود عزیر علیہ السلام کی، اور مشرکین فرشتوں کی عبادت کرتے ہیں تو کیا یہ بھی جہنم میں ہوں گے؟ محمد (ﷺ) اس کا کوئی جواب نہ دے سکتے۔ اگر وہ کہتے کہ ہاں یہ بھی جہنم میں ہوں گے تو خود ان کی بات میں تعارض ہوجاتا۔ وہ ان کو نبی اور مقبولِ بارگاہ بھی کہتے ہیں اور ان کو جہنم رسید بھی کرتے ہیں۔ اور اگر نفی میں جواب دیتے تو وجہ فرق بیان نہ کرسکتے کہ مورتیاں ہی جہنم میں کیوں جائیں گی۔ پوجا تو ان حضرات کی بھی ہوئی ہے۔ قریش یہ بات سن کر بغلیں بجانے لگے کہ واہ! یہ بات تو ایسی ہے کہ محمد (ﷺ) اس کا کوئی جواب دے ہی نہیں سکتے۔ سورۃ الزخرف (آیات ۵۷ تا ۶۱) میں اس کا صراحت کے ساتھ اور یہاں اشارۃً جواب دیا گیا ہے۔ ارشاد ہے: —— بیشک جن لوگوں کے لئے ہماری طرف سے خوبی مقدر ہوچکی ہے وہ جہنم سے دور رکھے جائیں گے، وہ اس کی آہٹ تک نہیں سنیں گے —— یعنی جن لوگوں نے دنیا میں نیکی اور سعادت کی راہ اختیار کی ہے، جن کے لئے اللہ تعالیٰ پہلے ہی وعدہ فرما چکے ہیں کہ وہ جنتی ہیں، وہ عذابِ جہنم سے محفوظ رکھے جائیں گے۔ انبیاء، ملائکہ، اولیاء اور نیک مؤمنوں کے لئے اس کا پہلے ہی فیصلہ ہوچکا ہے، اس لئے لوگوں نے ان کو معبود بنایا ہو تو بھی ان کو جہنم سے محفوظ رکھا جائے گا۔ اور اتنا دور رکھا جائے گا کہ وہ اس کی آہٹ تک محسوس نہ کریں گے۔ کیونکہ جنت: دوزخ سے بالکل الگ اور فاصلے پر ہے —— اور وہ اپنی من پسند چیزوں میں ہمیشہ رہیں گے —— یعنی وہ ایسی جگہ ہونگے جہاں ہر عیش وآرام ان کو حاصل ہوگا۔ وہاں سب

(۱) بلاغ: مصدر ہے: پیغام، تبلیغ۔ بَلَغَ (ن) الشیئَ: پہنچنا۔ (۲) عبداللہ بن الزِّبَعْرٰی: فتح مکہ کے بعد مسلمان ہوگئے تھے اور مخلص مسلمان ہیں ۱۲

کچھ ان کی مرضی کے مطابق ہوگا۔ وہ دنیا میں اللہ کے قانون کے پابند تھے، اس لئے وہاں ہر قانون ان کے تابع ہوگا۔ حدیث میں ہے کہ ''دنیا مؤمن کا قید خانہ ہے اور کافر کی جنت!'' (رواہ مسلم) قیدی قید خانہ میں آزاد نہیں ہوتا۔ ہر معاملہ میں حکم کا پابند ہوتا ہے۔ اور قید خانہ میں قیدی کا جی کبھی نہیں لگتا۔ وہ اس کو اپنا گھر نہیں سمجھتا۔ ہر وقت اس سے نکلنے کا خواب دیکھتا ہے۔ اور جنت (باغ) میں کوئی قانونی پابندی نہیں ہوتی۔ اور کبھی وہاں سے نکلنے کو جی نہیں چاہتا۔ پس مؤمن کو چاہئے کہ دنیا میں قانون کی پابندی کرے، اور یہاں جی نہ لگائے۔ جی لگانے کی جگہ جنت ہے۔ وہ کافر ہی ہے جو اس دنیا میں بے قید زندگی گذارتا ہے، من مانی کرتا ہے اور یہاں ہمیشہ رہنا چاہتا ہے ــــــ اور جنت کی یہ کیفیت عارضی اور وقتی نہیں ہوگی، بلکہ دائمی اور غیر منقطع ہوگی۔ پس جنت کی مسرتوں اور راحتوں کا کیا حال ہوگا اس کا کون اندازہ کر سکتا ہے ــــــ ان کو بڑی گھبراہٹ غم گیں نہیں کرے گی ــــــ یعنی قیامت کا دن جو عام لوگوں کے لئے انتہائی گھبراہٹ اور پریشانی کا وقت ہوگا: اس وقت نیک لوگوں پر اطمینان طاری ہوگا۔ جس کا حساب صاف ہو اس کو حساب کا کیا ڈر؟ ــــــ اور فرشتے ان کا استقبال کریں گے (اور مژدہ سنائیں گے کہ) یہ تمہارا وہ دن ہے جس کا تم وعدہ کئے گئے تھے ــــــ یعنی قبروں سے اٹھتے ہی فرشتے ان کا استقبال کریں گے۔ اعزاز واکرام سے انہیں ہاتھوں ہاتھ لیں گے۔ اور کہیں گے کہ جس دائمی مسرت وراحت کا تم سے وعدہ کیا گیا تھا وہ دن آپہنچا، اب تمہارے وارے نیارے ہوجائیں گے۔

اس کے بعد کی دو آیتوں میں یہ مضمون ہے کہ قیامت کا دن بڑی گھبراہٹ کا دن کیوں ہے؟ اور اس دن نیک بندے مطمئن کیوں ہونگے؟ پہلی آیت میں اس کی وجہ یہ بیان کی ہے کہ قیامت کے دن میں بڑے ہولناک واقعات پیش آئیں گے۔ مثلاً سب سے اہم واقعہ یہ پیش آئے گا کہ آسمان بایں ہمہ فراخی لپیٹ کر رکھ دیا جائے گا۔ یہ واقعات گھبراہٹ کا باعث ہوں گے۔ اور دوسری آیت میں یہ بیان ہے کہ جنت کی سرزمین نیک بندوں کی میراث ہے اور اس بات کی ان کو آسمانی کتابوں میں خبر بھی کردی گئی ہے۔ پھر ان کو کس بات کا غم یا ڈر ہوسکتا ہے؟ ارشاد ہے ــــــ جس روز ہم آسمان کو لپیٹ دیں گے جس طرح طومار کاغذات کو لپیٹ لیتا ہے ــــــ یعنی جس طرح فائل میں کاغذات سمیٹ لئے جاتے ہیں: ساتوں آسمان بایں ہمہ پہنائی قیامت کے دن لپٹے ہوئے اللہ تعالیٰ کے دائیں ہاتھ میں ہونگے (سورۃ الزمر آیت ۶۷) اور اس کے علاوہ بھی نہ معلوم کیا کیا واقعات پیش آئیں گے جو گھبراہٹ کا باعث ہونگے۔ پھر ــــــ جس طرح پہلی بار ہم نے آفرینش کی ابتداء کی ہے: ہم اس کو دوبارہ بنائیں گے، یہ ہمارے ذمے وعدہ ہے، ہم ضرور اس کو کر کے رہیں گے ــــــ یعنی جیسی سہولت سے آسمانوں کو پہلی بار پیدا کیا تھا:

اسی طرح دوبارہ بنادیں گے۔ یہ ایک حتمی وعدہ ہے، جو یقیناً پورا ہوکر رہے گا۔

اور البتہ واقعہ یہ ہے کہ ہم نے زبور میں نصیحت کے بعد لکھا ہے کہ زمین کے وارث میرے نیک بندے ہونگے ـــــ زبور: داؤد علیہ السلام کی کتاب ہے۔ اس میں نیکی، راستبازی اور توکل کی نصیحت کے بعد لکھا ہے کہ: ''صادق زمین کے وارث ہونگے، اور اس میں ہمیشہ بسے رہیں گے'' (۳۷ داؤد کا مزمور آیت ۲۹) اور سورۃ الزمر (آیت ۷۴) میں ہے: ''اور (جنتی جنت میں پہنچ کر) کہیں گے: ''اللہ کا شکر ہے کہ اس نے ہم سے کیا ہوا وعدہ پورا کیا، اور ہم کو اس زمین کا وارث بنایا۔ اب ہم جنت میں جہاں چاہیں اپنی جگہ بناسکتے ہیں'' ـــــ غرض اس آیت میں زمین سے جنت کی سرزمین مراد ہے۔ اور اس دنیا کی زمین میں حکومت عطا فرمانے کا تذکرہ سورۃ النور (آیت ۵۵) میں ہے۔

یہ بشارت جو دنیا ہی میں نیک مؤمنین کو آسمانی کتابوں میں دیدی گئی ہے: قیامت کے دن ان کی ڈھارس بندھائے گی۔ اور خوف وحزن کے بجائے ان کے دل میں یہ امید پیدا کرے گی کہ وہ عنقریب اپنی سعی کا پھل پانے والے ہیں، نتائج خیر سے ہمکنار ہونے والے ہیں، اور جنت میں پہنچ کر سدا عیش کرنے والے ہیں ـــــ بیشک اس میں عبادت گزار بندوں کے لئے ایک پیغام ہے ـــــ یعنی اس بشارت کا ایک فائدہ تو وہ ہے جو اوپر مذکور ہوا کہ مؤمنین قیامت کے دن مطمئن ہونگے، دوسرا فائدہ یہ ہے کہ بندگی کرنے والے بندگی میں منہمک رہیں، وہ آخرت میں اجر کی امید باندھے رات دن تعمیلِ حکم میں لگے رہیں۔ ان کے لئے اس مضمون میں یہ پیغام ہے کہ ان کی بندگی ضائع نہیں جائے گی۔ اس کا صلہ ملے گا اور بہت بڑا ملے گا یعنی وہ جنت کی زمین کے مالک ہونگے۔

اس کے بعد کی آیت میں یہ مضمون ہے کہ نبی ﷺ کی بعثت دراصل دنیا جہاں کے لئے رحمت اور مہربانی ہے۔ ارشاد ہے: ـــــ اور ہم نے آپ کو جہانوں کے لئے رحمت ہی بنا کر بھیجا ہے ـــــ آپ نے تشریف لاکر غفلت میں پڑی ہوئی دنیا کو چوکنا اور ان کو جنت سے ہمکنار کیا۔ پس آپ کی بعثت سراسر لوگوں کے لئے رحمت ہے۔ اور کفار مکہ کا یہ خیال غلط ہے کہ آپؐ کی بعثت قوم کے لئے زحمت ومصیبت ہے۔ آپؐ کی وجہ سے قوم میں پھوٹ پڑگئی یہ پھوٹ تو خود انھوں نے ڈالی ہے اس طرح کہ اللہ کے داعی کی بات نہ مانی!

فائدہ: نبوت مطلقاً رحمت ہے۔ اس آیت میں رحمت کا حصر کیا گیا ہے۔ ذاتِ پاک ﷺ کا حصر نہیں کیا گیا۔ عربی کا قاعدہ ہے کہ جس چیز کا حصر کرنا مقصود ہوتا ہے اس کو إلاَّ کے بعد لاتے ہیں۔ اگر یہ کہنا ہو کہ زید ہی کھڑا ہے تو کہیں گے: ما قائم إلا زید اور اگر قیام کا حصر کرنا مقصود ہو تو کہیں گے: مازید إلا قائم۔ آیت کریمہ میں إلا کے بعد رحمة کو لایا گیا ہے۔ پس آیت کے معنی یہ ہونگے کہ ہم نے آپ کو رحمت ہی بنا کر بھیجا ہے زحمت بنا کر نہیں بھیجا۔

آیت پاک کا یہ مطلب نہیں کہ آپ ہی رحمت ہیں، دیگر انبیاء رحمت نہیں ۔ بلکہ نبوت مطلقاً رحمت ہے۔ انبیاء علیہم السلام اسی لئے آتے ہیں کہ لوگوں کو جنت کا راستہ دکھائیں اور جہنم سے بچائیں۔ نبی ﷺ نے اپنی اور لوگوں کی ایک مثال بیان فرمائی ہے۔ فرمایا: ''ایک شخص نے آگ جلائی۔ جب آگ نے اپنے ماحول کو روشن کر دیا تو پتنگے اور دوسرے آگ پر فریفتہ ہونے والے جانور آ کر اس میں گرنے لگے۔ ایک شخص آیا اور وہ ان کو روکنے لگا، مگر وہ اس پر غالب آ گئے، اور زبردستی آگ میں گھسنے لگے! پس میں نے تمہاری کمریں پکڑ کر آگ سے بچانا شروع کیا، مگر تم زبردستی اس میں گھسے جا رہے ہو! (بخاری حدیث ۶۴۸۳) یہ وہ بدنصیب ہیں جو رحمت سے فیضیاب ہونے کے لئے تیار نہیں۔ پس وہی قصوروار ہیں، آفتابِ نبوت کا اس میں کچھ قصور نہیں سورج کی روشنی ہر طرف پہنچتی ہے، مگر کوئی اپنے اوپر تمام دروازے اور سوراخ بند کر لے تو یہ اس کی دیوانگی ہے۔

جہاد و قتال بھی سراسر رحمت ہے۔ اس کے ذریعہ اندھوں کی آنکھوں میں بھی روشنی پہنچ جاتی ہے۔

قُلْ اِنَّمَا يُوْحٰٓى اِلَيَّ اَنَّمَآ اِلٰـهُكُمْ اِلٰهٌ وَّاحِدٌ ۚ فَهَلْ اَنْتُمْ مُّسْلِمُوْنَ ﴿۱۰۸﴾ فَاِنْ تَوَلَّوْا فَقُلْ اٰذَنْتُكُمْ عَلٰي سَوَاۗءٍ ۭ وَاِنْ اَدْرِيْٓ اَقَرِيْبٌ اَمْ بَعِيْدٌ مَّا تُوْعَدُوْنَ ﴿۱۰۹﴾ اِنَّهٗ يَعْلَمُ الْجَــهْرَ مِنَ الْقَوْلِ وَيَعْلَمُ مَا تَكْتُمُوْنَ ﴿۱۱۰﴾ وَاِنْ اَدْرِيْ لَعَلَّهٗ فِتْنَةٌ لَّكُمْ وَمَتَاعٌ اِلٰى حِيْنٍ ﴿۱۱۱﴾ قٰلَ رَبِّ احْكُمْ بِالْحَقِّ ۭ وَرَبُّنَا الرَّحْمٰنُ الْمُسْتَعَانُ عَلٰي مَا تَصِفُوْنَ ﴿۱۱۲﴾

(النصف ع)

قُلْ	آپ کہہ دیں	اِلٰهٌ وَّاحِدٌ	ایک معبود ہے	اٰذَنْتُكُمْ (۲)	میں نے تم کو اطلاع کر دی
اِنَّمَا	اس کے سوا نہیں	فَهَلْ اَنْتُمْ	تو کیا تم		
يُوْحٰٓى	(کہ) وحی کی جاتی ہے	مُّسْلِمُوْنَ	ماننے والے ہو؟	عَلٰي سَوَاۗءٍ	یکساں طور پر
اِلَيَّ	میری طرف	فَاِنْ	پس اگر	وَاِنْ	اور نہیں
اَنَّمَآ (۱)	اس کے سوا نہیں	تَوَلَّوْا	سرتابی کریں وہ	اَدْرِيْٓ	جانتا میں
اِلٰـهُكُمْ	(کہ) تمہارا معبود	فَقُلْ	تو آپ کہہ دیں	اَقَرِيْبٌ	کیا نزدیک ہے

(۱) أنما: بھی جمہور کے نزدیک إنما کی طرف کلمۂ حصر ہے۔ (۲) آذَنَ إِيْذَانًا: اطلاع دینا، خبر کر دینا۔

اَمْ	یا	مَا	جو	قٰلَ	کہا پیغمبر نے
بَعِيْدٌ	دور ہے	تَكْتُمُوْنَ	چھپاتے ہو تم	رَبِّ	اے میرے رب!
مَّا	وہ جو	وَاِنْ	اور نہیں	احْكُمْ	فیصلہ فرما
تُوْعَدُوْنَ	تم وعدہ کئے گئے ہو	اَدْرِيْ	جانتا میں	بِالْحَقِّ	برحق
اِنَّهٗ	بیشک وہ	لَعَلَّهٗ	شاید وہ	وَرَبُّنَا	اور ہمارے رب
يَعْلَمُ	جانتے ہیں	فِتْنَةٌ	آزمائش ہو	الرَّحْمٰنُ	نہایت مہربان
الْجَهْرَ	زور سے کہنا	لَّكُمْ	تمہارے لئے	الْمُسْتَعَانُ[1]	مدد مانگے ہوئے ہیں
مِنَ الْقَوْلِ	بات کو	وَمَتَاعٌ	اور فائدہ پہنچانا ہو	عَلٰى مَا	ان باتوں پر جو
وَيَعْلَمُ	اور جانتے ہیں	اِلٰى حِيْنٍ	ایک وقت تک	تَصِفُوْنَ	تم چھانٹتے ہو

یہ سورت کی آخری آیات ہیں۔ان میں دعوتِ انبیاء کا خلاصہ کر کے تنبیہ کی گئی ہے کہ ابھی سنبھلنے کا وقت ہے، ورنہ فیصلے کی گھڑی سر پے کھڑی ہے۔ارشاد ہے: —— آپ (کفار مکہ سے) کہہ دیں: ''میری طرف صرف یہ وحی کی جاتی ہے کہ تمہارا معبود صرف ایک معبود ہے، پس کیا تم ماننے والے ہو؟'' —— یہ دعوتِ انبیاء کا خلاصہ ہے۔توحید کامل ہی اس کا لُبِّ لُباب ہے۔اور یہ ایسی صاف واضح بات ہے جس کے قبول کرنے میں ذرا پس وپیش نہ ہونی چاہئے۔پس کیا تم یہ بات تسلیم کرتے ہو؟ —— اس آیت میں دو حصر ہیں[2]: ایک: ''میری طرف صرف وحی کی جاتی ہے'' یعنی آپ ﷺ رحمتِ عالم ہونے کے باوصف اللہ کے بندے ہیں۔کچھ خدائی شان کے حامل نہیں۔البتہ آپ وحی کے ساتھ ممتاز ہیں۔نبیوں اور رسولوں کا دوسرے انسانوں سے امتیاز اسی وصف کے ذریعہ ہوتا ہے۔دوسرا حصر: ''تمہارا معبود صرف ایک معبود ہے'' یعنی توحید کامل۔جس کی مکرر سکرر دعوت دی جاتی ہے —— پس اگر وہ سرتابی کریں تو آپ کہہ دیں کہ میں تم کو دوٹوک اطلاع کر چکا —— اب تم اپنا انجام سوچ لو ﴿آذنتکم علی سواء﴾ میں نے تم کو خبر کر دی یکساں طور پر یعنی دونوں برابر۔یہ بلیغ کلام ہے۔اس میں تمثیل ہے۔جب دشمن سے مصالحت ہوتی ہے، اور غدر کا اندیشہ ہوتا ہے، تو پیمان پھیر دیا جاتا ہے، اور اس کی خوب تشہیر کر دی جاتی ہے، تا کہ دشمن بے خبر نہ رہے اور نقضِ عہد کا الزام نہ آئے۔کفار کو بھی ایسی صاف وارننگ دی گئی ہے۔

(۱) المستعان: دوسری خبر ہے، اور الرحمن: پہلی خبر ہے۔ المستعان: اسم مفعول، استعانة: مدد مانگنا۔(۲) حَصْر: گھیرنا، احاطہ کرنا، منحصر کرنا۔

اور دعوتِ توحید قبول نہ کرنے کی صورت میں جس عذاب کا کفار سے وعدہ کیا گیا ہے: اس کا وقت قریب آ گیا ہے یا ابھی اس کے آنے میں دیر ہے اس سلسلہ میں نبی ﷺ کا اعلان یہ ہے: —— اور میں نہیں جانتا کہ جس بات کا تم سے وعدہ کیا گیا ہے: وہ قریب ہے یا دور؟ —— رسول کو قطعی علم صرف وقوع عذاب کا ہوتا ہے، وقت اور زمانہ کی تعیین کا علم اسے نہیں دیا جاتا۔ اور اس میں جو مصلحتیں ہیں وہ اللہ تعالیٰ بہتر جانتے ہیں —— وہ بالیقین زور سے کہی ہوئی بات کو جانتے ہیں، اور اس کو بھی جانتے ہیں جس کو تم چھپاتے ہو —— یعنی وہ ہر کھلی چھپی بات سے واقف ہیں۔ وہ خوب جانتے ہیں کہ تمہارے عذاب کے لئے کونسا وقت مناسب ہے —— اور میں نہیں جانتا کہ شاید وہ (تاخیر) تمہارے لئے آزمائش ہو، یا ایک وقت تک فائدہ پہونچانا ہو —— یعنی عذاب آنے میں اگر دیر ہے تو اس میں بھی مصلحت ہے۔ تاخیر عذاب سے ممکن ہے تم کو جانچا جا رہا ہو کہ تم سنبھلتے ہو یا نہیں؟ یا محض ڈھیل دینا مقصود ہوتا کہ حجت تام ہو جائے۔ اور کل قیامت کو ان سے کہا جا سکے: ”کیا ہم نے تم کو اتنی عمر نہیں دی تھی کہ جس کو سمجھنا ہوتا سمجھ سکتا، اور تمہارے پاس ڈرانے والا بھی پہنچا تھا؟!“ (سورۃ الفاطر آیت ۳۷) —— پھر جب تبلیغ کے سارے مرتبے ختم ہو چکے، اور اصلاح کی امید نہ رہی تو پیغمبر نے دعا کی —— اس نے کہا: ”اے میرے پروردگار! آپ برحق فیصلہ فرما دیجئے!“ —— یعنی عملی فیصلہ فرما دیجئے جو اندھوں کو بھی نظر آ جائے۔ یعنی ہر ساز و سامان کے باوجود کافروں کی تباہی و بربادی! —— اور ہمارے پروردگار نہایت مہربان ہیں —— پس جب تم پر عذاب آئے گا وہ ہماری ہر طرح حفاظت فرمائیں گے۔ اور —— ان سے مدد چاہی گئی ہے ان باتوں کے مقابلہ میں جو تم چھانٹتے ہو! —— کوئی کہتا ہے کہ ہم عنقریب مسلمانوں کا نام و نشان مٹا دیں گے، کوئی کہتا ہے کہ یہ چار دن کا ہنگامہ ہے، اس طرح کی تمام باتوں کا جواب صرف یہ ہے کہ خدایا! کافروں کی ہفوات کے مقابلہ میں ہماری مدد فرما، آپ بہترین مدد فرمانے والے ہیں۔

نبیوں اور مؤمنوں کا آخری سہارا اللہ کی مدد ہوتی ہے۔ اسی کی مدد سے وہ منزلِ مقصود تک پہنچتے ہیں
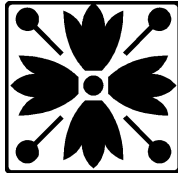
سورۃ الحج

نمبرشمار ۲۲ نزول کا نمبر ۱۰۳ نزول کی نوعیت مدنی آیات ۷۸ رکوع ۱۰

سورت کا نام اور زمانۂ نزول: آیات ۲۷ تا ۳۷ میں حج کے احکام بیان ہوئے ہے، اس لئے اس سورت کا نام ''سورۃ الحج'' رکھا گیا ہے۔ یہ سورت مدنی ہے، کچھ حضرات کی رائے میں مکی ہے، اور کچھ کے نزدیک مکی اور مدنی آیات کا مجموعہ ہے۔ نزول کے نمبر سے اندازہ ہوتا ہے کہ اس سورت کی بعض آیتیں بہت بعد میں نازل ہوئی ہیں۔ قرآن کا نزول شانِ نزول کے مطابق ہوتا تھا، مگر نازل شدہ آیات ترتیب قرآنی میں اسی جگہ رکھی جاتی تھیں جہاں وہ لوح محفوظ کی ترتیب میں ہیں۔ پس بعض آیات اگرچہ بعد میں نازل ہوئیں مگر وہ اس سورت میں شامل کی گئیں۔

سورت کے مضامین: یہ سورتِ پاک قیامت کے تذکرہ سے شروع ہوئی ہے۔ پہلی دو آیتوں میں قیامت کے زلزلہ کا ذکر ہے۔ پھر تین قسم کے لوگوں کا تذکرہ ہے۔ ایک: منکرین کا: جو نہ صرف قیامت کا انکار کرتے ہیں، بلکہ دوسروں کو بھی شک میں مبتلا کرتے ہیں، اس لئے بعث بعد الموت کی دلیل بھی پیش کی گئی ہے (آیات ۳-۱۰) دوسرے: منافقین کا: جو ابھی مذبذب حالت میں ہیں، اگر اسلام میں ان کو فائدے نظر آتے ہیں تو اس پر جمتے ہیں، ورنہ الٹے پاؤں پھر جاتے ہیں (آیات ۱۱-۱۳) تیسرے: مخلص مؤمنین کا۔ ان کے احوال میں خاص طور پر یہ بات بیان کی ہے کہ کفار: مسلمانوں کے ساتھ اللہ کی نصرت دیکھ کر چیں چیڑ کرتے ہیں۔ ان سے کہا گیا ہے کہ اگر تمہیں یہ بات ناگوار ہے تو اللہ کی مدد روکنے کے لئے سارے جتن کر دیکھو، پھر دیکھو تمہاری کوئی تدبیر کارگر ہوتی ہے یا نہیں؟ (آیات ۱۴-۱۶)

اس کے بعد دنیا میں موجود چھ بڑے فرقوں کا تذکرہ کیا ہے۔ جن میں سے ہر ایک خود کو حق پر سمجھتا ہے۔ ان کے

درمیان علمی اور عملی فیصلہ کیا ہے کہ حق پر وہی جماعت ہے جو اللہ کو سجدہ کرتی ہے، اور اس کے احکام کی پیروی کرتی ہے۔ باقی فرقے خوش فہمی میں مبتلا ہیں۔(آیات ۱۷-۲۴)

پھر آیت ۲۵ سے مشرکین مکہ سے خطاب ہے۔یہی لوگ قرآن کے اولین مخاطب تھے۔پہلی آیت میں ان کے کفر کا اور لوگوں کو اسلام سے اور مسجد حرام سے روکنے کا تذکرہ ہے۔اور ان کی اس روش پر گرفت کی گئی ہے کہ انھوں نے مسلمانوں کے لئے مسجد حرام کا راستہ بند کردیا ہے، حالانکہ مسجد حرام ان کی ذاتی ملکیت نہیں۔وہ کسی کو بھی حج وعمرہ سے روکنے کا حق نہیں رکھتے۔پھر مسجد حرام کی تاریخ بیان کی ہے کہ یہ گھر حضرت ابراہیم علیہ السلام نے خدا کے حکم سے بنایا ہے۔اور لوگوں کو حج کی عام اجازت دی ہے۔نیز یہ بتایا ہے کہ یہ گھر شرک کے لئے نہیں، بلکہ خدائے واحد کی بندگی کے لئے تعمیر ہوا ہے۔اور اس میں مقامی لوگوں کا اور باہر سے آنے والوں کا حق مساوی ہے۔مگر مشرکین نے یہ غضب ڈھایا کہ اس کو بتوں کی گندگی سے آلودہ کردیا۔ساتھ ہی حج کے ضروری احکام دیئے ہیں۔اور چار باتیں بیان کی ہیں: ۱-حج میں قربانی کی اہمیت ۲-قربانی کرنے کے بعد احرام کھولنا ۳-منت کی قربانیوں کا حکم ۴-اور طوافِ زیارت کا بیان۔(آیات ۲۵-۲۹)

پھر ہدیوں کے تعلق سے دو باتیں بیان کی ہیں: ۱-ہدیاں قابل احترام ہیں، مگر مشرکین نے جو جانور بتوں کے نام چھوڑ رکھے ہیں ان کی کوئی اصلیت نہیں، وہ شرک کا شاخسانہ ہیں، اور شرک کا حال بہت برا ہے۔۲-ہدیوں کا ادب ضروری ہے۔جانوروں سے ہدی بنانے سے پہلے تک ہر طرح کا انتفاع جائز ہے، مگر ہدی بنانے کے بعد کوئی انتفاع جائز نہیں۔اب ان کو قربان کرکے اخروی فائدہ اٹھایا جائے (آیات ۳۰-۳۳)

پھر چھ نہایت اہم باتیں بیان کی ہیں:

پہلی بات: لوگ قربانی پر اعتراض کرتے ہیں کہ یہ جانوروں پر ظلم ہے۔ان کو جواب دیا ہے، اور جواب کے ضمن میں واضح کیا ہے کہ قربانی کا مقصد صرف جانور کی جان لینا نہیں۔بلکہ اس کا اصل مقصد اللہ کا ذکر ہے۔اور قربانی کرنے والے میں قربانی کے علاوہ چار باتیں اور بھی پائی جانی ضروری ہیں۔(آیات ۳۴-۳۷)

دوسری بات: جہاد کے مسئلہ کو لے کر بھی بعض لوگ اعتراض کرتے ہیں۔اس کا جواب دیا ہے، ساتھ ہی جہاد کی حکمت، اور اس کے نتیجہ میں قائم ہونے والی اسلامی حکومت کا منشور بیان کیا ہے۔(آیات ۳۸-۴۱)

تیسری بات: نبیوں کے انکار کا اور اللہ کی دعوت کو ٹھکرانے کا سلسلہ ہمیشہ سے جاری ہے، اور اس کا وبال بھی کفار ہمیشہ بھگتتے رہے ہیں۔(آیات ۴۲-۵۱)

چوتھی بات: نبیوں کی تاریخ میں ہمیشہ ایسے واقعات پیش آتے رہے ہے جن کے ذریعہ شیطان اسلام کے خلاف محاذ بناتا ہے، لوگوں کو دین سے برگشتہ کرتا ہے اور اسلام کی ترقی میں رخنہ ڈالتا ہے۔ مگر اللہ تعالیٰ جلد اس روک کو ہٹادیتے ہیں، لوگوں کے دلوں سے وساوس دور کردیتے ہیں، اور اسلام کی رفتار بحال کردیتے ہیں۔ اس ضمن میں یہ بات بھی بیان کی ہے کہ اس قسم کے واقعات کیوں پیش آتے ہیں، اور ان میں حکمتیں کیا ہیں؟ (آیات ۵۲-۵۷)

پانچویں بات: مکہ کے مسلمانوں کو مکہ والوں کے ظلم وستم سے تنگ آکر وطن چھوڑنا پڑا تو اس کو بھی کفار نے تضحیک کا ذریعہ بنالیا۔ کہنے لگے: اچھا دین اختیار کیا کہ گھر سے بے گھر ہوگئے! ان مہاجرین سے اجر ونصرت کا وعدہ کیا ہے اور ساتھ ہی مؤمنین کے غلبے اور جہاد کے فائدہ کی طرف اشارہ کیا ہے۔ (آیات ۵۸-۶۶)

چھٹی بات: بعض مشرکین نے کٹ حجتی شروع کی تھی کہ اپنا مارا ہوا (ذبح کیا ہوا) حلال، اور اللہ کا مارا ہوا (مردار) حرام، یہ کیسی الٹی بات ہے؟ ان کو مختصر جواب دیا ہے اور ذبیحہ پر تسمیہ کی حکمت واضح ہے کہ یہ روزمرہ کی قربانی ہے اس لئے اس پر تسمیہ ضروری ہے، اور تسمیہ کا عمل زندہ جانور کے ساتھ ہی قائم ہوسکتا ہے۔ (آیات ۶۷-۷۰)

آخر میں شرک کی شناعت بیان کی ہے، اور یہ بات بیان کی ہے کہ سچا خدا کن صفات کا حامل ہوتا ہے؟ (آیات ۷۱-۷۶)

پھر دین کا خلاصہ پیش کرکے، اس کی تبلیغ اور اس پر مضبوطی سے عمل کرنے کا حکم دیا ہے۔ (آیات ۷۷و۷۸)
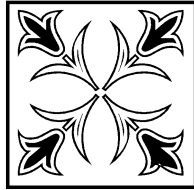
بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ

يٰٓاَيُّهَا النَّاسُ اتَّقُوْا رَبَّكُمْ ۚ اِنَّ زَلْزَلَةَ السَّاعَةِ شَيْءٌ عَظِيْمٌ ① يَوْمَ تَرَوْنَهَا تَذْهَلُ كُلُّ مُرْضِعَةٍ عَمَّآ اَرْضَعَتْ وَتَضَعُ كُلُّ ذَاتِ حَمْلٍ حَمْلَهَا وَتَرَى النَّاسَ سُكٰرٰى وَمَا هُمْ بِسُكٰرٰى وَلٰكِنَّ عَذَابَ اللّٰهِ شَدِيْدٌ ②

بِسْمِ	نام سے	شَيْءٌ	چیز ہے	ذَاتِ حَمْلٍ	حمل والی
اللّٰهِ	اللہ کے	عَظِيْمٌ	بڑی	حَمْلَهَا	اپنے حمل کو
الرَّحْمٰنِ	نہایت مہربان	يَوْمَ	جس دن	وَتَرَى	اور دیکھے گا تو
الرَّحِيْمِ	بڑے رحم والے	تَرَوْنَهَا	دیکھو گے تم اس کو	النَّاسَ	لوگوں کو
يٰٓاَيُّهَا [1]	اے	تَذْهَلُ [2]	بھول جائے گی	سُكٰرٰى [5]	نشے میں
النَّاسُ	لوگو	كُلُّ	ہر	وَمَا هُمْ	اور نہیں ہیں وہ
اتَّقُوْا	ڈرو	مُرْضِعَةٍ [3]	دودھ پلانے والی	بِسُكٰرٰى	نشے میں
رَبَّكُمْ	اپنے رب سے	عَمَّآ	اس کو جسے	وَلٰكِنَّ	مگر
اِنَّ	بیشک	اَرْضَعَتْ [4]	دودھ پلا رہی ہے	عَذَابَ	عذاب
زَلْزَلَةَ	زلزلہ	وَتَضَعُ	اور جن دے گی	اللّٰهِ	اللہ کا
السَّاعَةِ	قیامت کا	كُلُّ	ہر	شَدِيْدٌ	سخت ہے

(۱) جب منادی پر اَلْ داخل ہوتا ہے تو مذکر میں أَيُّهَا اور مؤنث میں أَيَّتُهَا حرفِ ندا کے ساتھ بڑھاتے ہیں۔(۲) ذَهَلَ (ف) ذَهْلاً وذُهُوْلاً: بھولنا، غافل ہوجانا، ذہن سے نکل جانا۔(۳) مُرْضِعَة: ۃ کے ساتھ: وہ عورت جو بالفعل بچے کو دودھ پلا رہی ہو، اور مُرْضِعٌ بغیرۃ کے: دودھ پلانے والی عورت، خواہ بالفعل دودھ پلا رہی ہو یا نہ پلا رہی ہو۔(۴) أَرْضَعَتْ: دودھ پلایا اس عورت نے ما موصولہ کی طرف لوٹنے والی ضمیر محذوف ہے۔ أي أَرْضَعَتْهُ. إِرْضَاع: بچے کو چھاتی سے دودھ پلانا۔(۵) سُكَارَى: سَكْرَان کی جمع: نشہ میں چور، مدہوش، مست، مؤنث سَكْرَىٰ۔

اللہ کے نام سے جو بے حد مہربان بڑے رحم والے ہیں

گذشتہ سورت آخرت کے تذکرہ پر ختم ہوئی تھی۔ یہ سورت اسی بیان سے شروع ہورہی ہے۔ نیز گذشتہ سورت کے شروع میں لوگوں کو جھنجھوڑا گیا تھا کہ حساب کا وقت قریب آ گیا ہے اور تم غفلت میں پڑے ہوئے ہو، یہ سورت بھی قیامت کے زلزلہ کی خبر سے شروع کی گئی ہے۔ ارشاد ہے: ـــــ اے لوگو! اپنے پروردگار سے ڈرو! ـــــ اس کے احکام کی خلاف ورزی مت کرو، اس کے دین کو قبول کرو، اور اس کی ہدایات پر عمل کرو، حساب کا دن آنے والا ہے۔ یہ دنیا ہمیشہ رہنے والی نہیں، اس کو ایک نہ ایک دن ختم ہونا ہے، اور قیامت برپا ہونے والی ہے ـــــ قیامت کا زلزلہ یقیناً بھاری چیز ہے ـــــ جب قیامت قائم ہونے کا وقت آئے گا پہلے سخت بھونچال آئے گا۔ اس وقت زمین پوری طرح ہلادی جائے گی۔ اور زمین کی حالت اس کشتی جیسی ہوجائے گی جو موجوں کے تھپیڑوں سے ڈگمگا رہی ہو، یا اس قندیل جیسی ہوجائے گی جو ہوا کے جھونکوں سے جھول رہی ہو، اس وقت زمین کی آبادی پر کیا گذرے گی، اس کا کچھ حال سنیے: ـــــ جس دن تم اس (زلزلہ) کو دیکھو گے: ہر دودھ پلانے والی عورت دودھ پیتے بچے کو بھول جائے گی۔ اور ہر حمل والی عورت اپنے حمل کو ڈال دے گی، اور تمہیں لوگ مدہوش نظر آئیں گے، جبکہ وہ مدہوش نہیں ہونگے، بلکہ اللہ کا عذاب سخت ہوگا ـــــ یعنی جب قیامت کا بھونچال آئے گا: مائیں اپنے بچوں کو دودھ پلاتے پلاتے چھوڑ کر بھاگ کھڑی ہونگی، ان کو ہوش ہی نہیں رہے گا کہ ان کا لاڈلا کہاں ہے اور کس حال میں ہے؟ اور پیٹ والیوں کے پیٹ گر جائیں گے، اور شدتِ خوف سے لوگ متوالے معلوم ہونگے، حالانکہ انھوں نے پی نہیں رکھی ہوگی، بلکہ اللہ کا عذاب اتنا سخت ہوگا کہ لوگ حواس باختہ ہونگے۔ ایسا ہولناک دن آنے والا ہے، مگر لوگ ہیں کہ خوابِ غفلت میں پڑے ہوئے ہیں۔ فیا لَلْعَجَبْ۔

> لوگو! قیامت یقیناً آنے والی ہے، اور وقوع قیامت کا حادثہ بڑا ہی ہولناک ہے۔ آج اس کی تیاری کرلو تاکہ کل پچھتانا نہ پڑے۔

وَمِنَ النَّاسِ مَنْ يُّجَادِلُ فِي اللهِ بِغَيْرِ عِلْمٍ وَّيَتَّبِعُ كُلَّ شَيْطٰنٍ مَّرِيْدٍ ۝۳ كُتِبَ عَلَيْهِ اَنَّهٗ مَنْ تَوَلَّاهُ فَاَنَّهٗ يُضِلُّهٗ وَيَهْدِيْهِ اِلٰى عَذَابِ السَّعِيْرِ ۝۴ يٰٓاَيُّهَا النَّاسُ اِنْ كُنْتُمْ فِيْ رَيْبٍ مِّنَ الْبَعْثِ فَاِنَّا خَلَقْنٰكُمْ مِّنْ تُرَابٍ ثُمَّ مِنْ نُّطْفَةٍ ثُمَّ مِنْ عَلَقَةٍ ثُمَّ مِنْ مُّضْغَةٍ مُّخَلَّقَةٍ وَّغَيْرِ مُخَلَّقَةٍ لِّنُبَيِّنَ

لَكُمْ ۭ وَنُقِرُّ فِي الْاَرْحَامِ مَا نَشَاۗءُ اِلٰٓى اَجَلٍ مُّسَمًّى ثُمَّ نُخْرِجُكُمْ طِفْلًا
ثُمَّ لِتَبْلُغُوْٓا اَشُدَّكُمْ ۚ وَمِنْكُمْ مَّنْ يُّتَوَفّٰى وَمِنْكُمْ مَّنْ يُّرَدُّ اِلٰٓى اَرْذَلِ
الْعُمُرِ لِكَيْلَا يَعْلَمَ مِنْۢ بَعْدِ عِلْمٍ شَيْـًٔا ۭ وَتَرَى الْاَرْضَ هَامِدَةً فَاِذَآ اَنْزَلْنَا
عَلَيْهَا الْمَاۗءَ اهْتَزَّتْ وَرَبَتْ وَاَنْۢبَتَتْ مِنْ كُلِّ زَوْجٍۢ بَهِيْجٍ ۝٥ ذٰلِكَ بِاَنَّ
اللّٰهَ هُوَ الْحَقُّ وَاَنَّهٗ يُحْيِ الْمَوْتٰى وَاَنَّهٗ عَلٰي كُلِّ شَيْءٍ قَدِيْرٌ ۝٦ وَّاَنَّ السَّاعَةَ
اٰتِيَةٌ لَّا رَيْبَ فِيْهَا ۙ وَاَنَّ اللّٰهَ يَبْعَثُ مَنْ فِي الْقُبُوْرِ ۝٧ وَمِنَ النَّاسِ مَنْ
يُّجَادِلُ فِي اللّٰهِ بِغَيْرِ عِلْمٍ وَّلَا هُدًى وَّلَا كِتٰبٍ مُّنِيْرٍ ۝٨ ثَانِيَ عِطْفِهٖ
لِيُضِلَّ عَنْ سَبِيْلِ اللّٰهِ ۭ لَهٗ فِي الدُّنْيَا خِزْيٌ وَّنُذِيْقُهٗ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ عَذَابَ
الْحَرِيْقِ ۝٩ ذٰلِكَ بِمَا قَدَّمَتْ يَدٰكَ وَاَنَّ اللّٰهَ لَيْسَ بِظَلَّامٍ لِّلْعَبِيْدِ ۝١٠ ع

وَمِنَ	اور کوئی	مَّرِيْدٍ[۲]	سرکش کی	اِلٰى عَذَابِ	عذاب کی طرف
النَّاسِ	انسان	كُتِبَ	لکھا گیا ہے	السَّعِيْرِ	دوزخ کے
مَنْ	(ایسا ہے) جو	عَلَيْهِ	اس پر	يٰٓاَيُّهَا	اے
يُّجَادِلُ	جھگڑا کرتا ہے	اَنَّهٗ[۳]	کہ شان یہ ہے	النَّاسُ	لوگو
فِي اللّٰهِ[۱]	اللہ (کے دین) میں	مَنْ[۴]	جس نے	اِنْ	اگر
بِغَيْرِ عِلْمٍ	علم کے بغیر	تَوَلَّاهُ[۵]	دوستی کی اس سے	كُنْتُمْ	ہوتم
وَّيَتَّبِعُ	اور پیروی کرتا ہے	فَاَنَّهٗ	پس یقیناً وہ	فِيْ رَيْبٍ	کسی شک میں
كُلَّ	ہر	يُضِلُّهٗ	گمراہ کرے گا اس کو	مِّنَ الْبَعْثِ	دوبارہ زندہ ہونے سے
شَيْطٰنٍ	شیطان	وَيَهْدِيْهِ	اور راہ دکھائیگا اس کو	فَاِنَّا	پس بیشک ہم نے

(۱) فی اللہ میں مضاف محذوف ہے، أي في دين الله۔ (۲) مَرِيْد: صفت مشبہ: بمعنی مارد: سرکش، ہر خیر سے خالی۔ (۳) أنه میں ضمیر شان ہے، اس کا مرجع کچھ نہیں، باقی اگلی پچھلی تمام ضمیریں شیطان کی طرف لوٹتی ہیں۔ اور جملہ أنه: كُتِبَ کا نائب فاعل ہے۔ (۴) مَنْ: موصولہ متضمن معنی شرط ہے، اور فأنه اس کی جزاء ہے۔ (۵) تَوَلّٰى تَوَلِّيًا: دوستی کرنا، ساتھی ہونا۔

خَلَقْنٰكُمْ	پیدا کیا ہے تم کو	نُخْرِجُكُمْ	نکالتے ہیں ہم تم کو	الْاَرْضَ	زمین کو
مِّنْ تُرَابٍ	مٹی سے	طِفْلًا	بچہ	هَامِدَةً [۳]	خشک
ثُمَّ	پھر	ثُمَّ	پھر	فَاِذَآ	پس جب
مِنْ نُّطْفَةٍ	نطفہ سے	لِتَبْلُغُوْٓا	تا کہ پہنچو تم	اَنْزَلْنَا	اتارا ہم نے
ثُمَّ	پھر	اَشُدَّكُمْ	تمہاری جوانی کو	عَلَيْهَا	اس پر
مِنْ عَلَقَةٍ [۱]	خونِ بستہ سے	وَمِنْكُمْ	اور تم میں سے بعض	الْمَآءَ	پانی
ثُمَّ	پھر	مَّنْ	جو	اهْتَزَّتْ [۴]	(تو) لہرائی وہ
مِنْ مُّضْغَةٍ	بوٹی سے	يُّتَوَفّٰى	روح قبض کیا جاتا ہے	وَرَبَتْ	اور پھولی وہ
مُّخَلَّقَةٍ [۲]	پیدا کی ہوئی	وَمِنْكُمْ	اور تم میں سے بعض	وَاَنْۢبَتَتْ	اور اگائی اس نے
وَّغَيْرِ	اور نہ	مَّنْ	جو	مِنْ كُلِّ زَوْجٍۢ	ہر قسم سے
مُخَلَّقَةٍ	پیدا کی ہوئی	يُّرَدُّ	پھیرا جاتا ہے	بَهِيْجٍ [۵]	خوشنما
لِّنُبَيِّنَ	تا کہ بیان کریں ہم	اِلٰٓى اَرْذَلِ	طرف نکمی	ذٰلِكَ [۶]	یہ بات
لَكُمْ	تمہارے لئے	الْعُمُرِ	زندگی کے	بِاَنَّ	بایں وجہ کہ
وَنُقِرُّ	اور ٹھہراتے ہیں ہم	لِكَيْلَا	تا کہ نہ	اللّٰهَ	اللہ تعالیٰ
فِي الْاَرْحَامِ	بچہ دانیوں میں	يَعْلَمَ	جانے وہ	هُوَ	ہی
مَا نَشَآءُ	جس کو چاہتے ہیں ہم	مِنْۢ بَعْدِ	بعد	الْحَقُّ	برحق ہیں
اِلٰٓى اَجَلٍ	مدت تک	عِلْمٍ	جاننے کے	وَاَنَّهٗ	اور (بایں وجہ) کہ وہ
مُّسَمًّى	معین	شَيْـًٔا	کچھ	يُحْيِ	زندہ کرتے ہیں
ثُمَّ	پھر	وَتَرَى	اور دیکھتا ہے تو	الْمَوْتٰى	مردوں کو

(۱)عَلَقَة: جمے ہوئے خون کی پھٹکی (گانٹھ، گٹھلی) بہتے خون کو مَسْفُوْح کہتے ہیں۔ اور علقہ کو علقہ اس لئے کہتے ہیں کہ وہ اس رطوبت کے ساتھ جو اس میں لگی رہتی ہے معلق ہوتا ہے (قرطبی) (۲)مُخَلَّقَة: مُضْغَة کی صفت ہے۔ (۳)هَمَدَتِ(ن) الأرضُ: خشکی کی وجہ سے زمین کی روئیدگی بند ہوجانا۔ (۴)اِهْتَزَّ الشیئُ: ہلنا، لہلہانا۔ (۵) بَهِيْج: صفتِ مشبہ: بَهُجَ (ک) بَهَاجَةً: پررونق ہونا، خوبصورت ہونا۔ (۶)ذلك: مبتداء، بأن: اپنے چار معطوفات کے ساتھ خبر۔

وَاَنَّهٗ	اور (بایں وجہ) کہ وہ	مَنْ	جو	فِي الدُّنْيَا	دنیا میں
عَلٰى كُلِّ	ہر چیز پر	يُّجَادِلُ	جھگڑا کرتے ہیں	خِزْيٌ	رسوائی ہے
شَيْءٍ		فِي اللّٰهِ	اللہ (کے دین) میں	وَّنُذِيْقُهٗ	اور چکھائیں گے ہم اسکو
قَدِيْرٌ	قادر ہیں	بِغَيْرِ	بغیر	يَوْمَ الْقِيٰمَةِ	قیامت کے دن
وَّاَنَّ	اور (بایں وجہ) کہ	عِلْمٍ	علم کے	عَذَابَ	عذاب
السَّاعَةَ	قیامت	وَّلَا	اور بغیر	الْحَرِيْقِ	جلتی آگ کا
اٰتِيَةٌ	آنے والی ہے	هُدًى	ہدایت کے	ذٰلِكَ (۴)	یہ سزا
لَّا رَيْبَ	کوئی شبہ نہیں	وَّلَا	اور بغیر	بِمَا	ان اعمال کی وجہ سے
فِيْهَا	اس میں	كِتٰبٍ	کتاب کے		ہے جو
وَاَنَّ	اور (بایں وجہ) کہ	مُّنِيْرٍ	روشن	قَدَّمَتْ	آگے بھیجے
اللّٰهَ	اللہ تعالیٰ	ثَانِيَ (۱)	موڑتے ہوئے	يَدٰكَ	تیرے ہاتھوں نے
يَبْعَثُ	زندہ کریں گے	عِطْفِهٖ (۲)	اپنے پہلو کو	وَاَنَّ	اور (بایں وجہ) کہ
مَنْ	ان کو جو	لِيُضِلَّ (۳)	تاکہ گمراہ کرے وہ	اللّٰهَ	اللہ تعالیٰ
فِي الْقُبُوْرِ	قبروں میں ہیں	عَنْ سَبِيْلِ	راستے سے	لَيْسَ	نہیں
وَمِنَ	اور بعض	اللّٰهِ	اللہ کے	بِظَلَّامٍ	ذرا بھی ظلم کرنے والے
النَّاسِ	انسان	لَهٗ	اس کے لئے	لِّلْعَبِيْدِ	بندوں پر

قیامت کی خبر دینے کے بعد اب تین قسم کے لوگوں کا تذکرہ کیا جاتا ہے۔ **ایک**: وہ لوگ ہیں جو نہ صرف قیامت کا انکار کرتے ہیں، بلکہ دوسروں کا بھی ذہن خراب کرتے ہیں۔ وہ لوگوں کے دلوں میں قیامت کے تعلق سے طرح طرح کے وساوس ڈالتے ہیں۔ اور ان کو اللہ کی راہ سے بے راہ کرتے ہیں۔ **دوسرے**: وہ لوگ ہیں جو محض دنیا کی خاطر دین کو

---

(۱) **ثَانِي**: اسم فاعل، **يجادل** کی ضمیر فاعل سے حال: **ثَنَى (ض) الشيئَ ثَنْيًا**: موڑنا، لپیٹنا، طے کرنا۔ (۲) **عِطْف**: شانہ، پہلو، جانب، جمع **أعطاف**، سر سے سرین تک انسان کی دونوں جانب: دو پہلو ہیں جن کو وہ موڑ سکتا ہے۔ **ثَنَى عِطْفَه**: پہلو موڑا یعنی منہ پھیرا، جیسے **نَأَى بِجَانِبِه**: اس نے پہلو تہی کی، **عَطَفَ عليه**: مہربان ہونا۔ **عَطَفَ عنه**: منہ موڑنا۔ (۳) **لِيُضِلَّ**: **يُجَادِلُ** سے متعلق ہے۔ (۴) **ذلك**: مبتداء، **بما**: اپنے معطوف کے ساتھ خبر۔

اختیار کئے ہوئے ہیں، اور وہ ابھی مذبذب حالت میں ہیں۔ تیسرے: دین میں مخلص مؤمن ہیں۔ ان آیاتِ پاک میں پہلی قسم کے لوگوں کا ذکر ہے۔ ارشاد ہے: —— اور کچھ لوگ ایسے ہیں جو اللہ کی بات میں بغیر دلیل کے جھگڑا کرتے ہیں —— یہ کٹھ حجت کافر ہیں۔ ان کو قیامت کی خبر دی گئی تو وہ بحث کرنے لگے۔ اور علم و دلیل کے بغیر الجھنے لگے —— اور وہ ہر سرکش شیطان کے پیچھے ہو لیتے ہیں —— یعنی وہ اپنے سرغنوں کی دُم پکڑے ہوئے ہیں۔ اور ان کی بولی بولنے لگے ہیں —— اور شیطان جس طرح جنات میں ہوتے ہیں انسانوں میں بھی ہوتے ہیں۔ سورۃ الانعام (آیت ۱۱۲) میں ارشاد ہے: ﴿وَكَذٰلِكَ جَعَلْنَا لِكُلِّ نَبِيٍّ عَدُوًّا شَيَاطِيْنَ الإِنْسِ وَالْجِنِّ، يُوْحِيْ بَعْضُهُمْ إِلٰى بَعْضٍ زُخْرُفَ الْقَوْلِ غُرُوْرًا﴾ یعنی ہم نے اسی طرح ہر نبی کے لئے انسان اور جنات میں سے شیاطین بنائے ہیں جو ایک دوسرے کو چکنی چپڑی باتوں کا وسوسہ ڈالتے رہتے ہیں تاکہ ان کو دھوکہ میں ڈال دیں۔ چنانچہ جو لوگ بداطوار بدقماش لوگوں سے میل جول رکھتے ہیں وہ ان کے خیالات سے متاثر ہو جاتے ہیں، اور اپنے ایمان و عمل کی پونجی کھو بیٹھتے ہیں۔ پس:

زینہار از قرین بد زنہار ❁ وَقِنَا رَبَّنَا عَذَابَ النَّار

پناہ بخدا! برے ساتھی سے پناہ! ❁ اے رب ہمیں جہنم کے عذاب سے بچا!

شیطان کے بارے میں یہ امر طے شدہ ہے کہ جو کوئی اس سے دوستی کرے گا وہ اس کو گمراہ کر کے رہے گا۔ اور اس کو عذابِ دوزخ کی راہ دکھائے گا —— یعنی وہ خود تو ڈوبا ہے دوسروں کو بھی لے ڈوبے گا۔ ان کو گمراہ کر کے دوزخ کے دَر تک پہنچا دے گا۔ اور جو کام اور جو انجام بڑے شیطان کا ہے وہی کام اور وہی انجام اس کے چیلوں کا بھی ہے۔ پس بُروں کی صحبت سے کوسوں دور رہنا چاہئے۔ اور نیکوں کی صحبت اختیار کرنی چاہئے۔

اس کے بعد موت کے بعد کی زندگی کا بیان شروع ہوتا ہے۔ لوگوں کو بعث بعد الموت کا مسئلہ دلائل سے سمجھایا جاتا ہے۔ اور غور کرنے کے لئے تین باتیں پیش کی گئی ہیں: ایک: خود انسان کی پیدائش کے مراتب میں غور کرنا، اور جسم میں روح پڑنے سے پہلے کے مراحل کو سوچنا۔ دوسری: جسم میں روح پڑنے کے وقت سے لے کر موت تک کے احوال میں غور کرنا۔ تیسری: مردہ زمین کی حیاتِ نو میں غور کرنا۔ پھر ان تین باتوں کی پانچ وجوہ بیان کی ہیں۔ اور آخر میں کٹ حجت کافروں کا انجام بیان کیا ہے:

پہلی بات: —— انسان اپنی پیدائش کے مراتب میں غور کرے —— اے لوگو! اگر تمہیں دوبارہ زندہ ہونے میں کچھ شک ہے تو (اپنی خلقت پر غور کرو) ہم نے تم کو یقیناً مٹی سے پیدا کیا ہے، پھر نطفہ سے، پھر خون کی جمی ہوئی بوند سے، پھر ایسی بوٹی سے جو پیدا کی ہوئی ہے اور نہ پیدا کی ہوئی ہے، تاکہ ہم تمہارے لئے (اپنی قدرت) واضح

کریں ــــ یعنی اگر کسی کو خلجان ہو کہ جب ہم مر کر گل سڑ جائیں گے، ہڈیاں تک ریزہ ریزہ ہو جائیں گی تو دوبارہ کیسے جی اٹھیں گے؟ تو یہ شخص اپنی پیدائش کے مراحل میں غور کرے۔ مٹی سے غذا پیدا ہوتی ہے۔ پھر غذا بدن کا جز بنتی ہے۔ اور خون کی شکل اختیار کرتی ہے۔ پھر اس کا خاص جزء نطفہ کی شکل اختیار کرتا ہے۔ پھر مرد اور عورت کے نطفے بچہ دانی میں پہنچتے ہیں۔ اور اس سے خون کی پُھٹکی بنتی ہے۔ پھر خون کی اس جمی ہوئی بوند سے گوشت کی بوٹی بنتی ہے۔ پھر کسی بوٹی کی تخلیق تو مکمل کر دی جاتی ہے، اور کوئی یونہی ناقص شکل میں گر جاتی ہے۔ غور کرو جس مادّہ سے انسان کا جسم بنتا ہے اس میں حیات موجود ہے؟ نہیں! وہ بے جان مادّہ کو جمع رکھ کر ایک جیتا جاگتا وجود بنا دیتے ہیں تو کیا وہ مرنے کے بعد دوبارہ زندہ نہیں کر سکتے؟ حیرت ہے انسان کہاں بھٹک رہا ہے!

صحیحین میں حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ سے مروی ہے۔ نبی ﷺ نے فرمایا: ''تم میں سے ہر ایک کی پیدائش جمع کی جاتی ہے، اس کی ماں کے پیٹ میں چالیس دن تک نطفہ کی حالت میں (یعنی اس مدت میں نطفہ میں کوئی خاص تبدیلی نہیں ہوتی) پھر اتنی ہی مدت میں عَلقہ (جما ہوا خون) ہوتا ہے۔ پھر اتنی ہی مدت میں مُضغہ (گوشت کی بوٹی) ہوتا ہے۔ پھر اللہ تعالیٰ اس کی طرف ایک فرشتہ بھیجتے ہیں چار باتوں کے ساتھ۔ پس وہ اس کا عمل، اس کی موت، اس کی روزی اور اس کا نیک یا بد ہونا لکھتا ہے۔ پھر اس میں روح پھونکی جاتی ہے'' (مشکوٰۃ حدیث ۸۲) یعنی مراحل تخلیق میں انتقال تدریجی ہوتا ہے۔ یکبارگی نہیں ہوتا۔ اور ہر مرحلہ پہلے والے اور بعد والے مراحل سے مختلف ہوتا ہے۔ مادّہ میں جب تک کوئی نمایاں تبدیلی نہیں ہوتی نطفہ کہلاتا ہے۔ پھر جب اس میں معمولی انجماد پیدا ہوتا ہے تو علقہ کہلاتا ہے۔ پھر جب اس میں خوب انجماد ہو جاتا ہے تو مُضغہ کہلاتا ہے۔ پھر اعضاء بننے شروع ہوتے ہیں۔ اور جب تخلیق مکمل ہو جاتی ہے تو اس میں روح ڈالی جاتی ہے۔

اور ایک دوسری حدیث میں جس کو ابن ابی حاتم رازی اور ابن جریر طبری رحمہما اللہ نے حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ ہی سے روایت کیا ہے: نبی ﷺ نے ارشاد فرمایا ''جب نطفہ مختلف ادوار سے گزرنے کے بعد مُضغہ بن جاتا ہے تو فرشتہ جو انسان کی تخلیق پر مامور ہے: اللہ تعالیٰ سے دریافت کرتا ہے: يَارَبِّ مُخَلَّقَةٌ أَوْ غَيْرُ مُخَلَّقَةٍ؟ اے پروردگار! اس مُضغہ سے انسان کا ہونا مقدر ہے یا نہیں؟ اگر جواب ملتا ہے کہ پیدا کرنا مقدر نہیں تو رحم اس کو ساقط کر دیتا ہے۔ اور اگر جواب ملتا ہے کہ پیدا کرنا مقدر ہے تو فرشتہ پوچھتا ہے: لڑکا یا لڑکی، نیک بخت یا بد بخت؟ اور اس کی عمر کیا ہے؟ اس کا عمل کیسا ہوگا؟ اور کہاں مرے گا؟ (ابن کثیر)

جو شخص جسم میں روح پڑنے سے پہلے کے ان مراحل کو سوچے گا وہ اچھی طرح سے اللہ کی قدرتِ کاملہ کو سمجھ سکتا

ہے۔ جو خدا ایسا قادر ہے وہ مرنے اور گلنے سڑنے کے بعد دوبارہ کیوں پیدا نہیں کر سکتا؟ آخر پہلی بار اس نے مٹی ہی سے تو بنایا ہے، پھر دوبارہ اس کو مٹی سے کیوں نہیں بنا سکتا؟!

دوسری بات: ــــــ زندگی کے مختلف احوال میں غور کرو ــــــ اور (روح پھونکنے کے بعد) ہم بچہ دانیوں میں جس کو چاہتے ہیں ایک مقررہ وقت تک ٹھہراتے ہیں۔ پھر ہم بچہ ہونے کی حالت میں باہر لاتے ہیں۔ پھر (بتدریج بڑھاتے ہیں) تا کہ تم اپنی بھری جوانی کو پہنچو، اور تم میں سے کسی کی روح قبض کر لی جاتی ہے۔ اور تم میں سے کوئی نکمی عمر کی طرف پھیرا جاتا ہے، تا کہ وہ جاننے کے بعد کچھ نہ جانے! ــــــ یعنی جسم میں روح پڑنے کے بعد بچہ فوراً باہر نہیں لایا جاتا۔ ابھی وہ اس دنیا کی آب و ہوا برداشت کرنے کے قابل نہیں۔ اس لئے جتنی مدت رحم میں ٹھہرانا مناسب ہوتا ہے ٹھہرایا جاتا ہے۔ عام طور پر تین چار ماہ تک بچہ بحالتِ حیات رحم مادر میں رہتا ہے، اور پلتا بڑھتا ہے۔ سوچو! اس مدت میں اس کے سانس لینے کا اور غذا کا قدرت نے کیا انتظام کیا ہے؟ پھر اس کو باہر لایا جاتا ہے اور رفتہ رفتہ وہ کمالِ شباب کو پہنچ جاتا ہے۔ پھر کچھ لوگ زندگی کے مختلف مراحل میں چل بستے ہیں۔ اور کچھ بڑھاپے کی نہایت کو پہنچ جاتے ہیں۔ ان کے قُویٰ جواب دیدیتے ہیں۔ یادداشت خراب ہو جاتی ہے اور وہ سب کچھ بھلا دیتے ہیں۔ یہی حال دوسرے قویٰ کا بھی ہو جاتا ہے۔ آنکھ دیکھنے کے قابل نہیں رہتی۔ پیر چار قدم نہیں اٹھا سکتے، کان جواب دیدیتے ہیں اور دانت گر جاتے ہیں، گویا انسان بوڑھا ہو کر پھر بچہ بن جاتا ہے۔ زندگی کے ان تدریجی تغیرات میں غور کیا جائے تو یہ حقیقت روزِ روشن کی طرح واضح ہو جاتی ہے کہ کائنات کا یہ نظم و انتظام محض اتفاقی نہیں، بلکہ کسی قادر و حکیم کی کارفرمائی ہے ــــــ دنیا کی زندگی میں جسم کمزور بنایا گیا ہے۔ وہ ایک وقت کے بعد ناکارہ ہو جاتا ہے۔ اور بالآخر فنا ہو جاتا ہے۔ پھر آخرت میں یہی جسم نہایت قوی بنایا جائے گا۔ اور اس میں حکمت یہ ہے کہ عمل کی زندگی مختصر ہو۔ اور آخرت میں جنت کی نعمتوں سے تا ابد متمتع ہو۔ جیسے زمین کے لئے طے کیا گیا ہے کہ وہ ہر سال اجڑ جائے، پھر از سرِ نو زندہ ہو، اور مخلوق کو روزی پہنچتی رہے۔

تیسری بات: ــــــ مردہ زمین کی حیاتِ نو میں غور کرو ــــــ اور تم زمین کو خشک پڑی ہوئی دیکھتے ہو، پھر جب ہم اس پر پانی برساتے ہیں تو ہلتی ہے اور پھولتی ہے، اور ہر قسم کی خوشنما نباتات اگاتی ہے! ــــــ یعنی تم ہر سال یہ نظارہ اپنی آنکھوں سے دیکھتے ہو کہ زمین خشک پڑی ہوتی ہے۔ موسم باراں آتا ہے۔ آفتاب کی گرمی سمندر پر پڑتی ہے۔ بخارات اٹھتے ہیں اور بادل بن کر برستے ہیں۔ جونہی زمین آبِ حیات جذب کرتی ہے اس میں حرکت پیدا ہوتی ہے، وہ پھولتی ہے اور اس کی نشو و نما کی صلاحیت بیدار ہوتی ہے۔ اور دیکھتے دیکھتے زمین گل و گلزار بن جاتی ہے۔ ہر طرف سبزہ ہی سبزہ نظر آنے لگتا ہے۔ اور قسما قسم کی نباتات اگ آتی ہیں۔ یہ سب کسی حکیم مطلق کی کارفرمائی ہے۔

زمین کے اس طرح ہر سال اجڑنے میں اور آباد ہونے میں غور کرنے والوں کے لئے بہت سے سبق ہیں۔

پانچ وجوہ: ـــــ یہ باتیں بایں وجہ ہیں کہ (۱) اللہ تعالیٰ ہی کی ہستی برحق ہے (۲) اور وہ بے جان چیزوں میں جان ڈالتے ہیں (۳) اور وہ ہر چیز پر پوری قدرت رکھنے والے ہیں (۴) اور قیامت آنے والی ہے، اس میں ذرا شبہ نہیں (۵) اور اللہ تعالیٰ ان لوگوں کو جو قبروں میں ہیں دوبارہ زندہ کریں گے ـــــ یہ پانچوں باتیں باہم مربوط ہیں۔ انسان اگر اپنی پیدائش میں اور بعد کے احوال میں غور کرے اور زمین کی حیاتِ نو کو سوچے تو اس کو صاف نظر آئے گا کہ اللہ تعالیٰ برحق ہستی ہیں۔ ان کا وجود محض فرضی اور خیالی نہیں۔ اور جس طرح ان کا وجود برحق ہے ان کے کام بھی پُر حکمت ہیں۔ انھوں نے یہ کارخانۂ عالم محض دل بہلانے کے لئے پیدا نہیں کیا، بلکہ خاص مقصد سے پیدا کیا ہے۔ اور ان کی شان بے جان چیزوں میں جان ڈالنا ہے۔ انسان کا جسم جس مادّہ سے بنا ہے اس میں حیات نہیں تھی اسی طرح زمین خشک ہوتی ہے پانی برستے ہیں وہ جی اٹھتی ہے۔ وہ قادر مطلق ہیں۔ ان کی قدرت غیر متناہی ہے۔ وہ جس طرح مخلوقات کو پہلی بار پیدا کر رہے ہیں دوسری بار بھی پیدا کرنے پر قادر ہیں۔ انھوں نے اپنے علم ازلی میں طے کر رکھا ہے کہ قیامت آنے والی ہے۔ اس میں قطعاً کسی شبہ کی گنجائش نہیں۔ کیونکہ انسان کی یہ محدود زندگی جس میں امتحان کی غرض سے نیکی اور بدی باہم مخلوط ہیں اور نیک و بد میں تمیز نہیں، اس کا تقاضا ہے کہ دوسری زندگی آئے جس میں مجرم اور مؤمن کو صاف طور پر ایک دوسرے سے جدا کر دیا جائے۔ اور ہر ایک کو اس مقام پر پہنچا دیا جائے جس کے وہ لائق ہے۔ چنانچہ قیامت کے دن تمام مردوں کو دوبارہ حیاتِ نو بخشی جائے گی اور انصاف کی عدالت قائم ہوگی۔ مؤمنین بامراد ہونگے اور مجرم کیفرِ کردار کو پہنچیں گے۔

کٹ حجت مجرم کا انجام: ـــــ اور کچھ لوگ ایسے ہیں جو اللہ کی بات میں علم وہدایت اور روشن کتاب کے بغیر جھگڑا کرتے ہیں، پہلوتہی کرتے ہوئے، تاکہ (لوگوں کو) اللہ کی راہ سے بے راہ کریں ـــــ اللہ کی بات میں یعنی دینی امور میں جیسے توحید و رسالت اور عقیدۂ آخرت وغیرہ ـــــ اور علم سے مراد عام انسانی علم ہے جو ہر شخص کو حاصل ہے ـــــ اور ہدایت سے مراد دین کی مجموعی راہ نمائی ہے ـــــ اور روشن کتاب سے مراد نص صریح ہے ـــــ اور آیت میں ادنی سے اعلی کی طرف ترقی ہے یعنی اس ضدی کافر کی بات نہ عام انسانی علم سے ہم آہنگ ہوتی ہے، نہ ہی دینِ سماوی کی مجموعی راہ نمائی سے لگا کھاتی ہے۔ اور نہ اس کے پاس آسمانی کتاب کی صریح نص موجود ہے۔ محض اوہام وظنون کی پیروی ہے کہ جب لوگ مر کر گل سڑ جائیں گے، پھر دوبارہ کیسے زندہ ہونگے؟ اور اس قسم کی باتوں کی بنیاد اعراض وتکبر ہے اور مقصد لوگوں کو گمراہی کے راستہ پر ڈالنا ہے ـــــ اس کے لئے دنیا میں رسوائی

ہے، اور قیامت کے دن ہم اس کو جلتی آگ کا مزہ چکھائیں گے ـــــ یعنی رسول کے یہ مخالفین دنیا میں بھی ذلیل وخوار ہونگے اور آخرت میں بھی دوزخ کا ایندھن بنیں گے۔ اور جب آخرت میں ان کو جہنم میں ٹھونسا جائے گا تو ان سے کہا جائے گا ـــــ یہ سزا ان اعمال کی وجہ سے ہے جو تیرے ہاتھوں نے آگے بھیجے ہیں، اور اس وجہ سے ہے کہ اللہ تعالیٰ بندوں پر ظلم کرنے والے نہیں ـــــ اس میں تقدیم وتاخیر ہے یعنی اللہ کی طرف سے کسی پر ظلم وزیادتی نہیں، یہ تیرے اپنے ہی کرتوت ہیں جن کا تو مزہ چکھ رہا ہے۔

دنیا میں ضدی کٹ حجت کی رسوائی کی ایک شکل یہ بھی ہے کہ ایسا شخص گفتگو اور مناظرہ میں اہلِ حق کے سامنے ٹھہر نہ سکے (ماجدی)

وَمِنَ النَّاسِ مَنْ يَّعْبُدُ اللّٰهَ عَلٰى حَرْفٍ ۚ فَاِنْ اَصَابَهٗ خَيْرُ ۨ اطْمَاَنَّ بِهٖ ۚ وَاِنْ اَصَابَتْهُ فِتْنَةُ ۨ انْقَلَبَ عَلٰى وَجْهِهٖ ۚ خَسِرَ الدُّنْيَا وَالْاٰخِرَةَ ۭ ذٰلِكَ هُوَ الْخُسْرَانُ الْمُبِيْنُ ⑪ يَدْعُوْا مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ مَا لَا يَضُرُّهٗ وَمَا لَا يَنْفَعُهٗ ۭ ذٰلِكَ هُوَ الضَّلٰلُ الْبَعِيْدُ ۚ⑫ يَدْعُوْا لَمَنْ ضَرُّهٗٓ اَقْرَبُ مِنْ نَّفْعِهٖ ۭ لَبِئْسَ الْمَوْلٰى وَلَبِئْسَ الْعَشِيْرُ ⑬

وَمِنَ	اور کوئی	خَيْرُ	بھلائی	خَسِرَ	گنوائی اس نے
النَّاسِ	انسان	اطْمَاَنَّ	(تو) مطمئن رہتا ہے	الدُّنْيَا	دنیا
مَنْ	جو	بِهٖ	اس پر	وَالْاٰخِرَةَ	اور آخرت
يَّعْبُدُ	عبادت کرتا ہے	وَاِنْ	اور اگر	ذٰلِكَ	یہ
اللّٰهَ	اللہ کی	اَصَابَتْهُ	پہنچی اس کو	هُوَ	ہی
عَلٰى حَرْفٍ	کنارے پر	فِتْنَةُ	آزمائش	الْخُسْرَانُ	خسارہ ہے
فَاِنْ	پس اگر	انْقَلَبَ	(تو) پلٹ جاتا ہے	الْمُبِيْنُ	کھلا
اَصَابَهٗ	پہنچی اس کو	عَلٰى وَجْهِهٖ	اپنے چہرے پر	يَدْعُوْا	پکارتا ہے وہ

مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ	اللہ سے کم درجہ میں	هُوَ	ہی	اَقْرَبُ	قریب تر ہے
مَا لَا	اس کو جو نہ	الضَّلٰلُ	گمراہی ہے	مِنْ نَّفْعِهٖ	اس کے نفع سے
يَضُرُّهٗ	نقصان پہنچاتا ہے اسکو	الْبَعِيْدُ	دور کی	لَبِئْسَ	یقیناً برا ہے
وَمَا لَا	اور اس کو جو نہ	يَدْعُوْا (۱)	پکارتا ہے وہ	الْمَوْلٰى	کارساز
يَنْفَعُهٗ	نفع پہنچاتا ہے اس کو	لَمَنْ (۲)	یقیناً اس کو	وَلَبِئْسَ	اور یقیناً برا ہے
ذٰلِكَ	یہ	ضَرُّهٗٓ	جس کا ضرر	الْعَشِيْرُ (۳)	ساتھی

ان آیاتِ پاک میں دوسری قسم کے لوگوں کا تذکرہ ہے۔ یہ وہ نام نہاد مسلمان ہیں جو مذبذب حالت میں ہیں، اسلام میں پختہ نہیں۔ بخاری شریف میں حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت ہے کہ جب رسول اللہ ﷺ ہجرت فرما کر مدینہ منورہ میں جلوہ افروز ہوئے تو بعض لوگ آکر مسلمان ہوتے تھے۔ پھر اگر اس کی بیوی کے لڑکا ہوا اور اس کی گھوڑی نے بچہ دیا تو وہ کہتا کہ یہ دین اچھا ہے! اور اگر اس کی بیوی نے بچہ نہ جنا، اور اس کی گھوڑی نے بچہ نہ دیا تو وہ کہتا کہ یہ دین بُرا ہے۔ اس پر یہ آیت نازل ہوئیں۔ (بخاری حدیث نمبر ۴۷۴۲) ارشاد ہے: —— اور کچھ لوگ ایسے ہیں جو کنارے پر کھڑے اللہ کی عبادت کرتے ہیں —— یعنی دنیوی نفع کی امید سے دین قبول کرتے ہیں۔ پھر بھلائی دیکھتے ہیں تو دین پر قائم رہتے ہیں، ورنہ چھوڑ دیتے ہیں —— اس آیت میں میدانِ جنگ میں تذبذب کی حالت میں شرکت کرنے والے کے ساتھ تشبیہ ہے۔ ڈانواں ڈول: فوج کے کنارے پر کھڑا ہوتا ہے۔ اگر دیکھتا ہے کہ اس کی فوج کا پلہ بھاری ہے، فتح کے آثار نمایاں ہیں اور غنیمت کی امید ہے تو وہ فوج میں آملتا ہے۔ اور اگر شکست کے آثار نظر آتے ہیں تو چپکے سے کھسک جاتا ہے۔ یہی حال اس مسلمان کا بھی ہے —— پس اگر اسے کوئی بھلائی پہنچتی ہے تو وہ اس پر مطمئن ہو جاتا ہے، اور اگر اس کو کوئی آزمائش پہنچتی ہے تو وہ اپنے چہرے پر پلٹ جاتا ہے —— یعنی کفر کی طرف لوٹ جاتا ہے —— گنوائی اس نے دنیا وآخرت! —— اس کی تفصیل اگلی دو آیتوں میں ہے —— یہی کھلا ہوا خسارہ ہے! —— کہ نہ خدا ہی ملا نہ وصالِ صنم! نہ اِدھر کا رہا نہ اُدھر کا!

(۱) يَدْعُوْا: دونوں جگہ فعل مضارع، صیغہ واحد مذکر غائب ہے۔ اور قرآنی رسم الخط میں جو واو: واوِ جمع کے مشابہ ہوتا ہے اس کے بعد الف لکھا جاتا ہے۔ (۲) لَمَنْ: میں لام ابتدائیہ ہے جو جملہ اسمیہ پر آتا ہے۔ مَنْ: مبتدا ہے، ضرہ: دوسرا مبتدا ہے، أقرب اس کی خبر ہے، پھر جملہ اسمیہ من کی خبر ہے۔ (۳) العشیر: رفیق، ہم صحبت، ساتھی، میل جول رکھنے والا، صفت مشبہ، بروزن فعیل بمعنی معاشر ج: عُشَرَاء.

دنیا کا خسارہ: ـــــ اور وہ اللہ سے کم درجہ میں ایسوں کو پکارتا ہے جو نہ اس کو نقصان پہنچا سکتے ہیں اور نہ اس کو نفع پہنچا سکتے ہیں ـــــ یعنی خدا کی بندگی چھوڑ کر بتوں کو پکارتا ہے۔اللہ کا دَر چھوڑ کر دوسری چوکھٹوں کی طرف مائل ہوتا ہے۔جن کے اختیار میں نہ ذرّہ برابر بھلائی ہے نہ برائی ـــــ یہی انتہائی درجہ کی گمراہی ہے ـــــ یعنی یہی پرلے درجہ کی حماقت ہے۔کیا جو چیز خدا نے نہیں دی وہ یہ معبودانِ باطل دے سکتے ہیں؟ ہرگز نہیں! ـــــ اور آیت میں نقصان کا تذکرہ نفع سے پہلے کیا گیا ہے۔اس سے یہ ضابطہ بنایا گیا ہے کہ ''جلبِ منفعت سے دفعِ مضرت مقدم ہے''،یعنی پہلے ضرر ہٹانے کی کوشش کرنی چاہئے ،نفع حاصل کرنے کی فکر بعد میں کی جائے گی۔

آخرت کا خسارہ: ـــــ اور وہ ایسوں کو پکارتا ہے جن کا ضرر ان کے نفع سے قریب تر ہے ـــــ یعنی آخرت میں اس کی عبادت میں مطلق نفع نہیں،ضرر ہی ضرر ہے۔اور یہ عربی کا محاورہ ہے یعنی پوجنے کا جو ضرر ہے وہ قطعی اور یقینی ہے،اس لئے فائدہ کا سوال تو بعد کا ہے نقصان ابھی ہاتھوں ہاتھ پہنچ گیا ـــــ یقیناً برا ہے کارساز،اور یقیناً برا ہے رفیق! ـــــ یعنی وہ نہ بڑے کی حیثیت سے کام آیا نہ برابر والے کی حیثیت سے۔پس جس نے بھی اس کو اس راہ پر ڈالا ہے ـــــ خواہ وہ کوئی انسان ہو یا شیطان ـــــ وہ بدترین سرپرست اور بدترین ساتھی ہے!

فائدہ: اس قسم کے مسلمان آج بھی موجود ہیں۔وہ دنیوی فوائد کے پیش نظر دین پر عمل کرتے ہیں۔اگر ان کی مرادیں پوری ہوتی رہیں تو دین اچھا ہے اور اگر وہ کسی آزمائش میں مبتلا ہوجاتے ہیں تو اللہ کی بندگی سے منہ موڑ لیتے ہیں۔اور ان آستانوں پر پہنچ جاتے ہیں جہاں سے ان کو فائدے کی امید ہوتی ہے۔مگر وہاں سے بھی ان کے ہاتھ کچھ نہیں آتا۔کیونکہ ان کے ہاتھ میں ہے ہی کیا؟ وہ نہ نفع کے مالک ہیں نہ نقصان کے۔دینے والے اللہ تعالیٰ ہیں۔اور ملتا وہی ہے جو مقدر میں ہوتا ہے۔البتہ وہ ان سے دعائیں مانگ کر اور ان کے سامنے ہاتھ پھیلا کر اپنا ایمان کھو بیٹھتے ہیں۔

> نفع وضرر کے مالک صرف اللہ تعالیٰ ہیں۔جو لوگ اللہ کو چھوڑ کر دوسروں سے امیدیں وابستہ کرتے ہیں وہ کبھی بامراد نہیں ہوسکتے!

اِنَّ اللّٰهَ يُدْخِلُ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ جَنّٰتٍ تَجْرِيْ مِنْ تَحْتِهَا الْاَنْهٰرُ اِنَّ اللّٰهَ يَفْعَلُ مَا يُرِيْدُ ﴿۱۴﴾ مَنْ كَانَ يَظُنُّ اَنْ لَّنْ يَّنْصُرَهُ اللّٰهُ فِي الدُّنْيَا وَالْاٰخِرَةِ فَلْيَمْدُدْ بِسَبَبٍ اِلَى السَّمَآءِ ثُمَّ لْيَقْطَعْ فَلْيَنْظُرْ هَلْ يُذْهِبَنَّ كَيْدُهٗ مَا

يَغِيْظُ ﴿١٥﴾ وَكَذٰلِكَ اَنْزَلْنٰهُ اٰيٰتٍۭ بَيِّنٰتٍ ۙ وَّاَنَّ اللّٰهَ يَهْدِيْ مَنْ يُّرِيْدُ ﴿١٦﴾

اِنَّ اللّٰهَ	بیشک اللہ	كَانَ يَظُنُّ	گمان کرتا ہے	يُذْهِبَنَّ(۴)	ضرور لے جاتی ہے
يُدْخِلُ	داخل کریں گے	اَنْ لَّنْ	کہ ہرگز نہیں	كَيْدُهٗ	اس کی تدبیر
الَّذِيْنَ	ان کو جو	يَّنْصُرَهُ(۱)	مدد کریں گے اس کی	مَا	اس کو جو
اٰمَنُوْا	ایمان لائے	اللّٰهُ	اللہ تعالیٰ	يَغِيْظُ(۵)	سخت ناراض کرتی ہے
وَعَمِلُوا	اور کئے انھوں نے	فِي الدُّنْيَا	دنیا میں	وَكَذٰلِكَ	اور اسی طرح
الصّٰلِحٰتِ	نیک کام	وَالْاٰخِرَةِ	اور آخرت (میں)	اَنْزَلْنٰهُ	اتارا ہم نے اس کو
جَنّٰتٍ	باغات میں	فَلْيَمْدُدْ(۲)	پس چاہئے کہ دراز ہو	اٰيٰتٍۭ	دلیلیں
تَجْرِيْ	بہتی ہیں	بِسَبَبٍ	کسی ذریعہ سے	بَيِّنٰتٍ	کھلی کھلی
مِنْ تَحْتِهَا	ان کے نیچے سے	اِلَى السَّمَاۗءِ	آسمان کی طرف	وَّاَنَّ	اور یہ کہ
الْاَنْهٰرُ	نہریں	ثُمَّ	پھر	اللّٰهَ	اللہ تعالیٰ
اِنَّ اللّٰهَ	بیشک اللہ تعالیٰ	لْيَقْطَعْ(۳)	چاہئے کہ بند کردے	يَهْدِيْ	راہ دکھاتے ہیں
يَفْعَلُ	کرتے ہیں		(مدد)	مَنْ	جس کو
مَا يُرِيْدُ	جو چاہتے ہیں	فَلْيَنْظُرْ	پس چاہئے کہ دیکھے	يُّرِيْدُ	چاہتے ہیں
مَنْ	جو شخص	هَلْ	کیا	۞	۞

ان آیات میں تیسری قسم کے لوگوں کا تذکرہ ہے۔ یہ مخلص مؤمنین کی جماعت ہے، جو ہر حال میں راہِ حق پر ثابت قدم رہتی ہے۔ اور دل کی تھاہ سے اللہ تعالیٰ کی عبادت کرتی ہے۔ ان کا بہترین انجام سنیں: —— بیشک اللہ تعالیٰ ان لوگوں کو جو ایمان لائے اور انھوں نے نیک کام کئے ایسے باغات میں داخل کریں گے جن کے نیچے سے نہریں بہتی ہیں —— جس کی وجہ سے وہ بہشتیں سدا بہار اور خوش منظر ہونگی —— بیشک اللہ تعالیٰ جو چاہتے ہیں کرتے ہیں —— ان کے کاموں پر کسی کو حرف گیری کا حق نہیں۔ جیسے وہ پہلی قسم کے ضدی کافروں کو دردناک عذاب دیں گے،

(۱) ینصرہ کی ضمیر مفعول مؤمن کی طرف لوٹتی ہے، جس کا تذکرہ الذین آمنوا میں آیا ہے (۲) لِيَمْدُدْ: فعل امر غائب، صیغہ واحد مذکر غائب ہے۔ مَدٌّ مصدر باب نصر: دراز ہونا، لمبا ہونا (۳) لِيَقْطَعْ: کا مفعول محذوف ہے أی النصرة (۴) يُذْهِبَنَّ: فعل مضارع با نون تاکید ثقیلہ، صیغہ واحد مذکر غائب، إِذْهَابٌ مصدر: دور کرنا، زائل کرنا (۵) غَاظَ يَغِيْظُ غَيْظًا: غضبناک بنانا، غصہ دلانا، سخت ناراض کرنا۔

دوسری قسم کے لوگوں کو نامرادی اور ناکامی سے ہمکنار کریں گے۔ اپنے مخلص بندوں کو دائمی نعمتوں سے نوازیں گے، اس پر کسی کو لب کشائی کا حق نہیں۔ اسی طرح اللہ تعالیٰ کا وعدہ ہے: ﴿إِنَّا لَنَنْصُرُ رُسُلَنَا وَالَّذِيْنَ آمَنُوْا فِي الْحَيَاةِ الدُّنْيَا وَيَوْمَ يَقُوْمُ الْأَشْهَادُ﴾ یعنی ہم اپنے پیغمبروں کی اور ایمان والوں کی دنیوی زندگانی میں بھی مدد کرتے ہیں، اور اس دن بھی مدد کریں گے جب گواہی دینے والے کھڑے ہونگے یعنی قیامت کے دن (سورۃ المؤمن آیت ۵۱)

دشمنانِ اسلام اس پر چیں چیڑ کرتے ہیں۔ ان کو اللہ تعالیٰ کا یہ فیصلہ پسند نہیں۔ وہ نہیں چاہتے کہ اللہ تعالیٰ رسول اللہ ﷺ کی اور مؤمنین کی مدد کرے۔ ان سے خطاب ہے: —— جو شخص خیال کرتا ہے کہ اللہ تعالیٰ اس (رسول اور مؤمن بندوں) کی دنیا وآخرت میں ہرگز مدد نہ کریں گے تو اس کو چاہئے کہ کسی ذریعہ سے آسمان تک پہنچ جائے، پھر چاہئے کہ وہ (اللہ کی مدد) بند کردے، پھر چاہئے کہ وہ دیکھے: آیا اس کی تدبیر نے اس چیز کو ختم کردیا جو اس کو سخت ناراض کئے ہوئے ہے؟! —— یعنی اگر کسی کا اللہ کی نصرت پر دل کباب ہو رہا ہے، اور وہ خیال باندھے بیٹھا ہے کہ اللہ تعالیٰ ان لوگوں کی مدد ہرگز نہیں کریں گے، اسلام نہیں پھیلے گا اور اللہ کا بول بالا نہیں ہوگا، تو وہ اپنے سارے جتن کر دیکھے۔ آسمان پر چڑھ جائے اور وہاں سے اللہ کی مدد بند کرا آئے، پھر دیکھے کہ اس کے دل کا کانٹا نکلا یا نہیں؟ وہ دیکھ لے گا کہ اس کی کوئی تدبیر کارگر نہیں ہوئی۔ وہ اللہ کی مدد کو نہیں روک سکتا۔ پھر دل کے پھپھولے پھوڑنے سے کیا فائدہ؟! —— اللہ تعالیٰ مؤمن بندوں کی مدد ضرور کرتے ہیں، خواہ دنیا میں خواہ آخرت میں۔ کبھی دنیا میں بھی ان کو برکتوں سے نوازتے ہیں۔ اور کبھی دنیا میں یہ بات کسی مصلحت سے مقدر نہیں ہوتی تو دنیا کی زندگی تنگی تُرشی میں گزرتی ہے، مگر آخرت میں وہ مؤمن بندوں کو ضرور نوازتے ہیں۔ جنتوں میں داخل کرتے ہیں، اور ابدی راحتوں سے ہم کنار کرتے ہیں —— اور آسمان پر چڑھنے کی بات ناممکن بات پر تعلیق ہے۔ کیونکہ آسمان پر چڑھنا کسی کے لئے ممکن نہیں۔ اور رسول اللہ ﷺ اور مسلمانوں کی مدد آسمانوں کے اوپر سے ہو رہی ہے۔ پس اس میں کوئی کیا روک لگا سکتا ہے؟

اب یہ مضمون تمام کیا جاتا ہے۔ ارشاد ہے: —— اور اسی طرح ہم نے اسے (قرآن کو) اتارا ہے جو کھلی ہوئی دلیلیں ہیں، اور بات یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ جس کو چاہتے ہیں ہدایت فرماتے ہیں —— یعنی یہ صاف واضح باتیں ہیں، مگر سمجھتا وہی ہے جسے خدا سمجھ دے! —— اور ''اسی طرح''، یعنی جس طرح یہ تین قسم کے لوگوں کے احوال واضح طور پر بیان کئے ہیں اسی طرح دین کی ساری باتیں واضح طور پر اس قرآن میں بیان کی گئی ہیں۔

> جو معاندِ اسلام خواہش مند ہے کہ اللہ تعالیٰ اپنے دین کی مدد نہ کریں، اور وہ اسلام کے خلاف دل میں غیظ وغضب رکھتا ہے، وہ جان لے کہ اس کے دل کا یہ کانٹا کبھی نہ نکلے گا۔

اِنَّ الَّذِیۡنَ اٰمَنُوۡا وَ الَّذِیۡنَ ھَادُوۡا وَالصّٰبِئِیۡنَ وَالنَّصٰرٰی وَالۡمَجُوۡسَ وَالَّذِیۡنَ اَشۡرَکُوۡۤا ٭ۖ اِنَّ اللّٰہَ یَفۡصِلُ بَیۡنَھُمۡ یَوۡمَ الۡقِیٰمَۃِ ؕ اِنَّ اللّٰہَ عَلٰی کُلِّ شَیۡءٍ شَہِیۡدٌ ﴿۱۷﴾ اَلَمۡ تَرَ اَنَّ اللّٰہَ یَسۡجُدُ لَہٗ مَنۡ فِی السَّمٰوٰتِ وَمَنۡ فِی الۡاَرۡضِ وَالشَّمۡسُ وَ الۡقَمَرُ وَ النُّجُوۡمُ وَالۡجِبَالُ وَ الشَّجَرُ وَ الدَّوَآبُّ وَکَثِیۡرٌ مِّنَ النَّاسِ ؕ وَکَثِیۡرٌ حَقَّ عَلَیۡہِ الۡعَذَابُ ؕ وَ مَنۡ یُّہِنِ اللّٰہُ فَمَا لَہٗ مِنۡ مُّکۡرِمٍ ؕ اِنَّ اللّٰہَ یَفۡعَلُ مَا یَشَآءُ ﴿ؕ۱۸﴾

اِنَّ	بیشک	بَیۡنَھُمۡ	ان کے درمیان	وَمَنۡ	اور جو
الَّذِیۡنَ	جو لوگ	یَوۡمَ الۡقِیٰمَۃِ	قیامت کے دن	فِی الۡاَرۡضِ	زمین میں ہیں
اٰمَنُوۡا	ایمان لائے	اِنَّ اللّٰہَ	بیشک اللہ تعالیٰ	وَالشَّمۡسُ	اور سورج
وَ الَّذِیۡنَ	اور جو لوگ	عَلٰی کُلِّ	ہر چیز سے	وَ الۡقَمَرُ	اور چاند
ھَادُوۡا (۱)	یہودی ہوئے	شَیۡءٍ		وَ النُّجُوۡمُ	اور ستارے
وَالصّٰبِئِیۡنَ (۲)	اور صابئین	شَہِیۡدٌ (۵)	پوری طرح باخبر ہیں	وَالۡجِبَالُ	اور پہاڑ
وَالنَّصٰرٰی	اور نصاریٰ	اَلَمۡ	کیا نہیں	وَ الشَّجَرُ	اور درخت
وَالۡمَجُوۡسَ	اور مجوس	تَرَ	دیکھا تو نے	وَ الدَّوَآبُّ	اور چوپایے
وَالَّذِیۡنَ	اور جن لوگوں نے	اَنَّ اللّٰہَ	کہ اللہ تعالیٰ	وَکَثِیۡرٌ	اور بہت سے
اَشۡرَکُوۡۤا	شریک ٹھہرایا	یَسۡجُدُ	سجدہ کرتے ہیں	مِّنَ النَّاسِ	لوگوں سے
اِنَّ (۳)	بیشک	لَہٗ	اس کے لئے	وَکَثِیۡرٌ	اور بہت سے
اللّٰہَ	اللہ تعالیٰ	مَنۡ	جو	حَقَّ	ثابت ہو گیا
یَفۡصِلُ (۴)	فیصلہ کریں گے	فِی السَّمٰوٰتِ	آسمانوں میں	عَلَیۡہِ	اس پر

(۱) ھَادَ (ن) ھَوْدًا: تائب ہو کر حق کی طرف لوٹنا۔ موسیٰ علیہ السلام کی قوم نے بچھڑے کی عبادت سے توبہ کی تھی اس لئے وہ ''یہود'' کہلائے۔ (۲) صَبَأَ (ف) صُبُوْءً ا من الشيئ إلى الشيئ: ایک چیز کو چھوڑ کر دوسری چیز اختیار کرنا، مذہب تبدیل کرنا (۳) جملہ إن اللّٰہَ: پہلے إن کی خبر کی جگہ میں ہے۔ (۴) فَصَلَ (ض) فَصْلاً وفصولاً بین الشیئین: دو چیزوں کو الگ الگ کرنا۔ دو میں فیصلہ کرنا۔ (۵) شھید: حاضر و باخبر جس کے علم سے کوئی چیز پوشیدہ نہ ہو۔

الْعَذَابُ	عذاب	اللّٰهُ	اللہ تعالیٰ	اِنَّ اللّٰهَ	بیشک اللہ تعالیٰ
وَمَنْ	اور جس کو	فَمَا لَهٗ	پس نہیں اس کے لئے	يَفْعَلُ	کرتے ہیں
يُّهِنِ[1]	ذلیل کریں	مِنْ مُّكْرِمٍ[2]	کوئی عزت دینے والا	مَا يَشَآءُ	جو چاہتے ہیں

پچھلی آیت میں فرمایا تھا کہ سارا قرآن ہدایت کی واضح دلیلیں ہے۔ مگر ہدایت ہر ایک کا نصیب نہیں۔ اللہ تعالیٰ جس کو توفیق دیں وہی ہدایت پاتا ہے۔ اب اس کی مثال ملاحظہ فرمائیں: دنیا میں چھ بڑے فرقے ہیں: مسلمان، یہودی، صابی، نصاری، مجوسی اور مشرکین۔ ان میں سے ہر ایک خود کو ہدایت پر سمجھتا ہے۔ مگر جب سب کا رخ ایک طرف نہیں تو منزل ایک کیسے ہوسکتی ہے؟ درحقیقت ہدایت پر وہی ہے جس کو اللہ تعالیٰ نے ہدایت دی ہے، دوسرے تمام فرقے اللہ کی راہ پر نہیں۔ اور دنیا میں اگرچہ سب یکساں نظر آتے ہیں، مگر حقیقت میں ان کی راہیں اور ان کی منزلیں الگ ہیں۔ کل قیامت کو اللہ تعالیٰ ان کے درمیان فیصلہ فرمائیں گے۔ اور دودھ کو پانی سے الگ کردیں گے۔ اللہ کے سامنے ہر چیز ہے، وہ سب کچھ جانتے ہیں —— رہا علمی فیصلہ تو وہ یہیں کیا جارہا ہے۔ کیا تم دیکھتے نہیں کہ ساری کائنات اپنے خالق و مالک کے سامنے سجدہ ریز ہے۔ سب اس کی بندگی میں لگے ہوئے ہیں۔ یہی ہدایت یافتہ ہونے کی دلیل ہے۔ جو لوگ اس کی بندگی سے سرتابی کرتے ہیں وہ ہدایت پر کیسے ہوسکتے ہیں؟ —— یہ دونوں آیتوں کا خلاصہ ہے۔ اب تفصیل پڑھیں ارشاد ہے: —— بیشک جو لوگ ایمان لائے، اور جو لوگ یہودی ہوئے، اور صابی، اور نصاری، اور مجوسی، اور جن لوگوں نے شریک ٹھہرایا: اللہ تعالیٰ قیامت کے دن ان کے درمیان فیصلہ فرمائیں گے، اللہ تعالیٰ یقیناً ہر چیز سے بخوبی واقف ہیں —— یعنی یہ سب ہی فرقے خود کو حق پر سمجھتے ہیں، مگر یہ بات کیونکر ممکن ہے؟ جس کا رُخ چین کی طرف ہے وہ بھی مکہ پہنچے، اور جس کا رخ مکہ کی طرف ہے وہ بھی مکہ پہنچے یہ بات کیسے ممکن ہے؟

ہرگز بکعبہ نرسی اے اَعرابی ❁ کیں راہ کہ تو میروی بترکستان است

(اُوبدّو! ہرگز تو کعبہ تک نہیں پہونچے گا ÷ یہ راستہ جس پر تو چل رہا ہے ترکستان کا ہے)

اللہ تعالیٰ قیامت کو اس نزاع کا عملی اور دوٹوک فیصلہ فرمائیں گے، اور ہر ایک کو اس کے ٹھکانے پر پہنچائیں گے۔

(۱) يُهِنْ: فعل مضارع معروف، مَنْ شرطیہ کی وجہ سے مجزوم، صیغہ واحد مذکر غائب، إِهَانَة: باب افعال: ذلیل کرنا، اس میں ھا کے بعد ی التقاء ساکنین کی وجہ سے گرگئی ہے۔ ن پر درحقیقت جزم ہے، آگے ملانے کے لئے کسرہ دیا ہے۔ (۲) مُکرِم: اسم فاعل، إِکرام: مصدر: عزت دینا، اکرام کرنا۔

کیونکہ لوگوں کے تمام احوال ان کے سامنے ہیں وہ علیم وخبیر ہیں۔ پس چاہئے کہ کچھ انتظار کیا جائے۔

فائدہ: یہودی: وہ لوگ ہیں جو حضرت موسیٰ علیہ السلام کے دین پر ہونے کے مدّعی ہیں۔ اور یہودیت: نسلی مذہب ہے۔ مگر عرب کے متعدد قبیلے یہودیوں کی صحبت سے متاثر ہوکر اوران کے علوم سے مرعوب ہوکر یہودی بن گئے تھے، ''جولوگ یہودی ہوئے'' میں یہ سب مراد ہیں ـــــ اور صابی: وہ فرقہ ہے جو عرب کے شمال مشرق میں شام وعراق کی سرحد پر آباد تھا۔ کہتے ہیں کہ یہ لوگ دینِ توحید اور عقیدۂ رسالت کے قائل تھے۔ وہ خود کو حضرت یحییٰ علیہ السلام کی امت کہتے تھے۔ اسی لئے جو اسلام قبول کرتا: مشرکین اس کو صابی کہتے تھے۔ امام ابوحنیفہ رحمہ اللہ ان کو اہل کتاب مانتے ہیں اوران کے ذبیحہ کی حلت اوران کی عورتوں سے نکاح کے جواز کے قائل ہیں۔ دوسرے حضرات کہتے ہیں: صابی: وہ لوگ ہیں جنھوں نے ہر ایک دین میں سے کچھ کچھ باتیں لے لی ہیں، اور حضرت ابراہیم علیہ السلام کو مانتے ہیں، اور فرشتوں کی بھی پرستش کرتے ہیں، اس لئے وہ اہل کتاب نہیں ـــــ اور نصاری: وہ لوگ ہیں جو حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے دین پر ہونے کے دعوے دار ہیں۔ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کا اصل وطن قصبہ ''ناصرہ'' تھا جو بیت المقدس سے ستر میل شمال میں، اور بحر روم سے بیس میل مشرق میں واقع ہے۔ اسی کی طرف نسبت کرتے ہوئے آپ ''یسوع ناصری'' کہلاتے ہیں، اوراُسی مناسبت سے آپ کی طرف منسوب ہونے والوں کو ''نصاری'' کہا جاتا ہے، اور آپ کے نام کی مناسبت سے ''عیسائی'' بھی کہا جاتا ہے ـــــ اور مجوسی: وہ لوگ ہیں جن کا دعوی ہے کہ ہم ''زرتشت'' نبی کی امت ہیں۔ مگر اب وہ آگ کو پوجتے ہیں، اور دو خدا مانتے ہیں: ایک خیر کا خالق جس کا نام ''یزداں'' ہے دوسرا شر کا خالق جس کا نام ''اَہرمن'' ہے۔ اور کہتے ہیں کہ یہ کائنات انہی دونوں خداؤں کی رزمگاہ ہے ـــــ اور مشرکین: سے مراد: صنم پرست اقوام ہیں، خواہ وہ عرب کے مشرک ہوں یا ہندوستان کے بت پرست۔

اہل اسلام میں جو مختلف فرقے ہیں۔ ان میں سے نجات پانے والے صرف وہ ہیں جو رسول اللہ ﷺ اور صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم کے طریق پر ہیں۔ اور وہ امت کا سوادِ اعظم (غالب حصہ) ہیں

مختلف فرقوں میں علمی فیصلہ: ـــــ کیا تم دیکھتے نہیں کہ اللہ تعالیٰ کو سجدہ کرتے ہیں جو آسمانوں میں ہیں، اور جو زمین میں ہیں، اور سورج اور چاند، اور ستارے اور پہاڑ، اور درخت اور چوپایے، اور بہت سے انسان۔ اور بہت سوں پر عذاب ثابت ہوگیا۔ اور جس کو اللہ تعالیٰ ذلیل کریں اس کو کوئی عزت دینے والا نہیں، بیشک اللہ تعالیٰ جو چاہتے ہیں کرتے ہیں! ـــــ یعنی انسان تو اختلاف رکھتے ہیں، مگر دوسری تمام مخلوقات خدا کی مطیع ومنقاد ہے۔

حالانکہ انسان کو ـــــ جس کو ساری مخلوقات سے زیادہ عقل وفہم دیا گیا ہے ـــــ چاہئے تھا کہ وہ سب سے زیادہ خدا کی بندگی پر متفق ہوتا۔ مگر افسوس کہ یہی دانش وبینش رکھنے والی مخلوق اللہ کے سامنے سرنگوں نہیں ہوتی۔ چنانچہ وہ اپنے انکار واعراض کی وجہ سے عذاب کی مستحق ٹھہری۔ اب اِن ذلیلوں کو عزت دینے والا کون ہے؟ سچ ہے: اللہ تعالیٰ فاعلِ مختار ہیں، وہ اپنی حکمت سے جو چاہیں کریں، کوئی ان کا ہاتھ پکڑنے والا نہیں ـــــ سجدہ کے معنی ہیں: انتہائی درجہ کی عاجزی۔ پس ہر مخلوق کا سجدہ اس کے لائق ہوگا۔ غیر مکلّف مخلوقات کا سجدہ تکوینی طور پر اس کا مطیع ومنقاد ہونا ہے۔ یعنی جس غرض سے ان کو پیدا کیا گیا ہے اس کی تکمیل میں لگا رہنا ہے۔ اور انسان کا سجدہ ان سے مختلف ہے۔ ان کا سجدہ اللہ کی بندگی اور ان کے احکام کی اطاعت ہے۔ یہ کام بحمد اللہ! بہت سے انسان کرتے ہیں، اور وہی مسلمان ہیں۔ اور بہت سے انسان اس سے سرتابی کرتے ہیں، اور وہی گمراہ لوگ ہیں، خواہ وہ کوئی فرقہ ہو ـــــ ''جو لوگ آسمانوں میں ہیں'' یعنی فرشتے۔ بہت سے مشرکین نے ان کو معبود بنالیا ہے۔ حالانکہ وہ اللہ تعالیٰ کو سجدہ کرتے ہیں۔ اور جو خود ساجد ہو وہ مسجود کیسے ہوسکتا ہے؟ اور علویات میں سے سورج، چاند اور ستاروں کی بھی لوگ پرستش کرتے ہیں، اور زمینی مخلوقات میں سے پہاڑ، درخت اور چوپایوں کی پرستش کی جاتی ہے۔ لوگ پتھروں کو پوجتے ہیں۔ پیپل اور گائے کی پوجا کرتے ہیں۔ حالانکہ یہ سب مخلوقات اللہ کے آگے جھکی ہوئی ہیں۔ وہ معبود کیسے ہوسکتی ہیں؟ خالق ومالک کو چھوڑ کر ایسی عاجز مخلوق کو پوجنا کونسی عقلمندی ہے؟ مگر انسانوں میں بہت سے ایسے بدنصیب، بدعقل اور ذلیل لوگ ہیں جو اللہ کو چھوڑ کر اس کی مخلوق کے آگے جھکتے ہیں۔ وہ خدا کے فیصلے کا انتظار کریں۔

عزت وذلت اللہ کے اختیار میں ہے۔ انھوں نے مؤمنین کی عزت کا اور منکرین کی ذلت کا فیصلہ کیا ہے۔ اور اللہ کے فیصلہ کو نہ کوئی بدل سکتا ہے، نہ ٹال سکتا ہے۔

هٰذٰنِ خَصْمٰنِ اخْتَصَمُوْا فِيْ رَبِّهِمْ ۡ فَالَّذِيْنَ كَفَرُوْا قُطِّعَتْ لَهُمْ ثِيَابٌ مِّنْ نَّارٍ ۭ يُصَبُّ مِنْ فَوْقِ رُءُوْسِهِمُ الْحَمِيْمُ ﴿۱۹﴾ يُصْهَرُ بِهٖ مَا فِيْ بُطُوْنِهِمْ وَالْجُلُوْدُ ﴿۲۰﴾ وَلَهُمْ مَّقَامِعُ مِنْ حَدِيْدٍ ﴿۲۱﴾ كُلَّمَآ اَرَادُوْٓا اَنْ يَّخْرُجُوْا مِنْهَا مِنْ غَمٍّ اُعِيْدُوْا فِيْهَا ۤ وَذُوْقُوْا عَذَابَ الْحَرِيْقِ ﴿۲۲﴾ اِنَّ اللّٰهَ يُدْخِلُ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ جَنّٰتٍ تَجْرِيْ مِنْ تَحْتِهَا الْاَنْهٰرُ يُحَلَّوْنَ فِيْهَا مِنْ اَسَاوِرَ

ع ۹

مِنْ ذَهَبٍ وَّلُؤْلُؤًا ۭ وَلِبَاسُهُمْ فِيْهَا حَرِيْرٌ ﴿۲۳﴾ وَهُدُوْٓا اِلَى الطَّيِّبِ مِنَ الْقَوْلِ ۚ وَهُدُوْٓا اِلٰى صِرَاطِ الْحَمِيْدِ ﴿۲۴﴾

هٰذٰنِ	یہ دونوں	فِيْ بُطُوْنِهِمْ	ان کے پیٹوں میں ہے	الَّذِيْنَ	ان کو جو
خَصْمٰنِ	دوفریق ہیں	وَالْجُلُوْدُ (۲)	اور کھالیں	اٰمَنُوْا	ایمان لائے
اخْتَصَمُوْا	جھگڑے وہ	وَلَهُمْ	اور ان کے لئے	وَعَمِلُوا	اور کئے انھوں نے
فِيْ رَبِّهِمْ	اپنے رب میں	مَّقَامِعُ (۳)	گرز ہیں	الصّٰلِحٰتِ	نیک کام
فَالَّذِيْنَ	پس جنھوں نے	مِنْ حَدِيْدٍ	لوہے کے	جَنّٰتٍ	باغات میں
كَفَرُوْا	انکار کیا	كُلَّمَآ	جب جب	تَجْرِيْ	بہتی ہیں
قُطِّعَتْ	بیونتے جائیں گے	اَرَادُوْٓا	ارادہ کریں گے وہ	مِنْ تَحْتِهَا	ان کے نیچے سے
لَهُمْ	ان کے لئے	اَنْ يَّخْرُجُوْا	کہ نکلیں وہ	الْاَنْهٰرُ	نہریں
ثِيَابٌ	کپڑے	مِنْهَا	اس (آگ) سے	يُحَلَّوْنَ	زیور پہنائے جائیں
مِّنْ نَّارٍ	آگ کے	مِنْ غَمٍّ (۴)	گھٹن کی وجہ سے		گے وہ
يُصَبُّ	ریڑھا جائے گا	اُعِيْدُوْا	لوٹائے جائیں گے وہ	فِيْهَا	ان (جنتوں) میں
مِنْ فَوْقِ	اوپر سے	فِيْهَا	اس (آگ) میں	مِنْ اَسَاوِرَ (۵)	کنگنوں سے
رُءُوْسِهِمُ	ان کے سروں کے	وَذُوْقُوْا	اور چکھو تم	مِنْ ذَهَبٍ (۶)	سونے کے
الْحَمِيْمُ	کھولتا پانی	عَذَابَ	عذاب	وَّلُؤْلُؤًا (۷)	اور موتی
يُصْهَرُ (۱)	گل جائے گا	الْحَرِيْقِ	جلنے کا	وَلِبَاسُهُمْ	اور ان کی پوشاک
بِهٖ	اس کی وجہ سے	اِنَّ اللّٰهَ	بیشک اللہ تعالیٰ	فِيْهَا	ان (جنتوں) میں
مَا	جو کچھ	يُدْخِلُ	داخل کریں گے	حَرِيْرٌ	ریشم ہے

(۱) صَهَرَ (ف) الشیئَ بالنار: پگھلانا، گلانا۔ (۲) والجلود کا عطف ما پر ہے۔ (۳) مَقَامِعُ: جمع مِقْمَعَةٌ کی: گرز، مڑے ہوئے کنارے والا لکڑی یا لوہے کا ڈنڈا جس سے ہاتھی وغیرہ کو قابو میں کرنے کے لئے مارا جاتا ہے۔ قَمَعَهُ (ف) کنڈی دار ڈنڈا مارنا، سر کے اوپر مارنا۔ (۴) الغَمُّ: رنج، ملال، گھٹن۔ (۵) أَسَاوِر: جمع السِّوَار: ہاتھ کا کنگن، چوڑی جو عورتیں کلائی میں پہنتی ہیں۔ (۶) من ذهب: أَسَاوِرَ کی صفت ہے۔ (۷) لؤلؤًا کا عطف من أَسَاوِرَ پر ہے۔

وَهُدُوٓا (۱)	اور راہ دکھائے گئے وہ	مِنَ الْقَوْلِ	بات کے	اِلٰى صِرَاطِ	طرف راہ
اِلَى الطَّيِّبِ	طرف ستھری	وَهُدُوٓا	اور راہ دکھائے گئے وہ	الْحَمِيْدِ	ستودہ کی

اہلِ اسلام اور اہلِ باطل کے درمیان قیامت کے دن عملی فیصلہ کیا ہوگا؟ ان آیتوں میں اس کا بیان ہے۔ارشاد ہے ـــــ یہ دو فریق ہیں ـــــ ابھی جن چھ جماعتوں کا ذکر آیا ہے ان کو حق و باطل پر ہونے کی حیثیت سے دو فریق قرار دیا ہے۔ایک مؤمنین کا گروہ ہے، دوسرا منکرین کا، جس میں یہود و نصاری، صابی و مجوس اور مشرکین سبھی شامل ہیں۔کیونکہ کفار سب ایک ہی تھیلے کے چٹّے بٹّے ہیں، الكُفْرُ ملةٌ واحدةٌ ـــــ ان میں اپنے رب کے باب میں جھگڑا ہے ـــــ یعنی وہ آپس میں اپنے رب کے معاملہ میں اختلاف رکھتے ہیں۔اہل باطل خدا کے عجز کے قائل ہیں۔وہ اس کے لئے صفاتِ ناقصہ ثابت کرتے ہیں۔وہ کہتے ہیں کہ اللہ سب کام آپ نہیں کرسکتا۔اس لئے اس نے مختلف لوگوں کے درمیان اپنے کام بانٹ دیئے ہیں، اس لئے ہم ان کو پوجتے اور پکارتے ہیں۔وہ اللہ کی ہدایات کو بھی قبول نہیں کرتے، نہ اس کے احکام کے سامنے سر جھکاتے ہیں ـــــ اور مؤمنین اللہ تعالیٰ کو قادر مطلق مانتے ہیں۔ان کا اعتقاد یہ ہے کہ وہ اپنے سب کام خود انجام دیتے ہیں۔وہ علام الغیوب ہیں، سب کی سنتے ہیں اور سب کی حاجتیں پوری کرتے ہیں۔وہ علیم وخبیر اور رحیم وکریم ہیں۔مسلمان اس کے احکام کے سامنے سربسجود رہتے ہیں ـــــ ان دونوں جماعتوں کے درمیان قیامت کے دن جو عملی فیصلہ کیا جائے گا وہ درج ذیل ہے:

منکرین کا انجام: ـــــ پس جنھوں نے (اللہ کے دین کا) انکار کیا ان کے لئے آگ کے کپڑے بیونتے جائیں گے ـــــ یعنی جسم کی ساخت کے مطابق آگ کے کپڑے کاٹے جائیں گے جیسے درزی کاٹتا ہے یا وہ جہنم میں ایسے کپڑے پہنائے جائیں گے جو آگ کی گرمی سے بہت جلد تپ جائیں گے۔سورۃ ابراہیم (آیت ۵۰) میں ہے: ﴿سَرَابِيْلُهُمْ مِنْ قَطِرَانٍ﴾ یعنی ان کے کرتے روغنِ چیڑ کے ہونگے، جو نہایت بدبودار، سیاہ اور تیزی سے آگ پکڑنے والا مادّہ ہے ـــــ ان کے سروں کے اوپر سے کھولتا ہوا پانی ڈالا جائے گا ـــــ یعنی جب وہ نہانا چاہیں گے: کھولتا ہوا گرم پانی ان کے سروں کے اوپر ریڑھا جائے گا ـــــ اس کی وجہ سے، جو کچھ ان کے پیٹوں میں ہوگا اور کھالیں گل جائیں گی ـــــ یعنی انتڑیاں اوجھری وغیرہ سب کچھ پک جائے گا، اور بدن کی بالائی سطح تک گل جائے گی۔پھر وہ اصلی حالت میں لوٹا دیئے جائیں گے۔اور ان کے ساتھ بار بار یہی عمل ہوتا رہے گا۔سورۃ النساء (آیت ۵۶) میں ہے: ''جب بھی ان کی کھالیں پک جائیں گی، ہم ان کو بدل کر دوسری کھالیں دیدیں گے تاکہ وہ عذاب چکھیں'' ـــــ اور

(۱) هُدُوْا: ماضی مجہول، جمع مذکر غائب، مصدر هداية: وہ ہدایت کئے گئے، وہ راستہ بتائے گئے۔

ان کے لئے لوہے کے گرز ہونگے ـــــ یعنی لوہے کے ہتھوڑوں سے ان کی خبر لی جائے گی ـــــ جب بھی وہ گھٹن کی وجہ سے آگ سے نکلنا چاہیں گے: اس میں لوٹا دیئے جائیں گے ـــــ یعنی جب بھی وہ جہنم میں بور ہو جائیں گے، اور اس سے نکل بھاگنے کی سعی کریں گے: اسی میں دھکیل دیئے جائیں گے ـــــ اور (کہا جائے گا) جلنے کا عذاب چکھو! ـــــ یعنی تمہیں اب اسی میں رہنا ہے۔ اب کبھی تمہیں اس سے نکلنا نصیب نہ ہوگا۔

مؤمنین کا انجام: ـــــ بیشک اللہ تعالیٰ ان لوگوں کو جو ایمان لائے اور انھوں نے نیک کام کئے، ایسے باغات میں داخل کریں گے جن کے نیچے سے نہریں بہ رہی ہونگی ـــــ جس کی وجہ سے وہ گل وگلزار بنے ہوئے ہونگے، اور دل فریب منظر پیش کریں گے ـــــ وہ جنت میں سونے کے کنگن اور موتی پہنائے جائیں گے ـــــ یعنی وہ موتیوں کے جڑاؤ والے سونے کے کڑے پہنے ہوئے ہونگے۔ نزولِ قرآن کے وقت یہ شاہوں اور رئیسوں کی زینت تھی۔ جنتیوں کو بھی شاہانہ لباس پہنایا جائے گا۔ یعنی ان کے ہر عنوان سے خوش حالی ٹپکتی ہوگی ـــــ اور ان کا لباس جنت میں ریشم کا ہوگا ـــــ دوزخیوں کا لباس آگ کا تھا، جنتیوں کا ریشم کا ہوگا۔ ببیں تفاوتِ راہ از کجا است تا بکجا؟! ـــــ اور (یہ باتیں ان کو اس وجہ سے نصیب ہونگی کہ) وہ ستھری بات کی راہ دکھائے گئے، اور وہ ستودہ صفات کی راہ دکھائے گئے ـــــ قولِ طیب کلمۂ پاک لا إله إلا الله، محمد رسول الله ہے۔ اور قابل تعریف اللہ کی راہ اسلام کی راہ ہے۔ یعنی ایمان وعمل کی برکت سے جنتیوں کو آخرت میں یہ مقام ملے گا۔ اور هُدُوْا میں اس طرف اشارہ ہے کہ یہ بات توفیقِ خداوندی کی مرہونِ منت ہے۔

> جن مسلمانوں کو ایمان کے ساتھ نیک عمل کی توفیق ملی ہے ان کو خدا کی اس نعمت کا شکر بجالانا چاہئے۔ کیونکہ اس کے صلہ میں سدا بہار جنت اور ان کی نعمتیں نصیب ہونگی۔

فائدہ: سونے کا زیور اور ریشمی لباس بذاتِ خود ممنوع نہیں۔ چنانچہ جنت میں یہ دونوں چیزیں جنتیوں کے لباس میں شامل ہونگی۔ دنیا میں ان کی حرمت ایک مصلحت سے ہے۔ حضرت شاہ ولی اللہ محدث دہلوی قدس سرہ نے حجۃ اللہ البالغہ میں اس پر بہترین کلام کیا ہے۔ جس کو رحمۃ اللہ الواسعہ (جلد پنجم، صفحہ ۴۹۹ تا ۵۲۴) میں یکھا جاسکتا ہے۔ اس کا خلاصہ درخلاصہ یہ ہے:

نبی کریم ﷺ نے عجمیوں کی عادات واطوار پر نظر ڈالی، اور ان کی عیش کوشی اور لذّاتِ دنیا میں سرشاری دیکھی، تو جو باتیں خرابیوں کی جڑ بنیاد نظر آئیں ان کو قطعی حرام کردیا۔ اور جو چیزیں ان سے کم درجہ کی تھیں ان کو مکروہ قرار دیا۔ کیونکہ نبی

ﷺ نے یہ بات جانی کہ یہی چیزیں آخرت فراموشی اور دنیا طلبی میں انہماک کا ذریعہ ہیں۔اس لئے ان کا قلع قمع کردیا۔

خرابی پیدا کرنے والی بڑی چیزیں آٹھ ہیں: ۱-متکبرانہ لباس ۔۲-خوش حالی والے زیورات ۔۳- بالوں کے ذریعہ آرائش ۔۴- کپڑوں وغیرہ میں تصویریں ۔۵- دل بہلانے والی چیزیں ۔۶-سواریوں کا ٹھاٹھ، ۷-سونے چاندی کے برتن ۔۸-عالی شان مکانات اور ان کی آرائش (رحمۃ اللہ ۵:۴۹۹)

> جنت چونکہ دار العمل نہیں بلکہ دار الجزاء ہے، اس لئے وہاں سونے چاندی اور موتی ریشم کا ٹھاٹھ جائز ہوگا۔

اِنَّ الَّذِیۡنَ کَفَرُوۡا وَیَصُدُّوۡنَ عَنۡ سَبِیۡلِ اللّٰہِ وَ الۡمَسۡجِدِ الۡحَرَامِ الَّذِیۡ جَعَلۡنٰہُ لِلنَّاسِ سَوَآءَ ۨ الۡعَاکِفُ فِیۡہِ وَ الۡبَادِ ؕ وَمَنۡ یُّرِدۡ فِیۡہِ بِاِلۡحَادٍۭ بِظُلۡمٍ نُّذِقۡہُ مِنۡ عَذَابٍ اَلِیۡمٍ ﴿۲۵﴾

اِنَّ	بیشک	الَّذِیۡ (۱)	جس کو	یُّرِدۡ (۶)	چاہے
الَّذِیۡنَ	جن لوگوں نے	جَعَلۡنٰہُ	گردانا ہے ہم نے	فِیۡہِ	اس میں
کَفَرُوۡا	انکار کیا	لِلنَّاسِ	لوگوں کے لئے	بِاِلۡحَادٍ (۷)	کج روی سے
وَیَصُدُّوۡنَ	اور روکتے ہیں وہ	سَوَآءَ (۲)	یکساں ہیں	بِظُلۡمٍ	ظلم سے
عَنۡ سَبِیۡلِ	راہ سے	الۡعَاکِفُ (۳)	رہنے والے	نُّذِقۡہُ	چکھائیں گے ہم اس کو
اللّٰہِ	خدا کی	فِیۡہِ	اس میں	مِنۡ عَذَابٍ	عذاب سے
وَ الۡمَسۡجِدِ	اور مسجد سے	وَالۡبَادِ (۴)	اور باہر سے آنے والے	اَلِیۡمٍ	دردناک
الۡحَرَامِ	حرمت والی	وَمَنۡ (۵)	اور جو شخص	۞	۞

(۱) الذی: صلہ کے ساتھ المسجد الحرام کی دوسری صفت ہے (۲) سواءَ: جَعَلْنٰہ کا مفعول ثانی ہے۔ (۳) العاکف: مرفوع ہے سواء کی وجہ سے۔ (۴) الباد: معطوف ہے العاکف پر۔ الباد: اسم فاعل، از بَدَاوَۃ: باہر سے آنے والا، صحرا میں اقامت اختیار کرنے والا۔ (۵) مَنْ: موصولہ متضمن معنی شرط اپنی جزاء نذقہ سے مل کر اِن کی خبر کے مقائم مقام ہے۔ (۶) یُرِدْ کا مفعول متروک ہے۔ لیذھب الذھن إلی کل مذھب (۷) بإلحاد اور بظلم دونوں حال ہیں، یرد کے فاعل سے اِلْحَاد کے لغوی معنی ہیں: میانہ روی سے ہٹنا، کج روی اختیار کرنا۔

اس آیت سے آخر سورت تک مشرکینِ مکہ سے خطاب ہے۔قرآن کریم کے اولین مخاطب یہی تھے۔ یہ خود بھی گمراہی پر جمے ہوئے تھے اور دوسروں کو بھی اللہ کے راستے سے روکتے تھے۔ایمان قبول کرنے والوں پر ستم ڈھاتے تھے، تا آنکہ وہ مکہ چھوڑ دینے پر مجبور ہوگئے۔ان کو اس کا انجام سنایا جارہا ہے۔ارشاد ہے: —— جن لوگوں نے (دینِ اسلام کا) انکار کیا، اور وہ (لوگوں کو) اللہ کی راہ سے روکتے ہیں، اور اس مسجد حرام سے (بھی) روکتے ہیں جس کو ہم نے لوگوں (کی عبادت) کے لئے بنایا ہے۔جس میں مقامی باشندے اور باہر سے آنے والے یکساں ہیں، اور جو شخص اس میں ظلم سے کسی کج روی سے (کسی ممنوع کام کا) ارادہ کرے گا تو ہم یقیناً اس کو دردناک عذاب چکھائیں گے —— یعنی یہ کفار مکہ خود بھی دینِ اسلام کے منکر ہیں، اور چاہتے ہیں کہ اور بھی کوئی اللہ کے راستے پر نہ چلے۔وہ اسلام قبول کرنے والوں پر ظلم وستم ڈھاتے ہیں، اور ان کو اسلام سے روکتے ہیں۔ان لوگوں نے مسلمانوں کے لئے مکہ کی سرزمین تنگ کردی ہے۔وہ مسجد حرام کے زیر سایہ مسلمانوں کو پنپنے نہیں دینا چاہتے۔حالانکہ مسجد حرام میں سب کا حق ہے۔یہاں مقیم ومسافر، شہری اور دیہاتی ہر ایک کو عبادت کرنے کے مساوی حقوق حاصل ہیں۔مگر وہ مسلمانوں کے حق میں کسی بھی طرح روادار نہیں کہ وہ اللہ کے اس گھر میں اللہ کا نام لیں۔ یہ لوگ کان کھول کر سن لیں: جو بھی خدا کی اس مسجد میں ظلم اور کج روی سے کسی بھی غلط کام کا ارادہ کرے گا: اللہ تعالیٰ اس کو یقیناً دردناک عذاب کا مزہ چکھائیں گے۔وہ اللہ کی گرفت سے بچ نہیں سکتا!

فائدہ(۱): آیت پاک میں كَفَرُوْا فعل ماضی ہے، اور يَصُدُّوْنَ فعل مضارع۔فعل ماضی گذشتہ بات کے لئے آتا ہے، اور فعل مضارع حال واستقبال کے لئے۔کفار مکہ کا کفر تو گذشتہ زمانہ کا واقعہ ہے۔اور اللہ کی راہ سے وہ فی الحال بھی روک رہے ہیں اور آئندہ بھی روکیں گے۔چنانچہ حدیبیہ کے سال جب نبی ﷺ اور مسلمانوں نے عمرہ کرنے کا ارادہ کیا تو کفار مکہ نے روک دیا، اور مسلمان عمرہ کا احرام کھول دینے پر مجبور ہوگئے۔ یہ واقعہ جو آئندہ پیش آنے والا ہے اس کی طرف فعل مضارع میں اشارہ ہے۔

فائدہ(۲): مسجد حرام: دراصل کعبہ شریف کا نام ہے۔سورۃ البقرہ (آیت ۱۴۴) میں ہے: ﴿فَوَلِّ وَجْهَكَ شَطْرَ الْمَسْجِدِ الْحَرَامِ﴾ یعنی آپ اپنا چہرہ کعبہ شریف کی طرف پھیر لیجئے۔پھر اُس مسجد کو بھی مسجد حرام کہنے لگے جو بیت اللہ کے گرد بنائی گئی ہے۔اور اسی کے حکم میں تمام مناسک یعنی وہ جگہیں ہیں جہاں حج کے ارکان ادا کئے جاتے ہیں، جیسے منیٰ، مزدلفہ اور عرفات وغیرہ سب جگہیں تمام مسلمانوں کے لئے وقف ہیں۔ان میں کسی کا مالکانہ حق تسلیم نہیں کیا جائے گا۔

فائدہ(۳): مکہ مکرمہ کے دیگر مکانات اور حرم کی باقی زمینیں بعض کے نزدیک وقفِ عام ہیں۔ان کا فروخت کرنا اور کرایہ پر دینا حرام ہے۔مگر امام شافعی رحمہ اللہ کے نزدیک مکہ کے مکانات اور زمینیں ملکِ خاص ہیں۔ان کی خرید وفروخت اور ان کو کرایہ پر دینا درست ہے۔اور امام ابوحنیفہ رحمہ اللہ سے جواز وعدم جواز کی دونوں روایتیں مروی ہیں۔مگر فتوی اس پر ہے کہ ملکِ خاص ہیں ان کی خرید وفروخت اور کرایہ پر دینا درست ہے،مگر حج کے دنوں میں مناسب نہیں۔درمختار میں ہے:وجاز بيعُ بيوتِ مكةَ وأرْضِها بلا كراهة، وبه قال الشافعي، وبه يُفتى اھ (شامی ۵:۲۷۸)[۱]

فائدہ(۴): الحاد کے لغوی معنی ہیں: سیدھے راستہ سے ہٹ جانا،کج روی اختیار کرنا۔اور آیت میں الحاد سے ہر گناہ مراد ہے۔جیسے ممنوعاتِ احرام کا ارتکاب کرنا۔حرم کا شکار مارنا،اس کا درخت کاٹنا،حتی کہ اپنے خادم کو برا بھلا کہنا بھی الحاد میں داخل ہے۔اور جو کام شریعت میں ممنوع ہیں وہ سب جگہ گناہ اور موجب عذاب ہیں،اور حرم شریف میں اس کی شناعت (برائی) بڑھ جاتی ہے۔جس طرح حرم میں نیکی کا ثواب بڑھ جاتا ہے گناہ کا وبال بھی بڑھ جاتا ہے۔پس جن لوگوں کو اللہ تعالیٰ اس پاک جگہ میں لے جائیں وہ ہر گناہ سے اور نازیبا بات سے بچنے کی پوری کوشش کریں۔

حرم کے علاوہ دوسری جگہوں میں محض گناہ کا ارادہ کرنے سے گناہ نہیں لکھا جاتا،جب تک عمل نہ کرے۔اور حرم میں صرف پختہ ارادہ کر لینے سے بھی گناہ لکھا جاتا ہے (ابن مسعود رضی اللہ عنہ)

وَإِذْ بَوَّأْنَا لِإِبْرٰهِيْمَ مَكَانَ الْبَيْتِ أَنْ لَّا تُشْرِكْ بِيْ شَيْئًا وَّ طَهِّرْ بَيْتِيَ لِلطَّآئِفِيْنَ وَالْقَآئِمِيْنَ وَ الرُّكَّعِ السُّجُوْدِ ﴿۲۶﴾ وَأَذِّنْ فِي النَّاسِ بِالْحَجِّ يَأْتُوْكَ رِجَالًا وَّ عَلٰى كُلِّ ضَامِرٍ يَّأْتِيْنَ مِنْ كُلِّ فَجٍّ عَمِيْقٍ ﴿۲۷﴾ لِّيَشْهَدُوْا مَنَافِعَ لَهُمْ وَيَذْكُرُوا اسْمَ اللّٰهِ فِيْٓ أَيَّامٍ مَّعْلُوْمٰتٍ عَلٰى مَا رَزَقَهُمْ مِّنْۢ بَهِيْمَةِ الْأَنْعَامِ ۚ فَكُلُوْا مِنْهَا وَ أَطْعِمُوا الْبَآئِسَ الْفَقِيْرَ ﴿۲۸﴾ ثُمَّ لْيَقْضُوْا تَفَثَهُمْ وَلْيُوْفُوْا نُذُوْرَهُمْ وَلْيَطَّوَّفُوْا بِالْبَيْتِ الْعَتِيْقِ ﴿۲۹﴾

(۱) اس مسئلہ کی اچھی تفصیل تفسیر روح المعانی میں ہے،شائقین اس کی مراجعت فرمائیں ۱۲

وَاِذْ	اور (یاد کرو) جب	وَاَذِّنْ	اور اعلان کر	فِیْٓ اَیَّامٍ	دنوں میں
بَوَّاْنَا[1]	ٹھکانہ دیا ہم نے	فِی النَّاسِ	لوگوں میں	مَّعْلُوْمٰتٍ	جانے ہوئے
لِاِبْرٰهِیْمَ	ابراہیم کو	بِالْحَجِّ	حج کا	عَلٰی مَا	اس پر جو
مَكَانَ	جگہ میں	یَاْتُوْكَ[3]	آئیں آپ کے پاس	رَزَقَهُمْ	عطا فرمائے ان کو
الْبَیْتِ	بیت اللہ کی	رِجَالًا[4]	پیادہ	مِّنْۢ بَهِیْمَةِ	چوپایوں سے
اَنْ	(اور حکم دیا) کہ	وَّعَلٰی كُلِّ ضَامِرٍ[5]	اور ہر دبلی اونٹنی پر	الْاَنْعَامِ[10]	پالتو
لَّا تُشْرِكْ	نہ شریک کر			فَكُلُوْا	پس کھاؤ
بِیْ	میرے ساتھ	یَّاْتِیْنَ[6]	آئیں وہ	مِنْهَا	ان سے
شَیْـًٔا	کسی چیز کو	مِنْ كُلِّ فَجٍّ[7]	ہر گھاٹی سے	وَاَطْعِمُوا	اور کھلاؤ
وَّطَهِّرْ	اور پاک کر			الْبَآئِسَ	بدحال
بَیْتِیَ	میرے گھر کو	عَمِیْقٍ[8]	لمبی (دور)	الْفَقِیْرَ	محتاج کو
لِلطَّآئِفِیْنَ	طواف کرنیوالوں کیلئے	لِّیَشْهَدُوْا[9]	تاکہ دیکھیں وہ	ثُمَّ	پھر
وَالْقَآئِمِیْنَ	اور اعتکاف کرنیوالوں	مَنَافِعَ	فوائد	لْیَقْضُوْا	چاہئے کہ دور کریں
وَالرُّكَّعِ[2]	اور رکوع کرنے والوں	لَهُمْ	اپنے لئے	تَفَثَهُمْ	اپنے میل کچیل
السُّجُوْدِ	اور سجدہ کرنے والوں	وَیَذْكُرُوا	اور لیں وہ	وَلْیُوْفُوْا	اور چاہئے کہ پورا کریں
	(کے لئے)	اسْمَ اللّٰهِ	اللہ کا نام	نُذُوْرَهُمْ	اپنی منتیں

(۱) بَوَّأَ تَبْوِئَةً: قیام کے لئے مناسب جگہ تیار کرنا، ٹھکانہ دینا...... لإبراهيم: مفعول کے قائم مقام ہے...... مكان البيت: بَوَّأْنَا کا ظرف ہے۔(۲) رُكَّعٌ: رَاكِع کی جمع: رکوع کرنے والے...... السُّجُوْد: سَاجِدٌ کی جمع: سجدہ کرنے والے......سجدہ: خضوع میں رکوع کی جنس سے ہے۔ نیز الرُّكَّع السُّجُوْد سے مراد نماز پڑھنے والے ہیں اس لئے عطف نہیں کیا گیا۔(۳) يأتوك: جوابِ امر ہے۔(۴) رِجَالاً: رَاجِلٌ کی جمع ہے: پاپیادہ۔(۵) ضَامِرٌ: دبلا پتلا، مراد دبلی اونٹنی۔ ضَمُر (ن،ک) ضُمُوْرًا: دبلا پتلا ہونا، چھریرا ہونا۔(۶) جملہ يأتين: ضَامِرٌ کی صفت ہے۔(۷) الفَجُّ: پہاڑوں کے بیچ میں طویل کشادہ راستہ، گھاٹی۔(۸) عميق: گہرا یعنی دور یا لمبا (۹) ليشهدوا: يأتوك سے متعلق ہے۔ شَهِدَ الشيئَ: دیکھنا، پانا، قال تعالیٰ: ﴿فَمَنْ شَهِدَ مِنْكُمُ الشَّهْرَ فَلْيَصُمْهُ﴾ (۱۰) أنعام: نَعَمٌ کی جمع ہے۔ اس کا اصل اطلاق اونٹ پر ہوتا ہے۔ عربوں کے نزدیک وہی بڑی نعمت تھی، پھر یہ لفظ بھیڑ بکری اور گائے بھینس پر بھی بولا جانے لگا۔

وَلْيَطَّوَّفُوْا	اور چاہئے کہ طواف کریں	بِالْبَيْتِ	گھر کا	الْعَتِيْقِ [1]	قابل تکریم

گذشتہ آیت میں مسجد حرام (کعبہ شریف) کا تذکرہ آیا ہے۔ اللہ کا یہ گھر اللہ کی عبادت کے لئے بنایا گیا ہے۔ جس میں مقامی لوگوں کا اور باہر سے آنے والوں کا مساوی حق ہے۔ جہاں عبادت کے لئے آنے والوں کو روکنے کا کسی کو حق نہیں۔ مگر مشرکینِ مکہ نے اس کو بتوں کی گندگی سے آلودہ کر دیا تھا۔ اور اس گھر کا مقصد فوت کر دیا تھا۔ مسلمان یہاں عمرہ کرنے آنا چاہتے تھے، مگر مشرکین نے ان کا راستہ روک دیا تھا۔ اب اِن آیات میں اس پاک گھر کا تذکرہ کیا جاتا ہے۔ اور ساتھ ہی حج کے ضروری احکام بھی بیان کئے جاتے ہیں۔ سب سے پہلے مکہ والوں کو اللہ تعالیٰ اپنا ایک احسان یاد دلاتے ہیں۔ ارشاد ہے: ـــــ اور (یاد کرو) جب ہم نے ابراہیم کے لئے بیت اللہ کی جگہ میں بسنے کے لئے مناسب جگہ تجویز کی ـــــ حضرت ابراہیم علیہ السلام نے اللہ کے حکم سے اپنی اہلیہ محترمہ حضرت ہاجرہ رضی اللہ عنہا، اور اپنے شیر خوار صاحبزادے حضرت اسماعیل علیہ السلام کو ملکِ شام سے لاکر جہاں آج کعبہ شریف ہے بسایا تھا۔ اس وقت یہ جگہ ویران اور غیر آباد تھی۔ اور پانی کا نام ونشان نہ تھا۔ اللہ تعالیٰ نے ابراہیم علیہ السلام کی نسل کی ایک شاخ کے بسنے کے لئے یہ مناسب جگہ تجویز فرمائی تھی۔ کیونکہ یہاں بیت اللہ تھا، جو طوفانِ نوح کے وقت اٹھالیا گیا تھا۔ اور اب وہ دوبارہ تعمیر کیا جانے والا تھا۔ اب یہ جگہ ہمیشہ کے لئے آباد ہوجائے گی۔ اور جو یہاں بسے گا وہ بیت اللہ کی دینی اور دنیوی برکتوں سے بہرہ ور ہوگا۔ انہیں دونوں بزرگوں کی نسل سے قریش مکہ ہیں۔ اور انہیں کی دعاؤں سے خوش وخرم زندگی بسر کر رہے ہیں۔ لیکن انھوں نے اس نعمتِ خداوندی کا حق اس طرح ادا کیا کہ ملتِ ابراہیمی سے منحرف ہوگئے۔ ظلم وگمراہی کو اپنا شیوہ بنالیا۔ جس دینِ حق کے قیام کے لئے یہ عبادت گاہ بنائی گئی تھی اس کو بت پرستی کا مرکز بنادیا۔ اور اب وہ لوگ اپنی تمام طاقتیں اسلام کی مخالفت میں خرچ کر رہے ہیں۔

پھر جب حضرت اسماعیل علیہ السلام سنِّ شعور کو پہنچے تو اللہ تعالیٰ نے حضرت ابراہیم علیہ السلام کو کعبہ شریف تعمیر کرنے کا حکم دیا۔ چنانچہ باپ بیٹے نے مل کر یہ مرکزِ توحید تیار کیا۔ جب کعبہ شریف تیار ہوگیا تو اللہ تعالیٰ نے تین احکام دیئے:

پہلا حکم: دیا ـــــ کہ میرے ساتھ کسی چیز کو شریک نہ کرو ـــــ یہ حکم نبی کے واسطہ سے امت کو دیا گیا ہے کہ اس گھر کی بنیاد خالص توحید پر رکھی گئی ہے۔ پس یہاں آکر کوئی مشرکانہ حرکت نہ کرے۔ کعبہ شریف کی پرستش کا خیال بھی دل میں نہ لائے، کعبہ مَعبد (عبادت کی جگہ) ہے معبود نہیں۔ اور اس کو ''قبلہ'' بمعنی ''قبلہ نُما'' کہتے ہیں۔

دوسرا حکم: ـــــ اور میرے گھر کو طواف کرنے والوں، اور اعتکاف کرنے والوں، اور رکوع سجدہ کرنے

(۱) العتیق کے تین معنی ہیں: آزاد، پرانا، اور قابل تکریم۔ تیسرے معنی پہلے دونوں معنی کو اپنے جلو میں لئے ہوئے ہیں۔

والوں کے لئے پاک رکھ ــــــ بیت اللہ کا نفل طواف ہر وقت جاری رہتا ہے۔ صرف جماعت کے وقت بند ہوتا ہے۔ اور یہاں نفل طواف کا ثواب نفل نماز سے زیادہ ہے۔ اور قائمین سے مراد اعتکاف کرنے والے ہیں۔ سورۃ البقرہ (آیت ۱۲۵) میں عاکفین آیا ہے۔ پس یہاں بھی وہی معنی مراد لئے جائیں گے۔ اور رکوع وسجود سے پوری نماز مراد ہے ــــ ان سب کاموں کے لئے اس گھر کو ظاہری اور باطنی گندگیوں سے پاک رکھنے کا حکم ہے۔ ظاہری گندگی ظاہری ناپاکی ہے۔ اور باطنی گندگی شرک کی آلودگی ہے۔ مگر مشرکین نے یہ غضب ڈھایا کہ وہاں تین سو ساٹھ بت بٹھا دیئے۔ اسلام نے اس گندگی کو ہمیشہ کے لئے ختم کردیا۔

تیسرا حکم: ــــــ اور لوگوں میں حج کا اعلان کر ــــــ چنانچہ ابراہیم علیہ السلام نے اعلان کیا: ''اے لوگو! اللہ تعالیٰ نے تم پر حج فرض کیا ہے، لہٰذا حج کو آؤ!'' اس اعلان سے بیت اللہ کا حج شروع ہوگیا جو آج تک جاری ہے، زمانۂ جاہلیت میں بھی حج کی رسم باقی تھی۔ اور ان شاء اللہ قیامت تک یہ سلسلہ جاری رہے گا۔ اسی اعلان کی وجہ سے مسجد حرام اور مناسک کے مقامات وقفِ عام ہوگئے ہیں۔

حاکم اور بیہقی وغیرہ نے حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت کی ہے کہ جب حضرت ابراہیم علیہ السلام کو اعلان کرنے کا حکم ملا تو آپ نے عرض کیا: پروردگار! میری آواز کہاں تک پہنچے گی؟ اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا: ''آپ اعلان کریں پہنچانا میرا کام ہے!'' چنانچہ اس اعلان کو آسمان اور زمین کے لوگوں نے سن لیا۔ اور ایک روایت میں ہے کہ زندہ انسانوں ہی نے نہیں، بلکہ جو انسان آئندہ پیدا ہونے والے تھے انھوں نے بھی سن لیا۔ اور جس کی قسمت میں حج کرنا تھا اس نے لبیک پکارا، کیا تم نہیں دیکھتے کہ لوگ انتہائی دور دراز علاقوں سے تلبیہ پڑھتے ہوئے کھچے چلے آتے ہیں یعنی تلبیہ کی اصل بنیاد یہی ندائے ابراہیمی کا جواب ہے ــــــ اس اعلان کی قرآن کریم میں اور احادیث مرفوعہ میں کوئی تفصیل نہیں آئی۔ اور حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما کا یہ بیان: واقعہ بھی ہوسکتا ہے اور تمثیل بھی۔ یعنی اذنِ عام کا یہ پیرایۂ بیان بھی ہوسکتا ہے۔ واللہ اعلم۔

آگے اعلانِ حج کی غایت کا بیان ہے ــــــ لوگ آپ کے پاس پیادہ پا اور ہر دبلی اونٹنی پر آئیں گے، جو ہر گہری گھاٹی سے پہنچے گی ــــــ یعنی آنے والے ہر حال میں آئیں گے، خواہ ان کو سواری میسر ہو یا نہ ہو، اور اتنی دور مسافت سے آئیں گے کہ سواریاں مشقتِ سفر سے ہلکان ہوجائیں گی۔ چنانچہ اس وقت سے آج تک ہزاروں سال گزر چکے ہیں، مگر حج کے لئے آنے والوں کا تانتا بندھا ہوا ہے۔ دور جاہلیت میں بھی اگرچہ عرب بت پرستی میں مبتلا ہوگئے تھے مگر حج کے پابند تھے۔ اور کسی نہ کسی شکل میں ارکانِ حج ادا کرتے تھے۔

حج کے مصالح: ـــــ تا کہ وہ اپنے فوائد کو دیکھیں ـــــ یعنی حج بے مصلحت نہیں۔ اس میں دینی اور دنیوی منافع ہیں۔ اس کا سب سے بڑا دینی فائدہ یہ ہے کہ اس سے زندگی بھر کے گناہ معاف ہوجاتے ہیں۔ صحیحین میں حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ''جس شخص نے اللہ کے لئے حج کیا، اور اس میں بے حیائی اور گناہ کے کاموں سے بچا رہا تو وہ حج سے ایسی حالت میں لوٹے گا کہ گویا وہ اپنی ماں کے پیٹ سے آج ہی پیدا ہوا ہے'' ـــــ دوسرا دینی فائدہ یہ ہے کہ حج کرنے سے ایمان پر مہر لگ جاتی ہے۔ اب اس کے مرتد ہوجانے کا خطرہ ٹل جاتا ہے۔ ترمذی میں حضرت علی رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ''جس کے پاس سفرِ حج کا ضروری سامان ہو، اور اس کو ایسی سواری بھی میسر ہو جو اس کو بیت اللہ تک پہنچائے، پھر بھی وہ حج نہ کرے تو کوئی فرق نہیں پڑتا کہ وہ یہودی ہوکر مرے یا عیسائی ہوکر'' یعنی استطاعت کے باوجود جو حج نہیں کرتا اس کا ایمان خطرے میں ہے۔ اور جو کرلے گا ان شاء اللہ مأمون ومحفوظ ہوجائے گا۔

اور دنیا کا سب سے بڑا فائدہ یہ ہے کہ اس سے محتاجگی دور ہوتی ہے۔ اللہ تعالیٰ نے سفرِ حج وعمرہ میں یہ خصوصیت رکھی ہے کہ اس سے فقر وفاقہ دور ہوتا ہے۔ ترمذی اور نسائی میں حضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ''حج اور عمرہ پے در پے کیا کرو، کیونکہ دونوں فقر ومحتاجگی اور گناہوں کو اس طرح دور کردیتے ہیں جس طرح بھٹی لوہے اور سونے چاندی کے میل کچیل کو دور کردیتی ہے۔ اور حج مقبول کا ثواب بس جنت ہی ہے'' یعنی دنیا میں بھی اس پر اللہ تعالیٰ کا یہ فضل ہوتا ہے کہ فقر وفاقہ اور محتاجگی و پریشان حالی سے اس کو نجات مل جاتی ہے۔ اور خوش حالی اور اطمینانِ قلبی کی دولت نصیب ہوتی ہے۔ آپ غور کریں! ساری دنیا کی تاریخ میں ایک واقعہ بھی ایسا نہیں بتایا جاسکتا کہ کوئی شخص حج یا عمرہ میں خرچ کرنے کی وجہ سے محتاج ہوگیا ہو۔ اور دوسرے دنیوی کاموں میں خرچ کرکے محتاج ہونے والے ہر جگہ دیکھے جاسکتے ہیں ـــــ علاوہ ازیں اس عظیم الشان اجتماع کے ذریعہ بہت سے سیاسی، تمدنی اور اقتصادی فوائد حاصل کئے جاسکتے ہیں۔

اس کے بعد حج کے چار احکام ذکر کئے ہیں:

پہلا حکم: حج میں قربانی کی اہمیت ـــــ اور وہ معلوم دنوں میں اللہ کا نام لیں ان پالتو چوپایوں پر جو اللہ تعالیٰ نے ان کو عطا فرمائے ہیں ـــــ معلوم دنوں سے مراد قربانی کے تین دن ہیں۔ جب حاجی عرفات سے لوٹ کر، مزدلفہ میں قیام کرتے ہوئے، دس ذی الحجہ کو منیٰ میں پہنچتے ہیں تو سب سے پہلے بڑے شیطان کو سات کنکریاں مارتے ہیں۔ پھر قربانی کرتے ہیں۔ اس قربانی میں گوشت وغیرہ فوائد پر نظر نہ ہونی چاہئے۔ اس کا اصل مقصد اللہ تعالیٰ کا ذکر

ہے۔ پس جس کو گوشت کی حاجت نہ ہو اس کو بھی قربانی کرنی چاہئے۔ حج تمتع اور حج قران کرنے والے پر قربانی واجب ہے۔ اور صرف حج کرنے والے پر مستحب۔ اور قربانی صرف پالتو جانور اونٹ، گائے، بھینس اور بھیڑ بکری کی ہوسکتی ہے۔ اور چونکہ یہ ہدی یعنی حج کی قربانی ہے اس لئے حرم ہی میں ہوسکتی ہے۔ اور رزقھم (اللہ نے ان کو عطا فرمائے) کا مطلب یہ ہے کہ قربانی کا جانور میسر ہو تو تمتع اور قران کی قربانی واجب ہے، ورنہ دس روزوں کا حکم ہے۔ (دیکھیں سورۃ البقرہ آیت ۱۹۶) ـــــ پس تم ان میں سے کھاؤ، اور بدحال محتاج کو کھلاؤ ـــــ بعض کفار کا خیال تھا کہ قربانی کا گوشت خود قربانی کرنے والے کو نہیں کھانا چاہئے۔ اس کی اصلاح فرمادی کہ شوق سے کھاؤ، اور مصیبت زدہ محتاجوں کو بھی کھلاؤ۔ نبی ﷺ نے حج کے موقع پر سو اونٹوں کی قربانی کی تھی۔ پھر ہر ایک میں سے ایک ایک بوٹی کاٹ کر، اس کو پکا کر شوربا نوش فرمایا تھا۔ پس خود کھانا بھی مستحب ہے، دوستوں کو دینا بھی جائز ہے۔ اور غریبوں کو بھی نہیں بھولنا چاہئے۔ ان تک قربانی کا گوشت ضرور پہنچنا چاہئے (قربانی کے جانوروں کے احکام آگے بھی آرہے ہیں)

دوسرا حکم: قربانی کے بعد احرام کھولنا: ـــــ پھر لوگوں کو چاہئے کہ اپنے میل کچیل دور کریں ـــــ یعنی جب قربانی سے فارغ ہوجائیں تو سر منڈوالیں یا زلفیں بنوالیں۔ افضل اول ہے، کیونکہ اس سے میل کچیل خوب دور ہوتا ہے۔ جب یہ عمل کرلیا تو احرام کھل گیا۔

تیسرا حکم: منت کی قربانیوں کا مسئلہ ـــــ اور چاہئے کہ وہ اپنی منتوں کو پورا کریں ـــــ نزول قرآن کے زمانہ میں جب لوگ حج کے لئے چلتے تھے تو ہدی کے جانور ساتھ لے کر چلتے تھے۔ قربانی کے جو جانور حاجی مکہ معظّمہ لے جاتے ہیں وہ ''ہدی'' کہلاتے ہیں۔ ہدی کی جمع ''ہدایا'' ہے۔ ہدی اگر اونٹ کی ہو تو اس کا اِشعار بھی کرتے تھے۔ اِشعار کے معنی ہیں علامت لگانا۔ علامت کے طور پر اونٹ کی کوہان کی دائیں جانب میں ذرا سی کھال چیرتے تھے۔ نبی ﷺ بھی حج کے موقع پر سو اونٹ ہدی کے طور پر لے گئے تھے۔ اسی طرح لوگ حاجیوں کے ساتھ بھی قربانیاں بھیجتے تھے۔ نبی ﷺ نے سنہ ۹ ہجری میں سو بکریاں حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کے ساتھ ہدی کے طور پر بھیجی تھیں۔ اسی طرح لوگ حج کے موقع پر قربانی کی منتیں بھی مانتے تھے۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ نے یہاں نذر سے یہی قربانیاں مراد لی ہیں (روح المعانی) یہ سب قربانیاں احرام کھولنے کے بعد بھی ذبح کی جاسکتی ہیں۔ پہلے ذبح کرنا ضروری نہیں۔ احرام کھولنے کے بعد ان کا تذکرہ کرنے سے یہ مسئلہ واضح ہوا۔ البتہ حرم شریف میں اور قربانی کے ایام میں ان کو ذبح کرنا ضروری ہے۔ اور دمِ جنایت کا جانور پورے سال ذبح کیا جاسکتا ہے۔ البتہ حرم میں اس کو ذبح کرنا ضروری ہے۔

چوتھا حکم: طوافِ زیارت کا بیان ـــــ اور چاہئے کہ وہ واجب التکریم گھر کا طواف کریں ـــــ یعنی طوافِ

زیارت کریں۔ یہ طواف حج کا آخری رکن ہے۔اس کا وقت دس سے بارہ ذی الحجہ تک ہے۔اور جس عورت کو عذر ہو وہ پاک ہونے کے بعد کرے۔اس طواف پر احرام کے سب احکام تام ہوجاتے ہیں۔اور احرام مکمل طور پر کھل جاتا ہے یعنی بیوی سے انتفاع بھی جائز ہوجاتا ہے۔

اور عتیق کے تین معنی ہیں: ایک: معزز ومکرم۔اس نام کی وجہ ظاہر ہے۔ بیت اللہ واجب التکریم ہے۔ دوسرے: قدیم پُرانا۔اس نام کی وجہ یہ ہے کہ یہی مکان سب سے پہلے لوگوں کی عبادت کے لئے زمین پر بنایا گیا ہے۔اس سے قدیم کوئی معبد نہیں (دیکھیں سورۂ آل عمران آیت ۹۶) تیسرے: آزاد۔اس نام کی وجہ یہ ہے کہ اس گھر کو برباد کرنے کے لئے جو بھی طاقت اٹھے گی اللہ تعالیٰ اس کو پاش پاش کردیں گے، یہاں تک کہ اس گھر کو اٹھالینے کا وقت آجائے گا۔

بیت اللہ وہ نقطۂ اولیں ہے جہاں سے یہ وسیع زمین پھیل کر انسانوں کے لئے ٹھکانہ بنی ہے۔

ذٰلِكَ ۚ وَمَنْ يُّعَظِّمْ حُرُمٰتِ اللّٰهِ فَهُوَ خَيْرٌ لَّهٗ عِنْدَ رَبِّهٖ ۭ وَ اُحِلَّتْ لَكُمُ الْاَنْعَامُ اِلَّا مَا يُتْلٰى عَلَيْكُمْ فَاجْتَنِبُوا الرِّجْسَ مِنَ الْاَوْثَانِ وَاجْتَنِبُوْا قَوْلَ الزُّوْرِ ۝ حُنَفَاۗءَ لِلّٰهِ غَيْرَ مُشْرِكِيْنَ بِهٖ ۭ وَمَنْ يُّشْرِكْ بِاللّٰهِ فَكَاَنَّمَا خَرَّ مِنَ السَّمَاۗءِ فَتَخْطَفُهُ الطَّيْرُ اَوْ تَهْوِيْ بِهِ الرِّيْحُ فِيْ مَكَانٍ سَحِيْقٍ ۝ ذٰلِكَ ۤ وَمَنْ يُّعَظِّمْ شَعَاۗىِٕرَ اللّٰهِ فَاِنَّهَا مِنْ تَقْوَي الْقُلُوْبِ ۝ لَكُمْ فِيْهَا مَنَافِعُ اِلٰٓى اَجَلٍ مُّسَمًّى ثُمَّ مَحِلُّهَآ اِلَى الْبَيْتِ الْعَتِيْقِ ۝

ذٰلِكَ (۱)	یہ بات (ہوچکی)	يُّعَظِّمْ	تعظیم کرے	اللّٰهِ	اللہ کی
وَمَنْ	اور جو شخص	حُرُمٰتِ (۲)	حرمتوں	فَهُوَ	پس وہ

(۱) ذلك: دونوں جگہ مبتدا محذوف الأمر کی خبر ہے۔عربی میں کلام کا نہج بدلنے کے لئے مختلف الفاظ استعمال کئے جاتے ہیں۔اگر ایک مضمون سے دوسرے مختلف مضمون کی طرف جانا ہوتو أما بعدُ یا صرف بعدُ استعمال کرتے ہیں۔اور اگر ایک ہی مضمون کے ایک پہلو سے دوسرے پہلو کی طرف جانا ہوتو اسم اشارہ هذا یا ذلك استعمال کرتے ہیں۔(۲) حُرُمَات: حُرْمَة کی جمع ہے۔ حرمت: ہر اس چیز کو کہتے ہیں جس کا شرعاً پاس ولحاظ کرنا ضروری ہو، پس ''حرمات اللہ'' اللہ کی محترم قرار دی ہوئی چیزیں ہیں۔

خَيْرٌ	بہتر ہے	لِلّٰهِ	اللہ کے لئے	سَحِيْقٍ[۴]	دور
لَّهٗ	اس کے لئے	غَيْرَ[۲]	نہ	ذٰلِكَ	یہ بات (ہوچکی)
عِنْدَ	پاس	مُشْرِكِيْنَ	شریک کرنے والے	وَمَنْ	اور جو شخص
رَبِّهٖ	اس کے رب کے	بِهٖ	اس کے ساتھ	يُّعَظِّمْ	تعظیم کرے
وَ اُحِلَّتْ	اور حلال کئے گئے	وَمَنْ	اور جو شخص	شَعَآئِرَ[۵]	امتیازی نشانیوں
لَكُمُ	تمہارے لئے	يُّشْرِكْ	شریک ٹھہرائے	اللّٰهِ	اللہ (کے دین) کی
الْاَنْعَامُ	پالتو جانور	بِاللّٰهِ	اللہ کے ساتھ	فَاِنَّهَا[۶]	پس بیشک وہ بات
اِلَّا مَا	مگر جو	فَكَاَنَّمَا	پس گویا	مِنْ تَقْوَى	پرہیزگاری سے ہے
يُتْلٰى	پڑھے جاتے ہیں	خَرَّ	گر پڑا	الْقُلُوْبِ	دلوں کی
عَلَيْكُمْ	تم پر	مِنَ السَّمَآءِ	آسمان سے	لَكُمْ	تمہارے لئے
فَاجْتَنِبُوا	پس بچو تم	فَتَخْطَفُهُ[۳]	پس اچک لیا اس کو	فِيْهَا	ان (جانوروں) میں
الرِّجْسَ	گندگی	الطَّيْرُ	پرندوں نے	مَنَافِعُ	فوائد ہیں
مِنَ الْاَوْثَانِ[۱]	بتوں سے	اَوْ	یا	اِلٰى اَجَلٍ	مدت تک
وَاجْتَنِبُوْا	اور بچو تم	تَهْوِيْ	ڈال دیا	مُّسَمًّى	مقررہ
قَوْلَ	بات	بِهِ	اس کو	ثُمَّ مَحِلُّهَآ[۷]	پھر ان کی ذبح کی جگہ
الزُّوْرِ	جھوٹی سے	الرِّيْحُ	ہوا نے	اِلَى الْبَيْتِ	گھر کی طرف ہے
حُنَفَآءَ[۲]	یکسو ہونے والے	فِيْ مَكَانٍ	جگہ میں	الْعَتِيْقِ	واجب التکریم

حج کے احکام کے ضمن میں ہدیوں کا تذکرہ آیا تھا۔ ان آیات میں ان کے تعلق سے دو باتیں بیان کی ہیں:

(۱) من الأوثان: میں مِنْ بیانیہ ہے۔ یہ رِجْسٌ کا بیان ہے۔ (۲) حنفاء اور غیر دونوں اجتنبوا کے فاعل سے حالِ مؤکدہ ہیں۔ (۳) خَطِفَ (س) خَطْفًا الشيئَ: اچکنا، چھین لینا (۴) سَحِيْق: دور، بعید، سحُق (س، ک) سُحْقًا: دور ہونا، دفع کرنا۔ (۵) شعائر: شعيرة کی جمع ہے۔ شَعِيرة: ہر وہ علامت جو کسی چیز کے لئے مقرر کی گئی ہو، جیسے منارہ: مسجد کا شعار ہے۔ دین اسلام کے بڑے شعائر چار ہیں: قرآن، کعبہ، نبی اور نماز۔ دیگر شعائر بہت ہیں۔ ہدایا بھی شعائر ہیں۔ (۶) فإنها کی ضمیر خَصْلة (بات) کی طرف لوٹتی ہے۔ جیسے فَبِهَا ونِعْمَتْ أی بالخصلة الحسنة أخذ، ونعمت هی. (۷) مَحِلّ: ظرف مکان: ہدی ذبح کرنے کی جگہ۔

پہلی بات: جس طرح آج کے بت پرست بتوں کے نام پر جانور چھوڑتے ہیں عرب کے مشرکوں میں بھی اس کا رواج تھا۔ ان لوگوں نے بتوں کے نام پر چھوڑے گئے ان جانوروں کو ہدیوں کا درجہ دے رکھا تھا۔ وہ ان کی تعظیم وتحریم کے قائل تھے۔ ان سے کسی حال میں انتفاع جائز نہیں سمجھتے تھے۔ سورۃ المائدہ (آیت ۱۰۳) میں ان جانوروں کا تذکرہ آیا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے بحیرہ، سائبہ، وصیلہ اور حام کی کوئی شرعی حیثیت مقرر نہیں کی۔ کفار اللہ تعالیٰ پر جھوٹ باندھتے ہیں کہ وہ اللہ کے حکم سے ایسا کر رہے ہیں۔ ان آیات میں بھی کفار پر رد ہے کہ یہ جانور قابل تعظیم نہیں۔ کیونکہ یہ اللہ کے محترم قرار دیئے ہوئے نہیں۔ البتہ وہ حرام ہیں، کیونکہ وہ غیر اللہ کے نامزد کردیئے گئے ہیں۔ اور ایسے جانوروں کی حرمت سورۃ الانعام (آیت ۱۴۵) میں مصرّح ہے۔ ارشاد ہے: —— یہ بات تو ہو چکی —— یعنی حج کے احکام کا بیان پورا ہوا۔ اب دوسری بات سنو! —— اور جو شخص اللہ کی قائم کی ہوئی حرمتوں کا پاس ولحاظ کرے گا تو وہ اس کے لئے اس کے رب کے نزدیک بہتر ہے —— یعنی اللہ تعالیٰ نے جن جن چیزوں کو محترم قرار دیا ہے جیسے ہدی کے جانور، کعبہ شریف، قرآن کریم، نبی اور نماز وغیرہ ان کا احترام کرنا اور ان کا ادب ملحوظ رکھنا بیشک بہت اچھی بات ہے۔ آخرت میں اس کا بڑا اجر وثواب ہے۔ مگر یہ حکم ان جانوروں کا نہیں جن کو تم نے خود قابل احترام اور حرام قرار دیا ہے۔ اللہ کے علاوہ کسی کو بھی تحریم کا اختیار نہیں —— اور تمہارے لئے پالتو جانور حلال کئے گئے ہیں، مگر وہ جو تم پر پڑھے جاتے ہیں (حرام ہیں) —— ان میں وہ جانور بھی ہیں جو غیر اللہ کے نامزد کردیئے گئے ہیں۔ مگر یہ تحریم اللہ تعالیٰ کی طرف سے نہیں۔ بلکہ یہ بتوں کو اللہ کے ساتھ شریک ٹھہرانے کا شاخسانہ ہے —— پس تم بتوں کی گندگی سے بچو اور جھوٹی بات سے (بھی) بچو، اللہ کے لئے یکسو ہونے والے، اس کے ساتھ شریک نہ کرنے والے بنو —— یعنی بتوں کی پرستش بھی چھوڑو، اور ان کے نام پر جانور چھوڑ کر اللہ تعالیٰ پر افتراء کرنے سے بھی بچو، ہر طرف سے ہٹ کر ایک اللہ کے ہو کر رہو۔ تمہارے سب کام بلا شرکت غیرے صرف اللہ کے لئے ہونے چاہئیں۔

فائدہ: بتوں کے نام پر جانور چھوڑنا اسی طرح اولیاء کے نام پر جانور چھوڑنا شرک ہے۔ اور اس سے جانور حرام ہوجاتا ہے۔ پھر اگرچہ وہ اللہ کے نام پر ذبح کیا جائے اس کا کھانا جائز نہیں۔ البتہ اگر منت ماننے والا اپنی منت سے سچی توبہ کرلے، پھر اس کو اللہ کے نام پر ذبح کرے تو حلال ہے۔ اس سے معلوم ہوا کہ ناجائز قول وفعل کا بھی اثر ہوتا ہے۔ جیسے ظہار کرنا یعنی بیوی کو ماں جیسا کہنا قولِ زُور (جھوٹی بات) ہے، مگر اس سے کفارہ ادا کرنے تک بیوی حرام ہوجاتی ہے۔ اسی طرح حالتِ حیض میں طلاق دینے سے یا ایک ساتھ تین طلاقیں دینے سے بھی طلاقیں واقع ہوجاتی ہیں،

اگر چہ اس طرح طلاق دینا جائز نہیں ہے، اور زنا سے بھی حرمتِ مصاہرت ثابت ہو جاتی ہے اگر چہ یہ فعل حرام ہے۔

شرک کا انجام: —— اور جو شخص اللہ کے ساتھ شریک ٹھہراتا ہے وہ گویا آسمان سے گر پڑا، پس (گوشت خور) پرندوں نے اس کی تِکّا بوٹی کر ڈالی یا ہوا نے اس کو کسی دور مقام میں پھینک دیا! —— یعنی نہ کوئی اس کا پرسانِ حال رہا نہ لاش ٹھکانے لگانے والا! گِدھوں نے نوچ کھایا یا ہوا کے جھکّڑ نے کسی دور جگہ میں ڈال دیا۔ یہی حال مشرک کا ہے کہ وہ توحید کے بلند مقام سے پستی کے کھڈ میں گر کر تباہ ہو گیا، اور آخرت میں اس کا کوئی پرسانِ حال نہ ہوگا۔

دوسری بات: ہدی کا ادب ضروری ہے، کیونکہ وہ اللہ کے نام پر ذبح ہونے والا جانور ہے۔ اور اس کا پاس ولحاظ یہ ہے کہ اس سے نفع نہ اٹھایا جائے۔ نہ اس پر سواری کی جائے، نہ اس کا دودھ استعمال کیا جائے، نہ اون سے فائدہ اٹھایا جائے۔ ارشاد ہے: —— یہ بات ہو چکی —— یعنی بتوں کے نام پر چھوڑے ہوئے جانوروں کا تذکرہ پورا ہوا —— اور جو شخص شعائر اللہ (اللہ کے دین کی نشانیوں) کا پاس ولحاظ کرتا ہے: تو یہ بات دلوں کی پرہیزگاری کی وجہ سے ہے —— ہدی: شعائر اللہ میں شامل ہے۔ کیونکہ ہدی حج کی علامت ہے۔ اور حج اسلام کا اہم رکن ہے۔ اور شعائر اللہ کی تعظیم دل کے تقوی کی علامت ہے۔ ان کی تعظیم وہی کرتا ہے جس کے دل میں تقوی اور خوفِ خدا ہوتا ہے۔ شعائر اللہ کی تعظیم شرک میں داخل نہیں۔ وہ عین ایمان کا تقاضا ہے۔ نیک بندے اللہ کے نام لگی چیزوں کا ادب ضرور کرتے ہیں —— تمہارے لئے ان میں ایک مدتِ معین تک فوائد ہیں —— یعنی اونٹ، گائے، بکری وغیرہ سے اس وقت تک فائدہ اٹھایا جا سکتا ہے جب تک ان کو باقاعدہ ہدی نہ بنا لیا جائے۔ جب ہدی بنا لیا تو وہ آزاد ہیں اب ان سے کسی قسم کا نفع اٹھانا جائز نہیں —— پھر ان کی ذبح کی جگہ محترم گھر کے پاس ہے —— یعنی اب ان سے اُخروی فائدہ اٹھاؤ، حرم میں لے جا کر خدا کے نام پر قربان کر دو، اور جب قربان ہو جائیں تو ان سے فائدہ اٹھا سکتے ہو، یعنی ان کا گوشت استعمال کر سکتے ہو۔ کیونکہ گوشت پوست اللہ کے یہاں نہیں پہنچتا۔ وہاں تمہارا تقوی پہنچتا ہے، جو پہنچ گیا اور مقصد حاصل ہو گیا —— اور محترم گھر سے مراد پورا حرم ہے۔ کیونکہ سارا حرم بیت اللہ کا حریم خاص ہے۔ اور ہدی کے جانور کو قربانی کے دنوں میں ذبح کرنا ضروری ہے۔ دوسرے دنوں میں ذبح کرنا جائز نہیں۔

مسئلہ: مجبوری کی صورت میں ہدی کے اونٹ پر سواری کرنا جائز ہے۔ جیسے اونٹ کو ہدی بنا کر ساتھ لیا ہے، اور خود پیدل چل رہا ہے، سواری کے لئے کوئی دوسرا جانور موجود نہیں، اور پیدل چلنا اس کے لئے مشکل ہو رہا ہے، تو ایسی مجبوری میں ہدی کے اونٹ پر سوار ہو سکتا ہے۔ حدیث میں ہے کہ ایک شخص ہدی کا اونٹ لئے جا رہا تھا۔ نبی ﷺ اس کے پاس سے گذرے۔ آپؐ نے فرمایا: ''اس پر سوار ہو جا'' اس نے عرض کیا: یہ ہدی ہے! آپؐ نے فرمایا: ''باؤلے!

سوار ہوجا!'' (رواہ الترمذی) (ابھی قربانی کا بیان جاری ہے)

احکام الٰہی کا ادب واحترام بلندئ درجات، عفو سیئات اور حصولِ خیر وبرکات کا سبب ہے۔

وَلِكُلِّ اُمَّةٍ جَعَلْنَا مَنْسَكًا لِّيَذْكُرُوا اسْمَ اللّٰهِ عَلٰى مَا رَزَقَهُمْ مِّنْ بَهِيْمَةِ الْاَنْعَامِ ۗ فَاِلٰهُكُمْ اِلٰهٌ وَّاحِدٌ فَلَهٗٓ اَسْلِمُوْا ۗ وَبَشِّرِ الْمُخْبِتِيْنَ ﴿۳۴﴾ الَّذِيْنَ اِذَا ذُكِرَ اللّٰهُ وَجِلَتْ قُلُوْبُهُمْ وَالصّٰبِرِيْنَ عَلٰى مَآ اَصَابَهُمْ وَالْمُقِيْمِي الصَّلٰوةِ ۙ وَمِمَّا رَزَقْنٰهُمْ يُنْفِقُوْنَ ﴿۳۵﴾ وَالْبُدْنَ جَعَلْنٰهَا لَكُمْ مِّنْ شَعَآئِرِ اللّٰهِ لَكُمْ فِيْهَا خَيْرٌ ۖ فَاذْكُرُوا اسْمَ اللّٰهِ عَلَيْهَا صَوَآفَّ ۚ فَاِذَا وَجَبَتْ جُنُوْبُهَا فَكُلُوْا مِنْهَا وَاَطْعِمُوا الْقَانِعَ وَالْمُعْتَرَّ ۗ كَذٰلِكَ سَخَّرْنٰهَا لَكُمْ لَعَلَّكُمْ تَشْكُرُوْنَ ﴿۳۶﴾ لَنْ يَّنَالَ اللّٰهَ لُحُوْمُهَا وَلَا دِمَآؤُهَا وَلٰكِنْ يَّنَالُهُ التَّقْوٰى مِنْكُمْ ۗ كَذٰلِكَ سَخَّرَهَا لَكُمْ لِتُكَبِّرُوا اللّٰهَ عَلٰى مَا هَدٰىكُمْ ۗ وَبَشِّرِ الْمُحْسِنِيْنَ ﴿۳۷﴾ اِنَّ اللّٰهَ يُدٰفِعُ عَنِ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا ۗ اِنَّ اللّٰهَ لَا يُحِبُّ كُلَّ خَوَّانٍ كَفُوْرٍ ﴿۳۸﴾

ع ۵ / ۱۲

وَلِكُلِّ اُمَّةٍ	اور ہر امت کے لئے	عَلٰى مَا	اس پر جو	اِلٰهٌ وَّاحِدٌ	ایک معبود ہے
جَعَلْنَا	مقرر کی ہم نے	رَزَقَهُمْ	عطا کیا ان کو	فَلَهٗٓ	پس اس کی
مَنْسَكًا (۱)	قربانی	مِّنْ بَهِيْمَةِ	چوپایوں سے	اَسْلِمُوْا	تابع داری کرو
لِّيَذْكُرُوا	تاکہ لیں وہ	الْاَنْعَامِ	پالتو	وَبَشِّرِ	اور خوشخبری دیجئے
اسْمَ اللّٰهِ	اللہ کا نام	فَاِلٰهُكُمْ	پس تمہارا معبود	الْمُخْبِتِيْنَ (۲)	نیاز مندوں کو

(۱) المَنْسَك: سین کے زبر اور زیر کے ساتھ: مصدر ہے، جمع مَنَاسِك۔ اس لفظ کے متعدد معانی ہیں: عبادت کا طریقہ، قربانی، قربانی کی جگہ اور حج کی عبادات (ارکان وافعال) یہاں قربانی کے معنی ہیں (۲) المُخْبِت: اسم فاعل، از باب افعال، أَخْبَتَ: اظہار عجز وانکساری کرنا۔ إخبات: اللہ کے احکام کے سامنے نیاز مندی، اس کی ضد استکبار (اکڑنا) ہے مجرد خَبَتَ (ن) المکانُ: پست ہونا، نشیب میں ہونا۔

الَّذِيْنَ	وہ لوگ	لَكُمْ	تمہارے لئے	لَعَلَّكُمْ	تا کہ تم
اِذَا	(کہ) جب	فِيْهَا	ان میں	تَشْكُرُوْنَ	شکر بجالاؤ
ذُكِرَ اللّٰهُ	ذکر کیا جاتا ہے اللہ کا	خَيْرٌ	بھلائی ہے	لَنْ	ہرگز نہیں
وَجِلَتْ [1]	سہم جاتے ہیں	فَاذْكُرُوا	پس ذکر کرو تم	يَّنَالَ	پہنچتا
قُلُوْبُهُمْ	ان کے دل	اسْمَ اللّٰهِ	اللہ کا نام	اللّٰهَ	اللہ کو
وَ الصّٰبِرِيْنَ	اور صبر کرنے والے	عَلَيْهَا	ان پر	لُحُوْمُهَا	ان کا گوشت
عَلٰى مَا	اس پر جو	صَوَآفَّ [3]	کھڑے کرکے	وَلَا	اور نہ
اَصَابَهُمْ	ان کو پہنچا	فَاِذَا	پس جب	دِمَآؤُهَا	ان کا خون
وَالْمُقِيْمِي [2]	اور اہتمام کرنے والے	وَجَبَتْ [4]	گر پڑیں	وَلٰكِنْ	بلکہ
الصَّلٰوةِ	نماز کے	جُنُوْبُهَا	ان کی کروٹیں	يَّنَالُهُ	پہنچتا ہے اس کو
وَمِمَّا	اور اس میں سے جو	فَكُلُوْا	پس کھاؤ	التَّقْوٰى	تقوی
رَزَقْنٰهُمْ	عطا فرمایا ہم نے ان کو	مِنْهَا	ان میں سے	مِنْكُمْ	تمہارا
يُنْفِقُوْنَ	خرچ کرتے ہیں	وَ اَطْعِمُوا	اور کھلاؤ	كَذٰلِكَ	اسی طرح
وَ الْبُدْنَ	اور قربانی کے اونٹ	الْقَانِعَ [5]	قناعت کرنے والے کو	سَخَّرَهَا	زیر حکم کردیا ان کو
جَعَلْنٰهَا	بنایا ہم نے ان کو	وَالْمُعْتَرَّ [6]	اور طالب احسان کو	لَكُمْ	تمہارے
لَكُمْ	تمہارے لئے	كَذٰلِكَ	اسی طرح	لِتُكَبِّرُوا	تا کہ بڑائی بیان کرو
مِّنْ شَعَآئِرِ	خاص نشانیوں میں سے	سَخَّرْنٰهَا	زیر حکم کردیا ہم نے انکو	اللّٰهَ	اللہ کی
اللّٰهِ	اللہ (کے دین) کی	لَكُمْ	تمہارے	عَلٰى مَا	اس پر جو

(۱) وَجِلَ يَوْجَلُ (س) وَجْلاً: ڈرنا، گھبرانا، سہمنا۔ (۲) المقيمين کا نون اضافت کی وجہ سے گر گیا ہے۔ (۳) صَوَافَّ: صَافَّة کی جمع، عليها کی ضمیر سے حال ہے، صَفَّ الأبلُ: اونٹوں کا ٹانگوں کو پھیلانا۔ جب اونٹ کو ذبح کرتے ہیں تو اس کا آگے کا دایاں یا بایاں پاؤں موڑ کر باندھ دیتے ہیں، اس طرح کھڑا کیا ہوا اونٹ صَافَّة کہلاتا ہے۔ اور پرندے صَوَافّ ہیں جب وہ اڑنے کی حالت میں پر پھیلائے ہوئے ہوں۔ (۴) وَجَبَ الشيئُ (ض) وُجُوْبًا: زمین پر گرنا...... جنوبُها فاعل ہے۔ (۵) القانع: قناعت کرنے والا، اسم فاعل از قَنِعَ (س) قَنَاعة: جو ملے اس پر مطمئن اور خوش ہوجانا۔ (٦) المُعْتَرَّ: اسم فاعل، اس کی اصل المُعْتَرِر ہے از اِعْتِرَارٌ (باب افتعال) مادّہ عَرٌّ، اِعْتَرَّ فلانا وبه: کسی سے سوال کئے بغیر طالبِ احسان ہونا۔

اللہ تعالیٰ	اللّٰہَ	ہٹا دیں گے	يُدٰفِعُ [1]	راہ دکھائی تم کو	ھَدٰىكُمْ
پسند نہیں کرتے	لَا يُحِبُّ	ان لوگوں سے جو	عَنِ الَّذِيْنَ	اور خوش خبری دیجئے	وَبَشِّرِ
ہر دغا باز	كُلَّ خَوَّانٍ	ایمان لائے	اٰمَنُوْا	نیکوکاروں کو	الْمُحْسِنِيْنَ
ناشکرے کو	كَفُوْرٍ	بیشک	اِنَّ	بیشک اللہ تعالیٰ	اِنَّ اللّٰهَ

یہاں سے چھ نہایت اہم باتوں کا بیان شروع ہوتا ہے:

پہلی بات: قربانی اور ہدی کے مسئلہ کو لے کر بعض کوتاہ اندیش اعتراض کرتے ہیں کہ یہ جانوروں پر ظلم ہے۔ مسلمان ناحق جانوروں کو مارتے ہیں۔ کسی کی جان لینے میں اللہ کا کیا فائدہ ہے؟ سب سے پہلے اس خیال کی تردید کی جاتی ہے۔ ارشاد ہے: ـــــ اور ہم نے ہر امت کے لئے قربانی تجویز کی ہے تاکہ وہ ان پالتو چوپایوں پر جو اللہ نے ان کو عطا فرمائے ہیں اللہ کا نام لیں ـــــ یعنی قربانی میں اللہ تعالیٰ کا کوئی فائدہ نہیں۔ لوگوں کا اپنا فائدہ ہے۔ لوگ قربانی کرکے اللہ کی نزدیکی حاصل کرتے ہیں۔ اور قربانی جانوروں پر ظلم اس لئے نہیں کہ جانور اللہ کی ملک ہیں۔ لوگوں کی ملک نہیں۔ ان کو بطور روزی دیئے گئے ہیں۔ اور مالک اپنی ملک میں جو چاہے تصرف کرسکتا ہے۔ اور اس کے حکم کی تعمیل ضروری ہے ـــــ اور قربانی کے ذریعہ اللہ کی نزدیکی نفس قربانی سے حاصل نہیں ہوتی۔ بلکہ وہ اللہ کے ذکر کا ذریعہ ہے، جیسے صفا مروہ کے درمیان سعی اور جمرات کی رمی اللہ کے ذکر کے لئے ہے۔ اور اللہ کے ذکر سے اللہ کی نزدیکی حاصل ہونا بدیہی بات ہے ـــــ اور قربانی کے ذریعہ اللہ کی نزدیکی حاصل کرنے کا حکم کسی نہ کسی صورت میں ہر شریعت میں رہا ہے۔ آدم علیہ السلام کے دو بیٹوں کی قربانی کا تذکرہ سورۃ المائدۃ (آیت ۲۷) میں آیا ہے۔ اور اہل کتاب کے مذہب میں قربانی: مذہب کا ایک اہم رکن ہے۔ موجودہ تورات میں بھی جگہ جگہ سوختنی قربانی کا تذکرہ ہے۔ اور ہندوؤں کے یہاں بھی دیوتاؤں کی بَلی کا رواج ہے۔ پس یہ اسلام کا کوئی انوکھا حکم نہیں ـــــ رہی یہ بات کہ قربانی کس چیز کی دی جائے، کب دی جائے، کہاں دی جائے، اور کس طرح دی جائے؟ یہ باتیں زمانوں، قوموں اور ملکوں کے اختلاف سے مختلف ہوسکتی ہیں، مگر سب کی روح تقرب حاصل کرنا ہے۔ اسلام نے قربانی کا ایک خاص نہج مقرر کیا ہے، اور اس میں حضرت ابراہیم علیہ السلام کا اُسوہ پیش نظر رکھا ہے۔ اس کے علاوہ قربانی میں کوئی نئی بات نہیں ـــــ پس تمہارا معبود ایک معبود ہے، سو اس کی تابعداری کرو ـــــ یعنی اعتراض کرنے والوں کی ایک نہ

(۱) یدافع کا مفعول محذوف ہے أی الکَفَرَۃَ المُتَغَلِّبَۃَ علی بیت اللہ اور باب مفاعلہ میں مزاحمت کی طرف اشارہ ہے کہ اللہ تعالیٰ آویزش کے بعد کفار کو ہٹائیں گے۔

سنو، اللہ کا حکم مانو۔ اللہ تعالیٰ نے حج میں اور اس کے علاوہ بھی قربانی کا جو حکم دیا ہے اس کی تعمیل کرو ـــــ اور آپؐ نیاز مندوں کو بشارت سنا دیجئے ـــــ یعنی جو لوگ اللہ کے حکم کے سامنے سر تسلیم خم کرتے ہیں، ان کو جنت کی اور جنت کی نعمتوں کی خوش خبری دیجئے۔

اور اللہ کے احکام کے سامنے سر جھکانے والے صرف وہی لوگ نہیں ہیں جو قربانی کا عمل کرتے ہیں، بلکہ یہ وہ لوگ ہیں جن میں چار باتیں پائی جاتی ہیں:

پہلی بات: ـــــ وہ لوگ جن کے دل اس وقت سہم جاتے ہیں جب اللہ کا ذکر کیا جاتا ہے ـــــ یعنی ان کا حال یہ ہے کہ وہ اللہ کا نام سن کر اور اس کا حکم جان کر سہم جاتے ہیں۔ اللہ کی عظمت کے سبب ان کے دلوں پر ہیبت طاری ہو جاتی ہے۔ اور وہ فوراً تعمیلِ حکم کے لئے تیار ہو جاتے ہیں۔

دوسری بات: ـــــ اور وہ اُن باتوں پر جو ان کو پہنچتی ہیں صبر کرنے والے ہیں ـــــ یعنی مصائب وشدائد کو صبر واستقلال سے برداشت کرتے ہیں۔ شریعت پر عمل کرنے میں خواہ کیسے بھی حالات پیش آئیں مردانہ وار ان کا مقابلہ کرتے ہیں۔ اور راہِ حق سے ان کے پیر نہیں ڈگمگاتے۔

تیسری بات: ـــــ اور وہ نماز کا اہتمام کرنے والے ہیں ـــــ نماز دین کا اہم ستون ہے۔ اگر یہ ستون قائم ہے تو دین قائم ہے۔ اور اگر یہ ستون گر پڑا تو سارے دین کا خدا حافظ! نیز نماز دین کا اہم حکم ہے۔ جو اس پر عمل کرتا ہے وہ دیگر احکام پر ضرور عمل کرتا ہے۔ اور جو اس بے خرچ حکم کو نظر انداز کرتا ہے اس سے دیگر احکام کی تعمیل کی کیا امید ہو سکتی ہے!

چوتھی بات: ـــــ اور وہ اس میں سے جو ہم نے ان کو بطور روزی دیا ہے خرچ کرتے ہیں ـــــ یعنی مال کی زکوٰۃ ادا کرتے ہیں، اور اور بھی خرچ کرتے ہیں۔ اللہ کے بخشے ہوئے مال میں سے اللہ کا حق نکالتے ہیں، غریبوں کی ضرورتیں پوری کرتے ہیں، دین کے کاموں میں سہارا لگاتے ہیں، اور ضرورت کے مواقع میں دل کھول کر خرچ کرتے ہیں۔ ان کا اعتقاد یہ ہے کہ جس اللہ نے اب دیا ہے وہ پھر بھی دے گا، اس لئے وہ اللہ کی راہ میں خرچ سے ہاتھ نہیں روکتے۔

لطیفہ: ضلع غازی آباد میں ہاپوڑ کے پاس ایک بڑا گاؤں ''بڑودہ'' ہے۔ وہاں کے مندر کا پجاری مسلمانوں کو چھیڑتا تھا کہ تم یہ قربانیاں کیوں کرتے ہو۔ یہ جانوروں پر ظلم ہے۔ کسی کی جان لینے میں اللہ کا کیا فائدہ ہے۔ اور اسلام میں قربانی ضروری نہیں۔ اسلام کے بنیادی ارکان چار ہیں۔ مسلمان اس کی باتوں سے تنگ تھے۔ اس گاؤں کے ایک

حافظ محمد حنیف صاحب رحمہ اللہ جو دارالعلوم دیوبند کے سفیر تھے اور دیوبند میں مقیم تھے۔ایک مرتبہ گاؤں گئے، لوگوں نے حافظ صاحب سے اس کا تذکرہ کیا۔حافظ صاحب چند مسلمانوں کو لے کر سادھو کے پاس گئے۔اور کہا: پنڈت جی! آپ کیا باتیں کہتے ہیں، ہم سے بھی کہیں تاکہ ہم بھی غور کریں۔اس نے وہی باتیں دُہرائیں۔حافظ صاحب نے جواب دیا: پنڈت جی! اسلام کے بنیادی ارکان چار نہیں پانچ ہیں۔پنڈت جی نے پوچھا: پانچواں حکم کیا ہے؟ حافظ صاحب نے کہا: جہاد! جہاد کے حکم سے ہر کافر واقف ہے، بلکہ خائف ہے، اس لئے اس نے تسلیم کیا کہ ہاں اسلام میں یہ حکم بھی ہے۔حافظ صاحب نے کہا: جہاد کی نوبت کبھی کبھی آتی ہے۔ہم ہر سال قربانی کرکے اس کی پریکٹس کرتے ہیں، تاکہ جب جہاد کی نوبت آئے تو ہمارا ہاتھ خوب چلے۔یہ سنتے ہی اس کو سانپ سونگھ گیا، اور پھر اس نے مسلمانوں کو پریشان کرنا بند کردیا۔

اس کے بعد اونٹوں کی ہدی کی اہمیت، ان کے ذبح کا طریقہ اور قربانی کے گوشت کا حکم بیان فرماتے ہیں۔قربانی اونٹوں کے علاوہ گائے، بھینس اور بھیڑ بکریوں کی بھی درست ہے۔اور ہدی بھی سب کی ہوسکتی ہے۔مگر بکریوں کا چلنا دشوار ہے، اور بھینس عرب میں نہیں ہوتی، اور گائے بہت کمیاب ہے اس لئے لوگ زیادہ تر اونٹ ہی کو ہدی کے طور پر لے جاتے ہیں۔اس لئے ارشاد ہے: —— اور ہدی کے اونٹوں کو ہم نے تمہارے لئے اللہ کے دین کی علامتیں بنایا ہے —— یعنی ہدی کے اونٹ بھی شعائر اللہ میں داخل ہیں۔جب یہ اونٹ مکہ مکرمہ کے لئے چلتے ہیں تو پورے راستہ میں حج کا اعلان ہوتا ہے، لوگوں کو ترغیب ہوتی ہے کہ وہ بھی اللہ کے گھر چلیں۔پس جب شعائر اللہ کی تعظیم دلوں کی پرہیزگاری سے ہے تو ان ہدیوں کا بھی احترام کرنا چاہئے —— تمہارے لئے ان میں خیر ہے —— یعنی ان کو ادب کے ساتھ قربان کرنے میں بہت سے دینی اور دنیوی فوائد ہیں —— پس تم ان پر کھڑے ہونے کی حالت میں اللہ کا نام لو —— یعنی بسم اللہ، اللہ أکبر کہہ کر ذبح کرو۔اور اونٹ کے ذبح کرنے کا بہترین طریقہ یہ ہے کہ اس کو قبلہ رخ کھڑا کیا جائے۔پھر اس کا داہنا یا بایاں ہاتھ باندھ دیا جائے۔پھر سینہ اور گردن کے درمیانی گھڑے میں زخم لگایا جائے —— پھر جب وہ کروٹ کے بل گر پڑیں تو ان میں سے کھاؤ، اور قناعت پسند اور طالبِ احسان کو کھلاؤ —— یعنی جب سارا خون نکل جائے، اور وہ ٹھنڈے ہوکر پہلو کے بل گر پڑیں تو ان کا گوشت خود بھی استعمال کرو، اور حاجت مندوں میں بھی تقسیم کرو —— حاجت مند دو قسم کے ہیں: ایک: قناعت پسند یعنی وہ لوگ جو محتاج ہیں مگر صبر سے بیٹھے ہیں، سوال نہیں کرتے۔دوسرے: وہ جو طلب گار بن کر سامنے آتے ہیں، مگر منہ سے کچھ نہیں کہتے۔صورت بیں حالت مپرس کی تصویر ہوتے ہیں۔دونوں قسم کے لوگوں کو کھلانے کا حکم ہے —— اس

طرح ہم نے ان جانوروں کو تمہارے زیرِ حکم کر دیا تا کہ تم اللہ کا شکر بجالاؤ ـــــ یعنی ایسے تن و توش کے جانور جو تم سے جثّہ میں اور قوت میں کہیں زیادہ ہیں تمہارے قبضہ میں کر دیئے، تا کہ تم ان سے خدمات لو اور آسانی سے ذبح کر کے کھاؤ۔ یہ اللہ تعالیٰ کا بڑا احسان ہے۔ جس کا شکر بجالانا ضروری ہے ـــــ قربانی دوسرے مذاہب میں ایک مشرکانہ رسم ہے۔ اسلام میں محض ایک توحیدی عبادت ہے، خدائے واحد کی طرف سے دھیان ہٹانے والی نہیں، عین اس کی طرف توجہ جمانے والی، رشتۂ عبودیت کو اور محکم کرنے والی! (ماجدی)

عرب جاہلیت میں قربانی کر کے اس کا گوشت بتوں کے سامنے رکھتے تھے، اور خون ان پر ملتے تھے۔ اسی طرح اللہ کے نام کی قربانی کا گوشت کعبہ کے سامنے لا کر رکھتے تھے اور خون کعبہ کی دیواروں پر لگاتے تھے۔ دیگر مشرکین بھی دیوتاؤں پر بھینٹ چڑھا کر یہی عمل کرتے ہیں۔ ان کا خیال ہے کہ بَلی کی خوشبو دیوتا محسوس کرتے ہیں۔ اور اسے کھاتے ہیں۔ ان پر رد کیا جا رہا ہے اور ساتھ ہی اس بات کی وجہ بیان کی گئی ہے کہ قربانی جب اللہ کے لئے کی گئی ہے تو اس کا گوشت کھانا اور کھال سے فائدہ اٹھانا جائز کیوں ہے؟ ارشاد ہے: ـــــ اللہ تک نہ ان کا گوشت پہنچتا ہے اور نہ ان کا خون، بلکہ ان کے پاس تمہارا تقویٰ پہنچتا ہے ـــــ یعنی قربانی ایک عبادت ہے۔ اللہ کے پاس اس کا گوشت اور خون نہیں پہنچتا، نہ وہ قربانی سے مقصود ہے۔ اس لئے اس کا استعمال جائز ہے۔ قربانی سے مقصود اللہ کا ذکر ہے، اور اخلاص کے ساتھ اللہ کے حکم کی بجا آوری ہے۔ یہی اخلاص کی کیفیت اللہ کے یہاں پہنچتی ہے۔ قربانی میں یہ دیکھا جاتا ہے کہ تم نے کس خوش دلی اور جوشِ محبت سے اپنی ایک قیمتی چیز اللہ کی بارگاہ میں پیش کی ہے ـــــ اس طرح ان کو تمہارے زیرِ حکم کر دیا تا کہ تم اللہ کی عظمت بیان کرو اِس نعمت پر کہ اس نے تمہیں ہدایت دی ـــــ یعنی اللہ نے تمہیں اپنی محبت اور عبودیت کے اظہار کی یہ راہ سمجھائی، اور ایک جانور کی قربانی کو اپنی جان کی قربانی کا قائم مقام کر دیا۔ اس نعمت پر تم جتنی بھی بڑائی بیان کرو کم ہے ـــــ اور آپؐ نیکوکاروں کو خوش خبری سنا دیجئے ـــــ کہ تمہیں آخرت میں تمہاری نیکیوں کا بڑا اجر ملنے والا ہے۔ صحابۂ کرام نے رسول اللہ ﷺ سے دریافت کیا یا رسول اللہ! قربانی کیا چیز ہے؟ یعنی اس کی کیا وجہ ہے؟ آپؐ نے جواب دیا: ''تمہارے باپ حضرت ابراہیم علیہ السلام کی سنت ہے!'' صحابہ نے عرض کیا: ہمارے لئے اس میں کیا ہے؟ آپؐ نے فرمایا: ''ہر بال کے بدلے ایک نیکی!'' دوسری حدیث میں ہے: ''قربانی قیامت کے دن اپنے سینگوں، کھروں اور بالوں سمیت آئے گی یعنی بیکار اجزاء کا بھی اجر ملے گا۔ اور قربانی کا خون زمین پر گرنے سے پہلے اللہ کے یہاں قبول ہو جاتا ہے، پس خوش دلی سے قربانی کرو''

آخر میں ایک خیال کا جواب دیا جاتا ہے کہ اللہ تعالیٰ حج اور قربانی کے احکام دے رہے ہیں، مگر اس کا موقع کہاں ہے؟ مکہ مکرمہ پر کفار کا قبضہ ہے۔ وہ اس بات کے روادار کہاں کہ مسلمان اس پاک سرزمین پر قدم رکھیں۔ اس خیال کا جواب دیا جاتا ہے کہ اس کا بھی موقع آرہا ہے۔ ارشاد ہے: ـــــ بیشک اللہ تعالیٰ ایمان لانے والوں کی طرف سے مدافعت کریں گے ـــــ اور مشرکوں کے غلبہ واقتدار کو ہٹائیں گے۔ لفظ مدافعت میں اس طرف اشارہ ہے کہ کفار حملہ آور ہونگے، اور مسلمان اللہ کی مدد سے ان کو دفع کریں گے، اور یہ سلسلہ یہاں تک چلے گا کہ کفار کا مکہ مکرمہ پر سے غلبہ اور اقتدار ختم ہوجائے گا ـــــ بیشک اللہ تعالیٰ کسی بھی دغاباز ناشکرے کو پسند نہیں کرتے ـــــ کفار مکہ بڑے خائن تھے۔ اللہ تعالیٰ نے اپنا گھر ان کی تولیت میں دیا تھا۔ چاہئے تھا کہ وہ وہاں ایک خدا کی بندگی کرتے۔ مگر انھوں نے اس امانت میں خیانت کی اور وہاں تین سو ساٹھ بت بٹھا دیئے۔ گویا اللہ کا گھر دوسرے معبودوں کے حوالے کردیا ـــــ اور اللہ تعالیٰ نے باشندگانِ حرم پر وہ وہ انعامات فرمائے ہیں کہ دوسرے عرب اس کا تصور بھی نہیں کرسکتے۔ اس کا تقاضا تھا کہ وہ صرف منعم کی بندگی کرتے، مگر ان ناشکروں نے غیروں کی بندگی شروع کردی، اس سے بڑی ناشکری کیا ہوسکتی ہے؟ ـــــ ایسے خائنوں اور ناشکروں کو کوئی کیسے پسند کرسکتا ہے؟ اور ان کو جو اقتدار حاصل ہے وہ چند روزہ ہے۔ بہت جلد پانسا پلٹنے والا ہے۔ نصرتِ خداوندی کے حقدار مؤمنین ہیں۔ جب حق وباطل کی جنگ شروع ہوگی تو انجام کار اہل ایمان غالب آئیں گے۔ اور ان باطل پرستوں کو راستے سے چھانٹ دیا جائے گا۔

ایمان وکفر کی کش مکش میں اہلِ ایمان تنہا نہیں ہوتے۔ اللہ کی حمایت ان کے ساتھ ہوتی ہے۔ وہ دشمنوں کی چالوں کو توڑتے ہیں، اور ان کے ضرر کو دفع کرتے ہیں۔

أُذِنَ لِلَّذِينَ يُقَاتَلُونَ بِأَنَّهُمْ ظُلِمُوا ۚ وَإِنَّ اللَّهَ عَلَىٰ نَصْرِهِمْ لَقَدِيرٌ ﴿٣٩﴾ الَّذِينَ أُخْرِجُوا مِنْ دِيَارِهِمْ بِغَيْرِ حَقٍّ إِلَّا أَنْ يَقُولُوا رَبُّنَا اللَّهُ ۗ وَلَوْلَا دَفْعُ اللَّهِ النَّاسَ بَعْضَهُمْ بِبَعْضٍ لَهُدِّمَتْ صَوَامِعُ وَبِيَعٌ وَصَلَوَاتٌ وَمَسَاجِدُ يُذْكَرُ فِيهَا اسْمُ اللَّهِ كَثِيرًا ۗ وَلَيَنْصُرَنَّ اللَّهُ مَنْ يَنْصُرُهُ ۗ إِنَّ اللَّهَ لَقَوِيٌّ عَزِيزٌ ﴿٤٠﴾ الَّذِينَ إِنْ مَكَّنَّاهُمْ فِي الْأَرْضِ أَقَامُوا الصَّلَاةَ

وَاٰتَوُا الزَّكٰوةَ وَاَمَرُوْا بِالْمَعْرُوْفِ وَنَهَوْا عَنِ الْمُنْكَرِ ۭ وَلِلّٰهِ عَاقِبَةُ الْاُمُوْرِ ۝۴۱

اُذِنَ	اجازت دی گئی	يَّقُوْلُوْا	کہتے ہیں وہ	وَّ مَسٰجِدُ	اور مسجدیں
	(لڑنے کی)	رَبُّنَا	ہمارا رب	يُذْكَرُ (۸)	لیا جاتا ہے
لِلَّذِيْنَ (۱)	ان کو جو	اللّٰهُ	اللہ ہے	فِيْهَا	ان میں
يُقٰتَلُوْنَ	لڑے جاتے ہیں	وَلَوْلَا	اور اگر نہ ہوتا	اسْمُ	نام
بِاَنَّهُمْ	باایں وجہ کہ وہ	دَفْعُ (۴)	ہٹانا	اللّٰهِ	اللہ کا
ظُلِمُوْا	ظلم کئے گئے	اللّٰهِ	اللہ کا	كَثِيْرًا	بہت زیادہ
وَاِنَّ اللّٰهَ	اور بیشک اللہ تعالیٰ	النَّاسَ	لوگوں کو	وَلَيَنْصُرَنَّ	اور ضرور مدد کریں گے
عَلٰى نَصْرِهِمْ	ان کی مدد کرنے پر	بَعْضَهُمْ	ان کے بعض کو	اللّٰهُ	اللہ تعالیٰ
لَقَدِيْرُ	البتہ قادر ہیں	بِبَعْضٍ	بعض کے ذریعہ	مَنْ	(اس کی) جو
الَّذِيْنَ (۲)	(وہ) جو	لَّهُدِّمَتْ	(تو) یقیناً ڈھادیئے	يَّنْصُرُهٗ	مدد کرتا ہے ان کی
اُخْرِجُوْا	نکالے گئے		جاتے	اِنَّ اللّٰهَ	بیشک اللہ تعالیٰ
مِنْ دِيَارِهِمْ	اپنے گھروں سے	صَوَامِعُ (۵)	خلوت خانے	لَقَوِيٌّ	یقیناً قوت والے
بِغَيْرِ حَقٍّ	ناحق	وَبِيَعٌ (۶)	اور گرجے	عَزِيْزٌ	غلبہ والے ہیں
اِلَّا اَنْ (۳)	مگر یہ کہ	وَّصَلَوٰتٌ (۷)	اور عبادت خانے	اَلَّذِيْنَ (۲)	(وہ) جو

(۱) للذين يقاتلون: أُذِن کے نائب فاعل کے قائم مقام ہے۔اور ماذون فیہ یعنی قتال محذوف ہے۔(۲) الذين: دونوں جگہ هم محذوف کی خبر ہے۔(۳) استثناء کے ذریعہ ناحق کی تاکید کی گئی ہے۔اور یہ تاكيدُ المدح بما يُشبه الذَّم کے قبیل سے ہے، جیسے: ولا عيبَ فيهم غير أن سيوفهم ÷ بهنَّ فُلول من قَراع الكتائب: ان میں کوئی عیب نہیں۔بس یہ عیب ہے کہ ان کی تلواروں میں لشکروں کے ساتھ ٹکرانے کی وجہ سے دندانے پڑ گئے ہیں۔(۴) دفع: مصدر ہے اور مابعد کی طرف مضاف ہے اور الناس اس کا مفعول بہ ہے اور بعضَهم: الناس سے بدل ہے۔(۵) صوامع: صُوْمَعَة کی جمع ہے: عیسائی راہبوں کی خانقاہیں، تکیے، خلوت خانے۔(۶) بِيَعٌ: بِيْعَةٌ کی جمع ہے: گرجے، عیسائیوں کے عبادت خانے۔(۷) صلوات: صَلاةٌ کی جمع ہے: یہود کے عبادت خانے۔(۸) جملہ يذكر: مساجد کی صفت ہے۔

اِنْ	اگر	وَ اٰتَوُا	اور دیں وہ	عَنِ الْمُنْكَرِ	برے کاموں سے
مَّكَّنّٰهُمْ (۱)	اقتدار دیں ہم ان کو	الزَّكٰوةَ	زکات	وَ لِلّٰهِ	اور اللہ کے لئے ہے
فِي الْاَرْضِ	زمین میں	وَ اَمَرُوْا	اور حکم دیں وہ	عَاقِبَةُ	انجام
اَقَامُوا	(تو) اہتمام کریں وہ	بِالْمَعْرُوْفِ	نیک کاموں کا	الْاُمُوْرِ	کاموں کا
الصَّلٰوةَ	نماز کا	وَنَهَوْا	اور روکیں وہ	۞	۞

دوسری بات: جہاد کے مسئلہ سے اعتراض کا جواب ـــــ ان آیاتِ پاک میں جہاد کی اجازت، اس کی حکمت اور جہاد کے نتیجہ میں قائم ہونے والی اسلامی حکومت کا منشور ہے۔ اور یہ تذکرہ یہاں اس مناسبت سے آیا ہے کہ جس طرح قربانی کا حکم ہر شریعت میں رہا ہے: جہاد کا حکم بھی تمام شریعتوں میں رہا ہے۔ جہاد کی حکمت کے ضمن میں اس کی طرف اشارہ ہے۔ پس اسلام کا یہ حکم بھی کوئی انوکھا حکم نہیں۔ نیز پچھلی آیت میں جو کفار مکہ کو مسلمانوں کے راستے سے ہٹانے کا وعدہ ہے اس کی صورت بھی اسی طرح نکلے گی۔

جہاد کی اجازت: ـــــ (لڑنے کی) اجازت دی گئی ان لوگوں کو جن کے ساتھ جنگ کی جاتی ہے بایں وجہ کہ وہ مظلوم ہیں ـــــ یہ سب سے پہلی آیت ہے جو کفار سے قتال کی اجازت کے سلسلہ میں نازل ہوئی ہے۔ اس سے پہلے ستّر سے زیادہ آیتوں میں قتال کو ممنوع قرار دیا تھا۔ جب تک نبی ﷺ مکہ میں رہے: حکم یہ تھا کہ کفار کے مظالم پر صبر کیا جائے۔ چنانچہ صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم نے مسلسل تیرہ سال تک کفار کے زُہرہ گداز مظالم پر صبر کیا۔ پھر جب نبی ﷺ نے اور مسلمانوں نے مدینہ منورہ کی طرف ہجرت کی تو یہ آیت نازل ہوئی۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما بیان فرماتے ہیں کہ جب نبی ﷺ کو مکہ مکرمہ سے نکالا گیا تو حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ نے (دل میں) کہا: ''ان لوگوں نے اپنے نبی کو نکالا ہے، پس یہ ضرور تباہ ہونگے!'' پھر جب یہ آیت نازل ہوئی تو حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ نے فرمایا: ''میں (پہلے ہی) سمجھ گیا تھا کہ اب جنگ کی اجازت مل جائے گی'' (رواہ الترمذی حدیث ۳۲۲۱ کتاب التفسیر) پھر اس کے بعد اس قسم کی کئی آیتیں نازل ہوئیں، جن میں جہاد کی اجازت ہی نہیں صریح حکم تھا۔

اس آیت پاک میں جہاد کی اجازت دو وجہ سے دی گئی ہے: ایک: اس وجہ سے کہ کفار مسلمانوں پر چڑھائی کرنے والے ہیں، اس لئے مسلمانوں کو اپنا وجود باقی رکھنے کے لئے مقابلہ کی اجازت دینی ضروری ہے۔ دوم: اس وجہ سے کہ کفار کے ظلم وستم کی حد ہوگئی ہے۔ اس دوسری وجہ کا بیان آگے خود نظم کلام میں آرہا ہے۔ اور پہلی وجہ کی تفصیل درج ذیل ہے:

(۱) مَكَّنَ له في الأرض: حکومت دینا، طاقت واقتدار دینا۔

ہجرت کے بعد جب مسلمان ایک مرکز میں سمٹنے شروع ہوئے تو کفار مکہ کے پیروں تلے سے زمین سرکنی شروع ہوئی۔ کیونکہ مسلمان ان کی گرفت سے نکلتے جا رہے تھے، اور ان کی اجتماعیت کفار کے لئے خطرہ بنتی جا رہی تھی۔ چنانچہ انھوں نے عبداللہ بن اُبی کو جو ابھی تک مشرک تھا، ایک دھمکی آمیز خط لکھا کہ: ''آپ لوگوں نے ہمارے آدمی کو پناہ دی ہے۔ ہم اللہ کی قسم کھا کر کہتے ہیں کہ یا تو ان سے لڑو یا ان کو مدینہ سے نکال دو، ورنہ ہم سب مل کر مدینہ پر ہلّہ بول دیں گے، مردانِ جنگی کو قتل کریں گے اور عورتوں کی حرمت پامال کریں گے!'' جب یہ خط عبداللہ کو موصول ہوا تو وہ اور دوسرے مشرکینِ مدینہ مکہ والوں کے حکم کی تعمیل کے لئے اکٹھے ہو گئے۔ نبی ﷺ کو اس کی خبر ہوئی تو آپؐ ان کے پاس تشریف لے گئے، اور فرمایا: ''قریش کی دھمکی آپ لوگوں پر گہرا اثر کر گئی۔ اب تم خود اپنے کو جتنا نقصان پہنچانا چاہتے ہو قریش اس سے زیادہ تم کو نقصان نہیں پہنچا سکتے۔ تم اپنے بیٹوں اور بھائیوں سے لڑنا چاہتے ہو!'' وہ لوگ آپ ﷺ کی یہ بات سن کر جنگ کے ارادے سے باز آ گئے، اور منتشر ہو گئے (ابوداؤد حدیث ۳۰۰۴ کتاب الخراج باب خبر بنی النضیر)

جب کفار مکہ کو ان کے خط کا جواب نہ ملا تو ان کا پارہ چڑھ گیا اور اس بات کو انھوں نے اپنی توہین کے مترادف سمجھا۔ اور طے کر دیا کہ اب پوری تیاری کے ساتھ مدینہ پر حملہ کرنا ہے۔ بلکہ قریش نے مسلمانوں کو کہلا بھیجا کہ تم دھوکہ میں نہ رہنا کہ ہم مکہ سے صاف بچ کر نکل گئے۔ ہم یثرب (مدینہ) ہی پہنچ کر تمہارا ستیاناس کر دیں گے (رحمۃ للعالمین ۱:۱۱۶)

پھر مکہ والوں نے زور وشور سے جنگی تیاری شروع کر دی۔ اور ہتھیاروں کی فراہمی کے لئے ایک قافلہ ملکِ شام روانہ کیا۔ اس قافلہ پر لیبل اگرچہ عِیْر (تجارتی قافلہ) کا لگا ہوا تھا، مگر درحقیقت وہ ہتھیار خریدنے کے لئے جا رہا تھا۔ اس قافلہ کو جاتے ہوئے بھی مسلمانوں نے روکنے کی کوشش کی تھی مگر وہ بچ کر نکل گیا تھا۔ پھر اس نے شام میں ہتھیاروں کی جو خریداری کی تھی اس کا حال بھی نبی ﷺ کو معلوم ہوتا رہتا تھا۔ چنانچہ جب وہ قافلہ واپس لوٹا تو ضروری ہوا کہ اس کا راستہ روکا جائے۔ کیونکہ اگر یہ ہتھیار مکہ پہنچ گئے تو مسلمانوں کے لئے موت کا پیغام ثابت ہونگے۔ چنانچہ نبی ﷺ تین سو تیرہ صحابہ کے ساتھ اس قافلہ کی مزاحمت کے لئے نکلے، مگر قافلہ پھر بھی بچ کر نکل گیا، اور اس کو بچانے کے لئے جو ایک ہزار مردانِ جنگی مکہ سے نکلے تھے ان سے بدر مقام میں مڈبھیڑ ہو گئی، اور جنگ بدر کا واقعہ پیش آیا۔

اس تفصیل سے یہ بات عیاں ہے کہ کفار نے جنگ کا پورا منصوبہ بنا لیا تھا، وہ مدینہ پر چڑھائی کی پوری تیاری کر چکے تھے، ایسے پر خطر حالات میں جو مسلمانوں کے وجود کے لئے چیلنج تھے ضروری ہو گیا تھا کہ مسلمانوں کو مقابلہ

کرنے کی اجازت دی جائے۔

اور اگر کوئی خیال کرے کہ مسلمان تو مٹھی بھر ہیں، مشکل سے ان کی تعداد ایک ہزار ہوگی، اور وہ نہتے بھی ہیں۔ وہ مکہ والوں سے کس طرح لوہا لیں گے؟ اس کا جواب دیا جا رہا ہے ـــــ اور بیشک اللہ تعالیٰ ان کی نصرت پر پوری طرح قادر ہیں ـــــ یعنی ان کی تعداد کی کمی اور ظاہری بے سروسامانی کے باوجود اللہ تعالیٰ ان کو کامیاب کریں گے۔ ایسا بارہا ہوا ہے کہ چھوٹی جماعت اللہ کے حکم سے بڑی جماعت پر غالب آئی ہے۔ پس مسلمان اللہ کی مدد پر نظر رکھیں، جی نہ چھوڑیں وہ ضرور منصور ہونگے۔

اس کے بعد مسلمانوں کی مظلومیت کا بیان ہے ـــــ یہ وہ لوگ ہیں جو بلا وجہ اپنے گھروں سے نکالے گئے، اگر کوئی وجہ ہوسکتی ہے تو یہ ہے کہ وہ کہتے ہیں: ''ہمارا پروردگار اللہ ہے!'' ـــــ ظاہر ہے کہ یہ کوئی گناہ نہیں یہ تو خوبی کی بات ہے ـــــ مسلمانوں کا مکہ میں کوئی جرم نہیں تھا۔ نہ وہ چوریاں کرتے تھے، نہ ڈاکے ڈالتے تھے نہ کسی کو ستاتے تھے نہ دنگا فساد کرتے تھے، اگر ان کا جرم تھا تو بس یہ تھا کہ وہ صرف خدا کو مانتے ہیں، ڈھکوسلوں کو نہیں مانتے۔ اس کی ان کو یہ سزا ملی کہ وہ گھر سے بے گھر کئے گئے، بے یار و مددگار ہوکر وطن کو خیر باد کہنا پڑا۔ سوچو! اس سے بڑا ظلم کیا ہوسکتا ہے؟ اب بھی ان کو مقابلہ کی اجازت نہ دی جائے تو کب دی جائے گی؟!

جہاد کی حکمت: ـــــ اور اگر اللہ تعالیٰ لوگوں کو ایک دوسرے کے ذریعہ ہٹایا نہ کرتے تو ڈھادی جاتیں خانقاہیں اور گرجے اور عبادت خانے اور وہ مسجدیں جن میں بکثرت اللہ کا نام لیا جاتا ہے ـــــ یعنی سنت اللہ ہمیشہ سے یہ جاری ہے کہ اللہ تعالیٰ ظالموں، سرکشوں اور زبردستوں کا زور اہلِ حق کے ذریعہ توڑتے ہیں، تاکہ اللہ کے دین کو دنیا میں قدم جمانے اور پھلنے پھولنے کا موقع ملے۔ اگر اللہ تعالیٰ کی یہ سنت نہ ہوتی تو موسیٰ علیہ السلام کے زمانہ میں یہودیوں کی عبادت گاہیں، عیسیٰ علیہ السلام کے زمانہ میں عیسائیوں کے گرجے اور خلوت خانے اور اسلام کے دور میں مسجدیں وجود میں نہ آتیں اور آتیں تو دشمنانِ اسلام ان کو ڈھادیتے۔ جہاد کی مشروعیت کی یہی وجہ ہے۔

جہاد کی مشروعیت اقامتِ دین کے لئے ہے۔ اور گذشتہ تمام انبیاء علیہم السلام کے زمانوں میں جہاد مشروع رہا ہے۔ سورۃ المائدہ (آیات ۲۰ تا ۲۹) میں اس جہاد کی فرضیت کا تذکرہ ہے جو موسیٰ علیہ السلام کے زمانہ میں بنی اسرائیل پر عائد کی گئی تھی اور جس کی ادائیگی سے انھوں نے منہ موڑا تھا اور اس کی بھیانک سزا پائی تھی۔ اور سورۃ البقرہ (آیات ۲۴۶ تا ۲۵۱) میں طالوت کی جالوت کے ساتھ جنگ کا ذکر ہے۔ اور وہاں بھی اللہ کی یہ سنت بیان کی گئی ہے کہ اگر اللہ تعالیٰ لوگوں کو ایک دوسرے کے ذریعہ نہ ہٹائیں تو زمین تباہ ہوجائے۔ اور سورۃ الصّف کی آخری آیت میں عیسیٰ علیہ

السلام پر ایمان لانے والے تین سوتیس صحابہ کے جہاد کا تذکرہ ہے۔جس کی برکت سے اللہ تعالیٰ نے دینِ عیسوی کو منصور کیا۔اسی طرح بدر میں تین سو تیرہ صحابہ کی جانبازی سے اللہ تعالیٰ نے دین اسلام کو سربلند کیا۔

فائدہ: مساجد کی یہ صفت لائی گئی ہے کہ ان میں اللہ کا ذکر بہت زیادہ کیا جاتا ہے۔اس میں دو باتوں کی طرف اشارہ ہے: ایک: اس میں مساجد کی دوسری عبادت گاہوں پر برتری کی طرف اشارہ ہے۔اور یہ برتری ذکر اللہ کی وجہ سے ہے۔کیونکہ اللہ کی عبادت کے لئے جو بھی گھر ہے، وہ اگر ذکر اللہ سے آباد ہے تو وہ مقصد کی تکمیل کرتا ہے، ورنہ وہ ویران خانہ ہے۔دوسری بات: اس میں یہ تنبیہ ہے کہ جس طرح اہل کتاب نے اپنی عبادت گاہوں کو ویران کردیا مسلمانوں کو چاہئے کہ وہ مساجد کو ویران نہ کریں، ان کو ذکر اللہ سے اور دینی کاموں سے آباد رکھیں۔مگر افسوس! آج مساجد کی صورتِ حال بھی کچھ اچھی نہیں۔مساجد وقتی طور پر کھلتی ہیں، باقی وقت میں وہاں کوئی اللہ کا نام لینے والا نہیں ہوتا۔مساجد عالی شان ہوتی ہے مگر اعمال سے ویران ہوتی ہیں۔حالانکہ مساجد وہ پاور ہاؤس ہیں جہاں ایمان کی روشنی پیدا ہوتی ہے۔اور جن گھروں کے تار مسجد سے جڑے ہوئے ہیں وہاں روشنی سپلائی ہوتی ہے۔اور وہ مشینیں جو روشنی پیدا کرتی ہیں وہ ذاکرین کی جماعت ہے۔یہ مضمون تفصیل سے سورۃ النور میں آئے گا۔

اس کے بعد مجاہدین کی نصرت کا وعدہ ہے —— اور اللہ تعالیٰ ضرور مدد کریں گے اس کی جو اللہ کے دین کی مدد کرتا ہے —— یہ اللہ تعالیٰ کا وعدہ ہے، اور قرآن کریم میں اس کا بار بار اعادہ کیا گیا ہے۔سورۃ محمد (ﷺ) میں ہے: ﴿ يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ آمَنُوْٓا اِنْ تَنْصُرُوْا اللّٰهَ يَنْصُرْكُمْ، وَيُثَبِّتْ أَقْدَامَكُمْ ﴾ ترجمہ: اے ایمان والو! اگر تم اللہ کی مدد کروگے تو اللہ تعالیٰ تمہاری مدد کرے گا، اور تمہارے قدم جمادے گا۔جو بندے کفن پہن کر اور ہتھیلی پر جان رکھ کر اللہ کے راستے میں نکلتے ہیں اللہ تعالیٰ ان کی ضرور مدد کرتے ہیں —— بیشک اللہ تعالیٰ قوت والے غلبہ والے ہیں —— یعنی قوت وغلبہ کا آخری سرا انہی کے پاس ہے، اور ان کا ارادہ ہر مادی سامان اور ہر ظاہری تدبیر سے بالاتر ہے۔

اسلامی حکومت کا منشور: جہاد کی برکت سے اللہ تعالیٰ مسلمانوں کو حکومت واقتدار عطا فرمائیں تو اسلامی حکومت کا کیا کام ہوگا؟ ارشاد ہے: —— یہ وہ لوگ ہیں کہ اگر ہم ان کو زمین میں اقتدار عطا فرمائیں تو وہ نماز کا اہتمام کریں، اور زکوۃ ادا کریں، اور نیک کاموں کا حکم دیں، اور برے کاموں سے روکیں —— یعنی اگر سچے مسلمانوں کی حکومت قائم ہوجائے تو مسجدیں آباد اور پُر رونق ہوجائیں۔زکوۃ کی ادائیگی عام ہوجائے، اور اس کی تقسیم کا ایسا نظام بن جائے کہ کوئی ننگا بھوکا نہ رہ جائے۔نیک کاموں کا چلن ہوجائے، اور تمام برائیاں دم توڑ دیں۔اور دنیا جنت کا نمونہ بن جائے۔سوچو! ایسے بندوں کی اللہ تعالیٰ مدد کیوں نہ کریں گے؟! —— اور سب کاموں کا انجام اللہ

تعالیٰ کے لئے ہے ــــ یعنی مسلمان گو آج مغلوب اور کافر غالب نظر آرہے ہیں، مگر اللہ کی قدرت میں ہے کہ وہ پانسا پلٹ دیں اور مسلمانوں کو منصور و غالب کردیں۔

فائدہ: یہ آیت اس وقت نازل ہوئی ہے جب مسلمانوں کو حکومت و اقتدار حاصل نہیں تھا۔ اللہ تعالیٰ نے پہلے ہی یہ خبر دی ہے کہ جب ان کو حکومت ملے گی تو وہ یہ اور یہ کام کریں گے۔ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے فرمایا: ثَنَاءٌ قَبْلَ بَلَاءٍ یعنی یہ عمل کے وجود میں آنے سے پہلے عمل کرنے والوں کی تعریف ہے۔ پس اس آیت میں خلفائے راشدین کی بڑی منقبت ہے، کیونکہ ان کا دورِ حکومت اس آیت کی سچی تصویر تھا۔

اسلامی نظامِ حکومت عالَم کے لئے رحمت ہے، مگر مجرم لوگ انجانے اندیشوں کی وجہ سے اس کو پسند نہیں کرتے۔

وَاِنْ يُّكَذِّبُوْكَ فَقَدْ كَذَّبَتْ قَبْلَهُمْ قَوْمُ نُوْحٍ وَّعَادٌ وَّثَمُوْدُ ﴿۴۲﴾ وَقَوْمُ اِبْرٰهِيْمَ وَقَوْمُ لُوْطٍ ﴿۴۳﴾ وَّاَصْحٰبُ مَدْيَنَ ۚ وَكُذِّبَ مُوْسٰى فَاَمْلَيْتُ لِلْكٰفِرِيْنَ ثُمَّ اَخَذْتُهُمْ ۚ فَكَيْفَ كَانَ نَكِيْرِ ﴿۴۴﴾ فَكَاَيِّنْ مِّنْ قَرْيَةٍ اَهْلَكْنٰهَا وَهِيَ ظَالِمَةٌ فَهِيَ خَاوِيَةٌ عَلٰى عُرُوْشِهَا وَبِئْرٍ مُّعَطَّلَةٍ وَّقَصْرٍ مَّشِيْدٍ ﴿۴۵﴾ اَفَلَمْ يَسِيْرُوْا فِي الْاَرْضِ فَتَكُوْنَ لَهُمْ قُلُوْبٌ يَّعْقِلُوْنَ بِهَا اَوْ اٰذَانٌ يَّسْمَعُوْنَ بِهَا ۚ فَاِنَّهَا لَا تَعْمَى الْاَبْصَارُ وَلٰكِنْ تَعْمَى الْقُلُوْبُ الَّتِيْ فِي الصُّدُوْرِ ﴿۴۶﴾ وَيَسْتَعْجِلُوْنَكَ بِالْعَذَابِ وَلَنْ يُّخْلِفَ اللّٰهُ وَعْدَهٗ ۭ وَاِنَّ يَوْمًا عِنْدَ رَبِّكَ كَاَلْفِ سَنَةٍ مِّمَّا تَعُدُّوْنَ ﴿۴۷﴾ وَكَاَيِّنْ مِّنْ قَرْيَةٍ اَمْلَيْتُ لَهَا وَهِيَ ظَالِمَةٌ ثُمَّ اَخَذْتُهَا ۚ وَاِلَيَّ الْمَصِيْرُ ﴿۴۸﴾ قُلْ يٰاَيُّهَا النَّاسُ اِنَّمَا اَنَا لَكُمْ نَذِيْرٌ مُّبِيْنٌ ﴿۴۹﴾ فَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ لَهُمْ مَّغْفِرَةٌ وَّرِزْقٌ كَرِيْمٌ ﴿۵۰﴾ وَالَّذِيْنَ سَعَوْا فِيْٓ اٰيٰتِنَا مُعٰجِزِيْنَ اُولٰۗىِٕكَ اَصْحٰبُ الْجَحِيْمِ ﴿۵۱﴾

ع ۱۳

وَاِنۡ	اور اگر	لِلۡكٰفِرِيۡنَ	منکروں کو	وَبِئۡرٍ (۷)	اور کنویں
يُّكَذِّبُوۡكَ	جھٹلاتے ہیں وہ آپ کو	ثُمَّ	پھر	مُّعَطَّلَةٍ	بیکار پڑے ہوئے
فَقَدۡ	تو یقیناً	اَخَذۡتُهُمۡ	پکڑا میں نے ان کو	وَّقَصۡرٍ	اور محل
كَذَّبَتۡ (۱)	جھٹلایا	فَكَيۡفَ	پس کیسا	مَّشِيۡدٍ (۸)	مضبوط بنائے ہوئے
قَبۡلَهُمۡ	ان سے پہلے	كَانَ	تھا	اَفَلَمۡ	کیا تو نہیں
قَوۡمُ نُوۡحٍ	قوم نوحؑ نے	نَكِيۡرِ (۳)	میرا انکار	يَسِيۡرُوۡا	چلے وہ
وَّعَادٌ	اور عاد نے	فَكَاَيِّنۡ (۴)	پس کتنی ہی	فِى الۡاَرۡضِ	زمین میں
وَّثَمُوۡدُ	اور ثمود نے	مِّنۡ قَرۡيَةٍ	بستیاں	فَتَكُوۡنَ	پس ہوتے
وَقَوۡمُ اِبۡرٰهِيۡمَ	اور قوم ابراہیم نے	اَهۡلَكۡنٰهَا	ہلاک کیا ہم نے ان کو	لَهُمۡ	ان کے لئے
وَقَوۡمُ لُوۡطٍ	اور قوم لوط نے	وَهِىَ	درانحالیکہ وہ	قُلُوۡبٌ	دل
وَّاَصۡحٰبُ مَدۡيَنَ	اور مدین والوں نے	ظَالِمَةٌ	ظالم تھیں	يَّعۡقِلُوۡنَ	سمجھتے وہ
وَكُذِّبَ	اور جھٹلائے گئے	فَهِىَ	پس وہ	بِهَاۤ	ان سے
مُوۡسٰى	موسیٰ	خَاوِيَةٌ (۵)	گرنے والی ہیں	اَوۡ	یا
فَاَمۡلَيۡتُ (۲)	پس مہلت دی میں نے	عَلٰى عُرُوۡشِهَا (۶)	اپنی چھتوں پر	اٰذَانٌ	کان

(۱)قوم: اسم جمع مذکر ومؤنث ہے اس لئے فعل مؤنث آیا ہے۔(۲) أَمْلٰی إِمْلَاء: مہلت دینا، ڈھیل دینا، لمبی امیدیں دلانا۔ (۳)نکیر: بروزن فعیل: مصدر غیر قیاسی بمعنی انکار ہے۔اس کی اصل نکیری ہے، یاء حذف کر کے راء کا کسرہ بطور علامت باقی رکھا گیا ہے۔نکیر کے مفہوم میں دو باتیں شامل ہیں: ایک: کسی کی بری روش پر ناخوشی کا اظہار کرنا۔دوسری: اس کو ایسی سزا دینا کہ حالت دگرگوں ہو جائے، حلیہ بگڑ جائے اور کوئی پہچان نہ سکے کہ یہ وہی شخص ہے۔(۴) کأین: اصل میں كَأَيٍّ ہے۔قرآنی املاء میں تنوین کو بصورت نون لکھا گیا ہے۔ کأین: ہمیشہ مبہم کثیر تعداد پر دلالت کرتا ہے۔اور ابہام کو دور کرنے کے لئے اس کے بعد تمیز مِنْ کے ساتھ لائی جاتی ہے، جیسے:﴿ كَأَيِّنْ مِنْ نَبِيٍّ قَاتَلَ مَعَهُ رِبِّيُّوْنَ كَثِيْرٌ﴾(۵) خاوية: اسم فاعل۔ خَوَى المكانُ(ض) خَوَاءً: کسی جگہ کا اپنے مکینوں سے خالی ہونا، مکان کا گر پڑنا، ڈھ جانا۔(۶)عروش: عَرْشٌ کی جمع۔ عَرْشُ البيت: گھر کی چھت نیز بیل کے چھانے کے لئے جو چھتری اور ٹٹی کھڑی کی جاتی ہے وہ بھی عرش کہلاتی ہے۔اور بادشاہ کے بیٹھنے کی جگہ کو بھی اسی اعتبار سے عرش کہتے ہیں کہ وہ بلند چھتری دار ہوتی ہے۔(۷) بئر: کا عطف قرية پر ہے۔(۸) مَشِيْد: اسم مفعول، شاد البناءَ(ض) شَيْدًا: چونے سے پلاستر کرنا، پختہ بلند عمارت بنانا۔

يَسۡمَعُوۡنَ	سنتے وہ	عِنۡدَ رَبِّكَ	آپ کے رب کے پاس	اَنَا	میں
بِهَا	ان سے	كَاَلۡفِ	مانند ہزار	لَكُمۡ	تمہارے لئے
فَاِنَّهَا(۱)	پس بیشک واقعہ یہ ہے:	سَنَةٍ	سال کے ہے	نَذِيۡرٌ	ڈرانے والا ہوں
لَا تَعۡمَى	نہیں اندھی ہوتیں	مِّمَّا	ان سے جو	مُّبِيۡنٌ	آشکارا
الۡاَبۡصَارُ	آنکھیں	تَعُدُّوۡنَ	شمار کرتے ہو تم	فَالَّذِيۡنَ	پس جو لوگ
وَلٰكِنۡ	بلکہ	وَكَاَيِّنۡ	اور کتنی ہی	اٰمَنُوۡا	ایمان لائے
تَعۡمَى	اندھے ہوتے ہیں	مِّنۡ قَرۡيَةٍ	بستیاں	وَعَمِلُوا	اور کئے انھوں نے
الۡقُلُوۡبُ	دل	اَمۡلَيۡتُ	ڈھیل دی میں نے	الصّٰلِحٰتِ	نیک کام
الَّتِىۡ	جو	لَهَا	ان کو	لَهُمۡ	ان کے لئے
فِى الصُّدُوۡرِ	سینوں میں ہیں	وَهِىَ	درانحالیکہ وہ	مَّغۡفِرَةٌ	بخشش
وَيَسۡتَعۡجِلُوۡنَكَ	اور جلدی مچاتے ہیں	ظَالِمَةٌ	ظالم تھیں	وَّرِزۡقٌ	اور روزی ہے
	وہ آپؐ سے	ثُمَّ	پھر	كَرِيۡمٌ	باعزت
بِالۡعَذَابِ	عذاب کے بارے میں	اَخَذۡتُهَا	پکڑا میں نے ان کو	وَالَّذِيۡنَ	اور جو لوگ
وَلَنۡ(۲)	اور ہرگز نہیں	وَاِلَىَّ	اور میری طرف	سَعَوۡا	کوشش کرتے ہیں
يُّخۡلِفَ	خلاف کریں گے	الۡمَصِيۡرُ	لوٹنا ہے	فِىۡۤ اٰيٰتِنَا	ہماری آیتوں میں
اللّٰهُ	اللہ تعالیٰ	قُلۡ	آپ کہہ دیں	مُعٰجِزِيۡنَ(۳)	ہرانے کو
وَعۡدَهٗ	اپنے وعدے کے	يٰۤاَيُّهَا	اے	اُولٰۤئِكَ	یہ لوگ
وَاِنَّ	اور بیشک	النَّاسُ	لوگو	اَصۡحٰبُ	اصحاب
يَوۡمًا	ایک دن	اِنَّمَاۤ	بس	الۡجَحِيۡمِ	دوزخ ہیں

تیسری بات: نبیوں کے انکار کا سلسلہ بھی ہمیشہ سے جاری ہے ــــــ جس طرح قربانی ہر ملت میں رہی ہے، اور اب ملتِ اسلامیہ کے ذریعہ تا قیامِ قیامت جاری رہے گی۔ اور جس طرح جہاد ہر مذہب میں فرض رہا ہے۔ اور اب

(۱) **فإنها:** میں ضمیر قصہ ہے، اس کا مرجع کچھ نہیں۔ اور إن کا اسم ہے اور جملہ **لا تعمی** خبر ہے۔ (۲) **ولن:** جملہ حالیہ ہے۔ (۳) **مُعَاجِزٌ:** اسم فاعل، مصدر مُعَاجَزَة: مقابلہ کر کے اپنے حریف کو ہرا دینا، عاجز کر دینا۔

اسلام نے اس کو قیامت تک کے لئے فرض کر دیا ہے۔ اسی طرح ایک تیسری حقیقت بھی ہے جو ہمیشہ سے ہمیشہ تک جاری ہے۔ اور وہ ہے نبیوں کا انکار، اللہ کی دعوت کو ٹھکرانا اور دنیا و آخرت میں اس کے وبال سے دوچار ہونا۔ اِن آیاتِ پاک میں اسی کا بیان ہے۔ کفار مکہ نے نبی ﷺ کا انکار کیا۔ آپ نے اللہ کی طرف سے جو دعوت پیش کی اس کو نہ صرف نظر انداز کیا، بلکہ اس پودے کو جڑ سے اکھاڑ دینے کے لئے ایڑی چوٹی کا زور لگایا۔ اس لئے اب وہ اپنی حرکتوں کا خمیازہ بھگتیں گے، جہاد شروع ہو گیا ہے، اب ان کی شامت آنے والی ہے۔ وہ جلد صفحۂ ہستی سے حرفِ غلط کی طرح مٹا دیئے جائیں گے۔ ارشاد ہے: ــــــ اور اگر یہ لوگ آپؐ کو جھٹلاتے ہیں تو ان سے پہلے قوم نوح اور عاد اور ثمود اور قوم ابراہیم اور قوم لوط اور مدین والے جھٹلا چکے ہیں، اور موسیٰ بھی جھٹلائے گئے ــــــ پس یہ کوئی نئی اور انوکھی بات نہیں۔ سارے پیمبروں کے ساتھ یہی معاملہ ان کی اقوام کی طرف سے پیش آتا رہا ہے ــــــ پس میں نے (اول) کافروں کو مہلت دی، پھر ان کو پکڑ لیا، پس کیسی رہی میری عقوبت! ــــــ بڑی سخت تھی اللہ کی گرفت۔ عذاب نے ان کا حلیہ بگاڑ دیا، وہ صفحۂ ہستی سے نابود کر دیئے گئے اور قصۂ پارینہ بن کر رہ گئے۔

تکذیب انبیاء کا انجام: ــــــ پس کتنی ہی بستیاں ہیں جو نافرمان تھیں، ہم نے ان کو تباہ کر دیا، اب وہ اپنی چھتوں پر گری پڑی ہیں، اور کتنے ہی ویران کنویں اور گچ کاری کے محل! ــــــ یعنی ان کے ٹوٹے ہوئے مکانات، اجڑے ہوئے کنوئیں اور ڈھیے ہوئے عالیشان محلات ان کی مرثیہ خوانی کر رہے ہیں ــــــ تو کیا وہ لوگ (مکہ والے) زمین میں چلے پھرے نہیں کہ ان کے لئے ایسے دل ہوتے جن سے وہ سمجھتے، یا ایسے کان ہوتے جن سے وہ سنتے! ــــــ یعنی گذشتہ تباہ شدہ اقوام کے حالات کا مشاہدہ انسان کو عقل و بصیرت عطا کرتا ہے۔ بشرطیکہ وہ ان حالات کو محض تاریخی حیثیت سے نہ دیکھے، بلکہ چشمِ عبرت سے دیکھے ــــــ پس بیشک واقعہ یہ ہے کہ آنکھیں اندھی نہیں ہوتیں، بلکہ وہ دل اندھے ہو جاتے ہیں جو سینوں میں ہیں ــــــ یعنی وہ لوگ خوب چلے پھرے ہیں۔ وہ اپنے شام کے تجارتی سفروں میں دیارِ عاد و ثمود سے گذرے ہیں۔ انھوں نے مدین والوں اور قوم لوط کی تباہی بھی سر کی آنکھوں سے دیکھی ہے۔ مگر کیا حاصل؟ جب تک دل کی آنکھوں سے نہ دیکھیں عبرت کیسے حاصل ہو؟ اور دل کی آنکھوں سے وہ دیکھ نہیں سکتے، کیونکہ ان کے دل اندھے ہو گئے ہیں۔ اس لئے سب کچھ دیکھ کر بھی ان کو کچھ نظر نہیں آیا۔

جلدی مچانے والوں کو جواب: ــــــ اور وہ لوگ (مکہ والے) آپؐ سے عذاب کی جلدی مچا رہے ہیں ــــــ کہتے ہیں کہ اگر تم سچے نبی ہو تو وہ عذاب کیوں نہیں لے آتے جو برحق نبی کے جھٹلانے پر آتا ہے، اور جس کی دھمکی تم بار بار ہمیں دے چکے ہو ــــــ حالانکہ اللہ تعالیٰ کبھی اپنے وعدہ کے خلاف نہیں کرتے ــــــ یعنی عذاب

اپنے وقت پر ضرور آتا ہے۔ اللہ کا وعدہ کبھی جھوٹا نہیں ہوسکتا ـــــ اور بیشک آپ کے پروردگار کے پاس کا ایک دن ہزار سال کے مانند ہے ان دنوں سے جن کو تم شمار کرتے ہو ـــــ یعنی تمہاری گھڑیوں اور جنتریوں کے لحاظ سے ـــــ وقت ربڑ کی مثال ہے، کھینچو تو دراز اور چھوڑ دو تو ذرا سا! اسی طرح وقت (ٹائم) اس دنیا میں دراز کر دیا گیا ہے۔ یہاں کے ہزار سال اللہ کے یہاں کے ایک دن کے برابر ہیں۔ انسان اپنے ماضی اور مستقبل کے بارے میں سوچے تو یہ بات عیاں ہوجائے گی۔ آدمی کو گذری ہوئی زندگی کتنی مختصر معلوم ہوتی ہے اور باقی زندگی کتنی دراز؟ اس کی وجہ یہی ہے کہ گذری ہوئی زندگی سمٹا ہوا ربڑ ہے اور باقی زندگی کھچا ہوا ربڑ ہے۔ پس اگر کسی قوم کو ہزار سال کی مہلت ملی ہے تو وہ اللہ کے حساب میں صرف ایک دن کی مہلت ہے۔ اور مکہ والوں سے عذاب کا وعدہ کئے ابھی تیرہ سال گذرے ہیں۔ اللہ کے یہاں یہ مدت کس شمار میں ہے؟ چند لمحوں سے زیادہ نہیں۔ پس یہ نہ کہو کہ دھمکی دیئے ہوئے عرصہ بیت گیا! ابھی چند لمحات ہی گذرے ہیں کہ تمہاری ہلاکت کا وقت آ گیا ہے ـــــ اور کتنی ہی بستیاں ہیں جو نافرمان تھیں، میں نے ان کو ڈھیل دی، پھر میں نے ان کو پکڑا، اور میری ہی طرف لوٹنا ہے ـــــ یعنی ڈھیل دینے سے کیا وہ لوگ کہیں بھاگ گئے؟ سب لوٹ کر ہمارے ہی پاس آ گئے، اسی طرح تمہیں بھی چند لمحوں کی مہلت ملی ہے، تم بھی ہماری گرفت سے بچ نہیں سکتے۔ تمہیں بھی ایک نہ ایک دن ہماری طرف لوٹنا ہے۔

آخر میں یہ بات بیان کی گئی ہے کہ عذاب نبی کے اختیار میں نہیں ہوتا اس کا کام صرف چوکنا کرنا ہے۔ ارشاد ہے: ـــــ آپ کہہ دیں: اے لوگو! میں تم کو صاف صاف ڈرانے والا ہی ہوں ـــــ یعنی اس سے زیادہ میرا کوئی اختیار نہیں۔ پس اگر میں تمہاری فرمائش کے مطابق عذاب نہ لاسکوں تو اُس سے عذاب کی خبر کا جھوٹا ہونا لازم نہیں آتا۔ میں نے بہر حال سچی خبر دی ہے۔ تم کو اس پر کان دھرنا چاہئے اور اپنا حال درست کرنا چاہئے ـــــ پس جو لوگ ایمان لائے اور انھوں نے نیک کام کئے ان کے لئے مغفرت اور عزت کی روزی ہے ـــــ عزت کی روزی سے مراد یا تو عمدہ روزی ہے یعنی جنت میں عمدہ میوے اور پھل ملیں گے، انواع واقسام کی نعمتیں ملیں گی اور اللہ تعالیٰ کا دیدار نصیب ہوگا۔ یا مراد یہ ہے کہ عزت کے ساتھ کھلایا جائے گا، فقیر کی طرح ٹکڑا ہاتھ میں رکھ نہیں دیا جائے گا ـــــ اور جو لوگ ہماری باتوں کو ہرانے کے درپے ہیں وہی لوگ دوزخی ہیں! ـــــ یعنی جو لوگ نبی اور اہل ایمان کو ہرانے کی دوڑ دھوپ میں لگے رہتے ہیں وہی جہنم کا ایندھن بننے والے ہیں۔

آیات کا خلاصہ: کسی قوم کا اپنے پیغمبر کی تکذیب کرنا کوئی انوکھا واقعہ نہیں، ہمیشہ سے ایسا ہوتا رہا ہے۔ مگر اس تکذیب کا انجام آنکھوں کے سامنے ہے۔ تباہ شدہ قوموں کے کھنڈرات موجود ہیں، اس سے کوئی سبق لینا چاہے تو لے

سکتا ہے۔رہی یہ بات کہ تکذیب کرتے ہی عذاب کیوں نہیں آجاتا؟ تو بات یہ ہے کہ یہ کب کہا گیا ہے کہ عذاب پھٹ سے آجائے گا اور نبی نے یہ کب کہا ہے کہ عذاب لانا اس کے اختیار میں ہے۔اس کا فیصلہ تو اللہ تعالیٰ کے ہاتھ میں ہے۔ وہ پہلے بھی قوموں کو مہلت دیتے رہے ہیں۔اور مہلت کا زمانہ صدیوں تک دراز بھی ہوسکتا ہے۔عذاب میں تاخیر اس بات کی دلیل نہیں کہ وہ خالی دھمکی ہے۔عذاب ضرور آئے گا۔دنیا میں بھی آسکتا ہے، ورنہ آخرت کا عذاب تو یقینی ہے۔

وَمَآ اَرۡسَلۡنَا مِنۡ قَبۡلِكَ مِنۡ رَّسُوۡلٍ وَّلَا نَبِىٍّ اِلَّاۤ اِذَا تَمَنّٰٓى اَلۡقَى الشَّيۡطٰنُ فِىۡۤ اُمۡنِيَّتِهٖ‌ ۚ فَيَنۡسَخُ اللّٰهُ مَا يُلۡقِى الشَّيۡطٰنُ ثُمَّ يُحۡكِمُ اللّٰهُ اٰيٰتِهٖ‌ؕ وَاللّٰهُ عَلِيۡمٌ حَكِيۡمٌ ۙ‏ ﴿۵۲﴾ لِّيَجۡعَلَ مَا يُلۡقِى الشَّيۡطٰنُ فِتۡنَةً لِّلَّذِيۡنَ فِىۡ قُلُوۡبِهِمۡ مَّرَضٌ وَّالۡقَاسِيَةِ قُلُوۡبُهُمۡ‌ؕ وَاِنَّ الظّٰلِمِيۡنَ لَفِىۡ شِقَاقٍۢ بَعِيۡدٍ ۙ‏ ﴿۵۳﴾ وَّلِيَـعۡلَمَ الَّذِيۡنَ اُوۡتُوا الۡعِلۡمَ اَنَّهُ الۡحَـقُّ مِنۡ رَّبِّكَ فَيُؤۡمِنُوۡا بِهٖ فَتُخۡبِتَ لَهٗ قُلُوۡبُهُمۡ‌ؕ وَاِنَّ اللّٰهَ لَهَادِ الَّذِيۡنَ اٰمَنُوۡۤا اِلٰى صِرَاطٍ مُّسۡتَقِيۡمٍ‏ ﴿۵۴﴾ وَلَا يَزَالُ الَّذِيۡنَ كَفَرُوۡا فِىۡ مِرۡيَةٍ مِّنۡهُ حَتّٰى تَاۡتِيَهُمُ السَّاعَةُ بَغۡتَةً اَوۡ يَاۡتِيَهُمۡ عَذَابُ يَوۡمٍ عَقِيۡمٍ‏ ﴿۵۵﴾ اَلۡمُلۡكُ يَوۡمَـئِذٍ لِّلّٰهِ ؕ يَحۡكُمُ بَيۡنَهُمۡ‌ ؕ فَالَّذِيۡنَ اٰمَنُوۡا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ فِىۡ جَنّٰتِ النَّعِيۡمِ‏ ﴿۵۶﴾ وَالَّذِيۡنَ كَفَرُوۡا وَكَذَّبُوۡا بِاٰيٰتِنَا فَاُولٰۤـئِكَ لَهُمۡ عَذَابٌ مُّهِيۡنٌ‏ ﴿۵۷﴾ ع ۹ ۱۴

وَمَآ	اور نہیں	اِلَّآ	مگر	فِىۡۤ اُمۡنِيَّتِهٖ(۳)	اس کی آرزو میں
اَرۡسَلۡنَا	بھیجا ہم نے	اِذَا	جب	فَيَنۡسَخُ(۴)	پس ہٹا دیتے ہیں
مِنۡ قَبۡلِكَ	آپؐ سے پہلے	تَمَنّٰٓى(۲)	تمنا کی اس نے	اللّٰهُ	اللہ تعالیٰ
مِنۡ رَّسُوۡلٍ(۱)	کوئی رسول	اَلۡقَى	(تو رخنہ) ڈالا	مَا(۵)	اس (روک) کو جو
وَّلَا نَبِىٍّ	اور نہ کوئی نبی	الشَّيۡطٰنُ	شیطان نے	يُلۡقِى	ڈالتا ہے

(۱) من: زائدہ استغراق جنس کے لئے ہے۔(۲) تَمَنَّى الشيئَ: آرزو کرنا، تمنا کرنا، خواہش مند ہونا۔(۳) أُمنية: تمنا، آرزو، جمع أَمَانِيْ۔(۴) نسخ الشيئَ: (ف) نَسْخًا: ختم کرنا، زائل کرنا۔(۵) ما: مفعول بہ ہے ینسخ کا۔

الشَّيْطٰنُ	شیطان	بَعِيْدٍ	دور کے	وَلَا يَزَالُ	اور برابر رہیں گے
ثُمَّ	پھر	وَّلِيَعْلَمَ	اور تا کہ جان لیں	الَّذِيْنَ	وہ لوگ جنھوں نے
يُحْكِمُ	مضبوط کرتے ہیں	الَّذِيْنَ	وہ لوگ جو	كَفَرُوْا	انکار کیا
اللّٰهُ	اللہ تعالیٰ	اُوْتُوا	دیئے گئے	فِيْ مِرْيَةٍ	شک میں
اٰيٰتِهٖ	اپنی آیتیں	الْعِلْمَ	علم	مِّنْهُ	اس سے
وَ اللّٰهُ	اور اللہ تعالیٰ	اَنَّهُ	کہ وہ	حَتّٰى	یہاں تک کہ
عَلِيْمٌ	خوب جاننے والے	الْحَقُّ	برحق ہے	تَأْتِيَهُمُ	آئے ان کے پاس
حَكِيْمٌ	حکمت والے ہیں	مِنْ رَّبِّكَ	آپؐ کے رب کی	السَّاعَةُ	قیامت
لِّيَجْعَلَ	تا کہ بنائیں اللہ		طرف سے	بَغْتَةً	اچانک
مَا	اس (روک) کو جو	فَيُؤْمِنُوْا	پس ایمان لے آئیں وہ	اَوْ	یا
يُلْقِي	ڈالتا ہے	بِهٖ	اس پر	يَأْتِيَهُمْ	آئے ان کے پاس
الشَّيْطٰنُ	شیطان	فَتُخْبِتَ (۲)	پس جھک جائیں	عَذَابُ	عذاب
فِتْنَةً	آزمائش	لَهٗ	اس کے لئے	يَوْمٍ عَقِيْمٍ (۳)	بے برکت دن کا
لِّلَّذِيْنَ	ان کے لئے	قُلُوْبُهُمْ	ان کے دل	اَلْمُلْكُ	بادشاہی
فِيْ قُلُوْبِهِمْ	جن کے دلوں میں	وَاِنَّ	اور بیشک	يَوْمَئِذٍ	اس دن
مَّرَضٌ	روگ ہے	اللّٰهَ	اللہ تعالیٰ	لِّلّٰهِ	اللہ کے لئے ہے
وَّ الْقَاسِيَةِ (۱)	اور سخت ہونیوالے ہیں	لَهَادِ	البتہ راہ نمائی کرتے ہیں	يَحْكُمُ	فیصلہ فرمائیں گے
قُلُوْبُهُمْ	جن کے دل	الَّذِيْنَ	ان لوگوں کی جو	بَيْنَهُمْ	ان کے درمیان
وَاِنَّ	اور بیشک	اٰمَنُوْٓا	ایمان لائے	فَالَّذِيْنَ	پس جو لوگ
الظّٰلِمِيْنَ	ظالم لوگ	اِلٰى صِرَاطٍ	راستے کی طرف	اٰمَنُوْا	ایمان لائے
لَفِيْ شِقَاقٍ	البتہ اختلاف میں ہیں	مُّسْتَقِيْمٍ	سیدھے	وَ عَمِلُوْا	اور کئے انھوں نے

(۱) **القاسیة** کا عطف **الذین** پر ہے اور **قلوبھم** اس کا فاعل ہے۔ (۲) **تخبت**: از إخبات: نیاز مند ہونا، جھک جانا۔ اس کی ضد استکبار ہے۔ (۳) **عَقِيْم**: بانجھ، بے فائدہ، بے برکت۔

الصّٰلِحٰتِ	نیک کام	كَفَرُوْا	انکار کیا	لَهُمْ	ان کے لئے
فِيْ جَنّٰتِ	باغات میں ہونگے	وَكَذَّبُوْا	اور جھٹلائیں انھوں نے	عَذَابٌ	عذاب ہے
النَّعِيْمِ	نعمتوں کے	بِاٰيٰتِنَا	ہماری آیتیں	مُّهِيْنٌ	رسوا کرنے والا
وَالَّذِيْنَ	اور جن لوگوں نے	فَاُولٰٓئِكَ	پس یہ لوگ	۞	۞

چوتھی بات: ایسے واقعات پیش آتے رہتے ہیں جن کے ذریعہ شیطان اسلام کے خلاف محاذ بناتا ہے ——— گذشتہ آیات میں آپ نے پڑھا کہ تین باتیں ہمیشہ سے رہی ہیں۔قربانی کا حکم ہمیشہ سے رہا ہے۔ جہاد کا حکم بھی ہر شریعت میں رہا ہے۔اور حق کے انکار کا سلسلہ بھی ہمیشہ سے جاری ہے۔اور اس کے نتیجہ میں کفار کی تباہی بھی اللہ تعالیٰ کی سنتِ مستمرہ ہے۔اسی طرح ایک چوتھی بات ہے، وہ بھی ہمیشہ سے جاری ہے۔اور وہ ''واقعات کی رفتار'' ہے۔ یہ بات بھی انبیاء علیہم السلام کے اختیار میں نہیں۔انبیاء کی تاریخ میں ایسے واقعات ہمیشہ پیش آتے رہے ہیں جن کے ذریعہ اہل ایمان کی آزمائش کی جاتی ہے۔تمام رسولوں اور نبیوں کے ساتھ اس قسم کے معاملات پیش آئے ہیں کہ جب بھی دین کی ترقی کے آثار پیدا ہوتے ہیں، اور اللہ کے رسول امید باندھتے ہیں کہ اب ظہور اسلام کا وقت قریب آگیا ہے تو اچانک شیطان رنگ میں بھنگ ڈالتا ہے۔اور کوئی ایسا واقعہ پیش آجاتا ہے جو لوگوں کو شک میں مبتلا کر دیتا ہے۔ جیسے اللہ تعالیٰ نے موسیٰ علیہ السلام کی مدد فرمائی۔فرعون سے نجات عطا فرمائی۔ جب بنی اسرائیل فرعون کی بالا دستی سے آزاد ہو گئے تو اللہ تعالیٰ نے تورات عطا فرمانے کا وعدہ کیا، اور سب کو طور پر بلایا۔مگر اچانک سامری نے سوانگ بھرا اور گوسالہ پرستی کا سلسلہ شروع کر دیا، اور تھوڑی دیر کے لئے موسیٰ علیہ السلام کی محنت پر پانی پھیر دیا۔

اسی طرح جنگِ بدر کے بعد جنگِ اُحد میں جو صورتِ حال پیش آئی وہ بھی لوگوں کے لئے تشویش کا باعث بن گئی۔ جنگِ بدر میں تین سو تیرہ نہتے مسلمانوں نے چشم زدن میں کفار کے لشکر کا صفایا کر دیا تھا۔ستّر کو موت کی گھاٹ اتار دیا تھا، اور ستّر ہی کو پابہ زنجیر مدینہ لے آئے تھے، جن سے فدیہ میں بڑی رقم حاصل ہوئی تھی۔مگر ٹھیک ایک سال کے بعد جنگِ احد پیش آئی۔اس وقت مسلمانوں کی جمعیت بھی زیادہ تھی، اور نسبۃً ساز و سامان بھی زیادہ تھا۔اور کفار کا لشکر بدر کی طرح ایک ہزار ہی تھا۔اس موقعہ پر اللہ کے نبی کس قدر پر امید ہونگے اس کا کون اندازہ کر سکتا ہے۔اگر جنگِ احد میں بھی وہی نقشہ دنیا کے سامنے آتا جو بدر میں آیا تھا تو اسلام کی اشاعت کے لئے کتنی کشادہ راہ کھل جاتی۔ مگر اچانک جنگ کے خاتمہ پر تیر اندازوں کے جگہ چھوڑ دینے کی وجہ سے پانسہ پلٹ گیا۔اور فتح شکست میں بدل گئی۔ ستّر جانباز صحابہ شہید ہو گئے، اور جو زندہ بچے وہ بشمول نبی ﷺ سب زخمی تھے۔ یہ صورتِ حال ایک آزمائش تھی،

لوگ کہنے لگے کہ جنگی معرکے بس کنویں کے ڈول کی طرح ہیں۔ کبھی ایک فتح مند ہوتا ہے تو کبھی دوسرا۔ حق وصداقت سے اس کا کوئی تعلق نہیں۔ یہ شیطان نے رنگ میں بھنگ ڈالا۔ اور اشاعتِ اسلام کی راہ میں رکاوٹ کھڑی کردی۔ سورۂ آل عمران میں اس کی حکمتوں پر مفصل کلام کیا گیا ہے۔

اور اس کی یہی ایک مثال نہیں ہے۔ مکی زندگی میں اس کی مثال معراج کا واقعہ ہے۔ جب دعوت کا رنگ آیا کہ یہ واقعہ پیش آیا۔ جس نے کھروں کو اور نکھار دیا اور وہ صدیق بن گئے اور مذبذب پیچھے ہٹ گئے ——— اور مدنی زندگی میں ایسے کم از کم دس واقعات پیش آئے ہیں جن سے تھوڑی دیر کے لئے حرکتِ اسلامی متاثر ہوئی ہے۔ مگر جلد ہی اللہ تعالیٰ نے وہ روک ہٹادی، اور اسلام کی گاڑی اپنی پوری رفتار کے ساتھ رواں دواں ہوگئی۔ جیسے احد کے دو سال بعد غزوۂ احزاب پیش آیا۔ اس وقت صورتِ حال اتنی نازک ہوگئی تھی کہ کلیجہ منہ کو آ گیا تھا۔ سورۃ الاحزاب میں اس کی تفصیل ہے۔ اسی طرح حضرت زینب رضی اللہ عنہا سے نکاح کا معاملہ ہے۔ جس میں معاشقہ تک کی بات گھڑ لی گئی، اس کی تفصیل بھی سورۂ احزاب میں ہے۔ اسی طرح حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا پر تہمت کا معاملہ ہے، جس کو لے کر بدباطن لوگوں نے خوب کیچڑ اچھالا، اس کی تفصیل سورۃ النور میں ہے۔ اور آخری معاملہ غزوۂ تبوک کا ہے، جس میں کھرے کھوٹے کا خوب امتیاز ہوگیا۔

اِن آیات میں یہی حقیقت سمجھائی ہے کہ یہ انبیاء علیہم السلام کی تاریخ کا کوئی انوکھا واقعہ نہیں۔ ہر رسول اور ہر نبی کے ساتھ ایسے حالات پیش آئے ہیں۔ واقعات کی یہ رفتار انبیاء کے اختیار میں نہیں ہوتی۔ اور اس میں اللہ تعالیٰ کی حکمتیں ہوتی ہیں جن کو اِن آیات میں واضح کیا گیا ہے۔ ارشاد ہے: ——— اور نہیں بھیجا ہم نے آپؐ سے پہلے کوئی رسول اور نہ کوئی نبی مگر جب اس نے (غلبۂ اسلام کی) آرزو کی تو شیطان نے اس کی آرزو میں (رخنہ) ڈالا ——— یعنی پیش آمدہ واقعہ کے ذریعہ لوگوں کو شک میں مبتلا کردیا۔ قرآن وحدیث کی اصطلاح میں ہر نامناسب بات کو شیطان کی طرف منسوب کیا جاتا ہے۔ جنگِ احد کے موقعہ پر جن صحابہ سے کمزوری کا اظہار ہوا تھا ان کے بارے میں سورۃ آل عمران (آیت ۱۵۵) میں ہے: ﴿إِنَّمَا اسْتَزَلَّهُمُ الشَّيْطَانُ﴾ یعنی شیطان ہی نے ان کو لغزش دیدی۔ اور حدیث میں اس آلائش کے بارے میں جو سوتے وقت ناک میں جمع ہوجاتی ہے فرمایا ہے کہ ''شیطان ناک کے بانسے پر شب باشی کرتا ہے'' اسی طرح ''شیطان نے اس کی آرزو میں ڈالا'' اس میں بھی پیش آمدہ واقعہ کے ناپسندیدہ نتائج کی طرف اشارہ ہے۔ یعنی کوئی ایسا واقعہ پیش آجاتا ہے جو تھوڑی دیر کے لئے اشاعتِ اسلام کی رفتار سست کردیتا ہے ——— پس اللہ تعالیٰ اس (روک) کو ہٹادیتے ہیں جو شیطان ڈالتا ہے، پھر اللہ تعالیٰ اپنی آیتوں (دین) کو مضبوط

کرتے ہیں، اور اللہ تعالیٰ خوب جاننے والے بڑی حکمت والے ہیں ـــــ یعنی یہ موانع عارضی ہوتے ہیں۔ جلد ہی اللہ تعالیٰ ان رکاوٹوں کو ہٹا دیتے ہیں، اور اشاعتِ اسلام کی رفتار بدستور جاری ہو جاتی ہے۔ اور غلبۂ اسلام کا وعدہ پورا ہوتا ہے۔ اور ایسا اس لئے ہوتا ہے کہ اللہ تعالیٰ علیم وحکیم ہیں۔ وہ اپنی حکمت ومصلحت سے ایسا کرتے ہیں۔ اور وہ حکمت یہ ہے کہ اس طرح اللہ تعالیٰ دل کے روگیوں اور سخت دل والوں کی آزمائش کرتے ہیں۔ وہ اسلام کے بارے میں قسم قسم کے وساوس میں مبتلا ہو جاتے ہیں۔ وہ سوچنے لگتے ہیں کہ اگر یہ سچے نبی ہوتے اور دین اسلام اللہ کا دین ہوتا تو یہ یکدم پانسہ پلٹ کیوں گیا؟ اور اللہ نے اپنے نبی کی مدد چھوڑ کیوں دی؟ ارشاد ہے: ـــــ تاکہ اللہ تعالیٰ اس (رخنہ) کو جو شیطان ڈالتا ہے ان لوگوں کے لئے آزمائش بنائیں جن کے دلوں میں روگ ہے، اور ان لوگوں کے لئے (بھی) جن کے دل سخت ہو گئے ہیں، اور ظالم لوگ یقیناً دور کے اختلاف میں ہیں ـــــ دل کے روگی: منافق لوگ ہیں۔ اور دل کے سخت وہ کفار ہیں جن کے دلوں کی طرف ابھی ایمان نے راہ نہیں بنائی۔ اسلام سے اختلاف دونوں ہی رکھتے ہیں۔ مگر یہ سخت دل والے دور کے اختلاف میں ہیں۔ ان دونوں قسم کے لوگوں کے لئے اس قسم کے واقعات آزمائش بن جاتے ہیں۔ منافقین تذبذب میں مبتلا ہو جاتے ہیں۔ اور کفار سابقہ نصرتِ الٰہی کو محض اتفاقی واقعہ قرار دیتے ہیں۔ جنگِ احد کے خاتمہ پر ابوسفیان نے جو کفار کے لشکر کا سپہ سالار تھا ہُبل کی جے پکاری تھی اور اعلان کیا تھا کہ یہ بدر کے دن کا بدلہ ہے (تفصیل کے لئے دیکھیں ہدایت القرآن پارہ۴ص:۵۱)

اور اس قسم کے واقعات میں مخلص مؤمنوں کے لئے یہ حکمت ہوتی ہے: ـــــ اور تاکہ وہ لوگ جو علم دیئے گئے ہیں ـــــ یعنی اللہ کی حکمتوں کو جانتے ہیں ـــــ جان لیں کہ وہ (پیش آمدہ) بات آپؐ کے رب کی طرف سے برحق ہے ـــــ یعنی جس اللہ نے بدر میں منصور وغالب کیا تھا اسی نے احد میں دوسری صورت سے دوچار کیا ـــــ پس وہ اس پر ایمان لے آئیں، پس اس کے لئے ان کے دل نیازمند ہو جائیں ـــــ یعنی اللہ پر ان کا ایمان قوی ہو جائے، اور اللہ کی آیتوں وعدوں اور حکمتوں کے وہ خوب قائل ہو جائیں، اور اللہ کے سامنے ان کی نیازمندی بڑھ جائے۔ وہ اس قسم کے واقعات سے جان لیتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ نہ کسی کے محتاج ہیں نہ پابند۔ ان کی حکمت کا جو تقاضا ہوتا ہے وہی کام کرتے ہیں ـــــ اور اللہ تعالیٰ ان لوگوں کو جو ایمان لائے ہیں ـــــ یعنی ایمان میں مخلص ہیں ـــــ یقیناً سیدھا راستہ دکھاتے ہیں ـــــ یعنی واقعات کی حقیقت سمجھنے کی توفیق بھی اللہ تعالیٰ ہی عطا فرماتے ہیں۔

سخت دل کفار کا حال: ـــــ اور وہ لوگ جنھوں نے انکار کیا وہ اس بات میں برابر شک میں مبتلا رہتے ہیں،

یہاں تک کہ ان کے پاس اچانک قیامت آجائے یا ان کے پاس بانجھ (بے برکت) دن کا عذاب آجائے ——— یعنی ان کا حال حسبِ سابق رہتا ہے۔ اس میں کچھ فرق نہیں پڑتا۔ آئندہ کی نصرت کے واقعات میں بھی وہ غور نہیں کرتے۔ وہ شک میں موت تک مبتلا رہتے ہیں۔ ان کو کفر وانکار کی سزا قیامت کے دن ملے گی۔ اور ممکن ہے دنیا میں بھی ان پر عذاب کا کوڑا برس پڑے۔ اگر دنیا ہی میں ان کو عذاب پہنچ گیا تو وہ دن بڑا ہی بے برکت ثابت ہوگا۔ اور اگر قیامت کے دن تک عذاب مؤخر ہوگیا تو ——— اس دن بادشاہی اللہ کے لئے ہے (اس دن) اللہ ان کے درمیان (عملی) فیصلہ فرمائیں گے ——— اور وہ فیصلہ یہ ہوگا: ——— پس جو لوگ ایمان لائے اور انھوں نے نیک کام کئے وہ نعمتوں کے باغات میں ہونگے۔ اور جن لوگوں نے انکار کیا اور انھوں نے ہماری آیتوں کو جھٹلایا، پس انہی لوگوں کے لئے رسوا کن عذاب ہے ——— لہٰذا وہ اس کا انتظار کریں۔

فائدہ: یہاں بد دین لوگوں نے بلکہ کفار مکہ نے **الغَرَانِيْقُ الْعُلٰى** (طائرانِ لاہوتی) کا قصہ گڑھا ہے۔ اور بہت سے مفسرین نے اس کو بنیاد بنا کر اِن آیات پاک کی تفسیر کی ہے جو قطعاً غلط ہے۔ کیونکہ یہ واقعہ کفار کا گھڑا ہوا ہے [1] اور حضرت شاہ ولی اللہ صاحب محدث دہلوی قدس سرہ نے حجۃ اللہ البالغہ (۲: ۵۱۸ طبع جدید، رحمۃ اللہ الواسعہ ۵: ۶۱۰) میں "اللہ کے اشاروں کو سمجھنے میں اجتہادی خطا" کو بنیاد بنا کر تفسیر کی ہے۔ اور اس کی دو مثالیں دی ہیں: ایک: مقامِ ہجرت کی تعیین میں نبی ﷺ سے چوک ہوگئی اور آپؐ طائف تشریف لے گئے۔ دوسری: حدیبیہ کے سال خواب کا زمانہ متعین کرنے میں چوک ہوگئی اور اسی سال سفر شروع کردیا۔ یہ تفسیر بھی کچھ زیادہ موزون نہیں۔ یہ معاملہ سب نبیوں کو عام کیسے ہوسکتا ہے؟ نیز سابقہ آیات سے ربط بھی باقی نہیں رہتا۔ ہم نے انبیاء علیہم السلام کی زندگی میں پیش آنے والے "واقعات کی رفتار" کو بنیاد بنا کر تفسیر کی ہے، اس سے ربط بھی قائم رہتا ہے اور اس کا عموم بھی قابل فہم بن جاتا ہے۔

جن کو صحیح فہم عطا ہوا ہے وہ جانتے ہیں کہ اگر واقعات ہمیشہ دین کی موافقت میں ظاہر ہوتے رہیں تو حق واشگاف ہوجائے اور امتحان کا پہلو رائیگاں ہوجائے۔

(۱) سنہ ۵ ہجری میں جبکہ صحابہ نے حبشہ کی طرف پہلی مرتبہ ہجرت کی ہے مکہ میں یہ واقعہ پیش آیا کہ نبی ﷺ ایک بار حرم میں تشریف لے گئے۔ وہاں قریش کا مجمع تھا۔ آپؐ نے ان کے سامنے سورۂ نجم تلاوت فرمائی۔ جب ان کے کانوں میں ایک ناقابل بیان رعنائی ودل کشی لئے ہوئے کلام الٰہی کی آواز پڑی تو انھیں کچھ ہوش نہ رہا۔ پھر جب آپؐ نے سورت کے ختم پر سجدۂ تلاوت کیا تو وہ لوگ بھی بے اختیار سجدے میں چلے گئے۔ بعد میں انھیں خیال آیا کہ ہم نے یہ کیا حماقت کی؟ چنانچہ انھوں نے اپنی خفت مٹانے کے لئے غرانیق والا واقعہ گھڑا اور کہنا شروع کیا کہ چونکہ محمد صاحب نے ہمارے بتوں کی تعریف کی تھی اس لئے ہم نے سجدہ کیا (تفصیل سورۂ نجم کی تفسیر میں آئے گی)

وَ الَّذِيْنَ هَاجَرُوْا فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ ثُمَّ قُتِلُوْٓا اَوْ مَاتُوْا لَيَرْزُقَنَّهُمُ اللّٰهُ رِزْقًا حَسَنًا ؕ وَ اِنَّ اللّٰهَ لَهُوَ خَيْرُ الرّٰزِقِيْنَ ۝ لَيُدْخِلَنَّهُمْ مُّدْخَلًا يَّرْضَوْنَهٗ ؕ وَ اِنَّ اللّٰهَ لَعَلِيْمٌ حَلِيْمٌ ۝ ذٰلِكَ ۚ وَ مَنْ عَاقَبَ بِمِثْلِ مَا عُوْقِبَ بِهٖ ثُمَّ بُغِيَ عَلَيْهِ لَيَنْصُرَنَّهُ اللّٰهُ ؕ اِنَّ اللّٰهَ لَعَفُوٌّ غَفُوْرٌ ۝ ذٰلِكَ بِاَنَّ اللّٰهَ يُوْلِجُ الَّيْلَ فِي النَّهَارِ وَيُوْلِجُ النَّهَارَ فِي الَّيْلِ وَاَنَّ اللّٰهَ سَمِيْعٌ بَصِيْرٌ ۝ ذٰلِكَ بِاَنَّ اللّٰهَ هُوَ الْحَقُّ وَ اَنَّ مَا يَدْعُوْنَ مِنْ دُوْنِهٖ هُوَ الْبَاطِلُ وَ اَنَّ اللّٰهَ هُوَ الْعَلِيُّ الْكَبِيْرُ ۝ اَلَمْ تَرَ اَنَّ اللّٰهَ اَنْزَلَ مِنَ السَّمَآءِ مَآءً ۫ فَتُصْبِحُ الْاَرْضُ مُخْضَرَّةً ؕ اِنَّ اللّٰهَ لَطِيْفٌ خَبِيْرٌ ۝ۚ لَهٗ مَا فِي السَّمٰوٰتِ وَمَا فِي الْاَرْضِ ؕ وَ اِنَّ اللّٰهَ لَهُوَ الْغَنِيُّ الْحَمِيْدُ ۝ۧ اَلَمْ تَرَ اَنَّ اللّٰهَ سَخَّرَ لَكُمْ مَّا فِي الْاَرْضِ وَ الْفُلْكَ تَجْرِيْ فِي الْبَحْرِ بِاَمْرِهٖ وَ يُمْسِكُ السَّمَآءَ اَنْ تَقَعَ عَلَى الْاَرْضِ اِلَّا بِاِذْنِهٖ ؕ اِنَّ اللّٰهَ بِالنَّاسِ لَرَءُوْفٌ رَّحِيْمٌ ۝ وَ هُوَ الَّذِيْۤ اَحْيَاكُمْ ۫ ثُمَّ يُمِيْتُكُمْ ثُمَّ يُحْيِيْكُمْ ؕ اِنَّ الْاِنْسَانَ لَكَفُوْرٌ ۝

ع ۱۵

وَ الَّذِيْنَ	اور جنھوں نے	لَيَرْزُقَنَّهُمُ	ضرور روزی دینگے انکو	خَيْرُ	بہترین
هَاجَرُوْا	وطن چھوڑا	اللّٰهُ	اللہ تعالیٰ	الرّٰزِقِيْنَ	روزی دینے والے ہیں
فِيْ سَبِيْلِ	راہ میں	رِزْقًا (۱)	روزی	لَيُدْخِلَنَّهُمْ	ضرور داخل کریں گے
اللّٰهِ	اللہ کے	حَسَنًا	عمدہ		ان کو
ثُمَّ	پھر	وَ اِنَّ	اور بیشک	مُّدْخَلًا (۲)	داخل ہونے کی جگہ میں
قُتِلُوْٓا	مارے گئے وہ	اللّٰهَ	اللہ تعالیٰ	يَّرْضَوْنَهٗ (۳)	جس کو پسند کریں گے وہ
اَوْ مَاتُوْا	یا مر گئے وہ	لَهُوَ	البتہ وہ	وَ اِنَّ	اور بیشک

(۱) رزقا حسنا: لیرزقن کا مفعول ثانی یا مفعول مطلق ہے۔(۲) مدخلا: ظرف مکان مفعول فیہ یا مصدر میمی مفعول ←

اللّٰهَ	اللہ تعالیٰ	بِاَنَّ	بایں وجہ ہے کہ	هُوَ	وہ
لَعَلِيْمٌ	خوب جاننے والے	اللّٰهَ	اللہ تعالیٰ	الْبَاطِلُ	لچر ہے
حَلِيْمٌ	بہت بردبار ہیں	يُوْلِجُ	داخل کرتے ہیں	وَاَنَّ	اور بایں وجہ ہے کہ
ذٰلِكَ	یہ بات (پوری ہوئی)	الَّيْلَ	رات کو	اللّٰهَ	اللہ تعالیٰ
وَمَنْ	اور جس نے	فِي النَّهَارِ	دن میں	هُوَ	وہ
عَاقَبَ(۱)	سزا دی	وَيُوْلِجُ	اور داخل کرتے ہیں	الْعَلِيُّ	عالیشان
بِمِثْلِ(۲)	برابر	النَّهَارَ	دن کو	الْكَبِيْرُ	سب سے بڑے ہیں
مَا	اس کے جو	فِي الَّيْلِ	رات میں	اَلَمْ	کیا نہیں
عُوْقِبَ	سزا دیا گیا وہ	وَاَنَّ	اور بایں وجہ ہے کہ	تَرَ	دیکھا تو نے
بِهٖ	اس سے	اللّٰهَ	اللہ تعالیٰ	اَنَّ	کہ
ثُمَّ	پھر	سَمِيْعٌ	خوب سننے والے	اللّٰهَ	اللہ تعالیٰ نے
بُغِيَ	زیادتی کی گئی	بَصِيْرٌ	خوب دیکھنے والے ہیں	اَنْزَلَ	اتارا
عَلَيْهِ	اس پر	ذٰلِكَ	وہ (نصرت)	مِنَ السَّمَآءِ	آسمان سے
لَيَنْصُرَنَّهُ	ضرور مدد کریں گے اسکی	بِاَنَّ	بایں وجہ ہے کہ	مَآءً	پانی
اللّٰهُ	اللہ تعالیٰ	اللّٰهَ	اللہ تعالیٰ	فَتُصْبِحُ	پس ہو جاتی ہے
اِنَّ	اور بیشک	هُوَ	وہ	الْاَرْضُ	زمین
اللّٰهَ	اللہ تعالیٰ	الْحَقُّ	برحق ہیں	مُخْضَرَّةً	سرسبز
لَعَفُوٌّ	البتہ درگذر کرنیوالے	وَاَنَّ	اور بایں وجہ ہے کہ	اِنَّ اللّٰهَ	بیشک اللہ تعالیٰ
غَفُوْرٌ	بڑے بخشنے والے ہیں	مَا	جس کو	لَطِيْفٌ	بڑے مہربان
ذٰلِكَ	وہ بات (مؤمنین کو	يَدْعُوْنَ	پکارتے ہیں وہ	خَبِيْرٌ	بڑے خبردار ہیں
	غالب کرنا)	مِنْ دُوْنِهٖ	اللہ سے کم تر	لَهٗ	ان کے لئے ہے

← مطلق ہے۔(۳) جملہ یرضونہ: مدخلا کی صفت ہے۔

(۱) عَاقَبَ فلانا بذنبه معاقبة وعقابا: سزا دینا۔(۲) مثل: مابعد کی طرف مضاف ہے۔

مَا	جو کچھ	مَّا	اس چیز کو جو	بِالنَّاسِ	لوگوں پر
فِي السَّمٰوٰتِ	آسمانوں میں ہے	فِي الْاَرْضِ	زمین میں ہے	لَرَءُوْفٌ	البتہ شفیق
وَمَا	اور جو کچھ	وَالْفُلْكَ (۱)	اور کشتی کو	رَّحِيْمٌ	مہربان ہیں
فِي الْاَرْضِ	زمین میں ہے	تَجْرِيْ (۲)	چلتی ہے وہ	وَهُوَ	اور وہ
وَاِنَّ اللّٰهَ	اور بیشک اللہ	فِي الْبَحْرِ	سمندر میں	الَّذِيْٓ	جنھوں نے
لَهُوَ	البتہ وہ	بِاَمْرِهٖ	ان کے حکم سے	اَحْيَاكُمْ	زندہ کیا تم کو
الْغَنِيُّ	بے نیاز	وَيُمْسِكُ	اور روکے ہوئے ہیں وہ	ثُمَّ	پھر
الْحَمِيْدُ	سزاوار تعریف ہیں	السَّمَاۗءَ	آسمان کو	يُمِيْتُكُمْ	موت دیں گے تم کو
اَلَمْ	کیا نہیں	اَنْ (۳)	(اس سے) کہ	ثُمَّ	پھر
تَرَ	دیکھا تو نے	تَقَعَ	گرے وہ	يُحْيِيْكُمْ	زندہ کریں گے تم کو
اَنَّ	کہ	عَلَى الْاَرْضِ	زمین پر	اِنَّ	بیشک
اللّٰهَ	اللہ تعالیٰ نے	اِلَّا	مگر	الْاِنْسَانَ	انسان
سَخَّرَ	کام میں لگایا ہے	بِاِذْنِهٖ	ان کی اجازت سے	لَكَفُوْرٌ	البتہ ناشکرا ہے
لَكُمْ	تمہارے لئے	اِنَّ اللّٰهَ	بیشک اللہ تعالیٰ	۞	۞

پانچویں بات: کفار نے ہجرت کو بھی تضحیک کا نشانہ بنایا ـــــ گذشتہ آیات میں آپ نے پڑھا کہ شیطان ناموافق حالات وواقعات کے ذریعہ اسلام کے راستے میں روڑے اٹکاتا ہے۔ کفار ومنافقین ان کے ذریعہ اسلام اور مسلمانوں کے خلاف پروپیگنڈہ کرتے ہیں۔ جب بھی کوئی ایسی بات پیش آتی ہے جو مسلمانوں کے موافق نہیں ہوتی تو مخالفین اس کے ذریعہ اسلام کی شبیہ بگاڑتے ہیں، اور لوگوں کو اسلام سے بدظن کرتے ہیں۔ مثلاً جب مسلمان کفار مکہ کے ظلم وستم سے تنگ آکر پہلے حبشہ کی طرف پھر مدینہ کی طرف ہجرت کرنے پر مجبور ہوئے تو کفار نے کہنا شروع کیا کہ ان لوگوں نے اچھا دین اختیار کیا جو گھر سے بے گھر ہوگئے۔ اہل وعیال اور مال ومنال سے ہاتھ دھو بیٹھے۔ اب دربدر کی ٹھوکریں کھا رہے ہیں ـــــ حالانکہ یہ واقعات کی رفتار تھی جو بہرحال پیش آنی تھی۔ حالات کا نشیب وفراز نبی تک

(۱) والفلك کا عطف ما پر ہے۔ (۲) جملہ تجری: الفلك کا حال ہے (۳) أن: مصدریہ ہے، اور اس سے پہلے حرف جر عن یا مِن پوشیدہ ہے۔

کے اختیار میں نہیں ہوتا، مسلمانوں کا اس میں کیا اختیار ہوسکتا ہے؟ یہ تو اللہ تعالیٰ کی سنت مستمرہ ہے۔ ہمیشہ نیا پودا عوارض سے دوچار ہوتا ہے، کوئی تناور درخت یکا یک کمال تک نہیں پہنچتا۔ دیکھنا درحقیقت انجام کو ہے۔ اگر انجام بخیر ہے تو درمیانی خطرات کی کیا پرواہ! ہمیشہ بڑے مقاصد کٹھنائیوں سے گذر کر ہی حاصل ہوتے ہیں۔ مہندی پتھر پے پس جانے کے بعد ہی رنگ لاتی ہے۔ سونا بھٹی میں تپانے کے بعد ہی نکھرتا ہے۔ اسلام قبول کرنے والوں کو بھی سرخ روئی سختیاں سہنے کے بعد ہی حاصل ہوگی۔ مگر شیطان اور اس کے چیلے ہجرت اور اس کی سختیوں کو اسلام کے خلاف پروپیگنڈے کا ذریعہ بناتے تھے۔ ان آیات میں ان کو جواب دیا گیا ہے کہ مہاجرین کو اللہ کی مدد ضرور پہنچے گی۔ اور جو لوگ اسلام کا غلبہ دیکھنے سے پہلے چل بسے ہیں وہ آخرت میں اجر پائیں گے، ارشاد ہے: ـــــ اور جن لوگوں نے اللہ کی راہ میں وطن چھوڑا پھر وہ مارے گئے یا مر گئے، اللہ تعالیٰ ان کو ضرور بہترین روزی عنایت فرمائیں گے، اور اللہ تعالیٰ یقیناً سب سے بہتر روزی دینے والے ہیں ـــــ یعنی جو لوگ دین کی خاطر وطن چھوڑنے کے بعد شہید کئے گئے، جیسے اسلام کی پہلی جنگِ بدر میں چھ مہاجرین شہید ہوئے، یا وہ طبعی موت مر گئے، جیسے حضرت عثمان بن مظعون اور حضرت ابوسلمہ بن عبدالاسد رضی اللہ عنہما کی مدینہ میں وفات ہوئی، اور یہ حضرات اسلام کا اور مسلمانوں کا غلبہ اپنی آنکھوں سے نہ دیکھ سکے، اللہ تعالیٰ ان کو آخرت میں بدلہ دیں گے جنت کی روزی عنایت فرمائیں گے۔ اور ہر طرح کی نعمتوں اور راحتوں سے شاد کام کریں گے۔ روزی کا مفہوم بہت وسیع ہے۔ جس چیز میں بھی کسی نوعیت کا فائدہ ہو وہ روزی ہے ـــــ وہ ضرور ان کو ایسی جگہ میں داخل کریں گے جس کو وہ پسند کریں گے ـــــ یعنی جنت میں داخل فرمائیں گے جو نہایت پسندیدہ جگہ ہے، جہاں سے وہ کبھی نکلنا نہ چاہیں گے۔ اور یہی جنت بہترین رزق ہے، اس لئے حرفِ عطف نہیں لایا گیا، تاکہ کمالِ اتحاد پر دلالت کرے۔ یعنی رزقِ حَسن اور مدخلِ کریم ایک ہیں ـــــ رہی یہ بات کہ بعض مہاجرین دنیاوی فتح ونصرت اور اس کے فوائد سے محروم کیوں گئے؟ اور ان کے مقابلہ میں کفار ان کے قتل کرنے پر قادر کیوں ہوئے؟ وہ قہر الٰہی سے ہلاک کیوں نہ کردیئے گئے؟ تو اس کی وجہ یہ ہے: ـــــ اور اللہ تعالیٰ یقیناً خوب جاننے والے بڑے بردبار ہیں ـــــ یعنی وہ ہر کام کی حکمت ومصلحت جانتے ہیں۔ مہاجرین کی اس ظاہری ناکامی میں بھی بہت سی حکمتیں اور مصلحتیں ہیں، اور اللہ تعالیٰ بڑے بردبار بھی ہیں، وہ دشمنوں کو فوراً سزا نہیں دیتے، ان کو سنبھلنے کا کافی موقع دیتے ہیں۔

یہ بات (پوری ہوئی) ـــــ یعنی جو مہاجریں غلبۂ اسلام دیکھنے سے پہلے چل بسے ان کے اجر کا بیان پورا ہوا۔ اور جو مہاجرین ابھی بقیدِ حیات ہیں ان کی دو قسمیں ہیں: ایک: سراسر مظلوم، جنھوں نے دشمن سے ظلم کا کوئی بدلہ نہیں لیا۔ جنگِ بدر میں شریک سب مہاجرین کا یہی حال تھا۔ ان لوگوں کو ان کی اسی مظلومیت کی بنا پر آیت انتالیس (۳۹)

میں تلوار اٹھانے کی اجازت دی گئی ہے، اور نصرت کا وعدہ کیا گیا ہے، تا کہ وہ اسلام کی فتح مندی بچشم خود دیکھیں۔

دوسری قسم: جزوی طور پر مظلوم، جنھوں نے دشمن سے برابر کا بدلہ لے لیا، مگر پھر دشمن نے زیادتی کی اور حملہ آور ہوا۔ جیسے جنگِ بدر میں جبکہ مہاجرین سراسر مظلوم تھے اللہ تعالیٰ نے ان کی مدد کی اور وہ منصور وغالب ہوئے، اور انھوں نے دشمنوں سے بدلہ لیا۔ پھر وہی کفار جنگ اُحد وغزوۂ احزاب میں مدینہ پر چڑھ آئے تو اس وقت بھی اللہ تعالیٰ نے مہاجرین کی مدد کی اور دشمنوں کو خائب وخاسر لوٹایا۔ اس آیت میں اس دوسری قسم کے مہاجرین کی نصرت کا وعدہ کیا گیا ہے۔ ارشاد ہے: ——— اور جس نے سزا دی اس کے برابر جو وہ سزا دیا گیا، پھر اس پر زیادتی کی گئی تو اللہ تعالیٰ ضرور اس کی مدد کریں گے ——— اور ان جنگوں میں اگر چہ انصار بھی برابر کے شریک تھے۔ مگر کفار کے پیش نظر مہاجرین ہی تھے۔ وہ انھیں کو کچلنا چاہتے تھے۔ انصار سے ان کو کچھ لینا دینا نہیں تھا ——— اللہ تعالیٰ یقیناً بہت معاف کرنے والے بڑے بخشنے والے ہیں ——— یعنی اگر ظالم سے بدلہ لینے میں بلا قصد زیادتی ہو جائے تو اللہ تعالیٰ معاف فرمائیں گے۔ اس پر دارو گیر نہیں فرمائیں گے۔

اس کے بعد مہاجرین کی نصرت وغلبہ کی پانچ بنیادیں بیان فرماتے ہیں۔ ارشاد ہے: ——— یہ بات (یعنی مہاجرین کی نصرت وغلبہ) اس لئے ہے کہ اللہ تعالیٰ رات کو دن میں داخل کرتے ہیں، اور دن کو رات میں داخل کرتے ہیں، اور اس لئے ہے کہ اللہ تعالیٰ خوب سننے والے خوب دیکھنے والے ہیں، یہ (نصرت وغلبہ) اس لئے ہے کہ اللہ تعالیٰ ہی برحق ہیں، اور اس لئے ہے کہ وہ لوگ اللہ تعالیٰ سے نیچے جن چیزوں کو پکارتے ہیں وہ لچر ہیں، اور اس لئے ہے کہ اللہ تعالیٰ ہی عالیشان سب سے بڑے ہیں ——— ان دو آیتوں میں مہاجرین کی نصرت وغلبہ کی پانچ وجوہ ذکر کی گئی ہیں:

پہلی وجہ: اللہ تعالیٰ انقلاب آفریں ہیں۔ دیکھتے نہیں کہ دن کی چہل پہل ہنگامۂ حرکت اور روشنی کامل ہوتی ہے کہ یکا یک اللہ تعالیٰ رات کی خوفناک تاریکی لے آتے ہیں، اور دنیا سنسان ہو جاتی ہے؟! اسی طرح پوری کائنات محوِ خواب ہوتی ہے، اور تمام مخلوقات پر موت کا سکتہ طاری ہوتا ہے کہ یک بیک دن کا ہنگامہ شروع ہو جاتا ہے؟! یہ انقلاب لوگ رات دن دیکھتے ہیں، اور یہ اللہ کی قدرت کا ادنی کرشمہ ہے۔ ایسی کامل قدرت رکھنے والی ہستی کے لئے حالات کو پلٹ دینا کیا مشکل ہے؟ وہ مظلوم کی مدد کر کے ظالم پر غالب کرنے پر پوری طرح قادر ہیں۔

دوسری وجہ: اللہ تعالیٰ کے شئون میں دیر ضرور ہے مگر اندھیر نہیں۔ وہ مظلوموں کی فریاد سن رہے ہیں اور ظالموں کے کرتوت بھی دیکھ رہے ہیں۔ اب مظلوموں کا پیمانۂ صبر لبریز ہو چکا ہے، اس لئے اب ان کی مدد آرہی ہے۔

تیسری وجہ: واقع میں صحیح اور سچا خدا ایک ہے۔ پس اس کی بندگی کرنے والے خائب وخاسر نہیں ہو سکتے۔ وقت

آنے پر ان کی مدد ضرور کی جاتی ہے۔اور وہ وقت اب آ گیا ہے۔

چوتھی وجہ: کفار جن جھوٹے خداؤں کی پرستش کرتے ہیں وہ سب جھوٹے ہیں۔ان کی حقیقت کچھ نہیں۔پس جو لوگ حقیقی خدا سے منہ موڑ کر باطل خداؤں کا سہارا لئے ہوئے ہیں وہ کبھی فلاح وکامرانی سے ہم کنار نہیں ہو سکتے۔وہ اب جلد محرومی سے دوچار ہونگے۔

پانچویں وجہ: اللہ تعالیٰ عالیشان اور سب سے بڑے ہیں۔قدرت انہی کی کامل، نصرت انہی کی حقیقی اور اختیارات انہی کے اصلی ہیں۔جب وہ کسی بات کا فیصلہ کرتے ہیں تو کوئی اس پر قدغن نہیں لگا سکتا۔اب انھوں نے اپنے دین کی سربلندی کا فیصلہ کرلیا ہے چنانچہ وہ مہاجرین کی مدد کریں گے،اور وہ غالب ومنصور ہونگے۔

آخر میں مؤمنین کے غلبے اور جہاد کے فائدے کی طرف اشارہ ہے۔انسان روح اور بدن کا مجموعہ ہے۔دونوں کے خالق ومالک اور پروردگار اللہ تعالیٰ ہیں۔اور اللہ تعالیٰ نے جس طرح بدن کی ضروریات مہیا کی ہیں روح کی ضروریات کا بھی انتظام کیا ہے۔اِن آیات میں اللہ تعالیٰ کی ربوبیت کا بیان ہے۔انسان غور کرے! اللہ تعالیٰ نے اس کی بقاء کے لئے کیا کیا سامان کیا ہے،اور کتنی بڑی بڑی چیزوں کو اس کی بیگار میں لگا دیا ہے۔پس کیا یہ ممکن ہے کہ دلوں کی دنیا ہمیشہ ویران رہے؟ ہرگز نہیں! اب بارانِ وحی شروع ہوگیا ہے۔اب مردہ دلوں کو حیاتِ نو ملے گی اور اس کا ذریعہ جہاد بنے گا۔ارشاد ہے —— کیا تم نے دیکھا نہیں کہ اللہ تعالیٰ نے آسمان سے پانی برسایا، پس زمین سرسبز ہوجاتی ہے؟ —— یعنی جونہی رحمت کا چھینٹا پڑتا ہے سوکھی زمین گل وگلزار بن جاتی ہے۔اسی طرح ویران دل وحی کی بارش سے لہلہانے لگیں گے۔اب جہاد شروع ہوگیا ہے، مؤمنین غالب آئیں گے اور ایمان کی راہیں کھل جائیں گی —— بیشک اللہ تعالیٰ بڑے مہربان پوری طرح باخبر ہیں —— لطیف: وہ ہستی ہے جو باریک بینی سے اپنے بندوں کے ساتھ ایسی مہربانی کا معاملہ کرے کہ بندے اس کو سمجھ بھی نہ سکیں۔اور کامیاب ہوجائیں۔اللہ تعالیٰ لطیف وخبیر ہیں۔وہ سب بندوں کے ساتھ لطف وکرم کا معاملہ فرماتے ہیں۔کافروں اور فاجروں تک کے لئے ان کا خوانِ کرم عام ہے۔ان کے علم میں اب فیضانِ رحمت کا وقت آ گیا ہے۔اب نہ چاہنے والے بھی دولتِ ایمان سے ہمکنار ہونگے —— انہی کی ملک ہے جو کچھ آسمانوں میں ہے اور جو کچھ زمین میں ہے —— اور مالک کو اپنی ملک میں ہر تصرف کا حق ہے، کوئی اس سے مزاحم نہیں ہوسکتا —— اور بیشک اللہ تعالیٰ ہی بے نیاز تعریف کے سزاوار ہیں —— یعنی وہ کسی کے محتاج نہیں اور ان کے سب کام قابل تعریف ہیں۔پس انھوں نے جو مؤمنین کو جہاد کی اجازت دی،اور ان کی نصرت کا وعدہ کیا، وہ ہر طرح قابل ستائش فیصلہ ہے اور وہ اس کو روبعمل لا کر رہیں گے —— کیا تم نے دیکھا نہیں کہ اللہ تعالیٰ نے

تمہارے کام میں لگا رکھا ہے اس چیز کو جو زمین میں ہے؟ــــــ یعنی ہوائیں تمہاری خاطر چلتی ہیں۔ دریا تمہارے لئے بہتے ہیں، آسمان سے مُون تمہارے لئے برستا ہے۔ زمین سبزہ تمہاری خاطر اگاتی ہے۔ چاند تارے اور سورج تمہاری بیگار میں لگے ہوئے ہیں، اور زمین کے تمام مکنون خزانے تمہاری ملک ہیں ــــــ اور کشتی کو جو ان کے حکم سے سمندر میں چلتی ہے ــــــ وہ تمہیں اور تمہارے سامان کو ایک جگہ سے دوسری جگہ لے جاتی ہے، اور تم ساری دنیا سے فائدہ اٹھاتے ہو۔ غور کرو! ایک تولہ وزن پانی پر ٹھہر نہیں سکتا۔ پھر دیکھو! یہ ہزاروں ٹن وزنی جہاز کیسی آسانی سے پانی پر رواں دواں ہیں؟ اور اب تو فضائے آسمانی بھی انسان کے لئے مسخر کر دی گئی ہے۔ بڑے بڑے جہاز پرندوں کی طرح اڑتے ہیں۔ یہ سب کیا ہے؟ انسان کی رزق رسانی اور راحت رسانی کا قدرتی انتظام! پس انسان اپنی زندگی کی احتیاجوں کو دیکھے، پھر خدائے پاک کی بخششوں پر نظر ڈالے تو اسے صاف نظر آئے گا کہ زندگی کی کوئی ضرورت اور احتیاج ایسی نہیں جس کا پروردگار عالم نے انتظام نہ کیا ہو ــــــ اور وہی آسمان کو زمین پر گرنے سے تھامے ہوئے ہیں ــــــ اسی کے دستِ قدرت نے آسمان، چاند، سورج اور ستاروں کو فضائے بسیط میں بغیر کسی ظاہری سہارے کے تھام رکھا ہے۔ وہ اپنی جگہ سے نیچے نہیں سرکتے۔ اگر ان میں سے کوئی معمولی کُرہ بھی زمین پر گر پڑے تو زمین پاش پاش ہو جائے۔ اور انسان کی زندگی کے تمام امکانات ختم ہو جائیں ــــــ مگر ان کے حکم سے ــــــ یعنی اگر وہ چاہیں تو ستارے جھڑ سکتے ہیں، اور قیامت کو ٹوٹ بھی پڑیں گے۔ ان کو موجودہ ہیئت پر اللہ کی قدرت ہی نے برقرار رکھا ہے ــــــ اللہ تعالیٰ بیشک انسانوں پر بے حد شفیق بڑے مہربان ہیں ــــــ یعنی یہ اللہ کی صفاتِ رأفت و رحمت کی کرشمہ سازی ہے جو انسان کو کارگاہِ حیات میں زندہ رکھے ہوئے ہے ــــــ اور وہی ہیں جنھوں نے تم کو زندگی دی، پھر وہ تمہیں موت دیں گے، پھر وہ تمہیں جلائیں گے ــــــ یعنی یہ زندگی آخری زندگی نہیں۔ حقیقی زندگی اس کے بعد ہے۔ اور درمیان میں موت واقع ہے۔ اور یہ زندگی اگلی زندگی کی کھیتی ہے۔ جو یہاں بوؤ گے وہی وہاں کاٹو گے ــــــ بیشک انسان بڑا ناشکرا ہے! ــــــ اللہ تعالیٰ نے اس پر کتنے بڑے بڑے انعامات واحسانات فرمائے ہیں، مگر وہ ان کا حق نہیں مانتا۔ وہ منعم حقیقی کو چھوڑ کر دوسروں کے سامنے جھکتا ہے، کھاتا اللہ کا رزق ہے اور گاتا دوسروں کی ہے۔

اللہ تعالیٰ نے انسان کی جسمانی ضروریات کی طرح روحانی ضروریات کا بھی انتظام کیا ہے۔ نبیوں کے ذریعہ دین بھیجا ہے۔ جو لوگ اس کا انکار کرتے ہیں یا اس پر عمل نہیں کرتے وہ ضدی اور ناشکرے ہیں۔

لِكُلِّ اُمَّةٍ جَعَلْنَا مَنْسَكًا هُمْ نَاسِكُوْهُ فَلَا يُنَازِعُنَّكَ فِي الْاَمْرِ وَادْعُ اِلٰى رَبِّكَ ۭ اِنَّكَ لَعَلٰى هُدًى مُّسْتَقِيْمٍ ﴿۶۷﴾ وَاِنْ جٰدَلُوْكَ فَقُلِ اللّٰهُ اَعْلَمُ بِمَا تَعْمَلُوْنَ ﴿۶۸﴾ اَللّٰهُ يَحْكُمُ بَيْنَكُمْ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ فِيْمَا كُنْتُمْ فِيْهِ تَخْتَلِفُوْنَ ﴿۶۹﴾ اَلَمْ تَعْلَمْ اَنَّ اللّٰهَ يَعْلَمُ مَا فِي السَّمَآءِ وَالْاَرْضِ ۭ اِنَّ ذٰلِكَ فِيْ كِتٰبٍ ۭ اِنَّ ذٰلِكَ عَلَى اللّٰهِ يَسِيْرٌ ﴿۷۰﴾

لِكُلِّ اُمَّةٍ	اور ہر امت کے لئے	مُّسْتَقِيْمٍ	سیدھی	فِيْهِ	اس میں
جَعَلْنَا	مقرر کی ہے ہم نے	وَاِنْ	اور اگر	تَخْتَلِفُوْنَ	اختلاف کرتے
مَنْسَكًا (۱)	قربانی	جٰدَلُوْكَ	جھگڑیں وہ آپؐ سے	اَلَمْ	کیا نہیں
هُمْ	وہ	فَقُلِ	تو کہہ دیں آپؐ	تَعْلَمْ	جانتا تو
نَاسِكُوْهُ (۲)	اس سے تقرب حاصل	اللّٰهُ	اللہ تعالیٰ	اَنَّ اللّٰهَ	کہ اللہ تعالیٰ
	کرنے والے ہیں	اَعْلَمُ	خوب جانتے ہیں	يَعْلَمُ	جانتے ہیں
فَلَا	پس نہ	بِمَا	اس کو جو	مَا	جو کچھ
يُنَازِعُنَّكَ	جھگڑیں وہ آپ سے	تَعْمَلُوْنَ	کرتے ہو تم	فِي السَّمَآءِ	آسمان میں
فِي الْاَمْرِ	ذبح کے معاملہ میں	اَللّٰهُ	اللہ تعالیٰ	وَالْاَرْضِ	اور زمین میں ہے
وَادْعُ	اور بلائیں آپؐ	يَحْكُمُ	فیصلہ کریں گے	اِنَّ ذٰلِكَ	بیشک وہ
اِلٰى رَبِّكَ	اپنے رب (کے دین)	بَيْنَكُمْ	تمہارے درمیان	فِيْ كِتٰبٍ	ایک نوشتہ میں ہے
	کی طرف	يَوْمَ الْقِيٰمَةِ	قیامت کے دن	اِنَّ ذٰلِكَ	بیشک وہ
اِنَّكَ	بیشک آپؐ	فِيْمَا	اس میں جس میں	عَلَى اللّٰهِ	اللہ تعالیٰ پر
لَعَلٰى هُدًى	البتہ راہ پر ہیں	كُنْتُمْ	تھے تم	يَسِيْرٌ	آسان ہے

چھٹی بات: مردار کی حرمت پر اعتراض کا جواب ——— یہ آیاتِ پاک مشرکین کے ایک خاص پروپیگنڈے کا

(۱) مَنْسَكًا کے معنی یہاں بھی وہی ہیں جو آیت ۳۴ میں ہیں یعنی قربانی۔ (۲) نَاسِك: اسم فاعل، جمع نَاسِكُوْن، اضافت کی وجہ سے نون گر گیا ہے۔ نَسَكَ (ن) فلانا نَسْكًا و مَنْسَكًا: خدا کا تقرب حاصل کرنے کے لئے قربانی کرنا۔

جواب ہیں: بعض مشرکوں نے یہ عجیب کٹ حجتی شروع کی کہ مسلمان اپنے مارے ہوئے یعنی ذبح کئے ہوئے جانور کو تو حلال کہتے ہیں، اور اللہ کے مارے ہوئے یعنی مردار کو حرام کہتے ہیں۔ یہ کیسی الٹی بات ہے؟ اِن آیات میں ان کو جواب دیا گیا ہے کہ ابھی آیت ۳۴ میں یہ بات آئی ہے کہ اللہ تعالیٰ نے ہر امت کے لئے قربانی تجویز کی ہے۔ اور قربانی کا عمل ظاہر ہے کہ زندہ جانور کے ساتھ قائم ہوتا ہے۔ مردار کے ساتھ قائم نہیں ہوتا۔ اور کھانے کے لئے جانور ذبح کرنے کا اور قربانی کے لئے جانور ذبح کرنے کا معاملہ یکساں ہے۔ اس لئے ذبیحہ پر بھی تسمیہ ضروری ہے جس طرح قربانی پر ضروری ہے۔ اور تسمیہ کا عمل زندہ ہی کے ساتھ قائم ہوسکتا ہے، مردار کے ساتھ قائم نہیں ہوسکتا۔ اس لئے مردار حرام ہے۔ ارشاد ہے: ـــــ اور ہم نے ہر امت کے لئے (جانوروں کی) قربانی تجویز کی ہے، جس کے ذریعہ وہ تقرب حاصل کرتے ہیں ـــــ یعنی اپنے ہاتھوں سے اللہ کا نام لے کر جانور ذبح کرتے ہیں، اور اللہ کی نزدیکی اور ثواب حاصل کرتے ہیں ـــــ پس وہ لوگ (کفار) آپؐ سے ذبح کے معاملہ میں جھگڑا نہ کریں ـــــ کیونکہ دونوں کا معاملہ یکساں ہے۔ اس لئے کھانے کے لئے بھی ہاتھ ہی سے ذبح کیا ہوا جانور حلال ہے۔ اور مردار کی جس طرح قربانی نہیں ہوسکتی: اس کا کھانا بھی جائز نہیں ـــــ اور اس کی وجہ یہ ہے کہ ایک خاص قربانی ہے جو قربانی کے دنوں میں ذبح کی جاتی ہے۔ اور ایک روزمرہ کی قربانی ہے۔ اور وہ ذبیحہ ہے جو کھانے کے لئے ذبح کیا جاتا ہے۔ دونوں کا مقصد اللہ کا ذکر ہے۔ غور کرو! ہر دن لاکھوں جانور اللہ کا نام لے کر کھانے کے لئے ذبح کئے جاتے ہیں۔ یہی عام قربانی ہے۔ اس کی مثال اعتکاف ہے۔ ایک خاص اعتکاف ہے جو رمضان میں کیا جاتا ہے دوسرا روزمرہ کا اعتکاف ہے۔ حدیث میں فجر کی نماز پڑھ کر اشراق تک مسجد میں رہنے کی فضیلت آئی ہے۔ حضرت شاہ ولی اللہ صاحب نے لکھا ہے کہ یہ روزمرہ کا اعتکاف ہے جس کو رسول اللہ ﷺ نے نیکوکاروں کے لئے مشروع کیا ہے[1] ـــــ اور آپؐ اپنے پروردگار (کے دین) کی طرف بلائیں، بیشک آپؐ سیدھے راستے پر ہیں ـــــ یعنی صرف ذبیحہ کا حلال ہونا ہی دین حق ہے۔ اور وہ لوگ غلط راستے پر ہیں جو مردار کو حلال کہتے ہیں۔ اور جو سیدھے راستے پر ہو اسے تو اس شخص کو ٹوکنے کا حق ہے جو غلط راستے پر ہو۔ مگر جو خود غلط راستے پر چل رہا ہو اس کو کیا حق ہے کہ وہ سیدھا راستہ چلنے والے سے الجھے! آنکھوں والے پر فرض ہے کہ وہ اندھے کو راستہ بتائے، اندھا بھلا کیا راہ نمائی کر سکتا ہے! ـــــ اور اگر (حق بات واضح ہونے کے بعد بھی) وہ لوگ آپؐ سے جھگڑا کریں تو آپ کہہ دیں کہ اللہ تعالیٰ خوب جانتے ہیں جو کچھ تم کر رہے ہو ـــــ یعنی مردار کھا رہے ہو۔ اس سے زیادہ ردوقدح میں نہ پڑیں کہ اس کا حاصل کچھ نہیں ـــــ اللہ تعالیٰ تمہارے درمیان قیامت کے دن فیصلہ

(۱) تفصیل کے لئے دیکھیں حجۃ اللہ البالغہ (۲: ۶۰) طبع جدید، رحمۃ اللہ الواسعۃ (۳: ۴۵۷)

فرمائیں گے اُس باب میں جس میں تم اختلاف کرتے ہو ــــ یعنی یہ مسئلہ خود کفار کے درمیان مختلف فیہ ہے۔ کچھ مشرکین مردار کھاتے ہیں، اور بہت سے مشرکین مردار کو حرام کہتے ہیں۔ اُن میں کون برحق ہے کون غلط، اس کا فیصلہ قیامت کے دن ہوگا۔ اور فیصلہ سے عملی فیصلہ مراد ہے جو اندھے کو بھی نظر آجائے، رہا علمی فیصلہ تو وہ یہیں کر دیا گیا ہے ــــ کیا تم جانتے نہیں کہ اللہ تعالیٰ جانتے ہیں ان چیزوں کو جو آسمان اور زمین میں ہیں، بیشک وہ ایک نوشتہ (لوح محفوظ) میں ہیں، بیشک وہ بات اللہ تعالیٰ پر آسان ہے ــــ یعنی اللہ تعالیٰ پوری کائنات کے رموز واحوال سے بخوبی واقف ہیں۔ ان کے لئے نہ کسی بات کا علمی فیصلہ کرنا مشکل ہے نہ عملی۔ ذبیحہ جائز کیوں ہے اور مردار حرام کیوں؟ اس کا علمی فیصلہ یہیں قرآن کریم میں کئی جگہ کر دیا ہے۔ اور عملی فیصلہ قیامت کے دن کیا جائے گا۔ اور اللہ کا علم نہ صرف زمین وآسمان کی تمام چیزوں کو محیط ہے، بلکہ بعض حکمتوں سے تمام باتیں لوح محفوظ میں لکھ بھی دی ہیں۔ اور اتنی بے شمار چیزوں کا ٹھیک ٹھیک جاننا، اور نوشتہ میں لکھ دینا اور اسی کے مطابق قیامت کے دن فیصلہ کرنا: اللہ تعالیٰ کے لئے کچھ مشکل نہیں۔

جو بات وحی پر اعتماد کئے بغیر فیصل نہ ہوسکتی ہو، اس میں مخالفین سے زیادہ بحث فضول ہے

وَيَعْبُدُوْنَ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ مَا لَمْ يُنَزِّلْ بِهٖ سُلْطٰنًا وَّمَا لَيْسَ لَهُمْ بِهٖ عِلْمٌ ۭ وَمَا لِلظّٰلِمِيْنَ مِنْ نَّصِيْرٍ ۝ وَاِذَا تُتْلٰى عَلَيْهِمْ اٰيٰتُنَا بَيِّنٰتٍ تَعْرِفُ فِيْ وُجُوْهِ الَّذِيْنَ كَفَرُوا الْمُنْكَرَ ۭ يَكَادُوْنَ يَسْطُوْنَ بِالَّذِيْنَ يَتْلُوْنَ عَلَيْهِمْ اٰيٰتِنَا ۭ قُلْ اَفَاُنَبِّئُكُمْ بِشَرٍّ مِّنْ ذٰلِكُمْ ۭ اَلنَّارُ ۭ وَعَدَهَا اللّٰهُ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا ۭ وَبِئْسَ الْمَصِيْرُ ۝ يٰٓاَيُّهَا النَّاسُ ضُرِبَ مَثَلٌ فَاسْتَمِعُوْا لَهٗ ۭ اِنَّ الَّذِيْنَ تَدْعُوْنَ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ لَنْ يَّخْلُقُوْا ذُبَابًا وَّلَوِ اجْتَمَعُوْا لَهٗ ۭ وَاِنْ يَّسْلُبْهُمُ الذُّبَابُ شَيْـــًٔا لَّا يَسْتَنْقِذُوْهُ مِنْهُ ۭ ضَعُفَ الطَّالِبُ وَالْمَطْلُوْبُ ۝ مَا قَدَرُوا اللّٰهَ حَقَّ قَدْرِهٖ ۭ اِنَّ اللّٰهَ لَقَوِيٌّ عَزِيْزٌ ۝ اَللّٰهُ يَصْطَفِيْ مِنَ الْمَلٰۗىِٕكَةِ رُسُلًا وَّمِنَ النَّاسِ ۭ اِنَّ اللّٰهَ سَمِيْعٌۢ بَصِيْرٌ ۝ يَعْلَمُ مَا بَيْنَ اَيْدِيْهِمْ وَمَا خَلْفَهُمْ ۭ وَاِلَى اللّٰهِ تُرْجَعُ الْاُمُوْرُ ۝

ع ۹

وَيَعْبُدُوْنَ	اور پوجتے ہیں وہ	اٰيٰتُنَا	ہماری آیتیں	اللّٰهُ	اللہ تعالیٰ نے
مِنْ دُوْنِ	اللہ سے کم درجہ میں	بَيِّنٰتٍ (۴)	خوب واضح	الَّذِيْنَ	ان سے جنھوں نے
اللّٰهِ		تَعْرِفُ	پہچانے گا تو	كَفَرُوْا	انکار کیا
مَا (۱)	اس کو جو	فِيْ وُجُوْهِ	چہروں میں	وَبِئْسَ	اور برا ہے
لَمْ	نہیں	الَّذِيْنَ	ان کے جنھوں نے	الْمَصِيْرُ	ٹھکانا
يُنَزِّلْ	اتاری اللہ نے	كَفَرُوا	انکار کیا	يٰٓاَيُّهَا	اے
بِهٖ (۲)	اس کے بارے میں	الْمُنْكَرَ	برے آثار	النَّاسُ	لوگو!
سُلْطٰنًا	کوئی حجت	يَكَادُوْنَ (۵)	قریب ہیں وہ	ضُرِبَ	بیان کیا گیا
وَّمَا (۳)	اور اس کو جو	يَسْطُوْنَ (۶)	حملہ کر بیٹھیں	مَثَلٌ	ایک دلنشیں مضمون
لَيْسَ	نہیں ہے	بِالَّذِيْنَ	ان پر جو	فَاسْتَمِعُوْا	پس سنو تم
لَهُمْ	ان کو	يَتْلُوْنَ	پڑھتے ہیں	لَهٗ	اس کو
بِهٖ	اس کے بارے میں	عَلَيْهِمْ	ان کے سامنے	اِنَّ الَّذِيْنَ	بیشک جن کو
عِلْمٌ	کوئی علم	اٰيٰتِنَا	ہماری آیتیں	تَدْعُوْنَ	پکارتے ہو تم
وَمَا	اور نہیں ہے	قُلْ	کہیں آپ	مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ	اللہ سے کم درجہ میں
لِلظّٰلِمِيْنَ	ظالموں کے لئے	اَفَاُنَبِّئُكُمْ	کیا پس بتاؤں میں تمہیں	لَنْ يَّخْلُقُوْا (۸)	ہرگز نہیں پیدا کر سکتے وہ
مِنْ نَّصِيْرٍ	کوئی مددگار	بِشَرٍّ	ایک بری چیز	ذُبَابًا	ایک مکھی
وَاِذَا	اور جب	مِّنْ ذٰلِكُمْ	اس سے	وَّلَوِ	اگرچہ
تُتْلٰى	پڑھی جاتی ہیں	اَلنَّارُ (۷)	(وہ) آگ ہے	اجْتَمَعُوْا	اکٹھا ہو جائیں وہ
عَلَيْهِمْ	ان کے سامنے	وَعَدَهَا	وعدہ کیا ہے اس کا	لَهٗ	اس کے لئے

(۱) ما: صلہ کے ساتھ یعبدون کا مفعول بہ ہے۔(۲) بہ: کی ضمیر ما موصولہ کی طرف لوٹتی ہے۔(۳) دوسرے ما کا پہلے ما پر عطف ہے۔(۴) بینات: آیات کا حال ہے۔(۵) یکادون: فعل مضارع، جمع مذکر غائب۔ كَادَ يَكَادُ كَوْدًا: قریب ہونا۔ كَادَ: افعال مقاربہ میں سے ہے، فعل مضارع پر داخل ہوتا ہے، اس کے بعد أنْ بہت کم آتا ہے۔ کلام مثبت میں فعل کی نفی اور کلام منفی میں فعل کا اثبات کرتا ہے۔(۶) سَطَا(ن) سَطْوًا وَسَطْوَةً علیه وبه: حملہ کرنا، دھاوا بولنا۔(۷) النار: ھی محذوف کی خبر ہے۔(۸) جملہ لن یخلقوا: إن کی خبر ہے۔

وَ اِنْ	اور اگر	اللّٰہَ	اللہ تعالیٰ کا	اِنَّ	بیشک
یَّسْلُبْھُمُ	چھین لے ان سے	حَقَّ (۱)	جیسا حق ہے	اللّٰہَ	اللہ تعالیٰ
الذُّبَابُ	وہ مکھی	قَدْرِہٖ	ان کے مرتبے کا	سَمِیْعٌ	خوب سننے والے
شَیْئًا	کسی چیز کو	اِنَّ	بیشک	بَصِیْرٌ	خوب دیکھنے والے ہیں
لَّا	(تو) نہ	اللّٰہَ	اللہ تعالیٰ	یَعْلَمُ	جانتے ہیں
یَسْتَنْقِذُوْہُ	چھڑا سکیں وہ اس کو	لَقَوِیٌّ	البتہ قوت والے	مَا	جو کچھ
مِنْہُ	اس سے	عَزِیْزٌ	غالب ہیں	بَیْنَ اَیْدِیْھِمْ	ان کے سامنے ہے
ضَعُفَ	بودا ہوا	اَللّٰہُ	اللہ تعالیٰ	وَمَا	اور جو کچھ
الطَّالِبُ	چاہنے والا	یَصْطَفِیْ	منتخب کرتے ہیں	خَلْفَھُمْ	ان کے پیچھے ہے
وَالْمَطْلُوْبُ	اور چاہا ہوا	مِنَ الْمَلٰٓئِکَۃِ	فرشتوں سے	وَاِلَی اللّٰہِ	اور اللہ کی طرف
مَا	نہیں	رُسُلًا	رسولوں کو	تُرْجَعُ	لوٹتے ہیں
قَدَرُوا	مرتبہ پہچانا انھوں نے	وَّمِنَ النَّاسِ (۲)	اور لوگوں سے	الْاُمُوْرُ	سب امور

دور سے مشرکوں کی باتوں کے جوابات دیئے جا رہے ہیں۔ اب آخر میں شرک کی سخافت وشناعت کا بیان ہے۔

ارشاد ہے: —— اور وہ لوگ اللہ تعالیٰ سے نیچے ایسے معبودوں کو پوجتے ہیں جن کی معبودیت کی کوئی دلیل اللہ تعالیٰ نے نہیں اتاری، اور نہ ان کے پاس اس کا کچھ علم ہے —— بس اسلاف کی کورانہ تقلید میں ایسا کئے جا رہے ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے جوازِ شرک کی کوئی حجت اپنی کتابوں میں نازل نہیں کی، بلکہ بصراحت بار باراس کی تردید کی ہے۔ اور نہ جوازِ شرک پر کوئی علمی اور عقلی دلیل قائم ہے، بلکہ اس کے بطلان پر بے شمار دلائل قائم ہیں —— اور ان ظالموں کے لئے کوئی مددگار نہیں —— یہ بطلانِ شرک کی ایک دلیل ہے۔ جب یہ معبودانِ باطل اُن ظالموں کی نہ دنیا میں کوئی مدد کر سکتے ہیں نہ آخرت میں پھر وہ خدا کیسے ہو سکتے ہیں؟ معبود تو اس کو بنانا چاہئے جو آڑے وقت میں کام آئے —— اس آیت میں دلیل نقلی کا تذکرہ دلیل عقلی سے پہلے کیا گیا ہے، اس سے دلیل شرعی کی دلیل عقلی پر مزیّت وفوقیت ظاہر ہوتی ہے۔

دلیل نقلی کے ساتھ مشرکین کا برتاؤ —— اور جب ان کے سامنے ہماری خوب واضح آیتیں پڑھی جاتی ہیں —— جو تردیدِ شرک کے مضامین پر مشتمل ہوتی ہیں —— تو آپ ان لوگوں کے چہروں پر ناگواری کے آثار محسوس

(۱) حق قدرہ: مفعول مطلق ہے۔ (۲) من الناس: من الملائکۃ پر معطوف ہے۔

کریں گے جو (توحید کا) انکار کرتے ہیں ـــــ یعنی توحید کا پیغام سن کر ان کے تیور بگڑ جاتے ہیں۔ چہروں پر غصہ کے آثار نمایاں ہوتے ہیں ـــــ قریب ہیں کہ حملہ کر بیٹھیں ان لوگوں پر جو انھیں ہماری آیتیں سناتے ہیں ـــــ یعنی ان کی ناگواری معمولی نہیں ہوتی، وہ غصے میں اتنے بھر جاتے ہیں کہ لگتا ہے کہ ابھی آیاتِ توحید سنانے والوں پر چڑھ دوڑیں گے ـــــ آپؐ کہیں: ''کیا میں تمہیں اس سے بڑھ کر ناگوار چیز بتاؤں؟'' ـــــ یعنی تمہیں توحید کا بیان سننا ناگوار معلوم ہوتا ہے، مگر اس سے بڑھ کر ایک سخت بری اور ناگوار چیز ہے ـــــ وہ آگ ہے، جس کا اللہ تعالیٰ نے ان لوگوں سے وعدہ کیا ہے جو (توحید کا) انکار کرتے ہیں ـــــ اور اللہ کے وعدے سچے ہوتے ہیں، پس تم دوزخ میں ضرور پہنچ کر رہو گے ـــــ اور وہ برا ٹھکانا ہے! ـــــ پس چاہئے کہ اس سے بچنے کے لئے آیات توحید سنو، اور شرک سے باز آجاؤ۔

بطلانِ شرک کی دلیل عقلی: ـــــ اے لوگو! ایک دل نشیں بات بیان کی جاتی ہے پس اس کو غور سے سنو! ـــــ یعنی بات نہایت واضح ہے، دل میں اتر جانے والی ہے، اور ہر ایک کی سمجھ میں آجانے والی ہے، مگر توجہ سے سننا شرط ہے۔ وہ بات یہ ہے: ـــــ جن معبودوں کو تم اللہ تعالیٰ سے وَرے پکارتے ہو وہ ہرگز ایک مکھی پیدا نہیں کر سکتے، اگرچہ وہ سب اس غرض کے لئے اکٹھے ہوجائیں ـــــ یعنی سب مل کر بھی مکھی کا ایک پَر نہیں بنا سکتے۔ اور جو خالق نہ ہو وہ معبود کیسا؟ ـــــ اور اگر مکھی ان سے کوئی چیز چھین لے تو وہ اس کو اس سے چھڑا (بھی) نہیں سکتے ـــــ یعنی پیدا کرنا تو درکنار، ان مورتیوں کے سامنے جو چڑھاوے رکھے ہیں، اگر ان میں سے مکھی کچھ اٹھا لے تو ان میں اتنی بھی سکت نہیں کہ وہ اسی کو اس سے واپس لے لیں۔ پس سوچو! ایسی عاجز و درماندہ مخلوق کو معبود بنانا حماقت نہیں تو اور کیا ہے؟ ـــــ بودا ثابت ہوا چاہنے والا (عابد) اور چاہا ہوا (معبود) ـــــ یعنی بچاری تو لاچار تھے ہی بت بھی بے چارے ثابت ہوئے۔ ایک مدد کا انتہائی محتاج ہے، دوسرا اسی قدر عاجز! عابد میں تو احتیاج ضروری ہے، اسی لئے وہ عبادت کرتا ہے، مگر معبود کے لئے ضروری ہے کہ وہ قادر و غالب ہو، جبھی وہ عابدوں کا بھلا کر سکتا ہے۔ یہاں دونوں ہی ایک جیسے ثابت ہوئے۔

سچا خدا کیسا ہوتا ہے: برحق معبود وہی ہوسکتا ہے جو بڑی قوت والا ہر چیز پر غالب ہو، کوئی چیز اس کے اختیار سے باہر نہ ہو۔ ایسا ہی خدا اپنی مخلوقات کی تمام ضروریات پوری کر سکتا ہے، صرف زندگی کی ضروریات ہی نہیں بلکہ روحانی ضروریات بھی۔ ایسا خدا صرف اللہ ہے، دوسری کوئی ہستی اِن صفات کی حامل نہیں۔ ارشاد ہے: ـــــ ان لوگوں نے (مشرکین نے) اللہ تعالیٰ کا مرتبہ جیسا پہچاننا چاہئے تھا نہیں پہچانا ـــــ ان کا تصور اللہ تعالیٰ کے بارے میں یہ ہے کہ وہ بھی ہمارے معبودوں کی طرح عاجز ہیں۔ ان کو بھی کارِ جہاں انجام دینے کے لئے مددگاروں کی ضرورت

ہے۔تنہا وہ سب کام انجام نہیں دے سکتے۔وہ سن لیں ـــــ اللہ تعالیٰ یقیناً بڑی قوت والے غالب ہیں ـــــ کائنات کا کوئی ذرّہ ان کی قدرت سے باہر نہیں، وہ ہر چیز پر غالب ہیں۔مشرکین اگر اللہ تعالیٰ کی اس شانِ رفیع کو کما حقہ پہچانتے تو وہ ہرگز ان بے حقیقت چیزوں کو اس کا ہم سر نہ بناتے۔

اللہ تعالیٰ نے انسان کی بقاء کا جو سامان کیا ہے اور اس کی جسمانی ضرورتوں کا جو انتظام کیا ہے، اس کا تذکرہ قرآن کریم میں جگہ جگہ آیا ہے۔ابھی آیات (۶۳ تا ۶۶) میں بھی اس کا کچھ بیان آیا ہے۔اسی طرح اللہ تعالیٰ نے اس کی روحانی ضرورت کا بھی انتظام فرمایا ہے۔ارشاد ہے: ـــــ اللہ تعالیٰ فرشتوں سے اور انسانوں سے رسول منتخب کرتے ہیں ـــــ اور ان ذرائع سے انسانوں تک اپنی ہدایات بھیجتے ہیں، تاکہ انسان اپنی روح کی تکمیل کرے، اور دنیا میں بھی آسائش کی زندگی گذارے ـــــ بیشک اللہ تعالیٰ خوب سننے والے خوب دیکھنے والے ہیں ـــــ یعنی وہ بخوبی جانتے ہیں کہ کون فرشتہ اور کون انسان ان کی پیغام رسانی کے قابل ہے۔سورۃ الانعام (آیت ۱۲۴) میں ہے: ﴿ أَللّٰهُ أَعْلَمُ حَيْثُ يَجْعَلُ رِسَالَتَهُ ﴾ یعنی اللہ تعالیٰ بخوبی جانتے ہیں کہ اپنے پیغام کہاں رکھیں۔کون نبی بنانے کے قابل ہے اور کس فرشتہ کے ذریعہ نبی کے پاس پیغام بھیجا جائے؟ اس سے اللہ تعالیٰ بخوبی واقف ہیں ـــــ وہ جانتے ہیں جو کچھ (رسولوں) کے آگے ہے اور جو کچھ ان کے پیچھے ہے ـــــ یعنی ان کے تمام احوال سے اللہ تعالیٰ باخبر ہیں، ان کا کوئی حال اللہ سے پوشیدہ نہیں۔نہ وہ کسی غیر مناسب شخصیت کا رسالت کے لئے انتخاب کرتے ہیں، نہ کوئی منتخب رسولوں کی پیغام رسانی میں دخل در معقولات کر سکتا ہے ـــــ اور اللہ تعالیٰ کی طرف تمام امور لوٹتے ہیں ـــــ تمام کاموں کا مدار ان کی مشیت پر ہے، ان کے حسب منشا ہی تمام کام انجام پاتے ہیں۔

فائدہ: اگر صرف انسان کے تعلق سے دیکھا جائے تو نبی: رسول سے عام ہے۔پس ہر رسول نبی ہوتا ہے، مگر ہر نبی رسول نہیں ہوتا۔نبی: وہ انسان ہے جو مخلوق کی ہدایت کے لئے مبعوث کیا گیا ہے۔خواہ اسے نئی شریعت دی گئی ہو یا نہ دی گئی ہو، اور خواہ اسے اپنوں ہی میں کام کرنے کا حکم ہو، خواہ دوسروں میں بھی۔اور رسول: وہ انسان ہے جسے نئی کتاب اور نئی شریعت دی گئی ہو، اور اس کو غیروں میں بھی کام کرنے کا حکم ملا ہو۔پہلے نبی حضرت آدم علیہ السلام ہیں۔اور پہلے رسول حضرت نوح علیہ السلام ہیں۔اور ایک ضعیف روایت میں نبیوں اور رسولوں کی مجموعی تعداد ایک لاکھ چوبیس ہزار آئی ہے، جن میں سے تین سو تیرہ رسول ہیں، پھر ان میں سے پانچ اولوالعزم (بڑے درجے کے) رسول ہیں۔

اور اگر فرشتوں کو بھی شامل کر کے دیکھا جائے تو نبی اور رسول میں من وجہٍ کی نسبت ہے، جس میں دو مادّے افتراقی اور ایک مادّہ اجتماعی ہوتا ہے۔فرشتے صرف رسول ہیں نبی نہیں، جیسے حضرت جبرئیل علیہ السلام صرف رسول ہیں۔اور موسیٰ علیہ السلام اور عیسیٰ علیہ السلام کے درمیان بنی اسرائیل میں جو شخصیتیں مبعوث ہوئی ہیں وہ صرف نبی ہیں، رسول نہیں

اور رسالت ونبوت دونوں باتیں انسانوں میں جمع ہوسکتی ہیں۔ جیسے گروہِ انبیاء میں ۳۱۳ نبی بھی ہیں اور رسول بھی۔

ہدایت (خدائی راہ نمائی) انسان کی بنیادی روحانی ضرورت ہے۔ اللہ تعالیٰ نے نبیوں اور رسولوں کے ذریعہ یہ ضرورت پوری کردی ہے۔ اب دانا وہ ہے جو اپنی روزی سے فائدہ اٹھائے۔

يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوا ارْكَعُوْا وَاسْجُدُوْا وَاعْبُدُوْا رَبَّكُمْ وَافْعَلُوا الْخَيْرَ لَعَلَّكُمْ تُفْلِحُوْنَ ۞ وَجَاهِدُوْا فِي اللّٰهِ حَقَّ جِهَادِهٖ ؕ هُوَ اجْتَبٰىكُمْ وَمَا جَعَلَ عَلَيْكُمْ فِي الدِّيْنِ مِنْ حَرَجٍ ؕ مِلَّةَ اَبِيْكُمْ اِبْرٰهِيْمَ ؕ هُوَ سَمّٰىكُمُ الْمُسْلِمِيْنَ ۙ مِنْ قَبْلُ وَفِيْ هٰذَا لِيَكُوْنَ الرَّسُوْلُ شَهِيْدًا عَلَيْكُمْ وَتَكُوْنُوْا شُهَدَآءَ عَلَى النَّاسِ ۚۖ فَاَقِيْمُوا الصَّلٰوةَ وَاٰتُوا الزَّكٰوةَ وَاعْتَصِمُوْا بِاللّٰهِ ؕ هُوَ مَوْلٰىكُمْ ۚ فَنِعْمَ الْمَوْلٰى وَنِعْمَ النَّصِيْرُ ۞

ع ۱۰

يٰٓاَيُّهَا	اے	وَافْعَلُوا	اور کرو تم	جِهَادِهٖ	اس کے لئے کوشش کا
الَّذِيْنَ	جو	الْخَيْرَ (۱)	نیک کام	هُوَ	اس نے
اٰمَنُوا	ایمان لائے	لَعَلَّكُمْ (۲)	تاکہ تم	اجْتَبٰىكُمْ (۶)	چن لیا ہے تم کو
ارْكَعُوْا	رکوع کرو	تُفْلِحُوْنَ	کامیاب ہوؤ	وَمَا جَعَلَ	اور نہیں بنائی
وَاسْجُدُوْا	اور سجدہ کرو	وَجَاهِدُوْا (۳)	اور بھرپور کوشش کرو	عَلَيْكُمْ	تم پر
وَاعْبُدُوْا	اور عبادت کرو	فِي اللّٰهِ (۴)	اللہ (کے دین) میں	فِي الدِّيْنِ	دین میں
رَبَّكُمْ	اپنے رب کی	حَقَّ (۵)	جو حق ہے	مِنْ حَرَجٍ	کچھ تنگی

(۱) خیر کا لفظ تمام نیک کاموں کو شامل ہے۔ (۲) لَعَلَّ: شاہی محاورہ ہے، وعدہ کے لئے مستعمل ہے۔ (۳) جَاهَدَ فی الأمر کے معنی ہیں کسی کام میں پوری طاقت لگانا، بھرپور کوشش کرنا، انتہائی درجہ جدوجہد کرنا۔ (۴) فی اللہ میں مجاز بالحذف ہے، قاعدہ ہے کہ اگر فی کے بعد اللہ آئے جیسا یہاں ہے، یا اللہ کے لئے ضمیر آئے، جیسے: ﴿وَالَّذِيْنَ جَاهَدُوْا فِيْنَا﴾ میں ہے تو لفظ دین محذوف ہوتا ہے، اور جہاد بمعنی مجاہدہ ہوتا ہے۔ اور اگر سبیل اللہ آئے تو مراد اصطلاحی جہاد ہے یعنی دین کے مخالفین سے لوہا لینا۔ (۵) حقَّ جهاده: مفعول مطلق برائے تاکید ہے (۶) اجتباہ: اپنے لئے چن لیا، پسند کیا، اختیار کیا۔ مُجْتَبٰی: چنا ہوا، پسند کیا ہوا۔

مِلَّةَ (۱)	(پھیلاؤ) ملت	الرَّسُوْلُ	رسولؐ	الزَّكٰوةَ	زکوٰۃ
اَبِيْكُمْ	اپنے باپ	شَهِيْدًا	گواہ	وَاعْتَصِمُوْا	اور مضبوط پکڑو
اِبْرٰهِيْمَ	ابراہیمؑ کی	عَلَيْكُمْ	تم پر	بِاللّٰهِ	اللہ (کے دین) کو
هُوَ (۲)	انھوں نے	وَتَكُوْنُوْا	اور ہوؤ تم	هُوَ	وہ
سَمّٰىكُمُ	نام رکھا ہے تمہارا	شُهَدَآءَ	گواہ	مَوْلٰىكُمْ	تمہارے کارساز ہیں
الْمُسْلِمِيْنَ (۳)	مسلمان (فرمانبردار)	عَلَى النَّاسِ	لوگوں پر	فَنِعْمَ	پس کیسے اچھے
مِنْ قَبْلُ (۴)	قبل ازیں	فَاَقِيْمُوا	پس اہتمام کرو تم	الْمَوْلٰى	کارساز ہیں
وَفِيْ هٰذَا	اور اس میں	الصَّلٰوةَ	نماز کا	وَنِعْمَ	اور کیسے اچھے
لِيَكُوْنَ	تاکہ ہوں	وَاٰتُوا	اور دو تم	النَّصِيْرُ	مددگار ہیں

یہ سورتِ پاک کی آخری آیتیں ہیں۔ پہلی آیت میں اُس دین کا خلاصہ کیا گیا ہے جو اللہ تعالیٰ نے ہمیشہ رسولوں کے ذریعہ انسانوں کی طرف بھیجا ہے۔ پھر دوسری آیت میں اس کی تبلیغ کا اور اس پر مضبوطی سے عمل پیرا ہونے کا حکم دیا ہے۔ ارشاد ہے: ——— اے ایمان والو! رکوع کرو، اور سجدہ کرو، اور اپنے پروردگار کی بندگی کرو، اور خیر کے کام کرو، تاکہ تم کامیاب ہوؤ ——— ''اے ایمان والو'' یہ کافروں کے بالمقابل مؤمنون سے خطاب ہے۔ کیونکہ کافر تو دین پر ایمان لاتے نہیں، پس ایمانداروں کو چاہئے کہ وہی اس پر عمل کریں ——— ''رکوع کرو اور سجدہ کرو'' یعنی نماز پڑھو۔ قرآن کریم میں نماز کو اس کے اجزاء سے تعبیر کیا گیا ہے۔ کہیں قیام سے، کہیں قرأت سے اور کہیں ذکر سے۔ یہاں رکوع وسجود سے تعبیر کیا ہے ——— نماز دین کا بنیادی ستون ہے، اس کو استوار رکھنا ضروری ہے۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے سرکاری عملہ کو ایک تحریر بھیجی تھی اس میں لکھا تھا کہ ''تمہارے (دینی) امور میں میرے نزدیک سب سے اہم نماز ہے۔ جو اس کی نگہداشت اور اس کی پابندی کرتا ہے وہ اپنے (پورے) دین کی حفاظت کرتا ہے۔ اور جو اس کو ضائع کرتا ہے وہ اور باتوں کو اور زیادہ ضائع کرے گا'' (موطا مالک حدیث نمبر ۶) ——— ''اور اپنے پروردگار کی

(۱) ملةَ کا عامل محذوف ہے أی بَلِّغُوْا۔ (۲) هو کا مرجع اکثر مفسرین نے اللہ کو قرار دیا ہے، کیونکہ پہلے هو کا یہی مرجع ہے، اور بعض مفسرین نے ابراہیم کو قرار دیا ہے، کیونکہ وہ اقرب ہے۔ حاصل دونوں کا ایک ہے۔ اگر ابراہیم علیہ السلام نے یہ نام رکھا ہے تو بھی اللہ کے حکم سے رکھا ہے۔ (۳) المسلمین: سَمّٰی کا مفعول ثانی ہے۔ مُسْلِمٌ کی جمع ہے، فارسی جمع ''مسلمان'' ہے جیسے طالب کی جمع طالبان، اِسْلام (باب افعال) کے لغوی معنی ہیں: خود سپردگی، سرافگندگی، فرماں برداری، اور اصطلاح میں: اسلام: حضرت محمد ﷺ کی لائی ہوئی شریعت (احکام وتعلیمات) کو بے چون وچرا ماننا اور سر تسلیم خم کرنا ہے۔ (۴) قبل کا مضاف الیہ هذا محذوف ہے۔

بندگی کرو‘‘یعنی عبادت ایک نماز ہی میں منحصر نہیں۔عبادت کی اور بھی صورتیں ہیں، جیسے زکوٰۃ دینا، روزہ رکھنا، حج کرنا اور ذکر وتلاوت کرنا، یہ سب عبادت کی صورتیں ہیں۔ان سب کو اپناؤ۔کیونکہ انسان بندگی کے لئے پیدا کیا گیا ہے، پس جو بندہ جس قدر بندگی کرے گا اسی قدر مقصدِ حیات کی تکمیل کرے گا ـــــ ’’اور خیر کے کام کرو‘‘یعنی عبادت کے علاوہ دوسرے نیکی کے کام بھی کرو، نیکی کے کاموں کی کچھ تفصیل آئندہ سورت کے شروع میں آرہی ہے ـــــ ’’تاکہ تم کامیاب ہوؤ‘‘یعنی دنیاؤ آخرت میں تمہارا بھلا ہو۔پہلے مسلمانوں کی سرخ روئی دین پر عمل کرنے کی وجہ سے تھی۔اوراب ان کی زبوں حالی دین پر عمل نہ کرنے کی وجہ سے ہے۔حدیث میں ہے:’’اللہ تعالیٰ اس کتاب یعنی قرآنِ پاک کی وجہ سے بہت سوں کواونچا کریں گے اور بہت سوں کو نیچا!(رواہ مسلم)یعنی جولوگ قرآن مجید کواپنا راہ نما بنائیں گے، اس کی ہدایات پر عمل کریں گے اوراس کے ساتھ تعلق استوار رکھیں گے وہ دنیاؤ آخرت میں سربلند ہونگے،بصورتِ دیگراگر وہ بلندیوں کے آسمان پر بھی ہوں گے تو نیچے گرادیئے جائیں گے۔کاش مسلمان سمجھیں!

فائدہ:امام اعظم ابوحنیفہ اورامام مدینہ مالک رحمہما اللہ کے نزدیک چونکہ یہاں رکوع وسجود کا ایک ساتھ ذکر ہے،اس لئے سجدہ سے نماز کا سجدہ مراد ہے۔سجدۂ تلاوت مراد نہیں۔جیسے سورۃ آلِ عمران(آیت ۴۳)میں مریم رضی اللہ عنہا کو حکم دیا گیا ہے:﴿وَاسْجُدِیْ وَارْکَعِیْ مَعَ الرّٰکِعِیْنَ﴾یعنی سجدہ کراور رکوع کران لوگوں کے ساتھ جو رکوع کرنے والے ہیں۔اورابھی اسی سورت(آیت ۲۶)میں رکوع وسجود کا تذکرہ آیا ہے۔جس سے مراد نماز پڑھنا ہے۔پس اس آیت میں بھی نماز پڑھنے کا حکم ہے ـــــ اورامام شافعی اورامام احمد رحمہما اللہ کے نزدیک یہاں رکوع سے تو نماز پڑھنا مراد ہے،مگر سجدہ سے سجدۂ تلاوت مراد ہے۔اس لئے ان کے نزدیک یہاں سجدۂ تلاوت واجب ہے۔ان کی دلیل حضرت عقبہ بن عامر رضی اللہ عنہ کی حدیث ہے۔انھوں نے عرض کیا:یارسول اللہ!سورۂ حج کو دوسری سورتوں پر یہ برتری حاصل ہے کہ اس میں دوسجدے ہیں!آپؐ نے فرمایا:’’ہاں!اور جوان کو نہ کرے وہ ان کو نہ پڑھے!‘‘ دوسری دلیل: حضرت عمرو بن العاص رضی اللہ عنہ کی روایت ہے کہ ان کو نبی ﷺ نے سورۂ حج میں دوسجدے سکھائے۔مگر پہلی حدیث جس کو ترمذی وغیرہ نے روایت کیا ہے ضعیف ہے۔اس کو ابن لہیعہ:ابوالمصعب بصری سے روایت کرتے ہیں۔جو دونوں ضعیف راوی ہیں،اسی طرح دوسری روایت کو سعید عتقی:عبداللہ بن منین کلابی سے روایت کرتے ہیں۔اور یہ دونوں مجہول راوی ہیں۔جبکہ وجوب ثابت کرنے کے لئے مضبوط دلیل کی ضرورت ہے۔اس لئے نماز سے باہر استحبابی طور پر کوئی سجدہ کرے تو بہتر ہے۔نماز میں نہ کرے اورنہ یہاں سجدہ واجب ہے۔

تبلیغِ دین کا حکم: ـــــ اوراللہ کے دین کے لئے بھرپور کوشش کروجیسا کہ اس کے لئے کوشش کرنے کا حق ہے ـــــ یعنی اللہ تعالیٰ نے رسول اللہ ﷺ کے ذریعہ جو دین تمہارے پاس بھیجا ہے،جس کا خلاصہ ابھی تم کو سنایا گیا،اس

دین کی اشاعت کے لئے ہرممکن کوشش کرو۔تبلیغ کے لئے برائے نام مجاہدہ کافی نہیں۔جیسے سورۃ آل عمران (آیت۱۰۲) میں حکم ہے کہ ''اللہ سے ڈروجیسا اللہ سے ڈرنے کا حق ہے''یعنی اللہ کے ہر حکم کی تعمیل کرواور معمولی گناہ کا بھی ارتکاب نہ کرو، اسی طرح یہ حکم ہے کہ دین کے لئے کوشش کروجیسا کہ کوشش کرنے کا حق ہے۔یعنی تبلیغ کے جوتقاضے ہیں ان کو پورا کرو۔

اور یہ حکم چار وجوہ سے دیا گیا ہے۔

پہلی وجہ: —— اس نے تمہیں چن لیا ہے —— یعنی نبی ﷺ پر نبوت تمام ہوگئی ہے۔آپ کے بعد کوئی نئے نبی آنے والے نہیں۔اور ابھی زمانہ کتنا باقی ہے اس کو اللہ کے سوا کوئی نہیں جانتا، پھر آنحضرت ﷺ کے بعد دین کا کام کیسے چلے گا؟ اس کے لئے اللہ تعالیٰ نے تم کو چن لیا ہے۔آپ ﷺ کے بعد دین کی اشاعت کا کام آپؐ کی امت سے لیا جائے گا۔سورۃ آل عمران (آیت۱۱۰) میں ہے:﴿ كُنْتُمْ خَيْرَ أُمَّةٍ أُخْرِجَتْ لِلنَّاسِ ﴾یعنی تم علم الٰہی میں بہترین امت تھے، چنانچہ تمہیں لوگوں کی نفع رسانی کے لئے وجود میں لایا گیا۔یعنی نبی ﷺ کے بعد دین کا کام تمہیں ہاتھ میں لینا ہے۔اور یہ خیال نہ کرو کہ یہ تو بہت مشکل کام ہے، ہمارے بس کا کہاں؟ نبیوں ہی کا یہ حوصلہ ہے، ہم عاجز امتی یہ کام کیسے انجام دے سکتے ہیں؟ سنو! —— اور اس نے تم پر دین میں کچھ تنگی نہیں کی —— نہ اس پر عمل کرنے میں کچھ دشواری ہے، نہ اس کو پھیلانے میں کوئی پریشانی ہے۔تم کام شروع کر کے دیکھو! کتنا آسان کام ہے۔

دوسری وجہ: —— اپنے باپ ابراہیم (علیہ السلام) کی ملت کو (پھیلاؤ) —— یعنی یہ تمہارا اپنا کام ہے، اور اس میں تمہارا اپنا نفع ہے۔نبی ﷺ جو دین لائے ہیں وہ تمہارے جد امجد حضرت ابراہیم علیہ السلام کا دین ہے۔اس کو پھیلاؤ گے تو دنیا میں تمہارے دادا کا اور ان کے واسطے سے تمہارا نام روشن ہوگا۔اور آدمی اپنے خاندان کی سر بلندی کے لئے ہر قربانی دیتا ہے، تن مَن دَھن کی بازی لگاتا ہے، پس تم بھی اٹھو اور ہر قربانی دے کر اس دین کو پھیلاؤ —— قرآن کے پہلے مخاطب مکہ والے تھے جو ابراہیم علیہ السلام کی نسل سے تھے۔اس تخصیص میں ان کے لئے تشویق ہے کہ یہ مذہب تمہارے لئے کوئی بیرونی چیز نہیں۔یہ تو عین تمہارے جد محترم کا مذہب ہے۔پس یہ وجہ پہلے مخاطبوں کے ساتھ خاص ہے، باقی تین وجوہ پوری امت کو عام ہیں۔

تیسری وجہ: —— انھوں نے تمہارا نام مسلم رکھا ہے پہلی کتابوں میں بھی اور اس کتاب میں بھی —— یعنی اللہ تعالیٰ نے پہلی کتابوں میں اور اس قرآن میں تمہارا نام ''مسلم''یعنی فرمانبردار رکھا ہے۔یا ابراہیم علیہ السلام نے تمہارا یہ نام رکھا تھا۔انھوں نے تعمیر کعبہ کے وقت یہ دعا کی تھی:﴿رَبَّنَا وَاجْعَلْنَا مُسْلِمَيْنِ لَكَ وَمِنْ ذُرِّيَّتِنَا أُمَّةً مُسْلِمَةً لَّكَ﴾ترجمہ: اے ہمارے پروردگار! ہم کو اپنا فرمان بردار بنا، اور ہماری اولاد میں ایک ایسی جماعت پیدا فرما جو آپ کی فرمانبردار ہو۔اور اس قرآن میں بھی شاید اُن ہی کے مانگنے سے یہ نام پڑا ہے۔بہر حال تمہارا امتیازی وصف یہی ہے۔پس اسکی لاج رکھو——

تمام انبیاء کا مذہب اسلام ہے: ﴿إِنَّ الدِّيْنَ عِنْدَ اللّٰهِ الإِسْلَامُ﴾ یعنی دین بلاشبہ اللہ کے نزدیک صرف اسلام ہے (سورۂ آلِ عمران آیت ۱۹) مگر بعد میں ہر نبی کی امت کا لقب جدا پڑ گیا۔ موسیٰؑ کی امت یہود اور عیسیٰؑ کی امت نصرانی کہلائی، مگر اس امت کا لقب ''مسلم'' ہی رہا۔ محمدی: اس امت کو کفار کہتے ہیں۔ اس کا اصل نام ''مسلمان'' ہے یعنی حکم خداوندی کے سامنے گردن جھکانے والے۔ پس اس امت کو چاہئے کہ اللہ کے ہر حکم کو خاص طور پر اشاعتِ اسلام کے حکم کو قبول کرے۔

چوتھی وجہ: ــــ تا کہ رسول (ﷺ) تم پر گواہ ہوں، اور تم لوگوں پر گواہ ہوؤ ــــ یعنی آنحضرت ﷺ قیامت کے دن اپنے زمانے کے لوگوں (امت دعوت) کے خلاف گواہی دیں گے، اور آپؐ کی امت اپنے اپنے زمانے کے لوگوں کے خلاف گواہی دے گی۔ کیونکہ جس طرح رسول اللہ ﷺ اللہ تعالیٰ کی طرف سے لوگوں کی طرف مبعوث ہیں، آپؐ کی امت بھی آپؐ کی طرف سے لوگوں کی طرف مبعوث ہے۔ پس جو ذمہ داری اللہ کے رسول کی ہے، وہی ذمہ داری رسول اللہ ﷺ کے رسولوں کی بھی۔ اور رسول اللہ ﷺ کی ذمہ داری دعوت وارشاد ہے۔ پس وہی ذمہ داری امت کی بھی ہے [1]

> مسلمانوں کو دین حق کی تبلیغ رسول اللہ ﷺ کے ذریعہ سے ہوئی ہے۔ اور مسلمانوں کے واسطے سے دین حق ساری نسلِ انسانی کو پہنچتا ہے (ماجدی)

دعوت کے کام کے لئے شرط: ــــ دعوت مؤثر اس وقت ہوتی ہے جب داعی کی زندگی اور اس کی دعوت میں مطابقت ہو۔ اگر ایسا نہیں ہوگا تو اس کی دعوت کا خاطر خواہ فائدہ نہیں ہوگا۔ لوگ اس کی بات کو سنجیدگی سے نہیں لیں گے، اس لئے ارشاد ہے: ــــ پس نماز کا اہتمام کرو، اور زکوٰۃ ادا کرو، اور اللہ کے دین کو مضبوط پکڑو ــــ نماز: بدنی عبادات میں سب سے اہم عبادت ہے اور زکات مالی عبادات میں۔ پس ان دونوں عبادتوں کا خصوصیت سے اہتمام کرو۔ اور اللہ کے دین کو مضبوط پکڑو یعنی تمام ہی احکام شرعیہ کی پابندی کرو، قرآن وسنت سے تمسک کرو۔ ان کو ہر حال میں لازم پکڑو۔ اس طرح اپنی زندگی کو خوب سنوار کر دعوت وتبلیغ کے لئے نکلو۔ اور اپنے سب کاموں میں اللہ تعالیٰ پر بھروسہ کرو ــــ وہ تمہارے کارساز ہیں ــــ وہ پیچھے کے احوال سنواریں گے ــــ پس کیسے اچھے کارساز ہیں! ــــ یعنی تم خود اپنے کام ایسے نہیں سنوار سکتے جیسے وہ سنواریں گے ــــ اور کیسے اچھے مددگار ہیں! ــــ یعنی دعوت کے کام میں بھی وہ تمہاری قدم قدم پر مدد کریں گے۔ تمہیں تنہا نہیں چھوڑیں گے۔

﴿اللہ کے فضل وکرم سے ۱۲؍ربیع الاول ۱۴۲۷ ہجری کو بروز منگل سورۃ الحج کی تفسیر پوری ہوئی﴾

(۱) یہ مضمون تفصیل سے حجۃ اللہ البالغہ کی شرح رحمۃ اللہ الواسعہ جلد دوم، صفحہ ۵۰ تا ۵۵ میں پڑھیں۔ اور ہدایت القرآن سورۃ النحل کی آیت ۸۹ کی تفسیر بھی ملاحظہ فرمائیں۔

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

سورۃ المؤمنون

نمبر شمار ۲۳ نزول کا نمبر ۷۴ نزول کی نوعیت مکی آیات ۱۱۸ رکوع ۶

سورت کا نام اور زمانۂ نزول: اس سورت کا نام پہلی ہی آیت سے ماخوذ ہے۔سورت کی ابتدائی دس گیارہ آیتوں میں یہ مضمون ہے کہ جن لوگوں نے نبی ﷺ کی بات مان لی ہے ان میں سات اہم اوصاف پیدا ہو گئے ہیں، اور یہی لوگ دنیاؤ آخرت میں فلاح وکامیابی کے مستحق ہیں۔آج بھی اہل ایمان کی سرخ روئی انہی ایمانی اوصاف کی بدولت ممکن ہے ـــــــ یہ سورت مکی دور کے آخر میں نازل ہوئی ہے۔نزول کا نمبر ۷۴ ہے۔مکی سورتیں کل ۸۵ ہیں۔پس یہ سورت آخر کے دوسالوں میں نازل ہوئی ہے۔

سورت کے مضامین: یہ سورت ایمانی اوصاف کے بیان سے شروع ہوئی ہے۔سورت کا سب سے پہلا مضمون یہ ہے کہ اگر ایمان کے ساتھ: سات باتیں مجتمع ہوں تو آخرت کی کامیابی یقینی ہے۔ایسے مؤمنین جنت الفردوس کے وارث ہونگے (آیات ۱-۱۱) مگر ان مؤمنین کو جنت دوسری زندگی میں ملے گی، اور یہ بات اس طرح بیان کی ہے کہ بعث بعد الموت کا امکان بھی سمجھ میں آجائے۔اس مقصد سے انسانی زندگی کے مختلف تطوّرات بیان کئے ہیں۔اور یہ بتایا ہے کہ بے جان مادّہ کس طرح مختلف احوال سے گذرنے کے بعد حیات سے ہمکنار ہوتا ہے۔(آیات ۱۲-۱۶)

پھر یہ مضمون شروع ہوا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے انسان کو پیدا کر کے بس یونہی نہیں چھوڑ دیا۔ بلکہ اس کی تمام ضروریات کا انتظام کیا ہے، اور صرف جسمانی ضروریات ہی کا نہیں بلکہ روحانی ضروریات کا بھی سامان کیا ہے۔ آیات (۱۷-۲۲) میں جسمانی ضروریات کا ذکر ہے۔پھر آیات (۲۳-۵۰) میں روحانی ضروریات اور دینی تربیت کا ذکر ہے۔اللہ تعالیٰ نے انسانیت کے آغاز کے ساتھ ہی نبوت وہدایت کا سلسلہ جاری فرمایا ہے۔سب سے پہلے نوح

علیہ السلام کا تذکرہ کیا ہے، پھر ایک دوسری قوم کا تذکرہ نامزد کئے بغیر کیا ہے، پھر انبیاء کا مسلسل آنا اوران کی قوموں کی تکذیب کرنے کا ذکر ہے۔آخر میں موسیٰ علیہ السلام اور فرعونیوں کا ذکر ہے، اس کے بعد عہد بنی اسرائیل کی ابتداء وانتہا کا تذکرہ ہے۔ساتھ ہی یہ تذکرہ بھی چلتا رہا ہے کہ انبیاء کی اقوام نے اپنے پیغمبروں کی بات مان کرنہیں دی، چنانچہ تکذیب کی پاداش میں وہ ہلاک ہوتی رہیں۔ضمناً عقیدۂ آخرت کا انکار اور منکرین کا انجام بیان کیا ہے۔

پھر تمام رسولوں سے خطاب کیا ہے کہ حلال کھاؤ اور نیک کام کرو، پھر قرآن کے مخاطبین کو بتایا ہے کہ تمام انبیاء کا دین ایک ہے، اسی دین کو یہ آخری پیغمبر پیش کررہے ہیں۔اور آج جو امتیں مختلف ہیں تو یہ نبیوں کے بعد خود لوگوں نے اختلاف پیدا کیا ہے۔ پھر یہ مضمون ہے کہ کفار دنیا کی عیش وراحت ہی کو حاصل زندگانی سمجھتے ہیں، اور اسی کو اپنی حقانیت اور مقبولیت کی دلیل سمجھتے ہیں۔ یہ ان کو دھوکہ لگا ہوا ہے ان کے مقابل مؤمنین کا تذکرہ کیا ہے جو بھلائیوں کی طرف دوڑنے والے ہیں، اوران کی چار باتیں بیان کی ہیں۔(آیات ۵۱-۶۲)

اس کے بعد کفار کی بداعمالیوں کا بیان ہے۔اوران کو بتایا ہے کہ مؤمنین کی طرح ان کے اعمال بھی ریکارڈ کئے جارہے ہیں، مگر وہ غفلت میں پڑے ہوئے ہیں۔ پھر ایسی سات باتوں کا تذکرہ کیا ہے جو امکانی درجہ میں کفار کے ایمان لانے میں رکاوٹ بن سکتی ہیں (آیات ۶۳-۷۷)

پھر اللہ کی قدرتِ کاملہ اور عظمتِ قاہرہ کا بیان ہے۔اللہ تعالیٰ کے تین عظیم کارنامے ذکر کئے ہیں اور حیات بعد الموت ثابت کی ہے پھر مشرکین سے تین سوالات کئے ہیں، اور توحید ثابت کی ہے (آیات ۷۸-۹۲)

پھر نہایت لطیف پیرائے میں کفار کو دنیا میں عذاب کی دھمکی دی ہے۔ پھر قیامت کے دن کے دو واقعات ذکر کئے ہیں، اور آخرت کے چار احوال ذکر کئے ہیں، اس کے بعد سورت کی آخری موعظتیں ہیں۔(آیات ۹۳-۱۱۸)

سُوْرَةُ الْمُؤْمِنُوْنَ مَكِّيَّةٌ (۷۴) (۲۳)

آیاتہا ۱۱۸ — رکوعاتہا ۶
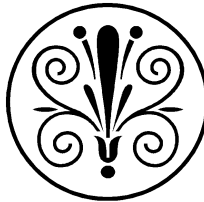
بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ

قَدْ اَفْلَحَ الْمُؤْمِنُوْنَ ۙ﴿۱﴾ الَّذِيْنَ هُمْ فِيْ صَلَاتِهِمْ خٰشِعُوْنَ ۙ﴿۲﴾ وَالَّذِيْنَ هُمْ عَنِ اللَّغْوِ مُعْرِضُوْنَ ۙ﴿۳﴾ وَالَّذِيْنَ هُمْ لِلزَّكٰوةِ فٰعِلُوْنَ ۙ﴿۴﴾ وَالَّذِيْنَ هُمْ لِفُرُوْجِهِمْ حٰفِظُوْنَ ۙ﴿۵﴾ اِلَّا عَلٰٓى اَزْوَاجِهِمْ اَوْ مَا مَلَكَتْ اَيْمَانُهُمْ فَاِنَّهُمْ غَيْرُ مَلُوْمِيْنَ ۚ﴿۶﴾ فَمَنِ ابْتَغٰى وَرَآءَ ذٰلِكَ فَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْعٰدُوْنَ ۚ﴿۷﴾ وَالَّذِيْنَ هُمْ لِاَمٰنٰتِهِمْ وَعَهْدِهِمْ رٰعُوْنَ ۙ﴿۸﴾ وَالَّذِيْنَ هُمْ عَلٰى صَلَوٰتِهِمْ يُحَافِظُوْنَ ۘ﴿۹﴾ اُولٰٓئِكَ هُمُ الْوٰرِثُوْنَ ۙ﴿۱۰﴾ الَّذِيْنَ يَرِثُوْنَ الْفِرْدَوْسَ ۭ هُمْ فِيْهَا خٰلِدُوْنَ ﴿۱۱﴾

بِسْمِ اللّٰهِ	اللہ کے نام سے	خٰشِعُوْنَ(۱)	عاجزی کرنیوالے ہیں	فٰعِلُوْنَ	ادا کرنے والے ہیں
الرَّحْمٰنِ	بے حد مہربان	وَالَّذِيْنَ	اور جو کہ	وَالَّذِيْنَ	اور جو کہ
الرَّحِيْمِ	نہایت رحم والے	هُمْ	وہ	هُمْ	وہ
قَدْ اَفْلَحَ	تحقیق کامیاب ہوئے	عَنِ اللَّغْوِ	بیکار باتوں سے	لِفُرُوْجِهِمْ	اپنی شرمگاہوں کی
الْمُؤْمِنُوْنَ	وہ مؤمنین	مُعْرِضُوْنَ	روگردانی کرنیوالے ہیں	حٰفِظُوْنَ	حفاظت کرنیوالے ہیں
الَّذِيْنَ	جو کہ	وَالَّذِيْنَ	اور جو کہ	اِلَّا(۲)	مگر
هُمْ	وہ	هُمْ	وہ	عَلٰٓى اَزْوَاجِهِمْ	اپنی بیویوں سے
فِيْ صَلَاتِهِمْ	اپنی نماز میں	لِلزَّكٰوةِ	زکات کو	اَوْ مَا(۳)	یا ان سے جن کے

(۱)خَشَعَ(ف)خُشُوْعًا: عاجزی دکھانا، انکساری کرنا، آواز پست ہونا، نگاہ نیچی کرنا۔ خَضَعَ(ف)خُضُوْعًا کے بھی تقریباً یہی معنی ہیں۔ مگر خُضوع کا استعمال بدن میں ہوتا ہے، اور خشوع کا آواز اور نگاہ میں...... الذين هم إلخ موصول مع صلہ: المؤمنون کی صفت ہے۔ في صلاتهم: خشعون سے متعلق ہے۔ یہی ترکیب آگے بھی ہے، اور سب الذين: المؤمنون کی صفتیں ہیں۔ (۲)الاستثناءُ مُفَرَّغٌ من أعم الأحوال أي حافظون لفروجهم في جميع الأحوال إلا حال كونهم وَالِيْنَ وَقَوَّامِيْنَ على أزواجهم (روح) اور على أزواجهم: میں على بمعنی مِنْ ہے۔ (۳) ما: کا عطف أزواج پر ہے۔ اور ما: موصولہ ہے، اور عائد ملكت میں محذوف ہے أي ملكته.

مَلَكَتْ	مالک ہیں	الْعٰدُوْنَ [۲]	حد سے تجاوز کرنے	يُحَافِظُوْنَ	پابندی کرنیوالے ہیں
اَيْمَانُهُمْ	ان کے دائیں ہاتھ		والے ہیں	اُولٰٓئِكَ	یہ لوگ
فَاِنَّهُمْ	پس بیشک وہ	وَالَّذِيْنَ	اور جو کہ	هُمُ	وہ
غَيْرُ	ملامت کئے ہوئے	هُمْ	وہ	الْوٰرِثُوْنَ	وارث ہونے والے ہیں
مَلُوْمِيْنَ [۱]	نہیں ہیں	لِاَمٰنٰتِهِمْ	اپنی امانتوں کا	الَّذِيْنَ	جو
فَمَنِ	پس جس نے	وَعَهْدِهِمْ	اور اپنے پیمانوں کا	يَرِثُوْنَ	وارث ہونگے
ابْتَغٰى	چاہا	رٰعُوْنَ [۳]	خیال رکھنے والے ہیں	الْفِرْدَوْسَ [۴]	بہشت بریں کے
وَرَآءَ ذٰلِكَ	اس کے علاوہ	وَالَّذِيْنَ	اور جو کہ	هُمْ	وہ
فَاُولٰٓئِكَ	پس وہ لوگ	هُمْ	وہ	فِيْهَا	اس میں
هُمُ	وہ	عَلٰى صَلَوٰتِهِمْ	اپنی نمازوں کی	خٰلِدُوْنَ	ہمیشہ رہنے والے ہیں

اللہ کے نام سے شروع کرتا ہوں جو بے حد مہربان نہایت رحم والے ہیں

گذشتہ سورت کے آخر میں مؤمنین کو حکم دیا تھا کہ وہ رکوع وسجدہ کریں یعنی نماز پڑھیں، اپنے رب کی عبادت کریں، اور نیک کام کریں تا کہ وہ کامیاب ہوں۔ اب یہ سورت نیک کاموں کے بیان سے شروع ہورہی ہے۔ ان کا مقصد بھی کامیابی حاصل کرنا ہے۔ رسول اللہ ﷺ کا پاک ارشاد ہے کہ جو شخص ان دس آیات [۵] پر پورا پورا عمل کرے جنت میں جائے گا (رواہ الترمذی والنسائی وغیرہما) اور خود رسول اللہ ﷺ ان آیات پر پوری طرح عمل کرتے تھے۔ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے دریافت کیا گیا کہ نبی ﷺ کے اخلاق کیا تھے؟ انھوں نے جواب دیا: كان خُلُقه

(۱) مَلُوْم: اسم مفعول لَامَهُ على كذا لَوْمًا: ملامت کرنا۔ آڑے ہاتھوں لینا۔ (۲) عادون: اسم فاعل، صیغہ جمع مذکر، اصل میں عَادِوُوْنَ تھا پہلا واو کلمہ میں چوتھی جگہ آیا، اور اس کا ماقبل مضموم نہیں ہے۔ اس لئے اس کو ی سے بدلا عَادِيُوْن ہوا، پھر ضمہ ی پر ثقیل تھا نقل کر کے ماقبل کو دیا، پھر دو ساکن جمع ہوئے تو ی کو گرا دیا۔ عَادُوْن ہوا۔ عَدَا (ن) عَدْوًا: دوڑنا۔ (۳) راعون: اسم فاعل، صیغہ جمع مذکر، اصل میں رَاعِيُوْنَ تھا، ضمہ ی پر ثقیل تھا نقل کر کے ماقبل کو دیا، پھر دو ساکن جمع ہوئے تو ی کو گرا دیا۔ رَعٰی يَرْعٰی الماشية: جانوروں کو چرانا۔ رَعَى الشيئَ: خیال رکھنا، حفاظت کرنا۔ (۴) الفِرْدَوْس: مکمل لوازم والا باغ، سرسبز و شاداب باغ (مذکر ہے، کبھی مؤنث بھی آتا ہے) یہ لفظ معرب ہے، اور تمام زبانوں میں معروف ہے۔ اور جنت کے لئے مستعمل ہے۔ انگریزی میں اس کا تلفظ پیرے ڈائز (PARADISE) ہے۔ جس کے معنی ہیں: جنتِ عدن یعنی جنت کا سب سے بلند و بالا درجہ۔ (۵) آیات درحقیقت گیارہ ہیں، عرب کسر کو چھوڑ دیتے ہیں ۱۲

القرآنُ: یعنی آپؐ کے اخلاق وہی تھے جو قرآن میں ہیں۔ پھر حضرت عائشہؓ نے یہ دس آیتیں پڑھیں اور فرمایا: یہی رسول اللہ ﷺ کی عادات واخلاق تھے (رواہ النسائی وغیرہ) اس لئے تفسیر پڑھنے والوں کو یہ آیتیں اچھی طرح سمجھنی چاہئیں، اوران پر عمل کرنے کی کوشش کرنی چاہئے، ان شاءاللہ کامیابی ان کے قدم چومے گی۔

ان گیارہ آیات کا خلاصہ یہ ہے کہ اگر انسان میں ایمان کے ساتھ: سات باتیں جمع ہوں تو آخرت میں اس کی کامیابی یقینی ہے۔ وہ سات باتیں یہ ہیں: خشوع وخضوع کے ساتھ نماز پڑھنا، بیکار باتوں سے بچا رہنا، پابندی سے زکات ادا کرنا، شرمگاہ کی حفاظت کرنا، امانت داری برتنا، عہد و پیان کا پاس ولحاظ رکھنا، اور نمازوں کی پابندی کرنا۔ ان اوصاف کے حامل لوگوں سے جنت الفردوس کا وعدہ ہے، اور یہی اصل اور کامل کامیابی ہے۔ اب تفصیل ملاحظہ فرمائیں:

یقیناً کامیابی حاصل کی ان مؤمنین نے جو اپنی نماز میں خشوع کرنے والے ہیں، اور جو بیکار باتوں سے کنارہ کشی کرنے والے ہیں۔ اور جو زکوٰۃ ادا کرنے والے ہیں، اور جو اپنی شرمگاہوں کی حفاظت کرنے والے ہیں، مگر اپنی بیویوں سے اور ان سے جن کے مالک ہیں ان کے دائیں ہاتھ، پس وہ یقیناً ملامت کیۓ ہوئے نہیں ہیں، پس جو کوئی اس کے علاوہ چاہے، پس وہ حد سے نکل جانے والے ہیں، اور جو اپنی امانتوں اور اپنے پیانوں کا لحاظ رکھنے والے ہیں، اور جو اپنی نمازوں کی پابندی کرنے والے ہیں، یہی لوگ وارث بننے والے ہیں، جو بہشتِ بریں کے وارث ہونگے، وہ اس میں ہمیشہ رہنے والے ہیں۔

فلاح (کامیابی) کا لفظ قرآن وحدیث میں بکثرت استعمال ہوا ہے۔ قرآن پاک کے بالکل شروع (سورۃ البقرہ آیت ۵) میں: ﴿اَلْمُفْلِحُوْنَ﴾ (کامیاب ہونے والوں) کا تذکرہ آیا ہے۔ اذان واقامت میں پانچ وقت ہر مسلمان کو فلاح کی طرف دعوت دی جاتی ہے۔ فلاح کے معنی یہ ہیں کہ ہر مراد حاصل ہو، اور ہر تکلیف دور ہو۔ ایسی فلاح دنیا میں ممکن نہیں۔ دنیا آزمائش کی جگہ ہے، اس لئے یہ بات دنیا کے موضوع کے خلاف ہے کہ کوئی بات خلافِ طبع پیش نہ آئے اور ہر خواہش بلا تاخیر پوری ہو جائے۔ اگر کوئی ہفت اقلیم کا بادشاہ بن جائے تو بھی اسے زوالِ نعمت کا کھٹکا لگا رہے گا۔ پس کامل فلاح کا حصول یہاں ممکن نہیں۔ یہ متاع گرانمایہ ایک دوسرے عالم میں ملتی ہے، جس کا نام آخرت ہے۔ وہ ایسی جگہ ہے جہاں انسان کی ہر مراد ہر وقت بلا انتظار پوری ہوگی۔ ان آیات کے آخر میں اس کا تذکرہ ہے۔

یہ کامل کامیابی ان مؤمن بندوں کا نصیب ہے جن میں ایمان کے ساتھ خصوصی طور پر سات باتیں پائی جاتی ہیں:

پہلی بات: خشوع وخضوع کے ساتھ نماز پڑھنا۔ خشوع کے معنی سکون کے ہیں۔ دل میں بھی سکون ہو کہ غیر اللہ کا خیال دل میں بالقصد نہ لائے اور اعضاء بھی پرسکون ہوں کہ فضول حرکتیں نہ کرے۔ خصوصاً وہ حرکتیں جن سے رسول

اللہ ﷺ نے نماز میں منع فرمایا ہے۔ جیسے:

① ـــــ نماز میں دائیں بائیں دیکھنا، خواہ چہرہ پھیر کر دیکھے یا گوشۂ چشم سے دیکھے۔ بے ضرورت نماز میں ایسا کرنا مکروہ ہے۔ اس سے نماز میں خشوع باقی نہیں رہتا۔ حدیث میں ہے کہ اللہ تعالیٰ نماز کی حالت میں بندے کی طرف برابر متوجہ رہتے ہیں، جب تک وہ دوسری طرف التفات نہ کرے۔ جب وہ دوسری طرف التفات کرتا ہے تو اللہ تعالیٰ اس سے رُخ پھیر لیتے ہیں [1] اور نبی ﷺ نے حضرت انس رضی اللہ عنہ کو حکم دیا کہ نگاہ اس جگہ رکھو جس جگہ سجدہ کرتے ہو، اور نماز میں دائیں بائیں مت دیکھو، کیونکہ نماز میں التفات تباہی ہے [2] اور متفق علیہ روایت میں ہے کہ نماز میں اِدھر اُدھر دیکھنا لوٹ کھسوٹ ہے۔ شیطان بندے کی نماز میں سے کھسوٹ لیتا ہے [3]۔ یعنی اس سے نماز ناقص ہوتی ہے۔

② ـــــ نماز میں کسی چیز سے کھیلنا: خواہ بدن کے کسی حصہ سے کھیلے یا کنکری وغیرہ سے۔ نماز میں یہ حرکت بھی مکروہ ہے، اس سے بھی نماز کا خشوع باقی نہیں رہتا۔ نبی ﷺ نے ایک شخص کو دیکھا جو نماز میں اپنی ڈاڑھی سے کھیل رہا تھا۔ فرمایا: ''اگر اس شخص کے دل میں خشوع ہوتا تو اس کے اعضاء میں بھی سکون ہوتا!'' [4] اور متفق علیہ روایت میں ہے کہ نبی ﷺ نے ایک شخص کو دیکھا جو نماز میں سجدہ کی جگہ کی مٹی ٹھیک کر رہا تھا: فرمایا: ''اگر ایسا کرنا ضروری ہو تو صرف ایک مرتبہ کرے!'' [5]

③ ـــــ نماز میں جماہیاں لینا۔ بعض لوگ جب نماز شروع کرتے ہیں تو جماہیوں پر جماہیاں لینے لگتے ہیں۔ حدیث میں اس کو شیطانی حرکت قرار دیا ہے۔ اور فرمایا: ''نماز میں جماہی آنا چاہے تو حتی الامکان منہ بند رکھے، کیونکہ شیطان منہ میں گھستا ہے!'' [6] یعنی مکھی مچھر وغیرہ منہ میں گھس جاتا ہے اور ساری نماز خراب کر دیتا ہے۔ علاوہ ازیں جماہی سے طبیعت میں سستی پیدا ہوتی ہے، پھر آدمی ہارے جی نماز پڑھتا ہے۔

اس قسم کے اور بھی افعال واحوال ہیں جو خشوع میں خلل ڈالتے ہیں۔ جیسے نگاہ آسمان کی طرف اٹھانا، انگلیاں چٹخانا وغیرہ۔ اس سب چیزوں سے نماز میں احتیاط ضروری ہے۔ اور اصل خشوع دل کا خشوع ہے۔ جب دل خاشع وخائف ہوتا ہے تو اس کے آثار بدن پر ظاہر ہوتے ہیں۔ حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ سے منقول ہے کہ وہ نماز میں ایسے ساکن ہوتے تھے جیسے بے جان لکڑی، اور کہا جاتا تھا کہ یہ نماز کا خشوع ہے۔ ایسا خشوع اگرچہ نماز کی صحت کے لئے

---

(۱) رواہ ابوداؤد، والنسائی وغیرہما، مشکوٰۃ حدیث ۹۹۵ باب مالایجوز من العمل فی الصلوٰۃ، کتاب الصلاۃ (۲) مشکوٰۃ حدیث ۹۹۶ و ۹۹۷ (۳) مشکوٰۃ حدیث ۹۸۲ (۴) رواہ الترمذی بسند ضعیف (مظہری) (۵) مشکوٰۃ حدیث ۹۸۰ (۶) رواہ مسلم مشکوٰۃ حدیث ۹۸۵

شرط نہیں، مگر حسنِ قبول کے لئے شرط ہے۔ کامل فلاح اور اعلیٰ درجہ کی کامیابی انہیں مؤمنین کو حاصل ہوتی ہے جو کامل خشوع وخضوع کے ساتھ نمازیں ادا کرتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ ہم سب کو ایسی نماز پڑھنے کی توفیق عطا فرمائیں (آمین)

دوسری بات: بیکار باتوں سے بچا رہنا۔ زندگی بڑی قیمتی ہے۔ مسلمان کی یہ شان نہیں کہ ایک لمحہ بھی ضائع کرے اور غیر مفید کام کی طرف متوجہ ہو۔ سیر وتفریح اور مشاغل نشاط جس حد تک صحتِ جسم اور انبساطِ قلب کے لئے ضروری ہیں: ضروری ہیں، ان کا شمار لغو میں نہیں۔ باقی فضول مشاغل میں وقت ضائع نہیں کرنا چاہئے۔ حدیث میں ہے کہ: ''آدمی کے اسلام کی خوبی بے فائدہ چیزوں کو چھوڑ دینا ہے''[1] اور ہر لغو بات سے بچنے کا ذکر جو نماز میں خشوع کے ساتھ متصلاً آیا ہے، اور زکوٰۃ کے حکم کو بعد میں لایا گیا ہے، اس میں راز یہ ہے کہ لغویات سے اجتناب نماز کی عین تکمیل کرنے والا ہے۔ جو لوگ زندگی کے ہر معاملہ میں فضول باتوں سے بچتے ہیں وہ نماز میں بھی بچتے ہیں۔ اور جن کی زندگی لاابالی پن میں گزرتی ہے ان کو نماز میں بھی سکون نصیب نہیں ہوتا ـــــ لغو کا اعلیٰ درجہ معصیت ہے۔ فائدہ ندارد گناہ لازم! پس اس سے احتراز واجب ہے۔ اور ادنیٰ درجہ یہ ہے کہ کام نہ مفید ہو نہ مضر، اس کا ترک اولیٰ اور موجبِ مدح ہے۔

تیسری بات: پابندی سے زکوٰۃ ادا کرنا۔ زکوٰۃ شروع اسلام ہی سے فرض ہے، سورۃ مزمل میں جو بالکل ابتداء میں نازل ہوئی ہے زکوٰۃ کا ذکر ہے۔ البتہ اس کی تفصیلات ہجرت کے بعد نازل ہوئی ہیں۔ پہلے زکوٰۃ کا مفہوم اللہ کی راہ میں خرچ کرنا تھا ـــــ اللہ کے لئے خرچ کرنے میں ذاتی فائدے بھی ہیں اور قومی بھی۔ زکوٰۃ ادا کرنے سے نفس سنورتا ہے۔ بخل زائل ہوتا ہے، جذبۂ ترحم ابھرتا ہے اور گناہ معاف ہوتے ہیں۔ اور انفاق سے کمزوروں کو سہارا اور حاجت مندوں کو تعاون ملتا ہے[2]

چوتھی بات: شرمگاہ کی حفاظت کرنا۔ گناہ کے سرچشمے دو ہیں: پیٹ کی خواہش اور شرمگاہ کی خواہش۔ پیٹ بھرنے کے لئے آدمی حرام وحلال کو بالائے طاق رکھ دیتا ہے، اور شرمگاہ کی تسکین کے لئے ہر کردنی ناکردنی کرتا ہے ـــــ بخاری شریف میں روایت ہے کہ اگر کوئی شخص مجھے زبان اور شرمگاہ پر کنٹرول رکھنے کی گارنٹی دیدے تو میں اس کو جنت کی گارنٹی دے سکتا ہوں[3]

مگر شرمگاہ کی خواہش بجائے خود بری چیز نہیں۔ جس طرح بھوک پیاس اور نیند فطری ضرورتیں ہیں خواہش بھی طبعی چیز ہے۔ اور اللہ تعالیٰ نے اس کو انسان پر اس لئے مسلط کیا ہے کہ نسلِ انسانی پھیلے۔ اور یہ بات اسی صورت میں

(۱) رواہ مالک واحمد وابن ماجہ (مشکوٰۃ حدیث ۴۸۳۹ باب حفظ اللسان کتاب الآداب) (۲) تفصیل کے لئے دیکھیں رحمۃ اللہ الواسعہ ج:۴، ص:۲۳-۲۵ (۳) مشکوٰۃ حدیث ۴۸۱۲ باب حفظ اللسان۔

ممکن ہے کہ اس کو اس کی جگہ میں خرچ کیا جائے۔ قابل الزام اس کا ضائع کرنا یا بے محل خرچ کرنا ہے۔ چنانچہ بیوی سے بھی اغلام کرنا، اور حالتِ حیض ونفاس میں صحبت کرنا حرام ہے۔ اسی طرح زنا، لواطت، مُتعہ یعنی چندروزہ نکاح، اور ہاتھ سے منی نکالنا ممنوع ہیں۔ کیونکہ یہ مادّہ کا ضیاع اور مقصد کو فوت کرنا ہے۔

پانچویں بات: امانت داری برتنا۔ امانت: ہر وہ چیز ہے جس کی ذمہ داری کسی نے لی ہو، اور اس پر بھروسہ کیا گیا ہو۔ امانت کی حفاظت اور اس کا حق ادا کرنا ایک جامع لفظ ہے۔ اس کی بے شمار صورتیں ہیں۔ کچھ حقوق اللہ سے متعلق ہیں اور کچھ بندوں سے۔ حقوق اللہ سے متعلق امانتیں یہ ہیں: فرائض وواجبات کو ادا کرنا اور حرام ومکروہات سے اجتناب کرنا۔ بلکہ سورۃ الاحزاب (آیت ۷۲) میں تمام شرعی احکام کو لفظ امانت سے تعبیر کیا ہے۔ اور حقوق العباد سے متعلق امانتیں بطور مثال یہ ہیں:

۱ــــ مالی امانتیں: یعنی کسی شخص نے کسی کے پاس کوئی چیز برائے حفاظت رکھی ہو تو وہ امانت ہے۔ اس کی حفاظت اور بوقت طلب اس کی ادائیگی ضروری ہے۔

۲ــــ اسی طرح کوئی راز کی بات کسی سے کہی گئی ہو تو وہ بھی امانت ہے، اس کو ظاہر کرنا امانت داری کے خلاف ہے۔

۳ــــ اسی طرح مزدور اور ملازم کو جو کام سپرد کیا گیا ہے، اور اس کے لئے جو وقت طے کیا گیا ہے وہ بھی امانت ہے۔ پس کام میں کمی کرنا یا وقت میں چوری کرنا امانت میں خیانت ہے۔ آج بہت سے مسلمان ملازمت کے لئے سرگرداں ہیں، اگر وہ اس امانت داری کا ثبوت دیں تو سب سے پہلے انہی کو ملازمت ملے۔

چھٹی بات: عہد وپیمان کا پاس ولحاظ رکھنا۔ عہد اور پیمان: دونوں کے معنی ہیں قول وقرار۔ اس کے تحت میں حقوق اللہ اور حقوق العباد: دونوں قسم کے قول وقرار آتے ہیں۔ نیز معاملات وعبادات کے سارے عہد اس میں شامل ہیں۔ سورۃ الانعام (آیت ۱۵۲) میں ہے: ﴿وَبِعَهْدِ اللّٰهِ أَوْفُوْا﴾ یعنی اللہ تعالیٰ سے کئے ہوئے عہد وپیمان پورے کرو۔ اور سورۃ الرعد (آیت ۲۰) میں مؤمن بندوں کا حال بیان کیا ہے: ﴿ اَلَّذِيْنَ يُوْفُوْنَ بِعَهْدِ اللّٰهِ وَلَا يَنْقُضُوْنَ الْمِيْثَاقَ ﴾ یعنی مؤمن بندے پیمانِ خداوندی پورا کرتے ہیں، اور وہ اپنا اقرار نہیں توڑتے ــــــ انسان نے اللہ تعالیٰ سے کیا عہد وپیمان کیا ہے؟ یہ عہد کیا ہے کہ الٰہی! آپ ہمارے خالق ومالک اور پروردگار ہیں، اور ہم آپ کے بندے ہیں۔ اس عہد وپیمان کی وجہ سے کچھ ذمہ داریاں عائد ہوتی ہیں۔ انہی ذمہ داریوں سے عہدہ برآ ہونے کا نام پیمانِ خداوندی کو پورا کرنا ہے ــــــ اور انسانوں سے کئے ہوئے عہد دو قسم کے ہیں: از قبیلِ معاہدہ اور از قبیل وعدہ۔ معاہدہ: وہ ہے جو دو طرف سے کسی معاملہ میں کیا گیا ہو۔ اس کا پورا کرنا لازم ہے، اور اس کی خلاف ورزی

دھوکہ ہے۔اور وعدہ: وہ ہے جو ایک طرف سے کیا گیا ہو۔اس کا پورا کرنا دیانۃً یعنی شرعاً لازم ہے۔حدیث میں ہے کہ وعدہ ایک قسم کا قرض ہے،مگر قضاءً اس کا پورا کرنا ضروری نہیں۔یعنی بذریعہ عدالت اس کو مجبور نہیں کیا جاسکتا۔

ساتویں بات: نمازوں کی پابندی کرنا۔یعنی نمازیں اپنے اوقات پر آداب وحقوق کی رعایت کے ساتھ ادا کرنا۔دنیا کے جھمیلوں میں پڑکر یا نفس وشیطان کے چکر میں پھنس کر نمازوں کو ضائع نہ کرنا۔غور کا مقام ہے!صفاتِ حسنہ کا بیان نماز میں خشوع سے شروع کیا،اور اس کی پابندی کی تاکید پر ختم کیا اس سے نماز کی اہمیت ظاہر ہوتی ہے۔مگر آج مسلمانوں کی اکثریت نماز ہی سے غافل ہے۔اور کامیابی چاہتی ہے۔چاہتی ہے کہ دنیا میں اس کا راج قائم ہو،اور آخرت میں وہ جنت کی حق دار بنے۔حالانکہ یہ چیز ایمان وعمل صالح کے بغیر نصیب نہیں ہوتی۔

فردوس یعنی جنت کا اعلیٰ درجہ: مؤمنین کاملین کا حصہ ہے۔پس ہر مؤمن اعمال میں محنت کرے تاکہ اس کو یہ مقام حاصل ہو۔

وَلَقَدْ خَلَقْنَا الْإِنْسَانَ مِنْ سُلٰلَةٍ مِّنْ طِيْنٍ ﴿۱۲﴾ ثُمَّ جَعَلْنٰهُ نُطْفَةً فِيْ قَرَارٍ مَّكِيْنٍ ﴿۱۳﴾ ثُمَّ خَلَقْنَا النُّطْفَةَ عَلَقَةً فَخَلَقْنَا الْعَلَقَةَ مُضْغَةً فَخَلَقْنَا الْمُضْغَةَ عِظٰمًا فَكَسَوْنَا الْعِظٰمَ لَحْمًا ثُمَّ اَنْشَاْنٰهُ خَلْقًا اٰخَرَ فَتَبٰرَكَ اللّٰهُ اَحْسَنُ الْخٰلِقِيْنَ ﴿۱۴﴾ ثُمَّ اِنَّكُمْ بَعْدَ ذٰلِكَ لَمَيِّتُوْنَ ﴿۱۵﴾ ثُمَّ اِنَّكُمْ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ تُبْعَثُوْنَ ﴿۱۶﴾

وَلَقَدْ	اور البتہ تحقیق	مِّنْ طِيْنٍ (۲)	مٹی کے	فِيْ قَرَارٍ (۴)	قرارگاہ میں
خَلَقْنَا	پیدا کیا ہم نے	ثُمَّ	پھر	مَّكِيْنٍ (۵)	محفوظ
الْإِنْسَانَ	انسان کو	جَعَلْنٰهُ	بنایا ہم نے اس کو	ثُمَّ	پھر
مِنْ سُلٰلَةٍ (۱)	خلاصہ سے	نُطْفَةً (۳)	ایک بوند	خَلَقْنَا	بنایا ہم نے

(۱) سُلَالَة: اسم مشتق ہے: کسی شے سے نکالی ہوئی چیز،خلاصہ،ست، سَلَّ(ن) الشیئَ من الشیئِ: کھینچ کر نکالنا،آہستہ سے نکالنا۔من سُلالة: خلقنا سے متعلق ہے(۲)من طین بھی خلقنا سے متعلق ہے،اور سُلَالَة سے بھی متعلق ہوسکتا ہے،کیونکہ سُلَالَة بمعنی مَسْلُوْلَة ہے(۳)نطفة کے معنی ہیں: بوند،قطرہ ج: نِطَاف،نَطَفَ(ض) نَطْفًا: ٹپکنا(۴) قَرَار: قرارگاہ،ٹھہرنے کی جگہ۔قَرَار: اسم مصدر ہے، قَرَّ قَرَارًا: ٹھہرنا(۵)مکین: محفوظ،مضبوط،صفتِ مشبہ ہے مَكُنَ(ک)مَكَانَة: بلند مرتبہ ہونا، ←

النُّطْفَةَ	بوند کو	الْعِظٰمَ	ہڈیوں کو	الْخٰلِقِيْنَ	پیدا کرنے والے
عَلَقَةً	خونِ بستہ	لَحْمًا	گوشت	ثُمَّ	پھر
فَخَلَقْنَا	پس بنایا ہم نے	ثُمَّ	پھر	اِنَّكُمْ	بیشک تم
الْعَلَقَةَ	خونِ بستہ کو	اَنْشَاْنٰهُ [1]	بنایا ہم نے اس کو	بَعْدَ	بعد
مُضْغَةً	ایک بوٹی	خَلْقًا	ایک مخلوق	ذٰلِكَ	اس کے
فَخَلَقْنَا	پس بنایا ہم نے	اٰخَرَ	دوسری	لَمَيِّتُوْنَ	ضرور مرنے والے ہو
الْمُضْغَةَ	بوٹی کو	فَتَبٰرَكَ	پس عالی شان ہیں	ثُمَّ اِنَّكُمْ	پھر بیشک تم
عِظٰمًا	ہڈیاں	اللّٰهُ	اللہ تعالیٰ	يَوْمَ الْقِيٰمَةِ	قیامت دن
فَكَسَوْنَا	پس پہنایا ہم نے	اَحْسَنُ	بہترین	تُبْعَثُوْنَ	دوبارہ زندہ کئے جاؤ گے

جن لوگوں میں ایمان کے ساتھ سات باتیں پائی جاتی ہیں وہ جنت کے وارث ہونگے۔ ان کو جنت کب ملے گی؟ ان آیات میں اس کا جواب ہے۔ ان کو جنت الفردوس اس وقت ملے گی جب لوگ مرنے کے بعد دوبارہ زندہ ہونگے۔ اور یہ بات اس طرح بیان کی ہے کہ مرنے کے بعد دوبارہ زندہ ہونے کا امکان بھی سمجھ میں آجائے۔ پہلی زندگی مٹی سے وجود میں لائی گئی ہے، پھر روح پڑنے تک احوال بدلتے ہیں، پھر اچانک انسان وجود میں آجاتا ہے۔ زندگی کے ان تطوّرات میں جو بھی غور کرے گا اس کو دوسری زندگی میں ذرا شک باقی نہیں رہے گا۔ جو ہستی پہلی بار انسان کو مٹی سے پیدا کرسکتی ہے وہ دوبارہ کیوں پیدا نہیں کرسکتی؟ ضرور کرسکتی ہے۔ اللہ تعالیٰ قادر مطلق ہیں، اور اعادہ: ابتداء سے آسان ہے، پھر بعث بعد الموت میں کیا استبعاد رہ جاتا ہے؟ ارشاد ہے:

اور البتہ واقعہ یہ ہے کہ ہم نے انسان کو مٹی کے جوہر سے پیدا کیا۔ پھر ہم نے اس کو محفوظ مقام میں ایک بوند بنایا۔ پھر اس بوند کو پھُٹکی [2] بنایا۔ پس ہم نے اس پھُٹکی کو بوٹی بنایا۔ پس ہم نے اس بوٹی کو ہڈیاں بنایا۔ پس ہم نے ان ہڈیوں کو گوشت پہنایا۔ پھر ہم نے اس کو ایک دوسری ہی مخلوق بنادیا۔ پس عالی شان ہیں اللہ تعالیٰ جو تمام صنّاعوں سے بہتر ہیں۔ پھر تم اِس کے بعد ضرور مرنے والے ہو۔ پھر تم قیامت کے دن دوبارہ زندہ کئے جاؤ گے۔

انسان اس دنیا میں نیا پیدا نہیں ہوتا۔ اس دنیا میں صرف اس کا جسم بنتا ہے۔ اُس کی روح پہلے پیدا کی جاچکی ہے۔

← لوگوں میں باحیثیت ہونا، فَهُوَ مَكِين ج: مُكَنَاء

(۱) أَنْشَأَ الشيئَ: پیدا کرنا، وجود میں لانا نَشَأَ الشيئُ: پیدا ہونا، وجود میں آنا (۲) پھُٹکی: گانٹھ، گرہ، گٹھلی، خون کی جمی ہوئی بوند ۱۲

اورتمام روحیں عالم ارواح میں ہیں۔جب اس کے دنیا میں آنے کا وقت آتا ہے تو شکم مادر میں اُس کے لئے جسم بنتا ہے، پھر روح اس میں منتقل کی جاتی ہے۔اور جسم: چار عناصر سے خاص طور پر مٹی سے بنتا ہے۔اس طرح کہ عناصر اربعہ کی توانائیاں مجتمع ہوکر انسان کی غذا پیدا ہوتی ہے۔جب انسان وہ غذا کھاتا ہے تو اس سے خون بنتا ہے۔پھر خون کا خاص حصہ مادّۂ منویہ بننے کے لئے جدا کرلیا جاتا ہے۔پھر میاں بیوی کے مادّے رحم مادر میں پہنچتے ہیں۔جب علوق (حمل ٹھہرنا) مقدر ہوتا ہے تو مادّہ کا کچھ حصہ (ایک بوند) بچہ دانی میں ٹھہر جاتا ہے۔باقی مادہ باہر نکل آتا ہے۔وہی بوند مختلف تطورات سے گذرنے کے بعد انسان کا جسم بنتی ہے۔یہ بوند قرار مکین میں یعنی ایک محفوظ قرارگاہ میں نطفہ کی شکل میں رہتی ہے، اس میں کوئی خاص تبدیلی نہیں ہوتی، بس رحم کی حرارت کی وجہ سے معمولی تغیر آتا ہے۔یہ گانٹھ ایک جگہ جمی رہتی ہے، اِدھر اُدھر نہیں ہوتی۔اگر یہ گانٹھ اپنی جگہ سے ہل جاتی ہے تو اسقاط کا احتمال پیدا ہوجاتا ہے۔یہ مادّہ ماں کے پیٹ میں چالیس دن تک اسی حالت میں رہتا ہے۔پھر اتنی ہی مدت میں عَلَقہ (جما ہوا خون) بن جاتا ہے۔پھر اتنی ہی مدت میں مُضغہ (گوشت کا ٹکڑا) بن جاتا ہے۔اور مراحلِ تخلیق میں یہ انتقال تدریجی ہوتا ہے، دَفعی (یکبارگی) نہیں ہوتا۔اور ہر مرحلہ پہلے والے اور بعد والے مرحلہ سے مختلف ہوتا ہے۔پھر جب مادّہ میں خوب انجماد پیدا ہوجاتا ہے تو اس میں سفید ڈورے پیدا ہوتے ہیں۔یہی ڈورے آہستہ آہستہ ہڈیوں کی شکل اختیار کرتے ہیں۔پھر جب ان پر گوشت منڈھ جاتا ہے اور جسم کی تخلیق مکمل ہوجاتی ہے تو اللہ تعالیٰ فرشتہ کو حکم دیتے ہیں۔وہ عالم ارواح سے متعلقہ روح لاکر اس جسم میں پھونک دیتا ہے پس یکا یک انسان زندہ ہوجاتا ہے۔اور وہ بے جان مادّہ عقل وشعور رکھنے والی مخلوق بن جاتا ہے۔غور کرو! خالق کی کاریگری پر! کس طرح بے جان مادّہ کو ایک جیتا جاگتا وجود بنادیا۔پھر زندگی پڑنے کے بعد بھی ایک وقت تک انسان کو رحم مادر ہی میں رکھا جاتا ہے، کیونکہ ابھی وہ اس دنیا کی آب وہوا سہارنے کے قابل نہیں ہوا۔اور وہیں اس کی ساری ضروریات پوری کی جاتی ہیں۔کھانے پینے اور سانس لینے کا انتظام کردیا جاتا ہے۔تفصیل سورۃ الحج (آیت ۵) کی تفسیر میں گذر چکی ہے —— پھر بچہ پیدا ہوتا ہے، پلتا بڑھتا ہے۔اور جوان رَعنا ہوجاتا ہے۔پھر زوال شروع ہوتا ہے۔اور ایک وقت آتا ہے کہ روح بدن سے جدا کرلی جاتی ہے، یہی موت ہے۔روح بدن سے جدا ہوکر عالم ارواح میں پہنچ جاتی ہے، اور جسدِ خاکی مٹی کے حوالے کردیا جاتا ہے، کیونکہ وہ اسی سے پیدا ہوا ہے۔اور روح عالم بالا کی چیز ہے، اس لئے وہ اپنے مستقر پر چلی جاتی ہے۔غرض مرتا جسم ہے روح نہیں مرتی۔پھر جب قیامت کا دن آئے گا تو پہلے جسم والے اجزاء ہی سے دوبارہ جسم بنایا جائے گا، اور پہلے سے کہیں زیادہ طاقتور بنایا جائے گا۔جب جسم تیار ہوجائیں گے تو روحیں عالم برزخ سے واپس آکر ان جسموں میں داخل ہوجائیں گی، اور انسان دوبارہ زندہ ہوجائیں گے، اور

آخرت کی زندگی شروع ہوجائے گی، جو جاوداں ہے۔اب پھر کبھی موت نہیں آئے گی۔

وجود کی باگ ڈور اللہ کے ہاتھ میں ہے۔جب چاہے ڈھیلی چھوڑ دے، جب چاہے کھینچ لے!

وَلَقَدْ خَلَقْنَا فَوْقَكُمْ سَبْعَ طَرَآئِقَ ۖ وَمَا كُنَّا عَنِ الْخَلْقِ غٰفِلِيْنَ ﴿۱۷﴾ وَاَنْزَلْنَا مِنَ السَّمَآءِ مَآءًۢ
بِقَدَرٍ فَاَسْكَنّٰهُ فِي الْاَرْضِ ۖ وَاِنَّا عَلٰى ذَهَابٍۢ بِهٖ لَقٰدِرُوْنَ ﴿۱۸﴾ فَاَنْشَاْنَا لَكُمْ بِهٖ جَنّٰتٍ
مِّنْ نَّخِيْلٍ وَّ اَعْنَابٍ ۘ لَكُمْ فِيْهَا فَوَاكِهُ كَثِيْرَةٌ وَّمِنْهَا تَاْكُلُوْنَ ﴿۱۹﴾ وَ شَجَرَةً تَخْرُجُ
مِنْ طُوْرِ سَيْنَآءَ تَنْۢبُتُ بِالدُّهْنِ وَصِبْغٍ لِّلْاٰكِلِيْنَ ﴿۲۰﴾ وَاِنَّ لَكُمْ فِي الْاَنْعَامِ لَعِبْرَةً ۭ نُسْقِيْكُمْ
مِّمَّا فِيْ بُطُوْنِهَا وَلَكُمْ فِيْهَا مَنَافِعُ كَثِيْرَةٌ وَّمِنْهَا تَاْكُلُوْنَ ﴿۲۱﴾ وَعَلَيْهَا وَعَلَى الْفُلْكِ
تُحْمَلُوْنَ ﴿۲۲﴾ ع ۲

وَلَقَدْ	اور البتہ تحقیق	مَآءً	پانی	جَنّٰتٍ	باغات
خَلَقْنَا	پیدا کی ہم نے	بِقَدَرٍ (۲)	اندازے سے	مِّنْ نَّخِيْلٍ	کھجور کے
فَوْقَكُمْ	تمہارے اوپر	فَاَسْكَنّٰهُ	پس ٹھہرایا ہم نے اسکو	وَّ اَعْنَابٍ	اور انگور کے
سَبْعَ	سات	فِي الْاَرْضِ	زمین میں	لَكُمْ	تمہارے لئے
طَرَآئِقَ (۱)	راہیں	وَاِنَّا	اور بیشک ہم	فِيْهَا	ان میں
وَمَا	اور نہیں	عَلٰى ذَهَابٍ	لے جانے پر	فَوَاكِهُ	میوے ہیں
كُنَّا	ہیں ہم	بِهٖ (۳)	اس کے	كَثِيْرَةٌ	بکثرت
عَنِ الْخَلْقِ	مخلوق سے	لَقٰدِرُوْنَ	یقیناً قادر ہیں	وَّمِنْهَا	اور ان (باغوں) سے
غٰفِلِيْنَ	بے خبر	فَاَنْشَاْنَا	پس پیدا کئے ہم نے	تَاْكُلُوْنَ	کھاتے ہو تم
وَاَنْزَلْنَا	اور اتارا ہم نے	لَكُمْ	تمہارے لئے	وَ شَجَرَةً (۴)	اور (پیدا کیا) ایک
مِنَ السَّمَآءِ	آسمان سے	بِهٖ	اس کے ذریعہ		درخت کو

(۱) طرائق: طریقة کی جمع ہے: راہیں، مراد آسمان کے طبقے ہیں۔(۲) بقدر: ماء کی صفت ہے۔(۳) به کی ب صلہ کی ہے۔ ذَهَبَ: گیا۔ ذَهَبَ به: لے گیا۔(۴) شجرة کا عطف جنّاتٍ پر ہے۔ أی أنشأنالکم شجرة۔

تَخْرُجُ	پیدا ہوتا ہے وہ	فِي الْاَنْعَامِ	مویشی میں	مَنَافِعُ	فوائد ہیں
مِنْ طُوْرِ سَيْنَآءَ	طورِ سینا میں	لَعِبْرَةً	یقیناً غور کرنیکا مقام ہے	كَثِيْرَةٌ	بکثرت
تَنْۢبُتُ	اگتا ہے وہ	نُسْقِيْكُمْ	پلاتے ہیں ہم تم کو	وَّمِنْهَا	اوران سے
بِالدُّهْنِ	روغن کے ساتھ	مِّمَّا	اس سے جو	تَاْكُلُوْنَ	کھاتے ہوتم
وَصِبْغٍ (١)	اور رنگ کے ساتھ	فِيْ بُطُوْنِهَا	ان کے پیٹوں میں ہے	وَعَلَيْهَا	اوران پر
لِّلْاٰكِلِيْنَ	کھانے والوں کیلئے	وَلَكُمْ	اور تمہارے لئے	وَعَلَى الْفُلْكِ (٢)	اور کشتیوں پر
وَاِنَّ لَكُمْ	اور بیشک تمہارے لئے	فِيْهَا	ان میں	تُحْمَلُوْنَ	لادے جاتے ہوتم

اللہ تعالیٰ نے انسان کو پیدا کر کے بس یونہی نہیں چھوڑ دیا۔ وہ اپنی مخلوق کی ضرورتوں سے غافل نہیں۔ بلکہ اس کی تمام ضروریات کا انتظام کیا ہے۔ صرف جسمانی ضروریات ہی نہیں بلکہ روحانی ضروریات کا بھی سامان کیا ہے۔ اِن آیاتِ پاک میں انسان کی جسمانی ضروریات کا ذکر ہے۔ اللہ تعالیٰ نے انسان کی بقاءاور آسائش کے لئے ہر سامان پیدا کیا ہے۔ اس کی کوئی ضرورت ایسی باقی نہیں چھوڑی جو مہیا نہ کی ہو۔ اسی کی ضرورتوں کی تکمیل کے لئے سات آسمان بنائے۔ پھر آسمان سے پانی برسایا، جس سے انسان کی غذا اور اس کی آسائش کا سامان پیدا ہوتا ہے، اور بھی طرح طرح کی چیزیں پیدا کیں جن کے ذریعہ انسان عیش کرتا ہے۔ ارشاد ہے: —— اور البتہ واقعہ یہ ہے کہ ہم نے تمہارے اوپر سات آسمان پیدا کئے —— یعنی کشادہ راستوں والے سات آسمان بنائے۔ آسمانوں کو ''راستوں'' سے کیوں تعبیر کیا؟ یہ بات سلف سے مروی نہیں۔ مفسرین کہتے ہیں کہ وہ فرشتوں کی گذرگاہیں ہیں اس لئے ان کو ''راستے'' کہا گیا ہے۔ کوئی کہتا ہے کہ سات سیارے یا ان کی مداریں مراد ہیں۔ بہرحال اس کی کوئی قطعی وجہ معلوم نہیں —— اور ہم مخلوق سے بے خبر نہیں ہیں —— یعنی اللہ تعالیٰ نے آسمان ایسے بودے نہیں بنائے کہ کسی وقت اچانک ڈھہ پڑیں اور مخلوق تباہ ہو جائے۔ اللہ تعالیٰ مخلوق کی حفاظت سے غافل نہیں۔ انھوں نے آسمان ایسے مضبوط بنائے ہیں کہ تا ابد قائم ودائم رہ سکتے ہیں۔ جب قیامت کو ان کی شکست وریخت کا وقت آئے گا تو وہ بوسیدہ ہونے کی وجہ سے نہیں، بلکہ اللہ تعالیٰ کے حکم کی وجہ سے پھٹ جائیں گے —— اور ہم نے آسمان سے اندازے کے ساتھ پانی برسایا —— یعنی نہ اتنا زیادہ برسایا کہ دنیا تباہ ہو جائے، اور نہ اتنا کم برسایا کہ ضروریات کے لئے کافی نہ ہو —— پس ہم نے اسے زمین میں ٹھہرایا —— جب بارش ہوتی ہے تو پانی کا کچھ حصہ فوری طور پر انسانوں، جانوروں، درختوں اور کھیتوں کے کام آجاتا ہے،

(۱) صِبْغٌ: رنگ رنگنا، روٹی چپڑنا (۲) الفلك: لام کے جزم کے ساتھ: واحد بھی ہے اور جمع بھی، مذکر بھی ہے اور مؤنث بھی۔

باقی پانی کا کچھ حصہ تالابوں اور جھیلوں میں محفوظ ہو جاتا ہے، جس سے چرند و پرند اور انسان فائدہ اٹھاتے ہیں، اور زیادہ حصہ بچے ہوئے پانی کا زمین کے مسامات میں اتر جاتا ہے، اور زیر زمین پائپ لائنوں کے ذریعہ ہر طرف رواں دواں رہتا ہے۔ اور کنواں کھودنے پر برآمد ہوتا ہے ـــــ اور ہم اس کے لے جانے پر یقیناً قادر ہیں ـــــ پانی کو لے جانے کی بہت سی صورتیں ہو سکتی ہیں۔ مثلاً: سارا پانی بہہ کر سمندر میں چلا جائے، یا بھاپ بن کر ہوا میں اڑ جائے یا زمین میں اتر جائے۔ پانی کی طبعی خاصیت یہی ہے کہ وہ زمین کی گہرائی میں اترتا ہی چلا جائے، غرض ہر طرح اللہ تعالیٰ اس کو لے جانے پر قادر ہیں ـــــ پس ہم نے اس کے ذریعہ تمہارے لئے کھجوروں اور انگوروں کے باغ اگائے ـــــ کھجور اور انگور کی تخصیص عرب کے ماحول کے اعتبار سے ہے۔ وہاں یہی باغات ہوتے ہیں۔ پھر دوسرے پھلوں کو شامل کرکے فرمایا: ـــــ ان میں تمہارے لئے بہت میوے ہیں ـــــ یعنی ان باغات میں تمہارے لئے کھجور اور انگور کے علاوہ ہزاروں قسم کے پھل پیدا کئے، جن کو تم تفریح اور شوق سے کھاتے ہو ـــــ اور ان میں سے تم کھاتے ہو ـــــ یعنی ان میں سے بعض پھلوں کو سوکھا کر ذخیرہ کرتے ہو جو تمہاری غذا بنتے ہیں ـــــ اور ایک اور درخت اگایا جو طورِ سینا میں پیدا ہوتا ہے، جو تیل اور کھانے والوں کے لئے رنگ لے کر اگتا ہے ـــــ یہ خاص طور پر درختِ زیتون کا ذکر ہے۔ زیتون کی خاص پیداوار میدانِ سینا میں ہوتی ہے جہاں طور پہاڑ ہے، جہاں موسیٰ علیہ السلام کو نبوت سے سرفراز کیا گیا ہے۔ زیتون کے پھل کا اچار ڈالتے ہیں، اور مربہ تیار کرتے ہیں، اور اس کی گٹھلی سے تیل نکلتا ہے، جو کھانا پکانے میں، بدن پر لگانے میں اور چراغ جلانے میں کام آتا ہے۔ اور بہت سی جگہ اس سے روٹی چپڑ کر بھی کھاتے ہیں۔

نباتات کے بعد حیوانات کا تذکرہ: ـــــ اور تمہارے لئے یقیناً مویشی میں سبق ہے: ہم تمہیں اس میں سے جو ان کے پیٹوں میں ہے پلاتے ہیں ـــــ یعنی اللہ تعالیٰ انسان کے لئے دودھ جیسی نعمت مویشی کے پیٹوں میں تیار کرتے ہیں جہاں گوبر بھرا ہوا ہے۔ نہ اس میں گوبر کی بو آتی ہے نہ مزہ۔ خالص، صاف ستھرا، رنگ و بو اور خاصیت و مقصد میں اس سے بالکل مختلف، دل پسند اور خوش گوار! ـــــ اور تمہارے لئے ان میں بہت سے فائدے ہیں ـــــ یعنی دودھ کے علاوہ جانوروں میں انسان کے لئے بہت سی منفعتیں ہیں۔ ان کے بال، کھال، ہڈی، آنتیں، پٹھے اور دیگر اجزاء کارآمد ہیں، انسان ان سے کتنے ہی سامان تیار کرتا ہے ـــــ اور ان میں سے تم کھاتے ہو ـــــ یہ ان کا ایک بہت بڑا نفع ہے۔ ان کا گوشت انسان کی بہترین غذا ہے ـــــ اور ان پر اور کشتیوں پر تم سوار کئے جاتے ہو ـــــ یعنی یہ جانور اور کشتیاں سواری اور باربرداری کے کام بھی آتے ہیں۔ اور اس اعتبار سے ان میں دوہرا نفع ہے۔ ایک کرایہ پر دینے والے کا دوسرا کرایہ پر لینے والے کا۔ ''سوار کئے جاتے ہو'' میں اس ڈبل نفع کی طرف اشارہ ہے ـــــ غرض اللہ تعالیٰ ہی انسان کی

چھوٹی بڑی تمام حاجتیں پوری کرتے ہیں۔ دنیا کے سارے کارخانے کو اس کی بیگار میں لگا رکھا ہے۔ اللہ نے تمام چیزیں انسان کے فائدے کے لئے پیدا کی ہیں۔ اب بھی اگر انسان خدا کی فرمان برداری نہ کرے تو اس سے بڑا ظالم کون ہے؟

ہمہ از بہر تو سرگشتہ و فرماں بردار ❁ شرطِ انصاف نہ باشد کہ تو فرماں نہ بُری
ہر مخلوق تیرے لئے حیران اور فرماں بردار ہے ❁ پس یہ انصاف کی بات نہیں کہ تو فرماں بردار نہ بنے

وَلَقَدْ اَرْسَلْنَا نُوْحًا اِلٰى قَوْمِهٖ فَقَالَ يٰقَوْمِ اعْبُدُوا اللّٰهَ مَا لَكُمْ مِّنْ اِلٰهٍ غَيْرُهٗ اَفَلَا تَتَّقُوْنَ ﴿۲۳﴾ فَقَالَ الْمَلَؤُا الَّذِيْنَ كَفَرُوْا مِنْ قَوْمِهٖ مَا هٰذَآ اِلَّا بَشَرٌ مِّثْلُكُمْ ۙ يُرِيْدُ اَنْ يَّتَفَضَّلَ عَلَيْكُمْ ۭ وَلَوْ شَآءَ اللّٰهُ لَاَنْزَلَ مَلٰٓئِكَةً ۚۖ مَّا سَمِعْنَا بِهٰذَا فِيْٓ اٰبَآئِنَا الْاَوَّلِيْنَ ﴿۲۴﴾ اِنْ هُوَ اِلَّا رَجُلٌۢ بِهٖ جِنَّةٌ فَتَرَبَّصُوْا بِهٖ حَتّٰى حِيْنٍ ﴿۲۵﴾ قَالَ رَبِّ انْصُرْنِيْ بِمَا كَذَّبُوْنِ ﴿۲۶﴾ فَاَوْحَيْنَآ اِلَيْهِ اَنِ اصْنَعِ الْفُلْكَ بِاَعْيُنِنَا وَوَحْيِنَا فَاِذَا جَآءَ اَمْرُنَا وَفَارَ التَّنُّوْرُ ۙ فَاسْلُكْ فِيْهَا مِنْ كُلٍّ زَوْجَيْنِ اثْنَيْنِ وَاَهْلَكَ اِلَّا مَنْ سَبَقَ عَلَيْهِ الْقَوْلُ مِنْهُمْ ۚ وَلَا تُخَاطِبْنِيْ فِي الَّذِيْنَ ظَلَمُوْا ۚ اِنَّهُمْ مُّغْرَقُوْنَ ﴿۲۷﴾ فَاِذَا اسْتَوَيْتَ اَنْتَ وَمَنْ مَّعَكَ عَلَى الْفُلْكِ فَقُلِ الْحَمْدُ لِلّٰهِ الَّذِيْ نَجّٰىنَا مِنَ الْقَوْمِ الظّٰلِمِيْنَ ﴿۲۸﴾ وَقُلْ رَّبِّ اَنْزِلْنِيْ مُنْزَلًا مُّبٰرَكًا وَّاَنْتَ خَيْرُ الْمُنْزِلِيْنَ ﴿۲۹﴾ اِنَّ فِيْ ذٰلِكَ لَاٰيٰتٍ وَّاِنْ كُنَّا لَمُبْتَلِيْنَ ﴿۳۰﴾

وَلَقَدْ	اور البتہ تحقیق	يٰقَوْمِ	اے میری قوم	غَيْرُهٗ	ان کے سوا
اَرْسَلْنَا	بھیجا ہم نے	اعْبُدُوا	عبادت کرو	اَفَلَا تَتَّقُوْنَ	کیا پس ڈرتے نہیں تم
نُوْحًا	نوح کو	اللّٰهَ	اللہ تعالیٰ کی	فَقَالَ	پس کہا
اِلٰى قَوْمِهٖ	ان کی قوم کی طرف	مَا لَكُمْ	نہیں ہے تمہارے لئے	الْمَلَؤُا (۱)	ان رئیسوں نے
فَقَالَ	پس کہا انھوں نے	مِّنْ اِلٰهٍ	کوئی معبود	الَّذِيْنَ	جنھوں نے

(۱) قرآنی رسم الخط میں الْمَلَؤُا دس جگہ اسی طرح لکھا گیا ہے یعنی ہمزہ واو پر اور اس کے بعد الف لکھا گیا ہے، کیونکہ یہ واو: جمع کے واو کے مشابہ ہے۔

كَفَرُوْا	انکار کیا	اِنْ	نہیں ہے	فَاِذَا	پس جب
مِنْ قَوْمِهٖ	ان کی قوم سے	هُوَ	وہ	جَآءَ	آجائے
مَا هٰذَآ	نہیں ہے یہ	اِلَّا	مگر	اَمْرُنَا	ہمارا حکم
اِلَّا	مگر	رَجُلٌ	ایک آدمی	وَفَارَ	اور ابل پڑے
بَشَرٌ	ایک انسان	بِهٖ	جسے	التَّنُّوْرُ	تندور
مِّثْلُكُمْ	تم جیسا	جِنَّةٌ (۱)	جنون ہے	فَاسْلُكْ	پس داخل کیجئے
يُرِيْدُ	چاہتا ہے وہ	فَتَرَبَّصُوْا	پس انتظار کرو	فِيْهَا	اس میں
اَنْ	کہ	بِهٖ	اس کے بارے میں	مِنْ كُلٍّ (۴)	ہر قسم سے
يَّتَفَضَّلَ	برتر ہوجائے	حَتّٰى حِيْنٍ	ایک وقت تک	زَوْجَيْنِ	جوڑا
عَلَيْكُمْ	تم پر	قَالَ	کہا اس نے	اثْنَيْنِ	دو عدد
وَلَوْ	اور اگر	رَبِّ	اے میرے رب!	وَاَهْلَكَ	اور اپنے گھر والوں کو
شَآءَ	چاہتے	انْصُرْنِيْ	مدد کیجئے میری	اِلَّا	مگر
اللّٰهُ	اللہ تعالیٰ	بِمَا كَذَّبُوْنِ (۲)	مجھ کو جھٹلانے کی وجہ سے	مَنْ	وہ شخص
لَاَنْزَلَ	(تو) ضرور اتارتے	فَاَوْحَيْنَآ	پس وحی بھیجی ہم نے	سَبَقَ	پہلے سے ہوچکی
مَلٰٓئِكَةً	فرشتوں کو	اِلَيْهِ	اس کی طرف	عَلَيْهِ	اس پر
مَّا	نہیں	اَنِ (۳)	کہ	الْقَوْلُ	بات
سَمِعْنَا	سنی ہم نے	اصْنَعِ	بنائیں آپ	مِنْهُمْ	ان میں سے
بِهٰذَا	یہ بات	الْفُلْكَ	کشتی	وَلَا	اور نہ
فِيْٓ اٰبَآئِنَا	ہمارے باپ دادوں میں	بِاَعْيُنِنَا	ہماری آنکھوں کے سامنے	تُخَاطِبْنِيْ	گفتگو کیجئے مجھ سے
الْاَوَّلِيْنَ	اگلے	وَوَحْيِنَا	اور ہماری وحی کے مطابق	فِي الَّذِيْنَ	ان لوگوں میں جنھوں نے

(۱) جِنَّة: اگر جَنَّ (ض) جَنًّا (چھپنا) سے ہے تو اس کے معنی ہیں: جنون، سودا اور دیوانگی۔ اور اگر جِنّیٌّ کی جمع ہے تو اس کے معنی ہیں جنات۔ یعنی اس کو آسیب لگا ہے۔ عام طور پر مفسرین نے پہلے معنی کئے ہیں۔ (۲) بما كذبونِ: ما مصدریہ، اور آخر میں ی محذوف، نون کا کسرہ اس کی علامت (۳) أنْ: مفسرہ ہے، کیونکہ أوحینا بمعنی قلنا ہے (۴) كُلٍّ کی تنوین مضاف الیہ کے عوض میں ہے۔

ظَلَمُوْا	ظلم کیا	اَلْحَمْدُ	تمام تعریفیں	مُّبٰرَكًا	برکت والا
اِنَّهُمْ	بیشک وہ	لِلّٰهِ	اللہ کے لئے ہیں	وَّ اَنْتَ	اور آپ
مُّغْرَقُوْنَ (۱)	ڈوبائے ہوئے ہیں	الَّذِيْ	جنھوں نے	خَيْرُ	بہترین ہیں
فَاِذَا	پس جب	نَجّٰىنَا	نجات بخشی ہمیں	الْمُنْزِلِيْنَ	اتارنے والوں میں
اسْتَوَيْتَ	درست ہو جائیں	مِنَ الْقَوْمِ	لوگوں سے	اِنَّ	بیشک
اَنْتَ	آپ	الظّٰلِمِيْنَ	ظلم کرنے والے	فِيْ ذٰلِكَ	اس میں
وَمَنْ	اور جو لوگ	وَقُلْ	اور کہیں	لَاٰيٰتٍ	یقیناً نشانیاں ہیں
مَّعَكَ	آپ کے ساتھ ہیں	رَّبِّ	اے میرے رب!	وَّاِنْ (۲)	اور بیشک
عَلَى الْفُلْكِ	کشتی پر	اَنْزِلْنِيْ	اتاریں آپ مجھے	كُنَّا	ہیں ہم
فَقُلِ	پس کہیں آپ	مُنْزَلًا	اتارنا	لَمُبْتَلِيْنَ (۳)	البتہ آزمائش کرنیوالے

گذشتہ آیات میں انسان کی تخلیق اور اس کی بقاء اور آسائش کے لئے مختلف قسم کے سامان پیدا کرنے کا ذکر تھا۔ اب یہاں سے دور تک اس کی روحانی ضرورت اور دینی تربیت کا جو انتظام فرمایا ہے اس کا ذکر ہے۔ ساتھ ہی لوگوں کی بے اعتنائی کا بیان بھی ہے اور اس کا خمیازہ بھگتنے کا بھی ـــــ اللہ تعالیٰ نے انسانیت کے آغاز کے ساتھ ہی نبوت وہدایت کا سلسلہ جاری فرمایا ہے۔ پہلے انسان ہی پہلے نبی ہیں۔ کیونکہ اللہ کی راہ نمائی کے بغیر انسان ایک قدم نہیں چل سکتا۔ عقل کے بوتے پر چلے گا تو قدم قدم پر ٹھوکریں کھائے گا۔ اسی لئے جب آدم علیہ السلام کو جنت سے اترنے کا حکم دیا تو ساتھ ہی یہ بھی حکم دیا کہ تمہارے زمین پر اترنے کے بعد میری ہدایت آئے گی۔ جو اس کی پیروی کرے گا وہ نہ گمراہ ہوگا نہ تکلیف میں پڑے گا، اور جو اللہ کی نصیحت سے اعراض کرے گا وہ تنگی کا جینا جیئے گا اور قیامت کے دن اندھا اٹھایا جائے گا (سورۃ طٰہٰ آیات ۱۲۳ و ۱۲۴) ـــــ آدم علیہ السلام کے بعد لوگ ایک زمانہ تک ہدایت پر قائم رہے، پھر ان میں گمراہی پھیلی تو اللہ تعالیٰ نے سب سے پہلے رسول حضرت نوح علیہ السلام کو مبعوث فرمایا۔ اِن آیات میں انہی کا واقعہ ذکر کیا گیا ہے۔ ارشاد ہے: ـــــ اور البتہ واقعہ یہ ہے کہ ہم نے نوح (علیہ السلام) کو ان کی قوم کی طرف بھیجا، پس انھوں نے کہا: ''اے میری قوم! تم اللہ کی عبادت کرو، تمہارے لئے ان کے سوا کوئی معبود نہیں، پس کیا تم ڈرتے نہیں!'' ـــــ

(۱) مُغْرَق: اسم مفعول۔ قرآن میں قطعیت کے بیان کے لئے جس طرح فعل ماضی استعمال کیا جاتا ہے اسم مفعول بھی استعمال کیا جاتا ہے۔ (۲) اِنْ: مخففہ ہے، ضمیر شان اس کا اسم محذوف ہے (۵) اِبْتَلَاء: آزمائش میں ڈال کر جان لینا۔

نوح علیہ السلام کی قوم نے اللہ کو چھوڑ کر دیوی دیوتاؤں کی پوجا شروع کردی تھی۔ وَدّ، سُواع، یَغوث، یَعوق اور نَسْر اُن کے خداؤں کے نام تھے۔ نوح علیہ السلام نے ان کو سمجھایا کہ یہ خدا ہرگز نہیں۔ خدا ایک اللہ تعالیٰ ہیں۔ پس انہی کی عبادت کرو، دوسروں کو خدائی میں شریک مت بناؤ۔ کیا تمہیں حقیقی خدا کو چھوڑ کر دوسرے خداؤں کی بندگی کرتے ہوئے ڈر نہیں لگتا؟ کیا تم شرک کے نتائج سے بے خوف ہو گئے ہو؟ ـــــ پس اُن رؤساء نے جنھوں نے ان کی قوم میں سے انکار کیا: کہا: ''یہ شخص بس تم ہی جیسا ایک انسان ہے'' ـــــ یعنی یہ نہ اوتار ہے نہ دیوتا۔ بس تم ہی جیسا ایک انسان ہے۔ وہ رسول کیسے ہوسکتا ہے؟ مشرک اقوام کی بنیادی گمراہی یہ بھی ہے کہ وہ سمجھتے ہیں کہ انسان کی ہدایت کے لئے جب بھی کوئی آئے گا تو وہ یا تو خود خدا ہوگا بہ شکلِ انسان، جس کو وہ ''اوتار'' کہتے ہیں، یا وہ کوئی فرشتہ ہوگا، جس کو وہ ''دیوتا'' کہتے ہیں اگر وہ مرد ہو، اور ''دیوی'' کہتے ہیں اگر وہ عورت ہو۔ اسلام نے اس بنیادی غلطی پر ضربِ کاری لگائی ہے۔ اور بار بار اعلان کیا ہے کہ رسول ہمیشہ بشر ہی مبعوث کئے جاتے ہیں۔ ان میں عام انسانوں سے بجز تائیدِ وحی کے اور کوئی زائد چیز نہیں ہوتی۔ أَشْهَدُ أَنَّ مُحَمَّدًا عَبْدُهُ وَرَسُوْلُهُ میں اسی حقیقت کا اعتراف ہے کہ حضرت محمد مصطفیٰ ﷺ اللہ کے بندے اور اس کے رسول ہیں۔ یہ بات اگرچہ موٹی معلوم ہوتی ہے، مگر مشرکوں اور شرک زدہ ذہن والوں کی سمجھ میں نہیں آتی ـــــ مشرکوں کے رؤساء نے دوسری بات یہ کہی کہ ـــــ ''وہ چاہتا ہے کہ تم پر برتری حاصل کرے'' ـــــ یعنی اس کی تحریک کا مقصد بڑا بننا ہے۔ اس کی دوڑ دھوپ کا حاصل اقتدار حاصل کرنا ہے۔ یہی بات فرعون نے حضرت موسیٰ اور حضرت ہارون علیہما السلام سے کہی تھی کہ تم دونوں کا مقصد سرزمین مصر میں بڑائی حاصل کرنا ہے (یونس آیت ۷۸) اور یہی شبہ قریش کو نبی ﷺ کے بارے میں تھا۔ انھوں نے کئی مرتبہ آپ ﷺ سے سودا کرنا چاہا تھا کہ آپ بتوں کی برائی چھوڑ دیں، ہم آپ کو بادشاہ بنائے لیتے ہیں۔ لیڈروں کی سمجھ میں یہ بات کبھی نہیں آتی کہ کوئی شخص محض لوجہ اللہ قوم کی اصلاح کی کوشش کرسکتا ہے ـــــ ''اور اگر اللہ تعالیٰ چاہتے تو وہ فرشتوں کو اتارتے، ہم نے یہ بات اگلے باپ دادوں سے نہیں سنی'' ـــــ ''یہ بات'' یعنی معبود بس ایک ہی ہے۔ یہ بات ہم نے اپنے بڑوں سے نہیں سنی۔ ہمارے باپ دادا ہمیشہ دیوی دیوتاؤں کو مانتے چلے آئے ہیں۔ اب یہ شخص کیسی انوکھی بات کہتا ہے؟! اور اگر واقعی ہمارا اعتقاد غلط ہے اور خدا کو ہماری اصلاح و ہدایت منظور ہے تو اس غرض کے لئے کوئی فرشتہ اتارا جاتا۔ اللہ تعالیٰ کے ہاں کرّوبیوں کی کمی نہیں۔ انسان کا رسول ہونا ہماری سمجھ سے بالاتر ہے ـــــ ''وہ شخص بس ایک ایسا آدمی ہے جسے جنون لاحق ہو گیا ہے، پس اس کے بارے میں ایک خاص وقت تک انتظار کرو'' ـــــ یہ ایک نیا شوشہ چھوڑا۔ کہنے لگے: معلوم ہوتا ہے: اس غریب کا دماغ چل گیا ہے جو ساری قوم کے خلاف اور باپ دادوں کے خلاف ایسی بات زبان

سے نکالتا ہے۔ بہتر ہے چند روز صبر کرو اور انتظار کرو، ایک وقت کے بعد یہ خود ہی ختم ہو جائے گا۔ اور اس کا سارا شور ہنگامہ فرو ہو جائے گا۔

نوح (علیہ السلام) نے عرض کیا: ''اے میرے پروردگار! میری مدد فرما، مجھ کو جھٹلانے کی وجہ سے! ـــــ جب نوح علیہ السلام کی ساری کوششیں بیکار ثابت ہوئیں۔ ساڑھے نو سو برس سختیاں جھیل کر بھی ان کو راہِ راست پر لانے میں کامیاب نہ ہوئے۔ تو دعاء کے لئے ہاتھ اٹھائے اور عرض کیا: خدایا! ان اشقیاء کے مقابلہ میں میری مدد فرما! اب یہ بدبخت تکذیب سے باز آنے والے نہیں، اب ان کے وجود سے عدم بہتر ہے ـــــ پس ہم نے ان کے پاس وحی بھیجی کہ ہماری نگرانی میں اور ہمارے حکم کے مطابق کشتی تیار کرو ـــــ چونکہ کشتی کی صنعت پہلے سے موجود نہیں تھی، انسان کے ہاتھوں بننے والی یہ پہلی کشتی تھی، اس لئے وحی کی راہ نمائی ضروری تھی ـــــ پس جب ہمارا (عذاب کا) حکم آ پہنچے، اور تندور اُبل پڑے تو آپ کشتی میں ہر قسم میں سے جوڑا یعنی دو عدد داخل کیجئے اور اپنے گھر والوں کو (بھی) سوائے ان لوگوں کے جن کے متعلق پہلے سے بات طے ہو چکی ہے ـــــ یعنی عذاب کا فیصلہ ہو چکا ہے پس کافروں کو خواہ وہ آپ کے کنبے ہی کے کیوں نہ ہوں، کشتی میں سوار نہ کریں ـــــ طوفانِ نوح کے لئے ایک خاص تندور کے اُبلنے کو علامت مقرر کیا گیا تھا۔ جب یہ علامت پائی جائے تو نوح علیہ السلام کو حکم تھا کہ فوراً مؤمنین کے ساتھ کشتی میں سوار ہو جائیں۔ اور جن جانوروں کی ضرورت ہے اور ان کی نسل باقی رکھنی مقصود ہے ان میں سے ایک ایک جوڑا یعنی نر اور مادہ ساتھ رکھ لیں ـــــ اور مجھ سے ظالم لوگوں کے بارے میں کچھ نہ کہیں، وہ یقیناً ڈوبنے والے ہیں ـــــ یعنی کافروں میں سے کسی کی نجات کے لئے ہم سے سفارش نہ کریں، ان کی ہلاکت کا قطعی فیصلہ ہو چکا ہے ـــــ نبی امت کے حق میں باپ سے زیادہ شفیق و مہربان ہوتا ہے، اس لئے احتمال تھا کہ عذاب شروع ہونے پر نوح علیہ السلام کسی کے لئے سفارش کریں اس لئے پہلے ہی تنبیہ کر دی ـــــ پس جب آپ اور آپ کے ساتھی کشتی پر اچھی طرح بیٹھ جائیں تو کہیں: ''تمام تعریفیں اس اللہ کے لئے ہیں جس نے ہمیں ظالم لوگوں سے نجات بخشی!'' ـــــ یعنی ہم کو ان سے علحدہ کر لیا۔ ان کے ظلم و ستم سے ہمارا پیچھا چھڑایا۔ ہم کو محفوظ رکھا اور ان کو کیفرِ کردار تک پہنچایا۔ اس پر ہم خدائے پاک کے ممنون ہیں ـــــ اور آپ کہیں: ''اے میرے پروردگار! آپ مجھے برکت والا اتارنا اتاریں، اور آپ بہترین اتارنے والے ہیں'' ـــــ یعنی ہم جب تک کشتی میں رہیں آرام سے رہیں، اور جہاں اتارے جائیں وہاں بھی کوئی تکلیف نہ ہو، ہر طرح اور ہر جگہ آپ کی رحمت و برکت شاملِ حال رہے ـــــ بیشک اس (واقعہ) میں یقیناً نشانیاں ہیں ـــــ حق تعالیٰ کی قدرت و حکمت کی۔ وہ لوگوں کی ہدایت کے لئے رسول بھیجتے ہیں۔ جو لوگ

دعوت قبول کرتے ہیں شاد کام ہوتے ہیں۔اور جو دعوت کو ٹھکراتے ہیں تباہ کئے جاتے ہیں۔آج بھی وہی صورتِ حال مکہ میں درپیش ہے۔یہ لوگ نوح علیہ السلام کی قوم کا انجام دیکھ لیں۔اور سوچ لیں! اللہ کی سنت بدلتی نہیں۔اگر یہ بھی نہ سنبھلے تو ان کا بھی یہی انجام ہوگا ـــــ اور ہم یقیناً آزمانے والے ہیں ـــــ یعنی اللہ تعالیٰ بندوں کی آزمائش ضرور کرتے ہیں، اگرچہ وہ ہر چیز کو بخوبی جانتے ہیں، مگر وہ اپنے علم کے مطابق فیصلہ نہیں کرتے۔اگر ایسا کرتے تو لوگوں کے لئے عذر کا موقع ہوتا کہ خدایا! آپ ہمیں آزماتے، اور دیکھتے ہم کیسے اچھے اعمال کرتے ہیں۔

ثُمَّ أَنْشَأْنَا مِنْ بَعْدِهِمْ قَرْنًا آخَرِينَ ﴿٣١﴾ فَأَرْسَلْنَا فِيهِمْ رَسُولًا مِنْهُمْ أَنِ اعْبُدُوا اللَّهَ مَا لَكُمْ مِنْ إِلَٰهٍ غَيْرُهُ ۖ أَفَلَا تَتَّقُونَ ﴿٣٢﴾ وَقَالَ الْمَلَأُ مِنْ قَوْمِهِ الَّذِينَ كَفَرُوا وَكَذَّبُوا بِلِقَاءِ الْآخِرَةِ وَأَتْرَفْنَاهُمْ فِي الْحَيَاةِ الدُّنْيَا مَا هَٰذَا إِلَّا بَشَرٌ مِثْلُكُمْ يَأْكُلُ مِمَّا تَأْكُلُونَ مِنْهُ وَيَشْرَبُ مِمَّا تَشْرَبُونَ ﴿٣٣﴾ وَلَئِنْ أَطَعْتُمْ بَشَرًا مِثْلَكُمْ إِنَّكُمْ إِذًا لَخَاسِرُونَ ﴿٣٤﴾ أَيَعِدُكُمْ أَنَّكُمْ إِذَا مِتُّمْ وَكُنْتُمْ تُرَابًا وَعِظَامًا أَنَّكُمْ مُخْرَجُونَ ﴿٣٥﴾ هَيْهَاتَ هَيْهَاتَ لِمَا تُوعَدُونَ ﴿٣٦﴾ إِنْ هِيَ إِلَّا حَيَاتُنَا الدُّنْيَا نَمُوتُ وَنَحْيَا وَمَا نَحْنُ بِمَبْعُوثِينَ ﴿٣٧﴾ إِنْ هُوَ إِلَّا رَجُلٌ افْتَرَىٰ عَلَى اللَّهِ كَذِبًا وَمَا نَحْنُ لَهُ بِمُؤْمِنِينَ ﴿٣٨﴾ قَالَ رَبِّ انْصُرْنِي بِمَا كَذَّبُونِ ﴿٣٩﴾ قَالَ عَمَّا قَلِيلٍ لَيُصْبِحُنَّ نَادِمِينَ ﴿٤٠﴾ فَأَخَذَتْهُمُ الصَّيْحَةُ بِالْحَقِّ فَجَعَلْنَاهُمْ غُثَاءً ۚ فَبُعْدًا لِلْقَوْمِ الظَّالِمِينَ ﴿٤١﴾

ثُمَّ	پھر	فَأَرْسَلْنَا	پس بھیجا ہم نے	اعْبُدُوا	عبادت کرو تم
أَنْشَأْنَا	پیدا کئے ہم نے	فِيهِمْ	ان میں	اللَّهَ	اللہ تعالیٰ کی
مِنْ بَعْدِهِمْ	ان کے بعد	رَسُولًا	ایک پیغمبر	مَا لَكُمْ	نہیں ہے تمہارے لئے
قَرْنًا (۱)	لوگ	مِنْهُمْ	ان میں سے	مِنْ إِلَٰهٍ	کوئی معبود
آخَرِينَ	دوسرے	أَنِ (۲)	کہ	غَيْرُهُ	ان کے علاوہ

(۱) قَرْن: ایک زمانہ کے لوگ، ج: قُرُوْن۔(۲) أنْ: مفسِّرہ۔

اَفَلَا تَتَّقُوْنَ	کیا پس تم ڈرتے نہیں	وَيَشْرَبُ	اور پیتا ہے	لِمَا [3]	وہ بات جس کا
وَقَالَ	اور کہا	مِمَّا	اس سے جو	تُوْعَدُوْنَ	تم وعدہ کئے جاتے ہو
الْمَلَاُ	رئیسوں نے	تَشْرَبُوْنَ	پیتے ہو تم	اِنْ	نہیں ہے
مِنْ قَوْمِهٖ	ان کی قوم سے	وَلَئِنْ	اور بخدا اگر	هِيَ	وہ (زندگی)
الَّذِيْنَ	جنھوں نے	اَطَعْتُمْ	کہا مانا تم نے	اِلَّا	مگر
كَفَرُوْا	انکار کیا	بَشَرًا	ایک انسان کا	حَيَاتُنَا	ہماری زندگی
وَكَذَّبُوْا	اور جھٹلایا	مِّثْلَكُمْ	اپنے جیسے	الدُّنْيَا	دنیا کی
بِلِقَآءِ	ملاقات کو	اِنَّكُمْ	بیشک تم	نَمُوْتُ	مرتے ہیں ہم
الْاٰخِرَةِ	آخرت کی	اِذًا	تب تو	وَنَحْيَا	اور زندہ ہوتے ہیں ہم
وَاَتْرَفْنٰهُمْ [1]	اور عیش دیا ہم نے ان کو	لَّخٰسِرُوْنَ	البتہ گھاٹا پانے والے ہو	وَمَا	اور نہیں ہیں
فِي الْحَيٰوةِ	زندگی میں	اَيَعِدُكُمْ	کیا وعدہ کرتا ہے تم سے	نَحْنُ	ہم
الدُّنْيَا	دنیا کی	اَنَّكُمْ	کہ تم	بِمَبْعُوْثِيْنَ	دوبارہ زندہ کئے جانیوالے
مَا	نہیں ہے	اِذَا	جب	اِنْ	نہیں ہے
هٰذَآ	یہ شخص	مِتُّمْ	مر گئے	هُوَ	وہ شخص
اِلَّا	مگر	وَكُنْتُمْ	اور ہو گئے	اِلَّا	مگر
بَشَرٌ	ایک انسان	تُرَابًا	مٹی	رَجُلُ	ایک آدمی
مِّثْلُكُمْ	تم جیسا	وَّعِظَامًا	اور ہڈیاں	افْتَرٰى	باندھا اس نے
يَاْكُلُ	کھاتا ہے	اَنَّكُمْ	کہ تم	عَلَى اللّٰهِ	اللہ تعالیٰ پر
مِمَّا	اس سے جو	مُّخْرَجُوْنَ	نکالے جاؤ گے	كَذِبًا	جھوٹ
تَاْكُلُوْنَ	کھاتے ہو تم	هَيْهَاتَ [2]	دور ہے	وَّمَا	اور نہیں ہیں
مِنْهُ	اس سے	هَيْهَاتَ [2]	ناممکن ہے	نَحْنُ	ہم

(۱) اَتْرَفَ اِتْرَافًا: عیش وآرام دینا، ناز ونعمت میں پرورش کرنا۔ (۲) هَيْهَاتَ: اسم فعل ہے بمعنی بَعُدَ، عام طور پر مکرر آتا ہے۔
(۳) لِمَا: میں لام زائدہ ہے۔

لَهٗ	اس کی بات کا	قَالَ	فرمایا	بِالْحَقِّ	برحق بات کے ساتھ
بِمُؤْمِنِيْنَ	یقین کرنے والے	عَمَّا قَلِيْلٍ[۲]	تھوڑی دیر بعد	فَجَعَلْنٰهُمْ	پس بنادیا ہم نے ان کو
قَالَ	کہا اس نے	لَيُصْبِحُنَّ	البتہ ہونگے وہ	غُثَآءً[۳]	کوڑا کرکٹ
رَبِّ	اے میرے رب	نٰدِمِيْنَ	پچھتانے والے	فَبُعْدًا[۴]	پس خدا کی مار
انْصُرْنِيْ	مدد فرما میری	فَاَخَذَتْهُمُ	پس پکڑ لیا ان کو	لِّلْقَوْمِ	لوگوں پر
بِمَا كَذَّبُوْنِ[۱]	مجھ کو جھٹلانے کی وجہ سے	الصَّيْحَةُ	سخت آواز نے	الظّٰلِمِيْنَ	ظلم کرنے والے

گذشتہ آیات میں حضرت نوح علیہ السلام کا واقعہ ذکر کیا تھا۔اب دوسرے پیغمبروں اوران کی امتوں کا کچھ حال بغیر نام لئے ذکر کیا جاتا ہے۔ یہ واقعہ قوم عاد کا بھی ہوسکتا ہے اور ثمود کا بھی۔ عاد کی طرف حضرت ہود علیہ السلام مبعوث کئے گئے تھے اور ثمود کی طرف حضرت صالح علیہ السلام۔ یہ قوم سخت آواز کے ذریعہ ہلاک کی گئی تھی۔اس سے بعض مفسرین نے قوم ثمود کو متعین کیا ہے۔ کیونکہ سورۃ ہود (آیت ۶۷) میں ثمود کا ہولناک آواز سے ہلاک ہونا مصرح ہے۔مگر صَیْحَة سے مطلق عذاب بھی مراد لیا جاسکتا ہے۔اس صورت میں ان آیات کا تعلق قوم عاد سے بھی ہوسکتا ہے —— پھر ہم نے ان کے بعد (یعنی نوح علیہ السلام کی قوم کے بعد) ایک دوسری امت پیدا کی۔ پس ہم نے ان میں انہیں میں سے ایک رسول بھیجا (جس نے ان سے کہا) کہ اللہ کی عبادت کرو، تمہارے لئے اس کے سوا کوئی معبود نہیں، پس کیا تم ڈرتے نہیں —— تمام انبیاء علیہم السلام کی دعوت ایک ہے۔اور وہ توحید کی دعوت ہے۔ کیونکہ سب انبیاء ایک ہی دربار سے بھیجے گئے ہیں —— اور ان کی قوم کے اُن رؤساء نے جنھوں نے انکار کیا، اور آخرت سے ملنے کو جھٹلایا، اور ہم نے ان کو دنیا کی زندگی میں عیش دیا: کہا: ”یہ شخص بس تم ہی جیسا ایک انسان ہے، وہی کھاتا ہے جو تم کھاتے ہو، اور وہی پیتا ہے جو تم پیتے ہو“ —— انبیاء کو جواب بھی سب قوموں نے تقریباً ایک ہی دیا ہے۔سب نے یہی کہا کہ مادی حیثیت سے ہم اور نبی یکساں ہیں۔ طبعی حاجتوں کے لحاظ سے بھی ہم میں اور اس میں کوئی فرق نہیں۔ وہ ہماری ہی طرح کھاتا پیتا، چلتا پھرتا، سوتا جاگتا اور دوسری حاجتیں رکھتا ہے۔ پھر ہم کس طرح اس کو نبی مان لیں؟ نبی تو خدا کا اوتار یا فرشتہ ہوتا ہے۔اور جو اوتار یا فرشتہ ہو اس کے احوال ہم انسانوں کے احوال سے مختلف ہونے چاہئیں۔ وہ عجیب وغریب کرشمے دکھائے، ہوا پر اڑے،

(۱) بما کذبونِ: ما: مصدریہ اور آخر میں ی محذوف ہے۔(۲) عما قلیل: میں ما زائدہ ہے أی عن قلیل۔(۳) غُثَاء: خس وخاشاک، وہ پتے تنکے اور جھاگ وغیرہ جو سیلاب کے ساتھ بہہ کر آتے ہیں۔(۴) بُعْدًا له: وہ ہلاک ہو، اس پر خدا کی مار پڑے۔ بددعا کے لئے ہے۔ بُعْد: مصدر: قُرْب کی ضد۔لام: مدعو علیہ پر آتا ہے۔

آسمان پر چڑھے، اور بھوک پیاس وغیرہ حاجات نہ رکھتا ہوتو ہم اس کو نبی مان لیں ـــــ منکرین کی اس قسم کی ذہنیت کے پیچھے درحقیقت تین باتیں ہوتی ہیں: ایک: تکذیب وانکار۔ جب کوئی شخص ٹھان لیتا ہے کہ اُسے بات نہیں ماننی تو وہ کوئی نہ کوئی میں میکھ نکالتا ہے۔ دوسری: عقیدۂ آخرت کا انکار۔ جو شخص دوسری زندگی پر یقین نہیں رکھتا اس کی سمجھ میں انبیاء کی باتیں نہیں آتیں، کیونکہ ان کی باتیں آخرت کے عقیدہ پر مبنی ہوتی ہیں۔ تیسری: خوش حالی کا غرور۔ خوش عیش لوگ ہمیشہ اس زعم میں مبتلا رہتے ہیں کہ وہی برحق ہیں۔ اگر وہ غلط ہوتے تو نعمتوں سے کیوں نوازے جاتے؟ حالانکہ ان کی نعمتیں ان کے لئے آزمائش ہیں۔ یہی تین باتیں الملأ کے تین وصف لاکر بیان کی گئی ہیں۔

عقیدۂ آخرت کا انکار: ـــــ اور بخدا! اگر تم اپنے ہی جیسے ایک انسان کا کہنا مانو گے: تب تو تم یقیناً گھاٹے میں رہو گے ـــــ یعنی اگر تم نے آخرت کی بات مان لی تو تمہاری دنیا خراب ہوجائے گی۔ پھر تم دنیا کے لئے کچھ نہ کرسکو گے۔ تمہارا سارا کاروبار ٹھپ پڑ جائے گا اور تم مادّی مضرت میں مبتلا ہوجاؤ گے ـــــ کیا وہ تم سے وعدہ کرتا ہے کہ جب تم مرجاؤ گے اور مٹی اور ہڈیاں ہوجاؤ گے تو تم پھر سے نکالے جاؤ گے؟! ـــــ یعنی دیکھو! وہ کتنی نامعقول بات کہتا ہے۔ یہی وہ بات ہے جس کے قبول کرنے والوں کو وہ گھاٹے میں جانے والا کہہ رہے تھے ـــــ بہت دور! بالکل ناممکن بات ہے جو تم سے کہی جارہی ہے ـــــ یعنی کس قدر بعید از عقل بات وہ شخص کہتا ہے۔ بھلا جب جسم مٹی ہوگیا، اور ہڈیاں بوسیدہ ہوگئیں تو دوسری زندگی کیسی؟ ـــــ زندگی تو بس ہماری یہی دنیوی زندگی ہے، ہم مرتے ہیں اور جیتے ہیں، اور ہم دوبارہ اٹھائے جانے والے نہیں ـــــ یعنی دنیا کی یہ زندگی ہی پہلی اور آخری زندگی ہے۔ اس کے بعد کوئی زندگی آنے والی نہیں۔ اور دنیا کا یہ سلسلہ یونہی چلتا رہتا ہے۔ ایک مرتا ہے تو دوسرا اس کی جگہ لے لیتا ہے۔ آگے اللہ اللہ خیر سلا ـــــ یہ شخص بس ایک ایسا آدمی ہے جس نے اللہ تعالیٰ پر جھوٹ گھڑا ہے اور ہم اس کی بات ماننے والے نہیں! ـــــ یعنی ہم نہ اس کی پیغمبری کا دعوی مانیں نہ اس کی آخرت کی خبر! یہ دونوں باتیں جھوٹی اس نے اللہ کے نام لگائی ہیں۔

منکرین کا انجام: ـــــ پیغمبر نے عرض کیا: ''اے میرے پروردگار! میری تکذیب کرنے کی وجہ سے میری مدد فرما!'' ـــــ انبیاء علیہم السلام جب دیکھتے ہیں کہ ان کے پیامِ حق کی برابر تکذیب ہورہی ہے تو وہ نصرتِ الٰہی کے عملی ظہور کے لئے دعا کرتے ہیں۔ ڈاکٹر اور تیماردار ایک عرصہ تک سڑے ہوئے عضو کی مرہم پٹی کرتے ہیں، پھر جب دیکھتے ہیں کہ اس کا کچھ فائدہ نہیں بلکہ ضرر متوقع ہے تو اس کو کٹوا دیتے ہیں ـــــ اللہ نے فرمایا: ''ابھی جلد ہی یہ لوگ پشیمان ہوکر رہ جائیں گے!'' ـــــ یعنی عذاب آیا چاہتا ہے، جس کے بعد وہ کفِ افسوس ملیں گے اور وہ پچھتانا کچھ مفید نہ ہوگا ـــــ پس ان کو ایک سخت آواز نے عذاب کے ساتھ پکڑ لیا ـــــ حق: سے یہاں مراد عذاب ہے، کیونکہ وہ

برحق یعنی قطعی ہے ـــــ پس ہم نے ان کو کوڑا کرکٹ بنادیا ـــــ غُثَاء: وہ کوڑا کرکٹ ہے جو سیلاب کے ساتھ بہتا ہوا آتا ہے، پھر کناروں پر لگ جاتا ہے اور پڑا سڑتا رہتا ہے۔ ان لوگوں کا بھی یہی حال ہو کر رہ گیا ـــــ پس خدا کی مار ظالم لوگوں پر! ـــــ یعنی وہ خدائے پاک کی رحمت سے دور ہوئے۔ اور آخرت میں بھی جہنم کا ایندھن بنے۔

ثُمَّ اَنْشَاْنَا مِنْ بَعْدِهِمْ قُرُوْنًا اٰخَرِيْنَ ﴿۴۲﴾ مَا تَسْبِقُ مِنْ اُمَّةٍ اَجَلَهَا وَمَا يَسْتَاْخِرُوْنَ ﴿۴۳﴾ ثُمَّ اَرْسَلْنَا رُسُلَنَا تَتْرَا ؕ كُلَّمَا جَآءَ اُمَّةً رَّسُوْلُهَا كَذَّبُوْهُ فَاَتْبَعْنَا بَعْضَهُمْ بَعْضًا وَّجَعَلْنٰهُمْ اَحَادِيْثَ ۚ فَبُعْدًا لِّقَوْمٍ لَّا يُؤْمِنُوْنَ ﴿۴۴﴾ ثُمَّ اَرْسَلْنَا مُوْسٰى وَاَخَاهُ هٰرُوْنَ ۙ بِاٰيٰتِنَا وَسُلْطٰنٍ مُّبِيْنٍ ﴿۴۵﴾ اِلٰى فِرْعَوْنَ وَمَلَا۟ئِهٖ فَاسْتَكْبَرُوْا وَكَانُوْا قَوْمًا عَالِيْنَ ﴿۴۶﴾ فَقَالُوْٓا اَنُؤْمِنُ لِبَشَرَيْنِ مِثْلِنَا وَقَوْمُهُمَا لَنَا عٰبِدُوْنَ ﴿۴۷﴾ فَكَذَّبُوْهُمَا فَكَانُوْا مِنَ الْمُهْلَكِيْنَ ﴿۴۸﴾ وَلَقَدْ اٰتَيْنَا مُوْسَى الْكِتٰبَ لَعَلَّهُمْ يَهْتَدُوْنَ ﴿۴۹﴾ وَجَعَلْنَا ابْنَ مَرْيَمَ وَاُمَّهٗٓ اٰيَةً وَّاٰوَيْنٰهُمَآ اِلٰى رَبْوَةٍ ذَاتِ قَرَارٍ وَّمَعِيْنٍ ﴿۵۰﴾ ع

ثُمَّ	پھر	وَمَا	اور نہیں	رَّسُوْلُهَا	اس کا رسول
اَنْشَاْنَا	پیدا کیا ہم نے	يَسْتَاْخِرُوْنَ	پیچھے رہتی	كَذَّبُوْهُ	(تو) جھٹلایا انھوں نے
مِنْ بَعْدِهِمْ	ان کے بعد	ثُمَّ	پھر		اس کو
قُرُوْنًا	امتوں کو	اَرْسَلْنَا	بھیجا ہم نے	فَاَتْبَعْنَا	پس پیچھے کیا ہم نے
اٰخَرِيْنَ	دوسری	رُسُلَنَا	ہمارے رسولوں کو	بَعْضَهُمْ	ان کے بعض کو
مَا	نہیں	تَتْرَا (۲)	پے درپے	بَعْضًا	بعض کے
تَسْبِقُ	آگے بڑھتی	كُلَّمَا	جب بھی	وَّجَعَلْنٰهُمْ	اور بنادیا ہم نے ان کو
مِنْ اُمَّةٍ (۱)	کوئی امت	جَآءَ	آیا	اَحَادِيْثَ (۴)	کہانیاں
اَجَلَهَا	اپنی مقررہ مدت سے	اُمَّةً (۳)	کسی امت کے پاس	فَبُعْدًا	پس خدا کی مار

(۱) من أمة: تسبق کا فاعل ہے اور مِن زائدہ ہے، نفی کے استغراق کی تاکید کے لئے آیا ہے (۲) تَتْرىٰ اور تَتْرًا: لگاتار، پے درپے، مسلسل، ان کی اصل وَتْرىٰ اور وَتْرًا ہے۔ آخر میں الف تانیث کا ہے یا تنوین کا بدل ہے۔ (۳) اُمَّةً: مفعول مقدم ←

لِقَوۡمٍ	ان لوگوں پر	وَكَانُوۡا	اور تھے وہ	اٰتَيۡنَا	دی ہم نے
لَّا يُؤۡمِنُوۡنَ	جو ایمان نہیں لاتے	قَوۡمًا عَالِيۡنَ	متکبر لوگ	مُوۡسَى	موسیٰ کو
ثُمَّ	پھر	فَقَالُوۡٓا	پس کہا انھوں نے	الۡكِتٰبَ	کتاب (تورات)
اَرۡسَلۡنَا	بھیجا ہم نے	اَنُؤۡمِنُ	کیا ایمان لاویں ہم	لَعَلَّهُمۡ	تاکہ وہ
مُوۡسٰى	موسیٰ کو	لِبَشَرَيۡنِ	دو انسانوں پر	يَهۡتَدُوۡنَ	راہ پائیں
وَاَخَاهُ	اور ان کے بھائی	مِثۡلِنَا	جو ہمارے جیسے ہیں	وَجَعَلۡنَا	اور بنایا ہم نے
هٰرُوۡنَ	ہارون کو	وَقَوۡمُهُمَا	اور ان دونوں کی قوم	ابۡنَ مَرۡيَمَ	مریم کے لڑکے کو
بِاٰيٰتِنَا	ہماری نشانیوں کیساتھ	لَنَا (۱)	ہماری	وَاُمَّهٗٓ	اور اس کی ماں کو
وَسُلۡطٰنٍ	اور دلیل کے ساتھ	عٰبِدُوۡنَ	غلام ہے	اٰيَةً (۲)	بڑی نشانی
مُّبِيۡنٍ	واضح	فَكَذَّبُوۡهُمَا	پس جھٹلایا انھوں نے دونوں کو	وَّاٰوَيۡنٰهُمَآ (۳)	اور ٹھکانا دیا ہم نے
اِلٰى فِرۡعَوۡنَ	فرعون کی طرف	فَكَانُوۡا	پس تھے وہ		دونوں کو
وَمَلَا۟ئِهٖ	اور اس کے درباریوں	مِنَ	تباہ ہونے والوں میں	اِلٰى رَبۡوَةٍ (۴)	ایک بلند جگہ میں
	کی طرف	الۡمُهۡلَكِيۡنَ	سے	ذَاتِ قَرَارٍ	جو ٹھہرنے کے قابل
فَاسۡتَكۡبَرُوۡا	پس تکبر کیا انھوں نے	وَلَقَدۡ	اور البتہ تحقیق	وَّمَعِيۡنٍ (۵)	اور چشمہ دار تھی

عاد وثمود کے بعد رسالتوں اور ہلاکتوں کا سلسلہ قائم ہوگیا۔ لگاتار انبیاء مبعوث ہوتے رہے اور قومیں تکذیب کرتی رہیں اور ہلاک ہوتی رہیں۔ ارشاد ہے: ——— پھر ہم نے ان کے بعد (یعنی عاد یا ثمود کے بعد) دوسری امتیں پیدا کیں ——— جیسے قوم لوط اور قوم شعیب وغیرہ۔ یہ سب امتیں بھی تکذیب انبیاء علیہم السلام کی پاداش میں اپنے اپنے وقت پر ہلاک ہوتی رہیں ——— کوئی امت اپنے مقررہ وقت سے نہ تو آگے بڑھتی ہے اور نہ پیچھے رہتی ہے ——— یعنی ہر امت ٹھیک اپنے وقت پر ہلاک ہوئی۔ نہ اپنی میعاد سے ایک منٹ پہلے پکڑی گئی، نہ اس کو ایک منٹ کی مہلت

← ہے۔ (۴) أحاديث: أُحْدُوْثَة کی جمع ہے۔ جیسے: اَعَاجِيْب: أُعْجُوْبَة کی جمع ہے: کہانیاں، دل لگی کی باتیں۔

(۱) لنا: عابدون سے متعلق ہے۔ (۲) آيةً: مفعول ثانی ہے۔ (۳) آوىٰ إِيْوَاءً: پناہ دینا، اپنے پاس ٹھہرانا، آوَيْنَا: فعل ماضی، صیغہ جمع متکلم، مجرد: أَوَى المكانَ وإليه أُوِيًّا: پناہ لینا، قیام کرنا (۴) رَبْوَة: ٹیلہ، بلند جگہ۔ رَبَا الشيئُ (ن) رَبْوًا ورُبُوًّا: بڑھنا، اضافہ ہونا۔ (۵) مَعِيْن: آب جاری جو دکھائی دے۔

ملی ـــــ پھر ہم نے لگا تار اپنے رسولوں کو بھیجا ـــــ یعنی رسولوں کا تار باندھ دیا۔ یکے بعد دیگرے رسول مبعوث ہوتے رہے ـــــ جب بھی کسی امت کے پاس اس کا رسول آیا تو انھوں نے اس کو جھٹلایا ـــــ یعنی رسولوں کی بعثت کے ساتھ لوگوں کی تکذیب کا سلسلہ بھی جاری رہا ـــــ پس ہم نے ایک کے پیچھے ایک کو لگا دیا ـــــ یعنی ہلاکتوں کا سلسلہ بھی چلتا رہا ـــــ اور ہم نے ان کو کہانیاں بنادیا ـــــ یعنی ان کا نام ونشان مٹ گیا، بس افسانے رہ گئے ـــــ سو خدا کی مار ان لوگوں پر جو ایمان نہیں لاتے! ـــــ یعنی وہ اللہ کی رحمت سے دور کردیئے گئے ـــــ پھر ہم نے موسیٰ اور ان کے بھائی ہارون (علیہما السلام) کو ہماری نشانیوں اور واضح دلیل کے ساتھ فرعون اور اس کے درباریوں کی طرف بھیجا ـــــ نشانیاں اور واضح دلیل ایک چیز ہیں۔ عصائے موسیٰ اور یدِ بیضاء: موسیٰ علیہ السلام کی نشانیاں بھی ہیں اور دلیلِ نبوت بھی ـــــ پس ان لوگوں نے تکبر کیا ـــــ اور موسیٰ علیہ السلام کی دعوت کو قبول نہ کیا ـــــ اور وہ بڑے گھمنڈی لوگ تھے ـــــ یعنی ان کا تکبر وقتی نہیں تھا، گھٹی میں پڑا ہوا تھا ـــــ چنانچہ انھوں نے کہا: ''کیا ہم اپنے ہی جیسے دو انسانوں پر ایمان لے آئیں، حالانکہ ان کی قوم ہمارے زیرِ حکم ہے؟!'' ـــــ فرعونی: بنی اسرائیل سے بیگار لیتے تھے اور ان کو غلام بنائے ہوئے تھے۔ یعنی ایک تو یہ دونوں ہمارے ہی جیسے انسان ہیں، فوق البشر ہستیاں نہیں، پھر بشر بھی ایسے حقیر کہ ان کی قوم ہماری محکوم وغلام ہے۔ بھلا ایسے شخصوں کی بات ہم کیسے مان لیں؟ اس میں تو ہماری ہیٹی ہے! ـــــ حکمران فرعون تھا۔ ساری قوم نہیں تھی۔ مگر نفسیاتی بات یہ ہے کہ حکمران قوم کا ایک ایک فرد اپنے کو حاکم سمجھتا ہے۔ پھر یہاں تو فرعون کے درباریوں کا ذکر ہے، وہ تو کسی درجہ میں حاکم تھے ہی، اور اپنی محکوم رعایا کے ایک ایک فرد کو ذلت وحقارت کی نظر سے دیکھتے تھے ـــــ پس ان لوگوں نے ان دونوں کی تکذیب کی، پس وہ تباہ ہونے والوں میں سے ہوگئے ـــــ یعنی وہ بھی اپنی پیش رَو امتوں کی طرح صفحۂ ہستی سے مٹادیئے گئے ـــــ یہاں وہ سلسلۂ کلام پورا ہوا جو نوح علیہ السلام کی قوم کے تذکرہ سے شروع ہوا تھا۔ اس تذکرہ کا مقصد یہ ہے کہ سب ہی قوموں کے لئے اللہ تعالیٰ نے ہدایت کا سامان کیا۔ کیونکہ وہ انسانوں کے پروردگار ہیں۔ پس جس طرح انھوں نے انسان کی جسمانی ضرورتوں کا انتظام کیا، اس کی روحانی ضرورت یعنی ہدایت کا بھی سامان کیا۔ مگر برا ہو لوگوں کا کسی نے سن کر ہی نہ دیا۔ سب نے رسولوں کی تکذیب کی، اور اس کی سزا پائی۔ پس قصور لوگوں کا ہے، اللہ تعالیٰ کی طرف سے کوئی کمی نہ رہی۔

عہدِ بنی اسرائیل کی ابتداء وانتہا: بنی اسرائیل کا عہد موسیٰ علیہ السلام سے شروع ہوتا ہے۔ آپ کے بعد بہت سے انبیاء مبعوث ہوئے۔ کہتے ہیں کہ ایک لاکھ انبیاء صرف بنی اسرائیل میں مبعوث ہوئے ہیں واللہ اعلم۔ یہ عہد حضرت

عیسیٰ علیہ السلام پر تمام ہوگیا۔ آپ خاتمِ انبیائے بنی اسرائیل ہیں۔ اس کے بعد تمام سلسلوں کے خاتم کا عہد شروع ہوا۔ ارشاد ہے: —— اور البتہ واقعہ یہ ہے کہ ہم نے موسیٰ کو کتاب (تورات) عطا فرمائی تا کہ وہ راہ پائیں —— یعنی فرعون کی ہلاکت کے بعد حضرت موسیٰ علیہ السلام کو بنی اسرائیل کی ہدایت کے لئے تورات شریف عنایت فرمائی گئی۔ یہاں سے بنی اسرائیل کا عہد شروع ہوا۔ بعد کے انبیائے بنی اسرائیل تورات ہی کی تبلیغ کرتے تھے۔ اگرچہ بعض انبیاء کو کتابیں بھی دی گئیں، جیسے داؤد علیہ السلام کو زبور اور عیسیٰ علیہ السلام کو انجیل عطا فرمائی گئی، مگر ان کی حیثیت ضمنی کتابوں کی تھی۔ اصل کتاب جس پر بنی اسرائیل کی شریعت کا مدار تھا وہ تورات تھی۔ آج بھی زبور وانجیل: تورات کے مجموعہ (بائبل) میں شامل ہیں۔ یہ عہد حضرت عیسیٰ علیہ السلام پر تمام ہوا۔ ارشاد ہے: —— اور ہم نے ابن مریم (حضرت عیسیٰ علیہ السلام) کو اور ان کی والدہ کو ایک بڑی نشانی بنایا —— یعنی دونوں مل کر ایک نشانی ہیں۔ اور وہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کا بغیر باپ کے صرف ماں سے پیدا ہونا ہے —— اور ہم نے دونوں کو ایک بلند جگہ میں پناہ دی جو ٹھہرنے کے قابل اور چشمہ دار تھی —— یعنی عیسیٰ علیہ السلام پر اللہ تعالیٰ کی عنایت از ابتداء تا انتہا رہی۔ جب آپ کا حمل قرار پایا اس وقت فرشتہ ظاہر ہوا۔ اور جب وضع حمل کا وقت آیا تو بہترین جگہ آپ کی والدہ صاحبہ کو پہنچا دیا۔ حضرت مریم رضی اللہ عنہا بستی سے نکل کر جنگل میں ایک ایسی جگہ چلی گئیں جو بلند تھی۔ نیچے چشمہ یا نہر بہہ رہی تھی، اور وہاں کھجور کا درخت بھی تھا، جس پر پکی ہوئی کھجوریں تھیں، وہاں آپ کی ولادتِ مبارکہ ہوئی۔ تفصیل سورۂ مریم میں گذر چکی۔

آپ کی اس طرح حیرت انگیز طور پر ولادت نبی ﷺ کی ختم نبوت کی نشانی تھی۔ اور یہ نشانی دو طرح سے تھی: ایک: اس طرح کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام انبیائے بنی اسرائیل کے خاتم تھے۔ پس جس طرح نبوت کا ایک معین سلسلہ آپ پر ختم ہوگیا، اسی طرح نبوت کے تمام سلسلے حضرت خاتم النّبیین ﷺ پر تمام ہوگئے۔ یہ ختم نبوت جزئی: ختم نبوت کلی کی دلیل ہے۔ دوم: اس طرح کہ اللہ تعالیٰ نے انسان کی پیدائش کے حسّی سلسلہ کو جو ماں باپ سے چلا آرہا تھا ایک میں یعنی صرف ماں میں جمع کردیا، اسی طرح نبوت کے تمام سلسلوں کو جو ایک معنوی چیز ہے ایک ذات میں جمع کردیا۔ تفصیل سورۃ الانبیاء (آیت ۹۱) کی تفسیر میں گذر چکی ہے۔

حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی حیرت انگیز ولادت دنیا جہاں کے لئے ختم نبوت کی نشانی تھی۔

يَاأَيُّهَا الرُّسُلُ كُلُوا مِنَ الطَّيِّبٰتِ وَاعْمَلُوا صَالِحًا ۭ اِنِّيْ بِمَا تَعْمَلُوْنَ عَلِيْمٌ ۝۵۱ وَاِنَّ هٰذِهٖٓ اُمَّتُكُمْ اُمَّةً وَّاحِدَةً وَّاَنَا رَبُّكُمْ فَاتَّقُوْنِ ۝۵۲ فَتَقَطَّعُوْٓا اَمْرَهُمْ بَيْنَهُمْ زُبُرًا ۭ كُلُّ

حِزْبٍۭ بِمَا لَدَيْهِمْ فَرِحُوْنَ ﴿۵۳﴾ فَذَرْهُمْ فِيْ غَمْرَتِهِمْ حَتّٰى حِيْنٍ ﴿۵۴﴾ اَيَحْسَبُوْنَ اَنَّمَا نُمِدُّهُمْ بِهٖ مِنْ مَّالٍ وَّبَنِيْنَ ﴿۵۵﴾ نُسَارِعُ لَهُمْ فِي الْخَيْرٰتِ ۭ بَلْ لَّا يَشْعُرُوْنَ ﴿۵۶﴾

يٰٓاَيُّهَا	اے	وَّاحِدَةً	ایک	حَتّٰى حِيْنٍ	ایک وقت تک
الرُّسُلُ	پیغمبرو!	وَّاَنَا	اور میں	اَيَحْسَبُوْنَ	کیا گمان کرتے ہیں وہ
كُلُوْا	کھاؤ تم	رَبُّكُمْ	تمہارا رب ہوں	اَنَّمَا (۴)	کہ جو
مِنَ الطَّيِّبٰتِ	نفیس چیزوں سے	فَاتَّقُوْنِ	پس مجھ سے ڈرو	نُمِدُّهُمْ	اضافہ کرتے ہیں ہم
وَاعْمَلُوْا	اور کرو تم	فَتَقَطَّعُوْٓا (۲)	پس بانٹ لیا انھوں نے		ان کو
صَالِحًا	نیک کام	اَمْرَهُمْ	اپنے معاملہ کو	بِهٖ	اس کے ذریعہ
اِنِّيْ	بیشک میں	بَيْنَهُمْ	آپس میں	مِنْ مَّالٍ	مال سے
بِمَا	ان کاموں سے جو	زُبُرًا	ٹکڑے ٹکڑے	وَّبَنِيْنَ	اور بیٹوں سے
تَعْمَلُوْنَ	تم کرتے ہو	كُلُّ حِزْبٍ	ہر فرقہ	نُسَارِعُ	جلدی کر رہے ہیں ہم
عَلِيْمٌ	واقف ہوں	بِمَا	اس پر جو	لَهُمْ	ان کے لئے
وَاِنَّ	اور بیشک	لَدَيْهِمْ	اس کے پاس ہے	فِي الْخَيْرٰتِ	بھلائیوں میں؟
هٰذِهٖٓ	یہ (دین وملت)	فَرِحُوْنَ	نازاں ہے	بَلْ	(نہیں) بلکہ
اُمَّتُكُمْ	تمہارا طریقہ ہے	فَذَرْهُمْ	پس چھوڑ دے ان کو	لَّا يَشْعُرُوْنَ	وہ سمجھتے نہیں
اُمَّةً (۱)	طریقہ	فِيْ غَمْرَتِهِمْ (۳)	گہری گمراہی میں	❁	❁

گذشتہ آیات میں نوح علیہ السلام سے عیسیٰ علیہ السلام تک بہت سے رسولوں کا تذکرہ آیا ہے، اب ان سب سے

(۱) أمةً واحدةً: أمتكم سے حال ہے۔(۲) تَقَطَّعَ: جَعَلَ کے معنی کو متضمن ہے اس لئے دو مفعول آئے ہیں: ایک أمرهم دوسرا: زُبُرًا. الزُّبْرَة: کسی بھی چیز کا ٹکڑا۔ ج: زُبَرٌ اور زُبُرٌ۔(۳) غَمْرة: گہرا پانی جس کی تھاہ نہ ہو، مجازاً زبردست گمراہی، بڑی جہالت مراد ہے۔(۴) أنما: حرف تحقیق نہیں ہے، بلکہ أَنَّ حرف مشبہ بالفعل ہے اور ما موصولہ ہے اور نمدهم به صلہ ہے اور من مال وبنين: ما موصولہ کا بیان ہے، سب مل کر أن کا اسم ہیں، اور جملہ نسارع خبر ہے۔ مَدَّ الشيئَ: کسی چیز میں اضافہ کرنا، بڑھانا۔ مَدَّ الجيشَ: لشکر کو کمک پہنچانا۔

خطاب ہے: —— اے رسولو! نفیس چیزوں میں سے کھاؤ، اور نیک کام کرو، میں یقیناً ان کاموں کو جانتا ہوں جو تم کرتے ہو —— یہ حکم درحقیقت رسولوں کو مخاطب کر کے ان کی امتوں کو دیا گیا ہے۔ اور رسولوں سے خطاب حکم کی اہمیت ظاہر کرنے کے لئے ہے۔ یعنی یہ ایسا حکم ہے جس کے رسول بھی مخاطب ہیں، پس ان کی امتیں تو ضرور مخاطب ہونگی —— اور سب پیغمبروں سے ایک ساتھ خطاب کا یہ مطلب نہیں ہے کہ یہ سب حضرات کسی جگہ مجتمع تھے۔ بلکہ یہ حکم ہر پیغمبر کو اس کے زمانہ میں دیا گیا تھا۔ سبھی رسولوں کو یہ حکم دیا گیا کہ پاکیزہ اور حلال وطیب چیزیں کھائیں اور نیک کام کریں۔ اس میں نصاریٰ کی رہبانیت کا بھی رد ہو گیا جو حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے ذکر سے خاص مناسبت رکھتا ہے —— اور اکلِ حلال کا حکم پہلے اس لئے دیا گیا کہ حلال غذا کا عملِ صالح میں بڑا دخل ہے۔ جب آدمی کی غذا حلال ہوتی ہے تو عملِ صالح کی توفیق خود بخود ہوتی ہے۔ اور غذا حرام ہوتی ہے تو آدمی چاہنے کے باوجود عمل صالح نہیں کر پاتا، اور کرتا ہے تو قبول نہیں ہوتا۔ حدیث میں ہے کہ ایک شخص لمبا سفر کرتا ہے۔ غبار آلود پراگندہ حال ہوتا ہے، مگر اس کا کھانا پینا اور لباس حرام کا ہوتا ہے۔ اور حرام ہی سے پلا بڑھا ہوتا ہے (وہ کسی متبرک جگہ میں مثلاً مکہ مکرمہ میں پہنچ کر) اپنے دونوں ہاتھ آسمان کی طرف لمبے کرتا ہے، اور خوب گڑگڑا کر دعا مانگتا ہے مگر اس کی دعا کیسے قبول ہو؟! (رواہ مسلم)

نبیوں سے خطاب کے بعد عام لوگوں سے خطاب ہے۔ جن میں کفار مکہ بھی شامل ہیں: —— بیشک یہ تمہاری جماعت ہے: ایک جماعت! —— یعنی اوپر جن انبیاء کا ذکر آیا ہے وہ سب ایک جماعت ہیں۔ سب کا دین ایک ہے یعنی سب اصول میں متحد ہیں۔ وہی دین اب یہ آخری رسول پیش کر رہے ہیں۔ کوئی نیا دین نہیں پیش کر رہے —— اور میں تمہارا پروردگار ہوں پس مجھ سے ڈرو! —— یعنی اس مشترک دین کی بنیادی تعلیم توحید ہے، ایک اللہ کی بندگی کرنا اور اسی کے احکام کی اطاعت کرنا اس دین کا خلاصہ ہے —— اللہ تعالیٰ سے ڈرنے کے یہی معنی ہیں۔ اس کے یہ معنی ہرگز نہیں کہ اس سے جابر حاکم یا موذی جانور سے ڈرنے کی طرح ڈرا جائے۔ اللہ تعالیٰ سے تو محبت ضروری ہے۔ اور مؤمنین کو اللہ تعالیٰ سے بے حد محبت بھی ہوتی ہے۔ اور جس سے محبت ہوتی ہے آدمی اس کے احکام کی اطاعت کرتا ہے، خلاف ورزی نہیں کرتا تاکہ اس کی ناراضگی سے دوچار نہ ہو۔

پس انھوں نے اپنے معاملہ کو آپس میں ٹکڑے ٹکڑے کر لیا۔ ہر فریق اس پر جو اس کے پاس ہے: نازاں ہے —— یعنی حق واضح ہونے کے باوجود اپنے ہی طریقے سے چمٹا ہوا ہے۔ یہ اِس خیال کا جواب ہے کہ جب سب نبیوں کا دین ایک ہے تو ان کی امتیں آپس میں مختلف کیوں ہیں؟ جواب یہ دیا ہے کہ یہ اختلافات بعد کے لوگوں نے پیدا کئے ہیں۔ اسلام کے علاوہ دیگر مذاہب جو آج پائے جاتے ہیں وہ اسلام کی بگڑی ہوئی صورتیں ہیں۔ لوگوں نے

اس کی بعض باتوں کو مسخ کر دیا اور بعض من گھڑت باتوں کا اضافہ کر دیا تو دین کا نیا ایڈیشن تیار ہو گیا۔ اور اب ہر ایک کے پاس جو کچھ ہے وہ اس میں مگن ہے، اس سے ہٹنے کے لئے تیار نہیں۔ اب صحیح اسلام کو یہ آخری پیغمبر پیش کر رہے ہیں۔ لوگوں کو چاہئے کہ اس کو قبول کریں۔

فائدہ: اور جو بگاڑ پہلے رونما ہوا تھا اس امت میں بھی رونما ہوگا۔ بہتّر فرقوں والی پیشین گوئی موجود ہے۔ مگر چونکہ قرآن وحدیث اپنی اصلی صورت میں ہمیشہ موجود رہیں گے اس لئے امت کا سوادِ اعظم (بڑا حصہ) ہمیشہ صحیح دین پر قائم رہے گا۔ حقیقت گم نہیں ہو جائے گی ـــــ اور ائمۂ مجتہدین کا فروعی اختلاف اس میں داخل نہیں۔ اس اختلاف سے ملتیں الگ نہیں ہوتیں۔ چاروں فقہی مذاہب برحق ہیں۔ غیر مقلدین جو اس اجتہادی اور فروعی اختلاف کو فرقہ واریت کا رنگ دیتے ہیں وہ ان کی نادانی ہے۔

اچھا اگر یہ لوگ (مکہ والے) نہیں مانتے، اور اپنی گمراہی میں ڈوبے رہتے ہیں: ـــــ تو چھوڑیے ان کو ان کی سخت گمراہی میں ایک وقت تک! ـــــ یعنی ان کا یہ استغراق زیادہ دیر تک نہیں رہ سکے گا۔ جلد ہی وقت آرہا ہے جب ان کی آنکھیں کھل جائیں گی۔ جب موت سر پہ آ کھڑی ہوگی یا عذابِ الٰہی سروں پر منڈلانے لگے گا تو ہوش ٹھکانے آجائیں گے۔

کفار کو دھوکہ یہ لگا ہوا ہے کہ ان کو دنیا کی عیش و راحت حاصل ہے، وہ اس کو اپنی حقانیت اور مقبولیت کی دلیل سمجھ رہے ہیں، وہ مسلمانوں سے کہتے ہیں: ''ہم مال واولاد میں تم سے زیادہ ہیں، اور ہم کو عذاب ہونے والا نہیں!'' (سورۃ السبا آیت ۳۵) اس سلسلہ میں ارشاد ہے: ـــــ کیا وہ گمان کرتے ہیں کہ ہم ان کو جو مال اور بیٹے دیتے چلے جا رہے ہیں: تو ہم ان کو جلدی جلدی فائدے پہنچا رہے ہیں؟ ـــــ یعنی عند اللہ ان کی مقبولیت کی وجہ سے یہ سب نعمتیں ان کو مل رہی ہیں؟ نہیں ـــــ بلکہ وہ سمجھتے نہیں! ـــــ یعنی مال واولاد کی یہ افراط ان کی مقبولیت کی وجہ سے نہیں ہے۔ بلکہ یہ ان کو ڈھیل دی جا رہی ہے اور آزمائش کی جا رہی ہے۔ جب ان کی شقاوت کا پیمانہ لبریز ہو جائے گا تو ایک دم عذاب میں دھر لئے جائیں گے۔

آدمی کو کبھی دنیا کی کوڑیوں سے دھوکہ نہیں کھانا چاہئے، یہ تو ایک آزمائش ہے۔

إِنَّ الَّذِينَ هُم مِّنْ خَشْيَةِ رَبِّهِم مُّشْفِقُونَ ﴿٥٧﴾ وَالَّذِينَ هُم بِآيَاتِ رَبِّهِمْ يُؤْمِنُونَ ﴿٥٨﴾ وَالَّذِينَ هُم بِرَبِّهِمْ لَا يُشْرِكُونَ ﴿٥٩﴾ وَالَّذِينَ يُؤْتُونَ مَا آتَوا وَّقُلُوبُهُمْ وَجِلَةٌ أَنَّهُمْ إِلَىٰ رَبِّهِمْ

رٰجِعُوْنَ ﴿۶۰﴾ اُولٰٓئِكَ يُسٰرِعُوْنَ فِي الْخَيْرٰتِ وَهُمْ لَهَا سٰبِقُوْنَ ﴿۶۱﴾ وَلَا نُكَلِّفُ نَفْسًا اِلَّا وُسْعَهَا وَلَدَيْنَا كِتٰبٌ يَّنْطِقُ بِالْحَقِّ وَهُمْ لَا يُظْلَمُوْنَ ﴿۶۲﴾

اِنَّ	بیشک	لَا يُشْرِكُوْنَ	شریک نہیں کرتے	لَهَا	بھلائیوں کی طرف
الَّذِيْنَ	جولوگ	وَالَّذِيْنَ	اور جولوگ	سٰبِقُوْنَ	پیش قدمی کرنے
هُمْ	وہ	يُؤْتُوْنَ (۱)	دیتے ہیں		والے ہیں
مِّنْ خَشْيَةِ	ہیبت سے	مَآ	جو کچھ	وَلَا نُكَلِّفُ	اور نہیں حکم دیتے ہم
رَبِّهِمْ	اپنے رب کی	اٰتَوْا (۲)	دیتے ہیں	نَفْسًا	کسی شخص کو
مُّشْفِقُوْنَ	ڈرنے والے ہیں	وَّقُلُوْبُهُمْ (۳)	درانحالیکہ ان کے دل	اِلَّا	مگر
وَالَّذِيْنَ	اور جولوگ	وَجِلَةٌ (۴)	خوفزدہ ہیں	وُسْعَهَا	اسکی گنجائش کے موافق
هُمْ	وہ	اَنَّهُمْ (۵)	(اس لئے) کہ وہ	وَلَدَيْنَا	اور ہمارے پاس
بِاٰيٰتِ	آیتوں پر	اِلٰى رَبِّهِمْ	اپنے رب کی طرف	كِتٰبٌ	ایک نوشتہ ہے
رَبِّهِمْ	اپنے رب کی	رٰجِعُوْنَ	لوٹنے والے ہیں	يَّنْطِقُ	بولے گا وہ
يُؤْمِنُوْنَ	ایمان لاتے ہیں	اُولٰٓئِكَ	یہ لوگ	بِالْحَقِّ	ٹھیک ٹھیک
وَالَّذِيْنَ	اور جولوگ	يُسٰرِعُوْنَ	جلدی کررہے ہیں	وَهُمْ	اور وہ
هُمْ	وہ	فِي الْخَيْرٰتِ	بھلائیوں میں	لَا يُظْلَمُوْنَ	ظلم نہیں کئے جائیں
بِرَبِّهِمْ	اپنے رب کے ساتھ	وَهُمْ	اور وہ		گے

کفار دنیا کی عیش و راحت ہی کو حاصلِ زندگانی سمجھتے ہیں۔ حالانکہ اصل کامیابی آخرت کی کامیابی ہے۔ اب اِن آیات میں ان مؤمنین کا تذکرہ ہے جو بھلائیوں کی طرف دوڑنے والے ہیں، اور دونوں ہاتھوں سے آخرت کے فوائد سمیٹ رہے ہیں۔ یہ وہ حضرات ہیں جن میں خاص طور پر چار باتیں پائی جاتی ہیں:

(۱) يُؤْتُوْنَ: مضارع معروف، صیغہ جمع مذکر غائب، إِيْتَاء: دینا۔ (۲) آتَوْا: فعل ماضی، صیغہ جمع مذکر غائب، إِيْتَاء: دینا۔ ما آتوا: يؤتون کا مفعول بہ ہے۔ (۳) وقلوبهم: جملہ حالیہ ہے يؤتون کی ضمیر فاعل سے۔ (۴) وَجِلَةٌ: صفتِ مشبّہ، واحد مؤنث، مذکر وَجِلٌ، وَجِلَ يَوْجَلُ (س) وَجَلًا: ڈرنا، گھبرانا۔ (۵) أنهم سے پہلے لام محذوف ہے۔

پہلی بات: ـــــ بیشک جولوگ اپنے پروردگار کی ہیبت سے ڈرنے والے ہیں ـــــ یعنی وہ خدائے واحد سے ڈرتے رہتے ہیں، اس لئے وہ دنیا میں بے خوف ہوکر زندگی نہیں گذارتے۔ وہ ہر معاملہ میں اللہ کی نافرمانی سے بچتے ہیں۔

دوسری بات: ـــــ اور جولوگ اپنے پروردگار کی آیتوں پر ایمان رکھتے ہیں ـــــ یعنی آیاتِ کونیہ وقرآنیہ دونوں پر ایمان رکھتے ہیں۔ جو کچھ نبی ﷺ پیش کررہے ہیں اس کو قبول کرتے ہیں۔ اور جو کچھ اللہ کی طرف سے پیش آرہا ہے اس کو عین حکمت سمجھتے ہیں۔

تیسری بات: ـــــ اور جولوگ اپنے پروردگار کے ساتھ شریک نہیں کرتے ـــــ یعنی خالص توحید پر قائم ہیں۔ ریاء سے بھی بچتے ہیں کیونکہ وہ بھی ایک طرح کا شرک ہے۔ انبیاء اور اولیاء کی تعظیم میں ایسا مبالغہ نہیں کرتے جو شرک تک پہنچادے، غیر اللہ سے نہ مانگتے ہیں نہ ان کو حاجت روا سمجھتے ہیں۔ خالص اللہ کی بندگی کرتے ہیں۔ اس کی بندگی میں کسی اور کی بندگی کا شائبہ تک نہیں آنے دیتے، نہ وہ غیر الٰہی قوانین کی اتباع کرتے ہیں، اپنی اطاعت کو بھی اللہ کے لئے خالص رکھتے ہیں۔

چوتھی بات: ـــــ اور جولوگ دیتے ہیں جو کچھ دیتے ہیں درانحالیکہ ان کے دل خوفزدہ ہیں، اس لئے کہ ان کو اپنے پروردگار کے پاس جانا ہے ـــــ یعنی ان کی عطاؤ بخشش اللہ کے لئے ہوتی ہے۔ اور ان کو یہ دھڑکا لگا رہتا ہے کہ معلوم نہیں وہاں قبول ہو یا نہ ہو۔ خیرات آگے کام آئے یا نہ آئے۔ یعنی وہ اپنے عمل پر مغرور نہیں ہوتے، نیکی کرنے کے باوجود ڈرتے رہتے ہیں۔

فائدہ: ایک حدیث شریف میں یہ بات آئی ہے کہ ان بندوں کا یہ حال صدقات وخیرات کے علاوہ دیگر اعمال میں بھی ہوتا ہے۔ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں کہ میں نے رسول اللہ ﷺ سے دریافت کیا کہ کیا آیت کا مطلب یہ ہے کہ ایک شخص چوری، زنا اور شراب نوشی کر کے اللہ سے ڈرے؟ آپؐ نے فرمایا: ''صدیق کی بیٹی! اس سے مراد وہ شخص (بھی) ہے جو نماز پڑھتا ہے، روزے رکھتا ہے، زکات دیتا ہے پھر اللہ سے ڈرتا ہے'' (رواہ احمد والترمذی وابن ماجہ) حضرت حسن بصریؒ فرماتے ہیں: مؤمن اطاعت کرتا ہے پھر بھی ڈرتا ہے، اور منافق معصیت کرتا ہے پھر بھی بے خوف ہوتا ہے۔

یہ لوگ جلدی جلدی فائدے حاصل کررہے ہیں، اور وہ ان کی طرف سبقت کرنے والے ہیں ـــــ یعنی کفار اور بے دین لوگ جو اپنی دنیوی کامیابیوں پر مغرور ہیں، اور گمان کرتے ہیں کہ ہم خوب فائدے سمیٹ رہے ہیں، وہ ان کی خام خیالی ہے۔ حقیقت میں فائدے حاصل کرنے والے اہل ایمان واہل تقوی ہیں۔ وہ اپنے فوائد کی طرف تیزی سے بڑھ رہے ہیں۔ مگر یہ فوائد دنیا کے چند ٹھیکرے نہیں ہیں، بلکہ آخرت کی لازوال نعمتیں ہیں۔

اور ہم کسی کو اس کی مقدرت سے زیادہ حکم نہیں دیتے ـــــ یعنی مذکورہ باتوں پر عمل کرنا کچھ مشکل نہیں۔ پس کسی کے لئے اس عذر کا موقع نہیں کہ یہ کام ہمارے بس کے نہیں۔ کیونکہ بہت سے انسان ان پر عمل پیرا ہیں، اور وہ آخرت میں اپنا اجر پائیں گے ـــــ اور ہمارے پاس ایک نوشتہ ہے جو (سب کچھ) ٹھیک ٹھیک بتادے گا ـــــ نوشتہ سے مراد نامۂ اعمال ہے، جو ہر ایک شخص کا الگ الگ تیار کیا جارہا ہے۔ جس میں ایک ایک بات درج ہے، کوئی چھوٹا بڑا عمل ایسا نہیں جو اس میں درج نہ ہو۔ اسی کے مطابق کل قیامت کے دن بدلہ دیا جائے گا ـــــ اور وہ ظلم نہیں کئے جائیں گے ـــــ یعنی نہ تو عمل کرنے والوں کی کوئی نیکی ماری جائے گی نہ وہ عمل کے واجبی صلہ سے محروم رہیں گے۔ البتہ اگر فضل وانعام ہوجائے تو یہ ظلم نہیں۔ چنانچہ نیکیوں کا اجر بڑھا کر دیا جائے گا اور بہت سی کوتاہیوں سے درگذر کیا جائے گا۔

نیک کام آسان ہیں اور ان کا ثمرہ یقینی ہے، اس لئے سعی کے قابل یہی کام ہیں۔

بَلْ قُلُوْبُهُمْ فِيْ غَمْرَةٍ مِّنْ هٰذَا وَلَهُمْ اَعْمَالٌ مِّنْ دُوْنِ ذٰلِكَ هُمْ لَهَا عٰمِلُوْنَ ﴿۶۳﴾ حَتّٰٓى اِذَآ اَخَذْنَا مُتْرَفِيْهِمْ بِالْعَذَابِ اِذَا هُمْ يَجْـَٔرُوْنَ ﴿۶۴﴾ لَا تَجْـَٔرُوا الْيَوْمَ اِنَّكُمْ مِّنَّا لَا تُنْصَرُوْنَ ﴿۶۵﴾ قَدْ كَانَتْ اٰيٰتِيْ تُتْلٰى عَلَيْكُمْ فَكُنْتُمْ عَلٰٓى اَعْقَابِكُمْ تَنْكِصُوْنَ ﴿۶۶﴾ مُسْتَكْبِرِيْنَ بِهٖ سٰمِرًا تَهْجُرُوْنَ ﴿۶۷﴾

بَلْ	بلکہ	مِّنْ دُوْنِ	کم درجہ کے	اِذَآ	جب
قُلُوْبُهُمْ	ان کے دل	ذٰلِكَ	اس سے	اَخَذْنَا	پکڑلیں گے ہم
فِيْ غَمْرَةٍ (۱)	سخت غفلت میں ہیں	هُمْ	وہ	مُتْرَفِيْهِمْ (۳)	ان کے خوش حالوں کو
مِّنْ هٰذَا (۲)	اس سے	لَهَا	ان کو	بِالْعَذَابِ	عذاب میں
وَلَهُمْ	اور ان کے لئے	عٰمِلُوْنَ	کرنے والے ہیں	اِذَا (۴)	(تو) اچانک
اَعْمَالٌ	کام ہیں	حَتّٰٓى	یہاں تک کہ	هُمْ	وہ

(۱) غَمْرَةٌ: گہرا پانی جس کی تھاہ نہ ہو، مراد زبردست گمراہی۔ غَمَرَ الماءُ (ن) غَمَارَۃ و غُمورۃ: پانی کا چڑھنا، زیادہ ہوکر گردو پیش کو ڈھانپ لینا (۲) ھذا کا مشارالیہ ''کتابتِ اعمال'' ہے (۳) مُتْرَفی: مضاف، ھم: مضاف الیہ، اصل میں مُتْرَفِیْنَ تھا، اضافت کی وجہ سے نون اعرابی گرگیا۔ از اِتْرَاف (باب افعال) عیش دینا، آرام دینا۔ مُتْرَف (اسم مفعول) خوش حال، فارغ البال، امیر۔ (۴) اِذا (مفاجاتیہ) پہلے اِذا (شرطیہ) کا جواب ہے۔

يَجْـَٔرُوْنَ (۱)	چلائیں گے	قَدْ	تحقیق	عَلٰٓى اَعْقَابِكُمْ	اپنی ایڑیوں پر
لَا تَجْـَٔرُوا	مت چلاؤ	كَانَتْ	تھیں	تَنْكِصُوْنَ (۲)	پیچھے ہٹتے
اَلْيَوْمَ	آج	اٰيٰتِيْ	میری آیتیں	مُسْتَكْبِرِيْنَ (۳)	گھمنڈ کرتے ہوئے
اِنَّكُمْ	بیشک تم	تُتْلٰى	پڑھی جاتیں	بِهٖ (۴)	اس کو
مِنَّا	ہماری طرف سے	عَلَيْكُمْ	تم پر	سٰمِرًا (۵)	مشغلہ بناتے ہوئے
لَا تُنْصَرُوْنَ	مدد نہیں کئے جاؤ گے	فَكُنْتُمْ	پس تھے تم	تَهْجُرُوْنَ (۶)	چھوڑتے ہوئے

یہ مؤمنین کے بالمقابل کافروں کا ذکر ہے۔مؤمنین کا سرمایہ ایمان کے ساتھ نیک اعمال ہیں، جو ریکارڈ کئے جارہے ہیں۔جن کا پورا پورا بدلہ ان کو آخرت میں ملے گا۔اور کافروں کے پاس کفر کے ساتھ بداعمالیاں ہیں۔وہ بھی ریکارڈ کی جارہی ہیں، مگر کافر اس کی طرف سے سخت غفلت میں پڑے ہوئے ہیں۔البتہ جب ان کو ان کی بداعمالیوں کی سزا دنیا میں یا آخرت میں ملے گی تو وہ پھوٹ پھوٹ کر روئیں گے، مگر اب کیا ہو جب چڑیا چگ گئیں کھیت! موقع ہاتھ سے نکل گیا! ارشاد ہے: —— بلکہ ان کے دل اس سے سخت غفلت میں پڑے ہوئے ہیں —— یعنی کفار کا بھی ہر عمل لکھا جارہا ہے، مگر ان کو تو اس کا یقین ہی نہیں —— اور ان کے لئے اس سے فروتر اعمال ہیں جن کو وہ کرنے والے ہیں —— یہ اسی آخرت فراموشی کا نتیجہ ہے کہ وہ مؤمنین کے اعمال کے برخلاف کاموں میں منہمک ہیں۔کفر و شرک تو ان کا بڑا گناہ ہے ہی، باقی اس سے وَرے اور بہت سے گناہوں میں پھنسے ہوئے ہیں۔وہ ان میں برابر مبتلا رہیں گے: —— یہاں تک کہ جب ہم ان کے خوش عیش لوگوں کو عذاب میں پکڑیں گے تو وہ اچانک چلاّنا شروع کریں گے —— یعنی ان ظالموں کی ابھی اسی دنیا میں پکڑ کی جائے گی۔جب وہ عذاب میں گرفتار ہونگے تو چلاّئیں گے، شور مچائیں گے۔اور فریاد اور واویلا کریں گے۔ہجرت کے بعد مقام بدر میں یہ منظر دنیا کے سامنے آگیا، ان کے بڑے بڑے سورما مارے گئے یا قید ہوگئے۔عورتیں مہینوں تک ان کا نوحہ کرتی رہیں، روتی رہیں، چیختی رہیں اور ماتم کرتی رہیں، مگر کچھ ہاتھ نہ آیا —— اللہ کا عذاب جب آتا ہے تو خوش حال اور بدحال سب برابر کے شریک

(۱) يَجْأَرُوْنَ: فعل مضارع، صیغہ جمع مذکر غائب، جَأَرَ (ف) جَأْرًا وجُؤَارًا: آواز بلند کرنا، گائے بیل کا ڈکرانا، رانبھنا۔ (۲) نَكَصَ (ن،ض) نَكْصًا ونُكُوْصًا: پیچھے ہٹنا، باز رہنا (۳) استکبر: عناد وتکبر کی وجہ سے حق کو نہ ماننا۔ مستکبرین: تنکصون کے فاعل سے حال ہے۔(۴) به: سَامِرًا سے متعلق ہے، بہت سے مفسرین نے مستکبرین سے متعلق بھی کیا ہے، مگر بہتر سَامِرًا سے متعلق کرنا ہے۔(۵) سَامِرًا: دوسرا حال ہے اور بروزن اسم فاعل اسم جنس بھی ہے، اس لئے جمع نہیں لایا گیا: کہانی کہنے والا، افسانہ گو۔(۶) تَهْجُرُوْنَ: تیسرا حال ہے، هَجَرَ (ن) هَجْرًا وهِجْرَانا: چھوڑنا، ترک تعلق کرنا۔

ہوتے ہیں، مگر اس جگہ خوش حالوں کا ذکر خاص طور پر اس لئے کیا گیا ہے کہ ایسے ہی لوگ دنیا کے مصائب سے اپنے بچاؤ کا کچھ نہ کچھ سامان کر لیتے ہیں۔ مگر جب اللہ کا عذاب آتا ہے تو سب سے پہلے یہی لوگ بے بس ہو کر رہ جاتے ہیں ـــــ آج مت چلاؤ، ہماری طرف سے تمہاری مدد نہیں کی جائے گی ـــــ یعنی اب چلانا اور عاجزی کرنا لاحاصل ہے۔ اور تو کسی کی طرف سے مدد کا سوال ہی نہیں، اللہ تعالیٰ کی طرف سے بھی تمہاری کچھ دستگیری نہ ہوگی، کیونکہ تمہاری مہلت کا پیمانہ لبریز ہو چکا ہے ـــــ واقعہ یہ ہے کہ میری آیتیں تمہارے سامنے پڑھی جاتی تھیں تو تم الٹے پاؤں چل دیتے تھے ـــــ یعنی یاد کرو! جب ہمارا رسول تم کو ہماری آیتیں پڑھ کر سناتا تھا تو تم الٹے پاؤں بھاگتے تھے۔ تمہیں ان کا سننا بھی گوارہ نہ تھا ـــــ گھمنڈ کرتے ہوئے، اس کو مشغلہ بناتے ہوئے، چھوڑتے ہوئے ـــــ یہ تینوں باتیں بالترتیب ہیں۔ یعنی تم عناد و تکبر کی وجہ سے قرآن کریم کو نہیں سنتے، ایڑیوں پر الٹے بھاگتے ہو۔ پھر رات کو کعبہ شریف کے پاس جمع ہوتے ہو، اور قرآن کریم کو تفریح کا مشغلہ بناتے ہو۔ کوئی کہتا ہے یہ شاعری ہے، دوسرا کہتا ہے نہیں یہ دیوانے کی بڑ ہے! کوئی کہتا ہے یہ جادو ہے، دوسرا کہتا ہے نہیں یہ اگلوں کے افسانے ہیں۔ کوئی کہتا ہے اس کو یہ خود بناتا ہے، دوسرا کہتا ہے نہیں یہ فلاں شخص سکھاتا ہے۔ اس طرح کی باتیں چھانٹ کر تم قرآن کریم کو چھوڑ دیتے ہو، اس کی سزا تمہیں جلد ملنے والی ہے، چند دن انتظار کرو۔

أَفَلَمْ يَدَّبَّرُوا الْقَوْلَ أَمْ جَاءَهُمْ مَا لَمْ يَأْتِ آبَاءَهُمُ الْأَوَّلِينَ ﴿٦٨﴾ أَمْ لَمْ يَعْرِفُوا رَسُولَهُمْ فَهُمْ لَهُ مُنْكِرُونَ ﴿٦٩﴾ أَمْ يَقُولُونَ بِهِ جِنَّةٌ ۚ بَلْ جَاءَهُمْ بِالْحَقِّ وَأَكْثَرُهُمْ لِلْحَقِّ كَارِهُونَ ﴿٧٠﴾ وَلَوِ اتَّبَعَ الْحَقُّ أَهْوَاءَهُمْ لَفَسَدَتِ السَّمَاوَاتُ وَالْأَرْضُ وَمَنْ فِيهِنَّ ۚ بَلْ أَتَيْنَاهُمْ بِذِكْرِهِمْ فَهُمْ عَنْ ذِكْرِهِمْ مُعْرِضُونَ ﴿٧١﴾ أَمْ تَسْأَلُهُمْ خَرْجًا فَخَرَاجُ رَبِّكَ خَيْرٌ ۖ وَهُوَ خَيْرُ الرَّازِقِينَ ﴿٧٢﴾ وَإِنَّكَ لَتَدْعُوهُمْ إِلَىٰ صِرَاطٍ مُسْتَقِيمٍ ﴿٧٣﴾ وَإِنَّ الَّذِينَ لَا يُؤْمِنُونَ بِالْآخِرَةِ عَنِ الصِّرَاطِ لَنَاكِبُونَ ﴿٧٤﴾ وَلَوْ رَحِمْنَاهُمْ وَكَشَفْنَا مَا بِهِمْ مِنْ ضُرٍّ لَلَجُّوا فِي طُغْيَانِهِمْ يَعْمَهُونَ ﴿٧٥﴾ وَلَقَدْ أَخَذْنَاهُمْ بِالْعَذَابِ فَمَا اسْتَكَانُوا لِرَبِّهِمْ وَمَا يَتَضَرَّعُونَ ﴿٧٦﴾ حَتَّىٰ إِذَا فَتَحْنَا عَلَيْهِمْ بَابًا ذَا عَذَابٍ شَدِيدٍ إِذَا هُمْ فِيهِ مُبْلِسُونَ ﴿٧٧﴾

ع ۴

اَفَلَمۡ	کیا تو نہیں	بَلۡ	بلکہ	مُّعۡرِضُوۡنَ	روگردانی کرنے والے
يَدَّبَّرُوا (۱)	غور کیا انھوں نے	جَآءَهُمۡ	آیا ہے وہ انکے پاس		ہیں
الۡقَوۡلَ	کلام میں	بِالۡحَقِّ	حق کے ساتھ	اَمۡ	یا
اَمۡ	یا	وَاَكۡثَرُهُمۡ	اور ان کی اکثریت	تَسۡـَٔلُهُمۡ	مانگتے ہیں آپ ان سے
جَآءَهُمۡ	آئی ہے ان کے پاس	لِلۡحَقِّ	حق کو	خَرۡجًا (۵)	کچھ آمدنی
مَّا (۲)	وہ بات جو	كٰرِهُوۡنَ	ناپسند کرنے والی ہے	فَخَرَاجُ (۵)	پس آمدنی
لَمۡ يَاۡتِ	نہیں آئی	وَلَوِ	اور اگر	رَبِّكَ	آپ کے رب کی
اٰبَآءَهُمُ	انکے بڑوں کے پاس	اتَّبَعَ	پیروی کرتا	خَيۡرٌ	بہتر ہے
الۡاَوَّلِيۡنَ	اگلے	الۡحَقُّ	حق	وَّهُوَ	اور وہ
اَمۡ	یا	اَهۡوَآءَهُمۡ	ان کی خواہشات کی	خَيۡرُ	بہترین ہیں
لَمۡ يَعۡرِفُوۡا	نہیں پہچانا انھوں نے	لَفَسَدَتِ	(تو) یقیناً تباہ ہوجاتے	الرّٰزِقِيۡنَ	روزی دینے والوں میں
رَسُوۡلَهُمۡ	اپنے رسول کو	السَّمٰوٰتُ	آسمان	وَاِنَّكَ	اور بیشک آپ
فَهُمۡ	پس وہ	وَالۡاَرۡضُ	اور زمین	لَتَدۡعُوۡهُمۡ	البتہ بلاتے ہیں ان کو
لَهٗ	اس کو	وَمَنۡ فِيۡهِنَّ	اور جو ان میں ہیں	اِلٰى صِرَاطٍ	راستے کی طرف
مُنۡكِرُوۡنَ (۳)	انجانا سمجھتے ہیں	بَلۡ	بلکہ	مُّسۡتَقِيۡمٍ	سیدھے
اَمۡ	یا	اَتَيۡنٰهُمۡ	آئے ہیں ہم انکے پاس	وَاِنَّ	اور بیشک
يَقُوۡلُوۡنَ	کہتے ہیں وہ	بِذِكۡرِهِمۡ	ان کی نصیحت کیساتھ	الَّذِيۡنَ	جو لوگ
بِهٖ	اس کو	فَهُمۡ	پس وہ	لَا يُؤۡمِنُوۡنَ	نہیں ایمان رکھتے
جِنَّةٌ (۴)	جنون ہے	عَنۡ ذِكۡرِهِمۡ	اپنی نصیحت سے	بِالۡاٰخِرَةِ	آخرت پر

(۱) لم يَدَّبَّرُوْا: فعل مضارع نفی جحد بہ لم بمعنی ماضی منفی، اصل میں يَتَدَبَّرُوْا تھا۔ تا کا دال میں ادغام ہوا ہے تَدَبُّر (باب تفعل) غور کرنا۔ (۲) مالم يأت: جاء هم کا فاعل ہے (۳) مُنْكِرٌ: اسم فاعل، إِنْكَارٌ (باب افعال) کسی چیز کو نہ پہچاننا۔ عجیب واجنبی سمجھنا، اوپرا سمجھنا (۴) دیکھیں اسی سورت کی آیت ۲۵ (۵) خَرْجٌ اور خِرَاجٌ: دونوں کے معنی ہیں: محصول، مالگزاری، مراد مزدوری اور کام کا معاوضہ ہے۔ جمع اَخْرَاج وَأَخْرِجَة.

عَنِ الصِّرَاطِ	راستے سے	يَعْمَهُوْنَ [۴]	بھٹکتے ہوئے	اِذَا	جب
لَنٰكِبُوْنَ [۱]	یقیناً ہٹنے والے ہیں	وَلَقَدْ	اور البتہ تحقیق	فَتَحْنَا	کھول دیں گے ہم
وَلَوْ	اور اگر	اَخَذْنٰهُمْ	پکڑا ہم نے ان کو	عَلَيْهِمْ	ان پر
رَحِمْنٰهُمْ	مہربانی کریں ہم ان پر	بِالْعَذَابِ	عذاب میں	بَابًا	دروازہ
وَكَشَفْنَا	اور کھول دیں ہم	فَمَا	پس نہیں	ذَا عَذَابٍ	عذاب والا
مَا بِهِمْ	وہ جو ان کے ساتھ ہے	اسْتَكَانُوْا [۵]	فروتنی کی انھوں نے	شَدِيْدٍ	سخت
مِّنْ ضُرٍّ [۲]	بدحالی سے	لِرَبِّهِمْ	اپنے رب کے سامنے	اِذَا	(تو) اچانک
لَّلَجُّوْا [۳]	تو یقیناً اصرار کریں	وَمَا	اور نہیں	هُمْ فِيْهِ	وہ اس میں
	گے وہ	يَتَضَرَّعُوْنَ [۶]	گڑگڑائے وہ	مُبْلِسُوْنَ [۷]	آس توڑنے والے
فِيْ طُغْيَانِهِمْ	اپنی گمراہی میں	حَتّٰٓى	یہاں تک کہ		ہونگے

ان آیاتِ پاک میں سات ایسی وجوہ ذکر کی گئی ہیں جو کفار ومشرکین کے لئے ایمان لانے میں مانع ہوسکتی تھیں۔ مگر غور کیا جائے تو یہ چیزیں مانع نہیں، مانع کوئی اور چیز ہے۔ تفصیل درج ذیل ہے:

پہلی وجہ: ـــــ کیا تو ان لوگوں نے اس کلام (قرآن کریم) میں غور نہیں کیا؟ ـــــ یعنی کیا ان کے انکار کی وجہ یہ ہے کہ انھوں نے اس کلام کو سمجھا نہیں؟ ظاہر ہے یہ وجہ نہیں۔ قرآن ان کی اپنی زبان میں نازل ہوا ہے، اس کا اندازِ بیان نہایت واضح ہے، اور وہ کوئی ایسا دقیق مضمون بھی پیش نہیں کرتا جو لوگوں کی سمجھ سے باہر ہو۔

دوسری وجہ: ـــــ یا ان کے پاس وہ بات آئی ہے جو ان کے اگلے بڑوں کے پاس نہیں آئی؟ ـــــ یعنی کیا انکار کی یہ وجہ ہے کہ قرآن ان کے سامنے کوئی نرالی بات پیش کرتا ہے جو انھوں نے کبھی نہیں سنی؟ ظاہر ہے یہ وجہ بھی نہیں، کیونکہ انبیاء کا آنا، کتابوں کا لانا، توحید کی دعوت دینا، آخرت کا عقیدہ پیش کرنا، بھلائیوں کا حکم دینا اور برائیوں سے

---

(۱) نَاكِبٌ: اسم فاعل، نَكَبَ (ن) عنه نَكْبًا: ہٹنا، الگ ہونا۔ (۲) من: بیانیہ ماموصولہ کا بیان ہے، ضُرٌّ: تکلیف، بدحالی، خستہ حالی (۳) لَجَّ في الأمر (ض) لَجًّا: کسی کام میں پڑے یا لگے رہنا، چھوڑنے کو تیار نہ ہونا، اڑنا، اصرار کرنا۔ (۴) يَعْمَهُوْنَ: جملہ حالیہ ہے، عَمَهَ (ف) عَمَهًا: راستہ بھٹک کر پریشان ہونا کہ کہاں جائے (۵) اِسْتَكَانَ له: کسی کے سامنے اظہارِ عجز وانکساری کرنا۔ سکون سے باب استفعال ہے أی انتقل من كون إلى كون، جیسے: اِستَحَال أی انتقل من حال إلى حال (۶) تَضَرَّع له وإليه: گڑگڑانا، انکساری کرنا، لاچاری اور بےبسی کا اظہار کرنا (۷) مُبْلِس: اسم فاعل، از إِبْلَاس: مایوس ہونا، اور حیرت زدہ ہونا، اسی سے إبليس ہے یعنی اللہ کی رحمت سے مایوس، یہ مجرد سے مستعمل نہیں، صرف باب افعال سے مع تمام مشتقات کے آتا ہے۔

روکنا ایک معروف بات ہے۔ تاریخ انسانی میں یہ بات پہلی مرتبہ پیش نہیں آئی۔ وہ لوگ خود حضرت ابراہیم وحضرت اسماعیل علیہما السلام کی اولاد ہیں، اور عرب ہی کی سرزمین میں حضرت ہود، حضرت صالح اور حضرت شعیب علیہم السلام مبعوث ہو چکے ہیں۔ اور موسیٰ علیہ السلام اور انبیائے بنی اسرائیل سے بھی وہ واقف ہیں، پس انکار کی یہ وجہ بھی معقول نہیں۔

تیسری وجہ: —— یا انھوں نے اپنے رسول کو پہچانا نہیں، پس وہ اس کو انجانا سمجھ رہے ہیں؟ —— یعنی کیا انکار کی یہ وجہ ہے کہ ایک بالکل اجنبی شخص ان کے سامنے یہ دعوت پیش کررہا ہے، اور وہ ڈر رہے ہیں کہ کہیں وہ چکمہ نہ دے جائے؟ ظاہر ہے یہ بات بھی نہیں۔ نبی ﷺ ان کی برادری کے آدمی ہیں۔ ان کی ذاتی زندگی ان سے چھپی ہوئی نہیں۔ ان کی بے داغ سیرت سے وہ خوب واقف ہیں۔ نبوت سے پہلے بھی وہ ان کو صادق وامین کہہ کر پکارتے تھے۔ ان کے کردار وعمل پر آج تک کسی نے کوئی شبہ ظاہر نہیں کیا، پھر یہ وجہ کیسے ہوسکتی ہے؟

چوتھی وجہ: —— یا وہ کہتے ہیں کہ اسے جنون ہے —— یعنی کیا ان کے انکار کی یہ وجہ ہے کہ ان کے نزدیک نبی ﷺ —— خاکم بدہن! —— پاگل ہیں، اور بہکی بہکی باتیں کرتے ہیں؟ ظاہر ہے کہ یہ وجہ بھی نہیں۔ ان کی دانائی اور زیرکی کے سب قائل ہیں۔ اور آج تک آپؐ جیسا فرزانہ نہ کوئی پیدا ہوا نہ ہوگا۔ دوست ہی نہیں دشمن بھی اس کی شہادت دیتے ہیں۔ پھر یہ وجہ کیسے ہوسکتی ہے؟

انکار کی اصل وجہ: —— بلکہ وہ ان کے پاس حق لایا ہے، اور ان میں سے اکثر حق سے نفرت کرنے والے ہیں —— یعنی نادان لوگوں کی عام روش یہ رہی ہے کہ جو بھی شخص حق بات کہتا ہے اس سے لوگ ناراض ہوجاتے ہیں۔ سچی بات سب کو کڑوی لگتی ہے، کیونکہ وہ ان کی خواہشات کے مطابق نہیں ہوتی۔ ان لوگوں کے انکار کی اصل وجہ یہی ان کی حق بیزاری ہے —— اور اگر حق ان کی خواہشات کی پیروی کرے تو آسمان وزمین اور جو لوگ ان میں ہیں سب یقیناً ہلاک ہوجائیں —— یعنی سچائی کسی کی خواہش کے تابع نہیں ہوسکتی، اگر اللہ تعالیٰ لوگوں کی خواہش پر چلیں تو وہ خدا کیا ہوئے، بندوں کے ہاتھوں کا کھلونا ہوگئے۔ اور ایسی صورت میں نظام عالم درہم برہم ہوجائے گا۔ قیامت کے قریب جب زمین شر وفساد سے بھر جائے گی، اور کوئی اللہ کا نام لینے والا نہ رہے گا تو دنیا ختم کردی جائے گی، کیونکہ اس کا مقصد فوت ہوگیا۔ پھر اس کو باقی رکھنے کا کیا فائدہ؟ دنیا خرمستی کی جگہ تھوڑے ہے؟! —— بلکہ ہم ان کے پاس ان کی نصیحت لائے ہیں، پس وہ اپنی نصیحت سے روگردانی کرنے والے ہیں —— یہ قرآن وہی نصیحت ہے جس کی وہ آرزو کیا کرتے تھے۔ وہ نبی ﷺ کی بعثت سے پہلے کہا کرتے تھے: ﴿لَوْ أَنَّ عِنْدَنَا ذِكْرًا مِّنَ الْأَوَّلِيْنَ، لَكُنَّا عِبَادَ اللّٰهِ الْمُخْلَصِيْنَ﴾ یعنی اگر ہمارے پاس کوئی نصیحت پہلے لوگوں کی طرح آتی تو ہم اللہ کے

چنیدہ بندے ہوتے (سورۃ الصافات آیات ۱۶۷و۱۶۸) اب جبکہ وہ نصیحت نامہ آگیا تو وہ اس سے منہ موڑے ہوئے ہیں۔ حالانکہ خیر خواہی کی بات اگرچہ کڑوی ہو، اپنا فائدہ سامنے رکھ کر قبول کرنی چاہئے۔

پانچویں وجہ: ـــــ یا آپؐ ان سے کچھ آمدنی طلب کرتے ہیں؟ ـــــ یعنی کیا انکار کی یہ وجہ ہے کہ نبی ﷺ دعوت وتبلیغ پر ان سے کچھ معاوضہ طلب کرتے ہیں اور وہ بوجھ ان کے لئے ناقابل برداشت ہے؟ ظاہر ہے یہ وجہ بھی نہیں۔ انبیاء کبھی اپنی خدمات کا صلہ بندوں سے طلب نہیں کرتے۔ وہ بے غرض انسانیت کی خدمت کرتے ہیں۔ ان کا اعتماد اللہ پر ہوتا ہے ـــــ پس آپ کے پروردگار کی آمدنی (یعنی ان کا بخشا ہوا رزق) بہتر ہے، اور وہ بہترین روزی دینے والے ہیں ـــــ آپؐ کے پروردگار نے آپؐ کو دارین میں جو روزی عنایت فرمائی ہے وہ لوگوں کے معاوضہ سے کہیں بہتر ہے۔ پھر وہ ان حقیر ٹکڑوں پر نظر کیوں رکھیں؟

چھٹی وجہ: ـــــ یا انکار کی وجہ یہ ہے کہ نبی ﷺ ان کو غلط راستے پر لے جارہے ہیں جبکہ وہ صحیح راستے پر ہیں۔ ایسی صورت میں عقلمندی کی بات یہ ہے کہ اندھا بن کر راہ نما کے پیچھے نہ چلا جائے۔ انکار کی یہ وجہ بھی موجود نہیں۔ ارشاد ہے ـــــ اور یقیناً آپؐ لوگوں کو سیدھے راستہ کی طرف بلارہے ہیں ـــــ یعنی آپ ﷺ جس راستہ کی طرف لوگوں کو بلارہے ہیں وہ بالکل سیدھا اور صاف راستہ ہے، فطرت کے مطابق ہے، ہر شخص یہ بات بوجھ سکتا ہے ـــــ اور یقیناً جو لوگ آخرت پر ایمان نہیں رکھتے وہ راستے سے بھٹکے ہوئے ہیں ـــــ یعنی وہ غلط راستے پر چل رہے ہیں، اور اس کی دلیل یہ ہے کہ وہ آخرت کا انکار کرتے ہیں، اور جو آخرت کا منکر ہو وہ صحیح راستے پر کیسے ہوسکتا ہے؟

ساتویں وجہ: ـــــ یا انکار کی وجہ اہل ایمان کی بدحالی ہے۔ وہ دیکھتے ہیں کہ ایمان قبول کرنے والے تنگ حالی میں مبتلا ہیں، اس لئے وہ سوچتے ہیں کہ اس دین کو قبول کرنے سے کیا فائدہ؟ اس کو بھی انکار کی وجہ بنانا درست نہیں۔ ارشاد ہے: ـــــ اور اگر ہم ان پر (یعنی خستہ حال مسلمانوں پر) مہربانی کریں، اور انہیں جو تکلیف (یعنی بدحالی لاحق) ہے اسے دور کردیں، تو (بھی) وہ (کفار) اپنی گمراہی میں اصرار کرتے ہوئے بھٹکتے رہیں گے ـــــ راہِ راست پر نہیں آئیں گے۔ یعنی مسلمانوں کے موجودہ حالات کسی مصلحت سے پتلے ہیں۔ اگر اللہ تعالیٰ کا ان پر کرم ہوجائے اور وہ خوش حال ہوجائیں تو بھی ان کفار کو ایمان کی دولت نہیں ملے گی۔ یہ گمراہی میں پیر پسارے رہیں گے، اور اسی میں سرگرداں رہیں گے۔ کیا انھوں نے خود اپنے احوال میں غور نہیں کیا؟ ـــــ اور البتہ واقعہ یہ ہے کہ ہم نے انہیں عذاب میں پکڑا، پس نہ تو انھوں نے اپنے پروردگار کے سامنے فروتنی کی اور نہ وہ گڑگڑائے ـــــ ۸ نبوی میں نبی ﷺ کی دعا سے مکہ میں قحط پڑا۔ صحیحین میں حضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہ کی روایت ہے کہ جب قریش نے

نبی ﷺ کی دعوت قبول کرنے سے پیہم انکار کیا اور سخت مزاحمت شروع کردی تو آپؐ نے دعا فرمائی: ''الٰہی! میری مدد فرما یوسف علیہ السلام جیسے سات سالہ قحط سے!'' چنانچہ ایسا قحط پڑا کہ مردار تک کھانے کی نوبت آ گئی۔ مگر کتے کی دُم موئے پر بھی ٹیڑھی! قریش کو ہوش نہ آیا —— غور کرو! خوش حالی کے بعد قحط سالی تو سخت ہوتی ہے، اور سختی میں تو خدا یاد آ ہی جاتا ہے، مگر قریش کو یاد نہ آیا۔ اور وہ جو بات سوچ رہے ہیں وہ تو برعکس معاملہ ہے یعنی مسلمانوں کی بدحالی خوش حالی سے بدل جائے۔ ایسی صورت میں تو غفلت اور گمراہی اور بڑھتی ہے —— قریش کو ہوش کب آئے گا؟ اس دن آئے گا جب ہوش آنے سے کوئی فائدہ نہ ہوگا۔ ارشاد ہے: —— یہاں تک کہ جب ہم ان پر سخت عذاب کا دروازہ کھول دیں گے تو وہ اچانک اس میں حیرت زدہ رہ جائیں گے —— یہ سخت عذاب کا دروازہ جنگِ بدر کے دن کھول دیا گیا۔ اور وہ ہکے بکے رہ گئے کہ ہائے یہ کیا ہو گیا، ہم کیا تھے اور کیا ہو گئے!

ذکر کا یہ مفہوم بھی لیا گیا ہے کہ نبی ﷺ کی دعوت قبول کرنے سے قریش کو عظیم شرف حاصل ہوگا اور دنیا میں ان کا نام روشن ہوگا۔

وَهُوَ الَّذِيٓ اَنْشَاَ لَكُمُ السَّمْعَ وَالْاَبْصَارَ وَالْاَفْـِٕدَةَ ۭ قَلِيْلًا مَّا تَشْكُرُوْنَ ۝ وَهُوَ الَّذِيْ ذَرَاَكُمْ فِي الْاَرْضِ وَاِلَيْهِ تُحْشَرُوْنَ ۝ وَهُوَ الَّذِيْ يُحْيٖ وَيُمِيْتُ وَلَهُ اخْتِلَافُ الَّيْلِ وَالنَّهَارِ ۭ اَفَلَا تَعْقِلُوْنَ ۝ بَلْ قَالُوْا مِثْلَ مَا قَالَ الْاَوَّلُوْنَ ۝ قَالُوْٓا ءَاِذَا مِتْنَا وَكُنَّا تُرَابًا وَّعِظَامًا ءَاِنَّا لَمَبْعُوْثُوْنَ ۝ لَقَدْ وُعِدْنَا نَحْنُ وَاٰبَاۗؤُنَا هٰذَا مِنْ قَبْلُ اِنْ هٰذَآ اِلَّآ اَسَاطِيْرُ الْاَوَّلِيْنَ ۝ قُلْ لِّمَنِ الْاَرْضُ وَمَنْ فِيْهَآ اِنْ كُنْتُمْ تَعْلَمُوْنَ ۝ سَيَقُوْلُوْنَ لِلّٰهِ ۭ قُلْ اَفَلَا تَذَكَّرُوْنَ ۝ قُلْ مَنْ رَّبُّ السَّمٰوٰتِ السَّبْعِ وَرَبُّ الْعَرْشِ الْعَظِيْمِ ۝ سَيَقُوْلُوْنَ لِلّٰهِ ۭ قُلْ اَفَلَا تَتَّقُوْنَ ۝ قُلْ مَنْۢ بِيَدِهٖ مَلَكُوْتُ كُلِّ شَيْءٍ وَّهُوَ يُجِيْرُ وَلَا يُجَارُ عَلَيْهِ اِنْ كُنْتُمْ تَعْلَمُوْنَ ۝ سَيَقُوْلُوْنَ لِلّٰهِ ۭ قُلْ فَاَنّٰى تُسْحَرُوْنَ ۝ بَلْ اَتَيْنٰهُمْ بِالْحَقِّ وَاِنَّهُمْ لَكٰذِبُوْنَ ۝ مَا اتَّخَذَ اللّٰهُ مِنْ وَّلَدٍ وَّمَا كَانَ مَعَهٗ مِنْ اِلٰهٍ اِذًا لَّذَهَبَ كُلُّ اِلٰهٍۢ بِمَا خَلَقَ وَلَعَلَا بَعْضُهُمْ عَلٰي بَعْضٍ ۭ سُبْحٰنَ اللّٰهِ عَمَّا يَصِفُوْنَ ۝

عٰلِمِ الۡغَيۡبِ وَ الشَّهَادَةِ فَتَعٰلٰى عَمَّا يُشۡرِكُوۡنَ ﴿۹۲﴾ؑ

ع ۵ / ۱۵ / ۵

وَهُوَ	اور وہ	وَلَهُ	اور اس کے لئے ہے	لَمَبۡعُوۡثُوۡنَ	البتہ دوبارہ زندہ کئے
الَّذِيۡۤ	جس نے	اخۡتِلَافُ	بدلنا		جائیں گے
اَنۡشَاَ	پیدا کئے	الَّيۡلِ	رات	لَقَدۡ	البتہ تحقیق
لَكُمُ	تمہارے لئے	وَالنَّهَارِ	اور دن کا	وُعِدۡنَا	وعدہ کئے گئے
السَّمۡعَ	کان	اَفَلَا	کیا پس نہیں	نَحۡنُ (۳)	ہم
وَالۡاَبۡصَارَ	اور آنکھیں	تَعۡقِلُوۡنَ	سمجھتے ہو تم	وَاٰبَآؤُنَا	اور ہمارے باپ دادا
وَالۡاَفۡـِٕدَةَ	اور دل	بَلۡ	بلکہ	هٰذَا	اس کا
قَلِيۡلًا مَّا (۱)	بہت ہی کم	قَالُوۡا	کہا انھوں نے	مِنۡ قَبۡلُ	اس سے پہلے
تَشۡكُرُوۡنَ	شکر بجالاتے ہو تم	مِثۡلَ (۲)	مانند	اِنۡ	نہیں ہے
وَهُوَ	اور وہ	مَا	اس کے جو	هٰذَاۤ	یہ بات
الَّذِيۡ	جس نے	قَالَ	کہا	اِلَّاۤ	مگر
ذَرَاَكُمۡ	پھیلایا تم کو	الۡاَوَّلُوۡنَ	اگلوں نے	اَسَاطِيۡرُ (۴)	بے سند باتیں
فِى الۡاَرۡضِ	زمین میں	قَالُوۡۤا	کہا انھوں نے	الۡاَوَّلِيۡنَ	اگلے لوگوں کی
وَاِلَيۡهِ	اور اس کی طرف	ءَاِذَا	کیا جب	قُلۡ	آپ پوچھیں
تُحۡشَرُوۡنَ	جمع کئے جاؤ گے تم	مِتۡنَا	مرجائیں گے ہم	لِّمَنِ	کس کے لئے ہے
وَهُوَ	اور وہ	وَكُنَّا	اور ہوجائیں گے ہم	الۡاَرۡضُ	زمین
الَّذِيۡ	جو	تُرَابًا	مٹی	وَمَنۡ	اور جو لوگ
يُحۡيٖ	جلاتا ہے	وَّعِظَامًا	اور ہڈیاں	فِيۡهَاۤ	اس میں ہیں
وَيُمِيۡتُ	اور مارتا ہے	ءَاِنَّا	کیا بیشک ہم	اِنۡ	اگر

(۱) ما: زائدہ قلت کی تاکید کے لئے ہے۔ (۲) مِثۡلَ: ما کی طرف مضاف ہے، پھر مرکب اضافی مفعول بہ ہے۔ (۳) نَحۡنُ: ضمیر فصل ہے، ضمیر متصل پر عطف کے لئے کسی چیز کا فصل ضروری ہے۔ (۴) أساطیر: أُسۡطُوۡرَةٌ کی جمع ہے۔ مذہبی جھوٹی داستان، من گھڑت بات۔ سَطَرَ (ن) سَطۡرًا: لکھنا۔

كُنْتُمْ	تم ہو	مَنْ	کون ہے	مَا	نہیں
تَعْلَمُوْنَ	جانتے؟	بِيَدِهٖ	جس کے ہاتھ میں	اتَّخَذَ	بنائی
سَيَقُوْلُوْنَ	اب کہیں گے	مَلَكُوْتُ (۱)	سلطنت ہے	اللّٰهُ	اللہ نے
لِلّٰهِ	اللہ کے لئے	كُلِّ شَيْءٍ	ہر چیز کی	مِنْ وَّلَدٍ	کوئی اولاد
قُلْ	آپ کہیں	وَّهُوَ	اور وہ	وَّمَا	اور نہیں
اَفَلَا	کیا پس نہیں	يُجِيْرُ (۲)	پناہ دیتا ہے	كَانَ	ہے
تَذَكَّرُوْنَ	نصیحت پذیر ہوتے تم؟	وَلَا يُجَارُ (۳)	اور نہیں پناہ دی جاتی	مَعَهٗ	اس کے ساتھ
قُلْ	آپ پوچھیں	عَلَيْهِ	اس کے مقابلہ میں	مِنْ اِلٰهٍ	کوئی معبود
مَنْ	کون	اِنْ	اگر	اِذًا	تب تو
رَّبُّ	پروردگار ہے	كُنْتُمْ	ہو تم	لَّذَهَبَ	البتہ جاتا
السَّمٰوٰتِ	آسمانوں کا	تَعْلَمُوْنَ	جانتے؟	كُلُّ اِلٰهٍ	ہر معبود
السَّبْعِ	سات	سَيَقُوْلُوْنَ	اب کہیں گے	بِمَا	اس کے ساتھ جو
وَرَبُّ	اور پروردگار ہے	لِلّٰهِ	اللہ کے لئے	خَلَقَ	پیدا کیا اس نے
الْعَرْشِ	تختِ شاہی کا	قُلْ	آپ کہیں	وَلَعَلَا	اور البتہ چڑھائی کرتا
الْعَظِيْمِ	بڑے؟	فَاَنّٰى	پس کیوں	بَعْضُهُمْ	ان کا بعض
سَيَقُوْلُوْنَ	اب کہیں گے	تُسْحَرُوْنَ (۴)	سحر زدہ ہو رہے ہو تم	عَلٰى بَعْضٍ	بعض پر
لِلّٰهِ	اللہ کے لئے	بَلْ	بلکہ	سُبْحٰنَ	پاک ہے
قُلْ	آپ کہیں	اَتَيْنٰهُمْ	لائے ہیں ہم انکے پاس	اللّٰهِ	اللہ
اَفَلَا	کیا پس نہیں	بِالْحَقِّ	برحق بات	عَمَّا	اس سے جو
تَتَّقُوْنَ	ڈرتے ہو تم	وَاِنَّهُمْ	اور بیشک وہ	يَصِفُوْنَ	بیان کرتے ہیں وہ
قُلْ	آپ پوچھیں	لَكٰذِبُوْنَ	البتہ جھوٹے ہیں	عٰلِمِ (۵)	جاننے والا

(۱) **ملکوت**: عظیم الشان سلطنت (مصدر برائے مبالغہ) یہ لفظ اللہ تعالیٰ کی سلطنت کے لئے خاص ہے۔(۲) **أَجَارَ**: پناہ دینا، مدد کرنا(۳) **يُجَارُ**: يُجِيرُ کا مجہول ہے۔(۴) **سَحَرَ فُلَانًا**: جادو کرنا، فریفتہ بنالینا(۵) **عالم**: یا تو **اللّٰه** سے بدل ہے یا اس کی صفت۔

الْغَيْبِ	پوشیدہ کا	فَتَعٰلٰى	پس بالاتر ہے وہ	يُشْرِكُوْنَ	شریک ٹھہراتے ہیں
وَالشَّهَادَةِ	اور آشکارا کا	عَمَّا	اس سے جس کو		وہ

ان آیاتِ پاک میں اللہ تعالیٰ کی قدرتِ کاملہ اور عظمتِ قاہرہ کا بیان ہے۔اور ضمناً حیات بعد الموت اور توحید کا تذکرہ آیا ہے۔ پہلے اللہ تعالیٰ کے تین کارنامے ذکر فرمائے ہیں، پھر بعث بعد الموت کے منکرین کا قول ذکر کیا ہے۔ پھر مشرکین سے تین سوالات کئے ہیں۔اس کے بعد شرک کی تردید کی ہے۔ یہ آیات کا خلاصہ ہے۔اب تفصیل پڑھیں:

پہلا کارنامہ: ــــ اور اللہ تعالیٰ وہ ہستی ہے جس نے تمہارے لئے کان اور آنکھیں اور دل بنائے ــــ یعنی اللہ تعالیٰ نے یہ چند عظیم نعمتیں تمہیں بخشی ہیں۔ حواس ظاہرہ اور ادراک کی قوت عنایت فرمائی ہے۔ کان اس لئے دیئے ہیں کہ آیاتِ تنزیلیہ سنو، آنکھیں اس لئے دی ہیں کہ آیاتِ تکوینیہ دیکھو، اور دل و دماغ اس لئے دیئے ہیں کہ دونوں طرح کی آیتوں کو سمجھو۔ مگر ــــ تم بہت ہی کم شکر بجالاتے ہو ــــ یعنی اللہ کی بخشی ہوئی ان صلاحیتوں کو بہت کم لوگ ان کے مصرف میں خرچ کرتے ہیں۔ آنکھوں سے سب کچھ دیکھتے ہیں مگر اللہ کی نشانیاں نہیں دیکھتے۔ کانوں سے سب کچھ سنتے ہیں مگر اللہ کی آیتیں نہیں سنتے۔ دل و دماغ سے سب کچھ سوچتے ہیں مگر جو بات سوچنی چاہئے وہی نہیں سوچتے۔ یہ ان نعمتوں کی ناشکری ہے۔

دوسرا کارنامہ: ــــ اور اللہ وہ ہستی ہے جس نے تم کو زمین میں پھیلایا، اور اسی کی طرف تم جمع کئے جاؤ گے ــــ یعنی اللہ تعالیٰ نے انسان کو زمین سے پیدا کر کے زمین میں پھیلا دیا۔ مگر وہ اللہ کے اختیار واقتدار سے باہر نہیں ہوگیا۔ اس کو حیاتِ مستعار پوری کر کے اللہ ہی کی طرف لوٹنا ہے۔

تیسرا کارنامہ: ــــ اور اللہ وہ ہستی ہے جو جلاتا ہے اور مارتا ہے، اور اسی کے اختیار میں رات دن کا آگے پیچھے آنا ہے، پس کیا تم سمجھتے نہیں؟ ــــ یعنی موت وحیات کا سرا انہی کے ہاتھ میں ہے۔ وہی رات کے پیچھے دن کو اور دن کے پیچھے رات کو لاتے ہیں۔ یہ انقلاب شب وروز تمہارے مشاہدہ میں آتا رہتا ہے، پھر بھی تمہاری سمجھ میں حیات بعد الموت نہیں آتی۔

بعث بعد الموت کے منکرین کا قول: ــــ بلکہ یہ لوگ ویسی ہی بات کہتے ہیں جیسی اگلوں نے کہی ہے۔ انھوں نے کہا: ''کیا جب ہم مر جائیں گے، اور مٹی اور ہڈیاں ہو جائیں گے، تو کیا ہم دوبارہ زندہ کئے جائیں گے؟'' ــــ یعنی ان کے خیال میں مرنے اور گل سڑ جانے کے بعد دوبارہ زندہ ہونا ناممکن ہے ــــ ''البتہ واقعہ یہ ہے کہ ہم سے اور ہمارے بڑوں سے اس کا پہلے سے وعدہ کیا گیا ہے'' ــــ یعنی یہ عقل سے بعید بات جو آج ہم سے

کہی جارہی ہے، پہلے بھی ہمارے باپ دادوں سے کہی گئی تھی۔ لیکن ہم نے تو آج تک خاک کے ذرّوں اور ہڈیوں کے پنجر کو زندہ ہوتے دیکھا نہیں ـــــ ''یہ کچھ نہیں محض مذہبی جھوٹی داستانیں ہیں!'' ـــــ یعنی سب قصے کہانیاں ہیں جو پہلے لوگ گھڑ گئے ہیں۔ اور وہ منقول ہوتی چلی آرہی ہیں۔

پہلا سوال: ـــــ آپ پوچھیں: زمین اور جو لوگ اس میں ہیں کس کے ہیں؟ اگر تم جانتے ہو ـــــ تو بتاؤ؟ ـــــ وہ ابھی کہیں گے: ''اللہ کے ہیں!'' ـــــ یعنی وہ فوراً جواب دیں گے کہ زمین پر اور زمینی چیزوں پر اللہ ہی کا قبضہ ہے ـــــ مشرکین عرب کائنات کے پیدا کرنے میں، اور عظیم الشان امور کی تدبیر وانتظام میں نہ کسی کو اللہ کا شریک وساجھی مانتے تھے، نہ کسی کے لئے اللہ کے قطعی فیصلہ کو رد کرنے کی قدرت ثابت کرتے تھے۔ وہ صرف لوگوں کے معاملات میں اور بشری ضرورتوں میں دوسروں کو اللہ کا شریک گردانتے تھے۔ ان کا گمان تھا کہ جس طرح ایک عظیم الشان بادشاہ اپنی رعایا کا انتظام خود نہیں کرتا، بلکہ ان کے معاملات کا نظم ونسق مقربینِ بارگاہ کو سونپ دیتا ہے، اور رعایا پر ان کی اطاعت واجب کرتا ہے، اور ان کی سفارش ان کے خداموں اور حاشیہ برداروں کے حق میں قبول کرتا ہے، اسی طرح اللہ تعالیٰ نے بھی اپنے بعض مقرب بندوں کو خدائی کا مرتبہ عطا فرمایا ہے، اور اپنے دوسرے بندوں کے معاملات کا نظم ونسق ان کو سونپ دیا ہے۔ اس لئے ان مقرب بندوں کو خوش رکھنا ضروری ہے، تاکہ آڑے وقت میں وہ سفارش کریں اور بگڑی بنادیں، نیز ان کے توسط سے اللہ تعالیٰ تک رسائی بھی ممکن ہوجائے ـــــ حالانکہ یہ سب خیالی باتیں ہیں۔ قرآن کریم نے جگہ جگہ اس کی تردید کی ہے اللہ تعالیٰ نے کسی کو بھی اپنے معاملات کا اختیار نہیں سونپا۔ وہ کائنات کا نظم ونسق خود چلارہے ہیں ـــــ آپ کہیں: ''پس کیا تم نصیحت پذیر نہیں ہوتے؟!'' ـــــ یعنی کیا تم غور نہیں کرتے پھر تمہاری مشتِ خاک اس کے قبضۂ قدرت سے باہر کیسے ہوجائے گی؟ وہ تمہیں دوبارہ زندہ کیوں نہ کرسکے گا؟

دوسرا سوال: ـــــ آپ پوچھیں: ''ساتوں آسمانوں کا اور عظیم تختِ شاہی کا پروردگار کون ہے؟'' ـــــ عرش کے معنی ہیں: تختِ شاہی۔ اور اللہ کا عرش ایک مخلوق ہے جس کو اللہ تعالیٰ نے پیدا کیا ہے، اور فرشتوں کو مقرر کیا ہے جو اس کو اٹھائے ہوئے ہیں۔ اور ان کو حکم دیا ہے کہ اس کی تعظیم وطواف کریں۔ اس سے زیادہ عرش کی حقیقت بشر کو معلوم نہیں۔ قرآن کریم میں اس کی تین صفتیں آئی ہیں۔ عظیم، کریم اور مجید۔ عرش اپنے احاطہ کے اعتبار سے ''عظیم'' ہے، کیونکہ وہ سب اجسام سے بڑا ہے۔ حدیث میں ہے: ''ساتوں آسمان اور ساتوں زمینیں کرسی کے مقابلہ میں ایسی ہیں جیسے جنگل میں کوئی انگوٹھی پڑی ہو، اور یہی حال کرسی کا عرش کے مقابلہ میں ہے'' ـــــ اور وہ اپنے مقام ومرتبہ کے اعتبار سے ''کریم'' ہے۔ کیونکہ عرش کو ان سب چیزوں پر مزیت حاصل ہے جو اس کے احاطہ میں ہیں، اور اسی

اعتبار سے وہ مجید (بزرگ) ہے ـــــ اور عرش (تختِ شاہی) نظم وانتظام سے کنایہ بھی ہوتا ہے۔ یہاں یہی معنی مراد ہیں۔ یعنی ساتوں آسمانوں اور ساری کائنات کا نظم وانتظام کون سنبھالے ہوئے ہے؟ ـــــ وہ ابھی کہیں گے: ''اللہ کے لئے (پروردگاری) ہے!'' ـــــ یعنی کوئی بھی دوسرا اس کے اقتدار واختیار میں شریک وسہیم نہیں ـــــ آپ کہیں: ''پس کیا تم ڈرتے نہیں!'' ـــــ یعنی اس کی کامل قدرت کا اعتراف بھی کرتے ہو، اور ساتھ ہی شرک بھی کرتے ہو، کیا تمہیں اس کی سزا کا خوف نہیں؟

تیسرا سوال: ـــــ آپ پوچھیں: ''کون ہے جس کے ہاتھ میں ہر چیز کی بادشاہت ہے؟'' ـــــ یعنی ہر چیز پر کامل اقتدار کس کا ہے؟ اور ہر چیز پر مالکانہ تصرف کس کو حاصل ہے؟ ـــــ ''اور وہ پناہ دیتا ہے، اور اس کے مقابلہ میں کوئی پناہ نہیں دے سکتا؟'' ـــــ یعنی جسے چاہتا ہے اپنی پناہ میں لے لیتا ہے، اور آفات وبلیات اور عذاب سے بچالیتا ہے، اور اس کے مجرم کو کوئی پناہ نہیں دے سکتا۔ بتاؤ ایسی ہستی کون ہے ـــــ اگر تم جانتے ہو؟ ـــــ وہ ابھی کہیں گے: ''ایسی ہستی اللہ کی ہے!'' ـــــ آپ کہیں: پس تم کیوں سحر زدہ ہو رہے ہو؟! ـــــ یعنی مقدماتِ توحید تو تمہیں سب تسلیم ہیں، اور ان کے قدرتی اور لازمی نتیجہ سے انکار ہے۔ آخر یہ تم پر کس کا جادو چل گیا ہے؟ کیا تمہاری سمجھ میں یہ بات نہیں آتی کہ جو کسی چیز کا مالک نہیں وہ اللہ کا شریک وسہیم کیسے ہوگیا؟ جسے کوئی اختیار حاصل نہیں وہ بندگی کا مستحق کیسے ہوگیا؟ اور تم خود مانتے ہو کہ اللہ کے مقابلہ میں کوئی پناہ دینے والا نہیں، پھر اس سے غداری اور بے وفائی کیوں کرتے ہو؟!

توحید کا بیان: ـــــ بلکہ ہم ان کے پاس حق بات لائے ہیں ـــــ یعنی یہ بات لائے ہیں کہ معبود برحق صرف اللہ تعالیٰ ہیں ـــــ اور وہ لوگ یقیناً جھوٹے ہیں ـــــ جو کہتے ہیں کہ مسیح علیہ السلام اللہ کے بیٹے ہیں، یا فرشتے اللہ کی بیٹیاں ہیں ـــــ اللہ نے کوئی اولاد اختیار نہیں کی ـــــ نہ اولاد کا ہونا ان کے شایانِ شان ہے ـــــ اور نہ ان کے ساتھ کوئی اور معبود ہے، اگر ایسا ہوتا تو ہر خدا اپنی مخلوق کو لے کر علحدہ ہوجاتا، اور ضرور ایک دوسرے پر چڑھائی کردیتا ـــــ اس مختصر بلیغ فقرہ میں ''برہانِ تمانع'' کا بیان ہے۔ اس کی تفصیل یہ ہے کہ خدا وہی ہوسکتا ہے جو اپنی ذات وصفات میں کامل ہو، اس میں کسی حیثیت سے کوئی کمی نہ ہو۔ اب فرض کرو: دو یا چند خدا ہوں تو سب اسی شان کے ہونگے۔ پھر نظام عالم یا تو ان کے کلی اتفاق سے چلے گا یا ان میں اختلاف بھی ہوگا ـــــ اتفاق کی صورت میں دو احتمال ہیں: یا تو اکیلے ایک خدا سے کام نہیں چل سکتا یا چل سکتا ہے۔ بصورتِ اول: دونوں میں سے کوئی بھی کامل قدرت والا نہ ہو۔ اور بصورتِ ثانی ایک خدا بیکار رہا۔ جب ایک سے کام چل سکتا ہے تو دوسرے کی کیا ضرورت ہے؟

خدا تو اسی لئے ماننا پڑتا ہے کہ اس کے بغیر چارہ نہیں ـــــ اور اختلاف کی صورت میں بھی دو احتمال ہیں: یا تو کوئی مغلوب ہو جائے گا یا برابر کا مقابلہ رہے گا؟ بصورتِ اول جو مغلوب ہو گیا وہ خدا نہ ہوا۔ اور بصورتِ ثانی نظام عالم درہم برہم ہو جائے گا۔ اس آیت میں دلیل کا یہی حصہ مذکور ہے۔ یعنی جب چند خداؤں میں رسّہ کشی شروع ہو گی تو ہر چیز ٹوٹ پھوٹ کر برابر ہو جائے گی۔ دنیا کی جنگوں میں ہم دیکھتے ہیں کیسی ابتری پھیلتی ہے ـــــ حالانکہ نظام عالم کامل استحکام کے ساتھ چل رہا ہے۔ یہ دلیل ہے کہ خدا ایک ہی ہے، اور وہی نظام چلا رہا ہے (یہی دلیل سورۃ بنی اسرائیل آیت ۴۲ میں بھی ہے) ـــــ پس پاک ہیں اللہ تعالیٰ ان باتوں سے جو وہ (مشرکین) بیان کرتے ہیں ـــــ یعنی انہیں نہ اولاد کی ضرورت ہے، نہ کوئی دوسرا خدائی میں شریک وسہیم ہے ـــــ وہ پوشیدہ اور آشکارا کو جاننے والے ہیں ـــــ یعنی ان کا علم ہر چیز پر محیط ہے۔ کوئی ظاہر و باطن اور غیب و شہادت ان کے علم سے سے پوشیدہ نہیں۔ پھر ان کو مددگار کی کیا ضرورت ہے؟ ـــــ پس وہ برتر ہیں ان سے جن کو وہ شریک ٹھہراتے ہیں ـــــ یعنی جب برابری نہیں تو مشارکت کیسی؟!

> **دنیا کے بادشاہوں کی طرح خدا کے علم کو محدود ماننا بھی شرک ہے، اور کسی نبی یا ولی کو ما کان وما یکون کا عالم ماننا بھی شرک ہے۔**

قُلْ رَّبِّ اِمَّا تُرِيَنِّيْ مَا يُوْعَدُوْنَ ﴿۹۳﴾ رَبِّ فَلَا تَجْعَلْنِيْ فِي الْقَوْمِ الظّٰلِمِيْنَ ﴿۹۴﴾ وَاِنَّا عَلٰٓى اَنْ نُّرِيَكَ مَا نَعِدُهُمْ لَقٰدِرُوْنَ ﴿۹۵﴾ اِدْفَعْ بِالَّتِيْ هِيَ اَحْسَنُ السَّيِّئَةَ ۭ نَحْنُ اَعْلَمُ بِمَا يَصِفُوْنَ ﴿۹۶﴾ وَقُلْ رَّبِّ اَعُوْذُ بِكَ مِنْ هَمَزٰتِ الشَّيٰطِيْنِ ﴿۹۷﴾ وَاَعُوْذُ بِكَ رَبِّ اَنْ يَّحْضُرُوْنِ ﴿۹۸﴾ حَتّٰٓى اِذَا جَاۗءَ اَحَدَهُمُ الْمَوْتُ قَالَ رَبِّ ارْجِعُوْنِ ﴿۹۹﴾ لَعَلِّيْٓ اَعْمَلُ صَالِحًا فِيْمَا تَرَكْتُ كَلَّا ۭ اِنَّهَا كَلِمَةٌ هُوَ قَاۗىِٕلُهَا ۭ وَمِنْ وَّرَاۗىِٕهِمْ بَرْزَخٌ اِلٰى يَوْمِ يُبْعَثُوْنَ ﴿۱۰۰﴾

قُلْ	آپ کہیں	تُرِيَنِّيْ (۲)	آپ ضرور دکھائیں مجھے	رَبِّ	اے میرے رب!
رَّبِّ	اے میرے رب!	مَا (۳)	جو	فَلَا	پس نہ
اِمَّا (۱)	اگر	يُوْعَدُوْنَ	وعدہ کئے گئے ہیں وہ	تَجْعَلْنِيْ	بنائیں آپ مجھے

(۱) اِمَّا: اِنْ شرطیہ اور ما زائدہ سے مرکب ہے۔ (۲) تُرِيَنِّيْ: اِراءۃ سے فعل مضارع با نون تاکید، صیغہ واحد مذکر حاضر نون وقایہ ی ضمیر واحد متکلم۔ مفعولِ اول۔ (۳) ما یوعدون: مفعول ثانی۔

فِي الْقَوْمِ	لوگوں میں	وَ قُلْ	اور آپ کہیں	قَالَ	(تو) کہے گا وہ
الظّٰلِمِيْنَ	ظلم کرنے والے	رَّبِّ	اے میرے رب!	رَبِّ	اے میرے رب!
وَاِنَّا	اور بیشک ہم	اَعُوْذُ	پناہ چاہتا ہوں میں	ارْجِعُوْنِ (٦)	لوٹائیں آپ مجھے
عَلٰٓى اَنْ	اس پر کہ	بِكَ	آپ کی	لَعَلِّيْٓ	تاکہ میں
نُّرِيَكَ	دکھائیں ہم آپ کو	مِنْ هَمَزٰتِ (٣)	وسوسوں سے	اَعْمَلُ	کروں
مَا	جو	الشَّيٰطِيْنِ	شیطانوں کے	صَالِحًا	نیک کام
نَعِدُهُمْ	وعدہ کررہے ہیں ہم ان سے	وَاَعُوْذُ	اور پناہ چاہتا ہوں میں	فِيْمَا	اس میں جو
لَقٰدِرُوْنَ	البتہ قادر ہیں	بِكَ	آپ کی	تَرَكْتُ	چھوڑ آیا میں
اِدْفَعْ	ہٹائیے	رَبِّ	اے میرے رب!	كَلَّا	ہرگز نہیں
بِالَّتِيْ (١)	اس بات کے ذریعہ جو	اَنْ (٤)	اس سے کہ	اِنَّهَا	بیشک وہ بات
هِيَ	وہ	يَّحْضُرُوْنِ (٥)	حاضر ہوں وہ میرے	كَلِمَةٌ	ایک بات ہے
اَحْسَنُ	اچھی ہے		پاس	هُوَ	وہ شخص
السَّيِّئَةَ (٢)	برائی کو	حَتّٰٓى	یہاں تک کہ	قَآئِلُهَا	اس کو کہنے والا ہے
نَحْنُ	ہم	اِذَا	جب	وَمِنْ وَّرَآئِهِمْ	اور ان کے پیچھے
اَعْلَمُ	خوب جانتے ہیں	جَآءَ	آجائے	بَرْزَخٌ (٧)	ایک آڑ ہے
بِمَا	اس کو جو	اَحَدَهُمُ	ان میں سے کسی کو	اِلٰى يَوْمِ	اس دن تک
يَصِفُوْنَ	بیان کرتے ہیں وہ	الْمَوْتُ	موت	يُبْعَثُوْنَ	کہ اٹھائے جائیں گے وہ

(۱) **بالتی أی بالخصلة التی** یعنی موصوف محذوف ہے۔(۲) **السیئة: ادفع** کا مفعول بہ ہے۔(۳) **هَمَزَات: هَمَزَة** کی جمع: شیطانی وسوسہ، نفسانی خطرہ، برا خیال جو شیطان دل میں ڈالے، هَمَزَهٗ (ض) هَمْزًا: کوئی چیز چبھانا۔ گھوڑے کو مہمیز کرنا، گدگدی کرنا۔(۴) أَنْ سے پہلے مِنْ محذوف ہے۔(۵) **یحضرون** کے آخر میں ی محذوف ہے۔(۶) اِرْجِعُوْنِ: فعل امر، صیغہ جمع مذکر حاضر، رَجَعَ (ض) رُجوعاً: عام طور پر لازم آتا ہے، بمعنی لوٹنا، واپس آنا، مگر یہ کبھی متعدی بھی آتا ہے بمعنی لوٹانا۔ یہاں متعدی ہے، اسی طرح سورۃ التوبہ (آیت ۸۳) فَإِنْ رَّجَعَكَ اللّٰهُ میں بھی متعدی ہے۔ اور جمع حاضر کا صیغہ اگر مخاطب اللہ تعالیٰ ہیں تو برائے تعظیم ہے۔ اور اگر مخاطب ملائکہ ہیں تو ٹھیک ہے۔ اور آخر میں ی محذوف ہے۔(۷) **برزخ**: معرب ہے، کہتے ہیں کہ فارسی لفظ ''پردہ'' کی عربی ہے واللہ اعلم

عذاب کی پیشین گوئی: پچھلی آیات میں یہ بات بیان ہوئی ہے کہ مشرکین اللہ تعالیٰ کی شان میں گستاخی کرتے ہیں۔اس کے لئے اولاد تجویز کرتے ہیں۔اس کے لئے مخلوق جیسا ناقص علم ثابت کرتے ہیں اور مددگار تجویز کرتے ہیں۔ان کو ہر چند سمجھایا گیا مگر ٹس سے مس نہیں ہوتے۔اسی طرح وہ رسول اللہ ﷺ کی شان میں ہرزہ سرائی کرتے ہیں، بیہودہ باتیں بکتے ہیں، طرح طرح کے اعتراضات کرتے ہیں اور ایذا رسانی کا کوئی موقع ہاتھ سے نہیں جانے دیتے، اس لئے ان آیات پاک میں ان کو دنیا ہی میں آنے والے عذاب کی خبر دی جارہی ہے۔اور ایسے لطیف پیرائے میں دی جارہی ہے کہ قرآن کی بلاغت پر قربان ہونے کو جی چاہتا ہے۔ارشاد ہے: ـــــ آپؐ کہیں: ''اے میرے پروردگار! اگر آپ مجھے وہ عذاب دکھائیں جس کا ان لوگوں سے وعدہ کیا گیا ہے، تو اے میرے پروردگار! مجھے ان ظالموں میں شامل نہ کریں!'' ـــــ اور بیشک ہم اس پر پوری طرح قادر ہیں کہ آپؐ کو وہ عذاب دکھادیں جس کا ہم ان سے وعدہ کر رہے ہیں ـــــ ان تین آیتوں میں یہ بات کہی گئی ہے کہ یہ بات تو طے ہے کہ ان سرکشوں پر دنیا ہی میں اور آپ ﷺ کی حیاتِ مبارکہ ہی میں عذاب آئے گا۔اور وہ عذاب اتنا سخت ہوگا کہ خود نبی ﷺ کو اور مؤمنین کو اس سے پناہ مانگنی چاہئے۔دعا کرنے کا حکم اس وجہ سے نہیں ہے کہ یہ امر محتمل ہے۔ بلکہ عذاب کی سنگینی ظاہر کرنا مقصود ہے۔جس ذات تک اس عذاب کے پہنچنے کا قطعاً امکان نہیں اس کو بھی پناہ چاہنے کا حکم ہے۔پس جو لوگ اس عذاب کے مستحق ہیں ان کو کتنا ڈرنا چاہئے یہ بات ظاہر ہے۔

فائدہ: جب کسی قوم پر عذاب نازل ہوتا ہے تو بعض مرتبہ اس کا اثر نیک لوگوں تک بھی پہنچتا ہے۔گو آخرت میں ان کو عذاب نہ ہو، بلکہ اجر ملے۔مگر دنیا میں وہ بھی عذاب کی لپیٹ میں آجاتے ہیں۔اس لئے ہر شخص کو یہ دعا کرنی چاہئے کہ الٰہی! اگر ماحول میں پھیلی ہوئی برائیوں کی وجہ سے عذاب نازل ہو تو میری حفاظت فرما۔ایسا نہ ہو کہ میں بھی اس کی لپیٹ میں آجاؤں۔دعا کے عربی الفاظ یہ ہونے چاہئیں: ﴿ **رَبِّ إِمَّا تُرِيَنِّيْ مَا يُوْعَدُوْنَ، رَبِّ فَلَا تَجْعَلْنِيْ فِيْ الْقَوْمِ الظّٰلِمِيْنَ** ﴾ اللہ تعالیٰ ہمیں یہ دعا مانگنے کی توفیق عطا فرمائیں (آمین)

آپؐ برے برتاؤ کو ایسے برتاؤ سے دفع کریں جو کہ وہ اچھا ہو۔ہم خوب جانتے ہیں ان باتوں کو جو وہ بیان کرتے ہیں ـــــ یہ مکارم اخلاق کی تعلیم ہے۔یعنی آپ ﷺ کے بلند مقام اور اعلیٰ اخلاق کا مقتضی یہ ہے کہ آپ مخالفین کی برائی کو بھلائی سے ہٹائیں۔جواب ترکی بہ ترکی نہ دیں۔ان کی نازیبا حرکتوں کا سنجیدگی اور متانت سے توڑ کریں۔اور ان کی بیہودہ بکواس کو نظر انداز کریں۔اللہ تعالیٰ ان کی حرکتوں سے واقف ہیں۔وہ وقت پر اس کی کافی سزادیں گے۔آپؐ کے نرم برتاؤ کا اثر یہ ہوگا کہ لوگ آپؐ کی طرف جھکیں گے اور دعوت کا مقصد پورا ہوگا ـــــ رہا جہاد

وقتال کا مسئلہ تو وہ ایک دینی فریضہ ہے۔اس کی ضرورت سے جو کام ضروری ہیں وہ مامور بہ ہیں۔وہ مکارم اخلاق کے منافی نہیں۔جیسے غذا کے لئے جانور ذبح کرنا ایک معاشی ضرورت ہے جو جائز ہے۔مگر تفریح کے طور پر کسی جانور کو مارنا، یا چاند ماری کے لئے کسی جانور کو نشانہ بنانا، یا ذبح کرتے وقت غیر ضروری تکلیف پہنچانا ممنوع ہے۔اسی طرح جہاد میں عورتوں اور بچوں کو قتل کرنا، شہریوں اور مذہبی لوگوں کو مارنا، اور دشمن کی لاشوں کو بگاڑنا ممنوع ہے۔ کیونکہ یہ باتیں غیر ضروری اور حُسنِ اخلاق کے منافی ہیں۔

اور آپؐ کہیں: ''اے میرے پروردگار! میں آپ کی پناہ چاہتا ہوں شیاطین کے وسوسوں سے، اور میں آپ کی پناہ چاہتا ہوں اس سے کہ وہ (شیاطین) میرے پاس آئیں'' ـــــ یعنی کبھی بلند اخلاق آدمی کو بھی بے اختیار غصہ آجاتا ہے۔تو یہ شیطان کا وسوسہ ہے، وہ نہیں چاہتا کہ انسان حُسنِ اخلاق کا پیکر بنے۔اور دعوت کے مقصد میں کامیابی حاصل کرے۔اس کا علاج استعاذہ (پناہ چاہنا) ہے جو شخص اللہ کی پناہ میں آجاتا ہے شیاطین کے شر سے محفوظ ہوجاتا ہے ـــــ صحیح مسلم میں روایت ہے کہ نبی ﷺ نے فرمایا: ''شیطان تمہارے ہر کام میں اور ہر حال میں تمہارے پاس آتا ہے اور وسوسہ اندازی کرتا ہے'' اس سے پناہ مانگنے کے لئے یہ دعا تلقین کی گئی ہے۔یہ شیطان کے شر اور مکر سے بچنے کے لئے ایک جامع دعا ہے۔غصہ کی حالت میں جبکہ انسان کو اپنے نفس پر قابو نہیں رہتا یہ دعا ضرور مانگنی چاہئے۔اسی طرح شیاطین وجنات کے دوسرے حملوں سے بچنے کے لئے بھی یہ دعا مجرب ہے۔دعا کے الفاظ یہ ہونے چاہئیں: ﴿رَبِّ أَعُوْذُ بِكَ مِنْ هَمَزَاتِ الشَّيَاطِيْنِ، وَأَعُوْذُ بِكَ رَبِّ أَنْ يَّحْضُرُوْنِ﴾ یعنی پروردگار! شیطانوں کے وسوسوں سے حفاظت فرما اور کسی حال میں بھی شیطانوں کو میرے پاس نہ آنے دے! ـــــ آج کل بہت سے مسلمانوں کے گھر جنات کی آماجگاہ بنے ہوئے ہیں، وہ آسیبی اثرات کا شکار ہیں۔وہ لوگ اگر اس دعا کا اہتمام کریں تو بلائیں دور ہوں۔کیونکہ شیاطین الانس کا علاج تو ممکن ہے۔برے لوگوں سے دور رہا جائے۔مگر شیاطین الجن کا علاج اللہ تعالیٰ کی پناہ کے بغیر ممکن نہیں۔

رہے کفار تو شیاطین ان کے دلوں میں برابر وسوسے ڈالتے رہیں گے۔شرک وکفر اور بداعمالیوں میں مبتلا رکھیں گے۔اور موت تک ان کا پیچھا نہیں چھوڑیں گے۔ان کو موت کے بعد ہی ہوش آئے گا۔مگر اس وقت ہوش آنے سے کیا فائدہ؟ ارشاد ہے: ـــــ یہاں تک کہ جب ان میں سے کسی کو موت آئے گی تو وہ کہے گا: ''اے میرے پروردگار! مجھے واپس بھیج دیجئے، تاکہ میں نیک کام کرآؤں اس میں جو میں چھوڑ آیا ہوں!'' ـــــ یعنی موت کے بعد ہر کافر اور ہر بدکار تمنا کرے گا کہ کاش اس کو ایک موقع اور مل جائے، اور وہ دنیا کی طرف لوٹا دیا جائے، تاکہ وہ نیک اعمال کر کے اس عذاب سے نجات حاصل کرلے ـــــ ہرگز نہیں! ـــــ یعنی اس بدبخت کی یہ تمنا ہرگز پوری نہ ہوگی ـــــ

یہاں کسی کے دل میں خیال آئے کہ اگر اللہ تعالیٰ اس بندے کو ایک اور موقع دیدیں تو کیا حرج ہے، بیچارے کی بگڑی بن جائے گی؟! اس کا جواب یہ ہے ـــــ یہ ایک بات ہی ہے جسے وہ کہہ رہا ہے ـــــ یعنی اس کا یہ خواب شرمندۂ تعبیر نہیں ہوگا۔ اگر اس کو موقع دے بھی دیا جائے تو بھی لاحاصل رہے گا۔ کیونکہ اس کی دو ہی صورتیں ممکن ہیں: ایک: یہ کہ اس کے حافظے میں برزخ کے تمام مناظر موجود رہیں اور وہ دنیا میں لوٹا دیا جائے، تو امتحان کیا ہوا؟ اس دنیا میں امتحان تو اسی بات کا ہے کہ حقیقت کا مشاہدہ کئے بغیر اپنی عقل سے حق کو پہچان کر کون اس پر ایمان لاتا ہے۔ اور طاعت ومعصیت کا اختیار رکھتے ہوئے کون فرمانبرداری کرتا ہے۔ دوسری صورت: یہ ہے کہ وہ سب باتیں بھلادی جائیں اور خالی ذہن دنیا کی طرف لوٹایا جائے، تو پھر وہی کتے کی دُم ٹیڑھی ہوگی۔ وہ پھر بھی وہی کرے گا جو پہلے کرتا تھا ـــــ

اور ان کے پیچھے ایک آڑ ہے دوبارہ اٹھائے جانے کے دن تک ـــــ یہ دوسری وجہ ہے ان لوگوں کے واپس نہ لوٹ سکنے کی۔ جس طرح بعض دروازے گھر میں داخل ہونے کے بعد بند ہوجاتے ہیں یعنی لاک (تالا بند) ہوجاتے ہیں۔ اب وہ چابی کے بغیر نہیں کھل سکتے، اسی طرح جو اس دنیا سے گذر گیا اور قبر کی دنیا میں پہنچ گیا اس کا پیچھے سے دروازہ بند ہوگیا۔ اب وہ دروازہ قیامت کے دن ہی کھلے گا۔ اس سے پہلے لوٹنا ناممکن ہے (یہ مضمون سورۃ الانبیاء آیت ۹۵ میں بھی گذرا ہے) ـــــ ارواح جب عالم برزخ میں پہنچ جاتی ہیں تو دنیا والوں سے ان کا پردہ ہوجاتا ہے۔ اور آخرت بھی پوری طرح سامنے نہیں آتی۔ عالم قبر اسی دنیا کا حصہ ہے۔ اور عالم آخرت اور اس کے درمیان ایک باریک پردہ ہے، جس سے آخرت کے احکام جھلکتے ہیں۔ وہاں جنت کی نعمتوں اور جہنم کے عذاب کا تھوڑا سا نمونہ سامنے آتا ہے۔ قبر کی یہ راحتیں اور برزخ کا یہ عذاب قیامت تک چلتا رہے گا۔ پھر قیامت کے دن معاد (واپس لوٹنا) ہوگا یعنی اسی دنیا میں واپس آنا ہوگا۔ جب اجسام دوبارہ بن کر تیار ہوجائیں گے تو روحیں واپس آئیں گی، اور اپنے جسموں میں داخل ہونگی۔ اور دوسری زندگی شروع ہوجائے گی۔ پھر قیامت کے بہت بڑے دن کے معاملات پیش آئیں گے، اس کے بعد لوگ جنت یا جہنم میں پہنچا دیئے جائیں گے، جہاں وہ تاابد رہیں گے۔

الٰہی! ہماری آخرت کو دنیا سے بہتر بنا، اور ہمیں جنت الفردوس کا وارث بنا (آمین)

فَإِذَا نُفِخَ فِي الصُّورِ فَلَا أَنسَابَ بَيْنَهُمْ يَوْمَئِذٍ وَلَا يَتَسَاءَلُونَ ﴿١٠١﴾ فَمَن ثَقُلَتْ مَوَازِينُهُ فَأُولَٰئِكَ هُمُ الْمُفْلِحُونَ ﴿١٠٢﴾ وَمَنْ خَفَّتْ مَوَازِينُهُ فَأُولَٰئِكَ الَّذِينَ خَسِرُوا أَنفُسَهُمْ فِي جَهَنَّمَ خَالِدُونَ ﴿١٠٣﴾

فَإِذَا	پس جب	فَمَنْ	پس جو شخص	خَفَّتْ	ہلکی ہوئیں
نُفِخَ	پھونکا جائے گا	ثَقُلَتْ	بھاری ہوئیں	مَوَازِيْنُهٗ [۲]	اس کی ترازویں
فِي الصُّوْرِ [۱]	صور میں	مَوَازِيْنُهٗ	اس کی ترازویں	فَأُولٰٓئِكَ	پس وہ لوگ
فَلَآ أَنْسَابَ	تو نہ ناتے ہونگے	فَأُولٰٓئِكَ	پس وہ لوگ	الَّذِيْنَ [۳]	جنھوں نے
بَيْنَهُمْ	ان کے درمیان	هُمُ	ہی	خَسِرُوْٓا	گھاٹے میں رکھا
يَوْمَئِذٍ	اس دن	الْمُفْلِحُوْنَ	کامیاب ہونے والے	أَنْفُسَهُمْ	اپنے آپ کو
وَلَا	اور نہ وہ ایک دوسرے		ہیں	فِيْ جَهَنَّمَ	جہنم میں
يَتَسَآءَلُوْنَ	کو پوچھیں گے	وَمَنْ	اور جو شخص	خٰلِدُوْنَ	ہمیشہ رہنے والے ہیں

عالمِ برزخ (عالم قبر) کے بعد قیامت کا دن ہے۔ اس کے بعد عالم آخرت ہے، جہاں جنت و جہنم ہیں۔ عالم قبر اسی دنیا کا حصہ ہے اور قیامت کا دن اس دنیا کا آخری دن ہے۔ وہ دن آج کے دنوں کے حساب سے پچاس ہزار سال کا ہے۔ جب وہ دن شروع ہوگا تو پہلی مرتبہ صور پھونکا جائے گا۔ جس سے سب خلقت ختم ہوجائے گی۔ پھر ایک عرصہ کے بعد دوسری مرتبہ صور پھونکا جائے گا تو ساری کائنات دوبارہ زندہ ہوجائے گی۔ پھر قیامت کے معاملات شروع ہونگے۔ ظاہر ہے کہ اتنے لمبے دن میں بہت سے معاملات پیش آئیں گے۔ جو قرآن کریم میں جگہ جگہ مذکور ہیں۔ یہاں دو باتیں ذکر کی گئی ہیں:

پہلی بات: ـــــ پس جب صور میں پھونکا جائے گا تو اس دن نہ لوگوں کے درمیان رشتے ناتے ہونگے، اور نہ کوئی کسی کو پوچھے گا ـــــ یہ قیامت کے دن کی ہولناکی کا بیان ہے۔ قیامت کے دن صور دو مرتبہ پھونکا جائے گا۔ پہلی مرتبہ صور پھونکنے کا یہ اثر ہوگا کہ سارا عالم: زمین وآسمان اور جو کچھ ان کے درمیان ہے فنا ہوجائے گا۔ پھر جب دوسری مرتبہ صور پھونکا جائے گا تو سارے مردے زندہ ہوکر کھڑے ہوجائیں گے۔ اس آیت میں صحیح قول کے مطابق دوسری مرتبہ صور پھونکنے کا ذکر ہے ـــــ حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں: قیامت کے دن ہر مرد اور ہر عورت کو میدانِ محشر میں لایا جائے گا۔ اور سب لوگوں کے سامنے کھڑا کیا جائے گا۔ اور اعلان کیا جائے گا کہ یہ فلاں: ابن فلاں ہے، اگر کسی کا کوئی حق اِس کے ذمہ ہوتو وہ سامنے آئے۔ اور اپنا حق وصول کرلے۔ یہ وہ وقت ہوگا

(۱) صُور: نَر سِنْگا، بڑا سینگ، ایک قسم کا بجانے کا آلہ (۲) موازین: میزان یا مِوْزَان کی جمع: ترازویں، یا تولے جانے والے اعمال۔ (۳) الذین: مع صلہ، أولئك کی پہلی خبر، فی جهنم خالدون دوسری خبر، فی جهنم: خالدون سے متعلق ہے۔

کہ بیٹا اس پر خوش ہوگا کہ اب میں اپنا حق باپ سے وصول کرونگا۔ اسی طرح باپ بھی خوش ہوگا کہ اب میں اپنا حق بیٹے سے وصول کرونگا۔ اسی طرح میاں بیوی اور بھائی بہن کا معاملہ ہوگا۔ یہی وہ وقت ہوگا جس کے بارے میں فرمایا ہے کہ ''اس دن لوگوں کے درمیان رشتے ناتے نہیں ہونگے'' (رواہ ابن المبارک وغیرہ درمنثور ۵:۱۵) یعنی اس دن نسب، دوستیاں اور جان پہچان کچھ کام نہ آئے گی۔ رشتوں کی نفی کا یہی مطلب ہے۔ اس دن کوئی کسی کا حال بھی نہیں پوچھے گا۔ سب کو اپنی اپنی پڑی ہوگی۔ اس دن صرف ایمان اور نیک اعمال کام آئیں گے ـــــــ صور کے معنی ہیں: بڑا سینگ، نَرسِنگا، قیامت کے دن اس میں پھونکا جائے گا۔ یہ کام حضرت اسرافیل علیہ السلام کے حوالے ہے، مگر ان کو بھی صور پھونکنے کا وقت معلوم نہیں۔ جب حکم ہوگا تعمیل کریں گے۔ صور کی حقیقت اس سے زیادہ نہ معلوم ہے نہ معلوم ہوسکتی ہے۔

سوال: اس آیتِ پاک میں یہ بات ہے کہ قیامت کے دن رشتے ناتے کام نہیں آئیں گے۔ یہی بات سورۂ عَبَس (آیات ۳۴-۳۷) میں ہے: ﴿يَوْمَ يَفِرُّ الْمَرْءُ مِنْ أَخِيهِ، وَأُمِّهِ وَأَبِيهِ، وَصَاحِبَتِهِ وَبَنِيهِ، لِكُلِّ امْرِئٍ مِّنْهُمْ يَوْمَئِذٍ شَأْنٌ يُغْنِيهِ﴾ یعنی اس دن آدمی اپنے بھائی سے، اپنی ماں سے، اپنے باپ سے، اپنی بیوی سے اور اپنے بیٹوں سے بھاگے گا۔ اس دن لوگوں میں سے ہر شخص کے لئے ایسا معاملہ ہوگا جو اس کو کسی طرف متوجہ نہیں ہونے دے گا ـــــــ اور سورۃ الطّور (آیت ۲۱) میں ہے: ﴿وَالَّذِيْنَ آمَنُوْا وَاتَّبَعَتْهُمْ ذُرِّيَّتُهُمْ بِإِيْمَانٍ أَلْحَقْنَا بِهِمْ ذُرِّيَّتَهُمْ﴾ یعنی جو لوگ ایمان لائے اور ان کی اولاد نے ایمان میں ان کی پیروی کی تو ہم ان کی اولاد کو بھی ان کے شامل حال کردیں گے۔ اس سے نسب کا مفید ہونا ثابت ہوتا ہے۔ اور حدیث میں ہے کہ قیامت کے دن سارے نسب اور دامادی کے تعلقات منقطع ہوجائیں گے یعنی کام نہیں آئیں گے، بجز میرے نسب اور دامادی کے رشتے کے، معلوم ہوا کہ بعض نسب اور تعلقات کام آئیں گے۔ اور دوسری حدیث میں ہے کہ سَقَط یعنی گرے ہوئے بچے قیامت کے دن جنت کا پانی لئے اپنے والدین کو تلاش کریں گے اور ان کو پانی پلائیں گے۔ اس سے بھی نسب کا مفید ہونا ثابت ہوتا ہے ـــــــ اسی طرح اس آیت میں ہے کہ قیامت کے دن کوئی کسی کو نہیں پوچھے گا، جبکہ سورۃ الصافات (آیت ۲۷) میں ہے: ﴿وَأَقْبَلَ بَعْضُهُمْ عَلٰى بَعْضٍ يَتَسَاءَلُوْنَ﴾ یعنی محشر میں لوگ ایک دوسرے سے سوال کریں گے یعنی حالات پوچھیں گے ـــــــ پس ان مختلف باتوں میں تطبیق کیا ہے؟

جوابات: اس سوال کے تین جوابات دیئے گئے ہیں:

پہلا جواب: اس آیت میں بَيْنَهُمْ ہے، اس لئے یہ آیت کفار کے ساتھ خاص ہے۔ پیچھے سے ذکر بھی انہیں کا چلا آرہا ہے۔ رہے مؤمنین تو ان کے رشتے ناتے اور تعلقات کام آئیں گے ـــــــ مگر سورۂ عبس کی آیت عام ہے

اس لئے یہ جواب شافی نہیں۔

دوسرا جواب: یہ ہے کہ یہ آیت میدانِ محشر کے ساتھ خاص ہے۔ وہاں کوئی کسی کے کام نہیں آئے گا، نہ کوئی کسی کو پوچھے گا۔ پھر جب لوگ جنت یا جہنم میں پہنچ جائیں گے تو مؤمنین کے لئے نسب کام آئیں گے اور وہاں باتیں بھی ہونگی ـــــ مگر سورۃ الصافات کی آیت میں میدانِ محشر ہی میں کفار کے باہمی اختلاف کا ذکر ہے، اس لئے یہ جواب بھی تشفی بخش نہیں۔

تیسرا جواب: حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے فرمایا کہ محشر میں مختلف موقف (ٹھہرنے کے مقام) ہونگے۔ اور ہر موقف کا حال مختلف ہوگا۔ ایک وقت ایسا بھی آئے گا کہ کوئی کسی کے کام نہیں آئے گا، نہ کوئی کسی کو پوچھے گا۔ پھر جب کسی دوسرے موقف میں دہشت وہیبت کم ہوگی تو لوگ باہم ایک دوسرے کا حال دریافت کریں گے ـــــ ایک مرفوع روایت سے اس کی تائید ہوتی ہے۔ ابوداؤد میں مروی ہے کہ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا جہنم کو یاد کرکے رو رہی تھیں۔ نبی ﷺ نے ان سے وجہ دریافت کی۔ انھوں نے عرض کیا: مجھے جہنم یاد آگئی اس لئے رو پڑی۔ کیا آپ حضرات قیامت کے دن اپنے گھر والوں کو یاد کریں گے؟ آپ ﷺ نے فرمایا: ''تین مواقف میں کوئی کسی کو یاد نہیں کرے گا: ایک: جب نامۂ اعمال تولے جائیں گے۔ جب تک آدمی یہ نہ جان لے کہ اس کا پلڑا بھاری ہوا یا ہلکا؟ دوسرے: جب نامۂ اعمال اڑائے جائیں گے۔ جب تک آدمی یہ نہ جان لے کہ اس کا نامۂ اعمال دائیں ہاتھ میں آتا ہے یا بائیں ہاتھ میں یا پیٹھ کے پیچھے سے دیا جاتا ہے؟ تیسرے: پل صراط پر، جب وہ جہنم کی پیٹھ پر رکھا جائے گا''[1] ـــــ اس روایت سے معلوم ہوا کہ مؤمنین دیگر مواقف میں اپنے اہل وعیال کو یاد کریں گے۔ واللہ اعلم۔

دوسری بات: ـــــ پس جس کسی کا پلڑا بھاری ہوگا تو وہی لوگ کامیاب ہونے والے ہیں۔ اور جس کسی کا پلڑا ہلکا ہوگا تو وہی لوگ وہ ہونگے جنھوں نے اپنے آپ کو گھاٹے میں رکھا۔ وہ ہمیشہ جہنم میں رہیں گے ـــــ وزنِ اعمال کا منظر بھی بڑا ہولناک ہے۔ جیسا کہ ابھی روایت میں گذرا۔ اس دن جس شخص کا نیکیوں کا پلّہ بھاری ہوگا اس کی پانچوں انگلیاں گھی میں ہونگی۔ اور جس کا نیکیوں کا پلہ ہلکا رہ گیا اس کی لُٹیا ڈوبی! اب وہ ہمیشہ جہنم میں رہے گا۔

فائدہ (۱): اس آیت میں مقابلہ مؤمنین کاملین اور کفار کا ہے۔ انہیں کے اعمال نامے تلنے کا اور ہر ایک کے انجام کا ذکر ہے۔ اور مؤمنین کاملین کا پلہ بھاری ہونے کا مطلب یہ ہے کہ دوسرے پلے میں یعنی برائیوں کے پلّے میں کوئی وزن ہی نہ ہوگا۔ کیونکہ وہ خالی ہوگا یا کم وزن ہوگا۔ اور کفار کا پلّہ ہلکا ہونے کا مطلب یہ ہے کہ نیکیوں کے پلّے میں کوئی

(۱) مشکوٰۃ حدیث ۵۵۶۰ باب الحساب، کتاب احوال القیامۃ ۱۲

وزن ہی نہ ہوگا۔ کیونکہ ایمان کی شرط مفقود ہوگی۔

فائدہ (۲): بعض روایات سے معلوم ہوتا ہے کہ خود مؤمن وکافر کو تولا جائے گا۔ کافر کا کوئی وزن نہ ہوگا، خواہ وہ کتنا ہی موٹا تازہ ہو، اور مؤمن بڑا وزنی ثابت ہوگا، خواہ وہ دبلا پتلا ہو۔ اور بعض روایات سے معلوم ہوتا ہے کہ اعمال نامے تولے جائیں گے۔ اور بعض سے مفہوم ہوتا ہے کہ اعمال ہی تولے جائیں گے۔ ان کو محشر میں مجسّم کرلیا جائے گا اور تولا جائے گا۔ ان روایات میں کچھ تعارض نہیں۔ جمع کرنا ممکن ہے۔ اس طرح کہ عامل، عمل اور اعمال ناموں کو ایک ساتھ تولا جائے۔ یا ان میں سے کوئی ایک حقیقت ہو، اور باقی دو مجازی تعبیریں ہوں۔ واللہ اعلم۔

فائدہ (۳): ابن ابی حاتم رازی نے حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما کا قول نقل کیا ہے کہ قیامت کے دن گنہ گار مؤمنوں کا حساب اس طرح ہوگا کہ جس کی نیکیاں اس کے گناہوں سے بڑھ جائیں گی، خواہ ایک ہی نیکی بڑھے، وہ جنت میں جائے گا۔ اور جس کے گناہ بڑھ جائیں گے، خواہ ایک ہی گناہ بڑھے، وہ دوزخ میں جائے گا۔ مگر اس کا دوزخ میں جانا تطہیر کے لئے ہوگا۔ جیسے سونا، چاندی اور لوہا آگ میں ڈال کر تپایا جاتا ہے تاکہ اس کا میل اور زنگ صاف ہوجائے۔ اسی طرح مؤمن کا جہنم میں جانا ہوگا۔ اور جس کی نیکیاں اور برائیاں برابر ہونگی ان کو اعراف میں رکھا جائے گا۔ وہ وہاں ایک زمانہ تک حکم کے منتظر رہیں گے۔ بالآخر ان کو جنت میں داخلہ مل جائے گا۔ اور حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے یہ بھی فرمایا کہ میزانِ عمل اتنا صحیح وزن کرے گی کہ ایک رائی کے دانے کے برابر بھی کمی بیشی ہوگی تو پلّہ جھک جائے گا یا اٹھ جائے گا (مظہری)

فائدہ (۴): قرآن کریم میں عموماً نیک مؤمنین اور کفار کا حال ذکر کیا جاتا ہے۔ گنہ گار مؤمنون کے حال سے سکوت اختیار کیا جاتا ہے۔ اور اس کی وجہ شاید یہ ہے کہ نزول قرآن کے زمانہ میں سبھی مسلمان نیک تھے، کیونکہ وہ صحابہ تھے۔ سب کبیرہ گناہوں سے پاک تھے، اور اگر کسی سے کوئی گناہ ہوگیا تھا تو اس نے توبہ کرلی تھی۔ اور گناہ سے توبہ کرنے والا ایسا ہوجاتا ہے جیسے گناہ کیا ہی نہیں (مظہری) یا ان کا تذکرہ اس لئے نہیں کیا جاتا کہ مؤمن کی شان یہ ہے ہی نہیں کہ اس کے نامۂ اعمال میں گناہ باقی رہیں۔ اگر مؤمن سے کوئی گناہ سرزد ہوجاتا ہے تو وہ پہلی فرصت میں توبہ کرلیتا ہے۔ سورۃ التوبہ (آیت ۱۰۲): ﴿خَلَطُوْا عَمَلاً صَالِحًا وَّ آخَرَ سَيِّئًا﴾ میں انہی مؤمنین کا تذکرہ ہے۔

> مؤمن سے کوئی گناہ سرزد ہوجائے تو وہ اس وقت تک بے چین رہتا ہے جب تک اس کو ندامت کے آنسوؤں سے دھو نہ ڈالے۔

تَلۡفَحُ وُجُوۡهَهُمُ النَّارُ وَهُمۡ فِيۡهَا كٰلِحُوۡنَ ﴿۱۰۴﴾ اَلَمۡ تَكُنۡ اٰيٰتِىۡ تُتۡلٰى عَلَيۡكُمۡ فَكُنۡتُمۡ بِهَا تُكَذِّبُوۡنَ ﴿۱۰۵﴾ قَالُوۡا رَبَّنَا غَلَبَتۡ عَلَيۡنَا شِقۡوَتُنَا وَكُنَّا قَوۡمًا ضَآلِّيۡنَ ﴿۱۰۶﴾ رَبَّنَآ اَخۡرِجۡنَا مِنۡهَا فَاِنۡ عُدۡنَا فَاِنَّا ظٰلِمُوۡنَ ﴿۱۰۷﴾ قَالَ اخۡسَـُٔوۡا فِيۡهَا وَلَا تُكَلِّمُوۡنِ ﴿۱۰۸﴾

تَلۡفَحُ (۱)	جھلسے گی	فَكُنۡتُمۡ	پس تھے تم	رَبَّنَآ	اے ہمارے رب!
وُجُوۡهَهُمُ (۲)	ان کے چہروں کو	بِهَا	ان کو	اَخۡرِجۡنَا	نکالیں آپ ہمیں
النَّارُ	آگ	تُكَذِّبُوۡنَ	جھٹلاتے	مِنۡهَا	اس سے
وَهُمۡ	اور وہ	قَالُوۡا	کہا انھوں نے	فَاِنۡ	پس اگر
فِيۡهَا	اس (آگ) میں	رَبَّنَا	اے ہمارے رب!	عُدۡنَا	لوٹیں ہم
كٰلِحُوۡنَ (۳)	منہ بگڑے ہوئے	غَلَبَتۡ	غالب آگئی	فَاِنَّا	تو بیشک ہم
	ہونگے	عَلَيۡنَا	ہم پر	ظٰلِمُوۡنَ	قصوروار ہیں
اَلَمۡ تَكُنۡ	کیا نہیں تھیں	شِقۡوَتُنَا (۴)	ہماری بدبختی	قَالَ	فرمایا
اٰيٰتِىۡ	میری آیتیں	وَكُنَّا	اور تھے ہم	اخۡسَـُٔوۡا (۵)	دھتکارے پڑے رہو
تُتۡلٰى	پڑھی جاتیں	قَوۡمًا	لوگ	فِيۡهَا	اس میں
عَلَيۡكُمۡ	تم پر	ضَآلِّيۡنَ	گمراہ	وَلَا تُكَلِّمُوۡنِ (۶)	اور مجھ سے بات مت کرو

قیامت کے بعد آخرت ہے۔ جہاں دو ہی گھر ہیں: جنت اور جہنم۔ اور آخرت کی زندگی ابدی ہے، اس لئے وہاں احوال بھی بے شمار پیش آئیں گے۔ ان آیات میں اور آئندہ آیات میں آخرت کی چار باتیں ذکر کی گئی ہیں:

پہلی بات: ـــــ ان کے چہروں کو آگ جھلسے گی، اور وہ اس میں بگڑے ہوئے منہ والے ہوں گے ـــــ یعنی کفار جب جہنم میں ڈالے جائیں گے تو وہاں ان کے چہرے آگ سے جھلس کر کباب ہوجائیں گے۔ اور شکلیں ایسی

(۱) لَفَحَتِ النارُ أو السَّموم (ف) لَفْحًا: آگ یا لو کا چہرے کو جھلسنا (۲) وجوھھم: مفعول مقدم ہے (۳) كَلَحَ (ف) كُلُوْحًا بگڑی ہوئی شکل والا ہونا، ایسا چہرہ ہوجانا کہ نیچے کا ہونٹ لٹک جائے، اور اوپر کا ہونٹ اٹھ جائے، جیسے بکری کی بھنی ہوئی سری کا حال ہوتا ہے (۴) شِقْوَةٌ: شَقِيَ يَشْقٰى کا مصدر: بدبخت ہونا (۵) اِخْسَأُوْا: فعل امر، صیغہ جمع مذکر حاضر، خَسَأَ (ف) خَسْئًا: دھتکارنا، پھٹکارنا، (۶) ولا تکلمونِ: کے آخر میں ی محذوف ہے، نون کا کسرہ اس کی علامت ہے۔

بدنما ہو جائیں گی کہ نیچے کا ہونٹ لٹک کر ناف کو چھو لے گا، اور اوپر کا ہونٹ پھول کر کھوپڑی تک پہنچ جائے گا۔ پناہ بخدا!

دوسری بات: ـــــ (ان سے کہا جائے گا) کیا میری آیتیں تم کو پڑھ کر سنائی نہیں جاتی تھیں، پس تم ان کو جھٹلایا کرتے تھے؟ ـــــ یعنی جن وعیدوں کو تم دنیا میں جھٹلایا کرتے تھے، اب آنکھوں سے دیکھ لو! وہ سچی تھیں یا جھوٹی؟ ـــــ وہ کہیں گے: ''اے ہمارے پروردگار! ہم پر ہماری بدبختی غالب آ گئی، اور ہم گمراہ لوگ تھے۔ اے ہمارے پروردگار! ہمیں اس (جہنم) سے نکالیں، پس اگر ہم لوٹیں تو ہم یقیناً قصوروار ہیں'' ـــــ یعنی وہ اعتراف کریں گے کہ بیشک ہماری بدبختی نے دھکا دیا۔ ہم دنیا میں گمراہ تھے۔ اس لئے آج ابدی ہلاکت کے گڑھے میں آ پڑے۔ اب ہم نے سب کچھ دیکھ لیا۔ براہِ کرم! ایک دفعہ ہم کو یہاں سے نکالیے۔ ہم پھر کبھی ایسا نہ کریں گے۔ اگر کریں تو واقعی مجرم! پھر آپ جو چاہیں سزا دیں ـــــ فرمایا: ''اس میں دُھتکارے پڑے رہو، اور مجھ سے بات مت کرو!'' ـــــ یعنی آئندہ اپنی رہائی کے لئے کوئی عرض معروض نہ کرو، اب ہمیشہ دوزخ میں سڑتے رہو! چنانچہ اس کے بعد ہمیشہ کے لئے ان کی زبانیں بند ہو جائیں گی۔ اور وہ رہائی کے لئے کوئی عرض معروض نہ کر سکیں گے۔

إِنَّهُ كَانَ فَرِيقٌ مِّنْ عِبَادِي يَقُولُونَ رَبَّنَا آمَنَّا فَاغْفِرْ لَنَا وَارْحَمْنَا وَأَنتَ خَيْرُ الرَّاحِمِينَ ﴿١٠٩﴾ فَاتَّخَذْتُمُوهُمْ سِخْرِيًّا حَتَّىٰ أَنسَوْكُمْ ذِكْرِي وَكُنتُم مِّنْهُمْ تَضْحَكُونَ ﴿١١٠﴾ إِنِّي جَزَيْتُهُمُ الْيَوْمَ بِمَا صَبَرُوا أَنَّهُمْ هُمُ الْفَائِزُونَ ﴿١١١﴾

إِنَّهُ (۱)	بیشک شان یہ ہے	آمَنَّا	ایمان لائے ہم	الرَّاحِمِينَ	مہربانی کرنیوالوں میں
كَانَ	(کہ) تھی	فَاغْفِرْ	پس بخشش فرما	فَاتَّخَذْتُمُوهُمْ (۲)	پس بنایا تم نے ان کا
فَرِيقٌ	ایک جماعت	لَنَا	ہماری	سِخْرِيًّا (۳)	ٹھٹھا
مِّنْ عِبَادِي	میرے بندوں کی	وَارْحَمْنَا	اور مہربانی فرما ہم پر	حَتَّىٰ	یہاں تک کہ
يَقُولُونَ	کہتی تھی وہ	وَأَنتَ	اور آپ	أَنسَوْكُمْ (۴)	بھلا دی مسخروں نے
رَبَّنَا	اے ہمارے رب!	خَيْرُ	بہتر ہیں		تم کو

(۱) إنه: ضمیر شان إِنَّ کا اسم ہے، اور جملہ کان: اس کی خبر ہے (۲) اِتَّخَذْتُمُوْهُم: تم نے ان کو ٹھہرایا، ماضی، صیغہ جمع مذکر حاضر، اِتِّخَاذٌ مصدر۔ یہ اصل میں اِتَّخَذْتُمْ تھا۔ ضمیر کے اتصال کی بنا پر واو جمع لایا گیا، ھم ضمیر جمع مذکر غائب (۳) سِخْرِيًّا: اسم ہے، بمعنی ٹھٹھا، ہنسی، دل لگی (۴) أَنْسَوْكُمْ: إِنْسَاءٌ (بھلانا) سے فعل ماضی، صیغہ جمع مذکر غائب۔ فاعل کی ضمیر ٹھٹھا کرنے والوں کی طرف لوٹتی ہے ٹھٹھا ←

ذِكْرِيْ	میری یاد	اِنِّيْ	بیشک میں نے	اَنَّهُمْ (۲)	بالیقین وہ
وَكُنْتُمْ	اور تھے تم	جَزَيْتُهُمُ	بدلہ دیا ان کو	هُمُ	ہی
مِّنْهُمْ	ان سے	الْيَوْمَ	آج	الْفَآئِزُوْنَ	کامیاب ہونے والے
تَضْحَكُوْنَ	ہنسی کرتے	بِمَا صَبَرُوْٓا (۱)	ان کے صبر کی وجہ سے		ہیں

تیسری بات: یہ بھی آخرت کے احوال کا بیان ہے۔ان آیتوں میں کفار کو مؤمنین کا بہترین انجام سنایا جارہا ہے تاکہ ان کی حسرت بڑھے۔اور وہ جان لیں کہ جو لوگ دنیا میں بے حیثیت تھے آج کس مقام پر فائز ہیں۔ارشاد ہے:

—— بیشک میرے بندوں کی ایک جماعت ایسی تھی جو کہتی تھی: ''اے ہمارے پروردگار! ہم ایمان لائے، پس آپ ہماری بخشش فرمائیں، اور ہم پر مہربانی فرمائیں اور آپ رحم کرنے والوں میں سب سے بہتر ہیں!'' —— یہ مکی دور کے کمزور بے سہارا مسلمانوں کی دعا ہے، اور بڑی اہم دعا ہے۔ہمیں بھی یہ دعا کرنی چاہئے اور جب کبھی کافروں کے مظالم کا سامنا ہو تو یہ دعا بکثرت مانگنی چاہئے۔دعا کے الفاظ یہ ہیں: ﴿ رَبَّنَا آمَنَّا فَاغْفِرْ لَنَا وَارْحَمْنَا وَأَنْتَ خَيْرُ الرَّاحِمِيْنَ ﴾ —— پس تم نے ان کا ٹھٹھا اڑایا —— یعنی جب مسلمان اپنے رب کے آگے دعا واستغفار کرتے تو تم کو ہنسی سوجھتی تھی —— یہاں تک کہ ان مسخروں نے تم کو میری یاد بھلادی —— مخول کرنے والے چند لوگ ہوتے ہیں، باقی مزہ لینے والے ہوتے ہیں۔ارشاد ہوا کہ تم ان مخولیوں کی باتوں میں ایسے لگے کہ مجھے بھی یاد نہ رکھا —— اور تم ان سے دل لگی کیا کرتے تھے —— یعنی مسخرے ان مؤمنین کے بارے میں جو باتیں چھانٹتے تھے تم ان پر قہقہے لگاتے تھے —— بیشک میں نے آج ان کو ان کے صبر کا بدلہ دیا کہ وہی بالیقین کامیاب ہونے والے ہیں —— یعنی دیکھ لو! وہ رہے جنت کے بالاخانوں میں عیش کرتے۔یہ ان کو تمہاری ایذا رسانیوں پر صبر کا صلہ ملا ہے۔اور تم ستانے والے آج ناکامی کے عذاب میں گرفتار ہو۔ان غریبوں کا کیا بگڑا مصیبت تو تمہارے سر پڑی!

قٰلَ كَمْ لَبِثْتُمْ فِي الْاَرْضِ عَدَدَ سِنِيْنَ ﴿۱۱۲﴾ قَالُوْا لَبِثْنَا يَوْمًا اَوْ بَعْضَ يَوْمٍ فَسْـَٔلِ الْعَآدِّيْنَ ﴿۱۱۳﴾ قٰلَ اِنْ لَّبِثْتُمْ اِلَّا قَلِيْلًا لَّوْ اَنَّكُمْ كُنْتُمْ تَعْلَمُوْنَ ﴿۱۱۴﴾

قٰلَ	پوچھا	كَمْ	کتنا	لَبِثْتُمْ	ٹھہرے تم

← کرنے والے بعض ہوتے ہیں، باقی سامعین ہوتے ہیں، وہ کُمْ سے مراد ہیں، کُمْ: مفعول اول اور ذکری: مفعول ثانی ہے۔

(۱) بما صبروا: میں ما مصدریہ اور باء سببیہ ہے۔(۲) جملہ أنهم: جزیتُ کے مفعول ثانی کی جگہ میں ہے۔

فِي الْاَرْضِ	زمین میں	بِيَوْمٍ	دن کا	اِلَّا	مگر
عَدَدَ سِنِيْنَ (۱)	برسوں کے شمار سے	فَسْئَلِ	پس پوچھیں آپ	قَلِيْلًا	تھوڑا
قَالُوْا	کہا انھوں نے	الْعَادِّيْنَ (۲)	شمار کرنے والوں سے	لَوْ (۳)	کاش (اگر)
لَبِثْنَا	ٹھہرے ہم	قٰلَ	فرمایا	اَنَّكُمْ	کہ تم
يَوْمًا	ایک دن	اِنْ	نہیں	كُنْتُمْ	ہوتے
اَوْ بَعْضَ	یا کچھ حصہ	لَّبِثْتُمْ	ٹھہرے تم	تَعْلَمُوْنَ	جانتے

چوتھی بات: یہ آخرت کے احوال کی آخری بات ہے۔ آخرت میں کفار کو احساس دلایا جائے گا کہ دنیا کی زندگی چندلمحوں سے زیادہ نہیں تھی، اگر وہ ان چندلمحوں کو اللہ کی اطاعت میں گذارتے تو آج آخرت میں عیش کرتے۔ ارشاد ہے: ـــــ پوچھا: ''تم برسوں کی گنتی سے کتنی مدت زمین میں ٹھہرے ہو؟'' ـــــ دنیا میں لوگ زندگی کے ایام برسوں سے گنتے ہیں، اس لئے اسی حساب سے پوچھا جائے گا ـــــ جواب دیا انھوں نے: ''ہم ایک دن یا دن کا بھی کچھ حصہ ٹھہرے ہیں! سو آپ گننے والوں سے پوچھ لیں'' ـــــ آخرت کے طول ودوام کے مقابلہ میں خود ان کو دنیا کی زندگی بہت ہی مختصر معلوم ہوگی۔ نیز زندگی ربڑ کی مثال ہے۔ جب سمٹ جاتا ہے تو ذرا سارہ جاتا ہے، اسی طرح وقت بھی جب بیت جاتا ہے تو چندلمحوں سے زیادہ معلوم نہیں ہوتا۔ وہ شدتِ سراسیمگی سے کہیں گے کہ ہمیں کچھ یادوا دنہیں۔ آپ فرشتوں سے معلوم کرلیں۔ انھوں نے ہماری زندگی کا پل پل گن رکھا ہے ـــــ ارشاد ہوگا: ''تم دنیا میں بس ذرا سی مدت رہے ہو، کاش تم جانتے!'' ـــــ یعنی کاش تم نے دنیا ہی میں دنیا کی بے ثباتی اور بعجلت اختتام پذیری کا احساس کرلیا ہوتا تو دنیا پر مغرور ہوکر انجام سے غافل نہ ہوتے ـــــ پہلے سورۃ الحج (آیت ۴۷) میں گذر چکا ہے: ﴿وَإِنَّ يَوْمًا عِنْدَ رَبِّكَ كَأَلْفِ سَنَةٍ مِّمَّا تَعُدُّوْنَ﴾ یعنی دنیا کے شمار سے اللہ کے یہاں ایک دن ایک ہزار سال کے برابر ہے۔ پس اگر کوئی دنیا میں سو سال بھی زندہ رہا ہے تو وہ چند گھنٹوں سے زیادہ نہیں رہا!

اَفَحَسِبْتُمْ اَنَّمَا خَلَقْنٰكُمْ عَبَثًا وَّاَنَّكُمْ اِلَيْنَا لَا تُرْجَعُوْنَ ﴿۱۱۵﴾ فَتَعٰلَى اللّٰهُ الْمَلِكُ الْحَقُّ ۚ لَآ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ ۚ رَبُّ الْعَرْشِ الْكَرِيْمِ ﴿۱۱۶﴾ وَمَنْ يَّدْعُ مَعَ اللّٰهِ اِلٰهًا اٰخَرَ ۙ لَا بُرْهَانَ

(۱) عددَ سنين: کم کی تمیز اور مرکب اضافی ہے۔ (۲) عادٌّ، عَدٌّ سے اسم فاعل: گننے والے، شمار کرنے والے۔ عادِّين: اصل میں عَادِدِيْن تھا۔ دو حرف ایک جنس کے جمع ہوئے اس لئے ادغام کیا گیا۔ (۳) لو: شرطیہ بھی ہوسکتا ہے اور تمنّی کا بھی۔

لَهٗ بِهٖ ۙ فَاِنَّمَا حِسَابُهٗ عِنْدَ رَبِّهٖ ۭ اِنَّهٗ لَا يُفْلِحُ الْكٰفِرُوْنَ ۝۱۱۷ وَقُلْ رَّبِّ اغْفِرْ وَارْحَمْ وَاَنْتَ خَيْرُ الرّٰحِمِيْنَ ۝۱۱۸

اَفَحَسِبْتُمْ	کیا پس گمان کرتے ہو تم	اِلَّا هُوَ	مگر وہی	عِنْدَ رَبِّهٖ	اسکے رب کے پاس ہے
اَنَّمَا (۱)	کہ	رَبُّ	پروردگار	اِنَّهٗ	بیشک شان یہ ہے
خَلَقْنٰكُمْ	پیدا کیا ہم نے تم کو	الْعَرْشِ	عرش	لَا يُفْلِحُ	(کہ) کامیاب نہیں
عَبَثًا (۲)	کھیلتے ہوئے	الْكَرِيْمِ	بزرگ (کے)		ہونگے
وَّاَنَّكُمْ	اور یہ کہ تم	وَمَنْ يَّدْعُ (۴)	اور جو پکارے	الْكٰفِرُوْنَ	انکار کرنے والے
اِلَيْنَا	ہماری طرف	مَعَ اللّٰهِ	اللہ کے ساتھ	وَقُلْ	اور آپ کہیں
لَا تُرْجَعُوْنَ	نہیں لوٹائے جاؤ گے؟	اِلٰهًا اٰخَرَ (۵)	اور معبود کو	رَّبِّ	اے میرے رب!
فَتَعٰلَى	پس بہت برتر ہیں	لَا بُرْهَانَ	نہیں کوئی دلیل	اغْفِرْ	خطائیں معاف فرما
اللّٰهُ	اللہ تعالیٰ	لَهٗ	اس کے پاس	وَارْحَمْ	اور مہربانی فرما
الْمَلِكُ (۳)	بادشاہ	بِهٖ	اس کے معبود ہونے کی	وَاَنْتَ	اور آپ
الْحَقُّ	برحق	فَاِنَّمَا	پس بالتحقیق	خَيْرُ	بہتر (ہیں)
لَآ اِلٰهَ	نہیں کوئی معبود	حِسَابُهٗ	اس کا حساب	الرّٰحِمِيْنَ	مہربانی کرنیوالوں میں

یہ سورتِ پاک کی آخری آیتیں ہیں۔ اور بڑی برکت اور فضیلت والی ہیں۔ ایک مرتبہ حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ کا گزر ایک مصیبت زدہ شخص پر ہوا، آپ نے اس کے کان میں یہ آیتیں پڑھیں، وہ اسی وقت اچھا ہو گیا۔ نبی ﷺ نے ان سے دریافت کیا: آپ نے اس کے کان میں کیا پڑھا؟ آپ نے بتایا: یہ آیتیں پڑھیں۔ نبی ﷺ نے فرمایا: ''اس ذات کی قسم جس کے ہاتھ میں میری جان ہے! اگر کوئی آدمی جو یقین رکھنے والا ہو یہ آیتیں پڑھ کر پہاڑ پر دم کرے تو وہ بھی اپنی جگہ سے ہٹ جائے یعنی پہاڑ جیسی آفت بھی ٹل جائے (اخرجہ ابونعیم فی الحلیۃ) لہٰذا یہ آیتیں ہر

(۱) أنَّ: حرف مشبہ بالفعل، ماکافّہ، پھر جملہ حسبتم کے دو مفعولوں کے قائم مقام ہے (۲) عَبَثًا: مصدر ہے، عَبِثَ (س) عَبَثًا: کھیل کود میں لگنا، لایعنی اور بے فائدہ کام کرنا، ترکیب میں حال یا مفعول لہ ہے۔ (۳) الملكُ الحق: اللہ کی صفتیں ہیں۔ (۴) مَنْ: موصولہ متضمن معنی شرط، جملہ يدع: شرط، فإنما حسابه: جزاء اور جملہ لابرهان: معترضہ برائے تاکید، يَدع: مضارع مجزوم آخر سے واو گرا ہے۔ (۵) إلها آخر: مرکب توصیفی: يدع کا مفعول بہ ہے۔

شخص کو یاد کر لینی چاہئیں۔ اور نمازوں میں اور اس کے علاوہ پڑھتے رہنا چاہئے۔

پس کیا تمہارا یہ خیال ہے کہ ہم نے تم کو بے فائدہ پیدا کیا ہے، اور تم ہماری طرف لوٹائے نہیں جاؤ گے؟ —— لوگوں کو یہی دھوکہ لگا ہوا ہے۔ کیا کافر اور کیا بددین اور بے دین مسلمان، سب اعتقاداً یا عملاً یہی سمجھتے ہیں کہ ان کی تخلیق کا کوئی مقصد نہیں۔ نہ ان کو کبھی اللہ کے حضور میں حاضر ہونا ہے۔ اس لئے وہ قرآن کے دلائل کو جھٹلاتے ہیں یا ان کی زندگیاں غلط رخ پر پڑی ہوئی ہیں —— پس بہت برتر ہیں اللہ تعالیٰ جو حقیقی بادشاہ ہیں —— یعنی اس دنیا میں تو نیکی اور بدی کا پورا نتیجہ ظاہر نہیں ہوتا۔ پس اگر اس زندگی کے بعد دوسری زندگی نہ ہو تو گویا یہ سب کارخانہ محض کھیل تماشا ٹھہرا۔ سو حق تعالیٰ کی جناب اس سے بہت بلند ہے کہ ان کی نسبت ایسا خیال کیا جائے —— ان کے سوا کوئی معبود نہیں، وہ عرش بزرگ کے مالک ہیں —— یعنی جب وہی معبود ہیں تو ممکن نہیں کہ وفاداروں اور مجرموں کو یکساں رہنے دیں۔ ان میں امتیاز قائم نہ کریں۔ اور ایسا کرنا ان کے لئے کچھ مشکل نہیں وہ عرش بزرگ کے مالک ہیں۔ عرش جو مخلوقات میں سب سے بڑی چیز ہے اس کے مالک اور پروردگار جب وہی ہیں تو ساری کائنات ان کی قدرت میں ہے۔ وہ جو چاہیں کر سکتے ہیں۔ مگر یہ امتیاز اس دنیا میں نہیں ہوگا۔ یہ دنیا تو امتحان گاہ ہے۔ امتحان کے ہال میں سب طالب علم ساتھ بیٹھتے ہیں، کامیاب ہونے والے بھی اور ناکام ہونے والے بھی، اور سب کے ساتھ یکساں معاملہ کیا جاتا ہے۔ یہ عملی فیصلہ کب ہوگا؟ ارشاد ہے: —— اور جو کوئی اللہ کے ساتھ کسی اور معبود کو پکارے —— جس کے معبود ہونے کی اس کے پاس کوئی دلیل نہیں —— تو اس کا حساب اس کے پروردگار کے پاس ہوگا —— یعنی دوسری دنیا میں ہوگا، جب سب لوٹ کر ان کے پاس پہنچ جائیں گے۔ اور کیا فیصلہ ہوگا؟ —— بیشک کافر کامیاب نہیں ہونگے —— وہ ہمیشہ عذاب میں مبتلا رہیں گے —— اور آپ کہیں: ''اے میرے پروردگار! خطائیں معاف فرما اور مہربانی فرما، اور آپ مہربانی کرنے والوں میں سب سے بہتر ہیں'' —— یہ دعا ان بندوں کی رائگاں نہیں جائے گی۔ اللہ تعالیٰ آخرت میں مؤمنین کاملین کی خطائیں معاف کریں گے اور ان کے ساتھ رحم وکرم کا معاملہ فرمائیں گے، اور جنت کے بلند درجات عطا فرمائیں گے۔ الٰہی! ہمیں بھی اس زمرہ میں شامل فرما (آمین)

غیر اللہ کو پکارنے والے آخرت میں تباہ ہونگے، اور اللہ سے لو لگانے والے اور ان کے احکام کی پیروی کرنے والے آخرت میں شادکام ہونگے۔

(اللہ کے فضل وکرم سے آج بتاریخ ۲۱ ربیع الاول ۱۴۲۷ ہجری سورۃ المؤمنون کی تفسیر پوری ہوئی)